

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

تہذیب کا پیامبر

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۳ | یکم جولائی ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے (علیگ) ایل ایل بی

ناشر
راجیندر ناتھ شیدا
ایم اے

مدیران
فضل حق قریشی
دہلوی
مشیر احمد
ایم اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

رفتارِ زمانہ

حیدرآباد کا نیا صنعتی خاکہ

حیدرآباد کے محکمہ جات تجارت اور صنعت و حرفت کے رکن نواب لیاقت جنگ بہادر نے ایک تقریر کرتے ہوئے اخبارات کے نمائندوں کو بتایا کہ حکومت حیدرآباد اپنی ریاست میں صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے آئندہ دس سال کے دوران میں ساڑھے تین ارب روپئے خرچ کرے گی، اور اس سلسلے میں تمام ہر کارروائی بالکل آزادانہ ہوگی۔ سب سے پہلے اسے کوئلے کی کانوں پر پورا پورا اختیار حاصل کرنا ہوگا کیونکہ کوئلہ صنعت کی ترقی کے لئے ایک اہم جزو ہے۔ لیکن حکومت کا منشا یہ نہیں ہے کہ وہ نجی اداروں سے کسی قسم کا مقابلہ کرے۔ سوت کاتنے کا ایک کارخانہ قائم کیا جائیگا جس میں کم و بیش پچیس ہزار چرخے ہونگے تاکہ جلاہوں کو کم سے کم قیمت پر اچھا سوت حسب ضرورت مقدار میں مل سکے۔ ایک تیل کے اور دو مصنوعی ریشم کے کارخانوں کے علاوہ پارچہ بافی کے سات کارخانے قائم کئے جائینگے۔ آخرالذکر کے چھ کارخانے اسوقت موجود ہیں۔ دریائے گوداوری کے علاقے میں لوہے اور فولاد کا کام شروع کرنا زیر غور ہے۔ اس مقصد کے لئے دریائے گوداوری کے اس مخصوص علاقے سے ریاست بستار تک سو میل لمبی ریلوے لائن ڈالی جائیگی۔ ریاست مذکور سے کچا لوہا نکالنے کے لئے اسکی حکومت سے گفت و شنید ہو رہی ہے۔ قیاس ہے کہ وہاں کان کنی کی مراعات مل جائینگی۔ حکومت حیدرآباد سلمے ستارے کی قسم کی گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے بھی کوشاں ہے۔ کیونکہ وہاں کی یہ مشہور صنعت کبھی دنیا بھر میں مشہور تھی۔ خیال ہے کہ ضلع اورنگ آباد میں اس کام کو تین لاکھ کے سرمائے سے شروع کیا جائے۔ اس ضمن میں پچیس فیصد سرمائے کے حصے عوام کو دیدئے جائینگے تاکہ وہ بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔

لندن میں جشن فتح

۸ جون کی صبح اہل لندن کے لئے حد درجہ مسعود و مبارک ثابت ہوئی کیونکہ اس روز ایک اس شان سے جشن فتح منایا گیا جو تاریخ انگلستان میں ہمیشہ یادگار ثابت ہو سکتا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں موجودہ شہنشاہ کی تقریب تاجپوشی عمل میں آئی تھی۔ اس کے بعد سے یہ پہلا نعرۂ مسرت تھا جو حدود برطانیہ کی اس فضا میں بلند ہوا جسے چھ سال کی طویل صبر آزما جنگ نے مکدر بنا دیا تھا۔ اس میں شریک ہونے کے لئے لوگ پورے ذوق و شوق کے ساتھ انگلستان کے ہر حصے سے آئے اور ایک ہنگامۂ نشاط برپا کر دیا۔ اس میں بحری، بری، اور فضائی فوجوں کے علاوہ وہ محب وطن بھی شامل ہوئے جنھوں نے محاذ جنگ سے دور شہروں کی پر سکون فضا میں رہ کر کئی لحاظ سے جنگی خدمات انجام دی تھیں۔ ان سب کی تعداد دو لاکھ اکیس ہزار تھی۔ بادشاہ سلامت کو سلامی دیتے ہوئے جب یہ لوگ گذرے تو جلوس کئی میل لمبا ہو گیا۔ اس موقعہ کی ہزاروں لاکھوں تصویریں کھینچی گئیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم ٹیلی وژن کا انتظام تھا جو توقعات سے زیادہ کامیاب رہا۔ خیال یہ تھا کہ اس ٹیلی وژن کے ذریعہ اس جشن کے مناظر پچیس میل کے دائرے میں دکھائے جا سکیں گے لیکن تعجب ہوا جب ایک سو ستر میل دور رہنے والے لوگ بھی اچھی طرح اسکی زیارت کر سکے۔ اس جشن کا سب سے زیادہ لطف ان لوگوں کو حاصل ہوا ہوگا جو جنگ کے میدانوں میں بہادری کے کارنامے پیش کرتے ہوئے ہر قسم کی تکالیف برداشت کر چکے تھے۔

انجمن نو ساخت ہند

ہندوستان اور ایران کے مابین ثقافتی تعلقات کو زیادہ وسیع کرنے اور استوار رکھنے کے لئے دہلی میں ایک نئی انجمن کی داغ بیل ڈالی گئی ہے جسکا نام "انڈو ایرانین ایسوسی ایشن" رکھا گیا ہے۔ یہ انجمن علمی اور صنعتی نمائشوں، فلموں اور تقریروں وغیرہ کے ذریعہ دونوں ملکوں کے درمیان بہتر مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کرے گی۔ طلباء اور اساتذہ ایک دوسرے ملک میں بھیجے جائیں گے تاکہ اس طرح مل جل کر اکتساب علوم و فنون کی عملی صورت پیدا ہو سکے۔ اس امر کی بھی کوشش کی جائے گی کہ مختلف کھیلوں اور ورزشوں کے مظاہرے ایک دوسرے کے ملک میں کئے جائیں۔ حسب ضرورت کتابوں اور قلمی مسودوں وغیرہ کا تبادلہ عمل میں آئیگا۔ امید ہے کہ یہ انجمن، جیسا کہ اس کے مقاصد سے ظاہر ہے دونوں ملکوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی۔ اس انجمن کے ناظم اعلیٰ حضرت منظور حسن موسوی ایم اے ہیں جو عرصۂ دراز تک دہلی کے اینگلو عربک کالج میں شعبۂ السنۂ شرقیہ کے صدر اساتذہ رہے ہیں۔

موصوف بذاتِ خود ایران کا دورہ فرما کر وہاں کے جملہ حالات کا غائر مطالعہ فرما چکے ہیں۔

شاہ اطالیہ کی جلاوطنی

یورپ میں امن چین ہونے کے بعد جب اطالیہ کی فضا بھی پرسکون ہوگئی تو امبرٹو ثانی کو جو عالی خاندان سیوائے کے رکن اور تاج و تخت کے مستحق تھے بادشاہ بنا دیا گیا۔ اطالیہ کے اس مشہور خاندان کے افراد گزشتہ پچاسی سال سے عنانِ حکومت سنبھالے رہے ہیں۔ لیکن زمانے کا رنگ ہوا کہ بہت کچھ بدل چکا تھا اس لئے فوراً ہی اعتراضات شروع ہوگئے اور جمہوریت پسندوں نے زور دیا کہ شہنشاہیت کے سلسلے کو ختم کر دیا جائے۔ مجبوراً عوام سے استصوابِ رائے کیا گیا۔ ۵۵ ہزار ۹۲ لاکھ ۱۲ اشخاص نے جمہوریت قائم ہونے کے حق میں اپنی رائے پیش کی۔ اس کے برعکس ۹ لاکھ ۴۲ ہزار ۳۰۶ اشخاص نے شہنشاہیت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی مرضی ظاہر کی۔ اس شکست کے بعد ظاہر تھا کہ امبرٹو ثانی کو تاج و تخت سے دست بردار ہو جانا پڑا۔ چنانچہ وہ اپنی ملکہ میریا اور چار بچوں سمیت روم سے جلاوطن ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر اکتالیس سال ہے۔ ان کی روانگی کے بعد سے سامراجیوں نے شورش برپا کر رکھی ہے۔ وہ اپنے بادشاہ کو واپس بلانا چاہتے ہیں حالانکہ شاہ امبرٹو کے عمر تاج انتیس دن سے زیادہ نہیں رہ سکا تھا۔

پانی کیلئے نل والے دس ہزار کوئیں

محکمہ جات تعلیم صحت عامہ اور زراعت کے ڈپٹی سر جوگندر سنگھ نے شملہ کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اشیائے خوراک کی کمی محض اسلئے ہے کہ زراعت کے ضمن میں ہر لحاظ سے لاپرواہی برتی جاتی رہی ہے مثلاً مویشیوں کی دیکھ بھال کرنے، مچھلیاں پکڑنے، مرغیاں وغیرہ پالنے اور پھل اگانے کے سلسلے میں پوری پوری توجہ کبھی نہیں دی گئی۔ موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ ہمارے دیہاتیوں کو راہنمائی کی سخت ضرورت ہے۔ ملک کے اربابِ حل و عقد اور حاملانِ علم و عرفان کاشتکاری کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے سیاسی معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ زراعتی اور صنعتی کاموں میں بالکل نہیں پڑتے۔ انھوں نے پانی کے لئے نل والے دس ہزار کوئیں تیار کرانے کے لئے ایک پنج سالہ خاکہ مرتب کیا ہے جسکی تکمیل پر ایک کروڑ ایکڑ زمین میں اچھی طرح آبپاشی ممکن ہوسکیگی۔ اس خاکے کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ برطانیہ عظمیٰ کی طرح ہمارے ملک کو بھی ایک انڈین مارکٹنگ بورڈ قائم کر لینا چاہئے۔

امریکی دعوت نامے اسٹالن کے نام

صدر ٹرومین نے اخباری نمائندوں کے ایک اجلاس میں اس راز کو منکشف کیا کہ جنرلیسمو اسٹالن کو دو بار واشنگٹن آنے کی دعوت دی گئی اور دونوں بار موصوف نے عذرِ صحت پیش کرتے ہوئے انکار کر دیا۔ پہلا دعوت نامہ پوٹسڈم کانفرنس کے موقعہ پر بھیجا گیا تھا اور دوسرا اس وقت جب غیر ملکی وزراء کا جلسہ پیرس میں منعقد ہونے والا تھا۔ اسی دوسرے دعوت نامے میں صدر ٹرومین نے جنرلیسمو اسٹالن کی توجہ عالمگیر مسئلہ خوراک کی طرف مبذول کراتے ہوئے روسی امداد و تعاون کی استدعا کی تھی کیونکہ دیکھا جاتا تھا کہ اس وقت جبکہ بیشتر ملکوں کے لوگ بھوک کے مارے ہوئے تھے سرزمین روس پر غلے کی کوئی کمی نہیں تھی بلکہ اپنی ضرورت سے زیادہ مقدار میں ہر قسم کا اناج موجود تھا۔ موصوف نے دعوت نامہ قبول نہ کرتے ہوئے کہا: "ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اتنا طویل سفر کرنا میرے لئے حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے مناسب نہیں" غذائی تعاون کے سلسلے میں کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

کمانڈر انچیف کے اعزاز میں ترقی

ہندوستان کے کمانڈر انچیف جنرل سر کلاڈ آکنلک کی گرانقدر جنگی خدمات کا لحاظ رکھتے ہوئے بادشاہ سلامت نے انھیں فیلڈ مارشل کا اعزاز بخشا ہے۔ موصوف ۱۹۰۴ء میں پہلی بار ہندوستان تشریف لائے تھے۔ اس وقت ۶۲ پنجابی فوج کی کمان ان کے سپرد کی گئی تھی۔ ۱۹۴۱ء کے شروع میں ان کو کمانڈر انچیف بنایا گیا لیکن پانچ ہی مہینے بعد ان کو مشرقِ وسطیٰ میں کمانڈر انچیف کی حیثیت سے بھیج دیا گیا۔ وہاں انھوں نے لارڈ ویول کے نقوشِ قدم پر چلتے ہوئے زبردست سرگرمیٔ عمل دکھائی اور انھوں نے بھی رومیل کے ان افریقی دستوں کے خلاف جنگی محاذ قائم کیا جو تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ ستمبر ۱۹۴۱ء میں انھوں نے آٹھویں فوج مرتب کی اور العالمین کے مورچہ پر اسکی کمان ذاتی طور پر اپنے ہاتھ میں لیکر مقابلہ کیا۔ مشرقِ وسطیٰ کو خیرباد کہنے سے قبل انھوں نے زبردست حملوں کا ایسا مضبوط اڈا قائم کر دیا تھا جس نے شمالی افریقہ کی محوری فوجوں کو بری طرح مار بھگایا۔ آپ کے یہ کارنامے یقیناً لائقِ وقعت تھے۔

جوہری قوت اور صنعتی ادارے

لندن میں کچھ عرصے سے دنیا بھر کے سائنسدانوں کا ایک اہم اجلاس ہو رہا ہے۔ اسکا سب سے بڑا مقصد ایسی تجاویز پر غور و خوض کرنا ہے جنکو دائرہ عمل میں لاکر سائنٹفک قوتوں کے ذریعے صنعت و حرفت کو ترقی دی جاسکے۔ ظاہر ہے کہ اس اجلاس کے فیصلے نوعِ انسان کے لئے بہت ہی مفید رہیں گے۔ اس سلسلے میں ہندوستان سے بھی ایک سائنسی وفد بھیجا گیا ہے جس کی قیادت ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر فرما رہے ہیں۔ ہندوستانی اراکین کی کل تعداد چودہ ہے۔ کراچی سے وفد کی روانگی کے وقت ڈاکٹر بھٹناگر نے اخباری نمائندوں سے کہا کہ ہم ہندوستانی نمائندے اس اجلاس میں تجویز پیش کریں گے کہ جوہری قوت کو آئندہ صرف صنعت و حرفت کے اداروں میں استعمال کیا جائے۔ اس سے ہم ہرگز تیار نہ ہوں کیونکہ جاپان میں گرائے ہوئے بموں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ جان و مال کی ایسی ہولناک تباہی کو آئندہ کسی قیمت پر بھی گوارا

نہیں کیا جاسکتا۔ سنا گیا ہے کہ دنیا کے دوسرے سائنسداں بھی اس تجویز کی حمایت کرینگے۔

درمیانی عرصے کی حکومت

جیسا کہ پچھلی اشاعت میں بیان کیا جاچکا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں برطانوی وزارتی وفد نے چند اہم نکات پر مشتمل اپنی سفارشات مرتب کیں اور قبول کرنے کے لئے پرنس چیمبر کے علاوہ ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتوں یعنی لیگ اور کانگریس کو بھیجدیں۔ کافی غور وخوض کے بعد مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے ان سفارشات کو تسلیم کرلیا۔ اس کے بعد پرنسس چیمبر نے بھی اپنی منظوری دیدی۔ لیکن کانگریس ورکنگ کمیٹی نے چند اعتراضات کے ساتھ انھیں رد کردیا۔ اعتراضات میں زیادہ اہمیت تین امور کو حاصل تھی:۔ (۱) کانگریس اور لیگ کے مابین باعتبار تعداد مساوات نہ ہو۔ (۲) آسلم بنگال کے یورپین باشندوں کو اسمبلی کے لئے کھڑے ہونے یا رائے دینے کا حق نہ دیا جائے۔ (۳) صوبوں کو گروپوں میں تقسیم کرنے پر زور نہ دیا جائے۔

چونکہ حکومت برطانیہ کسی نہ کسی طرح درمیانی عرصے کی حکومت بنانے کے لئے تلی ہوئی تھی اس لئے برطانوی وزارتی وفد اور وائسرائے ہند کی جانب سے چودہ حضرات کو دعوت دی گئی کہ اگر وہ قبول کریں تو درمیانی عرصے کی حکومت بنالی جائے۔ ان حضرات کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ مسٹر محمد علی جناح
۲۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں
۳۔ خواجہ سر ناظم الدین
۴۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں
۵۔ سردار عبدالرب نشتر
(مسلم لیگ)

۶۔ پنڈت جواہر لال نہرو
۷۔ مسٹر اتیج کے مہتاب
۸۔ مسٹر راجگوپال آچاری
۹۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد
۱۰۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل
(کانگریس)

۱۱۔ سردار بلدیو سنگھ (سکھ)
۱۲۔ سر این۔ پی انجینئر (پارسی)
۱۳۔ ڈاکٹر جان متھائی (ہندوستانی عیسائی)
۱۴۔ مسٹر جگ جیون رام (اچھوت)

اس اعلان نامے میں ہندوستان کی موجودہ مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے تاہم توقع ظاہر کی گئی ہے کہ اشتراک عمل کے ساتھ اس حکومت کو چلانے کی کوشش کی جائیگی۔ اس کا موقع دیا گیا ہے کہ اگر نامزد حضرات میں سے کسی کو ذاتی طور پر شرکت کرنے سے احتراز ہو تو بنگ دوسرا نام بھی سمجھنے کے بعد تجویز کردیا جائیگا۔ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا ہے کہ کون سا محکمہ کس رکن کو تفویض کیا جائے گا۔

ایران اور آذربائیجان

یورپ کی لڑائی ختم ہونے کے بعد ہی ایران اور اس کے شمالی خود مختار صوبے "آذربائیجان" کے مابین چپقلش شروع ہوگئی تھی۔ اس سلسلے میں دونوں طرف سے مصالحت کی موثر پیدا کی جاتی رہی اور آخرکار اب ایک معاہدے کی رو سے امن و عافیت قائم ہوگئی ہے۔ ایران کی کابینہ نے بھی اس معاہدہ کو تسلیم کرلیا ہے۔ طہران کے سیاسی طبقوں میں قیاس لگایا جارہا ہے کہ ڈاکٹر سلام اللہ جاوید کو جو آذربائیجان کی موجودہ حکومت کے اندرونی معاملات کے وزیر ہیں، اس صوبہ کا گورنر جنرل بنادیا جائیگا۔ نئے معاہدے کے بموجب آذربائیجان اپنے "حق خود مختاری" سے دستبردار ہوگیا ہے اور ایک بار پھر اسے ایران کا ایک حصہ سمجھا جانے لگا ہے۔

آسٹریلیا کا گیہوں

اگر صورت حالات غیر معمولی نہ ہو تو آسٹریلیا میں گیہوں کی کل پیداوار وہاں کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے اسکا بیشتر حصہ دوسرے ملکوں کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ فصل کی تیاری بہت کچھ موسمی حالات پر منحصر ہوتی ہے۔ اسلئے ہوسکتا ہے کہ کسی سال اسکی مقدار کم ہو اور کسی سال زیادہ۔ چنانچہ اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۳۹ء میں وہاں سے گیہوں کی برآمد ۹۰،۸۵،۰۰۰ بشل اور ۱۹۴۴ء میں ۱،۸۰،۰۰۰،۹۱،۰۰۰ بشل رہی بلکہ ۱۹۴۵ء میں ایک دانہ بھی باہر نہ بھیجا جاسکا کیونکہ آندھیوں نے فصلیں تباہ کردی تھیں۔ اس سال کیلئے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۵۰،۰۰،۰۰۰ بشل گیہوں باہر بھیجا جاسکیگا۔

(ساڑھے سینتیس بشل ایک ٹن یا اٹھائیس من کے برابر ہوتے ہیں)۔

ٹیلی وژن کا موجد

نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر سننے میں آئی کہ ٹیلی وژن کے موجد کپتان جے ایل بیرڈ لہرون کو اس دار فانی کو چل بسے۔ موصوف کی عمر ۵۸ سال تھی وہ گذشتہ تیس سال سے دوسری تحقیقات کے ساتھ ساتھ ٹیلی وژن کے نت نئے تجربات میں مصروف تھے چنانچہ حال ہی میں ٹیلی فلم کی ایجاد پایہ تکمیل کو پہنچی تھی۔ انکی وفات اسوقت ہوئی جبکہ بہت سی مفید سائنسی تحقیقات کو جنگ کے باعث معرض التوا میں پڑے رہنے کے بعد اب فروغ پانیکا موقعہ ملا تھا۔ ساری متمدن دنیا موصوف کی حسرتناک موت پر افسوس اور پسماندگان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کررہی ہے۔

تصحیح

۱۵ جون ۱۹۴۶ء کے "تجلی" میں ایک مقالہ بعنوان "ایران میں قالین کی صنعت" شریک اشاعت تھا اس کے صفحہ ۸ پر سطر ۱۲ میں "کرنے لگے ہیں" کے بعد یہ الفاظ بڑھا لیجئے "بلکہ اپنے قالین دوسرے ملکوں میں بھی بھیجتے ہیں"۔ نیز سطر ۱۵ میں سے "ملکوں کے" کو حذف کردیجئے۔

(ادارہ)

تضمین میر حسن دہلوی بر غزل قائم چاندپوری

کیوں بتاتے ہو رکھائی مجھے تم یار بہت   میں بھی اس وضع سے گھبراتا ہوں ہر بار بہت
صلح کل یہ ہے کہ بس ذوق نہ اب آزار بہت   ہو اگر ایسے مری شکل سے بیزار بہت
تم سلامت رہو بندے کے خریدار بہت

اس کدورت کی ملاقات میں ہے کچھ بھی مزا؟   روکوں میں آپ کو جی میں رہو تم مجھ سے خفا
قصہ کوتہ یہ ہے بیجا ہے سب آپس میں گلا   یکد گر جب خفگی آوے تو جھگڑا ہی کیا
تم کو خواہندہ بہت ہم کو طرحدار بہت

میرے احوال سے واقف ہیں سبھی انس و جن   کہ ہوئے جاتے ہیں کم تاب و تواں دن بہ دن
ناتواں بسکہ ہوا ہوں مری جاں تیرے بن   آج کے رونے میں جی ڈوب چلا تھا لیکن
نالۂ دل نے رکھا مجھ کو خبردار بہت

ایک تو دل شدگاں پر نہیں کرتا تو نظر   تسپہ اٹھواتا ہے کوچے سے انہیں اے دلبر
ظلم اتنا بھی نہیں خوب خدا سے تو ڈر!   مر ہی جاوے گا کوئی دیکھ جفا زیادہ نہ کر
اپنے جی سے بھی یہاں بیٹھے ہیں بیزار بہت

آج کی نیت فاسد یہ کدھر باندھی ہے؟   کس ارادے پہ میاں تیغ و سپر باندھی ہے؟
ہے نشانا کوئی جس پر کہ نظر باندھی ہے؟   سچ کہو قتل پہ اب کس کے کمر باندھی ہے؟
ان دنوں ہاتھ میں تم رکھتے ہو تلوار بہت

جو کہ واقف نہ ہو تجھ سے تری عیاری سے   پیچ میں لاتو اسے مکر سے پرکاری سے
باز آیا میں تو ایسی تری غمخواری سے   شیخ مت مجھ کو ڈرا گور کی اندھیاری سے
ہجر کی میں نے تو کاٹی ہیں شب تار بہت

قیس و فرہاد کی حالت وہ ہوئی جو کہ سنی   اور بھی ان کے سوا جان گئی کتنوں کی
کل کی ہے بات حسن نے بھی دیا اپنا جی   قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مر گئے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

مرسلہ عبد العلیم شیرکوٹی

سری نواس شاستری

بین الاقوامی شہرت کا ہندوستانی خطیب

بادشاہ حسین

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

وی۔ ایس شاستری ولنگمن کمبکونم کے جنوب میں چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے ایک غریب گھرانے میں ۲۲ ستمبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے ان کی مثال سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ والدین کی ناداری لڑکے کی دماغی حالت پر کوئی اثر نہیں ڈالتی بلکہ زندگی کی تلخیاں دماغی جوہر کو جلا دیتی ہیں۔ سونے کو تپایا جاتا ہے تو اس کا رنگ اور روپ زیادہ نکھرتا ہے۔

ان کی ابتدائی تعلیم مقامی مدرسہ سے شروع ہوئی اور تحتانوی نصاب ختم کرکے وہ کمبکونم ہائی اسکول میں شریک کرائے گئے جہاں سے انہوں نے ۱۸۸۳ء میں میٹرک کا امتحان بدرجہ اعلیٰ کامیاب کیا۔ ثانوی تعلیم سے فراغت پاکر وہ گورنمنٹ کالج کمبکونم میں داخل ہوئے۔ یہ وہی درسگاہ ہے جو جنوبی ہند کی "کیمبرج" مشہور ہے اور اسی مادر جامعہ نے سر اے شیشیا شاستری، سر ایس سوامی ایئر، سر ٹی مدلیار، آنریبل ٹی مادھوراؤ، آنریبل مسٹر سرینواس اینگار جیسے نامور سپوت پیدا کئے۔

۱۸۸۵ء میں ایف اے اور ۱۸۸۷ء میں بی اے کے امتحانات میں اول رہے اور سنسکرت اور انگریزی کی غیر معمولی قابلیت کے سلسلہ میں متعدد انعامات حاصل کئے۔ ان امتیازات سے کہیں یہ اندازہ نہ لگایا جائے کہ مثل دوسرے ہندوستانی طالب علموں کے وہ بھی درسی کتابوں کے کیڑے تھے۔ انہیں رٹنے یا پڑھی اور سیکھی ہوئی چیزوں کو دوہرانے پڑھنے سے دلچسپی نہ تھی بلکہ ایک ذہین اور فرہین طالب علم کی طرح وہ سب کو سمجھ کر ذہن نشین کرنے پر اکتفا کرتے تھے، اور باقی وقت تفریحی مشاغل خصوصاً کھیل کود میں صرف کرتے تھے۔ ایک طرف تو اساتذہ میں اپنی فراست و ذہانت کی وجہ سے اپنا خاص وقار رکھتا تھا اور دوسری طرف طلباء میں کھلاڑی کی حیثیت سے ہر دل عزیزی حاصل تھی۔

مدرس کی حیثیت سے

عام طور پر مدرسی کا پیشہ کچھ بدنام سا ہے کیونکہ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں کوہ کندن و کاہ برآوردن کا معاملہ درپیش ہوتا ہے۔ استاد کو یہ شکایت رہتی ہے کہ اس کی دماغ سوزیوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور شاگرد کا یہ گلہ کہ اسے کام کی باتیں نہیں بتائی جائیں۔

غرضیکہ انہی غلط فہمیوں کے سبب ہر وہ نوجوان جو تازہ زندگی کی دہلیز پر کھڑا ہوتا ہے مدرس کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے۔ مگر کیا گوکھلے اور شاستری کی مثال پیش نظر رکھ کر بھی ہچکچانے کی ضرورت ہے؟ کیا ان لوگوں نے معمولی حیثیت کے اساتذہ کی سی زندگی نہیں شروع کی تھی؟ اور کیا انہوں نے اپنی غیر معمولی قابلیتوں کے لئے نئی راہیں نہیں ڈھونڈ نکالیں؟ کیا انہوں نے وہ سب کچھ حاصل نہیں کیا جو اس دنیا میں حاصل کیا جا سکتا ہے؟ کیا وہی شاستری جو کبھی ایک دیہاتی مدرسہ کی معمولی جماعتوں میں مدرس کی حیثیت سے بک بک کیا کرتا تھا آج دنیا کے پانچ مشہور ترین مقرروں میں سے نہیں ہے؟ کبھی وہ بے سمجھ بچوں کو سبق پڑھایا کرتے تھے اور آج چوٹی کے مدبروں کے لئے درس حکمت چھوڑ گئے — کیا ابتدا تھی اور کیا انتہا۔

تعلیم ختم کرکے وہ میونسپل ہائی اسکول مایاورم میں ملازم ہوگئے۔ بعض اور مدارس میں بھی مدرس رہکر وہ بالآخر ۱۸۹۹ء میں ہندو ہائی اسکول ٹریپلیکین کے صدر مدرس ہوگئے۔ مدرس کی حیثیت سے ان کی ہر دلعزیزی کا سبب زیادہ تر ان کا برتاؤ تھا۔ وہ لڑکوں سے اس طرح ملتے تھے گویا کہ وہ ان کے نوجوان دوست ہیں۔ ان کے ساتھ ملنا جلنا رہنا سہنا اور کہنا سننا سب اسی طرح تھا کہ رعونت اور حکومت کا کوئی شائبہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ تفریحی سفر میں ان کے ساتھ ساتھ کھیل کود میں شریک۔ انجمنوں اور اداروں میں برابر کے حصہ دار۔ غرضکہ لڑکوں کے ساتھ وہ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ طلباء انہیں اجنبی خیال نہ کرتے تھے مگر یہ سب کچھ کلاس کے باہر تھا اور جماعت کے اندر ان کا ضبط ضرب المثل کی حد تک مشہور تھا۔ اپنے فرائض کو انہوں نے دو حیثیتوں میں تقسیم کر لیا تھا ایک تو جماعت کے باہر اور دوسری جماعت کے اندر۔ جماعت کے اندر وہ ایک سخت گیر اور اصول کے پابند استاد تھے اور جماعت کے باہر وہ ایک ملنسار، خلیق اور ہمدرد مصاحب۔

سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں شرکت

صدر مدرسی کے زمانہ میں شاستری نے گوکھلے سے روحانی تعلق پیدا کیا اور یہ دلچسپی روز بروز بڑھتی گئی بالآخر ۱۹۰۶ء میں اسی جذبۂ خلوص کے تحت انہوں نے سرونٹس کے سلسلہ میں گوکھلے کے سوانح حیات لکھے۔ ان ہی دنوں گوکھلے اپنے کام کی اشاعت کے سلسلہ میں مدراس آئے اور لوگوں کو ملک اور قوم کی خدمت کے لئے آمادہ کرنے لگے۔ شاستری

کے سینہ میں جو چنگاری عرصے سے دبی ہوئی تھی دفعتاً شعلہ کی صورت میں بھڑک اٹھی اور انہوں نے عزم صمیم کر لیا کہ گوکھلے کا ساتھ دینگے چاہے انہیں کتنی قربانیاں ہی کیوں نہ دینی پڑیں۔ ۱۹۰۶ء میں سوسائٹی کے رکن ہو گئے۔ ان کے اس ایثار کا اعتراف اس طرح کیا گیا:-

"شاستری کی غیر معمولی شریف قربانیوں پر کبھی پردہ نہیں ڈالا جا سکتا انہوں نے اس وقت ایثار سے کام لیا جبکہ یہ صفت عنقا نہیں تو کمیاب ضرور تھی اور تفتیش کے مطابق بھی یقیناً نہ تھی جس مستعدی اور گرمجوشی کے ساتھ انہوں نے سوسائٹی کے لئے چندہ فراہم کیا ہے وہ انہیں کے حوصلہ کا کام تھا۔ چندہ کی ہر قسط کے ساتھ ان کی رگوں میں نیا خون دوڑتا تھا اور وہ کمر پہلے سے زیادہ چست کس لیتے تھے۔"

۱۹۰۷ء میں شاستری نے ملک کی ضروریات کا مطالعہ شروع کیا اور پانچ سال کے عرصہ میں ہندوستانی ماحول پر انہیں اتنی قدرت حاصل ہو گئی کہ سارے تاریک و روشن پہلو ان کی نظروں کے آگے محتاج توجہ نظر آئے۔ دراصل یہی وہ زمانہ تھا جبکہ شاستری اپنے اندر عزم صمیم اور خلوص عظیم پرورش کر رہے تھے۔ اس کے بعد جب انہوں نے میدان عمل میں پہلا قدم بڑھایا تو ان کے آگے ترقی کی راہ کھلی پڑی تھی اور کوئی سنگ گراں ایسا نظر نہ آتا جو ان کے اور منزل مقصود کے درمیان حائل ہو۔

مدراس یونیورسٹی اور مدراس لیجسلیٹو کونسل میں

۱۹۱۰ء میں وہ مدراس یونیورسٹی کے فیلو منتخب ہوئے اور سنہ ۱۹۲۰ء تک یہ اعزاز مسلسل باقی رہا۔ ۱۹۱۳ء میں مدراس لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بنائے گئے۔ کونسل میں وہ آپ کو تعلیمات کا نمائندہ خیال کرتے تھے۔ سرسی پی راج گوپال چاری جنکی اس وقت کونسل میں دھوم تھی شاستری کے مقابل میں بے زبان نظر آنے لگے۔ آنریبل ایف۔ ایچ۔ ایم۔ کارٹ جو کبھی ایڈوکیٹ جنرل بھی تھے انکے مباحثوں کے متعلق کہتے ہیں:-

"شاستری کی شخصیت میں ہمیں ایک ایسی ہستی نظر آتی جس پر ہماری قانون سازی بجا طور پر فخر کر سکتی ہے سب سے زیادہ خوشی مجھے کونسل میں اسوقت ہوتی ہے جب میں انہیں بحث کرتے سنتا ہوں۔ انکی منطق زور بیان طرز کلام اور سب سے زیادہ ان کا وہ مخصوص انداز کہ ہاری ہوئی بحث پر مسکرا دینا قابل رشک ہے۔ وہ اپنی بات پر اصرار کرتے ہیں لیکن اس میں ناکام ہو کر کھسیانے نہیں ہوتے۔ وہ کسی تحریک کی تائید کرتے ہیں تو آخر تک ڈٹے رہتے ہیں۔"

سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے صدر

گوکھلے کے انتقال پر ۱۹۱۵ء میں شاستری صدر منتخب ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ گوکھلے کے بعد صدارت کا لبادہ سوائے ان کے قدر دانوں کے کسی اور جسم پر زیب دیتا ہی نہ تھا۔ شاستری کے انہماک نے لوگوں کو یہ محسوس تک ہونے نہ دیا کہ اس سوسائٹی کا اتنا بڑا رکن اس سے علیحدہ ہو گیا۔ ان کی اس کارگزاری پر بارہا اراکین نے انہیں دائمی صدر منتخب کیا لیکن ہر دفعہ انہوں نے یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کیا کہ انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں یہ اعزاز انہیں سست نہ کر دے۔

امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں

امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کا جب سوال پیدا ہوا تو مدراس کونسل سے بعض اور امیدوار مقابلہ پر اتر آئے۔ کچھ لوگوں نے شاستری کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا کہ ان کی تقاریر اکثر و بیشتر مواقع پر ہوم رول کے سلسلہ میں ضرورت سے زیادہ آزاد لہجہ اختیار کر چکی ہیں یا یہ کہ اس کا بہت امکان ہے کہ شاستری کی زبان آئندہ بہت کچھ گل کھلائے گی لیکن کیا آفتاب خاک اڑانے سے چھپ سکتا ہے؟ نتیجہ الٹا ہوا اور نامور اور تجربہ کار امیدواروں کو ان کی توقع کے خلاف ناکامی ہوئی اور شاستری کو حیرت ناک حد تک کامیابی۔ شاستری کے طرفداروں کو ان کی تقریروں پر بھروسہ تھا اور ظاہر ہے کہ انکی توقعات بے جا نہ تھیں۔ کونسل میں جس کی زبان چلتی ہے اسی کا طوطی بولتا ہے۔ جس بحث میں انہوں نے حصہ لیا اس کو چمکا دیا جسکی طرفداری کی اسکو منظور کروا کے چھوڑا اور جسکی مخالفت پر اتر آئے اس سے سامعین کو متنفر کر دیا۔ ان کی وہ شہرۂ آفاق تقریر جو "رولٹ بل" کے سلسلہ میں کی گئی تھی ایک تاریخی یادگار ہے اور جس نے بھی سنی دشمن ہو کہ دوست مسحور ہو گیا۔ دوران تقریر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حاضرین کو سانپ سونگھ گیا ہے ان کی پھٹی ہوئی آنکھوں اور کھلی ہوئی باچھوں سے بیخودی کا ایک عجیب عالم پیدا ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے انگریز عہدہ دار اور گورنمنٹ کے زیادہ سے زیادہ طرفدار بھی تقریر کے اختتام پر پرجوش تالیوں کی گونج پیدا کرنے پر مجبور ہوئے۔

کانگریسی کی حیثیت سے

کانگریس کو ضرورت تھی ایک بلبل ہزار داستاں کی، ایک آتش نفس مقرر کی، ایک سحر آفریں نغمہ سنج کی تاکہ پروپیگنڈا ہو سکے۔ اسکے اغراض و مقاصد لوگوں میں ہر دلعزیز ہو سکیں۔ اس اہم خدمت کیلئے شاستری سے زیادہ کوئی اور موزوں ہو سکتا تھا یا نہیں اس کا فیصلہ ۱۹۱۷ء میں اسوقت ہوا جبکہ وہ بمبئی کی صوبہ وار کانفرنس کی ناسک میں صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے جو خطبہ پڑھا وہ کانگریس کی تاریخ میں ایک یادگار رہے گا۔ کوئی فرقہ، کوئی طبقہ اور کوئی مکتب خیال ایسا نہ تھا جو اس خطبہ کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتا ہو۔ انہوں نے کہا:-

"میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگتا ہے جب میں اس "سلف گورنمنٹ" کی تحریک کا خیال کرتا ہوں جو نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ نے متحدہ طور پر

"لکھنؤ کے پیکٹ میں طے کی تھی ایک ہندوستانی آنکھ کی نظروں کے آگے وہ منزل دکھائی دیتی ہے جس تک پہنچنے کی کوشش میں کئی پشتیں درگور ہو چکی ہیں۔ برطانوی پرچم کے سایہ میں سلف گورنمنٹ کا حصول اور برطانیہ عظمیٰ کا اپنا خود مختار صوبہ کہلانا ـــ کیا یہی وہ مدعا نہیں ہے جسکی تگ و دو میں ہم مصروف ہیں؟ کیا اس کے حصول سے مغرور سے مغرور ہندوستانی کی خواہشات پوری نہ ہونگی؟ میں اپنے ساتھیوں کی خوش بختی خیال کرتا ہوں کہ ان کے دور میں ہندوستان ایک نیا جنم لینے والا ہے۔ نوجوانو! وہ دن دور نہیں کہ ہندوستان کی تاریخ کا صفحہ الٹنے والا ہے اور ایک نیا باب جو زریں حروف میں لکھا جائیگا تمہاری نظروں کے آگے آئیگا۔ تمہارے حسن رأی نے جو بیج بو دیا تھا اب وہ ایک تناور درخت کی شکل میں لہلہا رہا ہے۔"

۱۹۱۸ء کے "مانٹیگو چیلمسفورڈ اسکیم میں حق رائے دہی" کی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے شاستری نے سر سریندر ناتھ بانرجی کا ساتھ دیا اور اس سلسلہ میں جو کچھ حاصل ہوا وہ ان ہی دونوں ہندوستانی نمائندوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ۱۹۱۹ء میں یہ اصلاحات کے سلسلہ میں گفت و شنید کرنے کے لئے ہندوستانی نمائندے مقرر ہو گئے اور انگلستان میں انہوں نے جو تقریریں کیں وہ ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جو آسانی سے نہیں بھلایا جا سکتا لیکن عجب اتفاق دیکھئے کہ جب یہ ہندوستان واپس ہوئے ہیں تو ملک کا بیشتر طبقہ اصلاحات کے خلاف ہو گیا۔ اس کا سبب شاید کانگریس کا پروپیگنڈا تھا لیکن شاستری کو اب بھی امید تھی کہ ان کی کوششوں سے کوئی سمجھوتہ ہو سکیگا اسلئے انہوں نے کانگریس سے استعفا نہیں دیا بلکہ اصلاحات قبول کرنے کی ترغیب دی مگر ساری کاوشیں بے سود ثابت ہوئیں۔

کونسل آف اسٹیٹ میں

۱۹۲۰ء میں انہیں کونسل آف اسٹیٹ کا رکن نامزد کیا گیا۔ یہاں انہوں نے جو کار نمایاں کئے اس کی بنا پر عام طور پر انہیں کونسل کا لیڈر سمجھا گیا۔ پریس ایکٹ اور رولٹ ایکٹ کے بارے میں انہوں نے جو دلچسپی لی اور جس زور بیان سے جو اثرات پیدا کئے وہ ایسے نہ تھے کہ ان قوانین کی نوعیت پر اثر انداز ہوئے بغیر رہ سکتے۔

امپیریل کانفرنس

۱۹۲۱ء میں شاستری ہندوستان کے نمائندہ ہو کر امپیریل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان گئے اپنی چرب زبانی اور طراری سے انہوں نے جو فائدہ اس کانفرنس میں اٹھایا اس کا اندازہ انکی شرکت سے پہلے بہت کم لوگوں نے کیا تھا۔ مملکت برطانیہ میں ہندوستانیوں کی فلاح و بہبودی کے جن طریقوں پر انہوں نے زور دیا اور ہندوستانیوں کے حقوق کی طرف جس طرح انہوں نے توجہ دلائی وہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔

ان کی تقریروں نے جو اثر برطانیہ اور مملکت برطانیہ کے نمائندوں پر کیا اسکا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہو سکیگا۔

"مسٹر شاستری کی تقریریں ابتدائی نشستوں میں مختصر سی تھیں لیکن رفتہ رفتہ ان کی طرز گفتگو کا اثر بڑھتا گیا اور لوگوں میں دلچسپی پیدا ہوتی گئی۔ خطابت کا کمال انہوں نے اسوقت دکھایا جبکہ ایک اہم نشست میں انہیں مقرر خصوصی بنایا گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے کامل دو گھنٹہ تک تقریر کی، ساری تقریر ان ہندوستانیوں کے حالات پر مشتمل تھی جو نٹال اور جنوبی افریقہ میں بس گئے ہیں انکی تکالیف کو دور کرنے۔ انکو شہریوں کو حقوق دینے اور انکے ساتھ مساویانہ سلوک کرنے پر خاص زور دیا تقریر اتنی طویل طویل اور انگریزوں کی ذہنیت اور رجحان کے خلاف ہونیکے باوجود بھی اتنی دلچسپی سے سنی گئی کہ کوئی تقریر اس کانفرنس میں اسکے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکی۔ لائیڈ جارج کو بہت ضروری کام کاج تھے اور وہ محض رسماً کانفرنس کی اس نشست میں چلے آئے اور ان کا قطعی ارادہ تھا کہ دس پندرہ منٹ بعد چلے جائیں لیکن کامل دو گھنٹہ تک انہیں واپس جانے کا خیال تک نہیں آیا۔ واپس جاتے وقت انہوں نے کہا اگرچہ میرے ضروری کام خراب ہو گئے لیکن میں خوش ہوں کہ میرا وقت اچھا گزرا۔"

جمعیت اقوام میں

ستمبر ۱۹۲۱ء میں شاستری نے جمعیت اقوام میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقع پر جو تقریر انہوں نے کی اس کے متعلق اہل الرائے متفق ہیں کہ وہ فن خطابت کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ تھا۔ ایسے مجمع میں جہاں قوموں کے منتخب دماغ ہوں اور ملکوں کے بہترین نمائندے وہاں بڑے بڑوں کی زبانوں میں لکنت پیدا ہو جاتی ہے مگر شاستری ایسے موقعوں پر اپنے کمال کی نمائش زیادہ ہی زیادہ کرتے ہیں۔

اتفاق دیکھئے کہ اس لسان الہند کو موقع اس نشست میں دیا گیا جبکہ ساری دنیا کے نمائندے اپنے مطالبات پیش کر چکے تھے اور جلسہ برخاست ہونے ہی والا تھا۔ اس آخری موقع پر جبکہ لوگوں کے دماغ تھکے ہوئے ہوں اثر پیدا کرنا ایسا نہ تھا کہ ہر شخص کے بس کا ہو جب تک "نہ بخشد خدائے بخشندہ"۔ شاستری جب تقریر کیلئے کھڑے ہوئے تو کچھ لوگ باہر چلے گئے اور بہت سے تبرکاً دو چار جملے سن کر چلے جانا چاہتے تھے مگر سفید صافہ اور کالی ابروؤں کے نیچے چمکنے والی ہندوستانی آنکھوں نے لوگوں کی اس بے چینی کا اندازہ کر لیا اور پہلا ہی جملہ اس انداز میں شروع کیا کہ لوگ اس کو نغمۂ ہوش ربا سمجھنے

گئے۔ ایک جلسہ کے بعد دوسرے جلسہ کے لئے لوگ ایسے منتظر تھے کہ جیسے انکی زندگیوں کے حصہ [illegible] بغیر حل ہی دھرے تھے۔ ایک مشہور اخبار کا نامہ نگار لکھتا ہے۔

> جلسہ برخاست ہونے سے پہلے ایک شخص مشرقی لباس میں سفید صافہ باندھے منظر عام پر آیا لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ ہندوستان کا یہ برہمن بین الاقوامی سیاست اور تدبر کے متعلق کیا خاک کہیگا۔ مہذب اقوام کے متمدن نمائندوں نے نہایت اخلاق کے ساتھ جو دوسرہ ابتدا میں برتا وہ ایسا تھا کہ ایک غیر مہذب سے غیر مہذب شخص بھی محسوس نہ کرتا۔ لیکن ابتدائی چند جملے ایسے تھے جیسے رباب کے شیریں نغمے۔ ہر شخص مسحور ہو گیا۔ یا تو وہ مجمع کی بے چینی تھی یا اب یہ عالم تھا کہ گویا سانپ سونگھ گیا ہے۔ پرشکوہ الفاظ ایک کے بعد ایک تلے جملوں میں کچھ اس طرح ادا کئے گئے کہ زبان و بیان کا لطف بھی ہو گیا۔ تقریر ختم ہوئی تو بڑی دیر تک تالیاں اتنی بجتی رہیں کہ اس سے پہلے اس جلسہ میں کبھی نہیں بجی تھیں۔ تقریر ختم ہو چکی تھی لیکن اسکے نغمے ابھی سننے والوں کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ایسا اتفاق کم ہوا ہے کہ مشرق کے نغموں نے مغرب کو بالکل ہی مسحور کر لیا ہو۔ لوگوں نے عام طور پر یہ تسلیم کیا کہ مشرق نے آج مغرب کو اسکے اپنے میدان میں پچھاڑ دیا۔"

اور یہاں شاستری نے کیا کہا (۳) ساری تقریریں؟ اول یہ کہ جمعیت اقوام کی اہمیت کا اقرار اور ہندوستان کا اس سے اخلاص دوم یہ کہ ہندوستان کو جمعیت کی معتمدی میں برابر کی نمائندگی کا حق اور اس کی صنعتی اور حرفتی طاقت کا اعتراف اور آخر میں ایک صدائے احتجاج اس غیر مساویانہ سلوک کے خلاف جو ہندوستانیوں کے ساتھ مملکت برطانیہ میں کیا جا رہا ہے۔

واشنگٹن کانفرنس

واشنگٹن میں جب تقلیل اسلحہ کی کانفرنس ہوئی تو ہندوستانی نمائندگی کا بار شاستری کے کندھے پر ڈالا گیا حقیقت یہ ہے کہ ان سے بہتر شخصیت ایسے موقع کیلئے اور کوئی موزوں نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ صرف ان کی لسانی قوت سے امریکی محفل میں مشرق بالخصوص ہندوستان کی پستی کا جو قلعہ تعمیر ہو رہا تھا مسمار ہو گیا بلکہ ان کی مدبرانہ قابلیت کا لوہا بھی ان کے سلجھے ہوئے خیالات نے منوا لیا جسطرح لندن میں انہوں نے اپنا سکہ جمایا اسی طرح واشنگٹن کانفرنس کے نمائندوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ ایک مقامی اخبار "ایوننگ اسٹار" نے لکھا:-

> وہ بہترین انگریزی بولتے ہیں۔ ان کی صاف اور موثر آواز دلوں کو گرماتی ہے اور ہندوستانی شخصیت پر سادہ لباس تا محور دس

کھب جاتا ہے۔ ان کے شاندار قدوقامت اور سفید ریشم کا صافہ آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔

مشہور ادیب مسٹر ایلمر ڈیوس نے نیویارک ٹائمس میں برطانوی ہند کا نمائندہ انہی بے باک اور بہترین تقریروں کی بنا پر "تعجب خیز منظر پیدا کرتا ہے" کے عنوان کے تحت لکھا۔

> " برطانیہ کے ایک اور نمائندہ کا تعارف کرانا میرا خوشگوار فرض ہے۔ ان کا نام مسٹر سری نواس شاستری ہے اور یہ ہندوستان کے باشندے ہیں جو پہلی دفعہ امریکہ میں منظر عام پر آئے اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہم آئندہ انہیں زیادہ دیکھیں گے انہوں نے اس جلسہ میں دو مرتبہ تقریریں کیں اور ان لوگوں کو جو سمجھ رہے تھے کہ یہ برطانوی ہند کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے اپنی حکومت ہی کی آواز دہرائینگے بڑی حد تک مایوسی ہوئی وہ ہندوستان کے لئے "سلف گورنمنٹ" چاہتے ہیں اور وہ اتنے بزدل نظر نہیں آتے کہ اپنے اس خیال کو چھپائیں۔ مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک ہی دن میں ہندوستان کی کایا پلٹ دینا چاہتے ہیں۔ وہ ایک صاحب دماغ مدبر ہیں شورش پسند انقلابی نہیں۔ وہ انگریزی اتنی اچھی بولتے ہیں کہ برطانیہ کا یا امریکہ کا کوئی نمائندہ اس جلسہ میں ان کی برابری نہیں کر سکا۔"

یہ ظاہر ہے کہ شاستری نے اس کانفرنس میں اپنی زبان کے جوہر دکھا کر ساری دنیا میں اپنی شہرت کا ڈنکا بجا دیا اور یہیں سے وہ دنیا کے بہترین خطیبوں میں شمار ہونے لگے۔

بمبئی کی صوبہ وارانہ لبرل کانفرنس

ہندوستان کا نام روشن کر کے شاستری [illegible] میں واپس ہوئے۔ کونسل آف اسٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی کے ارکان نے ان کا بہت پرتپاک خیر مقدم کیا۔ بمبئی کی صوبہ وارانہ لبرل کانفرنس نے خطبہ صدارت پڑھنے کیلئے مدعو کیا۔ سیاست کیلئے یہ بڑا ہی آشوب زمانہ تھا۔ گاندھی کو قید کر لیا گیا تھا اور ملک میں ایک انتشار سا تھا۔ شاستری نے ایسی نازک حالت پر قابو اس طرح پایا کہ لیجسلیٹو اسمبلی کے ذریعہ حکومت کے آگے "سلف گورنمنٹ" کی تحریک پیش کرا دی اور اسپر ہر طرف سے اتنا زور ڈلوایا کہ بالاخر اس پر غور و خوض کرنے کے لئے برطانوی کابینہ میں بارہ باثر ہندوستانیوں کو انگلستان بھیجا گیا۔

تحریک عدم تعاون

اسی خطبہ میں شاستری نے تحریک عدم تعاون کی ناکامی پر بہت افسوس کیا کہ کس طرح بالواسطہ

یا بالواسطہ تقریباً بیس ہزار افراد اس کی زد میں آ گئے مگر اس کی تحریک کے نتائج کو واضح کرتے ہوئے یہ بھی صاف کر دیا کہ اس تحریک کے بانی مہاتما گاندھی ان بربادیوں کے ذمہ دار نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ کیونکہ ان کی شخصیت مجسمہ خلوص ہے اور ان کا ارادہ سودیشی تحریک کو عام کرنا اور سوراج کے امکانات کو قریب سے قریب تر کرنا تھا۔ باوجود اسکے کہ شاستری نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ تحریک کی کامیابی محرک کے خلوص اور نیک نیتی پر حرف نہیں لا سکتی مگر پھر بھی بعض تنگ نظر اشخاص ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے لگے۔ شاستری کے ذہن میں کھوٹ نہ تھا اسلئے انہوں نے اسکی پرواہ نہ کی بلکہ دستوری اصلاحات کی بابہتر طرفداری کرتے رہے اور ملک کا ایک غیر جانبدار طبقہ ان کے ساتھ ہو گیا۔

امپیریل مشن

لندن کی امپیریل کانفرنس میں شاستری نے جو شہرت حاصل کی اسی بنا پر نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور کینیڈا کے دورہ کیلئے انہیں دعوتیں دیں۔ حکومت برطانیہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ تجویز کی کہ ایک وفد برطانیہ عظمیٰ کے نوآبادیاتی ممالک کو انکی صدارت میں بھیجا جائے۔ انکے اعزاز کی خوشی میں مختلف انجمنوں نے انہیں دعوتیں دیں لیکن سب سے زیادہ نمایاں ضیافت وائسریگل لاج کی تھی۔ وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ نے وائیکاؤنٹ پیل کا جو اسوقت سکریٹری آف اسٹیٹ تھے تہنیت نامہ سنایا اور اسکے بعد خود اس وفد کی کامیابی کی تمنا کی۔ شاستری نے جو جواب اس موقع پر دیا وہ عام طور پر ایسی تقریبوں میں نہیں سنا جاتا۔

جو پیغام کہ شاستری نے ان ممالک کو پہنچایا اسکے متعلق ایک ذمہ دار ہستی مسٹر پولاک کا بیان ہے۔

"مسٹر شاستری ان چند افراد میں سے ہیں جو نوآبادیات کے پیچیدہ اور اہم مسئلہ پر پوری قدرت کے ساتھ بحث کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنا لوہا ان سے منوایا جو اس مسئلہ پر شاستری سے بیر یا مقابلہ رکھتے ہیں بلکہ باوجود اس قابل تدبر اور تفکر و غور کے اپنی ہٹ دھرمی اور ضد سے مزید الجھنوں میں مبتلا کرتے تھے۔ میں نے یہ خیال اٹھارہ سال تک اسی قسم کے افراد کے ساتھ بسر کرنے کے بعد قائم کیا ہے۔ یقیناً یہ کارگذاری شاستری کو ایک بہت بلند پایہ مدبر بنا سکتی ہے۔ اسکے علاوہ انکا ایک غیر معمولی اعزاز بھی یہاں قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ انکا بیان سرکاری ملاقاتوں میں بلا کم و کاست اور بغیر احتساب کے قابل قبول سمجھا گیا۔"

پریوی کونسلر اور لندن کے شہری کا اعزاز

ملک معظم نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں پریوی کونسل کا رکن نامزد کیا اور اہالیان شہر لندن نے انہیں شہری حقوق دیئے۔ "گلڈ ہال" میں جو عشائیہ ترتیب دیا گیا

اس میں انہوں نے آزادی کے متعلق کہا:-

"تمدن، علم اور نیکی کی طرح آزادی بھی جتنی زیادہ دی جائیگی اتنی ہی زیادہ بڑھیگی جتنی دور تک وہ پھیلائی جائیگی اتنی دور تک اس کی خوشبو کی مہک پہنچیگی اور جس قدر تیزی کے ساتھ وہ ہر شخص تک پہنچائی جائیگی اسی قدر سرعت کے ساتھ وہ فائدہ پہنچائیگی۔ برخلاف اس کے جو حکومت یا شخصیت آزادی کو محدود کرنے کی فکر کریگی وہ ظاہر ہے کہ انسانیت کو شدید ضرب پہنچائیگی۔"

اس کے بعد انہوں نے برطانیہ کو انصاف کی طرف متوجہ کیا:-

"خواتین و حاضرین! وہ جو برطانیہ کے سایہ عاطفت میں آزادی کا سانس لے رہے ہیں جنکے حقوق کی نگرانی ایک طرف پارلیمنٹ کر رہی ہے تو دوسری طرف ان کا حق نمائندگی ان کی پشت پناہی ہوتی ہے کیا ان سے یہ توقع کیجا سکتی ہے کہ خود جس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اسی کو دوسروں کیلئے مضر خیال کریں گے۔ یا اس بخیل کی مثال قائم کریں گے جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ خود نقصان اٹھائے بغیر دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ محض طبیعت کے بخل کی وجہ سے انجان ہو جاتا ہے۔"

جنوبی افریقہ میں ایجنٹ

شاستری ایک عرصہ تک افریقہ میں ایجنٹ کی حیثیت سے رہ چکے ہیں اور وہاں ہندوستانیوں کے مفاد کیلئے انہوں نے جو کام کئے وہ ہر طریقہ سے قابل لحاظ ہیں۔ وہ ہندوستانی جو جنوبی افریقہ میں رہ بس گئے ہیں ان کو حقوق شہری دلانا اور ان کے ساتھ مساویانہ سلوک کی تجویز پر زور دینا ان کی نمایاں کوششیں ہیں۔

خصوصیات

شاستری مثل گوکھلے کے ان لیڈروں میں نہیں ہیں جو انتہا پسند ہیں۔ وہ یقیناً "سلف گورنمنٹ" مانگتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ہندوستان اب اس قابل ہو چکا ہے کہ اس کے کندھوں پر یہ بوجھ بلا تکلف رکھ دیا جائے مگر وہ آئینی۔ دستوری اصلاحی طریقوں کے طرفدار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے مہاتما گاندھی کی تحریک عدم تعاون کی مخالفت کی۔ مگر بعض دفعہ ان کا جوش و خروش انہیں آگے بھی بڑھا دیتا ہے چنانچہ "مانٹ ریال ریفارم کلب" میں انہوں نے کہا:-

"اب وقت آگیا ہے کہ برطانیہ ہندوستان پر سے اپنی سختیاں اٹھا لے۔ اگر برطانیہ چاہتا ہے کہ ہندوستان اس کی طاقت و قوت میں مزید اضافہ کرے تو یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ اسکو اپنے پہلو میں برابر کا رتبہ دے۔ وہ برطانیہ ہی کے جھنڈے کے نیچے رہنے پر تیار ہے لیکن ایک مساوی طاقت اور برابر کی مملکت کی حیثیت سے۔ اگر یہ مساویانہ برتاؤ نہ ہو سکا تو ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ برطانیہ سے الگ رہکر اپنی آزادی و حریت کی تدبیریں سوچنی پڑیں گی۔"

خطیب کی حیثیت سے شاستری کے حالات ان کی خطابت کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتے۔

اُن بالفعل عصرِ حاضرہ کے پانچ بہترین خطیبوں میں شمار کرتے ہیں۔ مسٹر فاس اسمارٹ آف اسپائر کا نقری زبان خطیب سمجھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر آف بائبل نے لارڈ ڈش سے کہا کہ وہ زبان کی خوبیوں سے اسوقت تک ناواقف تھے جب تک کہ انہوں نے شاستری کو نہ سنا۔ "ٹارنٹو" کے ایک اخبار نے لکھا تھا۔

"مسٹر شاستری کو شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس ہندوستانی کو انگریزی زبان پر کتنا غیر معمولی عبور ہے۔ نہ صرف انہیں الفاظ پر قدرت ہے بلکہ الفاظ بھی ان کے قبضہ میں ہیں اور یہی نہیں بلکہ ان سب سے بالاتر خیالات پر قابو رکھنا اور ان کو اسی طرح پیش کرنا جس طرح کہ وہ ان کے دماغ میں پیدا ہوئے تھے ان کا ایک ایسا کمال ہے جو دنیا کے بڑے بڑے خطیبوں کے لئے باعث رشک ہے"

انتقال ۱۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو شب کے نو بجکر پینتالیس منٹ پر اپنی قیامگاہ واقع میلاپور میں چھہتر سال کی عمر میں انتقال کیا۔

لندن کی نشرگاہ

زمین اپنے محور پر گھومتی اور ایک خاص حلقہ میں سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔ لندن سے سمندر پار ملکوں کے لئے خبریں نشر کرنے کے سلسلہ میں اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ جب لندن میں گرمی کا موسم ہوتا ہے تو کرۂ ارض کے دوسرے حصوں میں سردی ہوتی ہے، ایک جگہ دن ہوتا ہے تو دوسری جگہ رات، دن ہو یا رات مرد اور عورتیں برابر کام کرتی رہتی ہیں اور زندگی کے دوسرے مشاغل میں معروف رہتی ہیں۔ غرض زندگی بدستور جاری ہے۔ دنیا کے ہر حصہ میں اخبار نویس اور مستری بھی کام کرتے ہیں۔ نامہ نگار اپنے اداروں کو خبریں فراہم کرتے ہیں۔ تاروں میں آواز پیدا ہوتی ہے، ریڈیو کی مشینیں چلتی ہیں اور وسیع فضا میں آوازوں کی لہریں دوڑتی رہتی ہیں۔ خبریں دن رات آتی رہتی ہیں لیکن یہ خبریں حاصل کرکے دنیا کے اہم واقعات کیسے معلوم کئے جاتے ہیں؟ لوگ ریڈیو کے ذریعہ لندن کی خبریں سنتے ہیں، لندن سے مانوس مکالمہ اور جلد سمجھ میں آنے والی آواز سنائی دیتی ہے۔ آخر صاحب آواز ساری دنیا کے اہم واقعات سے ہمیں چوتھائی گھنٹہ میں کیسے مطلع کرسکا؟

صبح کو ایڈیٹروں کی کانفرنس ہوئی۔ یہ دن کے نہایت اہم کاموں کا موقع ہے۔ خبریں تمام دن آتی رہتی ہیں اور اسی طرح برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن (بی بی سی) کا کام بھی چوبیس گھنٹے جاری رہتا ہے مختلف قسموں کی خبریں موصول ہوتی ہیں۔ دنیا کے ہر گوشے سے خبریں آرہی ہیں اور ان کے نشر کا طریقہ بھی بن رہا ہے۔ آپ نے ایسا کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ اگر ٹائمز کی خاص سرخی چین کے قحط کے بارے میں ہے تو ڈیلی ٹیلیگراف کی اسکاٹ لینڈ میں ریلوے کے حادثے کے متعلق اور ڈیلی ایکسپریس نے روس کے سیاسی واقعات کو زیادہ اہمیت دی ہو۔ چاہے سب اخباروں میں یہ خبریں موجود ہوں۔

صبح کے وقت ایڈیٹر کے کمرے میں جمع ہونے والے لوگ بھی اسی طرح متفق ہوتے ہیں۔ خبر کی اہمیت سمجھنے کے لئے ایک ملکہ کی ضرورت ہے جسے چھٹا ملکہ کہتے ہیں لیکن یہ تو صحافت کی اصطلاح ہے۔ دراصل خبروں کی اہمیت کا اندازہ کسی خاص ملکہ سے نہیں بلکہ معمولی سمجھ بوجھ سے لگایا جاتا ہے۔ ایڈیٹروں کی کانفرنس کے سارے افراد جانتے ہیں کہ انہیں اٹلی، روس، مشرق بعید، امریکہ، یورپ اور سلطنت برطانیہ کی خاص خبروں کے متعلق فیصلے کرنے ہیں۔ مگر ایک ہی خبر سے متعلق ان کا کام مختلف ہوسکتا ہے مثلاً اگر ایڈیٹر بحیرۂ روم کی خبر کا ذکر کرتا ہے تو ڈیوٹی ایڈیٹر اس سلسلہ میں صبح تک کے واقعات بیان کرتا ہے۔ ذمہ داری تو ساری ایڈیٹر ہی کی ہوتی ہے مگر وہ چوبیس گھنٹہ حاضر رہ کر خود کیسے فیصلہ کرسکتا ہے لہٰذا ایسے ڈپٹی ایڈیٹر مقرر کرنے ہوتے ہیں۔ چوبیس گھنٹہ میں چار ڈپٹی ایڈیٹر کام کرتے ہیں۔ تین آٹھ آٹھ گھنٹہ کام کرتے ہیں اور ایک کی چھٹی رہتی ہے۔ اس لئے ڈپٹی ایڈیٹر خبروں سے واقف ہوتا ہے اور جب وہ کانفرنس میں خبریں بتاتا ہے تو ایڈیٹر فیصلہ کرتا ہے کہ ان خبروں کو کس پیرایہ میں نشر کیا جائے۔ بحیرۂ روم ہی کی خبر کو لیجئے وہ بتلائے گا کہ اسے سب سے پہلے رکھا جائے یا اس کے ایک حصہ پر زیادہ زور دیا جائے تاکہ سننے والوں کے سامنے دونوں رخ آجائیں یا اسے دوسری خبروں سے کم یا زیادہ اہم سمجھا جائے۔

ڈپٹی ایڈیٹر کا کام محض بلیٹنوں کے متعلق اظہار خیال کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ایک خبروں کے متعلق تقریروں کا ایڈیٹر بھی ہوتا ہے۔ یہ اخبار کے میگزین یا فیچر کے ایڈیٹر کی طرح ہوتا ہے اور ایسی تقریریں کرتا ہے جو خبروں کی تفصیلات بیان کریں۔ وہ کانفرنس میں سوال کرسکتا ہے کہ کیا کریٹ کے متعلق تقریر کرائی جائے۔ ایک شخص ابھی بحیرۂ روم سے ہوائی جہاز کے ذریعہ مجھ سے ملنے آیا ہے۔ وہ بہت اچھی تقریر کرے گا اور پھر اس کی آواز بھی اچھی ہے۔

تبصرہ کے ایڈیٹر کا کام کسی قدر مختلف ہے۔ اخبار پڑھنے والے کی طرح اسے بھی کبھی کبھی خبریں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس سے وہ واقعات عالم کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے اخباروں کے ایڈیٹوریل پڑھتا ہے۔ بہت سے لوگ بلیٹن سننے کے بعد خبروں پر تبصرہ سن کر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کونسی خبریں زیادہ اہم ہیں۔ اس طرح تبصرہ سے ایک ایسا پس منظر قائم ہوجاتا ہے جو محض بلیٹن سن کر قائم کرنا مشکل ہے۔ ایڈیٹروں کی کانفرنس میں یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ کن موضوعات پر تبصرہ کیا جائے۔ خاص علاقوں کی خبروں کے انچارج اپنے سامعین کی ضروریات کا آسانی سے پتہ چلا لیتے ہیں۔ جب ہر شخص یہ جان جاتا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے تو مجلس برخاست ہوجاتی ہے اور تجویز یا قوں پر عملدرآمد شروع ہوجاتا ہے۔

ایڈیٹر دن بھر کام میں مصروف رہتا ہے۔ وقتاً فوقتاً اس سے

ستیاپال

خاص خبروں کے متعلق مشورہ کیا جاتا ہے۔ وہ کنٹرولر کی میٹنگ میں بھی جاتا ہے جہاں اس کے اور بی بی سی کے دوسرے محکموں کے کام میں تناسب قائم کیا جاتا ہے۔ اسے اپنے محکمہ کے نظام کے ہر پہلو کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ وہ سمندر پار کے بحری ماہروں کو پڑھتا ہے جن میں سے کچھ نہایت مفید معلومات فراہم کرتے ہیں اور کچھ محض تمہیدی ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے اور ٹیلیفون پر باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ یہ کام پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا کہ شام آ پہنچی یہ دن بھر کے کام کے متعلق دوسری بڑی کانفرنس کا وقت ہے۔

خبروں کے کمرے کا اچھی طرح معائنہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ خبروں سے متعلق تقریروں کا ایڈیٹر کیا کرتا ہے۔ اس کی زیادہ توجہ اس پروگرام پر صرف ہوتی ہے جسے دنیا "ریڈیو نیوزریل" کے نام سے جانتی ہے۔ یہ چوبیس گھنٹہ میں آدھے گھنٹے کے تین پروگرام ریڈیو کے تمام ذرائع سے حاصل ہونے والی خبروں کو مفصل بیان کرتے ہیں۔ سمندر پار کے نامہ نگاروں کی خبریں جو بلیٹن میں بھی استعمال ہوتی ہیں، نیوزریل میں اس طرح پڑھی جاتی ہیں گویا خود نامہ نگار سنا رہے ہیں۔ خبروں کے متعلق تقریروں کا ایڈیٹر، ایڈیٹروں کی کانفرنس سے اپنے عملہ کے پاس جاتا ہے جو نامہ نگاروں سے حاصل ہونے والی خبروں پر غور کرتے ہیں اور دن کی خبروں کو قاعدہ میں نشر کرنے کے متعلق سوچتے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ امریکہ کا ایک مشہور شخص آیا ہے۔ اسے ایک مختصر تقریر نشر کرنے یا یونہی باتیں کرنے کے لئے مدعو کرنا چاہئے۔ اس طرح اگر قصر بکنگھم میں عطائے خطاب کی رسم ادا کی جارہی ہے یا شہر میں کوئی تاریخی جشن ہے یا وزیر خوراک کے دفتر میں کوئی بڑی کانفرنس ہے یا کسی عوامی مظاہرہ کے لئے کوئی بڑا ہال سجایا گیا ہے یا ملک کے کسی گوشے میں پولستانی موسیقی کی محفل ہے تو وہاں ریکارڈ بھرنے والے کو بھیجا جاتا ہے جہاں وہ کسی اونچی جگہ بیٹھ کر ریکارڈ تیار کرتا ہے۔

جب چیف سب ایڈیٹر خبریں پڑھ لیتا ہے تو وہ ان پر دستخط کرکے پڑھنے والے کے حوالے کرتا ہے۔ اس کے بعد خبریں پڑھنے والا ان کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ سب ایڈیٹر سے یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے "اگر یہ یوں لکھا جائے تو بہتر نہ ہو جائے گا اس سے آپ کی بات بھی جوں کی توں رہے گی اور مجھے پڑھنے میں بھی آسانی ہو جائے گی"۔ سب ایڈیٹر اس سے اتفاق بھی کرسکتا ہے اور اختلاف بھی۔ اگر ضروری سمجھا گیا تو جملہ تبدیل کیا جائے گا۔ یہ بلیٹن سنانے کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ پڑھنے کیلئے اور خبریں سنانے والا ہی صحیح رائے قائم کرسکتا ہے کہ کس چیز کے نشر کرنے میں سہولت رہتی ہے۔ دوسروں کے مقابلہ میں اسے فقرے بدلنا بھی بہتر آتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی صوتی قابلیت کا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔

برما کی لڑائی میں ایک نیا نام آتا ہے۔ وہ تلفظ کے ماہرین کو ٹیلیفون کرتا ہے۔ جو برمی زبان کے ماہرین کو وزارت اطلاعات میں ٹیلیفون کرتے ہیں اور اس طرح دو منٹ میں صحیح تلفظ معلوم ہو جاتا ہے۔ خبریں پڑھنے والا تلفظ لکھ لیتا ہے اور آئندہ کے لئے بھی یادداشت کے طور پر کارڈ انڈیکس پر لکھ دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے خبریں پڑھنے والے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ یا مثلاً یورپ کے محاذ پر ایک نئے امریکی جنرل کے نام کا اعلان ہوتا ہے۔ اس کا صحیح تلفظ معلوم نہیں ہے۔ دو طرح تلفظ کیا جاتا ہے ایسی صورت میں خبریں پڑھنے والا امریکی سفارت خانہ سے ٹیلیفون پر پوچھ لے گا اور صحیح تلفظ معلوم ہو جائے گا۔ شدہ اگر غلط تلفظ سے نشر کیا گیا تو صحیح نام جاننے والوں کو خواہ مخواہ ہنسی آئے گی یا ممکن ہے نا واقف بھی ہو جائیں۔

دنیا کے سامنے دن بھر خبریں پڑھنے والے میں اور کن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ سمندر پار کے لئے خبریں نشر کرنے والا شخص دوسروں سے کسی قدر مختلف ہوتا ہے۔ اسے مختلف ممالک کے لوگ سنتے ہیں جن کے حالات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور زندگی، گفتگو کا طریقہ اور عادتیں وغیرہ بھی۔ اسے وہ لوگ سنتے ہیں جنہیں شاید اس کے انگریزی لہجہ پر ہنسی آجائے اور جو ممکن ہے برطانیہ کی ہر بات کا مضحکہ اڑاتے ہوں۔ اس کی آواز کا صاف، مخلصانہ اور مستند ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ لنڈن سے نشر کی جارہی ہے۔ سارے غیر ملکی بلیٹنوں میں لنڈن کا ذکر ضرور آتا ہے۔ خبریں سناتے وقت آپ نے یہ کئی مرتبہ کہتے سنا ہوگا: "یہ خبریں لنڈن سے سنائی جارہی ہیں"۔ یا "یہ لنڈن ہے"۔ اس سے لوگوں کو یہ شبہ ہونے کا کوئی موقع نہیں ملنا چاہئے کہ لنڈن سے نشر ہونے والی خبریں سچی یا مستند نہیں ہوتیں۔

باجا بجتا ہے اسٹوڈیو میں روشنی ہوتی ہے۔ خبریں پڑھنے والا سانس لے کر کہتا ہے: "یہ لنڈن ہے۔ اب آپ خبریں سنئے"۔ خاموشی کے ساتھ اسٹوڈیو کا دروازہ کھلتا ہے اور چیف سب ایڈیٹر بہت سے کاغذ لیے ہوئے اندر آتا ہے، گھڑی کا دھیان رکھتا ہے، خبریں پڑھنے والے کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور جیسے جیسے اسے ضرورت پڑتی ہے مواد فراہم کرتا رہتا ہے۔ ایک لڑکی کاغذ کا ٹکڑا لئے داخل ہوتی ہے جو ابھی ابھی مشین سے پھاڑ کر لایا گیا ہے۔ شاید یہ ماسکو کا خاص اعلان ہے۔ چیف سب ایڈیٹر اسے دیکھ کر گھڑی پر نظر ڈالتا ہے۔ ابھی اسے شامل

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

ہیرے کی انگوٹھی

بدر النساء لطف

سورج سلمہ کے ڈوبتے ہوئے دل کی طرح غروب ہو رہا تھا۔ اس کی سنہری مگر دل میں اتر جانے والی شعاعیں دیناپور کے کچے مکانوں پر اس طرح جگمگا رہی تھیں جیسے بڑی آنکھوں میں ہلکے گلابی ڈورے۔ وہ اپنے گھر سے تھوڑی دور پتھر کی ایک سفید چٹان پر کہنی ٹکائے آنسو ٹپکا رہی تھی اس کے اشک کا ہر قطرہ پتھر پر گرتے ہی پھیل جاتا تھا ----

آج سلمہ کو سلیم سے وہ بات کہنا تھی جس کا نتیجہ ٹریجڈی افسانے کا آخر جملہ یا زندگی کا آخری سانس کہا جا سکتا ہے۔

کیا آج نہیں آؤگے؟ امید نہیں ناامیدی۔ آس نہیں افسوس۔ زندگی نہیں بلکہ "موت" کا فیصلہ نہ کروگے؟ کیا اپنے ہاتھ سے جلائے چراغ کو بجھتے ہوئے دیکھوگے؟ کیا اپنے چاند کی ڈوبتی ہوئی شعاعوں کے مناظر سے متاثر نہ ہوگے؟ کیا میرے آنسوؤں میں اپنے آنسو نہ ملاؤگے؟۔

شام ہوگئی۔ آفتاب غروب ہوگیا۔ پہاڑ کالی گھٹا بن کر سلمہ کی بڑی آنکھوں پر چھا گیا۔ وہ چپکے چپکے گھر کی طرف روانہ ہوگئی —

پہاڑی راستہ۔ رات کا وقت، سناٹا اور تنہا سلمہ سر جھکائے آرہی ہے، اس کا دل تو یہی چاہتا ہے کہ وہ پہاڑ کے کسی کھڈ میں گر جائے۔ اور اس گھر کی صورت نہ دیکھے جہاں "محبت بھرا دل" دولت کے بھاؤ میں فروخت ہونے کی اسکیم پوری ہو چکی ہے۔ اس نے گھر پہنچ کر وہی دیکھا جس کا خیال اس کو موت کی بھیانک تصویر راستے بھر دکھاتا آرہا تھا۔

اس کی ماں نے کہا: "سلمہ پرسوں شادی ہے چار دن میں سسرال چلی جاؤگی۔ اب بھی تمہارا گھومنا پھرنا نہیں جاتا۔" وہ کوئی جواب دئے بغیر ایک گوشے میں سر جھکا کے بیٹھ گئی۔ سلمہ کا باپ گھر میں ایک خوش آئند قہقہے کے ساتھ داخل ہوا۔ دیناپور کا وہ غریب کسان تھا۔ کون مفلس دولتمند ہونے کی تمنا نہیں کرتا۔ کون نہیں چاہتا کہ کچا مکان کوٹھی سے اور گاؤں کی زندگی شہر سے بدل جائے۔ ایک ہزار روپیہ کل رشید احمد خاں تعلقدار نے اس کو سلمہ کی شادی کے سلسلے میں دیا تھا اور آج تو چار ہزار نقد اور دو ہزار کے زیورات بھی حوالے کئے ---- وہ خوشی خوشی سلمہ کی ماں کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ "لو یہ چار سو نہیں چار ہزار کے نوٹ بھی وہیں رکھو جہاں کل کا روپیہ رکھا تھا۔ سلمہ کی ماں! تمہاری اکلوتی لڑکی کی تقدیر نے ہماری تمہاری قسمت کو گویا چاند لگا دئے شادی سے پہلے تو یہ عالم ہے اور شادی کے بعد؟" قہقہہ

سلمہ کی ماں نے خوشی خوشی نوٹ رکھ لئے۔ تعلقدار صاحب کی تعریفیں رات گئے تک میاں بیوی کرتے رہے۔

—— (۲) ——

سلیم کی جوانی کا یہ پہلا دن تھا جس روز اس نے سلمہ کو نہیں دیکھا۔ واپسی میں اسے کتابیں خریدنے میں دیر لگ گئی۔ شہر سے آنے والی لاری چھوٹ گئی۔ اٹھارہ کوس پہاڑی راستہ مگر اس کے باوجود بھی بغیر کسی سواری کے دیناپور کی طرف قدم بڑھائے۔ دو بجے دن کا چلا ہوا سلیم ایک بجے رات کے بعد دیناپور پہنچا۔ وہ اپنے گھر جانے سے پہلے سلمہ کے دروازے پر آکر بیٹھ گیا۔ گھٹنوں تک اس کے پاؤں خاک میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پسینے میں سر سے پاؤں تک غرق تھا۔

سلیم نے ہلکی سی سیٹی بجائی جس کی آواز فضا میں لہرا کر سلمہ کے نازک کانوں سے ٹکرائی — دل دھڑکا، اٹھی اور دروازے تک آئی۔ چپکے سے زنجیر کھولی سلیم چاندنی میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے سلمہ کو دیکھتے ہی (جیب سے ایک ہیرے کی انگوٹھی نکال کر) کہا یہ ناچیز ہدیہ شہر سے دیہات کی سلمہ کے لئے لایا ہوں۔

سلمہ: (انگوٹھی لیتے اور اپنے آنسو انگوٹھی پر ٹپکاتے ہوئے) "تم کیوں نہ گئے تھے سلیم؟"

سلیم: "کتابیں خریدنے۔ کیونکہ چھٹیاں ختم ہوگئیں۔ کل مجھے علیگڑھ ضرور جانا پڑے گا۔ اب اس کے بعد جب قسمت کروٹ بدلے۔"

سلمہ: "میں بھی یہی چاہتی تھی کہ جس محبت کی تم نے میرے دل میں پرورش کی ہے اس کی قبر اپنے ہاتھ سے بنا کر جاؤ۔"

ستارے چھپ رہے تھے اور آنسو ٹپک رہے تھے۔ سسکیوں کی آواز گاؤں کی فضا کو ہچکولے دے رہی تھی۔ سلمہ کے گرم اور بڑے آنسو سلیم کی کلائی پر برابر گر رہے تھے۔ وہ مسلسل پوچھ رہا تھا کیا ہوا سلمہ؟ کیوں رو رہی ہو سلمہ؟ کیا وجہ ہے مگر سلمہ زبان کے بدلے آنسوؤں سے سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی۔

سلیم: بتاؤ سلمہ۔ بولو۔ کہو۔ کیا بات ہے۔

سلمہ: چھپانا موت، بتانا گناہ۔ جاؤ سلیم دیر ہو رہی ہے۔

—— (۳) ——

سلیم دیناپور کے ایک چھوٹے سے زمیندار ممتاز احمد کا لڑکا تھا۔ ممتاز احمد دو سال قبل مر چکے تھے۔ بیوہ ماں دیناپور میں رہتی تھی۔ وہ

ساجدہ اس کی بڑی بہن، علیگڈھ میں افتخار احمد کو بیاہی ہوئی تھی جو یو پی کے کسی ضلع میں نائب تحصیلدار تھے۔ سلیم کی تعلیم کے کل اخراجات افتخار احمد ہی سے متعلق تھے کیونکہ اس کی زمینداری صرف اس قدر تھی کہ سال بھر کی جنس خریدنا نہ پڑے۔ سلیم تین بجے رات کو گھر پہنچا تھا۔ اس لئے صبح کو دیر میں آنکھ کھلی۔ لاری چھوٹنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔ جلدی جلدی اسباب باندھ کر اور یہاں سے رخصت ہو کر علیگڈھ کے ارادہ سے روانہ ہو گیا۔

سلمہ کے مکان سے قریب ہو کر نکلا۔ آج غیر معمولی چہل پہل دیکھ کر اس کے بڑھتے ہوئے قدم لڑکھڑائے۔ لیکن دن کا وقت تھا لوگ آجا رہے تھے۔ اس لئے یہ سر جھکا کر گذر گیا۔ تھوڑی دور بڑھنے کے بعد جب اس نے مڑ کر دیکھا تو سلمہ کوٹھے پر اسی بوسیدہ چھپر کے نیچے کھڑی ہوئی نظر آئی جو محبت کی پہلی جلوہ گاہ تھی۔ سلیم نے خدا حافظ کا اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ اٹھایا لیکن سلمہ کی خاموشی نے اس کے دل میں یہ شک پیدا کر دیا کہ کہیں یہ آخری ملاقات نہ ہو۔

لاری روانہ ہوئی اور یہ $2\frac{1}{2}$ بجے شہر پہنچا جہاں سے علیگڈھ جانے کے لئے ۶ بجے شب کو گاڑی روانہ ہونے والی تھی۔

(۴)

جس پتھر سے محبت کی نگاہ چاند کی شعاعیں کھینچتی ہے اسی پتھر سے وقت آنے پر چنگاریاں بھی اڑتی ہیں۔ رشید احمد خاں دیناپور کے سب سے بڑے تعلقدار تھے۔ ان کی آمدنی کسی طرح ڈیڑھ لاکھ سے کم نہ تھی۔ پچاس سال سے زائد عمر کے باوجود ان کی دولت ان کے جذبات روندنے میں ناکامیاب ہو چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ سولہ برس کی لڑکی سے شادی کر کے وہ اپنے دل کو پھر سے سیلاب شباب میں بہانے کے قابل ہو سکیں گے۔ سلمہ کے حسن کی شہرت نے ان کو گرویدہ کر رکھا تھا۔ ان کے مصاحبوں اور خوشامدیوں نے یہ سمجھانے سے پرہیز کیا تھا کہ سولہ برس کی سلمہ پچپن سالہ تعلقدار کے لئے موزون نہیں ہے۔

رشید احمد خاں: میں نے آموں کا باغ خرید کر جب سے اس میں بنگلہ ڈلوایا تھا۔ میرا دل رہ رہ کر مجھے ٹہوکے دے رہا تھا کہ ایسے مکان میں ایسا ہی مکین ہو۔

اختر: (مصاحب) کیوں نہیں سرکار، اور پھر سرکار انتخاب کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سلمہ پانچ انگلیاں پانچ چراغ ہے۔

رشید احمد خاں (بات کاٹ کر) پانچ چراغ ہے پانچ چراغ! جس وقت وہ تالاب سے پانی بھرنے جاتی ہے تو بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابر کی گود میں چودھویں رات کا چاند دھیرے دھیرے چل رہا ہے۔ اور جب وہ نازک کمر پر پھولوں کی ٹوکری کے بجائے بھیس بیر کا گھڑا اٹھا کر چلتی ہے تو میری بے پناہ دولت کہتی ہے کہ اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہئے۔

(۵)

علیگڈھ کی فضا سلیم کے لئے اندوہناک تاریک اور تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ کسی جگہ اس کا دل نہ لگا۔ وہ سیدھا ساجدہ کے گھر آیا۔ بہن کی محبت بھری نظر نے سلیم کے چہرے سے ٹکرا کر دل کی حالت معلوم کر لی۔ وہ بھائی کی محبت کے حال سے واقف تھی۔ وہ یہ بھی کہ معلوم ہوتا ہے ابھی سلمہ نے سلیم سے بات چیت نہیں کی۔

ساجدہ: کیوں سلیم پریشان کیوں آئے؟ گھر میں خیریت تو ہے؟

سلیم: ہاں خیریت ہے۔ کوئی خاص بات قابل تذکرہ نہیں۔

ساجدہ: (مسکرا کر) بھابی کیسی ہیں بھیا؟

سلیم: (مسکراہٹ کا جواب دیتے ہوئے) تمہارے بھیا کی شادی ہی کہاں ہوئی جو بھابی کا ذکر کر رہی ہو اور شاید؟...... سلیم کہتے کہتے رکا۔ اس کی ہنسی کروٹ بدل کر آنسوؤں میں ڈبڈبا گئی اور وہ بے ساختہ رو نکلا۔

ساجدہ: (گھبرا کر) کیوں سلیم سچ بتاؤ کیا بات ہوئی؟

سلیم: کہہ تو دیا کہ کوئی خاص بات نہیں۔

ساجدہ: سلمہ کس حال میں ہے؟

سلیم: جس حال میں بھی ہے اچھی ہے۔

ساجدہ: امی جان کے ذریعہ تمہارا پیغام سلمہ کے لئے گیا؟

سلیم: (تم یہاں علیگڈھ میں ہو اور میں کوشش کے باوجود بھی امی جان سے نہ کہہ سکا۔

ساجدہ: کہیں ایسا نہ ہو کہ سلمہ کسی اور کی ہو جائے۔

سلیم: ہو سکتا ہے ——— اور ——— اب کی تو ——— جیسے میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ دنیا پور کا چاند آخری مرتبہ دیکھا ہے۔

ساجدہ: تم نے اس کی شادی کے متعلق کچھ سنا ہے؟

سلیم: سنا تو کچھ بھی نہیں لیکن گذشتہ رات کو جس غم انگیز طریقے سے سلمہ ملی شاید یہ پہلا اتفاق تھا۔

(۶)

سلمہ آنسوؤں کی چھاؤں میں دلہن بن رہی تھی۔ دنیا پور میں اس کا میل جول عام تھا۔ محلہ میں اس کی پچاسوں سہیلیاں تھیں اور اس وقت اس کو دلہن بنانے میں سب کے ہاتھ لگے ہوئے تھے۔ دیہاتی قسم کی نوبت فضاؤں میں چھائی ہوئی تھی۔ سلمہ کا گھر مہمانوں سے چھلک رہا تھا

اس کا باپ رشید احمد خاں تعلقدار کو گھڑی گھڑی کی خبر دے رہا تھا اور روپیہ پہ روپیہ لا رہا تھا۔

رشید احمد خاں دینا پور کے جہاں سب سے بڑے تعلقدار تھے وہاں سب سے بڑے کنجوس بھی مشہور تھے۔ انھوں نے ہمیشہ روپیہ پہ روپیہ جمع کیا۔ وہ خرچ کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ لیکن قاعدہ ہے کہ جب دریا کا بند کسی وجہ سے ٹوٹتا ہے تو دھارا تیز بہتا ہے۔ یہ موقع تھا کہ وہ پیسہ کو پانی کی طرح بہا کر سلمہ کو اس کے گھر بار اور ماں باپ سمیت خرید لیں۔

اختر: (مصاحب) سرکار اور کچھ بھی سنا ؟

رشید احمد خاں: کیا ؟

اختر: سلمہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔

رشید احمد خاں: یہ کیسے معلوم ؟

اختر: اس طرح کہ سلمہ کی ایک سہیلی سلطانہ ہے جو ہمیشہ اس کی رازدار رہی ہے۔ کل شام جس وقت میں گھر جا رہا تھا تو اس نے مجھ کو بلا کر کہا کہ جب سے سلیم علیگڈھ گیا ہے سلمہ کا آنسو نہیں ٹھہرا۔

رشید احمد خاں: یہ سلیم کون ؟

اختر: ممتاز احمد کا لڑکا۔

رشید احمد خاں: ممتاز احمد کون ؟

اختر: اسے سرکار، وہی ممتاز احمد جس نے مکھی بن کر ہمیشہ سرکار کے دستر خوان پر حملے کئے۔

رشید احمد خاں: وہ ممتاز احمد جس نے ایک مقدمہ کے دوران میں میری مدد لی تھی اور سات سو روپیہ قرض لے کر سود اصل کچھ نہ دیا ؟

اختر: جی ہاں سرکار وہی۔

رشید احمد خاں: وہ تو کب کا مر گیا۔

اختر: لیکن اس کا لڑکا سلیم تو زندہ ہے اور سلمہ اسے چاہتی ہے۔

رشید احمد خاں: سلیم تو علیگڈھ میں پڑھتا ہے۔

اختر: جی ہاں پرسوں آیا تھا اور کل پھر علیگڈھ گیا۔

رشید احمد خاں: یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔

اختر: مگر اپنی محبت تو سلمہ کے دل میں چھوڑ گیا۔ سرکار جب تک یہ کانٹا نہ نکلے گا آرام نہیں مل سکتا۔

(۷)

ساجدہ: تو سلیم کیا سوچا ؟

سلیم: سوچا کیا۔ روپیہ پاس نہیں جو گھڑی گھڑی علیگڈھ سے دینا پور جاؤں۔

ساجدہ: تمہارے بہنوئی کے سو روپے میرے پاس رکھے ہیں۔ تم یہ لے کر دینا پور چلے جاؤ اور سلمہ سے اپنی نسبت ابھی جا کر طے کر لو۔

سلیم: میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا۔

ساجدہ: میں لکھے دیتی ہوں یہ خط امی جان کو دے دینا وہ طے کر دیں گی۔

سلیم نے آٹھ دن کی رخصت اور لے لی۔ روپیہ اور خط لے کر دینا پور روانہ ہو گیا۔ وہ سفر میں تھا لیکن اس کی روح دینا پور کی گلیوں میں چکر لگا رہی تھی۔ کبھی وہ اس تالاب پہ جاتا تھا جہاں سے سلمہ پانی بھرتی تھی۔ کبھی وہ اس اس پہاڑی پہ پہنچتا تھا جہاں سلمہ پتھر کی چٹان کا ٹیک لگا کر کھڑی ہوتی تھی اور روزانہ دونوں وقت ملتے سلیم کا انتظار کرتی تھی۔ اس نے پچاس روپے میں علیگڈھ سے کچھ پوڈر کے ڈبے، کریم کی شیشیاں اور ایک جگمگاتی ہوئی ساری خریدی۔ اور یہ سوچ کر سفر طے کر رہا تھا کہ اپنی سلمہ کو یہ سوغات دوں گا۔ اور وہ خوشی خوشی میرے ہدیہ کو قبول کرے گی۔ جب وہ چاندنی رات میں یہ جگمگاتی ہوئی ساری پہن کر کچے مکان کی دیوار کی اوٹ میں کھڑی ہوگی تو یہ معلوم ہوگا کہ ستاروں نے چودھویں کے چاند کو گھیر لیا۔ یہ سب کچھ تو تھا لیکن سلیم کا دل رہ رہ کر یہ کہہ رہا تھا کہ خدا اس خواب کو سچ کرے۔

(۸)

دینا پور میں چراغاں تھا۔ وہاں کے سب سے بڑے زمیندار کی شادی تھی۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ آسمان کے ستارے بلندی پر اور زمین کے چراغ پستی پر جگمگا رہے تھے۔ لیکن یہ چراغ سلمہ کے آنسوؤں میں جل رہے تھے۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی: "سلمہ اگر رشید احمد خاں سے بہتر کوئی شوہر تیرے لئے جڑ سکتا تو تیری شادی وہیں کرتی"۔ سہیلیاں کہہ رہی تھیں: "سلمہ دینا پور کی ملکہ بن رہی ہو۔ بڑا علاقہ، اتنی رعایا، اتنی دولت، سب تمہاری ہے"۔ سلمہ ڈبڈبائی اور سوچتی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھتی اور سر جھکا لیتی۔ دو بجے رات کو بڑی دھوم سے برات آئی۔ آتشبازی چھوٹی۔ پٹاخوں کے دھماکوں سے دینا پور کی فضا ہل گئی۔

عین اس وقت جبکہ نکاح شروع ہوا دلہن کے حجرے سے رونے کی آواز آئی۔ شادی کے گھر میں رونے کی صدا کو نجتے ہی سناٹا چھا گیا۔ کیا ہوا ؟

رشید احمد خاں سہرا الٹ کر کھڑے ہو گئے۔ سلمہ کے باپ اندر سے باہر آئے۔ دلہن بیہوش ہو گئی۔ اس کی نبضیں سحر کے ستاروں کی طرح ڈوب گئیں۔ دو ہچکیوں نے شادی کے گھر کو غم سے بدل دیا۔ ہیرے کی وہ انگوٹھی جو سلیم کی سوغات تھی آج سلمہ کی روح کو آزاد کرنے کیلئے کام آئی۔

ماں کی نظر جب ہاتھ کی انگوٹھی پر پڑی تو اس میں نگ نہ تھا۔ سلمہ کے گلابی رخسار زرد ہو چکے تھے اور رخسار کے سوکھے ہوئے آنسو سلیم کو یاد کر رہے تھے

(۹)

سلیم صبح ہوتے دینا پور میں داخل ہوا۔ وطن کی زمین نے پاؤں پکڑ کر پیغام تعزیت دیا۔ سلیم کے ایک دوست نے بڑھ کر کہا: "کب آئے سلیم؟"

سلیم: ابھی آرہا ہوں کیوں خیریت تو ہے؟

دوست: اور سب تو خیریت مگر کل دینا پور میں ایک تاریخی واقعہ ہوگیا۔

سلیم: (گھبرا کر) کیا؟

دوست: سلمہ مر گئی۔

سلیم: سلمہ مر گئی ۔۔۔ سلمہ ۔۔۔ مر ۔۔۔ گئی ۔۔۔ ہاتھ سے سب اسباب چھوٹ کر زمین پر گرا ۔۔۔ اور ساتھ ہی ساتھ سلیم بھی؟

صبح کی دھوپ دینا پور کے درختوں کی بلند چوٹیوں پر تعزیتی پیغام دے رہی تھی اور محبت کا یہ المیہ افسانہ انجام کو پہنچ چکا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سلیم اٹھ کر مکان آیا۔ ماں نے کہا: "ابھی پرسوں گئے اور آج پھر چلے آئے سلیم؟"

سلیم: غلطی ہوئی امی جان ۔ آئندہ سے دینا پور کی زمین پر آپ سلیم کو نہ دیکھیں گی ۔ سلیم کی ماں پکارتی رہی مگر سلیم لڑکھڑاتا ہوا سامنے کی پہاڑیوں میں ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح غروب ہوگیا۔

لندن کی نشرگاہ: ۔۔۔۔۔ بقیہ صفحہ ۱۸

کرنے کے لئے وقت ہے۔ اگلی خبر ختم ہوتے ہی وہ بٹن دباتا ہے اور مائکروفون کو غیر منسلک کر دیتا ہے۔ اور پھر کہتا ہے "ماسکو کا سرکاری اعلان شامل کرنا ہے جس طرح بھی ہو سکے شامل کیجئے"۔ پھر دوبارہ مائکروفون کو چالو کر دیتا ہے اور آواز آتی ہے: "ایک بالکل تازہ خبر سنیئے"۔ خبریں پڑھنے والا اسی کاغذ پر سے بالکل صحیح صحیح خبریں پڑھ دیتا ہے۔ دونوں کو وقت کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اگر خبریں وقت پر ختم نہ ہو سکیں تو سنائی بند ہو جائیں گی چاہے اس وقت کچھ بھی کیوں نہ کہا جا رہا ہو۔ پروگراموں کے لئے وقت کی پابندی بہت ضروری ہے تاکہ دوسرے نشر کرنے والوں کو وقت نہ ہو۔ خبر کی لمبائی کا خیال رکھنا سب ایڈیٹر کا کام ہے۔ جب دو سکنڈ باقی رہتے ہیں تو بات ختم ہو جانی چاہیئے۔ سرخ روشنی کے غائب ہوتے ہی خبریں پڑھنے والا اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے۔ پھر لندن سے دنیا کے لئے دوسرا بلیٹن نشر کیا جاتا ہے۔ (نارن ریویو سے ماخوذ)

غزل

وحشتؔ کلکتوی

ایسا بھی ترا غمزدہ مجبور نہیں ہے
تنگ آکے جو مر جائے تو کچھ دور نہیں ہے

دلجوئی وہ کیوں کرنے لگے لیکے مرا دل
یہ قاعدہ یہ رسم یہ دستور نہیں ہے

اب تک نظر آجاتی ہے مشتاق کو لیکن
وہ برقِ تجلی جو سرِ طور نہیں ہے

دل والے ہیں واقف مری بربادیٔ دل پر
ہر چند کہ یہ واقعہ مشہور نہیں ہے

کیا مہر و وفا کا یہی ہوتا ہے طریقہ
کیوں کہہ نہیں دیتے ہیں منظور نہیں ہے

کرتا ہوں اُسی بزم کا میں تذکرہ ہر دم
جس بزم میں میرا کوئی مذکور نہیں ہے

ہر شخص سے مانوس جو ہوتا نہیں وحشتؔ
یہ ہے کہ کم آمیز ہے، مغرور نہیں ہے

ہندوستانی موسیقی

شاہد احمد دہلوی

ہندوستانی موسیقی کی ابتدا ماضی کے دھندلکے میں چھپی ہوئی ہے۔ اس لئے اس کے آغاز کے متعلق صرف قیاس ہی ہماری رہبری کرتا ہے۔ ہندوؤں کے علم الاصنام کے مطابق سنگیت برہما کی ایجاد ہے، مہادیو نے اسے برتا اور نرد نے اسے رواج دیا۔ گندھروں اور اپسراؤں نے دیوتاؤں کے آگے اس کی نمائش کی۔ جب آکاش پر دیوتاؤں میں سنگیت رائج ہو اتو دھرتی کے باسیوں پر بھی اس کا اثر ہوا اور راجہ مہاراجاؤں کے جشن رسیلے نغموں سے گونجنے لگے۔ رفتہ رفتہ ملک میں سنگیت عام ہوا۔ اس کی باقاعدہ تعلیم دی جانے لگی۔ اور ہر طبقے کے لوگ اس سے بقدر استطاعت لطف اٹھانے لگے۔

انسانی فطرت کی تاریخ بتاتی ہے کہ جن الفاظ کے ادا کرنے میں جوش ظاہر کرنے کو جی چاہا لوگ انہیں گانے لگے۔ جوش کا اظہار یا تو دینی امور میں ہوتا ہے یا بعض دنیوی امور میں۔ دینی امور میں سب سے زیادہ جوش کا اظہار عبادت میں ہوتا ہے اور دنیوی امور میں عشق و محبت میں۔ اسلئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ گانے کی ابتدا عبادت اور عشق سے ہوئی۔

ہندوستانی سنگیت کا بچپن مندروں میں گذرا۔ برہمنوں نے دیوتاؤں کی پوجا پاٹ میں بھجن گائے اور اپنے چیلوں کو مذہبی تعلیم گانے میں دی۔ شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب شاعری نے نغمے میں جگہ پائی تو لے نے بھی صورت دکھائی۔ گیت، چھند، اور بیاں تال کے ساتھ گائی جانے لگیں۔ جب سنگیت کا رواج عام ہوا تو اس کی ترتیب و تہذیب بحیثیت ایک فن کے کی گئی اور راگ راگنیوں کا تعین کیا گیا۔ ان کے اصول مقرر کئے گئے اور یوں سنگیت کا علم و فن وجود میں آیا۔

آواز ارتعاش یا لرزش سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ آواز جو محض آواز ہو جس میں کوئی رسیلا پن یا خوش آیند کیفیت نہ ہو مثلاً بادل کی گرج یا دھماکہ۔ یا ایسی آواز جو کانوں کو بھی بھلی لگے۔ یہ سریلی یا موسیقانہ آواز کہلاتی ہے۔ صدائے محض سے جو تموج پیدا ہوتا ہے اسکے درمیانی وقفوں میں تناسب نہیں ہوتا۔ سریلی آواز کے تموج میں درمیانی وقفے برابر کے ہوتے ہیں۔ سائنس کی تحقیقات بتاتی ہے کہ موسیقانہ صدا کم از کم ۱۶ تموجات فی سکنڈ سے پیدا ہو سکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ اڑتالیس ہزار تموجات فی سکنڈ سے۔

ہندوستانی موسیقی کا دارومدار صرف ۱۲ سروں پر ہے۔ ہزاروں سال کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ انہی بارہ سروں میں ساری راگ بدیا ختم ہو جاتی ہے۔ جب اس کی اور زیادہ چھان بین کی گئی اور باریکیاں نکالی گئیں تو معلوم ہوا کہ آواز کے ایک مکمل ٹکڑے کو (جسے اصطلاح میں سپتک کہتے ہیں) بائیس مقاموں یا شرتیوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ انہی میں بارہ وہ مقام بھی شامل ہیں جنہیں سر کہا جاتا ہے۔ عام ہندوستانی سنگیت میں بارہ سرہی برتے جاتے ہیں۔ سرتیوں کی ادائیگی صرف بڑے فنکاروں ہی کے بس کی بات ہے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے بہت اعلیٰ تربیت یافتہ سماعت درکار ہے۔ اگر ایک تار کے دونوں سروں کو تان دیا جائے اور اس کے پہلے سرے کو سُر مان لیا جائے تو جیسے جیسے ہم اس تار پر آگے بڑھتے جائینگے سُر بدلتے جائینگے یہاں تک کہ بارہ نمایاں سر اس سے پیدا ہو جائینگے یا اگر باریک بینی سے کام لیا جائے تو بائیس سُرتیاں پیدا ہونگی۔ اس کے بعد جب آپ اور آگے بڑھینگے تو تیرھویں سُر یا تئیسویں سرتی پر پھر وہی پہلا سر آواز دیگا جہاں سے تار کا آغاز ہوا ہے۔ اور اس کے بعد پھر وہی سب سُر اور سُرتیاں دوبارہ ادا ہونے لگیں گی جو پہلے حصہ میں ہو چکی ہیں۔ فرق صرف اکہرے اور دوگنے کا ہوگا۔ بارہ نمایاں سُروں کے بعد دُگون کے سر یا ٹیپ کے سر ادا ہونے لگینگے اور دوسری سپتک یا استھان شروع ہو جائے گا، اور پھر بارہ سروں کے بعد تیسری سپتک۔ بالعموم انسانی گلے کی دوڑ انہی تین سپتکوں میں محدود ہوتی ہے اور سازوں میں بھی انہی تین سپتکوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ان تین سپتکوں یا استھانوں کے نام درجہ بدرجہ مندر، مدھ اور تار رکھے گئے ہیں۔

بارہ سُروں کی تقسیم اگلے لوگوں نے اس طرح کی ہے کہ سات سُروں کو بنیادی سر مانا ہے۔ ان کے نام ہیں:- (۱) کھرج (۲) رکھب (۳) گندھار (۴) مدھم (۵) پنچم۔ (۶) دھیوت اور (۷) نکھاد آوازوں کے فصل کے اعتبار سے ان سات سروں کو شدھ یعنی خالص سُر مانا گیا ہے۔ اس کے بعد تحقیق ہوا کہ پہلے اور پانچویں کے علاوہ باقی پانچ سروں کی دو دو شکلیں ہیں۔ چنانچہ پہلی شکل کے سروں کو کومل سُر کہا گیا۔ کومل کے معنے ہیں ملائم دوسری شکل کے سُر ان سروں سے چونکہ تیز ہیں اسلئے ان کا نام تیور رکھا گیا۔ اس لحاظ سے ایک سپتک کے بارہ سُر یہ ہوئے:۔

(۱) کھرج۔ (۲) کومل رکھب (۳) تیور رکھب۔ (۴) کومل گندھار (۵) تیور گندھار۔ (۶) کومل مدھم (۷) تیور مدھم (۸) پنچم (۹) کومل دھیوت (۱۰) تیور دھیوت (۱۱) کومل نکھاد اور (۱۲) تیور نکھاد

کھرج اور پنچم اچل یا قائم سر کہلاتے ہیں ان کے اترے چڑھے سُر نہیں ہوتے۔

متقدمین نے اس علم کی اتنی چھان بین کی ہے کہ سروں کا تعلق سیاروں سے، ان کی تاثیر اور تاثر، اور ان کے رنگ تک معلوم کر لئے ہیں۔ یہ سب باتیں ہزاروں برس کے تجربوں سے معلوم کی گئی ہیں اور نتائج کے اعتبار سے اتنی صحیح ہیں کہ ان کی سائنٹفک توجیہ ناممکن نہیں ہے۔ سات بنیادی سروں کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ ہفت افلاک کی گردش سے جو سات مختلف موسیقانہ آوازیں پیدا ہوتی ہیں انہیں پر موجودہ سات سروں کو منطبق کیا گیا ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ سات سیاروں سے سات سُر وابستہ کئے گئے ہیں اور ان سیاروں کے اچھے برے اثرات ان سات سروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ ہر سُر کا ایک مزاج بھی دریافت کیا گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ کونسا سُر انسان کے کس جذبہ کو ابھارتا ہے۔ اسی کی رعایت سے سروں کے رنگ بھی متعین کئے گئے ہیں۔ مثلاً جو سُر دل میں خوشی اور سرور پیدا کرتا ہو اس کا رنگ گلابی یا جو سُر غم واندوہ کا محرک ہو اس کا رنگ سیاہ مقرر کیا گیا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے ان نظریوں کو صحیح ماننے میں کوئی عذر نہیں ہوتا۔ تاثیر تو ہر سُریلی آواز میں ہوتی ہی ہے اور تاثیر نام ہے کسی ایک جذبے کے متاثر ہونے کا۔ موسیقی کے اثر و تاثر کے سلسلہ میں آئندہ بحث کی جائے گی۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ موسیقی حسنِ سمع کے ذریعہ روح کو اس درجہ متاثر کرتی ہے کہ خود فراموشی اور وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ حکمائے قدیم نے موسیقی کی اثر آفرینی کے تجربے کر کے سروں کے مزاج بھی تشخیص کر لئے۔ چنانچہ گرم، سرد، خشک و تر تاثیریں سروں سے منسوب کی گئیں اور سروں کی مناسب ترتیب سے بعض ناقابل علاج امراض کا تدارک کیا۔

ذیل میں ایک نقشہ پیش کیا جاتا ہے جس سے سُروں کی خصوصیات واضح ہو جائینگی۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ہندوستانی موسیقی کا دارومدار انہی سات شدھ اور پانچ کومل کل بارہ سروں پر ہے۔ انہی سروں کی ترتیب سے ہزاروں راگ بنتے ہیں۔ راگ سُروں کے ایک دلکش مجموعہ کا نام ہے۔ سانگیت لوگوں نے کم سے کم پانچ مختلف سُر ہر راگ کے لئے ضروری قرار دیئے ہیں، پانچ سُر سے کم کے راگ کو راگ نہیں مانا، گو رواج میں چار سُر اور تین سُر کے راگ بھی ہیں۔

قدیم روایت اور اہل ہنود کے علم الاصنام کے مطابق مہادیو جی نے سروں کے قیام کے بعد چھ راگ بنائے۔ وہ اس طرح کہ علاوہ کھرج کے ہر سُر سے ایک راگ پیدا کیا۔ چنانچہ رکھب سے بھیرون، گندھار سے دیپک، مدھم سے میگھ، پنچم سے سری، دھیوت سے ہنڈول اور نکھاد سے مالکوس۔ کھرج سروں کا بادشاہ ہے اور بغیر اس کے کوئی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ ہر راگ میں بنیادی حیثیت سے شامل ہوتا ہے اسلئے اسے ہر راگ کا مشترک سُر سمجھنا چاہئے کسی ایک خاص راگ سے اسے منسوب یا مخصوص نہیں کیا گیا۔ مگر یہ صرف روایت ہی روایت ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ تصور ہی سرے سے غلط ہے۔

متقدمین نے راگوں کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ ان کی قلمی تصویریں بھی بنادی ہیں۔ سُروں کی طرح راگوں سے بھی اچھے برے اثرات وابستہ کئے گئے ہیں اور غالباً اسی اثر و تاثر کے لحاظ سے ان کی شکلیں متصور و مصور کی گئی ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں ہے اس لئے مختصراً درج ذیل کیا جاتا ہے۔

(۱) بھیرون گورا رنگ بڑی بڑی آنکھیں۔ کشادہ پیشانی۔ گول منہ۔ مونچھیں چڑھی ہوئیں۔ بالوں کا جوڑا بندھا ہوا۔ سر پر ایک سانپ لپٹا ہوا۔ دوسرا سانپ کمر میں لپٹا ہوا۔ بیل پر سوار۔ گلے میں زنار۔ سرخ ریشمی دھوتی پہنے ہوئے۔ انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی۔ ہاتھ میں

سُر	مختصر نام	نسبت	مشابہت آواز	مخرج	ستارہ	تاثیر	مزاج	رنگ
کھرج (سر)	سا	برہما	مور	ناف	کنول	خوشی۔ سرور	سرد و تر	گلابی
رکھب	رے	برہما	پپیہا	دل	عطارد	خوشی و سرور	سرد و خشک	دھانی
گندھار	گا	سرسوتی	بھیڑ	سینہ	زہرہ	غم و یاس	سرد و تر	نارنجی
مدھم	ما	مہادیو	سارس	حلق	شمس	بےچینی و بیقراری	گرم و خشک	موتیا
پنچم	پا	لکشمی	کوئل	منہہ	مریخ	غمی، قہر، جبر اور غصہ	گرم و خشک	زعفرانی
دھیوت	دھا	گنیش	سانپ	تالو	مشتری	خوشی اور سرور، قہر، جبر	سرد و گرم	زرد
نکھاد	نی	سُریا	ہاتھی	ناک	زحل	سنگار، جذبات انگیز	سرد و خشک	سیاہ

موتیوں کی سمرن۔ عمر بارہ ہزار دو سو برس۔ ایک دھارا پانی دریائے گنگ کی گائے کے منہ سے نکل کر مہادیو کے داہنے شانے پر گرتی ہے بھیروں کی شکل مہادیو سے مشابہ ہے۔

(۲) مالکوس جامۂ سرخ پر زر سے آراستہ، ہوا کے تخت پر براجمان۔ بیلے کا گجرا گلے میں۔ ہاتھ میں یاقوت کی انگوٹھی۔ نورتن بازو پر۔ چمپاکلی مرصع گلے میں۔ سرخ زرکار پٹکا کمر میں۔ کانوں میں یاقوت کے حلقے۔ بالوں کی چوٹی بندھی ہوئی۔ ہاتھ میں میزانِ عدل مصاحبین پری پیکر حلقہ بدوش سبز فام بشکل کندن خام، از حد خوبصورت دھوتی چمبری پہنے ہوئے۔ عمر پانسو پچاس برس کی۔

(۳) ہنڈول گندمی رنگ مائل بہ زردی۔ کشادہ پیشانی۔ پیوستہ ابرو۔ مونچھیں چڑھی۔ آنکھیں سرخ۔ مالائے مرجان گلے میں پوشاک سفید۔ ہتھیاروں سے آراستہ۔ اسپ پری پیکر پر سوار۔ ہاتھ میں جھنڈا۔ سر پہ کلاہ کج۔ ایک طرف زعفران زار دوسری سمت کوڑ پاسے کی بہار۔

(۴) دیپک شبیہ ایک حسین نوجوان کی ہے جو ڈھڈھاتا سرخ جوڑا پہنے گرڑ پنکھ پر آسن جمائے بھگوان سے لو لگائے بیٹھا ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ نوجوان کے جسم میں سے نور کی شعاعیں اس طرح نکل رہی ہیں جیسے آگ کے شعلے پھوٹ رہے ہوں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آگ کی لپٹیں اس طرح اٹھ رہی ہیں کہ آتشیں کنول سے کھلے نظر آتے ہیں۔ گرڑ پنکھ کی سات چونچیں ہیں جن میں سے شعلے نکلتے رہتے ہیں۔ یہ موسیقار سا اڑتا رہتا ہے۔ فضا میں سے آگ نکلتا اور اسی میں اگلتا رہتا ہے۔ عمر ساڑھے اوپر دو ہزار برس کی۔

(۵) سری راگ شیر کی کھال کا جامہ پہنے ہوئے۔ مردے کے تلوے کی ہڈیاں گلے میں۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی رچی ہوئی۔ تیں ستارہ پیشانی پر روشن انگیٹھی پیش نگاہ مشتعل۔ افراط سرما سے لرزاں۔ دوسری تصویر میں از حد خوبصورت جوان۔ خوش رنگ پوشاک سفید بدن میں مالائے مروارید۔ گلے میں یاقوتِ بے بہا حمائل کئے ہوئے معشوقان پریوش بیٹھی گا رہی ہیں۔

میگھ جامہ سرخ پُر زر سے آراستہ تخت ہوا پر سوار بیلے کے پھولوں کا کنٹھا گلے میں۔ ہاتھ میں یاقوت کی انگشتری۔ نورتن بازو پر۔ گلے میں چمپاکلی۔ کانوں میں زمردیں حلقے۔ سرخ زرکار کمر بند۔ جوڑا بالوں کا بندھا ہوا۔ مصاحبین جھولا جھلا رہے ہیں۔ یاقوت کا تاریانہ ہاتھ میں۔ آنکھیں خمار آلود۔ آہو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے۔ دوسری تصویر میں سیاہ فام شمشیر برہنہ ہاتھ میں۔ گھنگھور گھٹائیں چاروں طرف چھائی ہوئیں۔ ان میں کڑک بجلیوں کے سانپ بن رہے ہیں۔ راگوں کے بعد راگنیاں وضع کی گئی ہیں۔ ہر ایک راگ کی پانچ پانچ راگنیاں مقرر ہیں۔ کل تیس راگنیاں ہوئیں۔

بھیروں راگ کی راگنیاں

(۱) **بھیروی**۔ زرد فام چمپئی رنگ۔ کشادہ پیشانی۔ پیوستہ ابرو۔ آہو چشم اوسط بینی۔ گردن بلند۔ باریک کمر۔

(۲) **براری**۔ سبز فام۔ پوشاک زعفرانی۔ فراخ پیشانی۔ بلند بینی میانہ قد لاغر اندام۔ نہایت ملیح چہرہ ہاتھ میں۔

(۳) **مدھ مات**:۔ طلائی رنگ۔ کشادہ پیشانی۔ باریک ابرو چشم کلاں۔ بلند بینی۔ اوسط اندام۔ زرد لباس قشقہ زعفرانی پیشانی پہ ہم آغوشِ حریف۔ لب دریا بیٹھی ہوئی۔

(۴) **سندھوری**:۔ گندمی رنگ۔ فراخ پیشانی میٹھی چشم اوسط اندام۔ میانہ قد۔ سرخ پوشاک۔ ڈری ڈری سہمی سہمی۔

(۵) **بنگالی**:۔ سبز رنگ میانہ قد پیشانی کشادہ۔ بھولی آنکھیں۔ پستہ قد۔ زعفرانی قشقہ۔ زرد لباس جوگنوں کی طرح کا۔ بھبھوت بدن میں لگائے نہایت حسین۔ چست و چالاک شوخی و گستاخی بشرہ سے عیاں۔

مالکوس راگ کی راگنیاں

(۱) **ٹوڑی**:۔ سبزہ رنگ۔ آہو چشم۔ دراز قد۔ فربہ اندام۔ سفید لباس قشقہ زعفرانی۔ بین کندھے پر دھرے زانو مٹھی بجا رہی ہے، جانوران صحرائی بیہوش پڑے یا حیران کھڑے ہیں۔

(۲) **گوری**:۔ گورا رنگ۔ فربہ اندام میش چشم۔ پوشاک سبز۔ آم کا بور کانوں میں۔ تنبورہ لئے گا رہی ہے۔

(۳) **گن کلی**:۔ گورا رنگ۔ کھلی پیشانی۔ آہو چشم۔ بلند بینی۔ دراز قد۔ وقت صبح گاہی۔ فراق زدہ۔ بال پریشان۔ قدم کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی ہے۔

(۴) **کھمباوتی** گورا رنگ میش چشم۔ اوسط اندام۔ میانہ قد۔ انگیا ساری سرخ پہنے ہوئے بشاش بیٹھی ہے۔ تیور گستاخ۔

(۵) **کوکب**:۔ سیمیں بدن۔ کشادہ ابرو۔ آہو چشم۔ دراز قد۔ پوشاک سرخ۔ بعد انفراغ کارہائے دنیاوی سے مست بے خبر سو رہی ہے۔

ہنڈول راگ کی راگنیاں

(۱) رام کلی :۔ طلائی رنگ ۔ پیوستہ ابرو ۔ آہوچشم ۔ میانہ قد ۔ نیلی پوشاک خوشامد سے اپنے مالک کے پاؤں دبا رہی ہے ۔

(۲) دیسا کھی :۔ سبزفام ، کشادہ ابرو ۔ فربہ اندام ۔ دراز قد ۔ پوشاک دھانی ۔ شمشیر برہنہ ہاتھ میں ، غصہ میں بھری ہی ہے ۔

(۳) دیوگری :۔ طلائی رنگ کشادہ ابرو میش چشم ۔ اوسط اندام ۔ قشقہ صندل سا اپنے مالک کے ساتھ محظوظ بیٹھی ہے ۔

(۴) یاستی :۔ سبزہ رنگ پیوستہ ابرو ۔ آہوچشم ۔ اوسط بینی ۔ میانہ قد فربہ اندام ، زرد لباس ۔ زیور مرصع سے آراستہ ۔ اپنے حریف کے پاس خوش بیٹھی ہوئی ہے ۔

(۵) ٹیلنگی :۔ پیوستہ ابرو ۔ فراخ پیشانی ۔ آہوچشم ۔ بلند بینی فربہ اندام ۔ سرخ رنگ ، لباس سفید پہنے مع ہمراہیان بطریہ امیرانہ بیٹھی ہوئی ہے ۔

دیپک راگ کی راگنیاں

(۱) کاموددی :۔ طلائی رنگ ۔ کشادہ پیشانی ۔ بلند بینی ۔ آہوچشم ۔ اوسط اندام سُرخ لباس

(۲) پٹ منجری :۔ سفید رنگ ۔ کشادہ ابرو ۔ میانہ قد ، سُرخ پوشاک سفید پیشانی پر قشقہ ۔

(۳) سارنگی :۔ کندنی رنگ ۔ فراخ پیشانی میش چشم ۔ لاجوردی لباس ۔ ساتھ سہیلیوں کے گانے بجانے میں مشغول ہے ۔

(۴) گندھاری :۔ سفید رنگ ۔ کشادہ پیشانی ۔ پست قد ۔ لاغر اندام ۔ سبزپوش ۔ اپنے نائک کے آگے بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے ۔

(۵) گونڈ گری :۔ سبزفام ۔ فراخ پیشانی ۔ دراز قد ۔ فربہ اندام ۔ زیر درخت انار خوش بیٹھی ہوئی ہے

سری راگ کی راگنیاں

(۱) بھیرائی :۔ سیہ فام ۔ فراخ پیشانی ۔ آہوچشم ۔ میانہ قد ، سفید پوشاک مرصع زیور چاندی سے آراستہ ۔ گلدستہ ہاتھ میں لئے بیٹھی ہے ۔

(۲) کرناٹی :۔ سبزفام ۔ کشادہ پیشانی میانہ قد ۔ اوسط اندام ۔ زیور طلائی مرصع سے آراستہ زرد لباس ۔ لونڈیاں پری وش دست بستہ آگے کھڑی ہیں ۔

(۳) مالسری :۔ سیہ فام ۔ فراخ پیشانی ۔ بلند بینی ۔ ملیح و حسین ۔ فربہ اندام دراز قد ۔ سُرخ پوش ۔

(۴) ساویری :۔ سرخ رنگ ۔ کشادہ ابرو ۔ اوسط اندام ۔ لباس سرخ اپنی سہیلیوں کے ساتھ سرو کی شاخ پکڑے کھڑی ہے ۔

(۵) دھناسری :۔ طلائی رنگ ۔ فراخ پیشانی ۔ فربہ اندام ۔ طلائی پیشانی پر قشقہ ۔ پوشاک سُرخ ۔ اپنے نائک کے ساتھ خوش بیٹھی ہے ۔

میگھ راگ کی راگنیاں

(۱) ملاری :۔ سیاہ فام ۔ کشادہ پیشانی ۔ بڑی بڑی آنکھیں نوکیلی ۔ میانہ قد زرد لباس ۔ آغوشِ حریف میں نشۂ جوانی میں چور ، نالو زبیٹھی ہے ۔

(۲) سورٹھ :۔ سرخ رنگ ۔ کشادہ ابرو ۔ آہوچشم پست بینی ۔ میانہ قد پوشاک سفید پہنے خوش بیٹھی ہے ۔

(۳) سوہنی :۔ طلائی رنگ ۔ فراخ پیشانی ۔ بلند بینی ۔ اوسط اندام ۔ سُرخ صندل کا ٹیکہ ۔ زعفرانی پوشاک گلاب کا پھول ہاتھ میں ۔

(۴) اساوری :۔ سبزفام ۔ کشادہ ابرو ۔ اوسط بینی ۔ دراز قد ۔ زیور مرصع سے آراستہ ۔ سرخ پوشاک صندل سفید کا قشقہ اپنے نائک کے ساتھ خوش بیٹھی ہے ۔

(۵) ککنی :۔ گورا رنگ ۔ فراخ پیشانی ۔ بلند بینی ۔ چشمان کلاں ۔ میانہ قد ، لباس گلابی ۔ فیل مست پر سوار ۔ پژمردہ اور فراق زدہ ۔

اگلے گن کاروں نے راگنیوں کے بعد پتروں میں مزید تقسیم کی ہے جسے بخوف طوالت نظرانداز کیا جاتا ہے ۔ راگ راگنیوں کی یہ پرانی تقسیم کچھ عرصے پہلے تک رائج تھی مگر ربع صدی ادھر کی بات ہے کہ جب اس فن کی عقلی جانچ کی گئی تو اس تقسیم میں کوئی اصول کارفرما نظر نہیں آتا ۔ متوں میں بھی باہمی اختلاف ہے ۔ کسی نے چھ راگ اور تیس راگنیاں مانی ہیں اور کسی نے چھ راگ اور چھتیس راگنیاں اور ہر راگ کے آٹھ آٹھ نو نو پتر بھی پیش کئے ہیں ۔ غرض اسی پرانی تقسیم کا سارا دارومدار روایتوں پر ہے ۔ اور ہماری ضرب المثل قدامت پرستی نے ہمیں کبھی اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دی کہ آخر ایسا کیوں ہے ؟ چنانچہ صدیاں بیت گئیں اور فن موسیقی کا یہی دستور رہا ۔ ہر زمانہ میں رواج کے مطابق گرنتھ لکھے گئے اور نئے نئے قاعدے اور اصول مقرر کئے گئے ۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ہمارا سنگیت ایک مجموعۂ اضداد بن کر رہ گیا ۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ اور غور کرو تو معقول بحث کوئی بھی نہیں کرتا ۔ ایک تو ہندوستانی موسیقی ویسے ہی ایک نہایت دشوار فن ہے ۔ اس پر گرنتھوں اور پنڈتوں کے باہمی اختلاف نے

اسے بالکل ہی گویکہ دھرا لینا دیا۔ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں بمبئی کے ایک ایڈووکیٹ پنڈت وشنو نرائن بھات کھنڈے نے بڑے غور و خوض کے بعد کل نظام موسیقی کی کایا پلٹ کی اور اسے علمی اور اصولی شکل دی۔ ایک قدیم تقسیم کے مطابق بارہ مروجہ سروں سے بہتر ٹھاٹھ پیدا کئے گئے ہیں۔ سات مختلف سروں کے مجموعہ کو جس میں سُر ترتیب وار لگائے جائیں ٹھاٹھ کہتے ہیں۔ چتر پنڈت نے ان ۷۲ ٹھاٹھوں میں سے صرف دس ٹھاٹھ انتخاب کئے ہیں اور ان میں وہ سب راگ آجاتے ہیں جو آجکل برتے جاتے ہیں۔ مروجہ بارہ سروں سے چونتیس ہزار آٹھ سو اڑتالیس راگ پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب کو علیحدہ علیحدہ یاد رکھنا ناممکن ہے اس لئے ٹھاٹھ بنائے گئے اور جن راگوں کے بنیادی سُر ایک سے ہیں انہیں ایک ہی ٹھاٹھ میں دکھا گیا۔ ٹھاٹھ کو خاندان سمجھنا چاہیئے اور اس سے متعلق راگوں کو افراد خاندان جیسے کسی خاندان کا نام لینے سے اس خاندان کے افراد کی جملہ خصائص ذہن میں آجاتی ہیں اسی طرح ٹھاٹھ معلوم ہوتے ہی اسکے راگوں کے اترے چڑھے سر سب واضح ہوجاتے ہیں۔ فی زمانہ کم و بیش دو سو راگ رواج میں ہیں اور دس ٹھاٹھ کی تقسیم کی وجہ سے انہیں یاد رکھنا چنداں دشوار نہیں ہے۔ ذیل میں چتر پنڈت کے دس ٹھاٹھ اور ان کے راگ درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) **کلیان ٹھاٹھ**:۔ ایمن۔ شدھ کلیان۔ بھوپ کلیان۔ ہمیر۔ کیدارا۔ چھایا نٹ۔ کامود۔ شام کلیان۔ ہنڈول۔ گونڈ سارنگ مالسری۔ ایمنی بلاول۔ چندر کانت۔ ساونی کلیان جیت کلیان۔

(۲) **بلاول ٹھاٹھ**:۔ بلاول۔ بہاگ۔ بہاگڑا۔ دیسکار۔ پہاڑی۔ ککب۔ سنکرا۔ نٹ۔ مانڈ۔ سرپردہ۔ الیا۔ گن کلی۔ شکل۔ نٹ بلاولی ہنس دھن۔ لچھا ساکھ۔ بیہم۔ درگا۔ ملوہا کیدارا۔ دیوگری۔ جلدھر کیدارا پٹ منجری۔

(۳) **کھماج ٹھاٹھ**:۔ کھماج جھنجھوٹی۔ سورٹھ۔ دیس۔ کھمباوتی۔ تلنگ۔ درگا۔ سداگیسری۔ جے جے ونتی۔ گونڈ ملار۔ نٹ ملار۔ تلک کامود۔ برہنس بھارا۔ نارایئی۔ پرتاب ورالی۔ ناگ سُر اولی۔

(۴) **بھیروں ٹھاٹھ**:۔ بھیروں۔ کالنگڑا۔ میگھ رنجنی۔ سوراشٹر۔ جوگیا۔ لام کلی۔ پربھاوتی۔ بھاس۔ للت پنچم۔ گوری۔ ساویری۔ بنگال بھیروں۔ شیومت بھیروں۔ اتند بھیروں۔ گن کلی۔ اہیر بھیروں۔ زیلف

(۵) **بھیرویں ٹھاٹھ**:۔ بھیرویں۔ مالکوس۔ اساوری۔ دھناسری۔ بھوپالی۔ زنگولہ۔ موٹکی۔ سدھ ساونت۔ بسنت مکھاری۔ بلاس خانی توڑی۔

(۶) **اساوری ٹھاٹھ**:۔ اساوری۔ جونپوری۔ دیوگندھار۔ سندھ۔ اڈانہ۔ کوسی۔ درباری۔ دیسی۔ کھٹ۔ الھیری۔

(۷) **توڑی ٹھاٹھ**:۔ شدھ توڑی۔ گوجری۔ میاں کی توڑی۔ ملتانی۔ بہادری توڑی۔

(۸) **پوربی ٹھاٹھ**:۔ پوربی۔ گوری۔ ریوا۔ بھاس۔ دیپک۔ ترپنی۔ مالوی۔ سری راگ۔ جیت سری۔ بسنت۔ پرج۔ دھناسری۔ پوریا دھناسری ہنس نرائن۔

(۹) **مارواٹھاٹھ**:۔ ماروا۔ پوریا۔ سوہنی۔ براری۔ جیت جھنکار۔ لھٹیا۔ بھاس۔ سازگری۔ مالیگورا۔ پنچم۔ پوریا کلیان۔

(۱۰) **کافی ٹھاٹھ**:۔ دھناسری۔ سیندھوی یا سیندورا۔ کافی۔ دھانی بھیم پلاسی۔ بہار۔ مدھ ماد۔ باگیسری۔ حسینی کانہرا۔ میگھ ملار۔ رام داسی ملار میاں کی ملار۔ میرا بائی کی ملار۔ سوہا۔ نیلامبری۔ سور ملار۔ پردیپکی۔ شہلنا۔ دیو ساکھ۔ بینس کنکنی۔ بندارانی۔ پیلو۔ کوسی کانہرا۔ نائیکی کانہرا۔ میاں کا سارنگ۔ سگھرئی۔ سدھ سارنگ۔ بروا۔ ساونت سارنگ۔ سری رنجنی۔ لنکدھن

مرقومہ بالا راگوں کے علاوہ بھی بیسیوں راگ گائے جاتے ہیں۔ ان کی سرگم کرکے دیکھ لیا جائے تو معلوم ہوسکتا ہے کہ کس ٹھاٹھ سے ان کا تعلق ہے۔ یا اگر کسی راگ کا ٹھاٹھ معلوم ہوجائے تو راگ کے سروں کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ انہی دس ٹھاٹھوں سے سب راگ نکلے ہیں اسلئے یہی صحیح اور اصولی تقسیم ہے اور یہی سسٹم ہندوستانی سنگیت میں آجکل مروج ہے۔

ہندوستانی موسیقی میں کہانیوں اور روایتوں کو بہت دخل ہے، اتنا کہ روایت پرستی نے ہمارے ملک میں ایک مقدس فریضے کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اور روایات و توہمات جزو عقیدہ ہوگئے ہیں۔ دراصل شاعری کی طرح موسیقی میں بھی "مبالغہ" ایک صنعت ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ موسیقی ایک نہایت موثر فن ہے۔ انسان تو خیر اشرف المخلوقات ہے، جانور تک اسکے اثر سے مست و مسحور ہوجاتے ہیں۔ عرب میں جب کارواں روانہ ہوتے ہیں تو بدو ایک قسم کا گیت گاتے ہیں جسے حُدی کہتے ہیں۔ اسکے اثر سے اونٹوں کی رفتار تیز ہوجاتی ہے اور وہ بغیر تھکے منزل پر منزل مارتے چلے جاتے ہیں۔ یا دور کیوں جائیے آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ کالا زہریلا ناگ سپیرے کی پونگی پر کیسا جھومتا رہتا ہے۔ انسانی طبائع پر موسیقی کا اس سے بھی زیادہ اثر ہوتا ہے۔ کسی حکیم کا قول ہے "جن جذبات" دل کے اظہار سے زبان و الفاظ عاجز رہ جاتے ہیں ان کو نغمہ اپنے سروں، اپنی لے اور اپنے زمزموں سے ادا کرتا ہے۔ اور ایسی خوبی سے ادا کرتا ہے کہ نفس انسانی اس پر عاشق ہوجاتا ہے اور روح میں عجیب رقت و نرمی پیدا ہوجاتی ہے

مثل مشہور ہے کہ گانا اور رونا کسے نہیں آتا گانا انسانی سرشت میں داخل ہے۔ کسی میں یہ صلاحیت بالکل بیکار پڑی رہ جاتی ہے اور کوئی اسے بقدر ذوق بڑھالیتا ہے۔ یہاں تک کہ گاتے گاتے کلاونت ہوجاتا ہے۔ موسیقی کی اثر انگیزی سے کون انکار کرسکتا ہے؟۔ روح کی راحت اور قلب کے سکون کے لئے موسیقی کا کوئی حریف نہیں ہے۔ ہمارے اسلاف نے راگوں کی تاثیروں کو ان کی انتہائی اکمل صورت میں تصور کرکے عجیب عجیب روایتوں کا ترکہ ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ مثلاً پرانی تقسیم کے چھ راگوں کے اثرات یوں بیان کئے ہیں۔

(۱) بھیروں راگ کے گانے سے بغیر کسی کی اعانت کے کولھو خود بخود چلنے لگتا تھا۔

(۲) مالکوس کے گانے سے بہتا ہوا پانی رک جاتا تھا۔ اندھیرے میں روشنی ہوجاتی تھی۔ (۳) ہنڈول کے گانے سے جھولا از خود جنبش میں آجاتا اور لالہ و گل سرسبز ہوتے تھے۔ (۴) دیپک کے گانے سے آگ لگ جاتی تھی اور چراغ خود بخود روشن ہوجاتے تھے۔ (۵) سری راگ کے گانے سے وحش و طیور اور انسان تک بیہوش ہوجاتے تھے اور آندھی سیاہ آجاتی تھی۔ (۶) میگھ کے گانے سے مینہ برسنے لگتا تھا۔

ان کے علاوہ بعض اور راگنیوں کے بھی عجیب و غریب اثرات بتائے گئے ہیں، مثلاً سوہنی گانے سے مینہ برسنا بند ہوجاتا تھا۔ ٹوڈی گانے سے ہوا چلنی بند ہوجاتی تھی۔ سارنگ گانے سے حیوان اور انسان پریشان و حیران بلکہ سکتہ اور محویت میں ہوجاتے تھے۔ زیلف گانے سے سوکھے ہوئے درختوں میں سبز پتے پھوٹ آتے تھے اور مردہ دل سے مردہ دل انسان کی طبیعت بشاش ہوجاتی تھی۔ پوربی کے گانے سے پتھر موم ہوجاتے تھے۔

سائنس اور عقلیات کے موجودہ ترقی یافتہ دور میں یہ سب باتیں مبالغہ آمیز حکایتیں معلوم ہوتی ہیں۔ تاثیر کے سلسلے میں اتنا ضرور دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر انسانوں پر وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ کوئی تڑپ اٹھتا ہے کوئی سر دھننے لگتا ہے اور کسی پر رقت طاری ہوجاتی ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ کچھ ایسی حالت طاری ہوجاتی ہے کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کرجاتی ہے۔ ہمارے فنکاروں کا بے امتیاز مذہب اب بھی یہی عقیدہ ہے کہ راگوں میں وہی تاثیریں ہیں جنکا مذکور ہوچکا ہے۔ لیکن اب اس وجہ سے اثر نہیں رہا کہ اس فن میں لالچ اور دنیاداری داخل ہوگئی۔ اگلے تائک اس علم کو عبادت تا کرتے تھے اور اس میں ان کا انہماک اور کمال اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ سحر و اعجاز کے کرشمے ان سے صادر ہوتے تھے۔ اب طلبِ زر اور نفسانیت کا دخل ہوگیا ہے۔ نہ تو وہ اگلی سی ریاضت ہے اور نہ خلوصِ نیت۔ وہ اثر ہو تو کیونکر؟ (باقی)

غزل

ضیا فتح آبادی

دامِ خیال کے لئے وسعتِ کائنات ہے
کون و مکاں پہ حکمراں میں ہوں مری حیات ہے

لے کے چراغِ بیخودی، صبحِ نشاط کر تلاش
دسترسِ خودی سے دور حسنِ ازل کی ذات ہے

چھیڑ ترانۂ اُمید، قلب و نظر جھنجھوڑ دے
کھوئی ہوئی سی یاس میں محفلِ شش جہات ہے

غم سے نجات کیا ملے، غم جو نہیں تو کچھ نہیں
دل کی تڑپ حقیقتاً حاصلِ کائنات ہے

نورِ حیات تجھ سے ہے، کیفِ حیات تجھ سے ہے
دن ہے نہ دن ترے بغیر اور نہ رات رات ہے

درسِ جنوں ہے گمرہی، خضر کی بات پر نہ جا
موت قیام کا ہے نام اور سفر حیات ہے

چاند نے جگمگا دیا، شمع نے گنگنا دیا
عشق نہیں تو زندگی ایک اندھیری رات ہے

حسن فریبِ ذوقِ دید، عشق طلسمِ سوزِ قلب
حسن نہیں ہے پائدار، عشق بھی بے ثبات ہے

گوشۂ ذہن میں ترے، میرا کہیں نشاں نہیں
یاد ہے تو مگر مجھے اب بھی، عجیب بات ہے

شادی و غم سے اے ضیا، کوئی اثر نہ لیجئے
نور فشاں ہے دن کہیں تیرگی بیز رات ہے

غزل

شفیع منصور

پھر وہ کاشانۂ غم ہائے کہن یاد آیا
دلِ آسودۂ غربت کو وطن یاد آیا

آج پھر بلبلِ بیکس کو باندازِ دگر
آشیاں جس میں جلا تھا، وہ چمن یاد آیا

جو مجھے بھول گیا دردِ محبت دے کر
پھر وہی چارہ گرِ رنج و محن یاد آیا

در و دیوار کی صورت نہ رہی وا افسوس
میں وطن میں کبھی پہنچا تو وطن یاد آیا

ایک فریادِ مجسم تھا وہ ہنگامِ وداع!
عشقِ مجبور کا اندازِ سخن یاد آیا

یاد آیا دلِ منصور کو پھر جادۂ شوق
پھر وہ اک سلسلۂ دار و رسن یاد آیا

دو غزلیں

ادیبؔ مالیگانوی

غمِ دل اب اتنا بھی بڑھتا نہ جائے
وہ دیکھیں مجھے اور دیکھا نہ جائے

جسے خوف ہو میری دیوانگی سے
وہ خود آئے، اور آ کے سمجھا نہ جائے

چمک جائے تاروں سے پھولوں سے رنگت
مگر دل سے تیری تمنّا نہ جائے

سجائی تو ہے انجمن حسرتوں سے
دل اس "انجمن" سے بھی اُکتا نہ جائے

محبت کی مجبوریاں، اللہ اللہ
نظر سے بھی اُن کو پکارا نہ جائے

وہ کشتی جو نکلی ہے طوفاں سے بچ کر
کہیں جا کے ساحل سے ٹکرا نہ جائے

زباں چپ، دل اُمڈا ہوا، گرم آنسو
کہیں ایسے عالم میں تو آ نہ جائے

کرم کے فسانے ہیں اُن کی زباں پر
ہنسی، مجھ کو بے ساختہ آ نہ جائے

ادیبؔ اس جوانی کا قائل نہیں ہے
فرشتوں کا دل جس سے تھرا نہ جائے

غم کیا؟ مری خوشی بھی جو ناکام ہو چکی
تیری خوشی تو، گردشِ ایام ہو چکی

کیا ظلم ہے کہ اُن کی خموشی کے ساتھ ساتھ
اُن کی نگاہِ ناز بھی بدنام ہو چکی

دل "زخم آشنا" ہے ترے التفات کا
اب مجھ سے سعیٔ راحت و آلام ہو چکی

ہاں اے زبانِ عشق، کوئی تازہ واردات
دنیا تمام منکرِ الہام ہو چکی

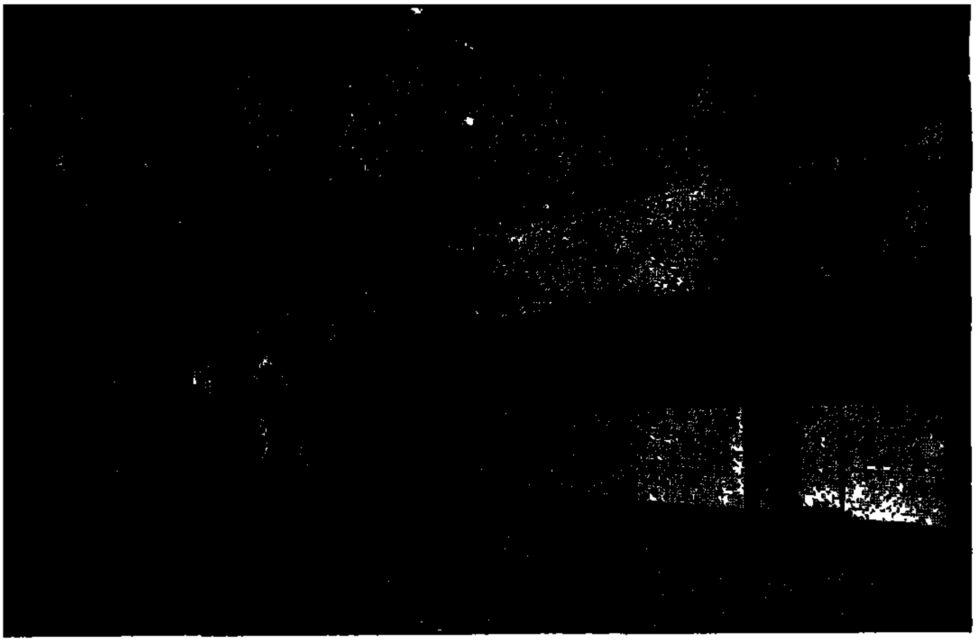
اے دل، رہینِ خوابِ تمنّا کہاں تلک
کم بخت، اب تو ہوش میں آ، شام ہو چکی

دل ہے کہ ہر شکست پہ ہوتا ہے مشتعل
سو بار سرنگوں ہوسِ خام ہو چکی

جس زندگی کو ناز تھا، تیری پناہ کا
وہ زندگی بھی خیر سے ناکام ہو چکی

مجھ سے نہ پوچھ، میری تباہی کی داستاں
آنکھیں اِدھر کھلی تھیں، اُدھر شام ہو چکی

اٹھ جاؤ لے کے اپنا "مذاقِ نظر" ادیبؔ
وہ بزمِ خاص، انجمنِ عام ہو چکی



مرے درجہ کی نئی
گاڑیاں

اڑی کا ایک عام نظارہ ان
ں کے تیسرے درجوں کے
کو موجودہ درجوں سے
ایک سو تیس مربع فٹ
جگہ دبکتی ہے۔ اس سے
وں کو بھی آرام ملے گا اور
اسباب کے واسطے بھی زیادہ
جگہ نکل آئی ہے۔ ←

'ہندوستان ایئر کرافٹ لمیٹیڈ'
بنگلور کی بنائی ہوئی تیسرے
درجہ کی ایک نئی گاڑی۔ ان نئی
گاڑیوں کی ایک خصوصیت یہ ہے
کہ انکے کواڑ اندر کی طرف
کھلتے ہیں اور پکڑنے کے ڈنڈے
بھی اندر ہی کی جانب ہیں۔
اسکی وجہ سے مسافر پائیدانوں
→ پر سفر نہیں کرسکیں گے

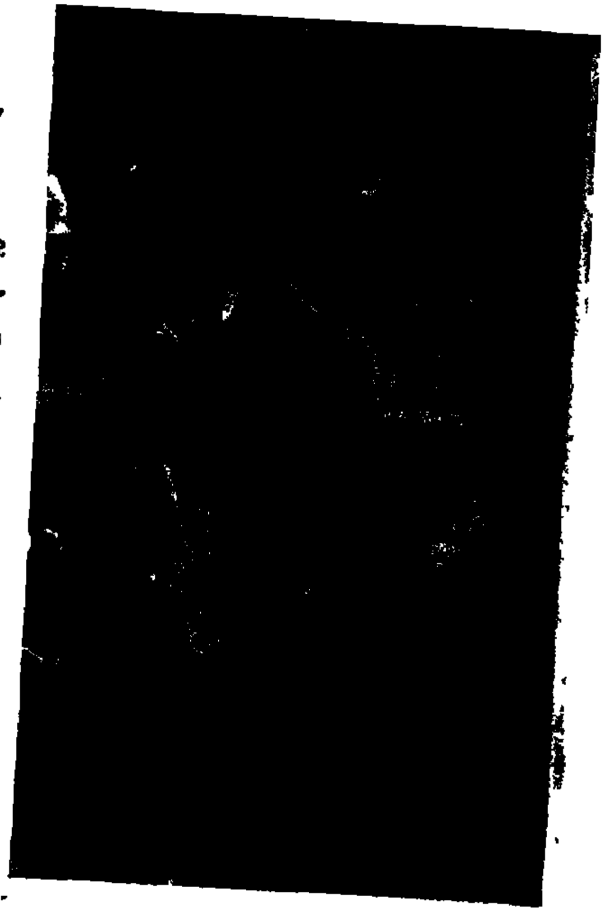


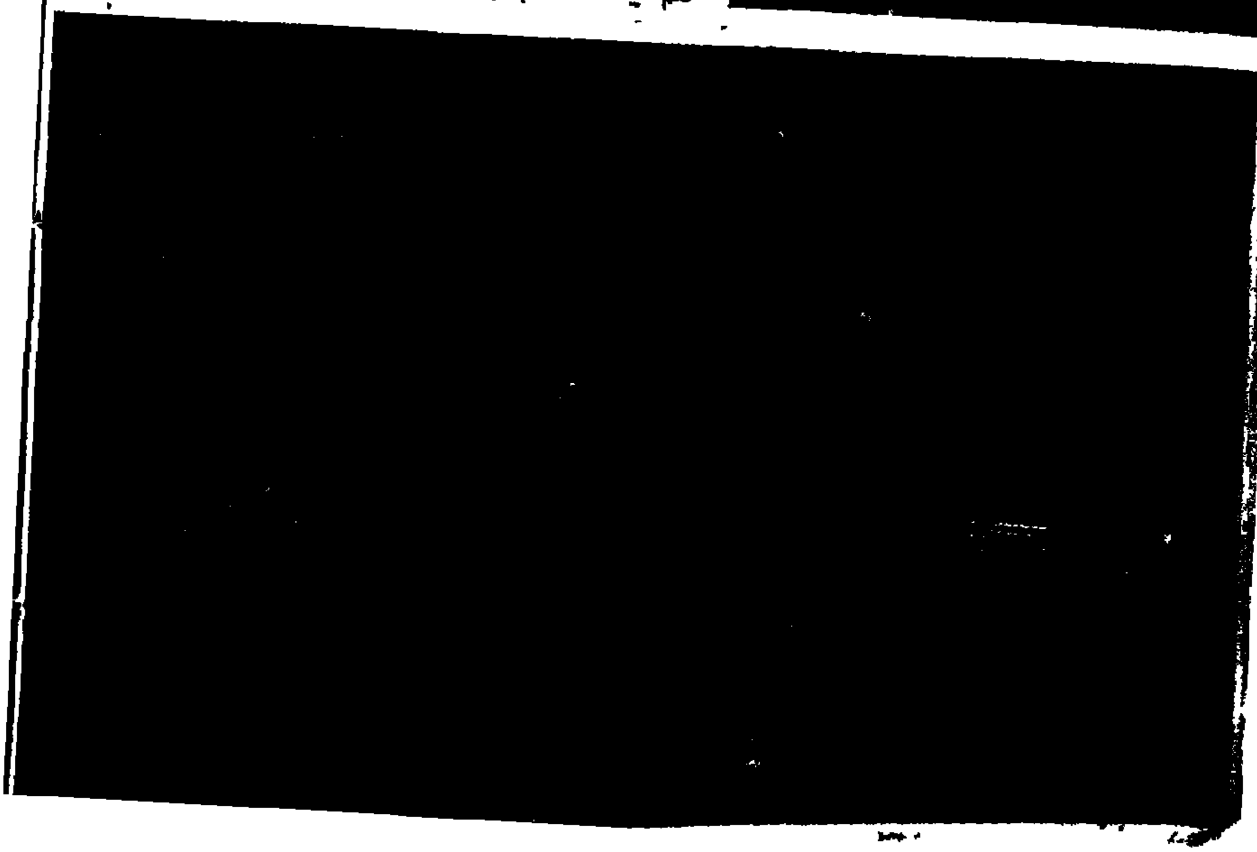


نئی وضع کی ہلکی گاڑیوں کا ایک درجہ۔ سیٹیں آرام دہ اور کشادہ ہیں۔
سیٹوں تک جانے اور چلنے پھرنے کے واسطے دو فٹ چوڑا راستہ
چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس سے مسافروں کو نقل و حرکت میں کوئی
دقت نہ ہوگی۔ ←

چین کے دریائی مکانات

چین ایک عجیب و غریب ملک ہے اسکی تاریخ دلچسپ بھی ہے اور غم انگیز بھی۔ گزشتہ چار ہزار سال سے یہ ملک طوفان' قحط' بیماری' افلاس اور جنگ کا شکار چلا آرہا ہے۔ ان مصیبتوں کے باوجود چینی عالم' ادیب اور فنکار خدمت خلق' مساوات' اخوت اور بلند اخلاق کا سبق دیتے اور اعلی سے اعلی حسین فن پارے دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں۔ میدان جنگ میں بھی یہ لوگ ہیٹے نہیں رہے ہیں۔ یاتو حملہ آور غنیم کو پسپا کردیا یا پھر رفتہ رفتہ اسکو اپنے اندر جذب کرلیا۔ ملک بہت وسیع ہے لیکن یہاں کی آبادی کیلئے ہمیشہ نا کافی رہاہے اسی لئے انہوں نے خشکی کے علاوہ اپنے بڑے بڑے دریاؤں میں بھی رہنے سہنے کے مستقل مکانات بنا ڈالے مکان کیا ہیں بڑی بڑی کشتیاں ہیں جن میں ضروریات کا سب سامان موجود رہتا ہے پرل دریا میں اس قسم کے مکانات سب سے زیادہ تعداد میں ہیں۔

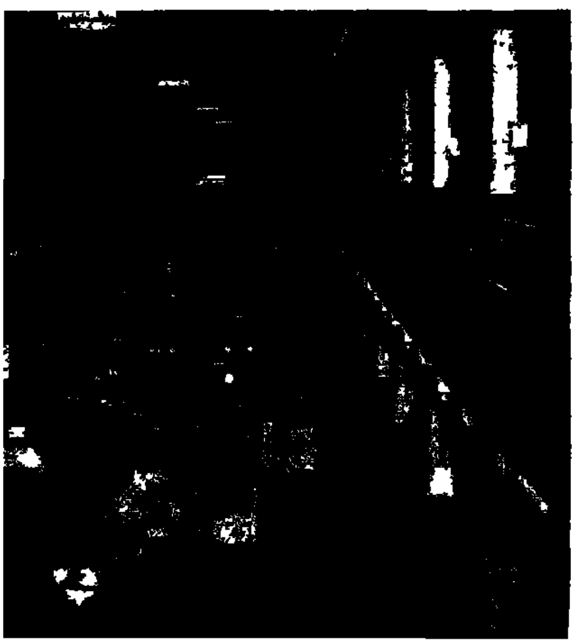






لندن کے ' پیٹنٹ آفس ' کا عدالتی کمرہ۔ معترضین اپنے دعوے اسی عدالت میں دائر کرتے ہیں اور فریقین کے بیانات وغیرہ سنے جاتے ہیں۔ اس عدالت کے فیصلہ کے خلاف اپیل عدالت عالیہ میں ہو سکتی ہے۔

پیٹنٹ آفس کا محافظخانہ۔ ۱۸۵۵ء سے لے کر ابتک جو جو پیٹنٹ کی جا چکی ہیں انکی مکمل یاد داشت یہاں موجود ہے۔ بہت تھوڑی سی رقم کی ادائیگی پر جو چاہے دیکھ سکتا ہے۔



ایجادات کا تحفظ

جب کوئی انجینئر یا سائنسدان کوئی نئی چیز ایجاد کرتا ہے اور اپنی ایجاد سے تجارتی منافع اٹھانا چاہتا ہے تو وہ سب سے پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اپنے ملک کے پیٹنٹ آفس میں پیٹنٹ حاصل کرنے کی درخواست دیتا ہے۔ درخواست پہونچنے پر یہ دفتر ضروری تحقیقات کرتا ہے اور جب یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ وہ چیز واقعی اسی شخص کی ایجاد ہے اور اس سے پہلے اسی چیز کیلئے کوئی اور شخص پیٹنٹ حاصل نہیں کرچکا ہے تو درخواست دہندہ کو پیٹنٹ دیدیا جاتا ہے۔

لندن کا پیٹنٹ آفس فلیٹ اسٹریٹ اور عدالتوں کے قریب ہی ہے عام طور پر پیٹنٹ کی مدت سولہ سال ہوتی ہے لیکن اگر کوئی اس عرصہ میں کافی رقم پیدا نہیں کر سکتا تو اس مدت میں توسیع کر دی جاتی ہے۔



بحرین کے تیل کے کارخانے کا ایک حصہ جہاں تیل صاف کیا جاتا ہے۔

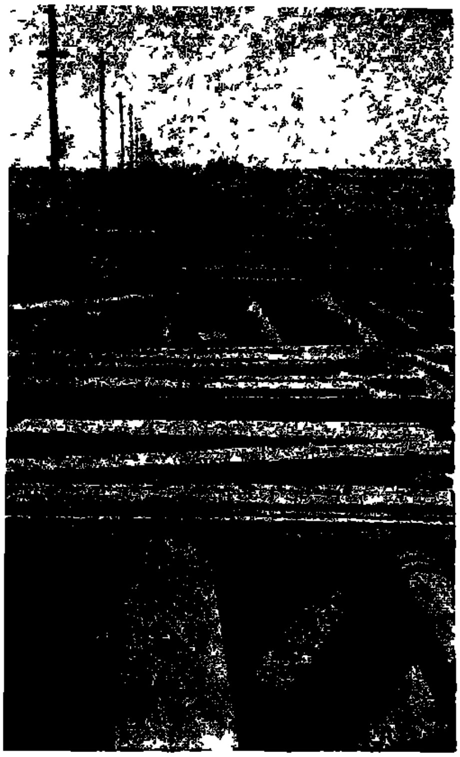
بحرین میں تیل صاف کرنے کے کارخانے

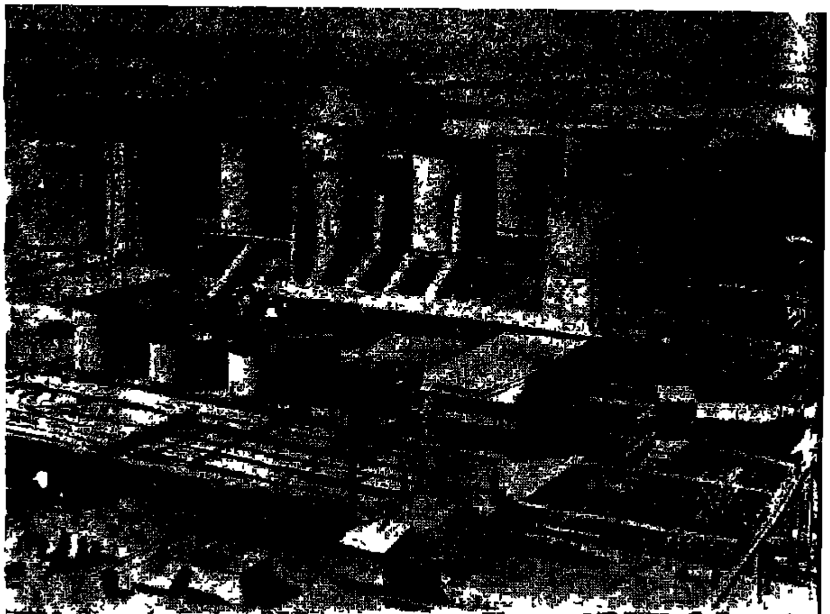
مشرق وسطیٰ کے بہت سے ملک تیل کی وجہ سے بڑے خوشحال اور دولتمند بنے ہوئے ہیں۔ انہی ملکوں میں بحرین بھی ہے۔ بحرین کی سالانہ آمدنی کا اکثر حصہ تیل ہی سے وصول ہوتا ہے۔ بحرین کا رقبہ تقریباً دوسو مربع میل ہے اور اسکی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ اتنے چھوٹے سے ملک کی ایک سال کی آمدنی کا (صرف تیل سے) چھبیس لاکھ روپیہ ہونا ایک غیر معمولی بات ہے۔ تیل روزانہ کی زندگی ہی میں کافی اہمیت کا حامل ہے مگر جدید طرز کی جنگ نے تو اسکی اہمیت میں اور بھی زیادہ اضافہ کر دیا۔

شیخ البحرین نے ۱۹۳۰ء میں 'بحرین پیٹرولیم کمپنی' کو تیل نکالنے کا ٹھیکہ دیا تھا لیکن ۱۹۳۲ء میں تیل برآمد ہوا۔ بحرین کی اکثر آبادی عربوں کی ہے۔ ان عربوں کے تعلقات ۱۹۲۰ء سے حکومت ہند کے ساتھ بڑے خوشگوار چلے آتے ہیں۔ بہت قدیم زمانے سے یہ جزیرہ موتیوں کے لئے مشہور چلا آتا ہے۔ یہاں ماہی گیری کے اڈے بھی بہت اچھے ہیں۔

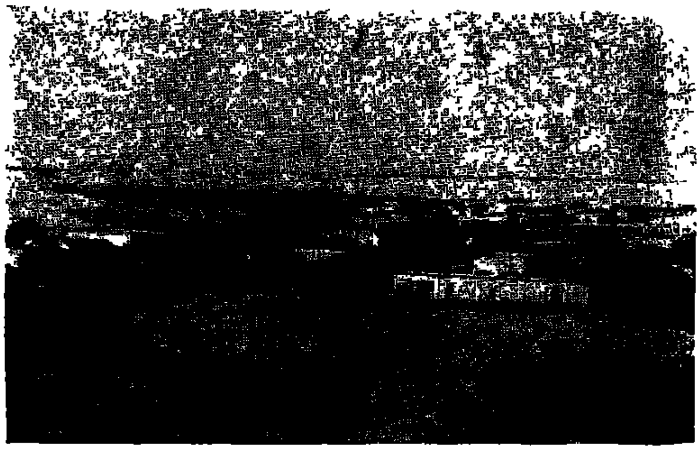
تیل کی برآمد کے بعد سے موتیوں کا کاروبار ٹھنڈا پڑ گیا۔ جنگ کے زمانہ میں یورپ اور امریکہ کے بازار موتیوں کیلئے بند رہے اسلئے اب سب سے اہم تجارت تیل ہی کی ہے 'بحرین پیٹرولیم کمپنی' جسکے پاس بحرین کے تیل کا ٹھیکہ ہے' کیلیفورنیا کی 'اسٹینڈرڈ آئل کمپنی' اور 'ٹکساز کارپوریشن' ہی کی ایک شاخ ہے گو پیٹرول سب سے زیادہ مقدار میں برآمد ہوتا ہے اور اسکی برآمد کی سالانہ مقدار چار لاکھ ٹن سے بھی زیادہ ہے لیکن مٹی کا تیل' ایندھن کے کام آنے والا تیل اور چکنا کرنے کا تیل بھی دستیاب ہوتا ہے۔ جنگ کے زمانہ کے ایک سال میں یہاں سے سات لاکھ سے زیادہ پیٹرول کی برآمد ہوئی۔ اتحادیوں کی امداد کے سلسلہ میں بحرین کی یہ امداد بڑی قابل قدر ہے۔

مخصوص جغرافیائی محل وقوع' عمدہ بندرگاہوں اور ہوائی اور آبی جہازوں کے اچھے ٹھکانوں کی وجہ سے بحرین یورپ اور ہندوستان کے درمیانی ہوائی راستہ پر ایک اہم حیثیت کا مالک ہے۔





ین سے نکالکر تیل کو یہاں جمع کیا جاتا ہے۔ ان ٹرنکوں کی سمائی بہت زیادہ ہے
، کو کارخانے سے بندرگاہ سینترانک ان ہی بڑے بڑے ٹنکوں کے ذریعہ لے جایا جاتاہے۔



دوروں کے مکانات۔ تیل کے میدانوں اور کارخانوں میں شدید آب و
ا کی وجہ سے کام کرنا بڑا کٹھن ہوتا ہے اسلئے کمیروں کو رہن
سہن کا ہر طرح کا آرام پہونچایا جاتا ہے



یہاں بھی کارخانہ میں کام کرنے والوں کے مکانات ہیں۔
بہت اچھی طرز کے بنائے گئے ہیں۔

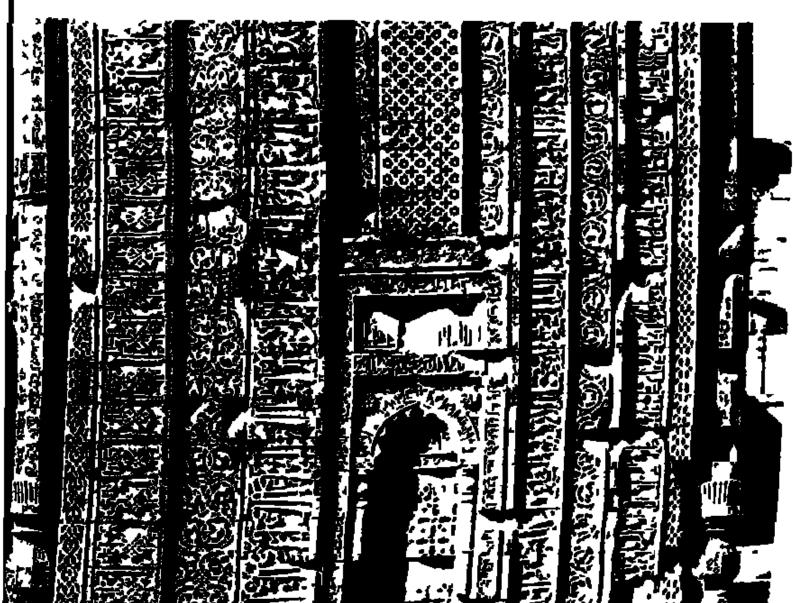


ا

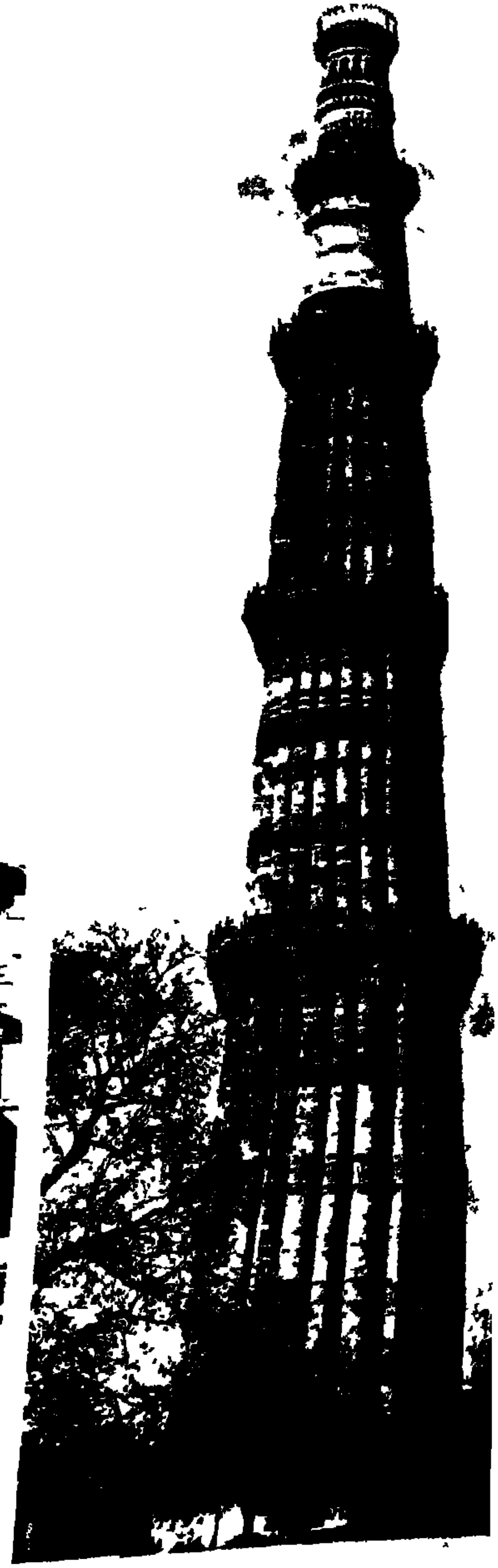
سرین
ٹرولیم کمپنی
تر۔عمارت
، جدید
کی ہے۔

قطب مینار

دہلی صدہا سال تک ہندو راجاؤں اور مسلمان بادشاہوں کی پایۂ تخت رہ چکی ہے اسلئے یہاں بیشمار تاریخی عمارتیں اتک موجود ہیں۔ ان میں قطب مینار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسکی تعمیر کو تقریباً سات سو سال گزر چکے ہیں اور اس دوران میں اس نے زمانہ کے سینکڑوں انقلاب دیکھے ہیں۔ یہ مینارہ قطب الدین ایبک کا بنایا ہوا ہے۔ اسکی پانچ منزلیں ہیں کل اونچائی ۲۳۸ فٹ ہے اور اوپر تک پہونچنے کیلئے زینہ ہے جو بالائی حصہ میں زیادہ تنگ ہوگیا ہے، پھر بھی شوقین لوگ سب سے اوپر کی چوٹی تک پہونچ ہی جاتے ہیں۔ جس ملک کے بھی سیاح یہاں آئے انہوں نے اس مینار کے بنانے والوں کی مہارت اور کمال کی داد ضرور دی۔



سلطان التمش کی مسجد کی دیواروں پر آیات قرآنی۔ ظاہر ہے کہ پتھر میں ان آیات کو کندہ کرنے میں کتنی دقت ہوئی ہوگی اور وہ سنگتراش جنہوں نے یہ ریزہ کاری کی ہے اپنے فن کے کیسے ماہر ہونگے۔



عجیب و غریب مینڈک

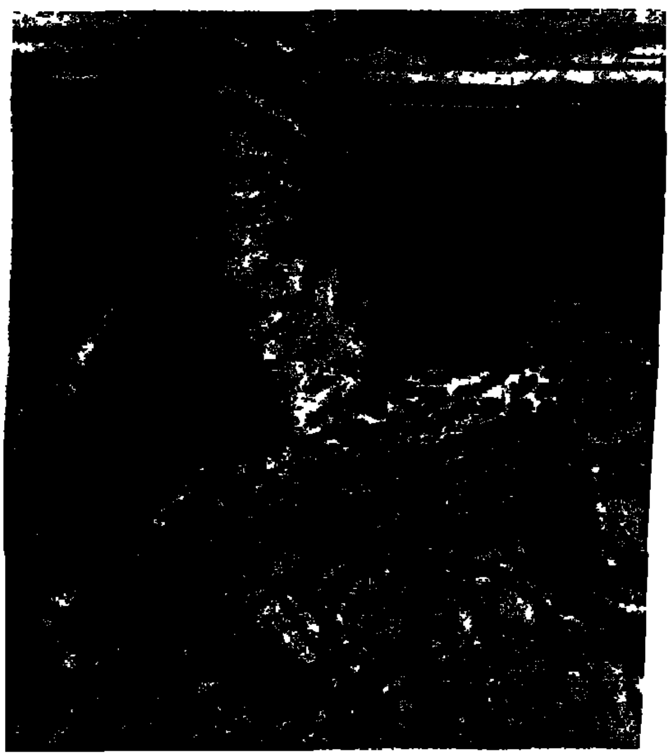
امریکہ میں ایک بہت بڑی قسم کا مینڈک پایا جاتا ہے جو اپنی اصل حالت پر بہت سے مدارج طے کرکے پہونچتا ہے۔ انڈے سے نکل کر یہ خوب کودتا پھاندتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اسکا جسم بڑھتا ہے۔ پہلے منہ بہت تنگ ہوتا ہے اور دم بہت لمبی۔ منہ رفتہ رفتہ چوڑا ہوتا جاتا ہے اور دم گھٹنے لگتی ہے۔ ٹانگیں بھی رفتہ رفتہ بڑھتی ہیں۔ ایک پورے طور پر پرورش یافتہ مینڈک چھ انچ لمبا ہوتا ہے اور دس فٹ کی چھلانگ مارسکتا ہے۔ اسکی آواز اس قدر تیز ہوتی ہے کہ پون میل تک سنائی دیتی ہے جس سے سونے والوں کی نیند میں بڑا خلل پڑتا ہے۔



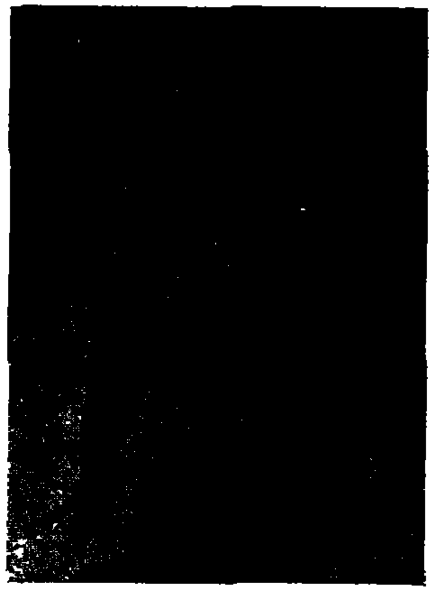
مینڈک کے یہ بچے ابھی انڈوں سے نکلے ہیں اور اپنی نئی دنیا میں خوب کود پھاند رہے ہیں۔ اگلے سال سے ان میں جسمانی تبدیلی شروع ہوگی۔



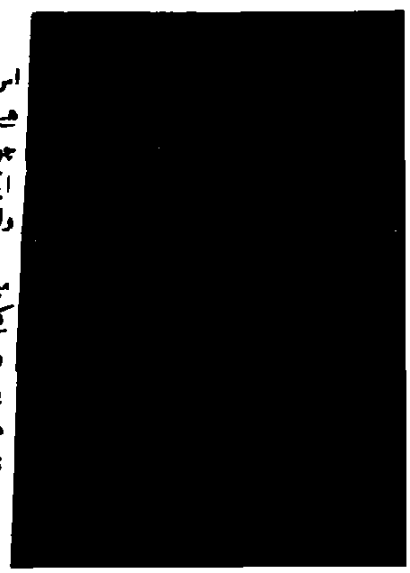
بچہ کا منہ جبتک پورے طور پر چوڑا نہ ہو جائے یہ کچھ کھانے کے قابل نہیں ہوتا اس عرصہ میں یہ اپنی دم کو اندر ہی اندر سٹکتا رہتا ہے۔



اس بچے کی پچھلی ٹانگیں نکل آئی ہیں گو ابھی اسکے لئے بیکار ہیں لیکن ایک دن یہی ٹانگیں اسکو بے پناہ تیراک بنا دینگی۔



اس مینڈک کی دم غائب ہوچکی ہے۔ منہ پورے طور پر چوڑا ہوچکا ہے اور اب یہ ایک نئی دنیا میں پہونچنے والا ہے۔



مینڈک کی اگلی ٹانگیں کھال کے اندر ہی اندر بڑھتی رہتی ہیں۔ مکمل ہوجانے کے بعد ایک دم پھوٹ نکلتی ہیں۔ اس بچہ کی ایک ٹانگ نکل آئی ہے اور دوسری نکلنے والی ہے۔ ←



ہر دلعزیز فلمی ستارہ اشوک کمار   فلم «شکاری» میں

اردو غزل گوئی کی نئی کروٹ

ابن الحسن رضوی

۱۵ اپریل سنہ ۱۹۴۶ء کے آجکل میں حضرت عطار السر پالوی کا مضمون "غزل کا مستقبل میری نظر میں" دیکھ کر میں نے یہ سمجھا تھا کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی اور پروفیسر کلیم الدین احمد کے صنف غزل پر پیہم حملوں سے جو غزل کے طرفداروں میں ایک عام بے چینی پھیلی ہوئی ہے اس کا ازالہ صاحب مضمون نے اس طرح کرنا چاہا ہے کہ اس کے مستقبل کا ایک روشن خاکہ پیش کر کے یہ ثابت کیا جائے کہ اگرچہ موجودہ غزل پر نیم وحشیانہ صنف شاعری کا الزام ہے لیکن اس میں وہ صلاحیتیں موجود ہیں جن کو بروئے کار لا کر غزل کو اصناف سخن میں ایک خاص جگہ دی جا سکتی ہے۔ مضمون کو پڑھنے کے بعد میرا خیال ایک حد تک صحیح نکلا۔ حضرت پالوی نے ایک مختصر تمہید میں جس میں علامہ نیاز، ڈاکٹر عندلیب اور میرزا صر علی کے مقولے شامل ہیں یہ فرمایا ہے کہ ہندی شاعری کو تمام دنیا کی شاعری میں محدود و ممتاز درجہ ملنے کی محقق وجہ یہ تھی کہ...... اس میں جذبات محبت عورت کی طرف سے اور عورت کی زبان سے ادا ہوتے تھے۔ اس میں مخاطب معشوق مرد بلکہ شوہر ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ یہ اشعار حد درجہ چٹیلے، البیلے اور رسیلے ہوتے تھے...... مگر واقعاتی اعتبار سے ان میں ایک نقص باقی رہتا تھا۔ وہ یہ کہ گو اس میں سب کچھ عورت ہی کی طرف سے ہوتا تھا مگر اس کو بیان کرنے والے عبدالرحیم، تلسی داس، بیاکو، سورداس، رسیں اور بہاری لال وغیرہ تھے جو مرد تھے حقیقتاً کوئی عورت نہ تھی اور اس صورت سے گویا ایک جھوٹ بولا جاتا تھا اس لئے کہ مرد نسوانی جذبات کو تمامتر سمجھنے اور بیان کرنے سے قدرتاً مجبور ہے اور شاید اسی وجہ سے ایسی شاعری کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہو سکا۔

اس تمہید کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ "اس میں شک نہیں کہ بیانیہ اسباب جن کی بنا پر یہ حکم کہ اردو غزل میں جو کمی و کوتاہی محسوس کی گئی ہے وہ غلط نہیں مگر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ زمانہ نے جو نئی کروٹ لی ہے اس کے پیش نظر اب اس کا کوئی اندیشہ نہیں کہ اردو زبان کی حیات میں غزل کو موت آ جائے۔ اس لئے کہ وہ نئی کروٹ جو زمانہ نے لی ہے یہ ہے کہ ہندی شاعری کی طرح اردو غزل میں بھی جذبات محبت عورت کی طرف سے عورتوں کی زبان میں بیان کئے جا رہے ہیں اور ایک جا نقص جو ہندی شاعری کا یہ تھا کہ بیان کرنیوالے بھی مرد تھے اس کو بھی دور کر دیا گیا ہے اور پڑھی لکھی عورتیں اپنے جذبات اپنی زبان میں بیان کرنے لگی ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عورت کی غزل گوئی سے غزل کی دونوں داخلی اور خارجی کوتاہیاں دور ہو گئی ہیں اور غزل کی پہلی داغ بیل اب پڑی اور اس کا اصلی دور اب شروع ہوا ہے جبکہ عورت نے غزل کہنا شروع کیا اور اس صورت میں غزل کا مستقبل تاریک ہونا کیا معنی پہلے سے بھی زیادہ تابناک ہے۔"

غزل پر جو اعتراضات ہوئے ہیں وہ صرف بیانیہ اسباب کی بنا پر نہیں کئے گئے ہیں بلکہ اصل اعتراض یہ ہے کہ غزل کا قوام اور اس کی ہیئت ترکیبی ایسے عناصر کی مرہون منت ہے جو اس کو صنف سخن کے دائرہ سے خارج کر دیتے ہیں۔ اصناف سخن کے لئے ضروری ہے کہ وہ شاعر کے تخیلی تجربات کے اظہار کے ایسے ذریعے ہوں جن کے ذریعہ شاعر بلا تکلف اظہار خیال کر سکے۔ شاعری نام ہے فطرت کے غائر مطالعہ سے پیدا شدہ تجربات اور ان تجربات کے پیدا کئے ہوئے تاثرات کے مکمل و موزوں بیان کا۔ شاعر کی قوت حاسہ، اس کا بلند پرواز تخیل، اس کا تیز ادراک اسی عالم رنگ و بو سے رنگین و دلکش تجربات حاصل کرتے ہیں اور جب وہ ان تجربات کو بیان کرتا ہے تو یہ اس کے مختلف اثرات، جذبات اور ان کے مکمل، صاف اور مربوط نقوش کی شکل میں شاعر کے واردات قلبی اور ان کے داخلی اور خارجی مشاہدات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اصناف سخن شاعر کے لئے صرف ذریعہ اظہار ہیں اور غزل بحیثیت ایک صنف سخن کے صرف اسی حالت میں قابل قبول ہو سکتی ہے کہ شاعر کے تجربات کے انکشاف کا ذریعہ ہو لیکن غزل اپنی ہیئت ترکیبی کی وجہ سے اس صلاحیت سے محروم ہے کہ اس میں بلند پایہ اور اعلیٰ قسم کی شاعری کی جا سکے۔ ردیف کی قید سے آزاد ہو کر بھی اعلیٰ قسم کی شاعری ممکن نہیں ہے اس لئے کہ غزل کے اشعار ایک دوسرے سے غیر متعلق اور معناً بالکل الگ ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں کسی تجربہ کا مربوط و مکمل بیان بالکل محال ہے۔ یہ کہنا کہ غزل کا ہر شعر ایک مکمل خیال کا اظہار کرتا ہے اس لئے بلند پایہ شاعری کے محاسن کا حامل ہوتا ہے شاعری کی غلط تعریف پر مبنی ہے۔ شاعری کسی ایک خیال کے مکمل اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ مختلف تجربات اور ان سے پیدا شدہ

تاثرات کا مربوط و مکمل بیان ہے۔ اس میں خیال کی ابتدا، وسط اور انتہا کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ غزل میں سرے سے اس کی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ شاعر کے تخیلی تجربات کے اس طرح اظہار میں مدد دے۔ پالوی صاحب شاعری کے بنیادی اصولوں کے پیش نظر اگر یہ ثابت کرسکتے کہ اردو غزل گوئی نے جو نیا دور شروع کیا ہے اس میں بلند پایہ شاعری ہوسکتی ہے یا ہونے کا امکان ہے تو یہ فرمانا بجا ہوتا کہ "غزل کی صحیح داغ بیل اب پڑی ہے"۔ حضرت پالوی صاحب نے غزل کے مستقبل کو تابناک بننے کے لئے صرف دو چیزوں کو ضروری خیال کیا ہے (۱) عورت کی طرف سے اظہار محبت جو ہندی شاعری کی خصوصیت ہے۔ اور (۲) عورتوں کی زبان میں عورتوں کا اظہار الفت جو اردو غزل کو ہندی شاعری سے ممیز کرتا ہے۔ لیکن کیا صرف یہ دو خصوصیتیں ہی بلند پایہ اور اعلیٰ شاعری کے لئے ضروری ہیں؟ میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ حضرت پالوی عورت کی جانب سے اظہار محبت کی بنا پر غزل کے مستقبل کو تابناک کہنے پر کیوں مصر ہیں جبکہ شاعری فی نفسہ اس سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی ہے۔ شاعری میں نہ تو مرد کی طرف سے اظہار الفت کی کوئی اہمیت ہے اور نہ عورت کی جانب سے اظہار محبت کی کوئی وقعت۔ شاعری کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ کون کہتا ہے بلکہ وہ تو یہ دیکھتی ہے کہ کیا کہا جارہا ہے۔ شاعری کی وسعت، عالمگیریت اور یہ زندگی کے ہر ادق اور اعلیٰ تجربات اور ان کے صاف و مکمل اظہار سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں عطاء اللہ صاحب کا عورت کی جانب سے اظہار پر خوش ہونا شاعری کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کے برابر ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور قابل غور ہے۔ پالوی صاحب فرماتے ہیں کہ "غزل کی صحیح داغ بیل اب پڑی اور اس کا اصلی دور اب شروع ہوا ہے جبکہ عورت نے غزل کہنا شروع کیا"۔ اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزل گوئی میں مردوں کا حصہ اب بالکل نہیں رہا اس لئے کہ غزل کی صحیح داغ بیل عورت نے ڈالی اور اس کا موضوع عورت کی طرف سے عورتوں کی زبان میں اظہار محبت رکھا گیا تو ایسی حالت میں اگر مرد غزل کہیں گے تو مندرجہ ذیل صورتیں پیدا ہوں گی اور عطاء اللہ صاحب کے خیال میں سب کی سب ناقص ہوں گی۔

(۱) پہلی صورت تو یہ ہوگی کہ مرد عورتوں کی زبان میں عورتوں کی طرف سے اظہار الفت کریں لیکن یہ صورت عبدالرحیم اور تلسی داس کے اتباع میں ہوگی۔ لہٰذا ایک قسم کا جھوٹ بولا جائے گا۔ اور ظاہر یہ کہ چونکہ مرد نسوانی جذبات کو تمام تر سمجھنے اور بیان کرنے سے مجبور ہے اس وجہ سے اس میں وہی نقص باقی رہے گا جو ہندی شاعری میں ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مرد اپنے جذبات کا عورتوں کے اتباع میں اظہار کریں۔ یہ صورت اس وقت موجود ہے لیکن پالوی صاحب نے یہ حکم لگا دیا ہے کہ "غزل کی صحیح داغ بیل اب پڑی اور اس کا اصلی دور اب شروع ہوا ہے جبکہ عورت نے غزل کہنا شروع کیا" لہٰذا مردوں کا اپنے جذبات کا اظہار غزل کے مستقبل کو تاریک بنادے گا۔ اس لئے کہ اس دور میں غزل کے مستقبل کو صرف عورت ہی تابناک بنا سکتی ہے اور اس کا واحد ذریعہ عورت کا عورت کی زبان میں اظہار محبت ہے۔

(۳) تیسری اور آخری صورت مندرجہ بالا صورتوں سے بھی گئی گزری ہے یعنی یہ کہ مرد شعرائے متقدمین کا اتباع کریں اور اب تک جو کچھ ان لوگوں نے کہی ہے دہرایا کریں لیکن اس صورت میں ان پرانی غزلوں کے سرمایہ میں اضافے کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا جو ان بزرگوں سے ہم لوگوں کو ملا ہے اور جس کی درستگی میں ہماری نوجوان خواتین ہمہ تن مصروف ہوکر غزل کی صحیح داغ بیل ڈال رہی ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ مردوں کو غزل گوئی ترک کردینی چاہیئے اس لئے کہ یہ ان کے بس کی بات نہ رہی۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت پالوی کے ان منتخب اشعار کا بھی ایک سرسری جائزہ لے لوں جو انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے ہیں۔ پالوی صاحب نے دس غزلیں (بقیہ پانچ شعر) دس مشہور اور معروف غزل گو خواتین کی پیش کی ہیں اور فرمایا ہے کہ "دیکھئے کہ غزل کا مستقبل جیسا کہ اوروں کا خیال ہے کتنا تاریک نظر آتا ہے یا جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں روشن"۔ معلوم ہوتا ہے یہ مجموعی طور پر پچاس اشعار لکھے ہیں جن میں ۴۲ شعر (۸۰ فی صدی سے زیادہ) ایسے ہیں جو تخلص کے ساتھ بھی مردوں کی طرف منسوب کئے جاسکتے ہیں۔ محترمہ صفیہ شمیم، محترمہ انیس بانو، محترمہ عظمت شمع، محترمہ رابعہ پنہاں، محترمہ صفیہ رعنا، محترمہ سحاب آغا شاعر اور محترمہ ناز کی پوری پوری غزلیں ایسی ہیں جن میں عورت کی جانب سے اظہار محبت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ محترمہ کنیز فاطمہ کاشی، محترمہ سیدہ اختر اور محترمہ شانتی بیخود کی غزلوں میں اگر کسی چیز سے نسوانیت کا اظہار ہوتا ہے تو وہ صرف قافیہ اور ردیف ہے۔ اگر ان تانیث افعال کو تذکیر افعال سے بدل دیا جائے مثلاً اس شعر کو

کسی کی یاد میں آنسو بہا رہی ہوں میں ۔۔۔ حدیث درد محبت سنا رہی ہوں میں

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر)

حادثہ

(افسانہ)

قیسی رامپوری

ایک زمانہ میں میری تجارت بڑی ترقی پر تھی لیکن جنگ چھڑنے کے بعد کچھ عرصہ کے لئے شکست پڑ گئی اور مجھے خطرہ لاحق ہونے لگا کہیں بالکل ہی نہ بیٹھ جائے چنانچہ اپنے پھیلے ہوئے سرمایہ کو سمیٹ کر کلکتہ چلا گیا بمبئی ابتدائے جنگ میں اطمینان کے قابل جگہ نہ تھی۔ ہر چند مجھے کلکتہ کے مقابلہ میں بمبئی زیادہ پسند ہے کیونکہ وہاں زیادہ اجنبیت سی محسوس نہیں کرتا۔ مگر یہ سرمایہ کا سوال تھا اور جہاں وہ محفوظ رہے وہیں اس کو لیجانے کی ضرورت تھی۔

اتفاق کی بات ہے کہ میں نے کلکتہ پہنچکر بہت سا ایسا مال خرید لیا جسکی چند ہی روز بعد قیمت دوگنی سے زیادہ ہو گئی تھی۔ اس کو بہت معقول منافع کے ساتھ فروخت کر دیا۔ دو چار دفعہ ایسا ہی کیا۔ غرض کلکتہ میں میری تجارت تھوڑے ہی عرصہ بعد جم گئی اور اس کے ساتھ میں بھی جم گیا۔

خدا نے مجھے شروع ہی سے بہت کچھ دیا تھا مگر میں نے ابتدا ہی سے سرمایہ ہی کو سب کچھ نہیں سمجھا تھا۔ میں زکوٰۃ ادا کر کے ہمیشہ سرمایہ کو مستحقین تک پہنچاتا رہا۔ اس کے علاوہ قابل امداد لوگوں اور اداروں کی امداد کا سلسلہ بھی جاری رکھتا اور پھر اپنی خطیر آمدنی سے خود بھی جائز طریقے پر زندگی کا لطف لیتا۔ مشکل یہ ہے کہ سرمایہ اور تقویٰ یکجا ہو کر ہزار مثالوں میں ایک مثال ایسی پیش کر سکتے ہیں کہ انسان جائز اور ناجائز "سرمستیوں" کے خیال کے لئے باہوش رہے۔ سرمایہ کی عطا کی ہوئی قدرت اور اپنے جوان دل کی شورشیں مجھے ترغیب دیتی رہتیں کہ تیری شاندار موٹر کی یہ ملائم گدیاں کیا اس لئے ہیں کہ ہمیشہ یوں ہی ویران رہیں یا ان پر تنہا تو ہی اس طرح بیٹھا رہے جیسے شاداب چمن کے درمیان کسی درخت کا سوکھا ہوا تنا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ دل اور اس کی امنگوں کا مطالبہ سراسر غلط تھا یا صحیح لیکن اتنا وثوق سے ظاہر کر سکتا ہوں کہ یہ آرزو میرے خون میں تیزی اور جسم میں حرارت سی بڑھا دیتی تھی اور جب یہ حرارت قابو کی حد سے متجاوز ہو جاتی تو دہکتی ہوئی چنگاریوں میں بدل جاتی۔ یہی تو وہ مسئلہ ہے جو دل کی تڑپ اور روح کے جمود کو ایک ہی عینک سے نہیں دیکھ سکتا۔ پھر کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ زندگی احتیاط ہی احتیاط کا نام ہے۔ اصول ہی اصول کے مجموعے کی صورت ہے۔ تقویٰ اور ریاضت ہی سے بہتر ہے۔ زندگی میں بے احتیاطیاں بھی ہیں۔ لغزشیں بھی ہیں اور گناہ بھی۔ مگر یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ان سے اجتناب بہرصورت اچھا ہے۔

اس احساس خوب و زشت نے مجھے سنبھال رکھا تھا اور اگر کسی کا فرادا کو دیکھ کر دل ایک مبہم سی طلب کے بعد صبر کر لیتا تھا تو اس کو بھی میں یہی سمجھتا تھا کہ سنبھلا ہوا ہوں۔ دقت یہ کہ حیات چند روزہ کے سامنے برائیاں، بھلائیاں کچھ اس طرح مخلوط طور پر بکھری ہوئی ہیں کہ ایک کو سمیٹیں تو دوسری بھی انکے ساتھ کھنچی چلی آتی ہیں۔ میں نے ایک دفعہ چند نیکیاں جمع کرنی چاہی تھیں لیکن یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوا ـــــ رنج کیا ہوا دل کا خون ہو گیا کیونکہ نیکیاں کم نکلیں اور "پشیمانیاں" زیادہ۔

ایک روز شام کو میں تھکا تھکایا اپنے مکان کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ سڑک سے ہٹ کر میری موٹر کسی قدر تنگ سے بازار سے گذر رہی تھی بھیڑ زیادہ تھی اس لئے میں آہستہ آہستہ موٹر چلا رہا تھا۔ ایک مقام پر تو آکر مجھے رک جانا پڑا۔ عین سڑک پر لوگ اس طرح حلقہ بنائے کھڑے تھے جیسے مداری کا تماشہ دیکھ رہے ہوں۔ میں نے ایک دو منٹ تک تو انتظار کیا جب دیکھا کہ راہ نہیں ملتی تو تماشا دیکھنے خود بھی تماشائیوں میں جا کھڑا ہوا تماشا تو کچھ نہ تھا ہاں ایک لڑکی سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر اینٹھے ہوئے تھے آنکھیں بند تھیں اور منہ سے کف جاری تھا۔ لوگ اسکے ارد گرد کھڑے تماشا تو دیکھ رہے تھے اور اپنی زبان میں اظہار افسوس تو کر رہے تھے لیکن کسی کو اتنی توفیق نہ تھی کہ اس کو سنبھالتا اور اٹھا کر آرام سے محفوظ سی جگہ میں لٹا دیتا۔ وہی احتیاط کا معاملہ سامنے آجاتا ہے۔ عورت ہمارے ہاں شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ویسے ہی ہماری شاعری و ادب میں بسی ہوئی ہے، ہماری جلوت و خلوت اس سے آباد ہے۔ ہمارا آرٹ اور فلمی لائن اس سے چمک رہی ہے مگر ہماری انسانی ہمدردی سوتی ہے جب اس کو ہماری مدد کی ضرورت پڑتی ہے تو ہم اس کو ہاتھ لگانے میں جھجکتے ہیں اور دور سے کھڑے کھڑے تماشا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

بے ہوش لڑکی کو اس کی ہی ہم عمر لڑکی نے سنبھال رکھا تھا اور وہ غریب گھبرا گھبرا کر ایک ایک کا منہ تک رہی تھی۔ دونوں کی کتابیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ قیاس ہوتا تھا کہ اسکول یا کالج سے آرہی ہوں گی کہ ایک پر کسی مرض کا دورہ پڑ گیا، شاید مرگی، شاید ہسٹریا اور اب عالم بے کسی میں تماشا بنی ہوئی یہاں پڑی ہے۔ تماشائیوں کی بے رحم آنکھیں کس طرح اس مبتلائے کرب جوان جسم کو دیکھ رہی تھیں۔ ان بیحیا آنکھوں میں مردانہ غیرت نہیں رہی تھی، ان ہوس کار سینوں میں تہور سو چکا تھا ورنہ کوئی بات نہ تھی کہ اتنی دیر تک ایک جوان لڑکی شاہراہ عام پر تماشا بنی پڑی رہتی۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ میں بھی تقریباً انہی اصولوں کا مارا ہوا ایک انسان تھا جن کا یہ مجمع شکار تھا۔ غیر عورت کے جسم کو چھونا میرے لئے بھی باعث شرم تھا۔ رسوائی کا سبب تھا مگر میں ذرا بے باک تھا جب دیکھا کہ کوئی اس غریب لڑکی کو سنبھالنے کے لئے نہیں بڑھتا تو میں مجمع سے نکلا

اور آگے بڑھ کر بے خوفی کے ساتھ اس کو ہاتھوں میں اٹھالیا۔ وہ لاش کی طرح میرے ہاتھوں میں لٹک رہی تھی اور اس کا کف بھرا منہ میرے کوٹ میں گھسا ہوا تھا۔ جب میں نے اس حجاب کو توڑ دیا تو اور بھی چند لوگوں کو ہوش آگیا۔ وہ بھی ذرا بے حجاب ہوئے اور بے ہوش لڑکی کے "حجابات" کو میری آغوش میں اس کی سہیلی سے سنبھالنے لگے۔ میں نے حقارت سے ان کی اس ہمدردی کو دیکھا اور اس کی سہیلی کو ساتھ لے کر اپنی موٹر میں آ بیٹھا۔ اس کے بعد مجمع نے مجھے اس طرح راستہ دے دیا گویا یہ خدا کی موٹر تھی اور بھیڑ کو فرشتوں نے چیر کر ہٹا دیا تھا۔

سب سے پہلے میں اپنے ایک شناسا ڈاکٹر کے پاس گیا اور اس کو ہمراہ لے کر دوسری لڑکی کی رہبری پر مریضہ کے مکان پر پہنچا۔ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا مکان تھا جس میں امارت کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ لیکن افلاس بھی چھپا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ میں نے موٹر کا دروازہ نہ کھولا۔ سہیلی بھاگی ہوئی مریضہ کی ماں کو بلانے گئی اور میں مریضہ کو ہاتھوں میں سنبھالے ایک پلنگ کی طرف لے گیا۔

جب اس کی ماں آئی تو اس نے اپنی بچی کی حالت کو دیکھ کر سر پیٹ لیا۔ چند منٹ بعد باپ بھی آگیا اور وہ بھی سخت پریشان ہوا۔ میں نے جلد جلد ڈاکٹر سے درخواست کی کہ لڑکی کی علالت سے اس کے والدین کو اپنی زبان میں باخبر کر دے اور اس کی جانب سے ذرا ان کو اطمینان بھی دلا دے۔ ڈاکٹر نے اپنا فرض ادا کیا۔

ڈاکٹر ہوشیار تھا۔ اس کی کوششوں سے لڑکی کو تھوڑی دیر بعد ہوش آگیا اور حالت بھی کسی قدر درست ہوگئی۔ ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ ماں کا اضطراب ابھی بدستور تھا۔ باپ اب ذرا مطمئن تھا۔ اس نے بڑی لجاجت سے میرا شکریہ ادا کیا اور اسی وقت چائے پان سے ہماری تواضع میں لگ گیا۔ اپنی بچی کی حالت کو درست پاکر ذرا وقفہ کے بعد ماں کے بھی حواس درست ہوئے اور منت پذیری کے اظہار میں مجھے اس نے اپنے بچہ کی طرح پیار کیا۔ اس کو شکر کے الفاظ نہیں مل رہے تھے صرف آنکھوں سے احسان کے آنسو جاری تھے۔

"اب آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کی بچی جلد اچھی ہو جائے گی"۔ میں نے صاف اردو میں اس سے کہا۔

"کیا اس سے پہلے بھی آپ کی لڑکی پر کبھی ایسا ہی دورہ پڑا ہے؟" ڈاکٹر نے اپنی زبان میں اس سے دریافت کیا۔

"ہاں دو سال ہوئے جب اس کی یہی حالت ہوگئی تھی۔ پھر تین چار مہینے ہوئے ایک ہلکا سا دورہ اور پڑا تھا" اس کی ماں نے کہا۔

"علاج جاری رکھئے اور اگر ممکن ہو تو جلد اس کی کہیں شادی کر دیجئے۔ یہ ہسٹریا کے آثار ہیں مرگی نہیں ہے۔ ابھی بالکل آغاز ہے اگر مرض زور پکڑ گیا تو مشکل ہو جائے گی" ڈاکٹر نے کہا۔

شادی کا نام سن کر بڑھیا نے ایک دھیمی سی آہ بھری۔ اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو میز پر چائے کا سامان چن رہا تھا۔ پھر اپنے مکان کی بے سرو سامانی پر نظر ڈال کر چپ ہوگئی۔

"یہ ڈاکٹر صاحب روزانہ آپ کے مکان پر آتے رہیں گے اور جب تک یہ خود علیحدہ نہ ہو جائیں ان کا علاج جاری رکھئے۔ خرچ کی پرواہ نہ کیجئے ڈاکٹر صاحب میرے دوست ہیں" میں نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ مریضہ کو ہوش آئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور اب اس کی حالت بھی درست تھی۔ اس کی سہیلی پیار سے اس پر جھکی ہوئی تھی اور دونوں جوان لڑکیاں چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں جن میں کچھ مسکراہٹیں اور کبھی کبھی ضعیف سی ہنسی کی آواز بھی شامل تھی۔

مریض لڑکی مجھ سے کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ میں نے دوسری پیالی پیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، اس کی طرف کیا دیکھا حقیقتاً اب اس کو دیکھا ایک زعفرانی رنگ کی نہایت خوبصورت لڑکی تھی۔ افسانوں کی تمام لڑکیاں خوبصورت ہوتی ہیں مگر یہ تو حادثہ کی ایک حسین دوشیزہ تھی جس کی کوئلے کی طرح سیاہ سیاہ بڑی بڑی آنکھیں منت پذیری کے جذبات کے ساتھ میری جانب نگراں تھیں۔

میں نے ایک پیالی میں چائے لونی اور اس کے پاس لے جا کر انگریزی میں کہا "اس حادثہ کی یاد میں جس کو آپ بھول جائیں تو جلد اچھی ہو جائیں گی اور اگر میں بھول گیا تو میرے لئے یہ ایک اور حادثہ ہوگا" اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پیالی لینے کو اپنا خوبصورت ہاتھ بڑھا دیا لیکن پیچھے سے ڈاکٹر کی ڈانٹ سنائی دی۔

"ہیں ہیں۔ یہ کیا کر رہے ہو۔ چائے نہ پلا دینا ان کو۔ چلے بڑے ڈاکٹر بن کر!" یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھ سے پیالی جھپٹ لی۔

"یہ دوسرا حادثہ ہے مگر افسوس ناتمام" حسینہ نے ہنس کر کہا۔ اپنی بچی کو ہنستا دیکھ کر ماں بھی خوش خوش ہمارے قریب آگئی۔ تھوڑی دیر اور بیٹھ کر ہم یہاں سے چل دئے۔

مکان پر پہنچ کر کاروبار میں میں نے اس واقعہ کو بھلا دینا چاہا، مگر وہ صاف ٹھہرا غریب گھر۔ وہ محبت کرنے والے احسانمند والدین اور آخر میں (بلکہ سب سے پہلے) وہ حسین بیمار جسم ایک لمحہ کے لئے میرے حافظے سے نہ نکلا۔ میری زندگی کی تنی ہوئی چادر کے درمیان ایک وزن آپڑا تھا"

جس نے اس میں جھول ڈال دیا۔ وہ لڑکی، وہ اس کی حسین آنکھیں، اور وہ اس کی میرے دل میں پیدا کی ہوئی قیامت —— اثار اچھے نہ تھے آثار کی کس کو فکر ہے۔ یہاں تو جو چیز مار ڈالتی ہے وہ اختلافات ہیں۔ زبان کا اختلاف، تہذیب کا اختلاف، عقائد کا اختلاف حتیٰ کہ صوبہ کا اختلاف۔ کس میں ہمت ہے کہ ان کو مٹائے اگر یہ مٹ سکتے ہیں تو صرف پیار سے اور پیار کرنا اب انسان کا شیوہ نہیں رہا۔ میں خود —— خود میرے اندر جرأت نہ تھی کہ اپنے پیار کا اعلان کر سکتا۔ میں اس لڑکی کو پیار کرنے لگا تھا۔

پانچ چھ بار مزاج پرسی کے سلسلہ میں جو میں اس کے مکان پر گیا تو اس کو پیار کرنے لگا۔ شاید غلط ہے پہلے ہی روز سے پیار شروع ہو گیا تھا میں نے کسی سامنے پھیلے ہوئے اختلاف کی پرواہ نہ کی۔ ایسے پیار ہمیشہ آنے والی مصیبتوں کے پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ مگر میں پیار اور پیار ہمیشہ پیار ہے۔

اس گھرانے میں آنے جانے کی وجہ سے میں کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ اس کے والدین مجھ سے محبت کرتے تھے اور اپنا تمام دکھ درد بیان کر دیا کرتے تھے۔ ان کی آمدنی کے ذرائع بہت محدود تھے جن کا زیادہ حصہ لڑکی کی تعلیم پر صرف ہو رہا تھا کیونکہ اگر کملا کو جلد شوہر مل سکتا تھا تو دولت تعلیم اور موسیقی کے ذریعہ ہی مل سکتا تھا تعلیم اس کی اچھی تھی۔ موسیقی میں اس کو خاص دستگاہ تھی ہاں دولت کی کمی تھی بہت کمی، بلکہ اس کا نشان تک نہ تھا۔ یہ بنگال کی رسم تھی۔ ایک لڑکی کو اس وقت تک اچھا شوہر میسر نہیں آسکتا جب تک شادی میں تاوان کے طور پر دینے کے لئے اس کے پاس پیسہ نہ ہو۔ تعلیم و موسیقی بھی نہایت ضروری چیز سمجھی جاتی ہے۔

"کملا اب کب تک ہوگی تمہاری شادی؟" میں اس سے دریافت کرتا۔

"جب کوئی دوسرا حادثہ ہوگا"، وہ شرما کر شوخی سے کہتی۔ اور پھر مجھے مطمئن نظروں سے دیکھنے لگتی۔ جو اینٹیں چن دی گئی ہیں وہ کہیں اس کے ہنس بول لینے سے گر سکتی تھیں۔

تین چار ماہ بعد کملا پر پھر ہلکا سا دورہ ہسٹریا کا پڑا۔ پھر اس کے والدین کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور پھر ڈاکٹر نے آکر وہی فتویٰ دیا کہ اس کی شادی جلد ہو جانی چاہئے۔ بے شک جلد ہو جانی چاہئے میں نے بھی کلیجہ تھام کر اس کی تائید کی۔

ایک دولتمند مجسٹریٹ کے لڑکے سے کملا کے والدین اپنی لڑکی کے معاملہ کو طے کرنے کا ارادہ کر چکے تھے مگر جہیز کے لئے روپیہ فراہم نہ ہونے کی وجہ سے ڈھیل پڑی ہوئی تھی۔ ادھر کملا کے مرض کے پیہم دورے اور ڈاکٹروں کے فتوے اصرار کئے جا رہے تھے کہ اس عزیز جان کی سلامتی کے لئے جلد اس کو کسی دولت مند قصاب کے سپرد کر دیا جائے۔

میرے لئے محبت کی بے چارگی کا وہ مقام وقت سے پہلے آگیا جہاں قدیم خودکشی کا تصور ہی اس جنجال سے رستگاری دلاتا ہے۔ یہ خودکشی جان کی نہ ہوگی بلکہ اپنی تمام ہستی کی ہوگی جس میں انسان زندہ تو بچاتا ہے مگر احساس زندگی سے خالی ہو کر۔

میں نے ایک مہینے کے بعد کملا کے والدین کو اس کے جہیز کے لئے بیس ہزار روپے دیدئے۔ وہ میرے قدموں پر گر پڑے۔ میرے اس عطیہ میں سپاس و احسان کا شائبہ تک نہ تھا۔ میں اپنی روح کا علاج کر رہا تھا۔ مجھے اپنی جان کا علاج مقصود نہ تھا اور میرا معالج مجسٹریٹ کا بیٹا تھا جس کو بالاتفاق سوسائٹی نے تجویز کیا تھا۔

کملا کو جو معلوم ہوا کہ میں نے اس کو اپنے سے جدا کرنے کو بیس ہزار روپیہ اس کے والدین کو دیا ہے تو وہ پرشکوہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی پھر خفا ہو گئی۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ ہمارے اختلافات اس کی بیماری کو کبھی اچھا نہیں ہونے دیتے۔ ایک پیار درمیان میں موجود تھا جو دونوں کو مار رہا تھا اور پیار ہی پیار میں مر جانا اب اس علم اسباب میں پرانی سی چیز ہو گئی ہے۔ یوں مرنے کو اب بھی محبت میں جی چاہتا ہے بلکہ مر ہی جاتے ہیں مگر وہ ایسی ہی خودکشی ہوتی ہے جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔

آج میں غور کرتا ہوں تو کملا کی بیہوشی کا تماشا دیکھنے والے ان تمام لوگوں کو اپنی بے حسی میں حق بجانب پاتا ہوں۔ نفرت، احتیاط اور گریز بعض اوقات آنے والی مصیبتوں سے انسان کو بچا لیتے ہیں مگر کیا مصیبتوں سے گریز کرنا آدمیت ہے؟ بالخصوص پیار کی مصیبتوں سے!

اردو غزل گوئی کی نئی کروٹ : —— بقیہ صفحہ ۳۶

اگر اس طرح پڑھا جائے

کسی کی یاد میں آنسو بہا رہا ہوں میں حدیث درد محبت سنا رہا ہوں میں

تو یہ غزلیں سبھی مردوں کی طرف منسوب کی جا سکتی ہیں۔ پالوی صاحب نے اشعار کے انتخاب کے وقت شاید اپنے دعوے کو پیش نظر نہیں رکھا ورنہ کاوش سے اشعار منتخب کرتے۔

آخر میں حضرت پالوی سے گذارش ہے کہ وہ غزل میں تبدیلی وغیرہ کا خیال چھوڑ کر اس کی کوشش کریں کہ اردو شعراء غزلوں سے کنارہ کش ہو جائیں اس لئے کہ یہ وہ صنف سخن ہے جو اعلیٰ شاعری کے لئے بالکل فضول، لغو اور مہمل ہے۔

فتح یورپ کے بعد پہلا موسم سرما

شانتارانی

جنگ نے پیکار اور امن وعافیت کی بابت سینکڑوں پیشین گوئیاں کی جاتی رہیں اور جن حالات کا پہلے سے اظہار کیا گیا، وہ اب رونما ہو رہے ہیں۔ منہدم شہر مواصلات کے ٹوٹے ہوئے رستے اور ان اشیا کی عالمگیر کمی جن پر روزمرہ کی زندگی کا انحصار ہے، یہ سب باتیں ظہور میں آ رہی ہیں۔ لیکن کم سے کم دو اہم اعتبارات سے حقیقت اتنی ہولناک نہیں ہے جتنی کہ بتائی گئی تھی۔ اول جرمن شہروں کی تباہی کو لیجئے ہر چند اتنی تباہ کن ہوائی بمباری پہلے کبھی نہیں ہوئی تاہم مادی نقصانات کا اندازہ وہ نہیں ہے جس کا قیاس لگایا گیا تھا۔ کوئلے کی کانیں تقریباً ٹھیک حالت میں ہیں اور تمام یورپ کو مجموعی حیثیت سے لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ بہت سے صنعتی کارخانے تباہ ہونے سے بچے رہے یا جلدی ہی مرمت ہو جانے کے لائق ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی اٹلی کے کارخانوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جہاں جرمن دستوں کے یکلخت ہٹ جانے سے متوقع لڑائی بالکل نہیں ہوئی۔ یہی بات فرانس اور ان شمالی ممالک کے کارخانوں کیلئے صادق آسکتی ہے جن کے علاقوں میں رہ کر جرمنوں نے اتحادی حملوں کو برداشت کیا تھا۔ یا جن پر اتحادیوں نے بمباری نہیں کی یا جن کو خود جرمنوں نے تباہ و برباد نہیں کیا۔ ڈنمارک اور ناروے کے صنعتی اداروں کا بھی یہی حال رہا۔ دوم اشیائے ضرورت خصوصاً اشیائے خوراک کی کمی کے اعداد و شمار کو لیجئے۔ وہ پیشین گوئی کے مطابق ایسے زیادہ ہولناک نہیں رہے ہیں۔

اسوقت تقریباً ہر چیز کمیاب ہے لیکن صحیح اعداد و شمار کا لحاظ رکھتے ہوئے حساب لگایا جائے تو ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔ گیہوں وغیرہ کی مقدار اناج پیدا کرنے والے ملکوں میں اس قدر زیادہ ہے کہ اگر اس کو کسی غلط طریقے سے خصوصاً مویشیوں کو کھلا کر ضائع نہ کیا جائے تو انسانی ضرورتیں اس سے پوری ہو سکتی ہیں۔ اہل یورپ کے لئے گوشت کمیاب بلکہ بالکل نایاب ہے لیکن ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں اس کی مقدار امریکہ میں بے قیاس ہے۔ اگر یورپ میں چقندر سے کھانڈ بنانے والے کارخانوں کو حسب ضرورت کوئلہ مل جائے تو گنے کی اس شکر کے ساتھ مل کر جو باہر سے منگائی جا سکتی ہے سب کی احتیاج پوری کی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد حمل و نقل کا اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ لڑائی کے دوران میں مال کے جہازوں کی سخت کمی رہی۔ لیکن غیر متوقع طور پر جب جاپان کا خاتمہ بہت جلد ہو گیا تو سینکڑوں جہاز جو فوجی سامان بحرالکاہل کے پار لیجانے کے لئے مصروف عمل تھے، دوسرے کاموں میں لگا دیئے گئے۔ حقیقتاً اب مال کے جہازوں کی بالکل کمی نہیں ہے بلکہ مسافر جہاز ہر وقت ان فوجیوں سے کھچا کھچ بھرے رہتے ہیں جو لڑائی ختم ہونے کے باعث چھٹی جا رہے ہوں یا جنکو واپس وطن بھیجا جا رہا ہو۔ مشرق بعید کی لڑائی ختم ہو جانے سے فوجیوں کا محفوظ ذخیرۂ خوراک، کمبل کپڑے، پٹرول اور دوائیں وغیرہ بچ گئیں جنکی اب انہیں ضرورت نہیں رہی تھی۔

بحالت موجودہ یورپ کے مختلف ملکوں میں معیار اغذیہ کا اندازہ لگانا بہت ہی دشوار ہے۔ ایک عام طریقہ یہ ہے کہ ہر شہری کو سرکاری طور پر خوراک کی مقررہ مقدار دی جائے اور اس کی غذائی ماہیت کو اس کی حرارت عزیزی کے اعتبار سے ظاہر کیا جائے۔ خوراک کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہونی چاہئے کہ وہ جسم انسانی کی اس حرارت میں اضافہ کرے۔ ایسی حرارت کے ایک درجے کو انگریزی زبان میں ایک کیلوری کہتے ہیں۔ ایک نوجوان کے لئے جو معتدل آب و ہوا میں سیدھی سادی زندگی بسر کر رہا ہو روزانہ دو ہزار چار سو کیلوریز کافی ہو سکتی ہیں۔ محنت شاقہ کرنے والوں کے لئے اکی تعداد چار ہزار تک ہو سکتی ہے۔

اکتوبر کے آخر میں مغربی یورپ کے ایک عام شہری کی روزمرہ کی خوراک میں کیلوریز کا معیار حسب ذیل تھا۔

فرانس میں دو ہزار، بلجیم اور ہالینڈ میں تقریباً دو ہزار دو سو ناروے میں دو ہزار چار سو، ڈنمارک میں تین ہزار اور برطانیہ میں دو ہزار آٹھ سو اور دو ہزار نو سو کے درمیان۔ گذشتہ سرما کے بعد سے ان معیاروں میں قدرے اضافہ ہوا ہے لیکن ان ملکوں میں سے جن پر جرمنی کا تسلط رہا صرف ڈنمارک کا معیار وہ ہو گیا جو جنگ سے پہلے تھا۔

اگرچہ تعمیر نو کا کام بڑی تیزی کے ساتھ شروع کیا گیا تاہم اس خطے میں سب سے زیادہ بدقسمت ہالینڈ رہا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ملک کے بیشتر افراد کو شدید ترین قسم کا قحط برداشت کرنے کے چند مہینے بعد ہی موسم سرما کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ تقریباً تمام اشیائے خوراک

سخت قسم کی کوئی چیز کسی قیمت پر دستیاب نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ چوربازاری کے انسداد کے لئے بڑی احتیاط برتی گئی ہے اور ملک کے لوگ جو کچھ عرصے پہلے اپنی اشیائے خوراک کو کپڑوں اور زیوروں سے بدل لیتے تھے ایسی بے سود تجارت سے باز رہنے لگے۔ راشن میں ہر شہری کو صرف اتنی روٹی مل جاتی ہے جس سے گذارہ ہو سکے اور اگرچہ خوراک کی بہت سی قسمیں رائج ہیں مگر مقررہ مقدار بہت ہی کم ہے۔ مثلاً ہر ہفتے ڈھائی چھٹانک کے قریب گوشت ملتا ہے۔

بلجیم میں شکم پری کا معیار ہالینڈ سے زیادہ بلند ہے۔ تازہ ترکاریوں کی طرح بہت سی چیزیں راشن کے علاوہ عام دکانوں سے بھی خریدی جاسکتی ہیں۔ سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا ان گھٹیا قسم کے اہلکاروں کو کرنا پڑ رہا ہے جو بنکوں یا تجارتی اداروں میں معمولی محرر ہیں یا جنگو پنشن کی قلیل رقم ملتی ہے۔ بلجیم میں ایک اور اہم بات قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ بچوں میں تپدق کا مرض بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ پیرس اور اس پاس کے بڑے شہروں میں زندگی کسقدر دوبھر ہو گئی ہے۔ چھوٹے بچوں کے سوا دوسرے لوگوں کو سیال دودھ نہیں مل سکتا تاہم راشن کارڈ پیش کرنے پر تھوڑا بہت گوشت دستیاب ہو سکتا ہے۔ خالص قہوہ جو فرانس کے گھرانوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے، قلیل مقدار میں ملنے لگا ہے تاہم کوکو اب بھی نایاب ہے اور صرف بچوں کے لئے تھوڑے سے چاکلیٹ مل جاتے ہیں۔ دیہاتوں میں جہاں عام ضروریات کی چیزیں آسانی سے دستیاب نہیں ہوسکتیں، اشیائے خوراک سے بدل لی جاتی ہیں۔ راشن کی دقت زیادہ تر شہریوں کے لئے ہے۔ دیہات والے مزے کرتے ہیں بلکہ ان کے شہری دوست اور رشتہ دار بھی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

انسان کے جسم میں اگر حرارتِ غریزی کی کمی ہو تو سردی کی سہار مشکل سے ہوسکتی ہے۔ مغربی یورپ میں نہ تو موسمی اثرات سے پناہ ملتی ہے نہ پہننے کے لئے گرم کپڑے۔ لباس کا راشن بہت ہی قلیل مقدار میں ہے اور مشکل یہ کہ چوربازار سے کچھ نہیں مل سکتا۔ اس سلسلے میں بھی غریب لوگ زیادہ مصیبت میں گرفتار ہیں کیونکہ ان کے لباس ناکافی ہونے کے ساتھ ساتھ خستہ حال ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ہالینڈ کو لیجیے مشہور بات ہے کہ وہاں کے لوگ سب سے زیادہ صاف ستھرا اور اچھا لباس پہنتے ہیں۔ لیکن اس وقت بچوں کا یہ عالم ہے کہ وہ میلا گھروں میں غلیظ چیتھڑے پہن کر جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ملک میں بھی پڑوس والوں کی طرح صابن نایاب ہے۔ اسی سبب سے متوسط

درجہ کے گھرانوں میں بھی جوؤں اور پسوؤں کی بہتات ہو گئی ہے اور نتیجہ کے طور پر لوگ خارش کے مرض میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔

یورپ میں کوئلے کا بھی سخت کال ہے اور اگرچہ مغربی یورپ کی حالت دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہتر ہے تاہم روشنی کرنے اور آگ جلانے یا گرمائی کرنے کے لئے خاص اوقات مقرر ہیں۔ ہالینڈ میں خانگی کاموں کے لئے کوئلے کی مقدار صرف اتنی ملتی ہے کہ اس سے سارے دن چولھا گرم نہیں رہ سکتا۔ فرانس کے بعض اضلاع میں حالت زیادہ خراب ہے۔ اکثر شہروں میں تقریباً دس من کوئلہ تین آدمیوں کو جاڑے بھر کے لئے دیا جاتا ہے۔ گیس اور بجلی پر سختی کے ساتھ پابندی ہے کہ وہ کھانا پکانے یا روشنی کرنے کے سوا کسی اور کام میں نہ لائی جائیں۔

کوئلہ نہ ہونے کے باعث صنعتی کارخانے بالکل مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ کوئلہ موجود ہے لیکن کوئلہ نکالنے والے مفقود۔ اس لئے زیادہ مقدار برآمد نہیں ہوسکتی۔ اس پر طرہ یہ کہ ذرائع حمل و نقل میں رخنے پڑ گئے ہیں مثلاً سڑکیں شکستہ حالت میں ہیں، پل ٹوٹ گئے ہیں، انجنوں اور گاڑیوں کی کمی ہے اور لاریوں کی تعداد برائے نام ہے۔

اب تک ان ملکوں کا ذکر ہوا ہے جنھوں نے اپنی فلاح و بہبود اور حفظ و امان کے لئے خود کوشش کی ہے۔ انجمن تنظیم و رفاہِ مشترک نے اشد ضرورت کی محض چند چیزیں فراہم کر کے انکی مدد کی ہے۔ جنوبی اور مشرقی یورپ کی تمام حکومتیں جو انجمن تنظیم و رفاہِ مشترک کی مستحق تھیں، اس سے مدد لیتی رہیں اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خوراک، کپڑے، ادویات، اور لاریوں بلکہ امدادی کارکنوں تک کے سلسلے میں اس پر بھروسہ کئے رہیں۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ انجمن تنظیم و رفاہِ مشترک اپنی خدمات صرف اتحادی ملکوں یا قابلِ رحم لوگوں تک محدود رکھے۔ اور اگر کبھی اس حد سے آگے بڑھنا ہو تو اپنی کونسل سے اجازت لے۔ نتیجہ یہ کہ اٹلی کو اس انجمن سے ابتک کوئی فائدہ نہ پہونچا سوائے اس کے کہ حاملہ عورتوں اور چھوٹے بچوں کو مدد دی گئی۔ تاہم اس کے بعد کونسل نے منظور کر لیا کہ سنہ ۱۹۴۶ء کے شروع سے ہر قسم کی امداد دی جائے۔ اس کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اس وقت اٹلی کے لوگ بری طرح غربت و افلاس میں پھنسے ہوئے ہیں اور کوئلہ نہ ہونے کے باعث صنعتی ادارے بھی انھیں کسی کام پر نہیں لگا سکتے۔ عام ضروریات زندگی کے علاوہ انھیں کھانے اور کپڑے کی کمی کے باعث سخت تکلیف ہو رہی ہے۔ بہت سے مکان مسمار ہو گئے ہیں یا ان کی چھتیں ٹپک رہی ہیں اور کھڑکیاں بھی نہیں ہیں۔ بے روزگاری کا مسئلہ ان سب پر بھاری ہے۔ اٹلی لڑائی سے پہلے بھی

اپنی تمام آبادی کا معاشی بار اٹھانے کا اہل نہیں تھا اسی لئے بہت سے باشندے ملک بدر رہتے تھے اور وہاں سے روزی کما کر اپنے وطن والوں کو بھیجتے تھے۔ اب اس بہاؤ کا رخ بدل گیا ہے۔ بہت سے لوگ جو ترک وطن کر گئے تھے اب شمالی افریقہ سے لوٹ رہے ہیں۔ ہزاروں جنگی قیدی بھی رہا ہو کر اپنے گھر جا رہے ہیں۔ یکی خوراک کا خطرہ لاحق ہو چلا ہے۔ دسمبر کے مہینے میں ہفتہ وار راشن تقریباً ایک سیر دس چھٹانک فی کس تھا۔ گوشت کی فراہمی صرف چور بازار کے ذریعہ ممکن تھی۔ چینی صرف دو چھٹانک ماہانہ مل سکتی تھی تاہم اسے بھی تقریباً چھپن روپے سیر کے حساب سے چور بازار سے خریدا جا سکتا تھا۔

یونان کے بعض اضلاع میں جہاں سنہ ۱۹۴۱ء کے دوران میں دشمن تسلط رہا، عدم صحت اغذیہ پر گزارہ ہو رہا ہے۔ گزشتہ بارہ مہینے میں انجمن تنظیم و رفاہ مشترک کے ان ارباب حل و عقد نے جو یونان میں متعین تھے، قحط دور کرنے کی کوشش کی مگر پہاڑی ملک کے اکثر حصوں میں ریلوں کا انتظام بگڑا پڑا ہے۔ پل وغیرہ ٹوٹ چکے ہیں اور سواریوں کا فقدان ہے۔ اس لئے دور افتادہ دیہاتوں میں اس وقت تک کسی قسم کی امداد نہیں پہنچائی جا سکی۔ مرضی سخاریچہ جو اس ملک کے باشندوں کے لئے ایک عام مرض رہا ہے لڑائی کے نتائج کے طور پر اور بھی زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلا۔ ابک یونان کے نہ پنپ سکنے کی وجہ سیاسی بھی ہے۔ لڑائی کے بعد سے یونان میں کوئی ایسی طاقتور حکومت قائم نہیں ہو سکی جس کو عوام کا اعتماد حاصل ہو، جو مالیات پر قابو پا سکے اور مناسب اقتصادی تدابیر پیش کر سکے۔ چونکہ ملک کا سرکاری نظام ابتر ہے اس لئے بہت سی چیزیں جو انجمن تنظیم و رفاہ مشترک نے بھیجی تھیں، چور بازار میں لے جا کر فروخت کر دی گئیں۔ یوگوسلافیہ میں بھی جنگ کے بعض مسائل یونان کی طرح خراب ہیں۔ برف سے ڈھکے ہوئے دیہاتوں میں کپڑے کا معاملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی کمی سے قطع نظر

غزل — مائل نقوی

دل کو ہین آرزوِ عشق میں یوں بنا دیا :: رنج کو واسطہ دیا، درد کا آسرا دیا
کیوں نہ دعائیں دوں اسے جس نے کہ دل دکھا دیا :: روح تڑپ تڑپ اٹھی درد نے وہ مزا دیا
طے ہوئی یوں رہِ ستم ساتھ تھا عشق کا کرم :: رک گئے جس جگہ قدم حوصلہ کچھ بڑھا دیا
جاؤ نگاہ لطف کے اب کہاں کوئے حریم ناز سے :: تیرے قدم کے نقش نے نقش قدم بنا دیا
شکر کے ساتھ لے لیا اس نے جو غم عطا کیا :: اس کا گلہ نہیں کیا، کم دیا یا سوا دیا
کچھ نہ کی قدرِ آرزو جب بہاں سے روبرو :: اب ہوئی میری جستجو خاک میں جب ملا دیا
یہ بھی اسی کا ہے کرم یوں نہ سہی تو یوں سہی :: بندہ نوازِ دل، درد تو لا دوا دیا
جوشش عشق کا اثر آب تو ہوا ہے اس قدر :: اٹھ گئی جس طرف نظر اس نے نقاب اٹھا دیا

شکر ہو یار کا ادا مائل بے نوا سے کیا
دردِ جگر عطا کیا، نالۂ نارسا دیا

ان تیس لاکھ باشندوں کے پیٹ بھرنے کا سوال زیادہ دشواریاں پیدا کر رہا ہے جو اپلڈریاٹک کے علاقے بلکہ اس سے بھی پرے آباد ہیں۔ اطالوی ملک رہنے والوں کا پیٹ بھرنے کے لئے اناج کا کوئی ذخیرہ موجود نہیں ہے۔ ان لوگوں کی نجات انجمن مذکور کی امداد پر منحصر ہے۔

یورپ میں سوویت خیالات کے زیر اثر رہنے والے ملکوں اور روس کے ان علاقوں کی بابت جو جرمنوں کے دور تسلط میں نقصان اٹھاتے رہے بہت کم حالات روشنی میں آسکے ہیں۔ بعض باتوں کا پتہ اب چلنا شروع ہوا ہے۔ رومانیہ اور بلغاریہ کی بابت بھی بہت کم حال معلوم ہو سکا۔ صرف اتنا پتہ چل سکا ہے کہ ان دو ملکوں کے پاس جو لڑائی سے پہلے اشیائے خوراک بھیجنے میں شہرت رکھتے تھے، کوئی فالتو چیز موجود نہیں ہے۔ ہنگری کے میدان زراعتی زرخیزی کے اعتبار سے دنیا بھر کے میدانوں سے بڑھے ہوئے ہیں لیکن ۱۹۴۵ء میں گیہوں کی فصل اتنی ناقص رہی کہ اس سے وہاں کی نصف آبادی کا پیٹ بھرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ پچھتر فیصدی مویشی تلف ہو گئے۔ صرف کانوں یا لوہا گلانے والے کارخانوں کے مزدوروں کو چربی میسر آسکتی ہے۔ توفیر زر کے باعث بھی صورت حالات زیادہ نازک ہو گئی ہے۔ جاڑے کے دوران میں قبضہ کرنے والی روسی فوج نے بھی اپنا بوجھ ہنگری پر ڈال دیا۔ ریلوے لائنوں اور گاڑیوں کی حالت قابل رحم ہے۔ بڈاپسٹ میں قحط پھیل رہا ہے کیونکہ سامان لے جانے والی کوئی گاڑی اس کے صدر مقام تک نہیں پہنچ سکتی۔ زیکوسلوکیہ میں اگرچہ کھانے کی مقدار قلیل اور کم تقویت بخش ہے اور ذرائع حمل و نقل بھی ٹھیک نہیں ہیں تاہم اس کی حالت پڑوسی ملکوں کے مقابلے میں غنیمت ہے۔ ملک کا وہ حصہ جہاں معیار خوراک سب سے کم ہے، ان جرمنوں سے آباد ہے جو الحاق کو

پھر وہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ بہت سے افراد کا انتقال ہو چکا ہے۔

سب سے زیادہ مصیبت اہل پولینڈ کو پہنچی ہیں۔ مشرق و مغرب دونوں طرف سے اس پر آفت ناک حملے ہوئے، پھر دو مختلف حکومتوں کا تسلط ہو گیا۔ کچھ لوگ مشرقی روس میں بھیجے گئے اور کچھ جرمنی میں۔ ظلم و ستم سہنے کے علاوہ انہیں فاقے کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ مشرقی اضلاع تو اب بھی ان کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے ہیں۔ البتہ مغرب میں وہ اپنی حالت سدھار رہے ہیں۔ وہاں کے چند اعداد و شمار قابل غور ہیں۔ سو لاکھ بچوں میں سے ساڑھے چھ لاکھ لازمی طور پر یتیم ہو گئے ہیں۔ پانچ لاکھ کسان گھرانوں کے مکانات لڑائی کے ہاتھوں مسمار ہو چکے ہیں۔ گذشتہ ماہ نومبر کے اندازے کے مطابق ان میں سے تین لاکھ زمین میں غار بنا کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے پاس نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا ہے نہ پہننے کو جوتے۔ تاہم اس علاقے میں خوراک کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ نہیں ہے جتنی کہ قیاس کی گئی تھی۔ کام کاج میں لگا ہوا ہر شخص آسانی کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں اور سگریٹ حاصل کر سکتا ہے۔

آسٹریا اور خصوصاً جرمنی کے لوگ مذکورہ بالا ملکوں کے لوگوں سے جسمانی طور پر زیادہ طاقتور تھے اس لئے وہ شدید جاڑے کا مقابلہ اچھی طرح کر سکے۔ موسم سرما میں ان کے لئے معیار خوراک کچھ اچھا نہیں رہا تاہم وہ دیہاتوں اور دوسرے ذخیروں سے تھوڑی بہت مقدار لیتے رہے۔ تنگی کا سب سے زیادہ ناگوار اثر شہر کے بچوں پر پڑا۔ تاہم اتحادیوں کے تعاون سے بہت سے بچوں کو ان کی رضامندی کے مطابق دوسرے مقامات پر بھیج دیا گیا۔ اس سلسلے میں ویانا کی مجلس بلدیہ نے بھی بڑی مدد کی۔ ان بچوں نے سردی کے علاوہ خود جرمنوں اور آسٹریا والوں کے ہاتھوں سخت تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ خانگی ضروریات کے لئے ان دونوں ملکوں میں کوئلہ نہیں ہے بعض لوگ دیہاتوں یا شہروں سے منہدم عمارتوں سے کچھ لکڑی چن لاتے ہیں اور بس اسی سے کھانا پکاتے اور گھروں کو گرم کرتے ہیں۔ چنانچہ دونوں ملکوں کے صدر مقامات میں لکڑیوں سے لدے پھندے کشتی ٹھیلے عموماً نظر آتے ہیں۔

وسطی یورپ میں سردی اور فاقے سے بچنے کی جدوجہد میں ایک ایسی تدبیر اختیار کی جا رہی ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ سرحدوں کو پار کر کے نئے گھروں کی تلاش میں نکل پڑے ہیں۔ اس زبردست نقل و حرکت نے صورت حالات کو اور بھی بگاڑ دیا ہے۔ بڑی تعداد میں واپس آئے ہوئے اسیران جنگ اور بے روزگار مزدوروں سے اس کی ابتدا ہوئی۔ چنانچہ مسٹر ارنسٹ بیون نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ "لاکھوں خانماں برباد جرمن آوارہ پھر رہے ہیں یا ایسا کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ کیونکہ ان کے گھر باقی نہیں رہے ہیں۔ انہوں نے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں گھسنا شروع کر دیا ہے۔ ایسی صورت میں ان لوگوں کے لئے دشواریاں پیدا ہو جائیں گی جو نظم و نسق قائم کرنے کی کوشش میں ہیں۔" اس نئے مرحلے نے بڑا ناگوار اثر پیدا کیا ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وسطی یورپ میں قحط اور بیماری وغیرہ کی روک تھام کے لئے جو جدوجہد ہو رہی ہے، اس میں رخنہ پڑ رہا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جرمن کون ہیں؟ ادھر ایک جگہ سے دوسری جگہ کیوں بھٹکتے پھر رہے ہیں؟ جب اتحادیوں نے برلن اور مغربی جرمنی پر شدید بمباری شروع کی تو بہت سی شہری آبادی ترک وطن کر کے مشرقی جانب محفوظ علاقوں میں چلی گئی۔ بیمار اور زخمی بھی اسی جانب لے جائے گئے۔ ان میں سے وہ لوگ جو مشرقی پرشیا کی طرف گئے تھے اور جن کو بڑھتی ہوئی سرخ فوج نے مار بھگایا تھا، سقوط المانیہ سے پہلے یا فوراً ہی بعد لوٹ گئے۔ لیکن جو ایسا نہ کر سکے وہ روسی یا پولستانی علاقوں ہی میں پھنس کر رہ گئے۔ تاہم دھمکیوں کے ماتحت انہیں بھی مغربی جانب بھاگ جانا پڑا۔ مغربی جرمنی میں گھسنے کی مجنونانہ کوشش میں ان میں سے بعض لوگوں کو چوری چھپے سرحد پار کرنی پڑی۔ کہیں جنگلوں کے راستے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے، اور کبھی تاریک فضا میں دریاؤں کو تیر کر پار کرتے ہوئے۔ شروع نومبر میں وہ دس ہزار یومیہ کی اوسط سے داخل ہو رہے تھے۔

مشرق سے مغرب کی طرف جانے والے جرمنوں کو دو اور قسموں میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ اول وہ چالیس لاکھ جرمن جو پہلے اس علاقے میں رہتے تھے جو اب پولستانی کہلاتا ہے اور جن کو وارسائی حکومت نے علاقہ پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ہی ملک بدر کر دیا۔ جرمنوں کی دوسری بڑی نقل و حرکت ہنگری اور زیکوسلویکیہ سے ہوئی (اور تھوڑی تعداد میں رومانیہ سے بھی) کیونکہ جنگ کے بعد قائم ہونے والی حکومتوں نے فیصلہ کر دیا۔ ان سب کو خارج البلد کر دینے کا جو جرمن نسل سے تھے یا جن کی زبان جرمنی تھی۔ ان میں وہ چالیس لاکھ جرمن شامل تھے جو ان ملکوں میں آباد تھے نیز وہ تیس لاکھ سوڈیٹن جرمن بھی جو جرمنی بولتے اور اقلیت کی حیثیت سے زیکوسلویکیہ میں رہتے تھے۔ پوٹسڈم کانفرنس نے پولینڈ، ہنگری اور زیکوسلویکیہ کی حکومتوں کو پرزور الفاظ میں کہا کہ ملک سے اخراج کی کارروائی انسانیت کے ساتھ عمل میں لائی جائے۔ اور جب یہ سوال بار بار دارالعوام میں اٹھایا گیا تو ناظم خارجہ نے یہی جواب دیا کہ حکومت برطانیہ ذمہ دار حکومتوں سے متواتر اس امر کی استدعا کر رہی ہے۔ یہ صورت اب بالکل ختم ہو گئی ہے لیکن عارضی ہے۔

ان تمام حالات و واقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ معلوم کرنا قدرتی

باقی صفحہ پر

چند پشتو شاعرات

یوں تو افغانستان کے بہت سے ادیبوں نے اپنی قومی زبان پشتو کی ادبی تاریخ اور صلاحیت کو اجاگر کرنے میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں لیکن اس سلسلے میں جس قدر ٹھوس کام کابل یونیورسٹی کے صدر شعبۂ ادبیات اور پشتو اکاڈمی کے رکن رواں آقائے عبدالحی حبیبی نے کیا ہے افغانستان کے شاید ہی کسی اور ادیب نے کیا ہو۔ اس نوجوان ادیب نے بہت سے تحقیقی مقالے لکھے اور حال ہی میں دو نادر کتابیں "پختانہ شعرا" (پشتو شعرا) اور "پٹہ خزانہ" (مخفی خزانہ) مفصل حواشی اور ضمیموں کے ساتھ شائع کی ہیں جن میں افغانستان کے پشتو شعرا کے سوانح حیات اور اصناف کلام کے نمونے درج ہیں۔ ان کتابوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پشتو زبان اسلامی دور کے آغاز ہی میں مستقل ادبی حیثیت رکھتی تھی اور اس طویل مدت میں اس زبان کی لغت اور طرز بیان نے بہت سی کروٹیں لی ہیں۔ یہ کتابیں لسانیات اور ادب کی تاریخ میں ایک دلچسپ اضافہ ہیں۔

"پختانہ شعرا" اور "پٹہ خزانہ" میں خاص فرق یہ ہے کہ پختانہ شعرا میں کسی شاعرہ کا ذکر نہیں۔ جب کہ "پٹہ خزانہ" میں چھ شاعرات کے سوانح حیات اور ان کے کلام کے نمونے شامل ہیں۔ یہی شاعرات ہمارا موضوع ہیں اور ان کے حالات اور کلام کے نمونے "پٹہ خزانہ" ہی سے ماخوذ ہیں۔ ہمارا مقصود ان کے کلام کے اقدار پر بحث کرنا نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ شعر و ادب کے میدان میں "پختون" قوم کی عورتیں مردوں کے دوش بدوش نظر آتی ہیں۔

"پٹہ خزانہ" قندھار کے غلزئی بادشاہ شاہ حسین ہوتک[1] (جو خود بھی پشتو اور فارسی میں شعر کہتا تھا) کے ایماء سے اس کے دربار کے ایک شاعر محمد ہوتک نے ۲۹-۱۷۲۸ء میں لکھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جو کوئٹہ کے کاتب محمد عباسی کاسی نے ۱۸۸۵ء میں لکھا تھا ۱۹۴۲ء میں آقائے حبیبی کے ہاتھ لگا جسے انہوں نے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا۔

اب ہم ان چھ شاعرات کے مختصر حالات اور کلام کے نمونے قارئین آنچل کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

محمد یعقوب دواشی

بی بی نیکبختہ

یہ خاتون موزئی قبیلہ کے سردار شیخ الہ داد کی بیٹی شیخ قدم[2] (قدس سرہ) کی زوجہ اور شیخ قاسم سلیمانی[3] (قدس سرہ) کی ماں تھی۔ اس نے ۱۵۲۱ء میں ارشاد الفقراء کے نام سے ایک منظوم کتاب لکھی۔ یہ خاتون بڑی عالمہ اور عارفہ تھی اور شیخ امام الدین موزئی کی کتاب "اولیائے افغان" اور نعمت اللہ ہروی کی کتاب "مخزن" میں بھی اس کے علم و عرفان کا ذکر آیا ہے۔ اس کا کلام پند و نصائح سے مملو ہے۔ نمونہ کلام

دَ خدائے حق نہ غاړه کیږده ۔۔۔ نوری نوری ویناپریږده
دنیا پاتہ دھرچا دہ ۔۔۔ پہ اخلاص کښې څنې لیرده
خوقوت لری پہ ځان کښې ۔۔۔ سر دیار پہ رضا کیږده
ځان لہ بدہ خویہ ژغوره ۔۔۔ زړه پہ ذکر دیار بلیږده

دنیا ترک وھہ کہ پوه یې
دَ بقا پر لوری پښې بږده

خدا کے حکم کی اطاعت کر ۔۔۔ دوسری باتوں کو چھوڑ
دنیا سب کو چھوڑنی ہے ۔۔۔ اسے خلوص کیساتھ چھوڑ
جب تک تن میں جان ہے ۔۔۔ مزاج یار کے سامنے سر تسلیم خم کر
خود کو بری عادتوں سے بچا ۔۔۔ دل کو ذکر یار کے لئے وقف کر
سمجھ دار ہے تو دنیا کو ترک کر ۔۔۔ اور راہ بقا پر چل

۲

نازو توخی

نازو توخی غزنی کے سلطان ملخی توخی کی بیٹی تھی ۱۶۵۱ء میں پیدا ہوئی۔ یہ خاتون بڑی عابدہ، سمجھدار، بہادر اور

---

[1] ویس خاں نے قندھار کو ایرانی حکومت سے آزاد کرایا اور غلزئی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے دو بیٹے تھے، شاہ محمود اور شاہ حسین۔ شاہ محمود نے ۱۷۲۲ء میں ایران پر حملہ کر کے سلطان حسین صفوی کو معزول اور خود ایران کا بادشاہ بنا۔ اور شاہ حسین کو قندھار کی سلطنت دے دی۔ شاہ حسین شاعر تھا اور شعرا اور ادبا کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس نے پشاور سے مشہور پشتو شاعر رحمٰن بابا کے دیوان کی نقل منگوائی اور اپنی زیر نگرانی کتابت کرائی۔ ۱۷۳۷ء میں نادر شاہ نے قندھار کا محاصرہ کیا۔ تو شاہ حسین نے سال بھر مقاومت کی۔ آخرکار امان مانگی۔ نادر نے اسے قید کر کے مازندران بھیجدیا۔

[2] شیخ قدم اپنے زمانے کے مشہور عارف تھے۔ سرہند میں فوت اور دفن ہوئے۔ بابر کے ہمعصر تھے۔

[3] شیخ قاسم شیخ قدم کے صاحبزادے تھے ان کے علم و عرفان کا آوازہ نہ صرف افغانستان بلکہ ہندوستان میں بھی تھا۔ اور "غوث الزمان" کہلاتے تھے۔ ان کے اثر و نفوذ سے جہانگیر خائف رہتا تھا۔ آخرکار اس نے انہیں قلعہ چنار میں نظر بند کر دیا۔ وہ وہیں فوت اور دفن ہوئے۔ تصنیف:۔ "تذکرۃ الاولیا"

غریب پرور تھی۔ جب اس کا باپ لڑائی میں مارا گیا اور اس کے بھائی حاجی عادل نے دشمنوں کے خلاف لشکر کشی کی تو اس کی عدم موجودگی میں نازو توخی سلطنت کا کام سنبھالتی رہی۔ جب کوئی قافلہ آتا تو اس کے قیام اور خورد و نوش کا انتظام خود کرتی۔ اس کی شادی شلم خان ہوتک سے ہوئی جس سے چار لڑکے پیدا ہوئے۔ سب سے بڑا حاجی میرویس خان تھا جس نے ایرانیوں کے اقتدار کا خاتمہ کر کے قندھار میں غلزئی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ نازو توخی پشتو میں شعر کہتی تھی اور اس نے دو ہزار اشعار کا دیوان چھوڑا۔ نمونۂ کلام سے

سحر گروه، د نرگس لیمه لانده
څاڅکی څاڅکی ئې له سترګو څڅیده
ما ویل څه دی ګلـبنـی ګلله ولی ژاړې؟
ده ویل ژوندم دی یوه خوله خندیده

صبح کے وقت نرگس کی آنکھ تر تھی	قطرے اس کی آنکھ سے گر رہے تھے
میں نے پوچھا حسینہ کیوں رو رہی ہو	کہا: میری زندگی ایک ہنسی کے برابر ہے

—— ۳ ——

بی بی زینب | یہ خاتون حاجی میرویس خان کی بیٹی تھی اس نے قرآن، فقہ وغیرہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور فارسی ادب پر بھی کافی عبور تھا۔ اس کا بھائی شاہ حسین امور سلطنت میں ہمیشہ اس سے مشورہ کرتا اور اس پر عمل کرتا تھا۔ جب اس کا بھائی شاہ محمود جس نے ایران فتح کیا اور وہاں غلزئی سلطنت کی بنا ڈالی تھی۔ اصفہان میں مارا گیا تو بی بی زینب نے ایک طویل مرثیہ کہا۔ جس کے چند بند ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

ځوان، ومیره د توری جنګ وَنا ⁂ ولاړ د قام په نام ونګ وَنا
دښمن له ده په وینو رنګ وَنا ⁂ په میدان شیر د۔ یا پلنګ وَنا
افسوس چه مرګ ده ده په خوا شو تا
قندهار واړه په ژړا شو تا

وہ جوان تھا، تلوار کا دھنی تھا	قوم کے نام اور آبرو کا ساتھی تھا
اس کے ہاتھ سے دشمن کا خون بہا	میدان جنگ میں شیر تھا یا چیتا
افسوس موت نے اس کو آن دبایا	سارا قندھار رو رہا ہے ۔۔۔۔

اصفهان پاته تاج نسکور عالمه ⁂ چه شاه محمود شون په ګور عالمه
د پښتون لمر شو، تیاره تور عالمه ⁂ راته دښمن به کا پیغور عالمه
چه پا چیا لاړ پښتون ګډ ا شونا
قندهار واړه په ژړا شونا

افغان رہ گیا، ہمارا تاج سرنگوں ہوا	جب شاہ محمود قبر میں جا سویا
پختون قوم کا سورج سیاہ پڑ گیا	اب دشمن طعنہ دے گا۔
کہ بادشاہ مر گیا اور پختون قوم کنگال ہو گئی	سارا قندھار رو رہا ہے ۔۔۔۔

هوتکو ژاړئ، محمود شاه څه شونا؟
پښتنو استاسی لوی سیاه څه شونا؟
له اصفهانه تر ترکه څه شونا؟ ⁂ پاچا چه وحشمت پناه څه شونا!
د پښتنو پر تم فنا شونا
قندهار واړه په ژړا شونا

اے ہوتکو! روؤ، شاہ محمود کیا ہوا؟	اے افغانو! تمہارا لشکر جرار کیا ہوا؟
اصفہان سے فراہ تک کی سلطنت کیا ہوئی؟	تمہارا حشمت پناہ بادشاہ کیا ہوا؟
پختونوں کی عظمت مٹ گئی۔	سارا قندھار رو رہا ہے ۔۔۔۔

—— ۴ ——

حافظہ حلیمہ | خوشحال خان خٹک کی بیٹی تھی۔ بچوں میں رہتی تھی۔ بڑی فاضلہ اور عارفہ تھی۔ ساری عمر تجرد میں گذاری۔ تصوف سے خاص شغف رکھتی تھی۔ حضرت شیخ سعدی لاہوری کی مرید تھی۔ شعر کہتی تھی اور اس کا کلام متصوفانہ ہے۔ نمونۂ کلام

د آشنا په فکر خو یره هسی شان شوم ⁂ نه پوهیږم چه مستاز که نور جهان شوم
چه مجازي ایاز لاړ د زړه نه ⁂ سر بلنده تر محمود غوندې سلطان شوم
غیر فکر می له زړه نه لاړ په شو ⁂ په خلیل ادیر عدو باندې یکسان شوم
"حلیمې" د غماز مکر لیات له حده شو
چه د بیل لېږه نکه په ګمان شوم

دوست کی یاد میں اتنی مسرور ہوں	کہ کبھی خود کو ممتاز سمجھتی ہوں کبھی نور جہاں
جب مجازی ایاز میرے دل سے نکل گیا	تو میں خود کو محمود جیسا بادشاہ سمجھنے لگی
جب غیر کا خیال دل سے نکلا	میری نظر میں دوست و دشمن سب برابر ہو گئے
اے حلیمہ مکر غماز حد سے گذر گیا	کہیں تجھے تیرے دوست سے جدا نہ کر دے

—— ۵ ——

زرغونہ | یہ خاتون ملا دین محمد کاکڑ کی بیٹی اور پنجوائی میں رہتی تھی۔ باپ سے علوم مروجہ (خاص کر) علم فصاحت سیکھے۔ زرغونہ

(باقی ص ۴۷ پر)

۱؎ خوشحال خان خٹک (۱۶۱۳ء۔ ۱۶۹۰ء) اورنگزیب عالمگیر سے ساری عمر برسر پیکار رہا۔ آخر تیرہ اورنگزیب نے اسے قلعہ رن تھنبور میں نظر بند کر دیا۔ لیکن افغانوں کی مدد سے نکل بھاگا۔ اس نے "ہدایہ فقہ" کا پشتو میں ترجمہ کیا اور کئی دوسری کتابیں لکھیں۔ پشتو کا مسلم الثبوت استاد اور صاحب طرز شاعر تھا۔ اس کا دیوان افغانستان اور سرحدات میں بہت مقبول ہے۔

تحسین ناشناس

ڈاکٹر تاثیر کے مضمون "اقبال میں تضاد نہیں" کا تجزیہ

غلام محمد بٹ

آجکل مورخہ یکم اپریل ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر تاثیر کا ایک مقالہ "اقبال میں تضاد نہیں" سیکش اکبرآبادی کے مضمون "اقبال کے متضاد نظریے" کے جواب میں چھپا ہے۔ موضوع کی افادیت کے پیش نظر اہل قلم حضرات کی خاموشی نہایت افسوسناک اور حضرت تاثیر کی جرأت قابل داد ہے۔ علی وجہ البصیرت یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے نظریات تضاد و تباین کے حامل ہیں بلکہ ایک مخصوص محور فکر کے آئینہ دار ہیں مگر حیرانی ہے کہ ڈاکٹر تاثیر نے بجائے رفع اعتراضات کے اپنے مضمون میں سیکش کے مفروضات کو ہی تسلیم کر لیا۔ ڈاکٹر تاثیر کی سادگی دیکھیے کس معصومانہ انداز میں سیکش کا دعویٰ "اقبال کے نظریات کا تضاد" تسلیم فرماتے ہیں۔ "خدا رحیم بھی ہے اور قہار بھی تو پھر تضاد بیان پر کیا اعتراض ہے جب مظاہر عالم کی بنیاد تضاد پر ہے اگر تضاد ایک حقیقت ہے تو ترجمان حقیقت اقبال ان تضاد بیان کی وجہ سے کیوں ناممود گردانا جائے۔" (آجکل مورخہ یکم اپریل صفحہ ۱۹) یعنی اقبال کی تضاد بیانی ڈاکٹر تاثیر کے نزدیک مسلم مگر اعتراض صرف اس کے ناممود گرداننے پر ہے۔ صفحہ ۱۹ پر ارشاد ہوتا ہے۔ "سیکش صاحب یہاں اقبال کو ہمہ اوست کا مخالف قرار دیتے ہیں اور بعد ازاں موافق بھی اور مخالف بھی۔ کیا یہ تضاد نہیں؟" حضرت تاثیر کی خدمت میں بصد ادب گزارش ہے کہ وہ "کیا یہ تضاد نہیں" کا مفہوم واضح کرنے کی کوشش فرمائیں۔ اگر "کیا یہ تضاد نہیں" کا منشا یہ ہے کہ سیکش اکبرآبادی کا تضاد ہے تو یہاں یہ موضوع سے خارج۔ اس لیے اس کا ثابت کرنا بے معنی۔ کیونکہ سیکش کا تضاد ثابت کر دینے سے اقبال کے تضاد کا جواز نہیں نکلتا یا اس کا تضاد رفع نہیں ہو جاتا۔ اور اگر اس "کیا یہ تضاد نہیں" کا مقصود اقبال کے تضاد کو اجاگر کرنا ہے تو یہ حرکت "نہ وزن ناممود" گردانی جائے گی۔

ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

ڈاکٹر صاحب خود تسلیم فرماتے ہیں کہ "یہ موئی شاعری اور مجادلہ مدعا ہے خالص علمی بحث" (صفحہ ۱۸) شاعری کی بھی ایک ہی رہی اور علمی بحث کا نمونہ بھی پیش ہو چکا۔ انھیں اپنی کمزوری کا خود احساس ہے۔ مضمون کے آخری پیرے میں فرماتے ہیں: "مگر یاد رکھیے میری ذاتی دلچسپی محض ادب سے ہے عقلی فلسفہ سے کم اور تصوف سے کمتر۔ مجھے قطعیت کا دعویٰ نہیں نہ مجھے اقبال کے جملہ عقائد سے اتفاق ہے بحث محض تضاد بیانی کی ہے۔ اقبال غلط ہو یا صحیح اس کے نظریات میں بنیادی تضاد نہیں۔ مجھے فقط یہی کہنا تھا۔" یہ ہے ان کی دلیل حصر۔ ظاہر ہے کہ عقلی فلسفہ اور تصوف بھی علم کی ذیل میں آتے ہیں اور جناب تاثیر ان میں بہت ہی کم دلچسپی لیتے ہیں تو پھر یہ "خالص علمی بحث" کے کیا معنی؟ "مظاہر عالم کی بنیاد میں تضاد بھی مانا گیا اور اقبال کو انہی حقائق کا ترجمان بھی۔" مگر یہاں بنیادی تضاد سے انکار بھی ہو رہا ہے۔ آخر یہ کیا مخمصہ ہے؟

اقبال کی تضاد بیانی کے قرار سے قطع نظر یہ اقبال کے جملہ عقائد سے نااتفاقی کیا چیز ہے جبکہ تاثیر صاحب خود اسی مضمون میں حضرت علامہ کو ترجمان حقیقت قرار دے چکے ہیں۔ حیرت ہے کہ انھیں حقیقت سے بھی کلی اتفاق نہیں۔ ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۱۹۔ اپنے جملہ عقائد یا کم از کم اقبال سے اختلافی عقائد ہی گنوا دئیے ہوتے۔

ایک اور مفروضہ ملاحظہ فرمائیے۔ "یہ رومی، قونوی، ابن عربی، بایزید، ابن تیمیہ، ابوحنیفہ، عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہم سب قرآن و حدیث کے پیرو تھے اہل اسلام تھے۔ اگر ان کے درمیان بنیادی تضاد تھا تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام تضاد کا منبع ہے" (صفحہ ۱۸) گزارش ہے کہ ڈاکٹر تاثیر کے کلیہ کے مطابق اسلام کو تضاد کا منبع ہونا ہی چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب تضاد کو حقیقت تسلیم کر چکے اور ان کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ اسلام کو بھی حقیقت مانتے ہوں گے تو پھر اسلام میں تضاد کیونکر نہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فلسفہ تضاد بھی تاثیر ہے۔ خواہ اس فلسفہ کا مقصد کچھ اور ہی کیوں نہ ہو۔ اور سنیے: "بکھری ہوئی کرنوں کو سمٹا کر ایک نیا آفتاب بناتا ہے" (صفحہ ۱۸) حیرت ہے کہ تاثیر کی شاعری کے صدقے میں اقبال کی حقیقت بھی مجاز ہے اور اقبال کا مجاز بھی حقیقت۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۱ پر ان کا فٹ نوٹ "یہ تشبیہ عام فہم ہے اقبال حقیقت کو کرن نہیں بلکہ ہمہ آفتاب سمجھا" اور ہمہ آفتاب کو چھوڑیے غالباً یہ ایں خانہ ہمہ آفتاب کا مخفف معلوم ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر تاثیر، اگر علامہ مرحوم آفتاب کو حقیقت یا حقیقت کو آفتاب مانتے تھے اور کرنوں کو مجاز تو پھر کس طرح بکھری ہوئی کرنوں یعنی بکھرے ہوئے مجاز کو سمٹا کر ایک نیا آفتاب یا حقیقت

بن سکتی ہے؟ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ "اقبال میں تضاد بیانی نہیں بلکہ اجتماع و تطبیق اضداد ہے۔ اس کا بیان متضاد بالذات نہیں بلکہ جامع اضداد ہے یعنیہ جس طرح جبر و اختیار میں قرآن کا رویہ ہے" (۱۹)۔ تاثیر صاحب کے خیال میں علامہ اقبال کے کلام میں اجتماع اضداد ہے۔ خالص علمی بحث کا وعدہ فرمانے کے باوجود حضرت تاثیر کسی کلام میں اجتماع اضداد کو صحیح ثابت نہیں کر سکیں گے۔ فلسفہ کا ایک مبتدی طالب علم بھی یہ جانتا ہوگا کہ اجتماع اضداد محال ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ قرآن کا مسئلہ جبر و اختیار بھی قطعیت کے ساتھ تائید میں پیش کر دیا گیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ جبر و اختیار کے متعلق علامہ اقبال اور قرآن مجید کا بغور مطالعہ کر لیا ہوتا۔ جبر و اختیار ضدین نہیں ہیں بلکہ مادہ کی ارتقائی حالتوں کے دو نام۔ بقول غالب ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی | حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مادہ کی ابعاد ثلاثہ کو ہم نظری طور پر ضدین کہہ لیں تو کہہ لیں مگر عملی طور پر یہ اضداد نہیں ہو سکتیں کیونکہ ان میں ایک نسبت مرکزی موجود ہے۔

میرا اپنا ایمان ہے کہ اقبال میں کسی قسم کا تضاد نہیں۔ بلکہ ان کے نظریات ایک باقاعدہ اور مربوط فکری نظام کے آئینہ دار ہیں۔ میں نے خود اقبال کی وحدت فکر کو اپنے ایک مضمون میں جو کہ ۵ ارمئی اور ۵ ارجون کے آجکل میں شائع ہو چکا ہے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جس کے لئے میں علامہ کی منظومات سے ان کی نثری تحریروں کا زیادہ ممنون ہوں۔ مگر ڈاکٹر تاثیر ہیں کہ جن کا مدار علم صرف منظومات ہیں۔

چند پشتو شاعرات :- ———— بقیہ صفحہ ۴۵

خوش خط اور مشہور شاعرہ تھی۔ سنہ ۱۷۹۰ء میں اس نے شیخ سعدیؒ کی بوستان کا پشتو میں منظوم ترجمہ کیا جو مقبول خاص و عام ہوا۔

—— ۷ ——

رابعہ | یہ خاتون بابر کی ہمعصر اور قندھار میں رہتی تھی۔ اس نے ایک پورے دیوان کے علاوہ بہت سے متفرق اشعار چھوڑے

نمونۂ کلام ؎

رباعی

آدم ئی مځکې وته راستون کړ ❊ په اور د غم ئی سوی لړمون کړ

دوزخ ئی روغ کړ په مځکه ❊ نوم ئی د هغه، دلته بیلتون کړ

ترجمہ

آدم کو زمین پر اتارا | اسے آتش غم میں جھونک دیا

زمین پر دوزخ بنائی | اس کا نام فراق رکھا

فتح یورپ کے بعد پہلا موسم سرما ———— بقیہ صفحہ ۴۳

امر ہے کہ نجات اور غلامی کی صورت جلدی کیوں پیدا نہیں کی جاتی جبکہ یورپ کی لڑائی کو ختم ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے؟ آخر یورپ اس عہد جدید کے لئے تیار کیوں نہیں ہے؟ اسکا آسان جواب صرف یہی ہے کہ ساری دنیا میں سیاسی انتشار پھیلا ہوا ہے۔ پھر فوری نتیجہ کیا رہیگا؟ سب سے پہلے ملک سے اخراج کی صورت یعنی وہ تدبیر جو سوویت کے زیر اثر ریاستوں نے اختیار کی۔ دوسرے امریکہ کی حکمت عملی کہ اس نے فی الحال کچھ عرصے کے لئے یورپ کے معاملات سے اپنے آپ کو الگ تھلگ کر لیا ہے۔ امریکہ میں چینی کے سوا کسی اور چیز پر راشن نہیں ہے۔ وہاں چیزوں کا خرچ نہ صرف یہاں کے ملکوں سے زیادہ ہے بلکہ اس معیار سے بھی بڑھا ہوا ہے جو جنگ سے قبل وہاں قائم تھا۔ تیسرے یہ کہ مشرقی اور مغربی یورپ کے حصے بجز بڑی تیزی سے ہو رہے ہیں۔ مشرقی یورپ کے زراعتی ممالک روسی اقتدار کے زیر اثر ہیں۔ یہاں کھیتوں کے ساز و سامان اور مویشیوں کو بری طرح ضبط کیا جا رہا ہے اور جاگیروں اور زمینوں کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جا رہے ہیں جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ زمین میں کاشت اسطرح کی جائے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو سکے۔ یہ کہ جرمنی اور آسٹریا میں بھی حد بندیاں ہو رہی ہیں اور ابتک وہاں کوئی اعلیٰ نظام حکومت قائم نہیں ہو سکا ہے۔



ونمالا آپ سے کہتی ہے۔ کہ کس قدر لکس ٹائیلیٹ صابن ہی اس کے حسن کا نرالا راز ہے۔
میں لکس ٹائیلیٹ صابن کا بھرپور جھاگ تیار کرتی ہوں اور اسے اپنی جلد پر ملائمیت سے لگاتی ہوں۔
اس کے بعد میں صاف ستھرے اور ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالتی ہوں۔
آخر میں بالآخر اپنا چہرہ نرم تولئے سے خشک کرتی ہوں۔
LUX
TOILET SOAP
فلمی اسٹاروں کا حسن بخش صابن
LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

موت کا جنم

فجی جزیرے کی ایک لوک کہانی

محمود ہاشمی

برائی کی پہلی انگڑائیاں

ابتدا میں یہ دھرتی نہ تھی بس پانی ہی پانی تھا۔ اور یا وہ نیلا آسمان جو اس پانی پر ذرا سا جھکا ہوا ہر وقت جھانکتا رہتا تھا۔ اور جس کا نیلا رنگ پانی کے آئینے میں جیسے گھل کر اسے بھی نیلا بنائے رکھتا تھا۔ ان دنوں نہ رات تھی نہ دن۔ نہ سورج تھا نہ چاند اور نہ ستارے۔ بس ایک ہلکی سی مدھم مدھم روشنی تھی جیسے چاند اور سورج کسی بادل کی اوٹ میں آ گئے ہوں۔ اور یہ مدھم سی روشنی چوری چوری کسی نئی سرزمین کی تلاش میں کھوئی کھوئی آوارہ پھر رہی ہو۔

دیوتاؤں نے ان دنوں بلولوتو کی مختصر بستی کو اپنے بسیرے کے لئے چن رکھا تھا۔ بلولوتو کی یہ بستی آسمان کے اس کنارے پر تھی جہاں آجکل ہوا اور آکاس ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور جہاں کچھ عرصہ سے دیوتاؤں نے سورج کی وہ سیڑھی رکھ چھوڑی ہے۔ جس پر سے ہر صبح وہ ہماری دنیا کو روشن کرنے کے لئے اب نیچے اترتا ہے اور پھر شام کو واپس لوٹ جاتا ہے۔

بولوتو میں اس زمانے کے سارے دیوتا ایک ساتھ رہتے تھے۔ دیوتا مابوئی جو کہ سب سے بڑا تھا اور اس کے دو بیٹے ایٹالانگا اور ٹیکی ٹیکی اور ان کے علاوہ اس کے بھائی ٹانگالبو۔ ہمپاتا اور لی اولی، روکیکولیو سب کے سب اسی ایک جگہ آباد تھے۔

کہتے ہیں یہ ایک حسین بستی تھی دیوتا یہاں شجرِ کلام کے سائے تلے بیٹھ جاتے۔ آبِ حیات کا چشمہ اُبل اُبل کر ان کے لئے قہوہ تیار کرتا۔ اور چونکہ پیالہ ایک ہی ہوتا تھا۔ اس لئے شجرِ کلام ان کی باری مقرر کرتا اور وہ چسکیاں لے لے کے اسے پیتے رہتے۔ اور جب قہوے کا یہ دور ختم ہو جاتا تو انہیں ایک گہری نیند گھیر لیتی اور وہ سو جاتے۔ قہوہ پینا اور سو جانا یا کبھی کبھار شجرِ کلام کی دو ایک نصیحت آمیز باتیں سن لینا۔ بس یہی ان کی زندگی تھی۔ اور یہ زندگی جو سوتے اور جاگتے کا ایک حسین سپنا تھی۔ خوشیوں کے جادو میں بہتے ہوئے بڑے مزے سے بیت رہی تھی۔ پر اسی زمانے میں ایک وقت ایسا بھی آیا۔ جب سکھ کے اس جزیرے میں دکھ کی ایک گھڑی نے چپکے سے آ جنم لیا۔

ایک دن قہوہ پیتے پیتے دیوتاؤں کے سردار مابوئی نے ایکا ایکی ایک انگڑائی لی۔ اور پھر دور تک پھیلے ہوئے پانیوں کی طرف خوابناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا "میں تھک گیا ہوں دیوتا۔ میں تھک گیا ہوں"۔

اور پھر ذرا سا رک کے وہ دوبارہ گویا ہوا "میرے ساتھیو کیا تم بھی کو زندگی سمجھتے ہو مجھے تو زندگی کا یہ چکر بڑا بے معنی نظر آتا ہے۔ قہوہ پیو، سو جاؤ، جاگو اور پھر قہوہ پیو"۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سمندر کی اس سطح پر جہاں اس کی کشتی کھڑی تھی نگاہیں جما کے بولا "میرے ملاحو، کھول دو یہ بادبان، اٹھا دو لنگر اور اگر تمہیں زندگی سے ذرا بھی محبت ہے تو آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں جینے کا ڈھنگ سکھا دوں گا۔ میں جینا چاہتا ہوں اور یہ جینا مجھے پسند نہیں"۔

اور اس وقت جب کہ مابوئی یہ کہہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں کسی عزم کی چمک سے بھرا رہی تھیں اور سارے دیوتا اس کی طرف بکا بکا ہو کر دیکھ رہے تھے، فضا میں اس کے بھائی ریکولیو کا طنزیہ قہقہہ گونجا۔ اور اسکی دو آنکھیں جو کہ اس کی دم پر لگی تھیں مضحکہ خیز طور پر ابھرتی ہوئی سی دکھائی دینے لگیں۔ "خوب سردار بھائی بہت خوب مگر آخر جاؤ گے کہاں؟"

جہاں ہمیں آسرا ملا۔ "مگر تم کیوں تلملا رہے ہو؟ تم جاؤ قہوہ پیو اور سو جاؤ۔ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ لیکن ہاں۔ ذرا اپنی دم کا خیال رکھنا۔ کہیں سوتے میں کوئی شیر اسے چرا نہ لے جائے۔ بھاگ کر اسے پکڑ بھی نہ سکو گے۔ تمہارے نصیب میں ہاتا کہاں"۔ اور یہ کہتے کہتے مابوئی نے اسکی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے اس نے اپنی آنکھوں سے کوئی نفرت بھری چنگاری اس پر پھینک دی ہو۔

اور ریکولیو جیسے اس چنگاری سے بلبلا اٹھا اور چیختے ہوئے کہنے لگا "تو پھر جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔ اور اے کاش یہ پانی تمہیں کبھی واپس نہ لائیں۔ تم ان کی خوراک بن کے رہو۔ اور یہ دھند بلولوتو کی بستی کو تمہاری نگاہوں سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھپا دے تم یہاں کبھی نہ واپس آ سکو"۔

مابوئی کے دونوں لڑکے بھی اس کے اس سے کچھ کہنے کیلئے آگے بڑھے مگر انہیں کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ کیونکہ عین اسی گھڑی شجرِ کلام کی شاخوں کو جنبش ہوئی اور اس کے پتے اس انداز میں کھڑکھڑا کرنے لگے جیسے اس کی شاخوں کے درمیان کوئی ان جانی ہوا چلنے لگی ہو۔ سارے دیوتاؤں نے چپ چاپ اپنی گردنیں جھکا لیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے اب شجرِ کلام کچھ کہنے والا ہے۔

اور جلد ہی شجرِ کلام نے کہا "اے مابوئی۔ اے دیوتاؤں کے سردار میری سن۔ اور اپنا گھر نہ چھوڑ۔ اگر تو چلا گیا تو برائی کی جھجک دور

ہو جائے گی اور اسے تیرے پاس آنے کا موقع مل جائے گا۔ اور یہ برائی اتنی بڑی ہے اور اتنی گمبھیر کہ اگر میں تجھے سمجھانا چاہوں تو سمجھا نہ سکوں اور اگر تو بھی سمجھنا چاہے تو سمجھ نہ سکے۔"

لیکن مالیوئی اپنی ضد پہ اڑا رہا۔ "آنے دو، برائی اگر یوں آتی ہے تو اسے آنے دو۔ میں نہیں ڈرتا۔ مجھ میں مقابلہ کی ہمت ہے۔" اور پھر اپنی گردن کو زیادہ بلند اور اپنی آواز کو زیادہ اونچا کرتے ہوئے اس نے دیوتاؤں کی طرف دیکھا اور کہا "وہ جو میرے ساتھ آنا چاہتے ہیں آگے بڑھ آئیں۔ اور وہ جو ڈرپوک ہیں ہیکو لیو کے ساتھ یہیں ٹھہرے رہیں۔" اور اس کے بعد اس نے اپنے قدم آگے بڑھا لئے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ذرا دور جانے کے بعد مڑ کے دیوتاؤں کے خاموش اور ساکت ہجوم پر ایک اور نگاہ ڈالی۔ اور فخریہ تحکمانہ انداز میں کہا۔ "وہ جو میرے بیٹے ہیں۔ میرے ساتھ آجائیں۔" اور پھر لہجے کو ذرا نرم کر کے اس نے یہ بھی کہا۔ "اگر میرے بھائی بھی میرے ساتھ چلنا چاہتے ہیں تو آجائیں۔"

دیوتاؤں کی محفل بدستور خاموش رہی۔ مگر چند ہی لمحوں بعد ان کے درمیان جیسے ایک نعرہ گونجا۔ "ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" اور مالیوئی کے بھائی اور بیٹے اس کے پاس آ گئے۔ اور ان کے ساتھ ہی چند اور دیوتا بھی۔ اسوقت ہیکو لیو غصے سے بے تاب ہو گیا اور اپنی دم کو لپیٹتے، دانتوں کو پیستے، لال بھبھوکا سا ہو کر دوسری جانب چلا گیا۔ اب "شجر کلام" کی شاخیں بھی پراسرار طور پر خاموش ہو گئیں۔ اور یہ بستی بسانے والے من چلے کسی نئی منزل کی طرف روانہ ہونے کیلئے سمندری کشتی پر سوار ہو گئے۔ مگر کشتی ابھی جنبش کرنے کو تھی کہ مالیوئی نے دفعتاً ایک نئی سوچ سوچی۔ اس نے اپنے بھائیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میرے اچھے بھائیو! تم اتر جاؤ اور کچھ دیر اور یہیں ٹھہرو۔ اگر میرے بعد وہ برائی جس کی پیشین گوئی "شجر کلام" نے کی ہے آنے لگے تو اسے روک لو۔ مجھے ہیکو لیو کی نیت نیک نہیں معلوم ہوتی۔ کون جانے جب ہم میں یہاں کوئی نہ ہو تو وہی کسی برائی کو بلا لے غصے میں وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ شجر کلام کی شاخیں کاٹ کے وہ اسے اپاہج بھی بنا سکتا ہے اور آب حیات کے چشمہ میں کوئی گندگی بھر کے ہمیں ہمیشہ کی کسی لعنت میں بھی گرفتار کر سکتا ہے۔ اس لئے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے باز رکھنے کے لئے یہیں رک جاؤ اور اس وقت تک اس کی نگہداری کرو جب تک کہ میں واپس نہ آؤں۔ اور یقین جانو کہ میں جلد ہی تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لئے لوٹوں گا۔ اس وقت حالات بھی بہتر ہوں گے اور نصیب بھی ہمارا ساتھ دے گا۔"

مالیوئی کے اس کہنے کو اس کے بھائیوں نے اپنے دل میں جگہ دی۔ اور یہ کہتے ہوئے وہ کشتی سے اتر گئے۔ "کہ اے ہمارے سردار بھائی۔ تمہارا کہا ہمارے سر آنکھوں پر۔ تم جاؤ۔ اور جب تک تم نہیں آتے ہم تمہاری راہ دیکھیں گے۔"

اس کے بعد مالیوئی کی کشتی سمندر کی لہروں کے بہاؤ پر روانہ ہو گئی اور ان لہروں کی چٹانوں، لہروں کے پہاڑوں اور ان پہاڑوں کے دور دراز تک پھیلے ہوئے سلسلوں کو روندتے روندتے آخرکار وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سمندر کا نیلا پانی سیاہی مائل تھا۔ اور جہاں لہریں نہ چیختی تھیں اور نہ ہی ڈراؤنی معلوم ہوتی تھیں۔

یہاں پہنچ کر مالیوئی نے ملاحوں کو حکم دیا۔ "رک جاؤ۔"

اور وہ رک گئے۔ بادبان باندھ دئے گئے اور لنگر ڈال دیا گیا۔

پھر مالیوئی نے اپنے اردگرد ایک نظر ڈالی اور کچھ دیر کشتی کے کنارے پر ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد اس نے اپنا مچھلی پکڑنے کا کانٹا پکڑا اور اسے سمندر میں پھینک دیا۔ پانی میں اس سے کہکشاں کی سی ایک لکیر بن گئی اور پھر تھوڑی دور جا کر وہ کانٹا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

مالیوئی کے ساتھی دیوتا حیران سے ہو کر اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتے تھے مگر انہیں جرأت نہ ہوتی تھی۔

لیکن اس کا بیٹا اٹیالانگا خاموش نہ رہ سکا اور چلا اٹھا "اے ابا آخر یہ کیا مذاق ہے۔ کیا ہم نے یہ ساری دوڑ دھوپ محض مچھلی کے اس شکار کے لئے کی ہے؟ کیا بلوتو کی مچھلیاں ختم ہو گئی تھیں۔ جو تم نے اس لمبے چوڑے سفر کی کوفت اٹھانے کی ٹھانی تھی۔"

اٹیالانگا ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ لیکن مالیوئی نے اپنا پروقار ہاتھ کھڑا کر کے اسے خاموش کر دیا۔ "بے صبر نہ ہو۔ اٹیالانگا انتظار کرو اور دیکھو۔"

مگر اٹیالانگا تھوڑی دیر بعد ہی پھر بے تاب ہو گیا۔

اب کے پھر مالیوئی نے اپنے ہاتھ سے اسے خاموش رہنے کو کہا اور ساتھ ہی اسے ٹوک بھی دیا۔ "میرے بیٹے۔ چھوٹے بڑوں کے سامنے ذرا چپ رہیں تو ہی اچھے لگتے ہیں۔"

پر اٹیالانگا لحظہ بہ لحظہ گستاخ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے بدتمیز بن کر کہا۔ "ابا۔ یہ خاموش رہنے کی بھی تم نے اچھی کہی۔ یہ کہنے سے پہلے اپنی ان اوٹ پٹانگ حرکتوں پر بھی تو ذرا غور کر لیا ہوتا۔"

"خاموش۔ بدتمیز! اپنی زبان سنبھال۔" مالیوئی نے چیخ کر کہا۔ اور

اس کے بعد اس آبکشاں کی سی لکیر پر جو مچھلی کے کانٹے سے بنی تھی نگاہیں گاڑتے ہوئے اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ کانٹے کا سرا اس کے ہاتھ سے لے لیں۔ اور سب کے سب اپنے پورے زور سے اسے اپنی طرف کھینچیں۔

اور جب انہوں نے کانٹے کو اپنی طرف کھینچا تو بوجھ کی وجہ سے ان کے پسینے چھوٹ گئے اور انہوں نے اندازہ لگایا کہ اس میں کوئی بڑی سی بھاری بھرکم مچھلی آ پھنسی ہے۔ مگر چونکہ وہ مچھلی حرکت نہ کر رہی تھی اس لئے انہیں ذرا ذرا شبہ بھی تھا۔ تاہم وہ اسے بدستور کھینچتے رہے۔ حتیٰ کہ تھوڑی دیر بعد سمندر کے اس پانی میں جہاں وہ لکیر سی تھی۔ اُبال سا آنا شروع ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ پانی کے اندر سے اب چیخوں کی سی آوازیں بھی آنے لگیں۔ جیسے وہاں کوئی قیامت آ گئی ہو۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود مالوئی کی بلند آواز اب بھی صاف سنائی دے رہی تھی "شاباش بہادرو کھینچے جاؤ۔ کھینچے جاؤ۔ ہمت نہ ہارو۔ بس تمہاری محنتوں کا پھل تمہیں ملنے ہی والا ہے۔ جی چھوٹا نہ کرو۔"

اور واقعی انہوں نے نہ جی چھوٹا کیا نہ ہمت ہاری۔ بس کھینچتے رہے۔ مگر جونہی کانٹے کا سرا اوپر آیا اور انہوں نے اس کے ساتھ ایک بڑے سے مٹیالے بادل کا سا ٹکڑا اٹکا ہوا دیکھا وہ سہم سے گئے اور ان کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"یہ کیا ہے اچھے سردار۔ یہ کیا ہے"۔ وہ سب کے سب ایک ساتھ چیخ اٹھے "کچھ نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے۔ بس تم کھینچے جاؤ۔ میں کہتا ہوں کھینچے جاؤ۔ ڈرتے کیوں ہو"۔

مالوئی کی حوصلہ افزا آواز نے پھر سے ان کی ہمت تازہ کر دی اور وہ دوبارہ کھینچنے لگے۔ حتیٰ کہ سمندر کے نیلے پانیوں میں سے دھرتی کا ایک ٹکڑا ابھر آیا۔ جو پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بعد ایک اور پہاڑ اوپر آیا۔ پھر ایک اور۔ ایک اور۔ اس طرح سات پہاڑ یکے بعد دیگرے اس گہرے پانی میں سے باہر نکل کے وہاں ایک خشک زمین بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے درمیان سرسبز وادیاں بھی تھیں۔ اور ان کے قدموں میں ہموار زمین کے کچھ ٹکڑے بھی بکھرے نظر آتے تھے۔

اب مالوئی کا سر فخر اور غرور سے اونچا ہو گیا اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور پھر ایک ایسی آواز میں جو خوشی کے نشے میں چور معلوم ہوتی تھی کہا "یہ ہے ہماری محنتوں کا پھل۔ اب ہم اسی دھرتی کے ٹکڑے کو اپنا گھر بنائیں گے اور دیکھو تو یہ ثابت کریں گے کہ یہاں کی زندگی کم از کم اس ہیولوٹو کی زندگی سے تو بدرجہا بہتر ہے جہاں لوگ تو وہاں پہ بس صرف سونا ہی جانتے ہیں۔ کیوں میرے ساتھیو اب تم کیا کہتے ہو؟"

سب کے سر جھک گئے۔ البتہ ایک سر اب بھی نہ جھکا۔ اس کا اپنا بیٹا ایٹالانگا جو کچھ دیر سے گستاخ بنتا جا رہا تھا اب بھی مرعوب نہ ہوا "ابا ان پہاڑیوں پر رہ کے ہم کیا کریں گے؟ کیا ان کی اونچائی چاہنے سے زحمت نہ بن جائے گی؟ ادھر ادھر جانے کے لئے کیا ہمیں بھی اب بندروں کی طرح کودنا پھاندنا پڑے گا؟"

اور ایٹالانگا کی شہ پا کر چند ایک اوروں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "ہاں سردار۔ یہ تو بڑی کٹھن زندگی ہو گی۔ دیوتاؤں کے بعد بندر بننا کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا"۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا" مالوئی نے انہیں تسلی دی اور پھر وہ چھلانگ لگا کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا اور وہاں زور زور سے اپنے پاؤں مارنے لگا۔ اب وہاں ایک ہیبت سی پڑ گئی۔ اور وہ پہاڑ اس کے پاؤں کے بوجھ سے دب دب کے چھوٹے چھوٹے ذروں میں بکھرنے لگا۔ اور دوسروں کے دیکھتے دیکھتے ہی وہ ایک ہموار زمین کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کے بعد وہ دوسرے پہاڑ پر چڑھا اور اس کے بعد تیسرے پر۔ اور یوں جب ان سات پہاڑوں میں سے تین بالکل ہموار ہو گئے تو وہ کچھ تھک سا گیا۔ اس لئے باقی چار پہاڑوں کو ویسے کا ویسا ہی چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔

اور یوں ان تین پہاڑوں سے جو نئی سرزمین بنی، وہ تھی ایٹا آج کے فیجی جزیرہ کا حسین ترین حصہ۔ اس کے بعد جلد ہی ٹانگا بھی وجود میں آیا جو فیجی کا ایک اور خوبصورت ٹکڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس زمانے کے سب سے بڑے دیوتا مالوئی ان دنوں نت نئی آبادیاں کرنے پہ تلا ہوا تھا کیونکہ مچھلیوں کے ایک لاپروا لیکن پر جوش شکاری کی طرح اس نے ان دنوں سمندر کی گہرائیوں سے بہت سے جزیرے نکال باہر کئے۔ کبھی اس کے کانٹے کی نوک تابی کو جا چھوتی اور کبھی نیوے کے جزیرے کو اور کبھی ڈاڈا کو۔ ان جزیروں کے درمیان اپنے پھرتیلے پاؤں کی مدد سے اس نے کچھ خوبصورت خوبصورت نہریں بھی بہا دیں اور ان کے درمیان لذیذ سبزیوں اور میٹھے پھلوں کے باغ بھی اگا دئے تاکہ اس کے ساتھی اس نئے مقام سے پورے طور پر مانوس ہو جائیں۔

پھر جب مالوئی اپنے اس نئے کاروبار سے فارغ ہو چکا اور اسے فرصتیں نصیب ہوئیں تو ایک دن جب کہ وہ اپنے پاؤں پھیلائے ایک نہر کے کنارے لیٹے ہوئے جاگتے کے سپنے دیکھ رہا تھا، اسے ہیولوٹو کے خیال نے آ گھیرا اور اپنے پرانے گھر کی یاد نے اس کے دل میں گدگدی سی شروع کر دی۔ اس نے سوچا کیوں نہ ایک مرتبہ پھر ذرا ہیولوٹو چلا جائے

ایک مرتبہ پھر سحر کلام کے پیچھے بیٹھ کے قہوہ کی چسکیاں لی جائیں آب حیات کے چشمے میں جھانکا جائے۔ اور سیکو لیبو کو اپنی کامیابی کی کہانی سنا کے، اسکے تن بدن میں جلن کی آگ روشن کی جائے۔"

اور سیکو لیبو کا نام ذہن میں آتے ہی اسے اپنا وہ وعدہ بھی یاد آیا جو وہاں سے آتی مرتبہ اس نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ "میں لوٹ آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرنا۔"

چنانچہ اپنے ساتھیوں سمیت وہ پھر بلوٹو کی بستی میں گیا۔ وہاں اس نے قہوہ بھی پیا۔ آب حیات کے چشمہ میں بھی جھانک کے دیکھا اور سیلو لیبو سے دل کھلی باتیں بھی کیں۔ مگر اس سارے دوران میں وہ یوں محسوس کرتا رہا جیسے کہیں نہ کہیں کوئی خلا اب بھی رہ گیا ہو، جیسے فضائیں ابھی تک کسی اور شے کی راہ دیکھ رہی ہوں، جیسے وہ کہانی جو اس نے شروع کی تھی ابھی ادھوری ہو، وہ برائی جس کی آمد کی پیشین گوئی سحر کلام نے کی تھی ابھی تک کہیں دھندلکوں میں چھپی بیٹھی تھی۔ کیا وہ برائی ضرور آئے گی؟ مگر وہ ہوگی کیا؟ اور وہ آئے گی کب؟ —— کب؟؟

(۲)
برائی کا بیج

بلوٹو کی بستی میں ایک بھید بھری خاموشی کا راج تھا اور دیوتا جو مستقبل کو ہمیشہ دیکھ سکتے ہیں اپنی آنکھوں کے سامنے ایک انوکھا سا اندھیرا پھیلا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ جیسے وہ دھند جو اس سے پہلے صرف دور تک پھیلے ہوئے پانیوں پر ہی نظر آیا کرتی تھی اب ان کی آنکھوں کا بھی ڈھکنا بن گئی ہو۔

اور اسی زمانے میں اٹیالانگا نے بلوٹو بستی کی اس دھند کی طرف دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ اداس ہے۔ اور ایکا ایکی اسے اپنے باپ مالوئی کے وہ الفاظ رلانے لگے جو اس نے اسے نئی بستی میں گستاخ سمجھ کے کہے تھے۔ خیال ہی خیال میں اس نے اس نئی بستی کو بھی دیکھا جو مایوتی نے مچھلی کی مانند سمندر سے نکالی تھی اور عین اس وقت اس کے ذہن میں ایک باغیانہ سوچ انگڑائیاں لینے لگی۔ اس نے اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے چھوٹے دیوتاؤں کو اپنے ساتھ ملانے کا قصد کیا۔

اس نے انہیں جمع کیا اور کہا: "میرے ہم جولیو! ہم سب جوان ہیں اور ہمارے باپ اور چچے بوڑھے۔ میں نے تمہیں یہاں صرف ایک سوال پوچھنے کے لئے بلایا ہے۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ تم مجھے بتاؤ۔ کیا جوانی بڑھاپے کے سامنے سر جھکانے میں حق بجانب ہے؟"

چھوٹے دیوتاؤں میں سے کوئی بھی اس کی بات کو نہ سمجھ سکا۔ اس لئے وہ سب کے سب چپ رہے۔ چنانچہ اس نے تھوڑی دیر بعد خود ہی وضاحت کی: "میرے دوستو مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ لڑکپن جونہی جوانی کی منزل میں داخل ہوتا ہے، باپ اور بیٹے، چچا اور بھتیجے کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے ——"

وہ ذرا کی ذرا رک گیا اور پھر کچھ وقفے کے بعد کہنے لگا۔ "تم جانتے ہو کہ میں تمہارے سردار اور دیوتاؤں میں سب سے بڑے دیوتا مایوئی کا بیٹا ہوں۔ مگر اس کے باوجود میں اپنی جوانی کو بوڑھے مایوتی کا غلام بنانا نہیں چاہتا۔ خود مختاری جوانی کا اولین حق ہے۔ اور میں جوان ہوں۔"

وہ مسکرایا اور پھر ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم بھی جوان ہو۔"

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ مگر جلد ہی اپنے چہرے پر ایک نئی طرز کی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہنے لگا: "ہم بھی دیوتا ہیں۔ دیوتاؤں کی اولاد اور ہم بھی وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔"

اب اپنی آواز میں اس نے ایک عزم کا سا ناؤ پیدا کر دیا اور ذرا پر وقار لہجے میں کہا: "ساتھیو، مایوئی اگر ایک نئی بستی میں امن چین سے رہ سکتا ہے تو ہم بھی وہاں امن چین سے رہ سکتے ہیں۔ مگر یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم اس کے سامنے جھک کے رہیں۔" اور پھر اس کی آواز اونچی اور تند ہونے لگی۔ "ساتھیو! میں وہاں مایوئی کے بغیر جانا چاہتا ہوں۔ میں اس بستی میں مایوئی کے بغیر رہنا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تم میرا بھی ساتھ دو۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟"

اور اس کی طوفانی آواز ایک جھٹکے کے ساتھ تھم گئی۔

سننے والوں پر ایک طویل خاموشی طاری تھی۔ اور ان کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے وہ بھی کسی نئی زندگی کے خواب دیکھنے لگی ہوں۔ مگر وہ سب چپ تھے۔

آخر اس چپ کو ان میں سے ایک نے جسکا نام نی فی تا تھا توڑا۔ وہ دوسرے ساتھیوں سے ذرا آگے بڑھا اور کہنے لگا: "محترم اٹیالانگا میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میں تیار ہوں۔ مگر ہم جائیں گے کیسے؟"

"جائیں گے کیسے؟" اٹیالانگا نے اس کے سوال کو دہرایا۔ اور پھر اس سمندری کشتی کی طرف اشارہ کیا جو ایک مرتبہ نئے جزیروں کی سیر کرا آئی تھی: "وہ دیکھو۔ ہم اس کشتی پر جائیں گے۔ یہ کشتی چھوٹی ہے اور ہم زیادہ۔ لیکن چونکہ ہمارا اعتماد ہمارے ساتھ ہوگا۔ اور ہماری ہمت بھی۔ اس لئے ہمیں گھبرانا نہیں چاہئے۔ اور ہاں دیکھو ہمیں ہونی چاہئے۔ جو کچھ ہو، جلد ہو۔ آج جب کہ مایوئی قہوہ پی کر سو رہا ہوگا ہم کشتی کا لنگر اٹھا دیں گے۔ بولو تمہیں منظور ہے؟"

"منظور ہے" ایک نعرہ سا فضا میں گونجا۔

اور یوں بلوفو کے قہوہ پی کے چلنے والوں نے ایک نئی زندگی کو اپنانے کے لئے سب کچھ منظور کر لیا۔

عین اس وقت ایٹالانگا نے انہیں ایک تنبیہ کی "دیکھو ہمارے اس ارادے کی عورتوں اور بچوں کے کانوں تک بھنک بھی نہ پڑے ورنہ سب کے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا"

"یونہی ہوگا" ایک اور نعرہ فضا میں گونجا۔

اور یوں ایٹالانگا نے ان نادانوں کی نادانی سے فائدہ اٹھایا اور انہیں اپنا بنا کے ان کا سب کچھ لوٹ لیا۔

اس کے بعد ایٹالانگا اپنے باپ مالوکی کے پاس گیا۔ اس انداز میں کہ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں جیسے سعادت مندی اسے باپ کے سامنے نگاہ اونچی کرنے کی اجازت نہ دیتی ہو۔

"ابا۔ میں معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں ابھی اس گستاخی پر نادم ہوں جو میں نے نئی بستی میں کی تھی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ وہاں میں نے ایسی ایسی باتیں کہیں جو مجھے نہ کرنی چاہئیں تھیں"

اور باپ ساری پرانی رنجش بھول گیا "نادان خواہ مخواہ پریشان ہو رہا ہے"

اور اس نے اس کی پیٹھ پر اسے تھپکی دی اور اسے اپنے ساتھ لئے ہوئے شجرِ کلام کے سائے تلے قہوہ پینے جا بیٹھا۔

قہوہ پیتے ہوئے جان بوجھ کے ایٹالانگا نے محض اپنے ہونٹ ہی تر کئے اور پیالے کو منہ کے ساتھ لگا کے بس جھوٹ موٹ کی چسکیاں لیتا رہا یہی وجہ تھی کہ بعد میں جب اس کا باپ اور چند دوسرے بڑے بڑے دیوتا گہری نیند سو گئے تو وہ بدستور جاگتا رہا۔ وہ اور اس کے دوسرے ساتھی بھی جن کی روحیں باغی ہو چکی تھیں۔ اور جو اپنے بزرگوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کے بھاگ جانے پر تلے ہوئے تھے۔

اور کچھ دیر بعد جب کہ ان کے بزرگ نیند میں خراٹے لے رہے تھے وہ چپ چاپ اٹھے۔ اپنے بیوی بچوں کو اپنے ساتھ لیا اور سمندر کی کشتی میں بیٹھ کر اس کے بادبان کھول دئے۔ اور بھاگ گئے۔ (باقی)

اعلان دفتر رسالہ آجکل میں مضامین نثر و نظم بڑی مقدار میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے رشحاتِ قلم روانہ نہ فرمائیں —— ادارہ

نقد و نظر

ف - ح

مطبوعات ادارۂ اشاعتِ اسلامیات

جیساکہ نام سے ظاہر ہے یہ ادارہ اسلام کی تبلیغ اور احکاماتِ مذہب کی تشریح و توضیح کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ مشیروں اور صلاح کاروں میں جامعہ عثمانیہ اور نظام کالج کی مستند و مقتدر ہستیاں شامل ہیں۔ اب تک اس ادارے نے چار کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں سے دو یعنی رہنمائے قرآن اور قرآن و سیرت سازی ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔ اے پی۔ ایچ ڈی صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ کی فکرِ بلیغ کا نتیجہ ہیں۔ باقی دو یعنی تعلیم قرآن اور اسلامی تقاریب مولوی غلام دستگیر صاحب رشید ایم۔ اے پروفیسر نظام کالج کی تالیفات ہیں۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے بارہا کہی ہوئی باتوں کو بالکل ہی نئے، انوکھے اور دلنشین انداز میں بیان کیا ہے، اور اسی لئے ان کی یہ کاوشات بہت زیادہ قابل قدر ہیں۔ ہر کتاب میں بہت سے مسائل دین کو ایمان اور تقلید کی حدود سے آگے بڑھ کر فلسفے اور خصوصاً نفسیات کی روشنی میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔ ان مسلمانوں کے لئے جو نئے دور کے اثرات کے ماتحت روحِ اسلام کو اطمینان بخش صورت میں سمجھنے سے قاصر ہیں، انکا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

رہنمائے قرآن | یہ الحاج نواب سر نظامت جنگ بہادر کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کے پانچ باب ہیں پہلے میں قرآن کو صحیفۂ فطرت اور اسلام کو ایک کامل تہذیب ثابت کیا ہے۔ دوسرے میں ان غلط تعبیرات کا جواب دیا ہے جو مذہب اور قرآن کے خلاف پیش کی جاتی ہیں۔ تیسرے میں وحی اور نبوت کی حقیقت سمجھائی ہے۔ چوتھے میں قرآن کا دائرۂ عمل واضح کیا ہے۔ پانچویں میں رابطۂ عبادت خلق پر روشنی ڈالی ہے۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ جلد معمولی۔ قیمت ایک روپیہ۔

قرآن اور سیرت سازی | نفسیاتی اعتبار سے اس دعوے کا ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ قرآن کا صحیح مطالعہ انسان کو نیک سیرت بنانے میں حد درجہ ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ انسانی کردار کی بہت سی کمزوریوں خصوصاً غصے، خوف اور حزن کا علاج قرآن سے ممکن ہے۔ اس کتاب کے آٹھ باب ہیں۔ مختلف موضوعات پر اصولی بحث کرنے کے بعد آخری باب میں انسان کی کامیاب زندگی کا قرآنی تصور پیش کیا ہے، جس کے مطالعے سے تعمیر حالات میں یقیناً بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ضخامت ۲۷۴ صفحات۔ مجلد قیمت سوا تین روپے۔

تعلیم قرآن | سورۂ فاتحہ اور سورۂ الناس سے سورۂ والضحیٰ تک اکیس سورتوں کے لفظی اور با محاورہ ترجموں کے بعد سیر حاصل تفسیریں پیش کی ہیں۔ یہ وہ سورتیں ہیں جن کا عام مسلمانوں کی پنج وقتہ نمازوں میں روزانہ ورد رہتا ہے۔ اس لئے اگر ان فرمودات الٰہی کے نفسِ موضوع اور صحیح مطلب و مفہوم کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو ظاہر ہے کہ عبادت میں دلی لگاؤ کے ساتھ ساتھ کس درجہ صداقت پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر طلبائے مدارس کے لئے لکھی گئی ہے لیکن عام مسلمان بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ضخامت ۸۸ صفحے۔ بلا جلد قیمت بارہ آنے۔

اسلامی تقاریب | چاند کے بارہ مہینوں میں مختلف دنوں کو مقدس سمجھتے ہوئے جو تقریبیں مسلمانوں میں رائج ہیں، ان پر مذہبی اور نفسیاتی زاویہ ہائے نظر سے ملک بھر کے مشہور اصحاب قلم نے روشنی ڈالی ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عید، بقر عید اور شب برات جیسے تہواروں کے علاوہ یوم جمعہ، یوم فاروق، یوم حسین، یوم عثمان، شب معراج، عید میلاد النبی وغیرہ کی تقاریب پر اس طرح بحث کی گئی ہے کہ ان نگارشات کے مطالعہ کے بعد عقیدت کی روشنی میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ ضخامت ۲۳۴ صفحات۔ مجلد قیمت چار روپے۔ یہ چاروں کتابیں ادارۂ اشاعت اسلامیات۔ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہیں۔

مطبوعات رائل ایجوکیشنل بک ڈپو

نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ادارے سے صرف تعلیمی کتابیں شائع ہوتی ہوں گی لیکن ادب و انشا کے میدان عمل میں یہ اپنے ہمعصروں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہے۔ اب تک جتنی کتابیں اس کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہیں وہ بلحاظ کتابت و طباعت اور باعتبار نفس مضمون اعلیٰ، عمدہ اور قابل مطالعہ ہیں۔ حال ہی میں اس نے جناب قیسی رامپوری کے تین ناول اور جناب بہار کوٹی کے افسانوں کا ایک مجموعہ چھاپ کر ایوانِ ادب میں چار نئے ستونوں کا اضافہ کیا ہے۔ قیسی صاحب بڑے کہنہ مشق افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔ اب تک ڈیڑھ درجن کے قریب ان کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تحریر میں حقیقت و صداقت کی ترجمانی اس شدت سے موجود ہوتی ہے کہ بعض دفعہ وہ اس کا لحاظ رکھنے میں ناول کی صحیح تکنیک کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی طرح زود نویسی کے باعث بعض جملوں کی ترکیب میں جھول پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے لئے مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ وہ اپنے جوش و خروش کے اظہار میں ذرا احتیاط برتیں اور خدمتِ ادب کے جذبے کے ساتھ ساتھ اس کی جملہ نزاکتوں کا حقیقی احساس اپنے دل میں پیدا کریں۔

رونق | ۲۸۰ صفحات کا یہ اصلاحی ناول حد درجہ دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ اس میں نیکی اور بدی کی باہمی کشمکش کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ عورت جس کی ازلی عظمت مسلّم ہے، غلط ماحول اور ناسازگار فضا کے سایوں میں گھِر جانے کے باوجود اپنی شان دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ موصوف کے دوسرے ناولوں کی طرح مکالمے کی بیساختگی اس میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ قیمت تین روپے۔

پھندا | اس میں کردار نویسی کا وہ رنگ جو قیسی صاحب کے اکثر ناولوں کو ایک امتیازی حیثیت بخشتا ہے، خوب نکھر کر اپنی شان دکھا رہا ہے۔ ایک طرف ایک پابندِ مذہب انسان ہے جس کی ذہنیت کورانہ تقلید کی بجائے عقلِ سلیم سے کام لیتی ہے۔ دوسری طرف اسی کا چھوٹا بھائی اپنی لاابالی کے باعث طبعاً دنیادار کہا جا سکتا ہے۔ ان کے ساتھ ایک تیسرے اشتراکی دوست ایثار تک جاتے نظر آتے ہیں لیکن اس طرح یہ کتاب مذہبی یا سیاسی موشگافیوں ہی کی حامل نہیں ہے بلکہ محبت کی بے پناہ قوتیں بھی عام خیالات و افکار اور افعال کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اسی لئے سامانِ دلبستگی میں کوئی کمی پیدا ہونے نہیں پائی۔ ضخامت ۲۰۶ صفحات۔ قیمت سوا دو روپے۔

برہنہ | اس میں عہدِ حاضر کی ایک دکھ بھری پکار ہے، جسے موجودہ جنگ اور اس کے اثرات نے پیدا کیا ہے۔ یہ ظلم و ستم کی داستانِ حزیں ہے۔ جس کے دلسوز نقوش واقعاتِ زمانہ نے تخلیق اور قیسی صاحب نے مربوط کئے ہیں۔ اس میں موصوف کی تحریر کا طنزیہ رنگ بڑی شدت کے ساتھ کارفرما ہے۔ البتہ کہیں کہیں خطیبانہ شان بارِ خاطر ہونے لگتی ہے۔ بحیثیت مجموعی ناول نہایت عمدہ اور اس دور کی قابلِ ذکر یادگار ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

خاکستر | جناب بہار کوٹی کے انیس افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں قیسی صاحب کی طرح حقیقت و واقعیت کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہے اور شاید اسی لئے ان کو دیباچہ لکھنے کی زحمت دی ہے۔ ان افسانوں میں تلخی اور طنز کا رنگ غالب ہے۔ اور موضوع کے لحاظ سے ان مسائل کو چھیڑا ہے جو گرگڑی میں لگے ہوئے گھن کی طرح اس وقت کی زندگی کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ خیالات میں فرسودگی لیکن اندازِ بیان میں اچھوتا پن ضرور ہے۔ بہار صاحب ابھی نئے لکھنے والوں کی صف میں ہیں لیکن تحریر کی پختگی ان کے شاندار مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

یہ سب کتابیں مجلد ہیں اور رائل ایجوکیشنل بکڈپو۔ اردو بازار دہلی سے مل سکتی ہیں۔

نکاتِ شیکسپیر

اگر تم کو یاد آئے کوئی دیوانہ پن اپنا
ہوا جو تم سے سرزد عشق میں جب تم ہوئے رسوا
اگر میری طرح معشوق کی توصیف کے پھندے
کبھی اپنے مخاطب کی سماعت پر نہیں ڈالے
اگر میری طرح مغلوب ہو کر دل کی وحشت سے
کبھی تم دفعتہً بزمِ احبا سے نہیں نکلے
تو یہ سمجھو کہ جھوٹا تھا تمہارے عشق کا سودا

(As You Like It Act 2, Sc 4)

الوداع! اے عظمت و جاہ و جلال
آدمی کا ہے یہی دنیا میں حال
آج اس کے بوتۂ امید میں
پھوٹتی ہیں نرم و نازک کونپلیں
کل دکھاتا ہے وہ پھولوں کی بہار
شرمگیں اعزاز کا رنگیں نکھار
تیسرے دن آ کے پڑتی ہے وہ کہر
برگ و گل پر جو ہلاکت کی ہے مہر
جب وہ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اب
پختہ تر ہونے کو ہے دورِ طرب
بیخ و بن تک جا پہنچتی ہے قضا
خاک میں ملتا ہے نخلِ امید کا!

(Henry VIII, Act 3, Sc. 2)

احساس نہ کچھ ہو دل میں غم کا
پھر بھی کر دیں زباں سے اظہار
یہ کام بہت کٹھن ہے لیکن
آساں ہے برائے مردِ عیّار!

(Macbeth, Act 2, Sc 3)

زمین و آسماں میں ہیں ابھی تک بے شمار اشیا
تمہارے فلسفے نے خواب بھی جن کا نہیں دیکھا

Hamlet Act 1 Sc 5)

تلوک چند محروم

روس میں آب پاشی

ممالک مشرق کی تاریخ تمدن ہمیشہ سے آب پاشی کے مسئلہ سے وابستہ رہی ہے یہاں پانی کی تلاش اور اس کے حصول کی کشمکش زندگی اور موت کا سوال بنا رہا ہے۔ یہ امر ایران، ہندوستان، افغانستان، ازبکستان، تاجکستان اور سویت روس کی دوسری وسط ایشیائی جمہوریتوں پر یکساں طور پر صادق آتا رہا ہے۔

انسانی تہذیب نے اول اول مشرقی دریائیں دجلہ و فرات، مرغاب و تجند، جیحون و سیحون، سندھ، گنگ اور نیل کی وادیوں میں جڑ پکڑی۔ ایک قدیم عربی کہاوت ہے کہ ہر صحرا کا ایک مستقبل ہوتا ہے۔ یہ بات بڑی پرانی ہے ممالک مشرق میں متعدد صحرا ہیں لیکن پرانے زمانہ میں اس سے بھی زیادہ تھے ہزارہا سال کی کوششوں سے وہ ریتیلے چٹیل میدان ہرے بھرے مرغزاروں میں تبدیل ہو گئے۔ انسان ہمیشہ سے دریاؤں کے قریب کے ریتلے میدانوں کو پانی دینے کے طریقے سیکھنے کی فکر میں رہا ہے۔ ان بنجر میدانوں میں پانی آجانے سے ایک نئی جان پڑی اور کسانوں نے غلہ کپاس، چاول، ترکاریوں اور پھلوں کی بڑی بڑی فصلیں تیار کیں۔ اندرونی ضروریات سے زائد اشیاء ان بیرونی مقامات کو بھیجی گئیں جہاں بارش کی قلت ہوئی اور پانی کی کمی۔ اس طرح ایسی نو آبادیات قائم ہوئیں جہاں کاشتکاری خاص پیشہ ہوتا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ تجارت اور دستکاریوں کو بھی فروغ ہو جاتا تھا یہی چھوٹی چھوٹی زرخیز آراضیاں رفتہ رفتہ آب پاشی کے ایسے بڑے بڑے مرکز بن گئے جہاں نہریں بیسیوں نہیں ہزاروں ہیکٹر زمین کو پانی پہنچاتی تھیں۔ غیر مزروعہ زمین کے طول میں لوگوں نے آب پاشی کے واسطے بڑی بڑی نہریں بنانا سیکھ لیا جن سے درجنوں کلومیٹر زمین کو پانی پہنچنے لگا پانی اصل نہروں سے چھوٹی چھوٹی شاخوں میں ہوتا ہوا بنجر زمین میں پہنچا اور ہزاروں گاؤں پانی کی برکت سے بڑے مرفہ الحال زراعتی مرکز بن گئے لوگوں کو اس "حیات بخش رطوبت" (پانی) کے خرچ میں کفایت کرنے کا ڈھنگ آگیا۔

"آب پاشی" کے معنی ہیں آراضی کو مصنوعی طریقہ سے کاشت کے لئے پانی دینا۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ فن آب پاشی اب سے دس ہزار سال پہلے کے لوگوں کو بھی معلوم تھا۔ اگرچہ آب پاشی کی تاریخ بہت قدیم ہے لیکن اس سلسلہ میں انجنیئری سے کام لینا، طرح طرح کی نہریں تعمیر کرنا اور ان کا جال پھیلا دینا غرض میکانکی آب پاشی ایک جدید چیز ہے۔ جدید مشینوں اور نئے نئے آلوں سے زراعت اور کاشت کے طریقوں میں ایک بڑا انقلاب ہو گیا ہے اور بہت سے بنجر علاقوں میں آب پاشی کا کام بڑے عمدہ طریقہ پر انجام پا رہا ہے۔

اسوقت تمام دنیا میں تقریباً اکیس کروڑ ستر لاکھ ایکڑ زمین کی آب پاشی کیجا رہی ہے اس میں سے نصف سے زیادہ زمین ہندوستان اور چین کی ہے۔

سویت روس میں اسوقت آب پاشی کی آراضی تقریباً ستاون لاکھ سات ہزار ایکڑ ہے۔ ۱۹۱۷ء سے پہلے روس میں آب پاشی کا علاقہ بیالیس لاکھ نو ہزار پانچسو ایکڑ تھا۔ اس میں سے چھتیس لاکھ بیالیس ہزار ایکڑ زمین کی آب پاشی سویت روس کی موجودہ وسط ایشیائی جمہوریتوں کی آبادی کی کوششوں اور ذرائع سے ہوئی تھی۔ آٹھ لاکھ ستاون ہزار نوسے ایکڑ زمین کی آب پاشی سرکاری خرچے سے ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں سرکاری صرفہ دس کروڑ سے کچھ کم ہوتا تھا (اس میں آب پاشی کے علاوہ صفائی وغیرہ کا خرچ بھی شامل تھا) گویا ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد کے زمانہ میں آب پاشی کے علاقہ میں جو اضافہ ہوا وہ اس سے آٹھ گنا تھا جو شروع سے لے کر ۱۹۱۷ء تک ہوا تھا۔ پنج سالہ منصوبہ بندی کی پہلی اور دوسری مدت میں ہی سویت حکومت نے ایک ارب، اکتالیس کروڑ تیس لاکھ کی رقم آب رسانی پر خرچ کی تھی۔

سویت روس کی مختلف جمہوریتوں میں آب پاشی کے علاقوں کی فی صدی شرح (اپنے کل علاقوں کے بالمقابل) حسب ذیل ہے:۔

ازبکستان :۔	۳۲ فیصدی	قازقستان :۔	۱۲ فیصدی
قرقزیہ :۔	۱۳ "	آذربائیجان :۔	۱۱ "
ترکمانیہ :۔	۷ "	تاجکستان :۔	۵ "
آرمینیہ :۔	۳ "	گرجستان :۔	۳ "
یوکرین :۔	۱ "	روسی فیڈریٹیڈ اسٹیٹس	۹ "

اس کے معنی یہ ہوئے کہ مرکزی ایشیائی جمہوریتیں روس کے آب پاشی کے کل علاقے کی ۶۷ ہیں (۶۷ فیصدی) ماورائے قفقاز ۱۴ فیصدی اور یورپی حصہ ۱۰ فیصدی۔

سویت روس کے مخصوص جغرافیائی اور آبی حالات کے پیش نظر آب پاشی کے علاقے کے ۹۲ فیصدی حصہ میں پانی "بغیر پمپنگ" کے بہتے کے پہنچایا جاتا ہے اور باقی کے صرف ۸ فیصدی حصہ کے لئے مشینیں وغیرہ لگائی گئی ہیں۔ آب پاشی کی

این۔ ڈی۔ پولیاکوف

مزید ترقی کے سلسلہ میں سویت روس اپنے قدرتی ذرائع اور علاقے کی وسعت کی وجہ سے تمام دنیا کے ملکوں سے بازی لے جا سکتا ہے بمعقول طور پر اندازہ لگایا گیا ہے کہ سویت روس میں آب پاشی کے قابل علاقہ آٹھ کروڑ چھہتر لاکھ پچاسی ہزار ایکڑ ہے۔ اسکا بڑا حصہ مرکزی ایشیائی جمہوریتوں اور ماورائے قفقاز میں واقع ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے فی الحال کل علاقہ کا ۲۰ فیصدی حصہ زیر آب پاشی ہے۔

روس کی قومی اقتصادیات میں آب پاشی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ آب پاشی کے تحت تیس ہزار سے زائد کھیت ہیں، چودہ سو سے زیادہ مشینیں وغیرہ کام کر رہی ہیں سات سو سے زیادہ سرکاری فارم ہیں، ساڑھے تیرہ ہزار شہر، اور نو آبادیاں ہیں اور پینتیس ہزار سے زیادہ آدمی نا ئدہ اٹھانے والے ہیں۔

سویت روس میں نہروں کا جال بہت رعب دار معلوم ہوتا ہے۔ بڑی بڑی نہروں کا طول ایک لاکھ چودہ ہزار آٹھ سو پچاسی میل سے زیادہ ہے اور چھوٹی چھوٹی نہروں کا چار لاکھ ترپن ہزار تین سو تیس میل ہے۔ آب پاشی کی نہروں کے علاوہ دوسری نہروں اور نالیوں کی لمبائی تقریباً چھ ہزار دو سو دس میل ہے۔ آب پاشی اور صفائی کے لئے مشینوں اور پلوں کے بڑے بڑے کارخانے ایک لاکھ تیس ہزار کے قریب ہیں۔ یہ تو ہیں بڑی نہروں کے واسطے، اور چھوٹی نہروں کے لئے تو ان کی تعداد اور بھی زیادہ ہے۔

سویت روس میں آب پاشی کا کام چلانے کے لئے پانچ ہزار آدمیوں کا عملہ مامور ہے (اس میں آب پاشی کے انجینئر اور مستری وغیرہ شامل ہیں) مستقبل قریب میں ان کارخانوں کی تعداد اور موجودہ عملہ میں اور زیادہ اضافہ ہونے والا ہے۔

آب پاشی کی ضرورت کا اندازہ فصل کے موقع پر بارش کی مقدار سے لگایا جاتا ہے۔ امریکی تخمینہ کے مطابق کرۂ ارض کے ایک تہائی حصہ میں سالانہ بارش کی مقدار دس انچ سے بھی کم ہے اور دوسرے تہائی حصہ میں دس سے بیس انچ تک ہے۔ سویت روس کی مرکزی ایشیائی جمہوریتوں میں بارش کی مقدار دو سے ۵ء۲ انچ تک ہے اور سویت روس کے یورپی حصہ میں اس کی مقدار بیس سے بائیس انچ تک ہے۔ بہت سے علاقوں میں اصل مقدار اس سے زیادہ ضرور ہے لیکن ان علاقوں کی فصلوں کو بارش سے فائدہ کے بجائے نقصان پہونچتا ہے کیونکہ بارشیں ناوقت اور ناگہانی ہوتی ہیں اس وجہ سے آب پاشی کی ضرورت کا اندازہ لگاتے ہوئے صرف سالانہ بارش کی مقدار ہی کو پیش نظر رکھنا کافی نہیں بلکہ سال کے دوران میں بارش کے وقفوں، مختلف فصلوں کی اپنی اپنی ضرورتوں اور بارش کے اوقات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ترکاریوں اور بے گٹھلی کے پھلوں کو دوسری فصلوں کی بہ نسبت زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ روس کے یورپی حصہ میں مثلاً ماسکو میں جہاں بارش کم نہیں ہوتی، ترکاریوں کے لئے آب پاشی کی زیادتی اس امر کی شاہد ہے لیکن صرف قدرتی تری ہی کی کمی کی وجہ سے آب پاشی کی ترقی ضروری نہیں ہے، بلکہ سویت روس میں اس ترقی کی محرک شہری اور صنعتی مرکزوں کی زیادتی ہوتی ہے جنصنعتی نو آبادیاں روس کی صنعتی ترقی کی وجہ سے ظہور میں آتی ہیں۔

گزشتہ چند سالوں میں سویت روس میں یہ کوشش ہوتی رہی ہے کہ قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنی جگہوں پر کارخانے وغیرہ قائم کئے جائیں جہاں کچا مال قریب ہو خاص طور پر ترکاریوں وغیرہ کی کاشت کا کام ایسی جگہ کیا جائے جہاں سے حمل ونقل پر زیادہ خرچ نہ ہو۔ اس لئے آب پاشی کی ترقی پرانی ہی جگہوں پر نہیں بلکہ سویت روس کے شمالی علاقوں میں بھی ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کو زراعت کا خاص جزو تسلیم کر لیا گیا ہے۔

وادیٔ فرغانہ میں کپاس بونے والوں کی کہاوت ہے "پانی کپاس کی ماں ہے، زمین باپ ہے اور کھاد اس کی دایہ ہے"۔ جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا تھا اب آب پاشی کو عمدہ اور مستحکم فصل کا واحد ضامن نہیں مانا جاتا۔ سویت روس میں تجربہ نے بتایا ہے کہ فصل کا استحکام اور اسکی عمدگی کا دار و مدار ضروری

ایک دوشیزہ سے ═══ عبدالعلیم تیرکوٹی

بھڑک اٹھا دلِ غیرت پسند سینے میں
جو دیتے تجھے چند غلامانِ نفسِ تیرہ داغ
ہوس کی صرصرِ محشر خرام سے یہ لوگ
بجھانا چاہتے تھے محفلِ حرم کا چراغ
بہت نگاہِ خرد آشنا نے کوشش کی
نہ مل سکا دلِ تاریک میں جنوں کا سراغ
نگاہِ شوق کی گستاخیوں سے حاصل ہو
تری جبیں کی ملائک فریبیوں کو فروغ
"حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ" (اقبال)

کیمیاوی کھاد اور ہوشیاری کے ساتھ برتنے پر ہے اس لئے آب پاشی کی مشینیں نصب کرتے وقت زراعت سے متعلق دوسری باتوں کا بھی دھیان رکھا جاتا ہے مثلاً فصلوں کی ادل بدل، زمین کی نگہداشت اور پیمائش، پیداوار کا انتخاب کیمیاوی کھاد کی بہائی اور کیڑوں کا مدہ انتظام۔

پرانے زمانہ کی آب پاشی کے طریقوں میں کچھ ایسے نقائص تھے جنکی وجہ سے جدید تجدیری کی راہیں بھی کھٹنت تھی۔ ان میں سے اکثر بہت طویل تھے، نہروں کے کنارے اور زاویئے غلط تھے اور قابو رکھنے والی کلیں معقود تھیں۔ ان اور بعض دوسرے نقائص کی وجہ سے پانی سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا اور زمینوں کو اتنا پانی بہم نہ پہونچ سکا جتنا ممکن تھا۔ اس سبب سے آب پاشی والی زمینوں میں طرح طرح کے نقائص پیدا ہو جاتے تھے اور فصلیں بھی خراب ہو جاتی تھیں۔

میکانکی آلات بھی ذرا گھٹیا درجہ ہی کے تھے۔ آب پاشی کے ان انتظامات سے چھوٹے چھوٹے کھیتوں ہی کا بھلا ہوتا تھا۔ تمام کام سوائے ہل چلانے کے ہاتھوں سے کیا جاتا تھا۔ ہل گھوڑے چلاتے تھے۔ غرض آب پاشی کے کام میں کسی طرح کا کوئی نظم ونسق نہ تھا۔ اس سلسلہ میں کوئی ضابطہ بھی نہ تھا ذمہ دار لوگ صرف وہ افسران سمجھے جاتے تھے جنکو "ارک آقسال" اور "میر آب" کہتے تھے۔ یہ لوگ بڑے بڑے خان اور بے لوگوں کے مفاد کا تحفظ کرتے تھے اور چھوٹے چھوٹے لوگوں کی ضروریات اور مفاد کا قطعی خیال نہ رکھا جاتا تھا حالانکہ یہی لوگ دراصل اس کے مستحق تھے

سویت حکومت کے قیام کے وقت سے آب پاشی کے کام کو بڑی ترقی ہو گئی ہے۔ اگرچہ تنظیم و تکمیل کو نہیں پہونچی ہے تو بڑے حصہ پر عبور پایا جا چکا ہے۔ آب پاشی کے علاقہ میں جو اضافہ ہوا ہے اسکا ۴۰ فیصدی حصہ تو پچھلے سلسلہ کی ازسر نو تنظیم سے وجود میں آیا ہے اور ۱۶ فیصدی تعمیر نو سے تنظیم نو بڑے پیمانہ پر جدید دھنگ کے میکانکی آلات کے ذریعہ کی گئی ہے۔

سویت روس میں آب پاشی کے علاقے چند کلومیٹر کے لیے چھوٹے چھوٹے کھیتوں پر مشتمل نہیں ہیں جہاں سب کام ہاتھوں سے یا زیادہ سے زیادہ گھوڑوں سے ہوتا ہو بلکہ وہاں آب پاشی کے علاقے بارہ سے اڑتالیس ایکڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ کے ہوتے ہیں۔ ان میں نہروں کے جال پھیلے رہتے ہیں۔ آب پاشی کا ہر علاقہ عام طور پر سولہ سو پچیس سے کر اڑتالیس سو پچھتر فٹ لمبا اور تین سو پچیس سے لے کر چھ سو پچاس فٹ چوڑا ہوتا ہے۔ ہر ایک علاقہ کے لئے ایک نہر کا ٹکڑا مخصوص ہوتا ہے اور اس میں پانی کی مقدار ۵ر۳ مکعب فٹ فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ ہر کھیت سے متعلقہ نہر عارضی طور پر بنائی جاتی ہے اور جب کھیت میں پورے طور پر ہل چلایا جا چکا ہوتا ہے تو ہر موسم بہار میں اس کی ازسر نو تنظیم و ترتیب کی جاتی ہے۔

پرانے زمانہ میں کھیتوں میں پانی بھرنے کے طریقے ابتدائی درجہ کے اور ناقص ہوتے تھے۔ آج آب پاشی کے طریقوں میں بڑی ترقی ہو چکی ہے۔ فی زمانا حد بندی اور نالیاں بنانے کا عام رواج ہو گیا ہے۔ ان طریقوں کی وجہ سے کھیتوں کو پانی صرف میکانکی ذرائع ہی سے دیا جا سکتا ہے (نالیاں کاٹی جاتی ہیں، حد بندیاں کی جاتی ہیں اور سطح کو ہموار بنایا جاتا ہے) پرانے زمانہ میں یہ کام ہاتھوں سے لئے جاتے تھے لیکن جدید طریقوں پر عمل درآمد کرنے سے پیداوار میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے۔ متذکرۂ بالا طریقہ "آب پاشی سطحی آب پاشی" کے تحت میں آتا ہے۔ ایک میکانکی طریقہ اور بھی ہے جنکو "چھڑکاؤ" یا "پھوار" کا طریقہ کہتے ہیں۔ آجکل یہ طریقہ زیادہ مقبول ہوتا جا رہا ہے۔

گزشتہ چند سالوں سے چھڑکاؤ کے طریقے کے سلسلے میں نئی نئی تحقیقات ہو رہی ہیں اور ملک کے مختلف حصوں میں نئے نئے تجربات کئے جا رہے ہیں جگہ جگہ نئی نئی مشینیں اور آلات لگائے گئے ہیں اور یہ نئے آلے بہت بڑی تعداد میں تیار کئے جا رہے ہیں۔ اس قسم کی میکانکی آب پاشی "نالی دار" باغات میں اور ایسے علاقوں کی فصلوں کے لئے اختیار کی جاتی ہے جہاں بارش اور قدرتی رطوبت کی کمی ہوتی ہے۔ سب سے آسان طریقہ وہی چھڑکاؤ والا ہے اور اس قسم کی چھڑکاؤ کرنے والا ایک آلہ فی فصل تقریباً سو سے لیکر ساٹھ ایکڑ تک آراضی میں آب پاشی کر سکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ طاقت والا ایک آلہ ہے جو ایک فصل میں دو سو چھیانوے ایکڑ تک میں آبپاشی کر دیتا ہے۔

۲ر۴۷ ایکڑ رقبہ میں آب پاشی کرنے کے سلسلے میں جو پانی خرچ ہوتا ہے اس کی آب پاشی کی ایک "اکائی" مانا جاتا ہے اور اتنی ہی زمین میں تمام موسم کے دوران میں جتنا پانی صرف ہوتا ہے اس کو پورے موسم کی آب پاشی کی اکائی سمجھا جاتا ہے۔ مختلف حالات میں یہ اکائی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے پانی کے بہاؤ والے طریقہ میں اس کی مقدار ۱۴,۲۰۰ اور ۴۰,۸۰۰ مکعب فٹ کے درمیان رہتی ہے اور چھڑکاؤ والے طریقے میں ۲,۴۰۰ اور ۱۴,۲۰۰ مکعب فٹ کے درمیان۔ ایک کھیت میں ایک یا دو سے کر پندرہ مرتبہ پانی دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پانی کتنے کتنے عرصہ بعد دینا چاہیئے اسکا انحصار فصل کی نوعیت اور زمین کی قدرتی حالت وغیرہ پر ہے) پانی دیتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ پانی وہاں تک پہنچ جائے جہاں تک جڑیں پہونچتی ہیں۔ ترکاریوں کے لئے یہ گہرائی سولہ سے چوبیس انچ تک کبھی جاتی ہے۔ غلہ کے واسطے چوبیس سے چھتیس انچ تک اور دوائی پودوں، باغوں اور انگور کی بیلوں کے لئے تین سے اکتالیس فٹ تک۔ سویت روس میں ہر علاقہ کے لئے آب پاشی کی مقدار، عمق، طریقہ اور عرصہ وغیرہ کا ایک تفصیلی گوشوارہ تیار کر لیا گیا ہے۔

تفصیلی گوشوارہ کئی سال کی محنت ریسرچ اور تجربہ کے بعد تیار ہو سکا ہے۔ اس سلسلہ میں کفایت پیدا کرنے کے طریقے خود روس میں اور اس کے علاوہ بیرونی ملکوں خصوصاً امریکہ میں عملی تجربات کرنے سے دریافت ہو سکے تھے۔

روس میں پرانی مشینوں کی نئے سرے سے تنظیم کرنے کے علاوہ نئے نئے کارخانے بھی بنائے گئے ہیں جن کی وجہ سے فن آب پاشی کو بڑی ترقی ہوگئی ہے۔ نئے آلات آب پاشی مندرجۂ ذیل مقامات پر نصب کئے گئے ہیں:—

دریائے چو پر چشن نامی بند، کرییا میں تبخال اور بازار علقہ، مالو، کبادنسکیا، ترکوکم اور انجیزک۔ کوباں ایفورٹک پر آب پاشی کا کام زیر تعمیر ہے اور ماددائے والنگا بھی کام جاری ہے۔ اس سے ایک کروڑ ایکڑ زمین میں آب پاشی کرانا ہے۔

سوویت روس میں مزدوروں کی بھرتی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس بیزی کا سلسلہ "اسٹالن فرغانہ نہر" کی تعمیر سے شروع ہوا ہے۔ یہ کام یکم اگست کو شروع ہوا اور ۳ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ختم ہوگیا۔ یہ نہر ایک سو پچاس میل لمبی ہے اور اس میں پانی کی مقدار ۴۲٫۴۳ مکعب فٹ فی سیکنڈ ہے۔ اس کی کھدائی میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار ازبک اور تاجیک کسانوں نے کام کیا اور اٹھتر لاکھ چوبیس ہزار آٹھ سو دن اس کام میں صرف کئے۔ فرغانہ کے ان کسانوں کی نقل ملک کے دوسرے حصوں میں بھی کی گئی۔ اس قسم کے کاموں کے سلسلہ میں حکومت کو زیادہ خرچ برداشت کرنا نہیں پڑا کیونکہ دو تہائی بار جنتا نے خود اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ یہ تمام کام بہت تھوڑے وقت میں ہوئے اور زیادہ تر مقامی سامان ہی پر اکتفا کی گئی۔ فنی نگہداشت بہترین ماہرین اور انجینیروں کے سپرد رہی۔

ہر مزدور کے کام کا اوسطاً بیاسی سے لے کر ایک سو دو مکعب فٹ (کھدائی) تھا اور کارگزار دو سو پچپن سے لے کر دو سو بہتر مکعب فٹ تک۔ کھدائی کا کام ۹۰ فی صدی مزدوروں نے پھاوڑوں وغیرہ ہی سے کیا اور مٹی ہٹانے کا کام گھوڑوں، گدھوں اور اونٹوں کی گاڑیوں سے لیا گیا۔ کچھ مشینیں بھی استعمال کی گئیں، جن کی وجہ سے مزدوروں کے کرنے کے کام آگاگی پھرتی سے انجام پا گئے۔

مزدوروں اور کمیروں کی آسائش کا پورا پورا خیال رکھا گیا۔ کل کام کی ترتیب اس طرح کی گئی تھی:—

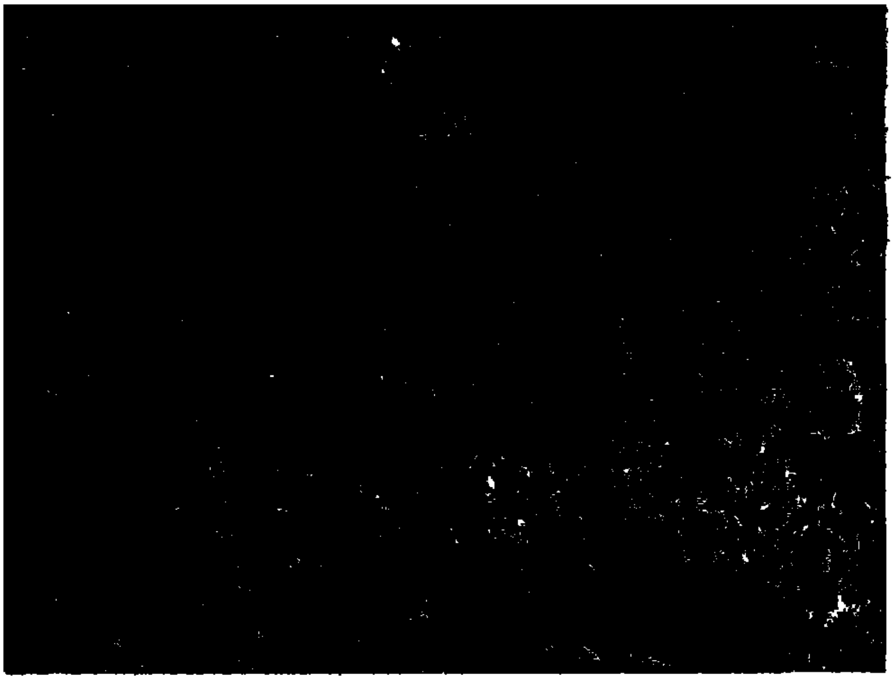
کام کی نگرانی پر مخصوص عملہ مامور تھا۔ تعمیرات کے مواقع انتظامی مراکز میں معین کئے گئے اور ہر موقع کے لئے کام مخصوص کر دئیے گئے (کتنے کلومیٹر نہر بنے گی اور کتنے مکعب میٹر کھدائی کا کام ہوگا) بڑے بڑے علاقوں کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم کر دیا گیا۔ ہر حصہ میں تقریباً ایک ہزار مزدور کام کرتے تھے اور ہر حصہ میں متعدد اجتماعی فارم ہوتے تھے۔ یہی فارم تعمیری کام کے خاص ذریعے تھے۔ ہر فارم کے لئے زیر تعمیر نہر کے کام کا ایک خاص حصہ مخصوص کر دیا جاتا تھا۔ ہر فارم کے متعلقہ مزدوروں کو چھوٹے بڑے جتھوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ہر جتھے کے آدمیوں کی تعداد کا انحصار زمین اور کام کی نوعیت پر تھا۔ کام کی یہ ترتیب و تنظیم بہت مفید ثابت ہوئی۔

ذیل کے گوشوارہ سے پتہ چلے گا کہ مرکزی ایشیا میں یہ کام کہاں کہاں اور کیا کیا ہوا:—

علاقہ	کتنے کام ہوئے	نہروں کی لمبائی (میلوں میں)	انجینیری کے ڈھانچے	کھدائی کا کام (مکعب فٹ میں)
فرغانہ	۱۹	۲۹۹	۱۳۴۳	۵۸۴۳۲۱۰۰۰
تاشقند	۹	۱۲۵	۶۳	۲۲۲۸۳۰۰۰
بخارا	۷	۱۲۲	۲۲	۲۵۰۰۷۰۰۰
خوارزم	۵	۱۰۷	۳	۷۴۸۰۰۰۰۰
سمرقند	۲	۱۷	۱۰	۳۳۵۱۷۰۰۰
روس کی خود مختار ریاستیں	۲	۱۹٫۲۵	–	۱۱۷۳۰۰۰۰
	"	-	،	
میزان	۴۴	۶۹۲٫۲۵	۱۴۸۵	۷۵۷۰۵۸۰۰۰

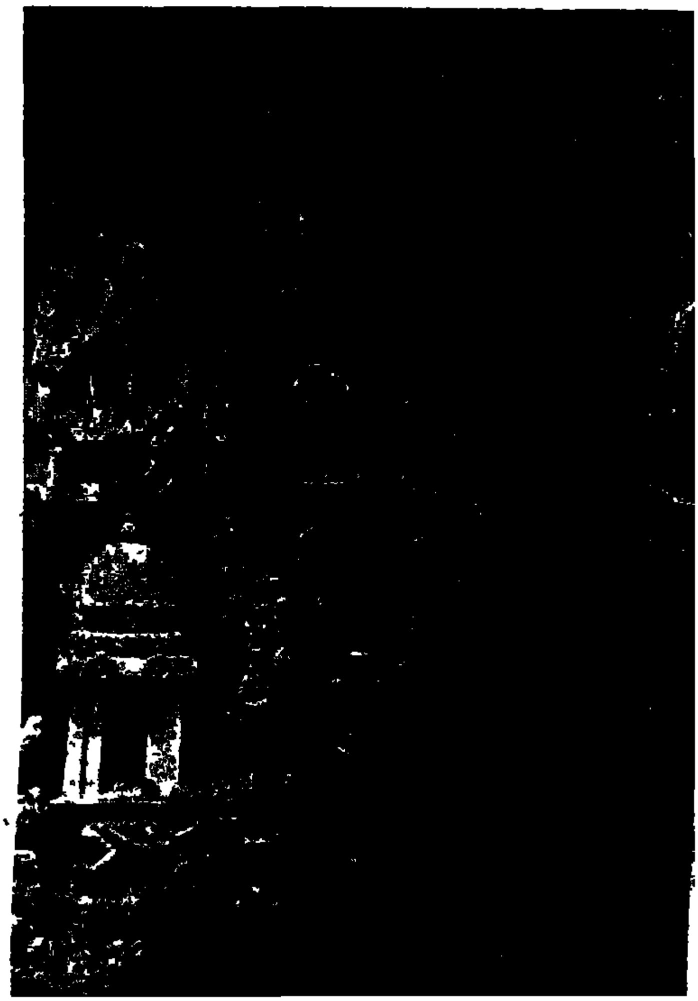
آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ غزل .... حضرت نوح ناروی ......
۲۔ امجد حیدرآبادی کی شاعری (مع تصویر) جناب نصیر الدین ہاشمی ...
۳۔ جدید ترکی ادب .... جناب پروفیسر اشرف انا پیدن ...
۴۔ ہندوستانی موسیقی (۲) ...... جناب شاہد احمد دہلوی ...
۵۔ بہانہ (ڈرامہ) .... جناب انتصار نوتنوی ....
۶۔ سید احتشام حسین (مع تصویر) ...... پروفیسر عبادت بریلوی ....
۷۔ برطانیہ میں تیمارداری کا پیشہ ... جناب کدار ناتھ لبین ......
۸۔ ٹوٹ گئے شبنم کے موتی (افسانہ) محترمہ اختر جہاں بیگم ......
۹۔ اقوام متحدہ کا ادارۂ غذا و زراعت ... جناب سید رضا علی ......
۱۰۔ غالب اور قنوطیت .... جناب علی حماد عباسی ......
۱۱۔ موت کا جنم (فجی کہانی) (۲) .. جناب محمود ہاشمی ......
۱۲۔ آج کا جرمنی .... جناب شنکر دیال ......
۱۳۔ حشر جذبات .... جناب ثاقب کانپوری
۱۴۔ آزاد شاعر .... ظریف الملک جناب ظریف دہلوی



دراوڑی* سنگتراشی

معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑ قوم
نے سنگ تراشی اور کندہ کاری
میں بڑی ترقی کرلی تھی اس کا
ثبوت جنوبی ہندوستان میں
بہت سی جگہ ملتا ہے مثلاً مہابلی
پورم کی چٹان اپنی عمدہ کھدائی



کیلئے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اس چٹان کے نقو
اچھا خاصا ایک مکمل ڈرامہ ہیں جس سے دریا پو
کے اعتقاد کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں گنگا کی کہانی
نقاشی کے ذریعہ تمثیل کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے
گنگا چٹان کی چوٹی سے نکل کر اسکے وسط میں آ
گرتی ہے۔ اس چٹان کے متعلق دوسرا خیال یہ ہے
اس میں «ارجن کی پراشچت» کو ظاہر کیا گیا ہے
ارجن وچار میں کھڑا ہے اور شیو اسکی پراشچت
منظور کرکے وردان دے رہا ہے۔ یقین کے ساتھ یہ
کہا جاسکتا کہ ان دونوں خیالات میں سے کون سا زیادہ
درست ہے۔ لیکن یہ چٹان اس دراوڑی فن سنگ
تراشی کا ایک اعلی نمونہ ضرور ہے جو جنو
ہندوستان میں ۷۰۰ء سے ۹۰۰ء تک مقبول رہا۔

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			فی کاپی	چندہ سالانہ
التفیر	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیپور	(فارسی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آہنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماہی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
تاج محل	(فارسی)	(سہ ماہی)	دو روپیہ	آٹھ آنہ
العرب	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ہندی)	(ماہوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ہے ڈے	(انگریزی)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارس ریویو	(انگریزی)	(ماہوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اوں ورث	(انگریزی)	(ماہوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی - چینی)	(سہ ماہی)	تین روپیہ	چار آنہ
پرسپکٹو	(انگریزی)	(سہ ماہی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی - فارسی (اردو - ہندی) (پشتو - روسی) (برمی - رومن اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)	—	ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا ٹریڈ ملیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

انڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچلے کتابی صورت میں — ایک سو اسی صفحات — دو نسخے — کپڑے کی جلد — قیمت دو روپیہ (بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں) —

«میراں دور لیبر» (زبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (محصول ڈاک معاف) —

خاص رعایت «عربی - انگریزی حلیے» سو سے صفحات — گتے کی جلد — قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ۔ کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ —

«فارسی انگریزی حلیے» کپڑے کی جلد — قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) —

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ — پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ — دھلی

Regd No L 4756

A UNITED PUBLICATION Delhi

پروڈیوسر و ڈائرکٹر سبطین فضلی کی کامیاب تخلیق

مہندی

کا

انتظار کیجیے جو فضلی فلمز کی ایک ایسی مکمل تصویر ہوگی جسے آپ ہمیشہ یاد رکھیں گے

نرگس اور بیگم پارہ

کے ساتھ کرن دیوان سلطان مظہر غوری مراد جانی بابو۔ زلو۔ انوری۔

بے بی شاما جیسے آرٹسٹ مہندی کی زینت ہیں۔

موسیقی:-	مکالمے:-	گانے:-	عکاسی:-	صدابندی:-
غلام حیدر	ساغر نظامی	مجروح سلطان پوری۔	دیوریچہ	اے نادر

مزید۔ خاتون گڑیا اور آوارہ کا انتظار کیجیے

فضلی فلمز۔ رتن ولا۔ دادر۔ بمبئی

آج کل دہلی

چندہ سالانہ روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۴ | فہرست | ۱۵ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ: آغا محمد یعقوب دواشی، بی اے (علیگ) ایل ایل بی

ناشر: راجیندر ناتھ شیدا، ایم اے

مدیران: فضل حق قریشی دہلوی — مشیر احمد، ایم اے

ادارہ مطبوعات ... پبلیکیشنز ... دہلی

رفتارِ زمانہ

اعزازی ڈگریاں

برطانیہ کی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح آکسفورڈ یونیورسٹی بھی ان عام ڈگریوں کے علاوہ جو وہاں تعلیم پانے اور کامیاب ہونے والے طلباء کو ملتی ہیں، ممتاز شخصیتوں کو اعزازی ڈگریاں بھی دیتی ہے۔ کنووکیشن میں ڈگریاں دیتے وقت یونیورسٹی کا وائس چانسلر صدارت کرتا ہے۔ اس موقع پر لاطینی زبان استعمال ہونے کے علاوہ ایسی لاطینی رسوم کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے جو یونیورسٹی کے ابتدائی دور یعنی بارھویں صدی عیسوی سے رائج ہیں۔ اس سال بھی یہ اعزازی ڈگریاں دنیا کی معزز ہستیوں کو عطا کی گئیں۔ باشندگانِ ہند میں سے ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر، سر راما سوامی مدالیار اور ملک سر فیروز خاں نُون کو یہ فخر حاصل ہوا۔ اول الذکر کو ڈاکٹر آف سائنس اور باقی دو اصحاب کو ڈاکٹر آف سول لاء کی ڈگریاں دی گئیں۔ یہ امر جہاں انھیں ہمارے ہندوستان کے واسطے باعثِ فخر ہے کہ اب اسے بھی دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ شمار کیا جانے لگا ہے۔

ہندوستانی مال اور مشرقی افریقہ

۱۹۴۶ء میں مشرقی افریقہ سے ۱۰،۹۱،۳۰،۸ روپیے کا سامان ہندوستان آیا۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان سے ۳۰،۹۳،۰۵،۲۳۶ روپیہ کا سامان مشرقی افریقہ گیا۔ وہاں کے باشندے ہندوستانی فلم بھی بہت پسند کرتے ہیں کیونکہ اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء کے مقابلے میں ۱۹۴۶ء میں دوگنی رقم کے ہندوستانی فلم وہاں بھیجے گئے۔ ان کے علاوہ سوتی کپڑا اور سن کی بنی ہوئی مختلف چیزیں بھی وہاں پسند کی جاتی ہیں۔ تاہم واقعاتِ حاضرہ سے جو کشیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل کی تجارت پر ناگوار اثر پڑے گا۔ اگر مشرقی افریقہ والوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ اپنا طرزِ عمل نہ بدلا تو یہ تجارتی تعلقات ٹوٹ جائیں گے اور ان کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں ہو سکے گی۔

نٹال میں ہندوستانی

اس وقت نٹال میں ہندوستانیوں کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے۔ حکومتِ نٹال کی پیہم درخواستوں پر ہندوستانیوں نے پہلے پہل ۱۸۶۰ء میں نٹال جانا شروع کیا۔ جب مزدوروں کے متعلق پہلے اقرارنامے کی میعاد ختم ہوئی اور ہندوستانی وہاں سے واپس آنے لگے تو پھر حکومتِ نٹال نے حکومتِ ہند سے مزدوروں کے لئے درخواست کی اور دونوں حکومتوں کے مابین معاہدہ ہوا جس کی ایک اہم شرط یہ تھی کہ اگر مزدور میعاد ختم ہونے کے بعد بھی وہاں رہنا چاہیں تو ان کو وہی درجہ حاصل ہوگا جو وہاں کے دوسرے لوگوں کو حاصل ہے۔ وہ ملک کے عام قانون کے تحت زندگی بسر کریں گے اور انھیں کسی امتیازی قانون کا شکار نہیں بنایا جائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ اس معاہدے کی اب پابندی نہیں کی جا رہی ہے، بلکہ عمل بالکل برعکس ہو رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ عوام کا رویہ بدل گیا ہے بلکہ حکومت ایسے قانون مرتب کر رہی ہے جو ہندوستانیوں کے لئے تکلیف دہ اور نقصان رساں ہو سکتے ہیں۔

مصر میں بجلی گھر

مصر میں بعد جنگ کی نت نئی منصوبہ بندیوں کے سلسلے میں ایک اہم خاکہ مرتب ہوا ہے جس کی رو سے نیل اور بحیرۂ قلزم کے پانیوں کو مختلف مقامات پر بند لگا کر آبی بجلی بنانے کے کام میں لایا جائیگا۔ ان دونوں مقامات پر اتنی بجلی تیار ہو سکے گی جو امریکہ کے زبردست بولڈر بند پر تیار ہونے والی بجلی سے مقدار میں نصف ہوگی۔ ایسی صورت میں مصر میں بجلی کی کل مقدار موجودہ صورت کے مقابلے میں تین گنی ہو جائے گی جو وہاں کے ایک کروڑ اسی لاکھ نفوس کے لئے کافی ہوگی۔ مجوزہ خاکے کے مطابق ایک بجلی گھر اسوان بند پر تعمیر ہوگا جو قاہرہ سے جانب جنوب پانچ سو میل کے علاقوں میں آبپاشی کے کام آتا ہے۔ اس نئی قوتِ برقابی کے ذریعہ روشنی کرنے کے علاوہ کارخانوں اور کھیتوں میں بھی کام لیا جا سکیگا تاکہ صنعت و حرفت اور زراعت میں ترقی ہو اور لوگ زیادہ خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

روسی سائنسداں اور آتش فشاں پہاڑ

روس کے بہت سے سائنسدانوں کا وفد حال ہی میں جزائر کمچاٹکا اور کیورائل پہنچا ہے تاکہ وہاں [illegible]

[illegible] پہاڑوں [illegible] کا مطالعہ کیا جائے۔ سوویٹ یونین میں صرف اسی دو ماہ تو [illegible] بھی آتش فشانی کر رہے ہیں۔ باقی سو بجھ چکے ہیں۔ سوویٹ یونین کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ آتش فشاں پہاڑوں کی فضائی تصاویر کھینچ کر ان کی اندرونی کیفیتوں کا مطالعہ کیا جائے۔ اس سے قبل یہ کام کبھی بھی انجام نہیں پایا۔ ان تصاویر کا مقصد اس نظریے کی تصدیق کرنا ہے کہ کیا ہم آتش فشاں پہاڑ ٹھیک اس خطے پر واقع ہیں جہاں سے زمین کی سطح اندرونی طبقات تک شق ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان تحقیقات کے سلسلے میں بہت سی دوسری مفید باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ اگر کبھی وہ پہاڑ گرم ہو کر لاوا اگلنے لگے تو وہاں کے لوگ تباہی کا سامنا کرنے کی بجائے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ فضائی کوششوں میں کس حد تک کامیاب رہتا ہے۔

ہندوستانی سپاہی اور قحط

ہندوستانی فوج کی تاریخ میں پہلی بار بہادر سپاہی اپنے ملک کے گوشے گوشے میں ایک ایسے دشمن کا مقابلہ کر رہے ہیں جو نظر نہیں آتا لیکن اس کی تباہکاریاں روز روشن کی طرح ظاہر ہوتی ہیں۔ اس دشمن کا نام ہے قحط جس کا کھٹکا ہر گھڑی لگا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ خالی از دلچسپی نہیں ہیں۔ پتہ لگتا ہے کہ اپریل ۱۹۵۳ء کے دوران میں علاقہ بمبئی کے سپاہیوں نے ۲۲۔ ایکڑ زمین کو زیر کاشت کرنے کے لئے اسقدر تندہی سے کام کیا کہ اس کی مجموعی مدت دس ہزار گھنٹے کے قریب ہوئی۔ اس زمین میں مکئی، جوار، باجرہ اور چاول لگایا گیا۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ سو ایکڑ زمین کاشتکاری کے لئے علیحدہ تیار کی جا رہی ہے۔ سندھ کے علاقے میں فوج نے اپنی زیر نگرانی اعلیٰ قسم کے بیج اور کھاد وغیرہ کی فراہمی کا انتظام کیا اور ٹکنیکل مشورے دئے اور شہری ماہرین نے انہیں مشورے اور مزدوروں کے ذریعہ ڈھائی ہزار ایکڑ زمین میں ایسی ترکاریاں [illegible] جو فوجی ضروریات کو پورا کر سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ اپریل ۱۹۵۳ء کے دوران میں اس [illegible] کے طفیل کراچی میں متعینہ فوجی دستوں کو دو لاکھ چون ہزار [illegible] پونڈ ترکاری [illegible] پچھلے سال کی تمام مقدار محسوب کی جائے تو وہ بیس لاکھ [illegible] ہو جاتی ہے جس سے یہ فائدہ ہوا کہ شہری منڈیوں پر فوجی ضروریات کی [illegible] بمبئی اور کراچی کے علاقوں میں فوج نے اپنے کھانے کے لئے [illegible] [illegible] ترکاریاں لگائیں۔ فوج نے اپنے واسطے اناج محفوظ رکھنے کے لئے [illegible] ذخیرے کے گودام بھی بنائے ہیں۔ اگر یہ صورت آئندہ بھی قائم رہی تو ظاہر ہے کہ اہل شہر کو ان دقتوں کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا جو فوجی ضروریات کے بڑھ جانے سے بعض مقامات پر اٹھانا پڑا ہے۔

ترکی کا نیا قانون صحافت

ترکی کی مجلس ملی نے اپنے ملک میں جمہوری طریقہ کار کو رائج کرنے کے سلسلے میں یہ قسم [illegible] تھا کہ اس جدید قانون کو منظور کر لیا جس کی رو سے قانون صحافت کی دفعہ ۲۲ میں ترمیم کی تجویز کی گئی تھی۔ اس دفعہ کے مطابق حکومت ترکی کو اختیار حاصل تھا کہ وہ ہر ایسے اخبار کو جو اس کے خیال کے مطابق حکومت کی حکمت عملی میں رخنہ ڈال رہا یا اس کے نظام کو قائم رکھنے کے سلسلے میں نقصان دہ ثابت ہو رہا ہو، شائع ہونے سے [illegible] اب ترکی اخبارات کو قلم کی پوری آزادی حاصل ہو گئی ہے [illegible] کی کارگزاری پر کسی قسم کا حملہ نہیں کر سکتے [illegible] پابندی بھی دور ہو جائے۔ یہ صورت اس لئے پیدا ہوئی کہ ترکی اخبارات کے نامہ نگاروں نے امریکی اور برطانوی اخبارات کے نمائندوں سے حال ہی میں بہت ربط ضبط بڑھا لیا تھا اور وہ انکی آزادی رائے سے متاثر ہو رہے تھے۔

جاپان کا مستقبل

حال ہی میں امریکی حکومت نے ایک گشتی چٹھی برطانیہ، روس اور چین کی حکومتوں کو بھیجی ہے اور دعوت دی ہے کہ چاروں ملکوں کے مابین پچیس سال کے لئے ایک ایسا معاہدہ ہو جائے جس کی رو سے وہ سب باہمی تعاون اور مشترکہ عمل سے جاپانی فتنہ کو آئندہ ابھرنے سے دبائے رکھیں۔ ایسی صورت پیدا کی جائے کہ ان کے دماغوں سے نبرد آزمائی کے جراثیم فنا ہو جائیں اور وہ امن عالم میں کوئی رخنہ پیدا نہ کر سکیں۔ ہر چند اب بھی اس لڑائی کی ہولناک تباہکاریوں نے ان کے عزم و ارادے کو ہمیشہ کے لئے کچل کر رکھ دیا ہے لیکن اندیشہ دامنگیر رہتا ہے کہ کہیں دھکیلے ہوئے کوڑوں کی سرزمین کے رہنے والے کچھ عرصے سے تک سسکا کر پھر کسی قابل نہ ہو جائیں۔ چونکہ اتحادی آئندہ دنیا بھر میں صلح و آشتی کی فضا قائم رکھنے کے درپے ہیں، اس لئے پیش بندی کے طور پر یہ سب تدبیر عمل میں آ رہی ہیں۔

جوہری بموں کے تجربات

سنا گیا ہے کہ جوہری بم کی صحیح قوت معلوم کرنے کے سلسلے میں کچھ نئے تجربات کئے جائیں گے۔ اس حقیقت کا انکشاف حال ہی میں امریکی بحریہ کے نائب امیر البحر نے کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ بحر الکاہل میں ایک خاص مقام پر سمندری جہازوں کا ایک بڑا لشکر کھڑا کر کے اس پر بم پھینکا جائیگا۔ ان کا خیال ہے کہ نتیجہ انتہائی ہولناک رہے گا تاکہ جاپان کے صوبہ ناگاساکی پر جو بم پھینکا گیا ہے اسکا اثر موجودہ اور آئندہ دور کے مرد عورت اور بچوں پر بڑا خوفناک رہے گا۔ دوسرے تجربے کے طور پر ایک جوہری بم سمندر کی سطح کے نیچے آہستہ سے پھینکا جائے گا۔ قیاس ہے کہ اس کے پھٹنے پر پانی کی لہریں سخت تموج اور تیزی سے ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے لگیں گی اور درجہ حرارت کئی کروڑ تک پہنچ جائیگا۔ تیسرے تجربے کے طور پر سمندر کی اسقدر میل کی [illegible]

میں بنے ایک بم پھینکا جائیگا۔ اس کے نتائج کے بارے میں ابھی کوئی آخری [illegible] نہیں کیا گیا ہے لیکن خیال یہی ہے کہ وہ سمندری آبادی کے لئے ہلاک ترین حادثہ ہوگا۔ ان تجربات کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ جوہری بم میدان جنگ کا سب سے زیادہ تباہکن ہتھیار ہے اور آئندہ اس مقصد کے لئے اس سے احتراز کرنا ہی بہتر ہے۔

مفتیٔ اعظم مصر میں

اس خبر کے گرم ہوتے ہی کہ یروشلم کے مفتیٔ اعظم الحاج امین الحسینی سرزمین فرانس سے فرار ہوکر مشرق وسطیٰ کے کسی محفوظ مقام پر پناہ گزین ہونے کے لئے چلے گئے ہیں، ساری دنیا میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی اور میدان سیاست کے ارباب حل و عقد ورطۂ استعجاب میں ڈوب گئے۔ شروع میں یہ خبر افواہ کی صورت میں پھیلتی رہی لیکن جب فرانس کے افسران اعلیٰ نے بھی اسکی تصدیق کردی تو تسلیم کرنے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔ قیاس لگایا گیا کہ وہ ملک شام میں پوشیدہ طور پر مقیم ہیں اور عرب لیگ کے اس اجلاس میں جو بلدان میں ہو رہا تھا شرکت کریں گے، اچانک سننے میں آیا کہ انھوں نے مصر میں پہنچکر براہ راست شاہ فاروق سے امانت طلب کی اور ان کے مہمان ہوگئے۔ شاہ مصر نے اپنی ملکی اور قومی روایات کے پیش نظر ان کو پناہ دی اور وزیر خارجہ سید لطفی پاشا نے صاف لفظوں میں کہدیا کہ اگر سیاسی اختلافات کی بنا پر کسی بھی ملک نے مفتیٔ اعظم کو ہم سے طلب کیا تو ہم انکار کردیں گے کیونکہ وہ چاہے کتنے ہی بڑے سیاسی مفرور ہوں مگر مصر ان کو اپنی پناہ میں لے چکا ہے اور اب اس سرزمین کا ذرہ ذرہ انکی حفاظت کریگا۔ اس ضمن میں برطانوی سفیر متعینہ قاہرہ کو ہدایت بھیجی گئی کہ حکومت مصر سے یہ دریافت کریں کہ مفتیٔ اعظم کے سلسلے میں اس کے آئندہ ارادے کیا ہیں۔ نیز یہ کہ برطانیہ کو اس امر کا یقین دلا دیا جائے کہ مفتیٔ اعظم کسی سیاسی سرگرمی میں عملی حصہ نہیں لیں گے۔ حکومت برطانیہ کی ان تحقیقات وغیرہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ موصوف کی واپسی کا مطالبہ نہیں کررہی۔ کچھ دن قاہرہ میں رہنے کے بعد وہ شاہ فاروق اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ اسکندریہ چلے گئے۔ ان کا جلوس بہت شاندار طریقہ پر نکالا گیا جس کی تفصیلات مصطفیٰ امین بے نے اپنے روزنامے "اخبار الیوم" میں درج کی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ مفتیٔ اعظم نے شاہ فاروق سے کہا کہ "میں نے کسی غیر ملک کے لئے کوئی سیاسی خدمت انجام نہیں دی۔ میں شام، فلسطین، لبنان، عراق، مصر اور دیگر عرب ممالک کی آزادی کیلئے جدوجہد کرتا رہا ہوں مجھے برطانیہ سے نفرت نہیں ہے، امریکہ سے نفرت نہیں ہے حتی کہ یہودیوں سے بھی نفرت نہیں ہے"۔

روس میں ترقی کے نئے خاکے

سوویت یونین نے اپنے چوتھے پنج سالہ خاکے کو دائرۂ عمل میں لانا شروع کردیا ہے۔ ترقی کے بہت نئے خاکے تیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے قفقاز کے جانب شمال ستافروپول کے علاقے میں ایک زبردست نہر بنائی جارہی ہے جو کیوبان اور یرگو رو یک دو دریاؤں کو آپس میں ملادیگی۔ آبپاشی کے سلسلے میں یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ اس نہر کی بدولت اس علاقے کے رہنے والوں کی دوسری ضروریات بھی پوری ہوسکیں گی جس زمین میں آبپاشی کرنی ہے اس کا رقبہ تقریباً پچیس ہزار ایکڑ ہے۔ اس نہر پر برقابی کے دو کارخانے بھی کھولے جائیں گے۔ ان میں سے ایک کی تعمیر بھی شروع ہوگئی ہے دریائے زرادیشان کی وادی میں پانی کا ایک عظیم الشان حوض تیار کرنے کے سلسلے میں جو کام جنگ چھڑ جانے کے باعث ترک کیا گیا تھا، وہ دوبارہ شروع کردیا گیا ہے۔ یہ سوویت یونین کے بہت بڑے حوضوں میں سے ہوگا۔ اس میں ساٹھ کروڑ مکعب میٹر پانی بیک وقت جمع رہ سکیگا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے اہم کام شروع کردئے گئے ہیں اور ان کی تکمیل میں عجلت برتی جارہی ہے۔

جاپان کے سابق وزیر خارجہ

تپ دق اور ایسی ہی کئی دوسری جان لیوا بیماریوں میں مبتلا رہنے کے بعد ٹوکیو کے ایک اسپتال میں جاپان کے سابق وزیر خارجہ یوسوکے متسوکا کا انتقال ہوگیا ان کی عمر تقریباً ۶۶ سال تھی۔ انھیں جنگی مجرم کی حیثیت سے گرفتار کرنے کے لئے جنرل میک آرتھر نے نومبر ۱۹۴۵ء میں احکام جاری کئے تھے۔ اس سال ماہ جنوری میں مسٹر متسوکا نے ہار مان کر اپنے آپ کو امریکی فوج کے حوالے کردیا۔ جنگی مجرمین کی فہرست میں ان کا نام شامل کیا گیا لیکن مہلک علالت کی بنا پر لسٹ سے خارج کرکے انھیں اسپتال میں بھیجدیا گیا۔ مسٹر متسوکا جولائی ۱۹۴۰ء سے پرل ہاربر کے حملے سے کچھ عرصے پہلے تک، جو دسمبر ۱۹۴۱ء میں ہوا تھا، جاپان کے وزیر خارجہ رہے۔ منچوریا کے سلسلے میں جو لڑائی چین اور جاپان کے مابین چھڑی تھی، اس میں بھی ان کی فتنہ پردازیاں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دو سیاسی کتابیں بھی لکھیں۔ ایک مسئلہ منچوریا اور دوسری تمام مشرقی ایشیا سے متعلق۔ ان کی موت اس وقت واقع ہوئی [illegible] نے ان کو بیماری کے باعث قابل رحم سمجھ لیا تھا۔

غزل — نوحؔ ناروی

کیا کوئی تیر حسینوں کی نظر ہوتی ہے
دل میں چبھتی ہے اِدھر پار اُدھر ہوتی ہے

حشر اُدھر اٹھتا ہے مائل یہ جدھر ہوتی ہے
خوب رویوں کی نظر اور نظر ہوتی ہے

کس مصیبت سے شبِ ہجر بسر ہوتی ہے
نہ قضا آتی ہے مجھ کو نہ سحر ہوتی ہے

ذکر کلیوں کا تو کیا دمِ فیضانِ بہار
خشک پتی بھی نکھر کر گلِ تر ہوتی ہے

کیا مرے کشفِ محبت میں اثر یہ بھی نہیں
آپ جاتے ہیں جہاں مجھ کو خبر ہوتی ہے

اہلِ غم کچھ بھی کہیں ہم یہ کہے جائیں گے
داغِ الفت ہی سے تزئینِ جگر ہوتی ہے

فطرتِ عشق دو وفا غیر کی محتاج نہیں
خود وہ مٹ جاتی ہے جو کور کسر ہوتی ہے

کیا کہا آپ نے دیکھا نہ کرو تم مجھ کو
دیکھنے کے لئے آنکھوں میں نظر ہوتی ہے

چرخ پر ڈوب گئے ڈوبنے والے تارے
اب کوئی دم میں شبِ غم کی سحر ہوتی ہے

دل کی اب خیر نہیں ہم یہ سمجھ لیتے ہیں
ملتفت وہ نگہِ ناز اگر ہوتی ہے

پہلے یہ سوچ لے پھر مجھ کو ستائے کوئی
آہِ مظلوم بڑی زود اثر ہوتی ہے

ہر طرف اہلِ نظر مجھ کو نظر آتے ہیں
دیکھنا یہ ہے نظر تیری کدھر ہوتی ہے

اس نے مرنے کو مرے اس لئے باور نہ کیا
اکثر اخبار کی جھوٹی بھی خبر ہوتی ہے

حشر کا دن ہم اسی دن کو سمجھ لیتے ہیں
عیش کی رات گزر کر جو سحر ہوتی ہے

کم سے کم جلوۂ دیدار میں دیکھا یہ اثر
اور کچھ ہو نہ ہو تسکینِ نظر ہوتی ہے

مطمئن دادطلب اپنی فغاں پہ نہ رہیں
تم جدھر ہوتے ہو یہ بھی تو اُدھر ہوتی ہے

کوچہ گردی نے شرف خضر کا بخشا مجھ کو
چلتے پھرتے مری اوقات بسر ہوتی ہے

خارِ گلشن سے نہیں دامنِ گل سے پوچھو
بوندِ شبنم سے جو گرتی ہے گہر ہوتی ہے

عرش تک جلد پہنچتی نہیں فریاد مری
ہوتے ہوتے کہیں مائل بہ اثر ہوتی ہے

کھل گیا الفتِ صادق کا نتیجہ ہم پر
سو میں ایک آدھ کو ہوتی ہے اگر ہوتی ہے

مختصر عیش کی راتوں میں یہ دیکھا ہم نے
شام ہوتی ہے اِدھر صبح اُدھر ہوتی ہے

دیکھ سب کا تجھے لطف سے دیکھا بھی نہ کر
اس میں بے حد تری توہینِ نظر ہوتی ہے

دیکھنے میں جو نہیں کچھ بھی وہی اُن کی نگاہ
جزوِ دل بنتی ہے پیوستِ جگر ہوتی ہے

یہ سمجھ کر نہ کبھی دل سے تمنا نکلی
اپنی توقیر فقط اپنے ہی گھر ہوتی ہے

اقتضا کہئے اسے فطرتِ انسانی کا
لوگ الفت نہیں کرتے ہیں مگر ہوتی ہے

کیا نظر آئے گا مجھ کو شبِ وعدہ کا وجود
شام ہونے نہیں پاتی کہ سحر ہوتی ہے

کبھی طوفاں کا تصور کبھی کشتی کا خیال * نوحؔ کی عمر انھیں دونوں میں بسر ہوتی ہے

امجد حیدرآبادی کی شاعری

اردو زبان کے اکثر شعراء ایسے ہیں جنھوں نے صرف شاعری کے میدان میں دادِ سخنوری دی ہے نثر نگاری میں ان کے کارنامے مفقود ہیں۔ غالب کی شخصیت دنیائے اردو میں اس لئے ممتاز ہے کہ نہ صرف ان کا کلام منظوم بلکہ خطوط یا دوسرے الفاظ میں نثر بھی اردو ادب کا گراں بہا سرمایہ ہے۔ زمانہ گذشتہ کے قطع نظر عصر حاضر کے بعض اصحاب بھی شاعری اور نثر نگاری کے لحاظ سے ممتاز ہوتے ہیں مثلاً مولانا شبلی، حالی، آزاد، ظفر علی خاں وغیرہ اسی قسم کی ایک شخصیت حضرت امجد کی ہے جس طرح آپ اقلیم سخنوری میں ایک خاص درجہ اور مقام رکھتے ہیں اسی طرح نثر نگاری میں بھی آپ کا قلم گوہر بار گلہائے افشانی کرتا ہے جن کی چمک دمک دنیائے اردو میں مدتوں باقی رہے گی۔ یہاں ہم مختصر طور پر آپ کی شاعری اور نثر نگاری پر نظر ڈالتے ہیں۔

کسی شاعر یا نثر نگار کے دماغی افکار اور ذہنی کاوشوں کو جانچنے کے لئے اولاً اس کی زندگی تعلیم و تربیت اور اس کے ماحول کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ اس کا اندازہ ہو سکے کہ کس ماحول میں اس کی شاعری پھلی پھولی اور کس فضا میں پروان چڑھی۔

(۲)

حضرت امجد کی پیدائش چودھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں یعنی ۱۲۹۵ھ یا ۱۲۹۶ھ میں بمقام حیدرآباد ہوئی۔ آپ کے والد ایک صوفی مشرب با خدا شخص تھے۔ مگر امجد کی پیدائش کے چالیس دن کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا سوائے والدہ کے ان کا کوئی عزیز قریب نہ تھا وہی ان کی پرورش کی کفیل تھیں۔ آمدنی کے ذرائع مفقود تھے۔ زندگی نہایت تکلیف سے بسر ہوتی تھی مگر اس کے باوجود تحصیل علم کی رغبت اور شوق دلانے اور تعلیم کے جاری رکھنے میں ایک غریب اور بیوہ ماں نے جو کد و کاوش کی وہ بار آور ہو کر رہی۔ قابل فرزند نے اپنے کلام نظم و نثر سے جو خدمت ملک و قوم کی انجام دی اور دے رہے ہیں وہ زندگی جاوید رکھتی ہے۔

آج سے نصف صدی پہلے کلکتہ، بمبئی، مدراس کی یونیورسٹیاں قائم ہو کر عرصہ ہو چکا تھا اور ان جامعات سے مرد تو مرد خواتین بھی اعلیٰ ڈگریاں لے کر میدان عمل میں بازی لگا رہی تھیں مگر حیدرآباد پر جمود طاری تھا مغربی علوم سے دلچسپی نہیں تھی۔ دارالعلوم اور مدرسہ نظامیہ مشرقی علوم کا درس دیتے تھے خصوصاً آخر الذکر مدرسہ اور اس کے ساتھ دارالعلوم اور مدرسہ نظامیہ کے طلباء ملا کر تھا جس کے علاوہ قدیم علماء مخالفین علم کو اپنے مکانوں پر بھی مشرقی علوم کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے گھر تشنگانِ علم کے لئے آب حیات بنے ہوئے تھے۔ شاعری کا بول بالا تھا ایک طرف حضرت فیض کے شاگرد اپنے استاد کی وراثت تقسیم کر رہے تھے تو دوسری طرف داغ کی محفل آراستہ تھی، سرشار، ترقی، گرامی، ظہیر وغیرہ شمالی ہند سے آکر حیدرآباد کی فضا کو شعر و سخن سے گرما رہے تھے۔

معاشرت میں اگرچہ مغربی طرز کی آمیزش ہو چکی تھی گو مشرقیت کو غلبہ تھا عام طور سے متوسط بلکہ اعلیٰ طبقہ کا رجحان مشرقی طرز پر تھا۔ رہنے سہنے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں مشرقی تہذیب مشرقی معاشرت کی جھلک نمایاں تھی۔ یہ تھی وہ فضا، اور یہ تھا وہ ماحول جس میں حضرت امجد نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ بسر کیا۔

حضرت امجد مکتب کی ابتدائی مذہبی تعلیم کے بعد مدرسہ نظامیہ میں شریک ہو کر نظامیہ کورس کا درس لینے لگے۔ اس کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کا شوق ہوا خانگی طور پر فارسی کی جانب متوجہ ہوئے۔ اس زمانہ آغا سید علی شوشتری الخاطب بہ شاد الملک سے استفادہ کرنے کے لئے میلوں کی مسافت طے کر کے جاتے تھے مطالعہ کا شوق دامن گیر تھا فارسی کے امتحانات منشی، منشی عالم اور منشی فاضل میں کامیابی حاصل کر لی۔

بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا ابتدائی زمانہ کا دیوان ہاتھ لگ گیا۔ اس کو دیکھتے اور پڑھتے رہتے۔ جسکے لئے آپ نے یہ شعر موزوں کیا ہے۔

نہیں غم گرچہ دشمن ہو گیا ہے آسماں اپنا ۔ مگر یارب نہ ہو نا مہرباں وہ مہرباں اپنا

نوجوانی میں وجہ معاش کی تلاش میں حیدرآباد چھوڑ کر بنگلور چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ تک عیسائی مشنری کے مباحث میں حصہ لیتے رہے اور کچھ عرصہ خانگی طور پر فارسی کے درس دیتے اور کچھ عرصہ تک مدرسہ ٹریننگ اسکول میں مدرس کے فرائض ادا کرتے رہے مگر چند ماہ کے بعد وطن کی کشش حیدرآباد واپس لاتی ہے۔

اب مدرسہ دارالعلوم میں مدرس کی خدمت کو قبول کیا اور اس عرصہ میں ماں نے اپنے اکلوتے فرزند کی شادی رچائی۔ ذمہ داری کا بار زیادہ ہو گیا کسی طرح اسی قلیل تنخواہ میں گذر کرتے رہے۔

اب طغیانی رود موسیٰ کا قیامت خیز سیلاب آتا ہے جس میں حضرت امجد کی ماں، بی بی اور بیٹی تینوں نذر سیلاب اجل

نصیر الدین ہاشمی

[illegible] حضرت امجد کی زندگی [illegible] کے ساتھ [illegible] کے اصلاحی [illegible] پہنچے۔

اس افسوسناک عظیم حادثہ نے امجد کو کئی سال تک تجرد کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔ شاہ خاموش صاحب کے سجادہ نشین حضرت سید اعظم حسینی نے گھر اقامت فرمائی۔ ان کے پوتے سید صابر حسینی (موجودہ سجادہ نشین) کی تعلیم کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اسی زمانہ میں استاد فلسفہ علامہ مولانا سید نادر الدین سے (جو علامہ عبدالحق خیر آبادی کے ارشد تلامذہ میں شامل تھے) فلسفہ کلام وغیرہ کا درس بھی جاری رکھا۔

استاد نے اپنے قابل شاگرد سے اپنی لخت جگر کا پیوند مناسب تصور کیا۔ مولانا سید نادر الدین نے اپنی بڑی لڑکی جمال النساء کی تعلیم میں بہت کوشش کی تھی جس کی وجہ سے علوم عربی، اور فارسی، تصوف اور خطاطی میں خاصی مہارت رکھتی تھی اور حضرت امجد کے گھر آنے کے بعد کبھی کبھی سحر اور رباعی کہنے لگی تھی۔

اس شادی کے بعد امجد کی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ تصوف کی مناسبت سے زہد اور ریاضت کا آغاز ہوا۔ طریقت اور سلوک کے منازل کی ابتداء ہوئی۔ پھر چند سال کے بعد آپ اپنی اہلیہ کے ساتھ حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ حج سے واپسی کے دو مہینے کے بعد آپ کی رفیق حیات کا انتقال ہوگیا۔ اس کا آپ کو بے حد صدمہ ہوا۔ مدت تک متاثر رہے۔

مدرسہ دارالعلوم کی مدرسی بھی کئی سال تک کرتے رہے۔ اس کے بعد دفتر صدر محاسبی میں منتقل ہوئے۔ اور ترقی کرتے ہوئے پچپن سال عمر کے آخر زمانہ میں مددگار صدر محاسب ہوگئے اور وظیفہ حسن خدمت حاصل کر کے اب اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

حضرت امجد بڑے خوددار شخص ہیں۔ کسی کا احسان گوارا نہیں کرتے۔ خود ہر قسم کا ایثار کرتے ہیں۔ آپ بڑے مہمان نواز ہیں۔ مہمانوں کی مہمان داری کر کے خوش ہوتے ہیں۔ عام طور سے آپ کسی کے یہاں نہیں جاتے مگر جب تعلق ہو جاتے ہیں تو ان سے ترک تعلق پسند نہیں کرتے۔ حتی الامکان سابقہ تعلقات کو قائم رکھتے ہیں۔ تواضع اور انکساری کی صفت امجد صاحب کا ایک خاصہ ہے۔ غریبوں سے خندہ پیشانی سے ملنا، ان کی دستگیری کرنا آپ کا معمول ہے۔ مجلس میں صدر پر بیٹھنا یا صدر بننا پسند نہیں کرتے۔ آپ نہایت سادگی پسند ہیں۔ کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے پہننے اوڑھنے میں انتہائی سادگی برتی ہے جو مل جائے وہ خوشی سے کھانا، جو مل جائے وہ پہننا آپ کی عادت ہے۔ گھر میں آپ معمولی قمیص تہبند میں رہا کرتے ہیں اور اسی لباس میں چھوٹی بڑی ہستیوں سے ملاقات کر لیتے ہیں۔ باہر جانا ہو تو پائجامہ اور سفید یا خاکستر

رنگ کی شیروانی زیب تن کرتے ہیں۔ ضروریات زندگی کی چیزیں اکثر خود خرید لاتے ہیں۔ سائیکل پر اکثر سوار ہوتے ہیں۔

آپ کے ملنے والوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے جس میں ہر طبقہ کے اشخاص شامل ہیں۔ اگر حیدرآباد کے امراء اور جاگیردار آپ کے دوست ہیں تو مفلوک الحال غریب کو بھی آپ کی دوستی کا فخر حاصل ہے۔ اگر سرکاری اعلیٰ عہدیدار آپ کے دوست ہیں تو کم مواجبی اہلکار بھی آپ کے دوستوں میں شامل ہیں اور ہر ملنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے وہی سب سے زیادہ دوست ہے۔ دوستوں سے مروت اور محبت سے پیش آنا آپ کا معمول ہے۔ اپنے اور پرائے کا غم کھانا اور دوسروں کے دکھ درد میں شریک رہنا آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔

سینما کے دردناک فلم اکثر دیکھا کرتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ سماع سے بھی خاص ذوق ہے۔ مجلس سماع میں آپ تڑپتے اور لوٹتے نہیں، البتہ رو لیا کرتے ہیں۔ کسی محفل میں طوائف کا گانا ہو تو اس سے بھی احتراز نہیں کرتے ہیں۔

عام طور پر آپ کسی کو مرید نہیں کرتے۔ مگر بعض خاص خاص اشخاص مریدین معتقدین ہیں۔ مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ آپ کا کلام نسوانی دنیا میں بھی بہت زیادہ مقبول ہے اور شیخ سعدی کی گلستاں کی طرح بچے بھی بہت شوق سے یاد کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔

(۳)

اس تفصیل کے بعد اب ہم آپ کی شاعری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ آپ کی شاعری کو چار دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور تو وہ ہے جو ابتدائی شاعری سے لے کر طغیانی رود موسیٰ پر ختم ہوتا ہے۔ اس زمانہ کا کلام اس وقت تقریباً مفقود ہے۔ اگرچہ ایک سو رباعیات کا ایک حصہ اسی زمانہ میں شائع ہوا تھا اور بڑے بڑے شعراء سے خراج تحسین حاصل کر چکا تھا اس سے آپ کے ہونہار ہونے کی خبر مل رہی تھی۔

شاعری کا دوسرا دور طغیانی رود موسیٰ کے بعد سے جمال النساء بیگم کی شادی تک قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں آپ نے نظموں کے علاوہ چند تضمینیں موزوں کی ہیں۔ حمد و نعت پر کلام مشتمل ہے۔ ساتھ ساتھ رباعیات بھی موزوں ہوتی رہیں۔ کلام میں تصوف کا رنگ آنے لگا۔

تیسرا دور جمال النساء بیگم کی شادی سے ان کے انتقال تک قرار دینا چاہیے۔ اس دور میں آپ کا کلام از سرتا پا تصوف میں رنگ گیا۔ خواہ رباعیات ہوں یا نظمیں سب کچھ تصوف سے لبریز ہیں۔ اس دور میں چند غزلیں بھی سفر حجاز میں کہی گئی ہیں۔

ہوتا اور اسکے بعد سے جس میں تصوف کا رنگ پختہ ہوگیا ہے۔ اس دور میں لکھا گیا آپ نے چند نظمیں معنی خیز لکھی ہیں۔ رباعیات تو ہر دور میں آپ کے کلام کا جزو لاینفک رہی ہیں۔

آپ کی تصانیف نظم اور نثر کی فہرست حسب ذیل ہے :—

(۱ و ۲) ریاض امجد حصہ اول و دوم (۳ و ۴) رباعیات حصہ اول و دوم (۵) خرقہ امجد (۶) نذر امجد۔

جو کتابیں صرف نظم پر مشتمل ہیں جو کتابیں نظم اور نثر سے ملی ہیں وہ یہ ہیں:—

(۱) جمال امجد (۲) گنج امجد (۳) گلستان امجد (۴) حکایات امجد (۵) میاں بی بی کی کہانی۔

امجد کے کلام کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے وہ خواہ کسی دور کا ہو اس میں تین باتیں خصوصیت سے پائی جاتی ہیں۔ سادگی، نازک خیالی اور تاثر۔ اور عمدہ نظم کے لئے یہی تینوں باتیں ضروری ہیں۔

اگر سادگی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ امجد کا کلام اکثر نہایت صاف ہے اور عام فہم بھی۔ قوانین فطرت سے متجاوز نہیں ہوتا۔ صفائی اور سادگی کے لحاظ سے آپ کے اشعار نظم نہیں معلوم ہوتے بلکہ نثر معلوم ہوتے ہیں۔ نازک خیالی کے لحاظ سے بھی امجد کا کلام خصوصیت رکھتا ہے لطیف تمثیلوں اور تشبیہوں سے چار چاند لگ جاتے ہیں اور پھر یہ تشبیہیں مبالغہ آمیز نہیں ہوتیں سادگی کے ساتھ نازک خیالی سے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کلام میں سیدھے سادے موتی ہیں جنکی صفائی اور چمک نے تک آنکھوں کو خیرہ نہیں کردیتی بلکہ دل و دماغ کو متاثر کردیتی ہے۔

امجد کے کلام میں مختلف حیثیت سے تاثر ہوتا ہے۔ اکثر دبشیر وہ درد و غم میں ڈوبا ہوا سوز و گداز کی تصویر ہوتا ہے کہیں پند و نصیحت کا آئینہ اور ساتھ ساتھ تصوف کی چاشنی ملی ہوتی ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، امجد کا کلام چار دور پر تقسیم کیا جاسکتا ہے اور پھر اس کو نظمیں، تضمین، غزلیں، رباعیات اور قطعات پر منقسم کرسکتے ہیں۔

نظمیں مختلف موضوع پر ملتی ہیں۔ مثلاً واقعہ نگاری۔ وصف نگاری، اخلاقی نظمیں، صوفیانہ نظمیں۔

وصف نگاری کی نظموں میں قیامت صغریٰ، طغیانی رود موسیٰ قابل ذکر ہیں جو ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد کی ایک خوفناک خاتون کی بلند شرکگی پر ''ایک بیکس کا خواب'' جو اپنے ایک خواب کے متعلق تفصیلی نظمیں ہیں خصوصیت سے قابل ستائش ہیں۔ ان میں واقعہ نگاری کا نہایت عمدہ اظہار ہوا ہے۔ واقعہ نگاری کی طرح وصف نگاری میں بھی، امجد کا قلم روانی سے چلتا ہے۔ ''میری قمری'' ''ماں کا نخچہ'' ''یتیم کی دعا'' وغیرہ اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ اخلاقی حیثیت سے بھی کئی نظمیں ملتی ہیں جن میں بہترین اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، امجد کی شاعری میں تصوف کا عنصر غالب ہے۔ آپ کی بے شمار نظمیں تصوف کی حامل ہیں جن میں تصوف کے اہم مسائل کو واضح کیا گیا ہے۔ آپ کی نظمیں قال نہیں بلکہ حال ہوتی ہیں۔ مثلاً تجدید کی پوری تیس نظمیں تصوف کے مسائل پر مشتمل ہیں۔

اس موقع پر ہم صرف دو نظموں کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں۔ ایک وصف نگاری سے متعلق ہے اور دوسری تصوف سے۔

''میری قمری''

ہم نے قمری عجیب پالی ہے — منتخب نغمہ سنجِ عالی ہے
کیا ہی نازوں سے اسکو پالا ہے — تیلیں کو قفس میں ڈالا ہے
قمریاں یوں تو دیکھی بھالی ہیں — اس کی باتیں مگر نرالی ہیں
گیت توحید کا سناتی ہے — راہِ حق کی طرف بلاتی ہے
پیاری پیاری وہ نور کی گردن — جس پہ قربان حور کی گردن
لال لال اس کی نرگس گلفام — یا بھرا ہے شراب صبح کا جام
اس پہ طرہ ہے سرخیٔ منقار — گل کو بھی رشک کرے بلبل پیار
تنگ منقار ارغواں یک سر — یاد مٹی پان کی ہو ہونٹوں پر
یا کوئی ناخنِ حنائی ہے — ہائے کیا سرخ پھونک پائی ہے
پاؤں بھی سرخ رنگ لیتے ہے — دل حنا کا اسی سے پستا ہے
زیبِ زینت سراپا اس کی ہر — سادگی میں ہزار جوبن ہے
جسم نقرہ صفت تمام سپید — صاف ہوتی تنگ قابل دید
ہے صدا اس کی مونسِ دلِ زار — جس پہ قربان ہزار صوت ہزار
ہے غضب اس کی مست کوکو آواز
گویا باب سماع ہوگیا باز

ایک تصوف کی نظم ملاحظہ ہو :—

ہر جزو کو اپنے کل سے اک نسبت ہے — کثرت میں گر اتفاق ہو وحدت ہے
ہر عضو کے حسن پر ہے تعریف مری — افعالِ جوارح پر ہے توصیف مری
ہر عضو کے ہر فعل سے منسوب ہوں میں — سر سے پا تک ہر اک کا مطلوب ہوں میں
بحر شاہد ہے ہر اک قطرۂ خوں — ہر جزو بدن کہتا ہے میں جز میں ہوں
ہر جزو یہ کہتا ہے کہ میں کل ہوں میں — ہر رنگ کا دعویٰ ہے کہ بو ہوں میں
اپنی ہی ہر اک مدح و ثنا کرتا ہے — جس کو دیکھو وہ ادا کرتا ہے
ہر جزو یہ کہہ رہا ہے میں بھی کل ہوں — ہر خار یہ کہتا ہے کہ میں بھی گل ہوں
کہتا ہے ہر اک سر سے ہے سودا دیکھو — ہر جزو کی ہے صدا ادھر تو دیکھو

تضمین اسکو کہتے ہیں جو دوسرے شعرا کے کلام پر مصرعے لگائے جائیں

یہ خصوصیت ہے کہ کسی شاعر کی غزل یا نظم کا شعر یا کوئی مصرع لے کر
اس کے ساتھ تین اور مصرعے لگا کر تضمین کی جاتی ہے
جہاں تک میرا خیال ہے امجد نے جو تضمین کا التزام کیا ہے وہ اردو کے
کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ آپ نے عربی، فارسی، اردو، ہندی کے
ساتھ اردو مصرعے لگائے ہیں اور پھر خوبی یہ ہے کہ ان مصرعوں سے اس نظم کو
چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ایک مختصر تضمین ملاحظہ ہو:۔

تضمین

ظہور جہاں در نرگس جادو ہے تو — جلوۂ ذات احد داور قیوم ہے تو
سورۃ الشمس لخاطی نما ہوئے تو — ایک شرح والضحیٰ آمد جمالِ روئے تو
نکوۂ والیل وصف زلف ہندوئے تو

کوئی میرے دل سے پوچھے تیر نگاہ کا اثر — ہے جو کبھی نشتر کبھی ہے مرہم زخم جگر
معجزے ہیں سحر کے اعجاز ہیں ترچھی نظر — لے رہی چشم سرمہ ناکت کحل مازاغ البصر
قاب قوسین است ابروئے خمیدہ ہے تو

ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے یا محمد المدد — کون پا سکتا ہے تیری شان اللہ الصمد
نور کی آیت ہے تیرا پاک تن اور احمد — سین دندان تو الیسین نشانے می دہد
صورت میم دارد حلقۂ گیسوئے تو

ہے سراپا مظہرِ کنزِ خفی — صاف بے صورت سی ہے تجلی ہو کی صورت گری
تیرا امجد کیوں نہ ہو قربان تجھ پر ہر گھڑی — قبلۂ دل کعبۂ جاں یا رسول اللہ توئی
سجدۂ مسکین حسن ہر لحظہ باد اسوئے تو

حضرت امجد کی غزلیں تیسرے اور چوتھے دور کی یادگار ہیں اور ان کی مقدار دوسرے کلام کے بہ لحاظ نہایت قلیل ہے۔ آپ کی تمام غزلیں تصوف میں رنگی ہوئی ہیں اور فلسفی مسائل کی حامل بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر شعر میں بجلی کی سی چمک اور تڑپ پائی جاتی ہے۔ وہ سوز و گداز کی بولتی تصویر ہوتی ہے ان کے اشعار میں بینائی کی جلوہ نمائیاں ہوتی ہیں جن تک رسائی اور پردہ دری ہر ایک کا کام نہیں ہوتا۔ وہ فصاحت و بلاغت کا ایک سمندر بے پایاں ہیں جو موج در تلاطم ہے حقائق و معارف کا ایک بحر بیکراں ہے جس کا کنارا نہیں ملتا۔ بلکہ نصیحت کا ایک خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ امجد نے غالب کی بعض غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً

"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں"

کے جواب میں امجد کی غزل کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:۔

حالت جان خستہ جاں عرش بریں پہ جائے کیوں
میرے لئے زمین پر صاحب عرش آئے کیوں
اور زمین و آسماں دیدۂ دل میں آسمائے کیوں
میرے سیاہ خانہ میں کوئی دیا جلائے کیوں

اس غزل کے دو شعر خصوصیت کے ساتھ قابل ملاحظہ ہیں:۔

زخم کو کھاؤں کیوں بتاؤ درد کو اور کیوں بڑھاؤں
نسبت ہو کو توڑ کر تیرے پاس آئے کیوں
بخشنے والا جب مرا عفو پہ ہے تلا ہوا
مجھ سا گنہگار پھر جرم سے باز آئے کیوں

اور مقطع کس غضب کا ہے :۔

امجد خستہ حال کی پوری ہو کیونکر آرزو
دل ہی نہیں جب اپنے پاس مطلب دل بر آئے کیوں

جیسا کہ بیان کر دیا گیا ہے حضرت امجد کی غزلوں کا پورا سرمایہ تصوف پر مشتمل ہے۔ اور غزل کے ایک ایک مصرع میں ایک نیا مضمون ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً ذیل کی غزل ملاحظہ ہو۔ اس میں کیفیت عبدیت اور معرفت الٰہی توحید وجودی کے مسئلے کو صاف کہا گیا ہے اور موجودہ زمانہ کے صوفیا جس طرح بندگی میں کبریائی کرتے ہیں۔ ان کی اصلاح کے لئے اس سے بہتر تعلیم نہیں ہو سکتی۔

ہم تو ایک بار اس کے ہو جائیں — وہ ہمارا ہوا ہوا نہ ہوا
ڈھونڈتا ہوں میں ہر نفس اس کو — ایک نفس مجھ سے جو جدا نہ ہوا
کیا ملا وحدت وجودی سے — بندہ بندہ رہا خدا نہ ہوا
بندگی میں یہ کبریائی ہے — پھر گدائی کہ پیش خدا نہ ہوا
جا چکے عقل و ہوش تاب و تواں — لیکن اب تک وہ آشنا نہ ہوا

حضرت میر درد فرماتے ہیں:۔

آہ پردہ تو کوئی مانع دیدار نہیں — اپنی غفلت کے سوا کچھ در و دیوار نہیں

امجد کے رنگ میں اس کو ملاحظہ فرمائیں:۔

کس طرح نظر آئے وہ پردہ نشیں امجد — ہر پردے کے بعد اور ایک پردہ نظر آتا ہے

تقدیر اور تدبیر کے مسئلہ پر شیخ ناسخ فرماتے ہیں:۔

ہم راہیاں واں پہنچے تدبیر سے کہتے ہیں — وہ بلندی سے چونک اٹھے تقدیر اسے کہتے ہیں

اب امجد کی زبان سے سنو:۔

وہ کرتے ہیں سب کچھ پر تدبیر اسے کہتے ہیں — ہم خود مر مٹ جاتے ہیں تقدیر اسے کہتے ہیں

رباعیات

رباعیات کی قسم ایسی ہے جس پر امجد نے ہر زمانہ میں کثیر سرمایہ فراہم کیا ہے اور اگر اقلیم رباعی کا آپ کو بادشاہ کہا جائے تو ناموزوں نہیں ہو سکتا ہے۔ پنجاب کے مشہور شاعر حضرت گرامی مرحوم، جن کی بلند مرتبگی کا اعتراف علامہ اقبال کرتے تھے، حضرت امجد کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

امجد بہ رباعی ست فرد امجد — ملک سخن را کلید زر امجد
گنجم کہ بود در آب سر و امجد — پیچ سر حکمت امجد امجد

امجد نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں رباعیاں کہی ہیں، مگر فارسی کی بہ نسبت اردو کا سرمایہ زیادہ ہے۔ رباعیات کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حضرت امجد کی رباعیات مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اگر ان کو موضوع کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو حقائق و معارف، توحید، رسالت، عبادت الٰہی، اخلاق فلسفہ اور تصوف پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ان رباعیوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی رباعی میں دینی امور کو واضح کیا گیا ہے تو کسی میں دنیوی معاملات کہیں وحدانیت کی تبلیغ کی گئی ہے تو کہیں دنیا کی تباہی بے نقاب کی گئی ہے کہیں سرمایہ داری اور دولت کی فریب کاریوں کو عریاں کیا گیا ہے تو کہیں مفلسی تنگ دستی اور غریبی کو سراہا ہے کسی میں وجدانی عرفان اور حقائق کے اسرار نہاں ہیں تو کسی میں رسالت اور ختم النبوت کے شواہد پیش کئے ہیں کسی میں اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کو بیان کیا گیا ہے اور بہترین اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے تو کسی میں دنیا کی بے ثباتی اور نیکی کی ہدایت فرمائی ہے۔ رباعیات کا بڑا حصہ تصوف پر مشتمل ہے۔ تصوف کے اسرار، تصوف کے رموز، سلوک کی منزلیں، سلوک کے راستے صوفیاء کے مدارج اور تصوف کے مسائل سے یہ رباعیات مملو ہیں۔

یہاں چند رباعیاں پیش کی جاتی ہیں:—

ہر ذرہ پہ فضل کبریا ہوتا ہے ۔۔۔ اک حیتر زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دلی زبان سے یہ کہتے ہیں ۔۔۔ وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

ہر گام پہ چکرا کے گرا جاتا ہوں ۔۔۔ نقش کف پا بن کے مٹا جاتا ہوں
تو مجھ کو سنبھال میرے دینے والے ۔۔۔ میں بار امانت میں دبا جاتا ہوں

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے ۔۔۔ کیا ذکر صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم بھی جاہل بھی، نادان بھی ۔۔۔ سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

خم ہے بہت صاحب ایماں ہونا ۔۔۔ کچھ کھیل نہیں ہے حق پہ قرباں ہونا
ہے قتل حسین سر تسلیم ہوتا ہے ۔۔۔ آساں نہیں ہے مسلماں ہونا

اس جسم کی کچلی میں اک نگ بھی ہے ۔۔۔ آواز شکستہ دل میں اک راگ بھی ہے
سمجھا نہیں بنا ہے اک تنکا بھی ۔۔۔ خاموش دیا سلائی میں اک آگ بھی ہے

امجد مسلمان ہیں اور اسلامی شاعر ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کی تعلیم سارے انسانوں کی بھلائی اور بہتری کے لئے ہے۔ وہ دنیا میں نیک کام کرنے، نیکی کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی تعلیم قرآنی تعلیم ہے۔ آپ اپنے کلام کے ذریعہ آیات قرآنی کی تفسیر فرماتے ہیں۔ امجد کی نظمیں اور رباعیات میں بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کی کسی آیت یا کلمہ کی شرح کرتے ہیں۔ وہ ہر جگہ سچی مسلمانی اور ایمانداری کی ہدایت کرتے ہیں اور عمدہ زندگی اور بہترین زندگی کا نصب العین قرآن پر عمل کرنے کو بتاتے ہیں۔

امجد کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ آپ حتی الامکان انسان کو نیک بننے، نیکی کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ آپ کی تعلیم کا ماحاصل اور مقصد یہی ہے کہ چند روزہ زندگی کو نیک کاموں کی انجام دہی میں بسر کیا جائے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:—

اس نام کی زندگی میں کچھ جان تو ہو ۔۔۔ گر بن نہ سکے فرشتہ انسان تو ہو
نیکی نہ ہوئی نہ ہو بدی بھی تو نہ کر ۔۔۔ صوفی نہ ہوا نہ ہو مسلمان تو ہو

موجودہ زمانہ میں سرمایہ داری اور دولتمندی کی مذمت جدید شعراء کا ایک طرۂ امتیاز بنا ہوا ہے اور دولت، دولت کی پکار ہے۔ مفلس اور غریب یہ خیال کرتے ہیں کہ دولت مندی بڑی شے ہے اور اہل دولت بڑی راحت اور آرام میں ہونگے مگر اہل دولت سے پوچھو کیا واقعی ان کو راحت اور آرام میسر ہے تو جواب نفی میں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت آرام اور راحت کا ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ وبال جان ہوتی ہے۔ ان کو آرام سے سونا میسر نہیں ہوتا ہر وقت یہ کھٹکا رہتا ہے کہ کہیں اس کی دولت ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ امجد اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:—

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے ۔۔۔ بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کر دی ۔۔۔ دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

انسان کا جسم ایک چھوٹی سی دنیا ہے جس میں سینکڑوں کل پرزے کام کرتے ہیں۔ انسان کی زندگی ایک گھڑی ہے جو چلتی رہتی ہے۔ انسان کے سانس میں ایک ایسی رفتار ہے جس پر زندگی کا دارومدار ہے۔

سانچے میں اجل کے ہر گھڑی ڈھلتی ہے ۔۔۔ ہر وقت یہ شمع زندگی جلتی ہے
آتی جاتی ہے سانس اندر باہر ۔۔۔ یا عمر کے حلق پر چھری چلتی ہے

خودی کے متعلق امجد کے خیالات ملاحظہ ہوں:—

ہیں مست مئے شہود تو بھی میں بھی ۔۔۔ ہیں مدعیٔ نمود تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہان میں یا میں ہی نہیں ۔۔۔ ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

حاصل نہ کیا مہر سے ذرہ تم نے ۔۔۔ دریا سے پیا نہ ایک قطرہ تم نے
امجد صاحب خدا کو کیا سمجھو گے ۔۔۔ اب تک خودی کو جب نہ سمجھا تم نے

دم بھر دم آدم کو سمجھتے ہوتے ۔۔۔ دن رات کے ہمدم کو سمجھتے ہوتے
یہ سچ ہے کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں ۔۔۔ اے کاش کہ ہم، ہم کو سمجھتے ہوتے

امجد کی زبان سے "رموز خودی" کو سنو۔

اس موت نما حیات سے ڈرتا ہوں ۔۔۔ زندہ ہونے کے واسطے مرتا ہوں
ظاہر ہوتے بے خودی میں اسرار خودی ۔۔۔ بے خود ہو کر خودی کا دم بھرتا ہوں

جدید ترکی ادب

ء
ترکی کے دستوری عہد کی سب سے بڑی خصوصیت ایک ادبی تحریک کا عروج ہے جو "ملی ادبیات" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا سب سے بڑا رہنما عظیم المرتبت مفکر اور شاعر ضیا گیوک الپ تھا۔ اس اسکول کا عقیدہ تھا کہ قومی ادب کو اور زیادہ ترکی اسلوب پر ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ ضیا گیوک الپ ایک فطری شاعر اور جوشیلا قوم پرست تھا۔ ساتھ ہی وہ مثال پرست بھی تھا اور اسے اخلاقی اور سماجی اصول بنانے اور ان کے اظہار پر حیرت انگیز قدرت تھی۔ اس نے "ملی ادبیات" کو ترقی دی اور پھر اپنی فطری صلاحیت، شہرت اور قابلیت سے "ینی مجموعہ" (نیا ریویو) کو چار چاند لگا دئے۔

ایک طرف تو یہ رسالہ اور ایک طرف "ترک یردو" (ترکی وطن) قومی ثقافت اور جذبات کو ابھار رہے تھے اور ثقافتی معلومات اور فنی تحقیقات میں اضافہ کر رہے تھے۔ جن جدید مصنفین کی تحقیقات ان دونوں رسالوں میں شائع ہوتی تھیں، انھوں نے ترکی نظم و نثر میں نئی طرح کی کشادگی، تازگی اور شوکت پیدا کی۔ خالدہ ادیب کے قلم میں بہت زور ہے اور نفسیات میں اس کی نظر بہت گہری پڑتی ہے، یعقوب قادری قارا عثمان اوغلو افسانے، ناول اور مضامین لکھتا ہے۔ اس کا اسلوب نہایت دلکش اور فنکارانہ ہے۔ رفیق خالد کو کہانیاں لکھنے کا خاص ملکہ ہے اور اس کی اظہار و بیان کی قوت تو اپنی مثال آپ ہے۔ عمر سیف الدین روزانہ واقعات پر سنجیدہ تبصرے کرتا ہے اور فالح رفقی کے مختصر مگر چبھنے والے فقروں نے ترکی نثر میں ایک نیا لطف پیدا کر دیا ہے۔ مورخ احمد رفیق نے عثمانی عہد کے مفصل واقعات کی تصویریں کھینچ کر تاریخی واقعات کے بیان کا ایک اچھوتا اسلوب پیدا کیا ہے اور تاریخی موضوعات میں خاص دلچسپی پیدا کرا دی ہے۔ ترکی کے جید عالم فواد کوپرولو نے جو بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے ترکی ادب کی تاریخ میں ایک نیا رجحان اور وسعت اور گہرائی پیدا کی اور خود ضیا گیوک الپ کی عمرانیاتی تحریروں اور اصول سازی نے ترجیحات کو بے انتہا متاثر کیا۔ ساتھ ہی اس نے قدیم روایات نظم کیں۔ ان سب کے مضامین "ینی مجموعہ" میں شائع ہوتے تھے۔

اس رسالے میں یحییٰ کمال کی نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ اگرچہ نظمیں تعداد میں بہت کم ہیں لیکن فنی لحاظ سے بے نظیر خصوصیات کی حامل ہیں کیونکہ یحییٰ کمال کو جدید ترکی کا سب سے بڑا شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ اسے زبان اور ٹکنیک پر اس قدر دسترس حاصل ہے کہ اس نے عروض کو جو ہزار برس پہلے سے رائج تھی۔ انداز بیان کا اکمل ذریعہ بنا دیا۔ اس کی نظموں کی شان و شوکت اور تغزل کا بیان عہد ماضی کی شاندار تہذیب کی یاد تازہ کرا دیتے ہیں۔

ایک بالکل دوسری قسم کا شاعر جس کا کلام دل و نظر کو موہ لیتا ہے احمد ہاشم ہے۔ اس کے خواب آور اشعار جن میں سنہری آسمان اور جھیل کے ساکت اور مسحور پانی پر شفق کے ہزاروں نازک رنگ ایک سماں پیدا کر دیتے ہیں اور جھیل کے کناروں پر ٹیبے پرندے محویت کے عالم میں کھڑے رہتے ہیں مگر رات کی آمد کا احساس ان کے دلوں میں ایک طرح کا انتشار بھی پیدا کر دیتا ہے۔

دونوں مذکورہ شاعر جدید ترکی شاعری کی عظیم الشان ہستیاں ہیں۔ یہ دونوں مغربی اور مشرقی تمدن سے بے حد متاثر تھے۔

دستوری عہد کی سماجی زندگی نے ایک اور ذریعہ اظہار پیدا کیا اور وہ ہے خطابت۔ حمد اللہ صبحی تانریوور ترکی کا ایک مشہور شاعر اور نثار تھا۔ یہ پہلے استنبول یونیورسٹی میں مسلم فنون کا پروفیسر اور "ترکی اوجاغی" کا صدر تھا اور کسی زمانہ میں وزیر تعلیمات بھی رہا تھا۔ شاعر ہونے کے ساتھ ہی وہ مشہور مقرر بھی تھا۔ اس کی مرصع اور ٹھوس تقریروں کی دو جلدیں موجود ہیں۔

مزاحیہ نظم اور نثر بھی لکھی گئی۔ رفیق خالد نے اپنے شگفتہ اور کھینچنے والے اسلوب اور فاضل احمد نے اپنی نظم و نثر کے مزاح اور اپنے بے پایاں علم و فضل سے نئے ادبی گلدستے تیار کئے۔ فاضل احمد نے "پیروڈی" کا نیا طرز نکالا۔ اسی طرح کا ایک اور مزاحیہ شاعر خالد نہاد ہے۔

اس زمانہ میں کچھ ڈراما نویسوں نے دوسروں کے ڈراموں سے استفادہ کر کے ڈرامے لکھے اور کچھ نے طبعزاد لکھے۔ ایک تھیٹر کا اسکول قائم ہوا جو دارالبدائع کہلاتا تھا۔ رشاد نوری گونتکن، ابن الرفیق احمد نور الدین اور صاحبزادہ جلال کے علاوہ جنھوں نے

روشن اشرف انائیدن

ء یہ مضمون ۱۹۵۱ء کو ہز ایکسیلنسی روشن اشرف انائیدن سفیر ترکی نے ترکی ادب پر ایک تقریر کی تھی۔ اس کا یہ اقتباس "تاریخ ریویو" سے لیا گیا ہے۔

خالص طنزیہ چیزیں لکھی ہیں۔ خالد فخری اور یوسف ضیا نامی دو شاعروں نے دو منظوم ڈرامے بھی لکھے۔ یہ دونوں ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ یہ ڈرامے سٹی تھیٹر میں بڑی کامیابی کے ساتھ کھیلے گئے۔

اس اسکول کے علاوہ بھی بہت سے مشہور مصنفوں کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً محمد عاکف۔ یہ روحانی زندگی اور جذبات کا شاعر تھا۔ اس کا مطمح نظر اسلام تھا۔ اس کی نظمیں صفحات کی عام سرخی کے تحت شائع ہوتی تھیں۔ یہ دوران نظم میں اصلیت پر مبنی واقعات کی ترجمانی کرتا تھا جو نہ صرف اخلاقی اور سماجی کمزوری پر تنقیدات کی حیثیت رکھتی تھیں بلکہ اپنی روحانی اور مذہبی خصوصیات کی وجہ سے بہت دلکش بھی ہوتی تھیں۔ کچھ سال کے بعد اس شاعر کو عوام کے سامنے آزادی کا نغمہ پڑھنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ ایک اور اچھا شاعر مدحت عالی تھا۔ یہ محمد عاکف کا بڑا دوست تھا اس نے محمد عاکف کی سوانح عمری لکھتے وقت اس کی بڑی تعریف کی۔ مدحت عالی نے حال ہی میں "استنبول سوم" کے نام سے ایک ناول بھی لکھا ہے جس میں قدیم دار الخلافہ کی سب اچھی جھلکیاں نظر آتی ہیں ساتھ ہی اس میں انقلابی اور بین الاقوامی جذبہ کو بڑے اہتمام اور صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

اس کے باوجود اس عہد کی سب سے بڑی خصوصیت "ملی ادبیات" کے اثر سے ترکی لغت کا استعمال اور ترقی رہی ہے اور بہترین تصنیفات پہلی جنگ عظیم کے دوران میں یعنی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک وجود میں آئیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ترکی سلطنت کے زوال ہی نے قومی ادب کو عروج بخشا۔

جنگ عظیم نے ترکی سلطنت پر برا اثر ڈالا۔ اس کے مقبوضات چھین لئے گئے اور دار السلطنت پر مندروس کے صلحنامہ کی رو سے اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا۔ فاتحین نے ترکی کی فوجیں گھٹا دیں، بد انتظامی اور مستقل خوفناک جنگ نے آبادی کم کر دی، حکومت پرانے اصولوں ہی پر چل رہی تھی جس کی وجہ سے کوئی فوری تنظیم تو غیر ممکن ہو گئی۔

تجلیات
امین حزیں سیالکوٹی

آنسوؤں کی بہار دیکھتا جا!
"ابر غم کی پھوار" دیکھتا جا!
مسکراتی حسین آنکھوں سے
"درد کا اشتہار" دیکھتا جا!
آنسوؤں کی بہار دیکھتا جا!
"شبنم لالہ زار" دیکھتا جا!
گل محبت نے جو کھلایا ہے
اس کا "بھیگا نکھار" دیکھتا جا!
آنسوؤں کی بہار دیکھتا جا!
لالہ رنگ آبشار دیکھتا جا!
منکر آتش درون جگر!
آ کے "سیل شرار" دیکھتا جا!
آنسوؤں کی بہار دیکھتا جا!
او تغافل شعار! دیکھتا جا!

یعنی بربادیوں سے پہلے ہی
"خرمن انتظار" دیکھتا جا!

سلطان اپنے تخت و تاج سے زیادہ کسی چیز کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ اس لئے سلطنت کا رعب جاتا رہا اور آخرکار وہ خود بھی جاتی رہی۔ لیکن ترک قوم میں زبردست قوت اور صلاحیت موجود تھی اس نے اس نے سلطان وحید الدین کے ساتھ زوال پذیر ہونا پسند نہ کیا۔ ترک قوم میں جس نے تاریخ میں بڑے کارنامے کر دکھائے ہیں وطنیت کا جذبہ عود کر آیا۔ اس نے آزاد ہونے کا فیصلہ کر دیا۔ اناطولیہ کے وطن پرستوں نے زندہ جاوید رہنما اتاترک کی دانشمندانہ قیادت قبول کر لی۔

ترکوں کی فتح کے بعد سے قوم؟ تاریخ نئی راہوں پر گامزن ہوئی۔ اناطولیہ کے دار الخلافہ انقرہ میں، جدید اصولوں پر ایک نئی ترکیہ جمہوریت قائم ہوئی۔ اب ترکی سلطنت کی بجائے ایک متحد، ہم آہنگ اور آزاد ملک بن گیا۔

نئی حکومت کے قیام سے نئے عہد کا آغاز ہوا۔ نئی راہیں نکلیں اور بہت سی اصلاحیں وجود میں آئیں۔ نئی جمہوریت کی خصوصیات قومیت، ارضیت اور انقلاب تھیں۔ ان تبدیلیوں کا تہذیب اور فنون وغیرہ پر کچھ اثر پڑنا ضروری تھا۔ تعلیم میں ثانیت کا تو شروع ہی میں خاتمہ ہو گیا اس کے بعد مذہبی مدارس اور خانقاہیں بند کر دی گئیں اور لازمی و دنیاوی تعلیم کی بنیاد ڈالی گئی۔

لیکن اس سے زیادہ اہم اصلاح رسم الخط کی تبدیلی ہے۔ یہ بنیادی اور جدید زمانہ کے پیش نظر ایک عجیب و غریب قسم کی تبدیلی تھی۔ عربی حروف کے رسم الخط کی جگہ رومن رسم الخط اختیار کیا گیا۔ یہ ترکی زبان کے لئے نہایت مناسب تھا کیونکہ نہ صرف یہ کہ اسے سیکھنے میں آسانی ہوتی ہے اور اس طرح عام خواندگی میں مدد ملتی ہے بلکہ اسے اختیار کرنے سے بہت سے عربی فارسی کے مترادف الفاظ بھی ترک کرنے میں سہولت ہوئی۔ یہ الفاظ صدیوں سے ترکی میں داخل ہو رہے تھے۔ ہم اسے زبان کی "خارجی رعایت" کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔ اس طرح بیکار کے لفظوں اور فقروں سے

نجات مل گئی اور اب زیادہ مختصر، صاف اور ترکی خصوصیات کی حامل ہوتی جا رہی ہے۔

نئے رسم الخط کے رائج ہونے سے دوسرے نتائج بھی پیدا ہوئے۔ اتاترک نے لسانی اور تاریخی تحقیقات کی دو انجمنیں قائم کی تھیں۔ پہلی انجمن کا مقصد زبان اور دیہاتی بیتوں کے متعلق تحقیقات کرنا تھا۔ اس نے ضروری اصطلاحات اختراع کیں اور ایک لغت تیار کی جبکہ دوسری انجمن نے ترکی کی تاریخ کے مختلف شعبوں میں تحقیقات کی جو تاریخ سلاطین کے زمانہ سے عثمانی عہد تک ہی محدود نہ تھی بلکہ یہ عظیم الشان عہد تاریخ کا محض ایک باب بنا۔ یہ دونوں انجمنیں آج بھی کام میں مصروف ہیں اور انہیں صدر جمہوریہ عصمت انونو کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے۔

ان کوششوں میں "خلق الیوی" (عوام کے گھر) یعنی ثقافتی مراکز اور ڈرامہ کی ایک اکیڈمی کا اور اضافہ ہوا۔

دنیا کے ادب سے تراجم کا بھی نیا دور شروع ہوا۔ دوسری قوموں کے شاہکار ترکی میں منتقل کئے گئے۔ آندرے جیڈ، آندرے موروا، پیئر لوتی، اناطول فرانس، ایمیل زولا، گے دی موپاساں، گستیو فلوبیرت، بالزاک، یہ یہی، استندھال، موسے، الماریتائن، بودیلیر، وکٹر ہیوگو، برینارین دے سیں پیری، والٹیر، روسو، مونتسکیو، راسین، کورنیل، مولیئر، لافونتین، شلر، گوئٹے، ڈکنس، ایڈگر ایلین پو، آسکر وائلڈ، بائرن، شیکسپیئر، گورکی، چیخوف، ٹالسٹائی، دوستوفسکی، ترگنیف، لیرمنتوف، پشکن، گوگول، جیبرل دی انزیو، ابسن، کے شاہکار اور زولا ہی لابو کی ایک کتاب ترکی میں ترجمہ ہو چکی ہے۔

ترکی میں جدید مصنفین اور حال کے شاہکار رواں ہی کے ترجمے نہیں ہوئے ہیں بلکہ نشاۃ الثانیہ کے شاعروں اور ادیبوں مثلاً دانتے، پیٹرارک، بوکیشیا اور قدما مثلاً ہومر، افلاطون، ارسطو، سقراط، ہیرودوتس، ورجل، ہوریس، اسکائیلس اور اووڈ وغیرہ کا بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان بے شمار کتابوں سے ترک نوجوانوں کو متعدد مشاہیر کے کلام سے واقفیت ہو گئی ہے۔ اس طرح وہ ہر قوم اور عہد کے خیالات سے آشنا ہو گئے ہیں۔ ان میں جدید ادب اور شاعر بھی شامل ہیں نشاۃ الثانیہ اور عہد قدیم کے بھی۔

تقریر کے فن نے بھی بہت ترقی کی ہے۔ سخت جدوجہد، آخری نجات، بالیقین الحکم، قومی آزادی اور فتح کی خوشی اور پھر حیرت انگیز

سماجی اور سیاسی اصلاحات نے ترکی میں دو شہرے مقرر کمال اتاترک اور عصمت انونو پیدا کئے۔

آج ترکی کی ادبی دنیا میں مشہور ناول نویس، مضمون نگار، نقاد، شاعر اور ڈرامہ نویس موجود ہیں مثلاً خالدہ ادیب، یعقوب قادری اور رشاد نوری گنتکن۔ ان میں آخری ادیب کی عمر دوسروں سے کم ہے لیکن اس کے ناولوں کا اسلوب نہایت شگفتہ، اس کی مشہور مختصر کہانیاں بالکل اچھوتی اور ڈرامے نہایت کامیاب ہوتے ہیں۔ ان تینوں مصنفوں کی کتابیں دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

کامیاب نثاروں میں فالح رفقی آتے کا نام لینا ضروری ہے۔ اس کے اسلوب کی خصوصیات اختصار، جذباتیت اور حیرت انگیز شوخی اور بوقلمونی ہیں۔ ایک اور غیر معمولی مصنف عبدالحق سناسی حصار ہے جو پچھلے چند برسوں میں نہایت مشہور ہو گیا ہے۔ اس کا ایک ناول جس کا نام "فہیم بے اور ہم" ہے ابھی شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک جذباتی کردار کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ اسی مصنف نے حال ہی میں حافظ کا شاندار تجزیہ اور حقیقت کی ماہیت کے متعلق ایک معیاری تصنیف پیش کی ہے اور اس کا نام "باسفورس کی چاندنی" رکھا ہے۔

پچھلے چند سالوں میں ادبی تنقید اور مضمون نگاری میں بہت ترقی اور کامیابی ہوئی ہے۔ اس سلسلہ کی اہم شخصیتیں وزیر تعلیمات، شاعر اور مضمون نگار حسن عالی یوجل اور باثر ادبی ناقد نور اللہ آتاچ اور پچھلی صدی کے ترکی ادب کا ماہر اور صدیوں کے ترکی اور مغربی ادب کا موازنہ کرنے والا اسمٰعیل حبیب ہیں۔

ترکی زبان اور اس کے ادب کی تاریخ کا خاص ماہر پروفیسر محمد فواد قوپرلو ہے جبکہ مشہور شاعروں، قدیم افسانوی نظموں اور دیہاتی گیتوں پر دوسرے شاعروں نے مفید معلوماتی مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ اب کچھ نئے شاعر بھی منظر عام پر آ رہے ہیں مثلاً فاروق نافذ چملی بل، نجیب فاضل قیا قورک، کمال الدین کامی، بہجت کمال چاغلار۔

یا سوغی، محمدی تانپی نار اور نجیب ورا ناس۔ ان سے نہایت عمدہ شعری تخلیق کی امید کی جاتی ہے۔ ان شاعروں نے ترکی زبان کو گھر کی یاد سے لے کر خون تمنا، زندگی گزرنے کا افسوس، کمال اور حسن کے لئے دلیرانہ جذبات اور روح کے پوشیدہ اور حیرت انگیز خواب تک کو روشناس کرایا ہے۔ ان کے شعروں میں حلاوت اور رفعت جذبات کارفرما ہے۔ فاروق نافذ چملی بل، نجیب فاضل قیا قورک اور وداد ندیم طور نے ڈرامے لکھے ہیں۔ اول الذکر منظوم ڈرامے لکھنے

اور باقی دونثر ہیں۔ یہ ڈرامے ان کے دقیق شعور کے مظہر ہیں۔

ان فنکاروں کی متحدہ کوششوں سے وہ ساری رکاوٹیں جو ایک نسل پیشتر فنکاروں کے لئے وبال جان تھیں اب اس طرح ناپید ہوگئی ہیں جیسے کہ ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ اب میدان صاف ہے۔ ترکی نظم و نثر سے غیر ملکی اثرات اور تعلقات خارج ہو گئے ہیں اور اب ان میں سادگی اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ نظم و نثر اپنے نرم اور سخت لہجوں سے صحیح جمالیاتی ذوق کا نمونہ پیش کرتے ہیں اور الفاظ اپنے مناسب اور متعین معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور اب خارجی تصنع اور تکلف کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ پرتکلف صنائع و بدائع تشبیہات اور استعارات کی جگہ سادہ زبان استعمال ہوتی ہے اور عوام اور خواص کے شاعروں کے درمیان صدیوں تک خلا رہا تھا اب وہ بھی پر ہوگیا۔ جدید قومی شاعری میں ان دونوں قسموں کا ملاپ پایا جاتا ہے۔ ترکی نثر عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد تک پہنچ رہی ہے اور اب اظہار خیالات کا بہتر سے بہتر ذریعہ بنتی جا رہی ہے۔ اب راستہ ڈھونڈنے کے لئے اندھیرے میں ٹٹولتے پھرنا نہیں پڑتا۔ راستہ مل گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ زندہ فن کا قوم کے دلوں کی گہرائیوں تک پہنچنا ضروری ہے اور یہی اس کی جدت اور تاثیر کا راز ہے۔

ایک عرصہ سے دوسری قوموں کے ادب سے متاثر ہوتے رہنے کی وجہ سے ترکی ادب بہت مالدار ہو چکا ہے اور اب بڑی ترقی کر رہا ہے۔ میں نے کچھ مصنفوں کا ذکر کیا ہے جن کی تصنیفات اس بات کی شہادت پیش کرتی ہیں اور نوجوان ادیبوں سے تو اور بھی کامیاب تصنیفات کی امید کی جاتی ہے۔

اس کے باوجود جدید ترکی ادب اپنی روایات سے مطمئن ہونے کے بجائے اپنی تنقید میں مصروف ہے کیونکہ اس کے سامنے ساری قوم کی روح اور خصوصیات کی صحیح ترجمانی کرنے کا نصب العین موجود ہے۔ یہ قومی زندگی کے ہر پوشیدہ پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہے تاکہ اسے صحیح اور مکمل اپج کا شرف حاصل ہوسکے اس طرح وہ دنیا کے ادب میں اپنے لئے مناسب جگہ حاصل کرے گا۔ (فارن ریویو سے ماخوذ)

ہندوستانی موسیقی

۲

شاہد احمد دہلوی

تال

ہندوستانی موسیقی میں سُر کے بعد دوسری اہم چیز تال ہے۔ گانے بجانے اور ناچنے میں وقفے اور تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے تال وجود میں آئی۔ ہماری موسیقی میں تال نے بڑے پیچیدہ رُوپ دھار رکھے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے سنگیت میں صرف برابر کے وقفوں کی تالیں مروّج ہیں۔ ہمارے یہاں اس کی ہزاروں شکلیں تھیں جن میں سے سینکڑوں اب بھی رواج میں ہیں۔ تال ایک مکمل اور دقیق علم ہے اور فن بھی۔ ہندوستانی موسیقی کے اور شعبوں کی طرح تال بجانا خود ایک بڑا آرٹ ہے جس کے بغیر گانے بجانے، اور ناچنے کا کوئی پہلو مکمل نہیں ہوتا۔

سارا نظامِ عالم کل کائنات اور اس کی موجودات "لے" یعنی باقاعدہ اور منظم حرکت پر قائم ہے۔ کائنات میں جتنی بھی مادی چیزیں ہیں وہ یا تو متحرک ہیں یا ساکن۔ اور اگر نظامِ عالم کو علمِ ہیئت کی روشنی میں دیکھا جائے تو ساکن دجامد کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ یہ زمین جس پر ہم بستے ہیں سورج کے گرد فضائے بسیط میں محوِ رقص ہے۔ ہزاروں سال سے ایک تسلسل اور ہم آہنگ ارضی رقص جاری ہے اور یہ رقص بھی دوگونہ ہے۔ ایک تو سورج کے گرد اور دوسرا اپنے محور پر۔ ایک کا نتیجہ موسم اور دوسرے کا دن اور رات۔ یہ سبق آپ نے اسکول میں پڑھا ہوگا۔ اس لئے اب اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری زمین ایک دن اور ایک رات یعنی چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کرتی ہے اور سورج کے گرد ایک سال میں اس رفتار میں کبھی فرق نہیں آتا کبھی آپ نے غور فرمایا کہ ایسا کیوں ہے؟ نظامِ کائنات ایک مقررہ اصول کے ماتحت حرکت میں ہے اس حرکت کی رفتار دائم و قائم ہے۔ یہ کرشمہ ہے ہم آہنگ گردش کا۔ ایک مقررہ رفتار کا جسے انگریزی میں (Rythmic Motion) اور موسیقی کی اصطلاح میں "لے" کہتے ہیں۔ "تال" "لے" کو ناپنے کا پیمانہ ہے۔ ہاں تو ہماری دنیا ہزاروں سال سے ایک مقررہ لے پر ناچ رہی ہے اور اس کی تال کا شمار شب و روز اور ماہ و سال سے کیا جاتا ہے۔

تال کی وجہِ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ مخفف ہے تانڈو اور لیستو کا۔ تانڈو کا "تا" اور لیستو کا "ل" مل کر تال بنا ہے۔ روایت ہے کہ گردشِ کائنات سے پیدا ہونے والے نغمہ و کیف انگیزی کی لے پر مہادیو اور پاربتی نے رقص کیا۔ مہادیو کا رقص تانڈو کہلایا اور پاربتی کا لیستو ناچ کے یہی دونوں طریقوں نے کرشن اور ان کی گوپیوں میں بھی رواج پایا۔

لے کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ موجودات میں کوئی شے لے سے خالی نہیں ہے مثلاً قلبِ انسانی کی ضربات۔ سانس کا آنا جانا نبضوں میں خون کی جنبش۔ دریا کی روانی۔ چڑیوں کی چہکار سب میں ایک تناسب رفتار یعنی لے ہے۔ یونانیوں نے اس لفظ کے مفہوم کو اتنی وسعت دے دی تھی کہ بیجان چیزوں کے لئے بھی تناسب کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ مثلاً صنم گری اور مصوری میں بھی لے کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ شاعری اور موسیقی کا دار و مدار ہی لے پر ہے۔ کیونکہ لے کا مصرف یہ ہے کہ جو آوازیں سنائی دیں ان کا درمیانی وقفہ یا فصل متعین کرے۔ یہ آوازیں چاہے موسیقانہ ہوں یا نہ ہوں۔ جو حیثیت شاعری میں بحر کو حاصل ہے وہی حیثیت موسیقی میں لے کی ہے۔ شاعری میں لے کی پیمائش کا پیمانہ رکن مقرر کیا گیا ہے اور موسیقی میں اس کا مرادف ماترہ ہے۔ لکھنؤ کے ایک نازک خیال استاد سُنا ہے کہ عروض و بحر کی تعلیم اپنے شاگردوں کو طبلے پر دیتے تھے۔ یہ بالکل قرینِ قیاس بھی ہے کیونکہ شعر کی بحر اور طبلے کی ضربات میں مکمل صوتی مماثلت ہے۔ مثلاً اس مصرعہ کو لیجئے: "تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں"۔ اس مصرعہ کی تقطیع از روئے شاعری یہ ہوگی:- فعولن فعولن فعولن فعولن۔ اور طبلے کی زبان میں اس کے بول یہ ہوں گے:- دھادھن تا دھادھن تا دھادھن تا دھادھن تا۔ وزن ایک ہی ہے، صرف بولوں کا فرق ہے اگر مصرعہ میں کوئی سکتہ ہو تو وہ شاعری سے خارج سمجھا جائے گا۔ اسی طرح موسیقی بھی لے کی محتاج ہے گویا اصل بنیاد بحر اور لے ہے۔ شاعری میں جس طرح بحریں مختلف ہوتی ہیں موسیقی میں تالیں مختلف ہوتی ہیں اول الذکر کے علم کو علمِ عروض اور ثانی الذکر کو علمِ ضربات یا ہندی میں تال ادھیائے کہتے ہیں دوسرے علوم کی طرح یہ علم بھی ایک ناپیدا کنار سمندر ہے جس کی شناوری کے لئے ایک عمر درکار ہے، وقت کوتاہ و قصہ طولانی۔ یہاں صرف مختصر اچھے عرض کیا جائے گا۔

گانے والا جو کچھ بھی گاتا ہے کسی نہ کسی ٹھیکے یا تال میں گاتا ہے اس کے بول ایک مقررہ فصل سے ادا ہوتے ہیں۔ اس رفتار کو تال کہتے ہیں۔ تال کے چار جزو ہوتے ہیں (۱) ماترے (۲) ضربیں (۳) بول اور (۴) لے۔

(۱) ماترہ:- چھوٹے سے چھوٹے جزو یا اکائی کو کہتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں نا دھن دھن نا تو ان میں سے ہر لفظ ایک ماترہ ہے۔ اس ٹکڑے کو ہم جلدی جلدی بھی کہہ سکتے ہیں اور رُک رُک کر بھی۔ تو پھر ماترہ کا معیار کیا ہوگا؟ اس کا اوسط وقفہ نبضِ انسانی کی دو ضربوں کے درمیانی وقفے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ ماتروں کی تعداد مختلف تالوں میں چار سے لے کر اٹھاسی تک پائی جاتی ہے۔

(۲) ضرب:- تال یا ٹھیکے کے ان حصوں کو کہتے ہیں جن پر تالی بجائی جاتی

چھپا خالی دکھائی جاتی ہے یعنی تال جو نہیں بجائی جاتی بلکہ صرف اشارہ کیا جاتا ہے
(۵) بول :۔ ماتروں کی آوازوں میں بوقلمونی پیدا کرنے کے لئے مختلف صوتی الفاظ وضع کئے گئے ہیں جیسے دھن، نا، ترکٹ، دھرکٹ، تک، گھن، تن، تا، گد، گن وغیرہ۔

(۶) لے :۔ ٹھیکے کی رفتار یا مزاج کو کہتے ہیں۔ اس کے تین درجے ہوتے ہیں بلمبت، مدھ اور درت۔ یعنی ٹھہری ہوئی، درمیانی اور تیز۔ اچھے گانے بجانے والے ان سب کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس کی باریکیوں مثلاً آڑ، کواڑ، بیاڑ، اور دگنی، ڈیوڑھی، چوگنی لے کر کے دکھاتے ہیں۔ تال اور لے علم ہندسہ سے تعلق ہے اور جسے معمولی حساب آتا ہے وہ اس کی تقسیم کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

حسابی علم کے مطابق ہزاروں تالیں وجود میں آسکتی ہیں لیکن زمانۂ قدیم میں بھی کہا جاتا ہے کہ تین سو ساٹھ تالیں برتی جاتی تھیں انہیں گھٹا کر ۹۲ بنیادی تالیں میاں تان سین نے قائم کیں۔ زمانے کی سہل پسندی کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان میں بھی کمی آتی گئی یہاں تک کہ بیس پچیس تالوں کا برتنے والا بڑا گنی سمجھا جاتا تھا۔ آج کل صرف دس بارہ تالیں رائج ہیں جن میں سے معروف درج ذیل ہیں:۔

(۱) اکتالہ (بارہ ماترے):۔ دھن دھن / دھاگے / ترکٹ تا / دھاگے / دھی نا۔

(۲) دھمار یا چوتالا (بارہ ماترے):۔ دھا دھا / گھن تا / کت تا / گھن تا / کت تا / گھن تا / تٹ کٹ / گد گن۔

(۳) سول فاختہ (دس ماترے):۔ دھن دھن / دھا کٹ / دھن گن / دھا ترکٹ / تن نا۔

(۴) عجیب تال (دس ماترے) دھن نا / دھن دھن تا / کت نا / دھن دھن نا۔

(۵) جھومرا (چودہ ماترے) دھن دھا ترکٹ / دھن دھن دھاگے ترکٹ تن تا ترکٹ / دھن دھن دھا ترکٹ۔

(۶) دھمار (چودہ ماترے):۔ کا دھی ٹ / دھی ٹ / دھا گے تی ٹ / تی ٹے / تا ۔

(۷) روپک (سات ماترے) تن تن نا / دھن نا /

(۸) پشتو (سات ماترے):۔ ترکٹ دھین / دھیا دھا تین۔

(۹) تنتال (سولہ ماترے):۔ نا دھن دھن تا / نا دھن دھن نا / تا تن تن نا / تا دھن دھن نا۔

(۱۰) تلواڑہ (سولہ ماترے) دھا ترکٹ دھن دھن / دھا دھا تن تن / تا ترکٹ دھن دھن / دھا دھا دھن دھن۔

نے اور تال کا حساب شعوری اور محسوس طریقے پر گنتی سے کیا جاتا ہے۔ لیکن جب کسی کو تال اور لے کی پکی سمجھ ہو جاتی ہے تو لے اس کے مزاج میں رچ جاتی ہے گویا لے اس کی قوت کا ایک جزو لاینفک بن جاتی ہے۔ اس طرح لے کا غیر شعوری احساس ہو جاتا ہے اور ماتروں کو انگلیوں پر شمار کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی جس سے خوشی و مسرت کی حال ہوتا ہے۔ تال کی ضربات سماعت میں ایک لطیف ہیجان پیدا کرتی ہیں جو تخیل میں ایک پُرکیف تموج برپا کر دیتی ہیں۔ اس عمل سے متخیلہ قوت سے عمل میں آتی ہے اور وہ خوشنما تصویریں یا پرچھائیاں جو اس کے سے وابستہ ہوتی ہیں ابھر کر روح کو ایک طربناک حیات تازہ سے دوچار کر دیتی ہیں۔ قدما اس احساس سرخوشی کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ جب لے کا مدیم گردش کائنات کے نغمۂ شیریں سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو ہمارے احساسات و مدرکات آزاد ہو کر اپنی اصل سے واصل ہو جاتے ہیں۔ ہر چیز کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی اصل کی طرف رجوع ہوتی ہے اور اپنی اصل سے مل جانے کے لئے بیقرار رہتی ہے اور جب کسی بیرونی تحریک سے اس لے میں جو ہمارے وجود میں خفتہ ہے، بیداری اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے تو ہماری روح نشاط سرمدی حاصل کرتی ہے۔

تال کے کئی ساز زمانہ نامعلوم سے چلے آتے ہیں۔ ضرورت اور رواج کے مطابق کئی ساز وجود میں آئے ان میں سے بعض ہم آہنگ نہیں ہو سکے یا سنگیت کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکے اور ماضی کو سونپ دیئے گئے۔ بعض نے مطابقت کی اور رائج ہوئے۔ بعض ایسے گھلے ملے کہ ناگزیر ہو گئے بعض سنگت کے لئے مخصوص ہوئے اور بعض علیحدہ بجائے جانے کے لئے۔ ان میں سے معروف یہ ہیں:۔

پکھاوج۔ طبلہ۔ ڈھول۔ تاشہ۔ نوبت۔ نقارہ۔ ڈھولک۔ کھول ڈیرو۔ ڈمرو۔ دف۔ دائرہ۔ مرفہ۔ کھنجری۔ مردنگ۔ جھیل۔ طبل اور چنگڑا۔ یہ سب تال کے ساز ہیں اور سب کا بنیادی اصول ایک ہے۔ فرق شکل باج اور آواز کا ہے۔ کوئی ایک ہاتھ سے بجایا جاتا ہے، کوئی دونوں سے اور کوئی چوبوں سے۔ کوئی جلسوں میں بجایا جاتا ہے، کوئی جلوسوں میں۔ ہر ساز کا موقع محل جدا ہے۔ تمدن کی بڑھتی ہوئی آگہی اور تہذیب کی پھیلتی ہوئی روشنی کے ساتھ ساتھ تال کے مختلف ساز وجود میں آتے رہے ان ایجادوں کے بے رنگ خاکوں میں اختراع کے فنکار نے رنگ بھر کر ارتقائے زمانہ کو سونپا اور موجودہ زمانے میں جتنے بھی تال کے ساز ملتے ہیں سب نہیں تو ان میں سے بیشتر انہی قدیم سازوں کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں ہندوستان کے قدیم ترین سازوں میں سے پکھاوج اب تک موجود ہے۔

پکھاوج کا ایک جداگانہ مکمل ساز ہے۔ ہندو علم الاصنام کے مطابق پکھاوج گنیش جی نے ایجاد کیا ہے۔ گائیکی کے تمام طریقوں یعنی دھرپد، دھمار اور ہوری کا ساتھ پکھاوج ہی پر کیا جاتا تھا۔ طبلہ بعد کی ایجاد ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت امیر خسرو نے پکھاوج کے دو ٹکڑے بیچ میں سے کر کے طبلہ بنایا۔ اور دونوں کے بول پکھاوج سے بالکل مختلف ہیں۔ پکھاوج پر کھلے بول بجائے جاتے ہیں یعنی پورا ہاتھ کھول کر ضرب لگائی جاتی ہے اور اس طرح جو آواز پیدا ہوتی ہے اس میں ایک ایسا شکوہ ہوتا ہے کہ سننے والے دہل جاتے ہیں۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دور پہاڑی آبشار چھوٹ رہے ہیں۔ کبھی بادلوں کی گھن گرج سنائی دیتی ہے اور بجلی سی کوندتی چلی آتی ہے جو سینہ پر اس طرح گرتی ہے کہ سننے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ کبھی خوش گلو پرندوں کی چہکار سنائی دیتی ہے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پہاڑی چشمہ اپنا راحت آفریں نغمہ گنگناتا عالم خواب میں بہتا چلا جا رہا ہے۔ طبلہ اپنے بولوں کی دلربائی اور نزاکت کی وجہ سے مقبول ہوتا چلا گیا اور پکھاوج آہستہ آہستہ منظر عام پر سے ہٹتے ہٹتے مخصوص فنکاروں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ آجکل شمالی ہند میں پکھاوجیوں کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ البتہ جنوبی ہند میں اس کا اب بھی رواج ہے اور کرناٹکی موسیقی کا اہم جزو۔

دلی میں جب سلطنت مغلیہ زوال پذیر ہوئی۔ تو شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی۔ رقص و سرود کی محفلوں سے یہاں کے در و دیوار گونج رہے تھے۔ موسیقی جیسے فن لطیف کو یہ فضا خوب راس آئی اور فن کاروں نے اسے بہت ترقی دی۔ خود بادشاہوں اور سلاطین زادوں نے یہ فن سیکھا اور اس میں استادی کا درجہ حاصل کیا۔ شاہ عالم بہادر شاہ ظفر کی بنائی ہوئی چیزیں اب بھی گائی جاتی ہیں۔ دلی میں چونکہ خانہ جنگی تھی۔ اس لئے بھانت بھانت کا فنکار یہیں آتا اور اپنے نصیب چمکاتا ہنروں کی یکجائی اور میل ملاپ نے اپنے پرائے، پچھم والے اور پورب والے کا فرق مٹا دیا تھا۔ دلی کے رنگ میں رنگ کر سب دلی والے ہی بن گئے تھے۔ چنانچہ یہاں کی ستھری تہذیب اور ٹکسالی زبان کی طرح یہاں کی گائیکی اور بجانا بھی ایک خاصے کی چیز بن گئی تھی۔ دلی اجڑی تو لکھنؤ آباد ہوا۔ دلی کی خزاں لکھنؤ کی بہار بنی۔ پروانے وہیں گرتے ہیں جہاں شمع جلتی ہے۔ نواب وزیر کی شمع نے دلی کے پروانوں کو کھینچ لیا۔ کچھ ماحول اور فضا کا اثر، کچھ اپنی جدت اور اختراع کا شوق، زبان کی طرح سازوں کے بول میں بھی جدتیں پیدا کی گئیں۔ ان تبدیلیوں کا سب سے زیادہ طبلہ کا باج متاثر ہوا۔ چنانچہ دلی کے باج سے علیحدہ پورب کا باج وضع ہوا۔ جس طرح شاعری میں تکلف و تصنع پیدا ہو گئے تھے اسی طرح طبلے میں

ٹھیکہ، قاعدہ، مہرا، لڑی، گت، ٹکڑا، فرد، چکردار پرن اور تہائی کی سات مختلف قسمیں ہیں۔ دلی والے طبلے کا کنار باج بجاتے ہیں۔ پورب والوں نے پکھاوج کے قاعدے اور ٹکڑے وغیرہ کے نقشے طبلے میں داخل کر لئے۔ دلی والوں نے قاعدے، پلٹے، ریلے اور چار باج پر زور دیا۔ پورب والوں نے گت، پرن، چکر دار اور ٹکڑوں کو نکھارا۔ دلی والے کنار بجاتے ہیں اور پورب والے بائیں۔ دلی کا طبلہ پوروں سے اور پورب کا پورے ہاتھ سے بجتا ہے۔ دلی والوں کو اپنے باج پہ ناز ہے اور انہیں اپنے پر۔ ہماری رائے میں اپنی جگہ تو دونوں ہی ہیں مگر بہتر وہ ہے جو سننے والوں کو پسند آ جائے۔ جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ ان کے علاوہ ایک باج اور بھی ہے جس کا نام ہے اجڑا۔ میرٹھ کے قریب ایک علاقہ اجڑا کہلاتا ہے۔ یہاں کے طبلہ نوازوں نے باج تو دلی ہی کا لیا ہے مگر انہوں نے اس کو انداز امتیاز بنا لیا۔

تال کے سازوں کا ذکر آ گیا ہے تو مختصراً چند اور سازوں کا حال بھی سن لیجئے۔

سنگت اور تانوں کے ساز دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مضراب سے بجائے جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو گز سے بجائے جاتے ہیں۔ مضراب یا ہاتھ سے بجائے جانے والے سازوں میں دور، بین، سرسوتی بین، وچتر بین، رباب، سرود، سُر سنگھار اور ستار ہیں اور گز سے بجائے جانے والے سازوں میں طاؤس، کمانچہ، دلربا، سارندہ، دو تارہ، یکتارہ اور سارنگی ہیں۔ ان کی شکلوں میں تھوڑا تھوڑا سا فرق ہے مگر ان کے بجانے کے اصولوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ مضراب سے بجائے جانے والے ساز تار پر گز چلانے سے بجتے ہیں۔ کسی میں پردے ہوتے ہیں جیسے ستار اور دلربا میں۔ کسی میں پردے نہیں ہوتے۔ مثلاً بین، سرود اور سارنگی۔ کسی میں بائیں ہاتھ کی انگلیاں تار پر رکھی جاتی ہیں اور کسی میں تار کے پہلو میں۔ سارنگی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا اصلی نام سو رنگی ہے اور یہ نام اس وجہ سے پڑا تھا کہ اس میں سینکڑوں رنگ گائیکی کے پیدا ہوتے ہیں۔ گلے کا ساتھ جتنا اچھا اس ساز سے ہو سکتا ہے کسی اور ساز سے نہیں ہو سکتا۔ گلے کی تمام حرکتوں کی ادائیگی کے علاوہ سارنگی میں یہ خوبی بھی ہے کہ اس میں دوسرے معروف سازوں کے باج بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً گائیکی اور گائیکی کی تمام شکلوں کے سُر اور پیچ، نقشے سارنگی میں اتارنے کی صلاحیت ہے۔ سارنگی جتنا مکمل ساز ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ سُروں کے باریک مقام اچھے فنکار ہی تار کے ساز میں ادا کر سکتے ہیں لیکن گمک، کھٹکا، مرکی، تان، بندش، زمزمہ اور سنگین تانوں اور نگوں کو ادا کرنا صرف سارنگی ہی میں ممکن ہے۔ اس کے علاوہ الاپ، جوڑ، [illegible]، سنگاوٹ، چھاڑ، گٹک، لپک، ٹھونک، ٹھاٹ جیسی باتیں میں نمایاں ہوتی ہیں کسی اور ساز میں نہیں ہوتی۔ مضراب کے سازوں کا [illegible] جیسے جھالا، مضراب [illegible] اور چکاری وغیرہ بھی [illegible]

(۱) کلاسیکی دو شکلیں ہیں ایک میں گرو تقریباً وہی حیثیت دی جاتی ہے جو مضراب کی ہے۔ دوسری میں انگلیوں کی مشق کچھ اس طرح کی جاتی ہے کہ مضراب کا رنگ بن سے پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستانی سنگیت گانے کے چند طریقوں یا ڈھنگوں کا مجموعہ ہے۔ ان کے نام یہ ہیں :—

(۱) الاپ (۲) دھرپد (۳) ہوری (۴) سادرو (۵) ٹپہ (۶) خیال (۷) ٹھمری (۸) دادرا (۹) ترانہ (۱۰) ترووٹ (۱۱) چترنگ (۱۲) غزل (۱۳) قوالی (۱۴) تھیٹر کی دھنیں (۱۵) گیت اور (۱۶) فلمی گانے۔

(۱) راگ راگنیوں کی شکلیں اور خصوصیات واضح کرنے کے لئے الاپ کا طریقہ ایجاد ہوا۔ الاپ راگ کے اظہار کا سب سے شدھ اور صحیح طریقہ ہے۔ اسکی دو قسمیں ہیں۔ راگ الاپ اور روپک الاپ۔ راگ الاپ میں گرہ، انش، منڈر، تار، نیاس، اپنیاس، البست وغیرہ سب خصوصیات راگ کی پائی جاتی ہیں۔ روپک الاپ میں استھائی اور انترہ صاف دکھایا جاتا ہے۔ الاپ میں چند مخصوص الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً آ۔ نا۔ تے۔ رے۔ نا۔ ری۔ نوم۔ توم۔ آخر کل الاپ بھی دھرپد کے انگ پر کیا جاتا ہے۔ الاپ کے بھی چار حصے کر دیئے گئے ہیں۔ استھائی۔ انترہ۔ سنچاری اور ابھوگ۔ الاپ کے ساتھ کوئی تال نہیں بجائی جاتی ہے کالنگر البتہ قائم کیا جاتا ہے۔

(۲) جب موسیقی میں شاعری شامل ہوئی اور تال سے اسکی شیرازہ بندی ہوئی تو دھرپد وجود میں آیا۔ اسمیں سُر، بول اور تال تینوں یکجا کئے گئے۔ اس کے علاوہ اسکے چار حصے بھی قائم کئے گئے۔ پہلا حصہ استھائی کہلایا، دوسرا انترہ، تیسرا سنچاری اور چوتھا ابھوگ۔ جب اس فن میں پختگی آئی تو مشکل تالوں میں دھرپد بنائے گئے مگر سب سے زیادہ چوتال یعنی دھرپد کا خاص ٹھیکہ برتا گیا۔ یہ بارہ ماترے کا کھلے بولوں کا ٹھیکہ ہے جسے دھرپد کی میراث بنایا گیا اور اسکی بنیاد پر پکھاوجی یا طبلہ نواز ہی بجایا کرتے ہیں جس ڈھنگ سے گویا بول کہتا ہے۔ اسی انگ کے ٹکڑے یا پرن پکھاوج یا طبلے پر کہی جاتی ہے۔ گانے کا یہ طریقہ مردانہ اور بھاری بھرکم سمجھا جاتا ہے بعض مضمون پروردگار کی عبادت و ریاضت یا بادشاہوں کی ثنا و صفت یا ناموروں کی شجاعت سے متعلق ہوتا ہے۔ گانے کے اس طریقے میں تان نہیں ہوتی۔ ذرت لے کی سرگم اور گمک کی وجہ سے تان کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔

(۳) ہوری بھی دھرپد انگ ہی کو گاتا ہے۔ فرق صرف تال کا ہوتا ہے۔ اسکی مخصوص تال دھمار یا دھمال ہے۔

(۴) سادرو بھی دھرپد کے ڈھنگ کو گاتا ہے۔ اسکی خاص تال جھپ تال ہے۔ باقی سب وہی خصوصیات ہیں جو دھرپد کی۔

(۵) ٹپہ گانے کا رواج پنجاب سے آیا اس میں ہیر رانجھا کی داستان یا شیخ سنگیو کا مذکور ہوتا ہے۔ میاں شوری نے اس ڈھنگ کے اصول و قواعد متعین کئے اور پیچیدہ تانوں سے اسے مزین کیا۔ یہ زرتانوں کا گانا ہے۔ پہلو تان میں ادا کیا جاتا ہے

(۶) دھرپد کا رواج ایک مدت تک رہا۔ اب سے تقریباً پانچ سو سال اُدھر سلطان حسین شرقی نے جو سلاطین شرقیہ کا آخری بادشاہ تھا خیال ایجاد کیا۔ اسکی وضع قطع اور گیند تو وہی ہے جو دھرپد کا ہے لیکن اس میں طرح طرح کی تانوں اور پیچیدہ ترکیبوں کا اضافہ کیا گیا۔ ہندوستان کی قدامت پسند اور روایت پرست آبادی میں خیال تین سو سال تک پنپ نہ سکا۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت میں عیش و عشرت کا دور دورہ تھا۔ خیال میں عاشقانہ مضامین باندھے گئے اور سدارنگ اور ادارنگ جیسے گویوں نے خیال کو اتنا فروغ دیا کہ دھرپد کی گرم بازاری جاتی رہی۔ تانوں کے خوبصورت جال میں سننے والے پھنس کر رہ جاتے ہیں اور اس سے رہائی صرف اسی وقت ہوتی ہے جب گانا ختم ہوتا ہے بلمپت گانے میں اسکی مخصوص تالیں تلواڑہ، جھومرا، آڑا چوتالہ اور ایکتالہ ہیں۔ ذرت میں تین تال، جھپ تال، ایکتالہ اور روپک ہیں۔

(۷) ہمارے ادب و شعر کی طرح ہمارا سنگیت بھی زندگی سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ لکھنؤ میں شاہان اودھ نے جس انداز سے داد عیش دی محتاج بیان نہیں مردانہ فنون کی جگہ نسوانی راحت پسندی نے لے لی تھی موسیقی میں دھرپد کے رزمیہ اور بزمیہ مضامین کی جگہ پہلے خیال کے عاشقانہ مضامین نے لی اور جب اخلاقی قدروں میں اور پستی آئی تو سنگیت میں بھی ابتذال اور فحش کی حد تک ہوسکارانہ مضامین باندھے جانے لگے اور سفلی جذبات کو اُبھارنے کے لئے ٹھمری ایجاد ہوئی جسے پہلے عورتوں کا گانا تصور کیا گیا۔ اسی لئے اسمیں اظہار عشق اور محبت کی دوسری کیفیات کا مذکور عورت کی زبانی ہوتا ہے اس کے بعد مرد و عورت کی تخصیص بھی مٹ گئی، اور عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں نے بھی ٹھمریاں گانا شروع کر دیں۔ طبیعتوں کی سہل پسندی اور عیش کوشی نے اس ہلکے پھلکے گانے کو قبول کیا اور اس درجہ مقبول کیا کہ آج تک پورب کی ٹھمری مشہور ہے۔ ٹھمری میں بول بنانے کی خوبصورتی دیکھنے کی چیز ہے۔ ایک ہی بول کو طرح طرح سے ادا کیا جاتا ہے، اور نرت کار جب بھاؤ بتا کر اسے گاتے ہیں تو اسکا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اسکی خاص تالیں چاچر، پنجابی یا دیپ چندی ہیں۔

(۸) دادرا بھی ٹھمری کی طرح پورب کا تحفہ ہے۔ اس میں بھی پوربی زبان میں شاعری کی جاتی ہے۔ عشق و ہوس کے تمام درجے طے کئے جاتے ہیں۔ پوربی بولوں کے علاوہ اس میں اردو کے عاشقانہ اشعار اور چند لگائے جاتے ہیں جنھیں سُن کر سامعین پھڑک جاتے ہیں۔ یہ بھی نرت بھاؤ کا گانا ہے اور بالعموم دادرا یا کہروے میں گایا جاتا ہے۔

(۹) ترانہ حضرت امیر خسروؒ کی ایجاد ہے اس کے لئے چند الفاظ مخصوص ہیں۔ مثلاً تا۔ نا۔ در۔ توم۔ توم۔ دانی وغیرہ۔ یہ بلمپت لے میں بھی گایا جاتا ہے لیکن اسکا لطف ذرت ہی میں آتا ہے۔ یہ گویا گانے میں ستار کی نقل ہے۔

جھپ تال، تین تال اور ایکتالہ میں گایا جاتا ہے۔

(۱۰) ترانے انگ سے گانا تروٹ بھی ہے۔ اس میں طبلے کے بول گائے جاتے ہیں۔

(۱۱) چترنگ میں چار رنگ شامل ہوتے ہیں۔ خیال کے بول، ترانہ، تروٹ اور سرگم سب ملے جلے ہوتے ہیں۔

(۱۲) غزل سرائی مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ گانے کی سب سے مقبول صنف یہی ہے۔ عام طور سے کہروا اور پشتو میں گائی جاتی ہے۔

(۱۳) قوالی حضرت امیر خسروؒ کی ایجاد ہے۔ حضرت امیر کی کئی ایجادات ہیں۔ مثلاً قول، قلبانہ، نقش، گل، نگار، ہوا، بسیط اور سوہلہ۔ ناقدری اور سہل پسندی نے ان سب طریقوں کو رفتہ رفتہ طاقِ نسیاں کو سونپ دیا۔ ان کے برتنے والے اب الشاذ کالمعدوم ہیں۔ انہی کے گانے والے قوال کہلاتے تھے۔ آجکل غزل کو ایک خاص ڈھنگ سے گانے کو قوالی کہتے ہیں۔ لفظوں کی تکرار اور ڈھولک کی تھاپ بڑی اثر انگیز ہوتی ہے۔

(۱۴) تھیٹر کی دھنیں پارسیوں کے قائم کئے ہوئے تھیٹروں کی بدولت ایک زمانے میں بہت مقبول تھیں۔ ان میں موسیقی کے بعض نئے تجربات کئے گئے تھے جو بہت کامیاب اور دلکش ثابت ہوئے۔ گویا یہ بھی ہماری موسیقی میں ایک نئی چیز تھی۔ خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود۔ ہمارے ملک میں اب اسٹیج ہی نہیں رہا ہے تو اس کی دھنیں کیا باقی رہتیں۔

(۱۵) گیتوں نے یوں تو ہمارے دیہاتوں میں جنم لیا لیکن شہروں میں آکر نکھر گئے۔ ان کی چلتی ہوئی دھنیں اور آسان مضمون ان کی مقبولیت کے سفارشی تھے۔

(۱۶) بیس سال کے عرصے میں فلمی گیتوں نے وہ زور پکڑا ہے کہ اب کوئی اور طریقہ ان کا حریف نہیں بن سکتا۔ ان کی چلتی ہوئی دھنیں بچے بچے کی زبان پر آجاتی ہیں۔ فلم کی کہانی گیت کی اہمیت کو اور بڑھا دیتی ہے۔ بعض گیت اپنی نرالی دھنوں کی وجہ سے مقبول ہوجاتے ہیں چاہے ان کے اشعار موزوں ہوں یا ناموزوں، چاہے ان میں کوئی مفہوم ہی نہ ہو تب بھی۔ ان دھنوں کو ہماری موسیقی سے کم اور سات سمندر پار کی موسیقی سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ یہ آمیزہ بھی ایک عجیب تجربہ ہے۔ عجیب بات ہے کہ جس شدت سے ان گیتوں کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اتنی ہی سرعت سے یہ فراموش اور محو بھی ہوجاتے ہیں۔ یہ ناپائیداری ان کی بے وقعتی کی دلیل ہے۔

زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور عوام کی سہل پسندیوں سے ہمارے سنگیت کا زوال ہوا یہاں تک کہ فن صرف بازی گری رہ گیا۔ رنگ رنگینیوں کی صحت جاتی رہی اور علم کی جگہ زیب کاری نے لے لی۔ پہلے موسیقی عبادت میں شامل تھی اب صرف دل بہلاوا اور حظِ نفس کا ایک سستا ذریعہ ہے جب کسی فن لطیف میں اتنی پستی آجاتی ہے تو اس کا روحانی عنصر فنا ہوجاتا ہے اور اس کے وہ کمالات جنہیں اعجاز کہا جاتا ہے زائل ہوکر ماضی کی روایات بن جاتے ہیں۔ ہمارا گیت اور ہمارا سنگیت اب بھی موجود ہے مگر اب نہ تو وہ مہنگے ریاضی کسبی فنکار ہیں اور نہ وہ اگلا سا ذوق، شوق اور قدردانی۔ زمانہ بدل گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے یہاں کا سنگیت بھی کچھ سے کچھ ہوگیا۔

اے ہمنشیں میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے ایسے نقشے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

غزل — عامر عثمانی

جب موت کے بادل آنکھوں سے ہر چیز کو پنہاں کر دیں گے
ہم اپنے تصور کی ضو سے اک شمع فروزاں کر دیں گے

بھولے سے اگر وہ آ بھی گئے کیا درد کا درماں کر دیں گے
اجڑے ہوئے گھر کی ویرانی کچھ اور نمایاں کر دیں گے

ناموسِ غمِ جاناں کی قسم وہ غم بھی خوشی بن جائے گا
ہم جوشِ وفا میں جس غم کو وابستۂ جاناں کر دیں گے

للہ گرا دو کچھ پردے ہر غنچہ و گل کے عارض پر
ورنہ یہ تمہارے دیوانے ہر شے کو گریباں کر دیں گے

ہاں اہلِ کرم بسملوں پر وہ وقت بھی آنے والا ہے
تسکینِ رگِ جاں کی خاطر نشتر کو رگِ جاں کر دیں گے

ہم دردِ فراواں سہنے کے خوگر بھی ہوئے تو کیا حاصل
جب درد میں لذت آئے گی وہ درد کو درماں کر دیں گے

اے گریۂ غم اے دیدۂ نم رہنے دے خدارا کچھ آنسو
وہ آئے تو ہم ان شمعوں کو رخشانِ سرِ مژگاں کر دیں گے

جب تو ہی نہیں تو جنت کیا، مت بھیج وہاں دیوانوں کو
دو چار اگر مل جائیں گے جنت کو بھی ویراں کر دیں گے

یہ گردشِ دوراں بخشے تو اک رات وصالِ جاناں کی
ہر ساعتِ رنگیں میں شامل طولِ شبِ ہجراں کر دیں گے

فردوسِ حریمِ الفت میں جلوے ہیں نہاں کچھ ایسے بھی
ہو جائیں گے جس دن بے پردہ خود حسن کو حیراں کر دیں گے

احسان کہ تم نے رکھا ہے انعامِ دل و جاں دینے پر
ورنہ یہ دل و جاں کس کے ہیں کیا نذرِ دل و جاں کر دیں گے

فرصت نہ ملی ان سجدوں کو فردوس و جہنم کے غم سے
اک روز یہی سجدے عامر زاہد کو پشیماں کر دیں گے

بہانہ

ڈرامہ

انتصار نوتوی

(ریل گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی پڑتی ہے۔ پہلے تیز پھر آہستہ آہستہ یہ آواز ڈوبتی ہوئی دور ہوتی ہے۔ بجنسہ جیسے کوئی گاڑی مکان کے پاس سے گذرتی ہوئی چلی گئی ہو۔

(ایک لمبا وقفہ جس میں کوئی بوڑھا شخص لگاتار کھانستا رہتا ہے)

زاہدہ:۔ کیا بجا ہوگا؟ . . . کیوں جی۔ (کوئی جواب نہیں ملتا۔ کھانسی برابر آتی رہتی ہے) میں تمہیں سے پوچھ رہی ہوں، ذرا وقت بتاؤ۔

سلیم:۔ (کھانستے ہوئے) ذرا کھانسی دم لینے دے تو بتاؤں (تھوڑی دیر تک کھانستا رہتا ہے) دو بج چکا ہے ڈھائی کا عمل ہوگا۔ سنا نہیں تم نے پنجاب میل نکلکر گیا ہے ابھی ابھی۔ اس گاؤں میں وقت کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔ اب چار بجے ایکسپریس گذرے گا پھر دس بجے رات کو پسنجر، دو بجے رات کو طوفان میل۔ چار بجے صبح......

زاہدہ:۔ (بات کاٹ کر) میں نے صرف وقت پوچھا تھا۔ تم تو سارا ٹائم ٹیبل بتلانے لگے۔ تمہاری بیماری شاید اس لئے طول کھینچتی جارہی ہے کہ تم باتیں بہت کرتے ہو۔ اسی لئے میں تم سے بات کم کرتی ہوں۔ ڈاکٹر نے تمہیں کم بولنے کی تاکید کی ہے۔ اس گاؤں کے وید جی اور حکیم بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ مگر تمہاری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا۔

سلیم:۔ (بگڑ کر) حکیم، وید میری سمجھ میں کیا خاک چھپر آئے۔ وہ لوگ میرا مرض ہی نہیں سمجھے۔ (کھانسنا شروع کرتا ہے) اسی لئے تاکید خوب کرتے ہیں۔

زاہدہ:۔ ڈاکٹر انور بھی تمہارا مرض نہیں سمجھتے؟ وہ تو اسپیشلسٹ ہیں۔

سلیم:۔ وہ بھی نہیں سمجھے۔ ارے انہیں بیکار یہاں بلا بھیجا مجھے کوئی مرض نہیں ہے۔ بجز ضعیفی کے کشور کی فکر ضرور ہے جو ہر وقت دل میں چٹکیاں لیا کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جسکا علاج لقمان کے پاس بھی نہ تھا۔ سچ کہتا ہوں زاہدہ میرا کشور اگر آجائے تو۔ بڑھاپا جوانی میں بدل سکتا ہے۔ دل و دماغ۔ تو نئے سرے سے طاقت آسکتی ہے ضعیفی میں اولاد کا بہت بڑا سہارا ہوتا ہے۔

زاہدہ:۔ کشور بھی آجائیگا ذرا صبر تو رکھو۔ اسی لئے میں نے اسکی قدِ آدم تصویر تمہاری نگاہوں کے سامنے لگا دی۔ وہ دیکھو وہ کیا ہے تمہارا کشور۔ ہم دونوں کی ناقابل (؟) طبیعتوں پر کیسا مسکرا رہا ہے۔ شہر سے میں اسی لئے تمہیں اس گاؤں میں لائی کہ یہاں کی تازی آب و ہوا تمہاری صحت پر اچھا اثر کرے گی۔ مگر تم اپنی طبیعت کو سمجھانے کی بالکل کوشش نہیں کرتے۔ شہر چھوڑنے سے ہمارا کس قدر نقصان ہوا۔ وکالت کی ساری آمدنی ختم ہوگئی۔ اب میرے لئے صرف یہ کام رہ گیا، وہاں آپ کو ڈاکٹر انور کے علاج سے کافی فائدہ تھا۔ کھانسی اور اختلاج دونوں میں کمی تھی۔ اس وقت کشور کو گئے ہوئے کچھ ہی دن گذرے ہونگے مگر اب تو مرض بڑھتا ہی جارہا ہے

سلیم:۔ تو پھر شہر لوٹ چلو۔ یہاں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

زاہدہ:۔ آج ڈاکٹر انور کی رائے لونگی۔ یہ انہیں کا مشورہ تھا کہ شہر چھوڑ کر گاؤں میں رہا جائے۔

سلیم:۔ کس وقت آئیں گے ڈاکٹر انور؟

زاہدہ:۔ اس وقت تک تو انہیں آجانا چاہئے تھا۔ موٹر سے کل دو گھنٹہ کا تو راستہ ہے سڑک بھی کچھ ایسی خراب نہیں۔ شاید مطب کرنے کے بعد وہاں سے چلیں ہاں تمہیں ایک خوشخبری سنانا بھول گئی۔ آج کی ڈاک سے نرگس آپا کا خط آیا ہے۔ انہیں رشتہ منظور ہے۔

سلیم:۔ کیسا رشتہ؟

زاہدہ:۔ بھول گئے۔ کشور کے جانے کے ایک ہفتہ بعد میں نے اسکا پیغام زلیخا کے ساتھ دیا تھا۔ تم سے بتایا تو تھا یعنی کشور کی شادی زلیخا کے ساتھ طے ہوگئی۔

سلیم:۔ ہاں (کھانسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے) اور کیا لکھا ہے نرگس آپا نے؟

زاہدہ:۔ آپکی طبیعت کا حال پوچھا ہے۔ کشور کے عراق سے واپسی کی تاریخ پوچھی ہے باقی تمام خط میں اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ کیا یہ خط کشور کو عراق کے پتہ سے بھیجدیا جائے۔

سلیم:۔ اسکا پتہ کہاں ہے۔ عراق پہنچکر اس نے ہمیں کوئی خط نہیں لکھا۔ اسکا کوئی خط آئے تو یہ خط اس کے پاس بھیجدینا۔ اسکی رضامندی بھی ضروری ہے۔

زاہدہ:۔ زلیخا تمہیں پسند ہے؟ کسقدر پیاری لڑکی ہے۔

سلیم:۔ عرصہ ہوا جب میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس وقت ضرور اچھی تھی ممکن ہے آج باپ کے ساتھ آتی ہو۔

زاہدہ:۔ ہاں کیا عجب ہے مگر میں بھول گئی ورنہ خط میں ڈاکٹر انور کو یہ بھی لکھدیتی کہ وہ زلیخا کو اپنے ساتھ ضرور لیتے آئیں۔

سلیم:۔ دیر بہت ہوگئی ہے شاید ہی آج کوئی آئے۔

زاہدہ:۔ ابھی وقت تو ہے۔ مطب کے بعد کھانا کھایا ہوگا۔ پھر تھوڑا سا آرام لینے کے بعد چلے ہونگے۔ میرے نزدیک چار بجے تک وہ یہاں ضرور پہنچ جائینگے۔

سلیم:۔ واپسی بھی تو انہیں آج ہی جانا ہوگا۔ انہیں اب تک آجانا چاہئے تھا۔ تم نے چار وغیرہ کا انتظام کر لیا ہے یہ گاؤں ہے۔ یہاں ضرورت کی چیز وقت پر بہت کم ملتی ہے۔ انڈے وغیرہ گھر میں موجود ہیں نہ؟

زاہدہ:۔ ان معاملات میں میری ملازمہ تعیین انتہائی منتظم ہے تازی ترکاریاں۔ دودھ۔ مکھن۔ موسمی پھل ہر چیز گھر میں موجود ہے۔

سلیم :- آج کی ڈاک آگئی ؟

زاہدہ :- ہاں کشور کا کوئی خط نہیں ہے۔ معلوم نہیں کیوں۔ اس نے ہمیں اپنی خیریت کی اطلاع اب تک نہیں دی۔

سلیم :- (فکر کے ساتھ) کیا بتایا جائے جوانی میں اس قسم کی ذمہ داریوں کا احساس لڑکوں میں کم ہو جاتا ہے ...... اور تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

زاہدہ :- میری ہرگز یہ رائے نہ تھی کہ وہ عراق جائے مگر وہ تو سیاحت کے نشہ میں چور تھا۔ تم نے بھی کوئی مخالفت نہیں کی۔

سلیم :- چلو اب لوٹ کر آجائے تو کہیں مت جانے دینا۔

زاہدہ :- اب کہاں جائیگا۔ آتے ہی اس کی شادی کر دونگی۔ ایسی خوبصورت بیوی پاکر وہ پھولا نہ سمائے گا۔ خود زلیخا اسے کہیں نہ جانے دیگی۔

سلیم :- کیا یہ ضروری ہے کہ وہ بھی زلیخا کو پسند کرے۔ خوبصورتی بذاتِ خود کوئی چیز نہیں ہوا کرتی۔ یہ پسند کا دوسرا نام ہے اور پھر وہ تو ایک سیاح ہے اس نے دنیا گھومی ہے۔ اس معاملہ میں اس کی نظر ہم سے زیادہ وسیع اور گہری ہوگی۔

زاہدہ :- (مسکرا کر محبت کے ساتھ) تم پر کہیں کا۔ تصویر میں دیکھو اسکی خلقی مسکراہٹ آنکھوں سے ظاہر ہو رہی ہے۔ رگ رگ میں شرارت بھری پڑی ہے۔

سلیم :- (ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش رہتا ہے)

زاہدہ :- میری تو آنکھیں اسے ہر وقت ڈھونڈا کرتی ہیں۔ خط نہ آنیکی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ گھر واپس ہو رہا ہو۔

سلیم :- ہاں اور بھی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ زندہ رہنے کے لئے کوئی سہارا تو چاہئے۔

زاہدہ :- کل میں نے اس کے لئے ایک دیہاتی شگون کیا تھا۔ یہاں کی عورتوں نے مجھے بتایا کہ میں کسی دن سچے دل سے یہ سمجھ کر کہ آج کشور آرہا ہے اسکا انتظار کروں۔ گھر کی صفائی کراؤں، کمروں کو سجاؤں عمدہ عمدہ کھانے پکاؤں اور چراغوں کو دن رہتے سے گھر میں جلاؤں (ہنسکر) کسقدر مضحکہ خیز چیزیں ہیں مگر گاؤں کی عورتیں اسے انتظار کا نیک شگون بتلاتی ہیں۔ بیچاری وہ سب کی سب میری بہت ہمدرد ہیں، کہتی تھیں کہ اس گاؤں کے بہت سے لڑکے جو لڑائی پر گئے تھے اس شگون کے مانتے ہی آگئے۔

سلیم :- اچھا۔ جب ہی کل پانچ بجے شام کو حسین میرے کمرہ میں لیمپ جلا کر رکھ گئی تھی۔ بیشک یہ کوئی نیک شگون ہوگا۔ چراغ کو دن رہے سے جلا دینا انتظار کی آخری حد ہے۔

زاہدہ :- کشور کا یہ فوٹو یہاں سے ہٹا دوں ؟

سلیم :- کیوں ؟

زاہدہ :- ڈاکٹر انور کے ساتھ شاید زلیخا بھی آئے۔ بھولی لڑکی مجھ سے پوچھ بیٹھے یہ کون ہیں ؟

سلیم :- (ہنسکر) کوئی جواب نہ پاکر خود ہی سمجھ جائیگی مگر کیا اس نے کشور کو دیکھا نہ ہوگا ؟

زاہدہ :- اس نے کیا دیکھا ہوگا؟ کالج بند ہو جانے کے بعد جب وہ آئی تو کشور جا چکا تھا۔

سلیم :- لوگ بے حد ملنسار ہیں مگر رشتہ دینے کی ابھی کیا ضرورت تھی۔ کشور کو آ لینے دیتیں۔

زاہدہ :- کیا تم میرے کشور کو اسقدر نالائق سمجھتے ہو، وہ میرا کہنا نہ مانے گا؟

سلیم :- نہیں یہ بات نہیں۔ ہم نے قبل از وقت ایک چیز اٹھائی ہے — خیر مجھے ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں۔ مجھے دوا لاکر پلاؤ۔ وقت ہو گیا۔

زاہدہ :- ہاں باتوں میں بھول گئی۔ ابھی لائی دوا آپ کی۔

(گلاس اور شیشی کے میز پر رکھنے کی آواز)

زاہدہ شیشی سے دوا انڈیل کر دیتی ہے اور سلیم ایک ایک گھونٹ کر کے پیتا ہے۔ موٹر کا ہارن سنائی پڑتا ہے۔ موٹر کی بھنبھناہٹ آہستہ آہستہ قریب ہوتی ہے۔ ساتھ ہی بچوں کا شور و غل اور ہنگامہ بھی سنائی پڑتا ہے جو گاؤں میں موٹر کی آمد کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

زاہدہ :- ڈاکٹر انور آگئے (قدموں کی آواز۔ غل شور کی آواز تیز ہو جاتی ہے۔ موٹر کے متعلق لوگ دیہاتی زبان میں باتیں کرتے ہوئے سنائی پڑتے ہیں)

ڈاکٹر انور :- آداب عرض۔

زاہدہ :- آداب۔

زلیخا :- آداب عرض کرتی ہوں۔

زاہدہ :- زلیخا۔ جیتی رہو بیٹی، خوش رہو۔ آؤ اندر۔ آج بڑی زحمت ہوئی تم کو اور ڈاکٹر صاحب کو۔

(موٹر کا دروازہ کھل کر بند ہو جاتا ہے)

ڈاکٹر :- جی زحمت کیسی۔ آپ کے حکم کی تعمیل اور زحمت (ہنسکر) کیا خوب۔ کیسے ہیں سلیم صاحب ؟

زاہدہ :- وہی حال ہے ڈاکٹر صاحب۔ کھانسی بہت کم ہے مگر اختلاج اور گھبن میں کوئی کمی نہیں — چلئے اندر چلئے۔ آؤ بیٹی زلیخا آؤ

یہ گاؤں ہے۔ دیہات دیکھا ہے تم نے؟ یہاں سب کسان رہتے ہیں جدھر نظر اٹھا کر دیکھو کھیت ہی کھیت نظر آئیں گے۔

زلیخا:۔ جی ہاں مجھے ایسی جگہ پسند ہے۔ شہر میں رہنے کے بعد اس قسم کی تبدیلی لطف سے خالی نہیں۔

(سب لوگ سلیم کے کمرہ میں داخل ہوتے ہیں)

ڈاکٹر انور:۔ آداب عرض کرتا ہوں سلیم صاحب۔

سلیم:۔ آداب عرض۔ آداب عرض۔ آئیے۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کی اس زحمت کا۔

ڈاکٹر:۔ (تکلفاً) اجی واہ زحمت کیسی۔ یہ تو میرا گھر ہے۔ کیا غیر کے یہاں میں آیا ہوں۔

سلیم:۔ بہت تکلیف ہوئی ہوگی راستے میں؟

ڈاکٹر:۔ جی نہیں مجھے دو گھنٹے سے بھی کم یہاں آنے میں لگے۔ سڑک صاف اور اچھی ہے ـــــــ کیسے ہیں آپ؟

سلیم:۔ شکر ہے خدا کا۔ آپ کی دوا سے کھانسی بہت کم ہے۔ مجھے کوئی مرض نہیں زاہدہ کو صرف وہم سما گیا ہے۔ (ہنسکر) بجائے میرے آپ ان کے وہم کا علاج کریں۔

ڈاکٹر:۔ یہ صحت کی بہت بڑی دلیل ہے کہ مریض اپنے کو تندرست سمجھے بیشک آپکو کوئی مرض نہیں۔ (زاہدہ کی طرف مڑکر) اور آپکو محض وہم ہے۔

زاہدہ:۔ خدا کرے مجھے وہم ہو اور انھیں کوئی مرض نہ ہو۔ پھر بھی آپ احتیاطاً ان کا غور معائنہ کیجئے۔

ڈاکٹر:۔ (ہنسکر) میں آج فیصلہ کردونگا کہ آپ کو وہم ہے یا ان کو مرض۔

زاہدہ:۔ (شوق کے ساتھ) اپنے کشور کی یہ تصویر دیکھی ڈاکٹر صاحب۔ یہ تصویر اس نے جرمنی میں بنوائی تھی۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) نہ جانے ہمارے گھر میں یہ سیاح کیوں پیدا ہوا۔ جرمنی، فرانس، بلجیم، ہالینڈ سب کہیں گھومنے کے بعد اب عراق گئے ہیں۔

ڈاکٹر:۔ بڑی غلطی تھی اگر نہ جاتے مشرقی ممالک تو رہ جاتے (سب ہنستے ہیں)

زاہدہ:۔ مگر اب نہیں جانے دیا جائیگا کہیں۔ بس بہت سیاحت ہو چکی۔ دنیا گھوم لی۔ اب آکر باپ کی جگہ بیٹھکر کام کریں۔ ولایت سے ماسٹری پاس کی آخر وہ کس دن کام آئے گی (مڑکر) زلیخا ادھر آؤ بیٹی ادھر شرمائی کیوں کھڑی ہو۔ تھک گئی ہو شاید۔ چائے آرہی ہے پی لو پھر باہر کھیتوں اور باغوں میں گھومنے چلیں گے۔ لو چائے آگئی۔

(نسیبن چائے کے برتنوں کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔ (وقفہ) چائے کا دور شروع ہوتا ہے)

ڈاکٹر:۔ کافی دن ہوئے کشور عراق میں کوئی خط آیا ان کا اس طرف۔

سلیم:۔ نہیں۔ کوئی خط نہیں آیا۔

ڈاکٹر:۔ زلیخا تمہیں یہ گھر پسند ہے یا میرا؟

زلیخا:۔ (شرمیلی) جی آپ کا مطلب۔ گاؤں اور شہر سے ہے؟

ڈاکٹر:۔ ہاں۔ یہی یہی۔

زلیخا:۔ پسند تو مجھے شہر ہی ہے مگر گاؤں بھی برا نہیں ہوتا۔

سلیم:۔ نہیں بیٹی برا ہوتا ہے۔ یہاں صرف کسانوں کے گھر ہیں۔ کسی وکیل یا ڈاکٹر کے نہیں۔ یہاں رہے تو کسان بنکر رہے۔

زلیخا:۔ (بھولے پن سے) اس گاؤں میں بندر بہت ہیں۔

زاہدہ:۔ (ہنسکر) ہاں بہت ہیں بیٹی۔ یہاں کے لوگ انہیں باپ داداؤں کو اب تک پہچانتے ہیں۔ انھیں کھانے کے لئے چنے اور بہت سی چیزیں دیا کرتے ہیں۔ ہم بھی تمہارے ساتھ تھوڑے سے چنے لیکر چلتی ہوں۔ پھر دیکھنا بہت سے بندر ہمیں آکر گھیر لیں گے۔ یہاں اس قسم کے تماشے بہت ہیں ـــــ تم چائے پی چکیں۔

زلیخا:۔ جی ہاں چلئے بندروں کا تماشہ دیکھا جائے۔

(قدموں کی آواز)

ڈاکٹر:۔ بہت دیر مت لگا دینا۔ ابھی گھر واپس چلنا ہے۔

سلیم:۔ چلے بھی جائیگا۔ اگر رات ہوگئی تو گھر موجود ہے۔

ڈاکٹر:۔ جی بہت ہرج ہو جائیگا۔ وہاں ایک دو کیس بہت ضروری ہیں ـــ آپ اپنا حال بتائیے۔ یہاں کی آب و ہوا کا آپ کی صحت پر کوئی اچھا اثر نہیں ہے۔ لیٹ جائیے تو میں آلہ سے آپکا سینہ دیکھوں (لمبا وقفہ۔ آلہ سے تمام سینہ دیکھنے کے بعد ہڈیوں کو ہاتھ سے بجا کر) ہر چیز اپنی جگہ پر ٹھیک اور درست ہے۔ کوئی خاص مرض آپکو نہیں۔

سلیم:۔ میں نے تو آپ سے ہمیشہ یہی کہا کہ مجھے کوئی مرض نہیں ہے۔ البتہ ایک فکر ہے آپ سے بیان کر دینے میں کوئی حرج نہیں مگر ڈرتا ہوں۔

ڈاکٹر:۔ اگر آپ مجھے بتا دیں تو مجھے آپ کے علاج میں بہت مدد ملے گی۔ آپ اطمینان رکھئے۔ میرے سینہ میں بہت سی پوشیدہ باتیں دفن ہیں۔ میں ڈاکٹر ہوں مجھ پر یقین کیجئے۔ کیا کوئی ایسی بات ہے جس کو آپ چھپانا چاہتے ہیں۔

سلیم:۔ ہاں۔ مگر پھر سوچتا ہوں کہ شاید کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ میں آج آپ سے اپنی ایک خفیہ بیماری کا اظہار کروں گا مگر وعدہ کیجئے کہ اس راز کو آپ کبھی اپنی زبان پر نہ لائیں گے۔

ڈاکٹر:۔ (سنجیدہ بنکر) میں وعدہ کرتا ہوں آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔

سلیم:۔ (مضمحل آواز کے ساتھ) کشور کی اس تصویر کو دیکھا آپ نے؟

زاہدہ ابھی تک کہہ رہی تھی آپ سے کہ اسے سامنے کے ساتھ اسکا اتفاق ہے۔ مگر...... (الفاظ منہ سے مشکل نکلتے ہیں۔ کھانسی کا دورہ شروع ہو جاتا ہے)

ڈاکٹر:۔ ہاں ہاں کیا کہنا چاہتے ہیں آپ۔

سلیم:۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ میرے منہ سے نہیں نکلتا۔ (کھانستا رہتا ہے)...... کشور اس دنیا میں زندہ نہیں ہے وہ مر چکا ہے۔

ڈاکٹر:۔ (گھبرا کر) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سلیم صاحب۔

سلیم:۔ بالکل سچ کہہ رہا ہوں ڈاکٹر۔ وہ جہاز سمندر میں ڈوب گیا جس پر کشور سفر کر رہا تھا۔ بعد میں مرنے والوں کی ایک لسٹ شائع ہوئی جس میں کشور کا نام بھی تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ مر گیا۔ مگر میں نے زاہدہ کو نہیں بتایا۔ مجھ سے بتلایا نہیں گیا۔ وہ شاید اس صدمہ کو نہ برداشت کر سکتی بس یہی میرا قرض ہے۔ کتنا ہولناک اور جان لیوا ہے۔ مگر وعدہ کیجئے کہ زاہدہ کو اسکا علم نہ ہوگا —— ذرا میرے ساتھ تصویر کے قریب چلئے۔ میرے اس مرض کو قریب سے حل کر دیجئے (قدموں کی آواز) کشور خوشرو جوان ہے۔ وکالت اس نے انگلینڈ ہی میں پڑھی۔ اس پیشہ کو پسند بھی کرتا تھا۔

(زاہدہ اور زلیخا باتیں کرتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوتی ہیں)

زاہدہ:۔ دیکھا بیٹی تم نے اس گاؤں میں کسانوں سے زیادہ بندر آباد ہیں (ڈاکٹر اور سلیم کی طرف مڑ کر) او آپ لوگ میرے کشور کا فوٹو دیکھ رہے ہیں۔ یہی دکھا رہے ہونگے ہر ایک کو فوٹو دکھایا کرتے ہیں بہت یاد کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب یہ کشور کو میں سمجھاتی ہوں کہ وہ جلد آ جائیگا۔ خدا پر بھروسہ رکھو مگر ان کے دل کو کسی طرح سکون نہیں۔

ڈاکٹر:۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) ہاں ہاں۔ جی ہاں۔ زلیخا چلو گھر چلیں۔ موٹر پر جا کر بیٹھو۔

سلیم:۔ ڈاکٹر صاحب......

ڈاکٹر:۔ آپ اطمینان رکھئے آپ کو کوئی مرض نہیں ہے۔ خوش رہنے کی کوشش کیجئے سکوت اور آرام کی ضرورت ہے۔

زاہدہ:۔ یہی تو میں کہا کرتی ہوں ڈاکٹر صاحب (سلیم سے) اب آپ اپنے بستر پر جائیے ورنہ طبیعت بھاری ہو جائے گی۔ (قدموں کی چاپ)

ڈاکٹر:۔ مجھے اجازت دیجئے چلو زلیخا۔

(زاہدہ۔ ڈاکٹر اور زلیخا کمرہ سے باہر نکلتے ہیں)

زاہدہ:۔ میں اسلئے نہیں کہہ سکتی کہ آپ کے پیشہ کو نقصان پہنچیگا۔ ورنہ دل نہیں چاہتا کہ آپ لوگوں کو چھوڑوں (موٹر کا دروازہ کھلکر بند ہوتا ڈاکٹر اور زلیخا اندر بیٹھ جاتے ہیں۔ موٹر اسٹارٹ ہوتی ہے) دیکھا آپ نے

حشرِ جذبات —— ثاقب کانپوری

رشکِ گلگوں ہے خود ہی گلزار ٭ اب قفس ہی میں منتظرِ فصلِ بہار
کون سمجھے گا اس لطافت کو ٭ تیرے انکار میں بھی ہے اقرار
درد میں اس کے زندگی تو ہے ٭ ہو مبارک یہ عشق کا آزار
مجھ کو غربت کی کیا شکایت ہو ٭ میں وطن میں بھی ہوں غریبِ دیار
عشق میں ہر قدم پہ ہے صبر طلب ٭ کس قدر ہے یہ راہ بھی دشوار
تیری صورت تو ہے سراپا رحم ٭ حسن تیرا ہے کیوں غریب آزار
وجد طاری ہے ذرے ذرے پہ ٭ کون ہے تیری بزم میں ہشیار
اپنی قسمت پہ میں بھی ناز کروں ٭ ہو اگر عاشقوں میں میرا شمار
میری توبہ کا اعتبار رہی کیا ٭ لوٹ جائے جو آ کے فصلِ بہار
ہم کو نسبت ہی تیری کافی ہے ٭ عشق میں اور کچھ نہیں درکار
تیری فرقت میں آیا جو آنسو ٭ بن گیا آنکھ میں دُرِ شہوار

ہے یہ سرمایہ عشق میں ثاقب
دل ہے زخمی تو آنکھ ہے خونبار

ڈاکٹر صاحب سلیم صاحب کی بے قراری کشور کی طرف سے ایک منٹ بھی غافل نہیں رہتے (آواز بھاری ہو جاتی ہے) مگر آپ کو نہیں معلوم کشور مر گیا ہے۔ وہ جہاز ہی ڈوب گیا جس پر وہ گیا تھا میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھ کر ان سے چھپا ڈالی۔ اگر وہ سنتے تو ان کے دل کی حرکت بند ہو جاتی۔ ڈاکٹر صاحب میں خود اس خود فریبی میں مبتلا ہوں شاید اسے خدا نے بچا لیا ہو اور یہ خبر غلط نکلے ہماری زندگی کے لئے یہ ایک بہانہ ہے۔

(موٹر اسٹارٹ ہو کر چل دیتا ہے)

آزاد شاعر

ظریف دہلوی

نہ ہم کہتے ہیں صاحب ذوق
[illegible] واجبی سی
[illegible]
[illegible] کر دیں
[illegible]
ظریف وقت [illegible] ہم
ردیف و قافیے میں [illegible]
[illegible] آفت
تو پھر اس کی ہمیں پروا کیا ہے
ہماری آرزو تو ہے بس اتنی
اگر یہ اک ذرا سا کام ہو جائے
یہ الہیسال ہم دیوان لے کر
[illegible] جیب میں [illegible]
میں دعوت دے رہا ہوں [illegible] سب کو
[illegible] شاعری میں کیا دھرا ہے
[illegible] ہے اور اختر شماری

مگر ہے شاعری کا ہم کو بھی شوق
پڑھی ہے اک ذرا سی فارسی بھی
زبان نثر کے ہم موجد نہیں
فسانہ دلنشیں تحریر کر دیں
مگر ہے شاعری میں قافیہ تنگ
بہت اچھا ہیں مجبور ہیں ہم
نہیں ہے روگ یہ تو اپنے بس کا
اور اک چھوٹا سا جیسے منہ میں [illegible]
ہمارا بحر سے کیا واسطہ ہے
نہیں ہم صاحب دیوان جلدی
ادیبوں میں ہمارا نام ہو جائے
چلیں مونچھوں پہ اپنی تاؤ دے کر
دلدر دور ہو جائیں یقیناً
نیا ملبوس پہنا دو ادب کو
گل و بلبل کا افسانہ بھرا ہے
جگر میں ٹیس لب پر آہ و زاری

کہیں فرقت پہ [illegible] رو رہی ہے
کہیں معشوق نے عاشق کو [illegible]
ہوا ہے مرتکب قتل عمد کا
نہیں پابند قوانین [illegible]
بھلا سمجھو یہ کوئی شاعری ہے
یہ ہے آزاد [illegible] ادب کی
ہماری شاعری ہے عین فطرت
نمونہ دیکھئے امداد دیجئے

[illegible]
[illegible]
[illegible]
ابھی [illegible]
ملا ایران کی تقلید کی ہے
[illegible]
[illegible] طبیعت
سبق اس شاعری کا ہم سے لیجے

نمونہ

پھر پھر اک دم گلی میں فاختہ
جیسے دولتمند ساہوکار کی وہ داشتہ
حسن کے قزاق نے، جیسا گھسوٹا ہو جمال
یوں ہیں جسن رفتہ کے مسہری پر پڑی روتی رہے ہو کر نڈھال
آہ بیکس فاختہ
یاد آتا ہے مجھے اپنا شباب
میں سمجھتا ہوں ترے جذبات کے ہیجان طوفاں خیز و عالم سوز کو
غم نہ کر
کیوں گھلی جاتی ہے رنج و فکر کے دریا کے بے طوفان و بے امواج میں
اس سے کچھ حاصل نہیں
بس سمجھ لے یہ جوانی چلتی پھرتی چھاؤں ہے
آئی اور پھر سے اڑی۔

مضمون

[illegible]
[illegible]

غزل

[illegible]
[illegible]

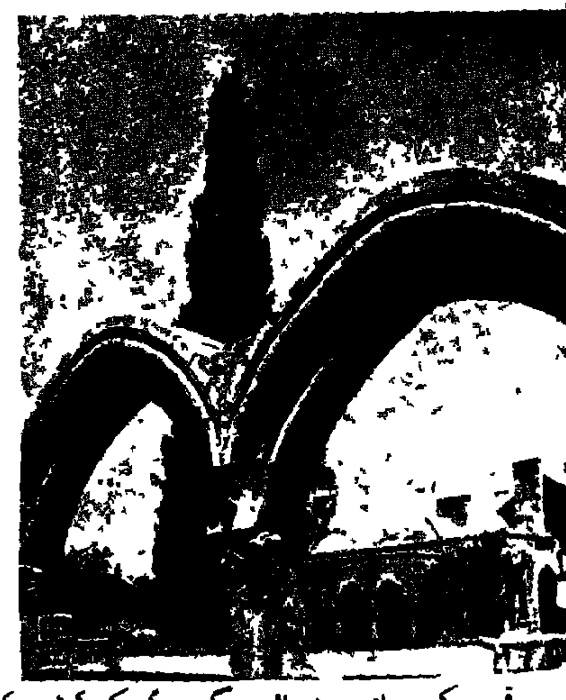


جزیرۂ قبرص میں اس قسم کے پہاڑی گاؤں بہت سے ہیں۔ یہ گاؤں اس راستہ پر واقع ہے جو "ٹروڈور" کو جاتا ہے۔



قبرص کے صدر مقام نکوشیا میں مسز جوینڈ بز کی دوکار یہاں کی کشیدہ کاری اور دوسری دستکاریوں کی چیز بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس کے سار پردے مسز جوینڈ بز ہی نے مہیا کئے ہیں۔

"قبرص کا صدر مقام نکوشیا برطانوی سپاہیوں کی تفریح گاہ ہے۔ یہ تصویر نکوشیا کے گورنمنٹ ہاؤس کی ہے ↓



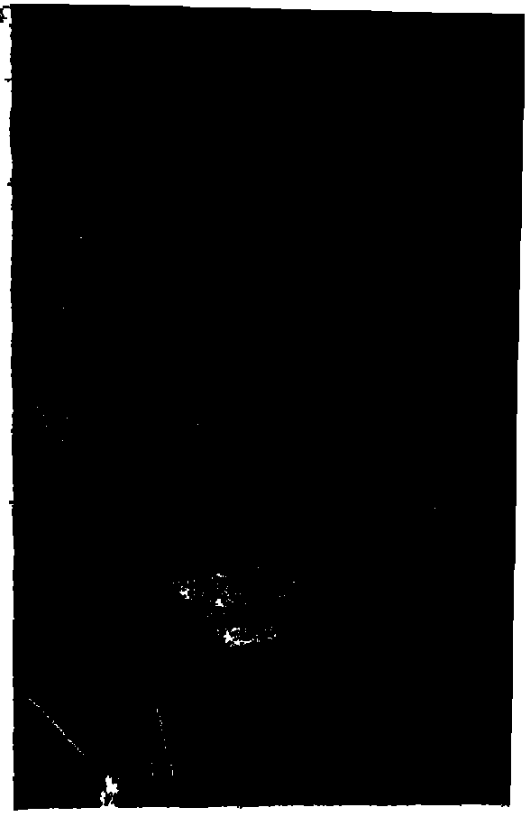


قبرص کی دیہاتی دوشیزائیں رنگ برنگ کے کپڑوں کی بڑی شوقین ہوتی ہیں لیکن ایسے بھڑکیلے کپڑے انکو



مشہور مصور ایوان طیوطیقوف ایک قدیم شہر کا ایک حصہ دکھا رہا ہے۔ یہ شہر اب بہت ترقی کر چکا ہے۔

← فنکار طیوطیقوف اپنے کمرے میں کام کر رہا ہے۔



روسی آرٹ

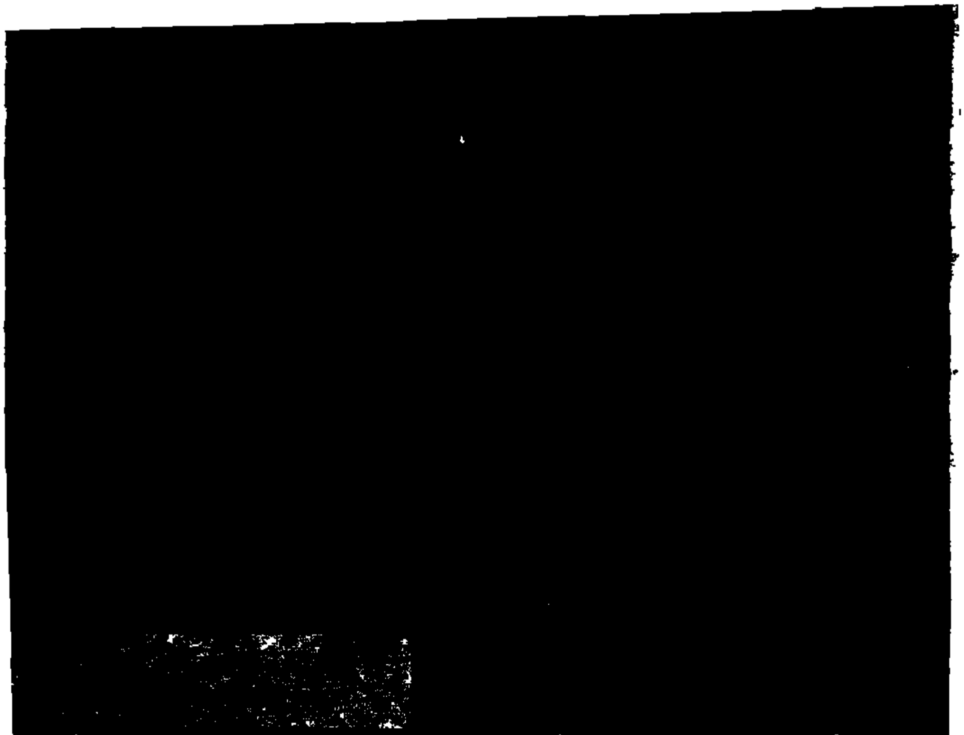
سائبیریا اپنی معدنیات اور صنعتی ترقی کیلئے مشہور ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہاں روسی فنون کے بھی کئی مرکز ہیں۔ مثلاً مغربی سائبیریا میں متعدد روسی فنکار رہتے ہیں اور یہاں فنون کی نمائشیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ اس صفحہ پر سائبیریا کے فنکاروں کے چند مرقع پیش کئے جاتے ہیں۔

مصور لقمان ایک تصویر بنا رہا ہے۔ ↓





مصور گرشوف کی بنائی ہوئی تصویر — ایک بوڑھا آدمی



نیا تجربہ

بام مچھلی جو برقی
روشنی پیدا کرسکتی ہے
اس تصویر میں اس مچھلی
کا وہ حصہ دکھایا جارہا
ہے جس میں برقی قوت
پنہاں ہوتی ہے۔

حال ہی میں کولمبیا یونیورسٹی اور نیویارک کی "زوولوجیکل سوسائٹی" کے ماہر سائنس دانوں نے بام مچھلی پر تجربات کرکے یہ اہم نتیجہ نکالا ہے کہ اسمیں برقی قوت بڑی کثیر مقدار میں موجود ہے۔ یہ تجربہ انسانی اعصاب کے متعلق بھی بہت اہم انکشافات کریگا۔



اس تجربہ گاہ میں ایک
بام [illegible] کے جسم کی
برقی قوت سے بجلی
کے چند بلب جلائے جا
رہے ہیں۔ (تصویریں
[illegible] لنفن بیورو
سے لی گئیں۔)

زراعت میں ریسرچ کا یہ بڑا ادارہ ۱۹۰۵ء میں بہار میں قائم ہوا تھا۔ ۱۹۳۴ء کے ہولناک زلزلہ کے بعد اسکو نئی دھلی میں لے آیا گیا۔ یہاں بہت سی تجربہ گاھیں اور بڑے بڑے فارم ھیں۔ اس ادارہ کی کئی شاخیں ھیں اور ہرشاخ میں علیحدہ علیحدہ کام ہوتا ھے۔ پودوں کی حفاظت' کیڑوں سے بچاؤ اور درختوں کی غذا کی بہم رسانی کے واسطے یہاں بڑی اہم دریافتیں ہوتی رہتی ھیں یہاں ماھرین زراعت کو اعلی تربیت بھی دی جاتی ھے۔ اس ادارے کی لائبریری اپنی نوعیت کی تمام ممالک مشرق میں واحد لائبریری ھے۔



"جراثیم کا کمرہ"۔ ان جراثیم سے پودوں میں مصنوعی طور پر بیماریاں پیدا کی جاسکتی ھیں۔



جوار باجرے کی ایک خاص بیماری کے اثرات کا معائنہ۔

(نیچے) مختلف کھادوں کا دھانوں پر کیا اثر ہوتا ھے!





کھاد کی حفاظت بڑی ضروری ھے۔ خاص سائنسی طریقہ سے ان کنستروں میں کھاد کو محفوظ کیا جارہا ھے۔



سک کے معمولی مرکب میں یہ ترکاریاں ۱۹۳۲ء
سے اشک ویسی کی ویسی ہی ہیں۔



اسٹی ٹیوٹ کے بعض تنومند مویشی جو بچے اور
دودھ دینے کے کام آتے ہیں۔



ریل کیمسٹ مسٹر دیسائی بعض پودوں کی نازک جڑیں
جمع کر رہے ہیں یہ بعض تجربات کے کام آتی ہیں۔

تماکو کے پودوں کی بیماری کا معائنہ ہو رہا ہے





پودوں کی بیماریوں کا مطالعہ. اس بیماری میں
گنے بالکل سوکھ جاتے ہیں۔

افغانستان نے موجودہ زمانہ میں بڑی ترقی کرلی ہے۔ کابل اور قندھار جدید وضع کے بڑے پر رونق شہر ہیں۔ قندھار افغانستان کا ایک بڑا تجارتی مرکز ہے۔ یہاں کئی بازار بہت بڑے اور پررونق ہیں۔ دور دور سے لوگ یہاں خرید و فروخت کیلئے آتے ہیں۔



قندھار میں باباولی کا مزار یہ ایک مقدس اور متبرک جگہ ہے۔

آج کا قندھار

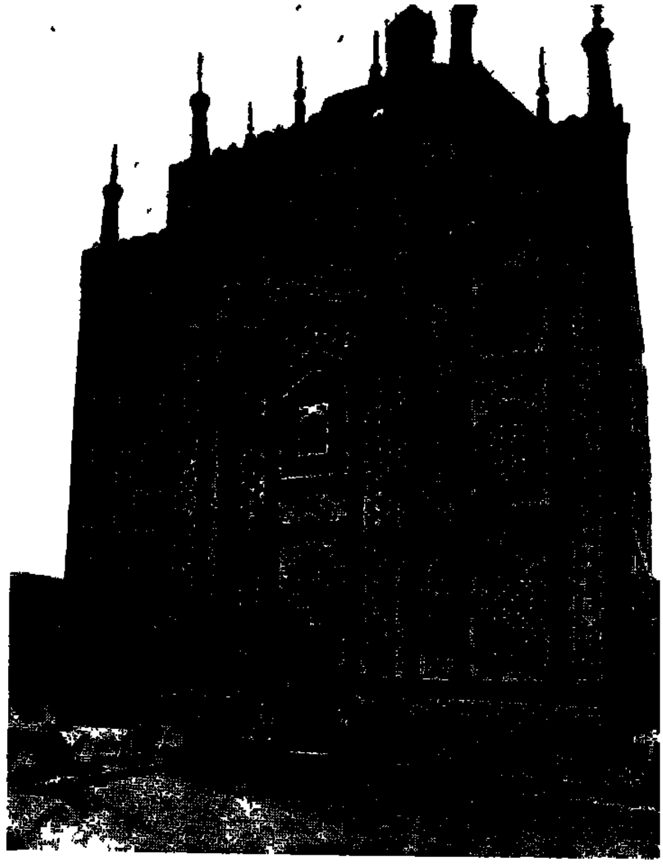


«کابل بازار»۔ یہاں بڑی رونق رہتی ہے۔ اسکی سڑک بہت چوڑی اور دوکانیں عالیشان ہیں۔

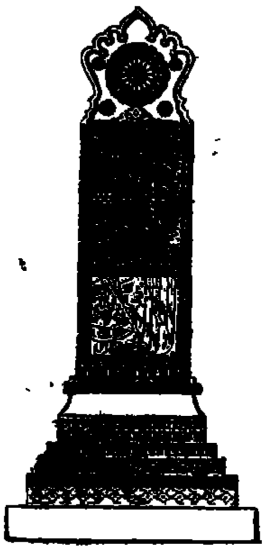


قندھار میں کئی بہت بڑے بڑے بازار ہیں جہاں بڑی چہل پہل اور ریل پیل رہتی ہے۔ انہی بازاروں میں ایک بازار شکار پور بازار ہے۔ قندھار کی یہ ایک بڑی منڈی ہے۔

شاہ خیر الدین اور شرفاخاں کے مقبرے



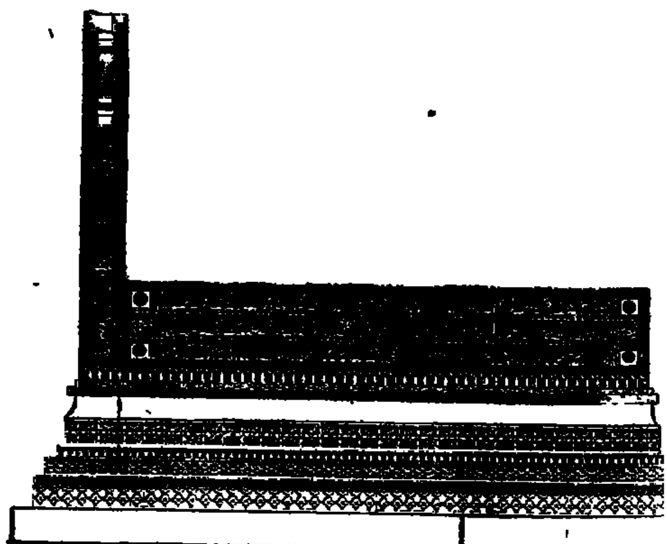
سکھر میں شاہ خیر الدین کا مقبرہ



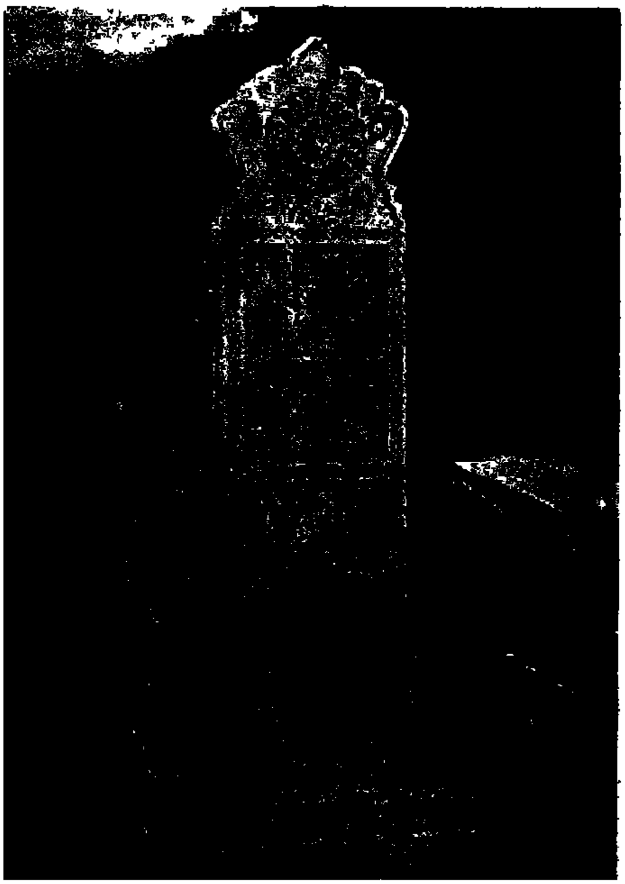
شرفاخاں کی قبر کی لوح
(پیچھے سے)



شرفاخاں کی قبر کی لو
(سامنے سے)



دیوان شرفاخاں کی قبر کا تعویذ



شرفاخاں کی قبر کا تعویذ اور لوح ←



ويرا

سید احتشام حسین

عبادت بریلوی

جو ہندوستان میں اردو ادب پر چھائے ہوئے ہیں ان میں صاف دانشمند نقادوں کے ساتھ ساتھ ایسے ادیبوں کی شمولیت بھی ہوئی ہے جن کی تحریروں میں پختگی، تخیل میں بلندی، دل میں کشادگی، نظر میں وسعت اور فکر میں گہرائی کے عناصر کی زیادتی موجود ہے۔ ایسے ادیبوں نے ہمارے ادب کو قریب قریب ہر شعبے کا ایک انقلاب کی لہر سے دوچار کر کے ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر دیا ہے۔ شاعری، افسانہ نگاری، تنقید، غرض یہ کہ ادب کی ہر شاخ ایک نئی دنیا میں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ادب میں ان تمام تبدیلیوں، ان تمام انقلابات اور ان تمام ترقیوں کا سہرا ظاہر ہے کہ ادیبوں ہی کے سر ہے۔ اور ادب کے ان نئے رجحانات کی عمارت ظاہر ہے انھیں کے سہارے کھڑی ہے۔

ایسے ہی ادیبوں میں سے ایک پروفیسر سید احتشام حسین بھی ہیں۔ جن کی ادبی زندگی کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے۔ ادبی دنیا میں قدم رکھے ہوئے انھیں آٹھ دس سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس قلیل سی مدت میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے اسی سے ان کے رنگ اور مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہم ان کی تحریروں کو پڑھ کر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی روح ایک بے چین روح ہے۔ ان کا دل ایک تڑپتا ہوا دل ہے۔ ان کا دماغ ایک روشن دماغ ہے۔ غرض یہ کہ ان میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک باشعور ترقی پسند ادیب میں ہونی چاہئیں۔ وہ سوچ سکتے ہیں۔ سمجھ سکتے ہیں۔ غور کر سکتے ہیں۔ تخیل کی پرواز کو آسمانوں سے پرے لے جا کر — وہ بہت دور ستاروں کے آگے بسنے والے جہانوں کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ ان کی نظر زمین کو چیرتی ہوئی، مختلف پردوں کو ہٹا کر تحت الثریٰ تک پہونچ سکتی ہے۔ وہ زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کے دل کی دھڑکنوں کا پوری طرح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ صرف ادب کو اپنا موضوع نہیں بناتے بلکہ ادب کے توسط سے زندگی پر ایک گہری نظر ڈالتے ہیں۔ یا زندگی کے راستے سے گزر کر ادب کی منزل تک پہونچتے ہیں جو کچھ بھی ہو۔ لیکن بہرحال یہ دونوں چیزیں ان کے یہاں لازم و ملزوم ہیں کہ اصل میں جب تک یہ ایک دوسرے سے شیر و شکر نہ ہوں ان میں سے کسی ایک کی بھی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں زندگی سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے خود ایک زندگی پائی جاتی ہے۔

ان خصوصیات کی حامل ہیں احتشام صاحب کی تحریریں جنہوں نے ۱۹۱۲ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ماہل کی سرزمین پر سیدوں کے ایک پرانے خاندان میں آنکھ کھولی۔ بچپن میں پرانے طریقے پر عربی فارسی پڑھنی شروع کی لیکن کچھ عرصے کے بعد ان کے گھر والوں نے انھیں انگریزی پڑھانا مناسب سمجھا چنانچہ اعظم گڑھ میں سکول کی تعلیم حاصل کی۔ جہاں سے وہ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے الہ آباد چلے گئے۔ الہ آباد سے انھوں نے بی اے اور ایم اے کے امتحانات اول درجے میں پاس کئے جس کے بعد وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو ادبیات کے لکچرر مقرر ہوئے۔ بس یہ وہ آج کل وہیں ہیں۔

لیکن ان واقعات سے کہیں زیادہ دلچسپ ان کی ادبی زندگی کی نشوونما کی کہانی ہے۔ انھوں نے شرفا کے ایک قدیم گھرانے میں آنکھ کھولی اس میں جو علمی شاعری کے چرچے ہر وقت ہوتے رہتے تھے ان کے کانوں میں پڑتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس ماحول میں ادب اور شاعری سے ان کے آس پاس کے لوگ دلچسپی لیتے تھے وہ ایک خاص قسم کا تھا جس میں قدیم روایاتی رنگ تھا۔ ماحول اور روایات کے ان اثرات نے احتشام صاحب کے اندر ادبی ذوق کی ایک شمع روشن کر دی۔ بچپن ہی میں ادب اور شاعری سے وہ دلچسپی لینے لگے لیکن چونکہ وہ ذہین تھے اس لئے ان کی ایک انفرادیت تھی۔ اس لئے وہ اپنے ماحول کے ساتھ نہیں بہے بلکہ اپنی ذہانت کی بدولت حلقہ بگوشی اختیار نہیں کی بلکہ ان کی ذہانت نے ماحول اور روایات اور اپنے آس پاس کی چیزوں کو ایک تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ انھیں اس کی بہت سی خامیاں نظر آئیں۔ اپنے ماحول میں سب سے زیادہ جس چیز نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کی وہ اس کی آفاقی کیفیت تھی۔ جس کو انھوں نے پسند نہیں کیا۔ ایک خاص ماحول میں رہ کر اس کے متعلق اس قسم کے خیالات کا قائم کرنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے اندر تنقیدی صلاحیتیں فطری طور پر موجود تھیں جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئیں۔ بہرحال شروع ہی سے وہ چیزوں کے متعلق دیکھنے بھالنے سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کے عادی ہو گئے اور جب ان کے علم میں اضافہ ہوا تو یہ تنقیدی شعور پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا۔ اس پر زمانے کے رجحان نے جلا دی۔

الہ آباد کے قیام کے زمانے میں احتشام صاحب نے بہت کافی لکھا اور ادب کے ہر شعبے کی طرف توجہ کی۔ شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید۔ غرضیکہ کوئی شعبہ بھی ان سے نہ بچ سکا۔ نظمیں، افسانے انھوں نے لکھے لیکن جو کچھ لکھے ان میں زندگی نظر آتی ہے۔ ان میں سماج کے بہت سے اہم اور ضروری مسائل کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ جذبات اور خواہشوں کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ انسانوں کی کاوش، الجھنوں اور پریشانیوں کا ذکر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فنی اور جمالیاتی خوبیاں بھی پیدا کی جاتی ہیں۔ ان کی شروع کی زیادہ تر نظمیں رومانی ہیں لیکن ان میں زندگی کا دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستانی نوجوانوں کے جذبات و احساسات کو ان میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں میں رومان کے یہ نقوش مدھم پڑتے جاتے ہیں اور حقیقت کا رنگ غالب آتا جاتا ہے۔ یہاں ان کے

ملاحظہ — یہ مختصر سا مضمون احتشام صاحب کے تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی ادبی کارگزاریوں کا تفصیلی جائزہ اس میں ممکن نہیں۔ عبادت ---

میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اب یہ انسانیت کی زبوں حالی اور بے کسی کا نقشہ کھینچتے ہیں اور زندگی کے ان تاریک پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں جن کا شکار آج سارے انسانیت ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے بیانات کے ساتھ ساتھ روشنی کی ایک کرن کسی نہ کسی طرح ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ یہ تمام خصوصیات "نظام کہنہ" "بیماری کی خبر" "ریشمی مسافر" اور "قصبے کے دھندلکے میں" بڑے طور پر نمایاں ہیں۔ افسانوں میں بھی کم و بیش یہی خصوصیات موجود ہیں۔ ان سب میں بھی زندگی کے بنیادی مسائل کو نفسیات سے ہم آہنگ کر کے دلکش پیرایے میں پیش کیا گیا ہے اور کہیں سماجی بدحالیوں کو موضوع بنا کر تاریخ زندگی کی تصویریں سامنے لائی گئی ہیں جو حقیقت اور جمالیاتی رنگ سے مزین ہیں لیکن ان سب سے زیادہ اہم ان کی تنقید ہے کیونکہ انہوں نے اس طرف سب سے زیادہ مستقل اور پر زور توجہ کی ہے۔

تنقید ان کا خاص میدان ہے اور انھوں نے تنقید کے متعلق سب سے زیادہ لکھا بھی ہے۔ وہ اپنے آپ کو تنقید ہی سے وابستہ بھی کرتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ پہلے تنقید نگار ہیں اور اس کے بعد کچھ اور! ان کے اندر ایک تنقیدی شعور بچپن ہی سے پیدا ہو چلا تھا جیسے جیسے وقت کے ساتھ ساتھ اس پر جلا ہوتی گئی اس کا بیان کہیں اور ہو چکا ہے۔ یہ تنقیدی شعور نہ صرف ان کی تنقیدوں میں کام کرتا ہوا نظر آتا ہے بلکہ ان کی تخلیقی کوششوں میں بھی اس کے اثرات پوری طرح نمایاں ہیں چنانچہ تنقید کے ساتھ ساتھ ان کے افسانے اور نظمیں بھی گہری سوچ اور تفکر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں جن کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ احتشام صاحب نے ان میں سموئے ہوئے موضوعات کو ایک تنقیدی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔ جب وہ تنقید لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کا یہ تنقیدی شعور پوری طرح کام کرتا ہے جس کے نتیجے میں ان کی تنقید صحیح معنوں میں تنقید بن جاتی ہے اور چونکہ وہ اپنے ان تنقیدی خیالات و نظریات کو نہایت غور و فکر اور سوجھ بوجھ کے بعد پیش کرتے ہیں اس لئے ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

احتشام صاحب کی تنقید تخلیقی تنقید ہے۔ بات یہ ہے کہ صرف برائیاں گنانا ان کے نزدیک تنقید نہیں ہے، وہ تنقید کو ان معمولی اور ادنیٰ باتوں سے بہت بلند سمجھتے ہیں جن پر عموماً بہت کچھ لکھتے ہیں اس سے ان کو پوری چڑ ہوتی ہے۔ کسی تخلیق پر تنقید کرتے وقت وہ اس خیال کو ایک لمحے کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے کہ اس تنقید پر ان کے خیالات بذات خود کسی اہمیت کے مالک ہوں یعنی وہ کچھ ایسی ہی نئے کی باتیں بتائیں کہیں ایسی گہرائی میں پہنچ کر معانی کے کچھ ایسے موتی نکالیں جہاں دوسرے کے ذہن کا پہنچنا مشکل ہو جائے۔ کہیں ایسی فضاؤں میں آسمانوں پر پرواز کریں جہاں کسی دوسرے کے تخیل کی پرواز نہ پہونچ سکے کہیں دور کسی ایسی دنیا میں پہنچ کر نئی نئی باتوں سے نئے خیالات و نظریات کے لئے تمہیدیں تراشیں جو جتنک کسی کی بھی رسائی ممکن نہ ہو۔ اپنی تنقیدوں میں انہیں نئے نئے خیالات و نظریات کو پیدا کرنے کا ایک شعوری احساس ان کی تنقیدی تحریروں کو تخلیقی رنگ دے دیتا ہے۔ چنانچہ اسی شعوری احساس کے پیش نظر وہ مجبور ہو جاتے ہیں زیادہ سے زیادہ گہرائی میں جانے کے لئے! اور وہ جاتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی تنقیدی تحریریں اکثر اصولوں کی بحث کا مرکز بن جاتی ہیں یہی ان کے تنقیدی نظریات کی تخلیق ہے۔ جن کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نہ تو وہ تنقیص کو تنقید سمجھتے اور نہ تعریف کرنے کو بلکہ ان کو تو یہ خیال رہتا ہے کہ ان کے تنقیدی خیالات و نظریات علوم میں اضافہ کریں ان خیالات میں تازگی اور جدت کا ہونا ضروری ہے تاکہ عوام اور خواص دونوں پر اثر کریں۔ اور ان کو منزل تک پہنچنے میں آسانی ہو جائے۔ ان کے خیالات میں سوچ اور تفکر کے عناصر کی فراوانی ہوتی ہے کیونکہ وہ غور و فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان میں جذباتیت کا پتہ نہیں چلتا بلکہ عقل و فہم اور شعور و ادراک کو دخل ہوتا ہے اور وہ ان سب کو پیش اس طرح کرتے ہیں، ان کا انداز بیان ایسا ہوتا ہے جس سے دل ان کی طرف کھنچتے ہیں۔ ان کی تنقید کی یہ تمام خصوصیات اس کو تخلیق کا رنگ دے دیتی ہیں اور ان کی تنقید کو تخلیقی تنقید کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

اپنی تنقید میں ان تمام خصوصیات کو پیدا کرنے کے لئے ان کو اردو تنقید کی روایت سے بغاوت بھی کرنی پڑی ہے اور اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ہماری تنقید نگاری میں ان کا مرتبہ ایک باغی کا مرتبہ ہے۔ انھوں نے اردو کی اس تنقیدی روایت کو توڑا جس کی بنیادیں سائنٹفک اصولوں پر قائم نہیں تھیں۔ یوں تو احتشام صاحب سے قبل بھی اردو تنقید میں روایتوں کے خلاف بغاوتیں ہو چکی تھیں جو اپنی اپنی جگہ پر بہت اہم ہیں لیکن یہ بغاوت جو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم اختر رائے پوری، مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین وغیرہ نے کی وہ ان سب بغاوتوں سے زیادہ اہمیت کی مالک ہے۔ حالی اور شبلی بھی اپنے اپنے وقت کے باغی تھے۔ ان کے خیالات نے اردو کے فرسودہ نظریات تنقید کو جڑ سے اکھاڑ دیا جو صرف الفاظ، زبان، روزمرہ و محاورہ اور عروض و قوافی کے مباحث کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان دونوں نے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔ صرف ہیئت کی اہمیت ہی کو انھوں نے محسوس نہیں کیا بلکہ مواد کی طرف بھی توجہ کی اور اس طرح شعر و ادب کے جانچنے کے اصول منضبط کئے۔ یہ دونوں نقاد مغرب سے براہ راست متاثر نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے عربی تنقید کے زیر اثر اپنے نظریات اور اصولوں کی تشکیل کی۔ مغرب کے جو کچھ تھوڑے بہت اثرات ان کے یہاں ملتے ہیں وہ عربی ہی کے توسط سے ان تک پہنچے ہیں لیکن ان کی بغاوت نے بہت سی نئی راہیں ضرور تعمیر کر دیں۔ مغربیت نے ہمارے سارے ادب پر چھانا شروع کر دیا۔ چنانچہ

ان کے بعد ادبی تنقید میں ایک اور روائیت کی بنیاد پڑی جس میں رومانیت کو زیادہ دخل ہے۔ ویسے بھی اس دور کے ادب کا رجحان مجموعی اعتبار سے رومانیت ہی کی طرف رہا۔ اسی وجہ سے تنقید میں بھی یہی اثرات آگئے اور عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتحپوری، حامداللہ افسر، لطیف الدین اور کسی حد تک فراق اور مجنوں بھی اس قسم کی تنقید کے علمبرداروں میں نظر آئے۔ فراق اور مجنوں نے آگے چل کر اپنا راستہ بدل دیا۔ انھوں نے اس رومانی اور خیالی تنقید کو چھوڑ دیا جس میں جذباتیت زیادہ تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ رومانیت ہمیشہ ہمیشہ چلنے والی نہیں تھی، کیونکہ خود حالات تبدیل ہو رہے تھے۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر خود فراق اور مجنوں نے بغاوت کی جس میں مجنوں تو پوری طرح ترقی پسند ہو گئے لیکن فراق تنقید کے ذوقی اور وجدانی ہونے کے قائل رہے کیونکہ باوجود ترقی پسند تحریک سے ہمدردی رکھنے کے ان کی جذباتیت اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس بغاوت نے کئی اور نئے نقادوں کو پیدا کیا جس میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم، اختر رائے پوری اور خود احتشام صاحب بھی شامل تھے اور انھوں نے چونکہ تنقید کی طرف ان میں سب سے زیادہ توجہ کی اس لئے وہ اس بغاوت میں سب سے پیش پیش نظر آئے۔

احتشام صاحب کے خیال کے مطابق تنقید بڑی اہمیت کی مالک ہے۔ وہ اس کو ترقی پسند دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ترقی پسند تنقید ہی اصل تنقید ہے کیونکہ اس کی بنیادیں سائنٹفک اصولوں پر قائم ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "ترقی پسند نقاد کا معیار نقد بالکل دوسرے تصورات لئے ہوتا ہے جس میں اچھے برے، عمدہ، نفیس، خراب اور اس قسم کے سطحی لفظوں سے نقد نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس کے جانچنے، پرکھنے اور دیکھنے کے آلے بالکل جداگانہ ہوتے ہیں۔ وہ عام طور سے کتاب کی اچھائی یا برائی پر صرف انداز بیان یا طرز تحریر کو دیکھ کر رائے نہیں دیتا بلکہ کتاب کے سمجھنے، اس کے مفاہیم کا تجزیہ کرنے اس کے اندرونی رجحانات کو واضح کرنے اور اسے انسانی زندگی کے افعال و کردار سے مطابق کر کے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ چونکہ اس کے سامنے یہ تصور نہیں ہے کہ ادیب کوئی مافوق الفطرت شخصیت رکھتا ہے۔ اس کی تحریریں الہام کی شان ہوتی ہے۔ اس لئے وہ فوراً یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ کتاب جو اپنے عہد کی یا جس عہد کا تذکرہ کرتی ہے، اس عہد کی پوری ترجمانی نہیں کرتی، اس نے اپنا ہر کام ہی پورا نہیں کیا جس کی اس سے توقع تھی۔" اسی خیال کے پیش نظر وہ اپنی تنقید میں صرف اچھائی اور برائی کا ذکر نہیں کرتے۔ نہ تنقیدی نعروں اور فقروں کو دہراتے ہیں، بلکہ جو تخلیق جس عہد کی پیداوار ہوتی ہے اس کے پس منظر میں اسکا جائزہ لیتے ہیں۔ ادیب کے اوپر ماحول کے جو اثرات پڑے ہیں ان کا تجزیہ کرتے ہیں اور پھر اس کے متعلق کوئی رائے دیتے ہیں۔ تنقید میں وہ ذوقی اور وجدانی کو رہنما نہیں بناتے بلکہ ایک حکیمانہ شعور کے سہارے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور حکیمانہ شعور ان کو مجبور کرتا ہے کہ ادبی تخلیق کو مختلف علوم کی روشنی میں دیکھ کر اس کے متعلق کوئی رائے قائم کریں یہی وجوہات ہیں کہ ان کے اس قسم کے تجزیوں میں بڑی فلسفیانہ گہرائی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کا ہر تنقیدی خیال و نظریہ معقولیت پسندانہ ہوتا ہے۔

یہ خیالات رکھنے والا نقاد، ظاہر ہے کہ ادب کے مابعد الطبیعاتی، الہامی اور روحانی ہونے کا قائل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ ادب کو گرد و پیش کے خارجی حالات اور مادی تغیرات کا مظہر خیال کرے۔ چنانچہ احتشام صاحب اسی طرح پر سوچتے ہیں۔ وہ ادب برائے ادب کے نظریئے کے قائل نہیں بلکہ ادب کو ایک سماجی فعل سمجھتے ہیں جس میں افادیت کا ہونا لازمی ہے۔ ادب اجتماعی اور سماجی ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور اجتماعی اور سماجی ماحول ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتا اس لئے ادب میں تغیرات ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ بہرحال اجتماعی اور سماجی مسائل کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ اس لئے ادب میں افادیت اور مقصدیت کے رنگ بھی دیتے رہتے ہیں۔ احتشام صاحب کہتے ہیں کہ "کوئی تحریک جو تہذیب و تمدن کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے ریاست دانوں اور مدبروں کی زبان سے نکلتی ہے وہ شاعروں کے ہاتھوں میں پہنچ کر ادبی حقیقت بن جاتی ہے۔" اس لئے ادب کو سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشی تغیرات و انقلابات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسکو ان سب کا ساتھ دینا چاہئے اور پوری طرح ترجمانی کرنی چاہئے اور ان سب کو کسی صحیح راستے پر لگانا بھی اسکا فرض ہے۔ کیونکہ سماج کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے مسائل ادیب کے بھی مسائل ہوتے اور وہ ان سے کسی حال میں بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا، کیونکہ انھیں اجتماعی مسائل کے سلجھنے میں اس کے انفرادی مسائل کے سلجھنے کا راز مضمر ہے۔ چنانچہ سماج کے ایک معقول فرد کی حیثیت سے ادیب کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ تمام مسائل کو اپنا موضوع بنا کر کوئی ایسا پیغام دے جو اجتماعی طور پر سماج کے تمام افراد کے لئے مفید ثابت ہو۔ احتشام صاحب کے خیال کے مطابق "ادیب اور شاعر کا کام یہیں ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے جو کچھ دیکھتا ہے وہی لکھ دے۔ بلکہ وہ جس طرح محسوس کرتا ہے کہ ایسا ہونا چاہئے اسکا اظہار بھی کر دے۔ پڑھے لکھے ہوشیار اور معمولی ادیب میں یہی فرق ہوتا ہے کہ اول الذکر زندگی کی نئی تخلیق کے پہلو پر بھی روشنی ڈال سکتا ہے۔ بہتر زندگی بسر کرنے کے اصول بھی بنا سکتا ہے۔ ظلم و جور کے خلاف آواز بھی بلند کر سکتا ہے۔ ناانصافی اور بے اعتدالی پر احتجاج بھی کر سکتا ہے۔ نظامی اور اقتصادی تاراجی جنگ اور منافرت کے خلاف علم بغاوت بھی بلند کر سکتا ہے۔" یہ ہے ان کے خیال کے متعلق ادب اور ادیب کا آدرش! (باقی صفحہ ۵۵ پر)

برطانیہ میں تیمارداری کا پیشہ

کدار ناتھ بسین

لڑائی کا زمانہ ہو یا امن کا، حفظان صحت، تیمارداری اور دایہ گری کے کام ہر ملک و قوم کے لئے سب سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ زچہ خانوں میں پیدائش کے وقت سے بھی پہلے سے لے کر سن بلوغ تک ہر شہری کے واسطے اس کی صحت کی حفاظت لازمی ہے بلکہ اس کی ضرورت بعد میں بھی اور بڑھاپے کے زمانہ میں بھی باقی رہتی ہے۔ تیمارداری کا کام ایک زمانہ میں سب سے زیادہ کٹھن سمجھا جاتا تھا اور اس کی طرف بہت ہی کم توجہ دی جاتی تھی لیکن فی زمانہ یہ کام انگلستان میں بہت موقر سمجھا جانے لگا ہے اور اس پیشہ کو مستند مان لیا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء اور سنہ ۱۹۳۶ء کے قوانین دایہ گری کی رو سے بغیر سند حاصل کئے ہوئے کسی کا اپنے تئیں دایہ کہنا خلاف قانون قرار دیدیا گیا ہے اور خلاف ورزی پر بسزائے قید یا سزائے جرمانہ ہو سکتی ہے۔

لڑائی سے پہلے سے اور جنگ کے دوران میں صحت عامہ کے شعبہ کو بڑی ترقی ہو گئی ہے۔ حال میں بعض مخصوص امراض مثلاً دق اور خلل دماغ کے معالجوں میں جو ترقی ہوئی ہے اس نے نرسوں پر بڑی بھاری ذمہ داری کا بوجھ ڈال دیا ہے اور ان کو بڑا ہوشیار ہونے کی ضرورت ہو گئی ہے۔ طبی دنیا میں ترقی کے ہر قدم کے ساتھ ساتھ نرسوں کو بھی اپنی استعداد بڑھانا لازمی ہو گیا ہے۔ ایک مکمل طور پر سند یافتہ سرکاری نرس کی ٹریننگ کا زمانہ اسی لئے طویل ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں جنگ سے پہلے جو اقدامات کئے گئے تھے دوران جنگ میں ان کو استوار تر کر دیا گیا جن کی بدولت نرسوں اور دائیوں کو وہ درجہ اور مالی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جس کی وہ مستحق تھیں۔ گذشتہ جنگ کے زمانہ میں انگلستان اور ویلز میں تقریباً ترانوے ہزار نرسیں تھیں (امراض دماغی کے شفاخانوں وغیرہ کی نرسیں اس تعداد میں شامل نہیں ہیں) اور اسکاٹستان میں تقریباً سولہ ہزار۔

دایہ گری کے پیشہ کو سنہ ۱۹۱۹ء سے قانونی حیثیت حاصل تھی۔ پھر نرسز رجسٹریشن ایکٹس کی رو سے انگلستان، ویلز اور اسکاٹستان میں ممتحن ادارے (جنرل نرسنگ کونسلز) قائم ہوئے جن کے پاس نرسوں کا رجسٹر رہتا ہے۔ ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد مقررہ امتحان دے کر اس رجسٹر کے عام حصہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس حصہ کے علاوہ پانچ اور اضافی حصے بھی ہیں۔ (۱) بیمار بچوں کی نرسیں (۲) بخار کی نرسیں (۳) مردوں کی نرسیں (۴) دماغی مریضوں کی نرسیں (۵) پاگلوں کی نرسیں۔ ہر قسم کی ٹریننگ کے لئے ابتدائی امتحان یکساں ہوتا ہے۔ اگر کوئی نرس جو ایک قسم کی ٹریننگ حاصل کر چکی ہے کسی دوسری قسم کی ٹریننگ پانا چاہتی ہے تو اس دوسری ٹریننگ کی مدت میں ایک سال کی تخفیف کر دی جاتی ہے۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں ایک کمیٹی نے لارڈ ایتھلون کی صدارت میں اس بات پر غور کیا کہ وہ کیا حالات و شرائط ہیں جن کی وجہ سے اس پیشہ میں مناسب عورتوں کے لئے جاذبیت پیدا ہو اور نرسیں ضروری تعداد میں ہر وقت موجود رہیں۔ اگلا قدم سنہ ۱۹۴۱ء میں اٹھایا گیا۔ اس سال لارڈ رشکلف کی صدارت میں ایک کمیٹی تنخواہوں کے بارے میں سفارش کرنے کے واسطے مقرر ہوئی۔ اس کمیٹی میں پیشہ ور اداروں کی، نرسوں، ٹریڈ یونین کانگرس، مقامی حکام اور شفاخانوں کی مختلف مجالس کے نمائندے شریک تھے۔ شفاخانوں کی نرسوں کی تنخواہوں کی پہلی رپورٹ فروری سنہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ اس رپورٹ میں مختصراً پہلے سے بہتر تنخواہوں کی سفارش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ ایک ہفتہ واڑے میں چھیانوے گھنٹہ کی ڈیوٹی، رخصت کی مدت مناسب، غیر معمولی تعلیمی قابلیت کی بنا پر تنخواہ زیادہ اور بیماری کی رخصت کے زمانہ میں پوری تنخواہ ہو۔ وزیر صحت عامہ نے ان سفارشات کو منظور کر لیا۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں پارلیمنٹ نے "نرسز ایکٹ" پاس کیا۔ اس کی رو سے اسسٹنٹ نرس کا درجہ بڑھا دیا گیا، نرسیں مہیا کرنے والے اداروں (نرسز کو آپریشنز) کو معائنوں وغیرہ کے ذریعہ منظم کیا گیا۔ اور نرس کا خطاب صرف انھیں کے لئے مخصوص کر دیا گیا جن کے پاس نرسنگ کوالیفیکیشن موجود ہو۔ اس قانون کی رو سے عوام نالائق اور جاہل نرسوں سے محفوظ ہو گئے اور ان عورات کا بھی تحفظ ہو گیا جو نرسنگ کا کام شروع کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر پورے طور پر ٹریننگ حاصل نہ کر سکی تھیں۔

نرسوں کی ٹریننگ بھی اتنی ہی کٹھن ہے جتنی ڈاکٹروں، انجنیروں یا اور قسم کے فن کاروں اور صناعوں کی۔ ٹریننگ کی مدت تین سال ہوتی ہے اور داخلہ کی عمر اٹھارہ اور تیس سال کے درمیان ہوتی ہے۔ اچھی صحت اور کام چلانے کے قابل تعلیم اور دوسری اہم ضروریات میں سے ہیں۔ پہلے سال نرس بہ حیثیت ایک چھوٹے درجہ کی طالبہ کے شفاخانوں کے "وارڈس" میں دن کی اور رات کی ڈیوٹی پر رہتی ہے۔ اس زمانہ میں اس کو بچھونا بچھانا، مریضوں کو بہلانا، اور ان کے ہاتھ پاؤں کو دھلانا،

کھلا دینا، معذور بیماروں کو کھانا خود کھلانا، طبی معائنہ کے لئے مختلف جسمانی حالتوں کو اختیار کرنا، اور مریضوں کو عمل جراحی کے کمرے، خاص خاص کلینکس اور ایکسرے کے شعبہ جات میں لے جانا سکھایا جاتا ہے۔ وہ پرانی نرسوں کی بھی مدد کرتی ہے اور اسے دکھایا جاتا ہے کہ مختلف آلات کو کیسے تیار کرتے ہیں۔

ٹریننگ کے دوسرے اور تیسرے سال مردانہ اور زنانہ طبی (میڈیکل) خصوصی (اسپیشل) اور جراحی کے (سرجیکل) وارڈس میں گزرتے ہیں۔ تیمارداری کے زیادہ مشکل کاموں پر جن میں زیادہ ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے لکچر ہوتے ہیں۔ مثلاً ایسے مریضوں کی دیکھ بھال جن کو آپریشن کی ضرورت ہوتی ہے دواؤں، ان کی خوراک کے تعین اور جسم پر ان کے اثرات کا مطالعہ، ناک، کان اور گلے کی بیماریاں، عورتوں کے مخصوص امراض اور غذاؤں کی تاثیر، یہ سب باتیں بذریعہ لکچروں کے بتائی جاتی ہیں۔

آخری امتحان تین سال کی ٹریننگ کے اختتام پر ہوتا ہے۔ امتحان تحریری بھی ہوتا ہے اور عملی بھی۔ تحریری امتحان میں پرچے عام نرسنگ دواؤں کے استعمال اور جراحی اور صنفی امراض پر ہوتے ہیں اور عملی امتحان نرسنگ کے اصلی طریقوں میں لیا جاتا ہے۔ یہ ٹریننگ کسی ایسے ہسپتال میں ہونا چاہئے جس کو سرکاری طور پر ٹریننگ اسکول کی حیثیت حاصل ہو۔ علمی ٹریننگ (لکچروں کے کمروں میں) اور عملی ٹریننگ (ہسپتال کے کمروں میں) بالعموم ساتھ ساتھ چلتی ہیں لیکن بہت سی جگہ ٹریننگ کے پہلے تین ماہ وارڈس سے بالکل الگ تھلگ گزرتے ہیں جس عورت کو سرکاری سند مل جاتی ہے وہ اگر خواہاں ہو تو مزید تعلیم پاکر یونیورسٹی سے نرسنگ کا ڈپلوما حاصل کر سکتی ہے۔ لندن اور لیڈس دونوں یونیورسٹیاں ایسے ڈپلومے دیتی ہیں۔ جو نرسنگ کی ٹریننگ لینا چاہیں۔ ان کی امداد کے لئے ٹریننگ کے زمانہ میں معقول رقم کے وظائف دئے جاتے ہیں۔

نرسنگ سروس میں داخل ہونے والیاں سب سے پہلے جو باتیں معلوم کرنا چاہتی ہیں وہ یہ ہیں کہ کس کس قسم کے کام کرنا ہوں گے کب کب فرصت مل سکے گی اور یہ کہ کیا ہر ہسپتال کا معیار یکساں ہی ہوتا ہے؟

اسی بنا پر وزارت صحت عامہ نے اس کے لئے ایک ضابطہ وضع کر دیا ہے جس پر شفاخانوں، نرسوں کی مجالس اور دوسرے متعلقہ اداروں کو پورا اتفاق رائے ہے۔ اس ضابطہ کی رو سے تمام وہ ہسپتال جہاں ٹریننگ کا انتظام ہے بہترین طریقہ تعلیم پر عمل درآمد کریں گے۔ جو نرسیں ٹریننگ پائیں گی ان کو طالبات ہی سمجھا جائے گا۔ ٹریننگ کا کورس اس کا لحاظ رکھتے ہوئے مرتب کیا جائے گا کہ نرسوں کو اس کے پڑھنے کا کافی وقت میسر ہے اور یہ کہ امتحان کا جو معیار رکھا گیا ہے وہ اس پر پوری اترنے کی اہل ہیں۔ عملی کام سیکھتے ہوئے ہسپتال کے اندر اور باہر ان کی تفریح کا بھی خیال اور انتظام رکھا جائیگا۔

ٹریننگ کے اسکولوں میں ابتدائی درجے ہونگے جہاں ٹریننگ پانے کی خواہاں نرسوں اور اسسٹنٹ نرسوں کو ہسپتال کے کمروں میں داخلہ سے قبل کی ٹریننگ دی جائے گی۔ لکچروں کا وقت متعین کرتے ہوئے پڑھانے والے عملہ اور خود ہسپتال کے ڈاکٹروں کا تعاون حاصل کیا جائیگا تاکہ نہ ڈیوٹی میں خلل پڑے نہ فرصت کے اوقات میں۔ تمام ٹریننگ اسکولوں میں چھٹیوں میں اور پرائیویٹ پڑھائی کا معقول انتظام کیا جائے گا۔

ہر نرس کو ایک پندرہ واڑے میں چھیانوے گھنٹے کی ڈیوٹی دینی ہوتی ہے خواہ وہ دن کی ہو خواہ رات کی۔ تمام نرسوں کو ہفتہ میں کم از کم ایک پورے دن کی چھٹی ضرور ملا کرے گی اسکے علاوہ گاہ گاہ اور بھی رخصت مل سکا کرے گی۔ جو نرسیں رات کی ڈیوٹی پر ہوا کریں گی ان کو آدھی رات کو آرام اور کچھ کھانے پینے کے لئے وقفہ ملا کرے گا۔ بیماری کی چھٹی کے علاوہ ہر نرس کو سال میں چار ہفتہ کی چھٹی پوری تنخواہ پر مل سکے گی۔

ہر ہسپتال میں نرسوں کی تندرستی کا خیال رکھنے کے لئے پورا پورا انتظام ہوگا اور اس کام کے واسطے ایک تجربہ کار ڈاکٹر مقرر ہوگا۔ داخلہ کے وقت ہر نرس کا طبی معائنہ ہوتا ہے اور آئندہ بھی وقت ضرورت اکثر ہوتا رہتا ہے۔ جو نرسیں چھوت کی بیماریوں کے سلسلہ میں متعین ہوتی ہیں ان کے معمولی ششماہی امتحانات کے ساتھ ساتھ اور بھی امتحان ہوتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

حیات جاوید — غلام ربانی تاباں

ایک دن تاریخ کی ظلمت میں کھو جاؤں گا میں
زندگی کی راہ میں پامال ہو جاؤں گا میں

یہ شفق آلودشامیں نرم و نازک سی فضا
ڈھل گئی رعنائی فطرت مرے اشعار میں
گا چکا ہوں کتنے رنگیں گیت ساز عشق پر
پڑھ چکا کتنے قصیدے حسن کی سرکار میں
اہل گلشن سے کہا افسانۂ برق و شرار
قصۂ مفلس سنایا محفل زردار میں
دی بشارت صبح کی ظلمت زدہ انسان کو
قلب عصر نو کی دھڑکن ہے مرے افکار میں
محرم اسرار فطرت ہے مری فکر رسا
بارہا پہنچا سواد ثابت و سیار میں

میرے مرنے پر مرے اشعار مر سکتے نہیں
میری تصنیفیں مرے افکار مر سکتے نہیں

ٹوٹ گئے شبنم کے موتی

افسانہ

اختر جہاں بیگم

پہلے دن تو کیشو کو شہر کی ہنگامی فضا ایک نئی دنیا معلوم ہوئی۔ سڑکوں پر پھسلتی ہوئی کاریں۔ رینگتی ہوئی بسیں۔ لاریاں۔ دمکیلے چہرے۔ لہراتے ہوئے ریشمی آنچل۔ ہر طرف گھما گھمی۔ جس چیز پر نظر پڑ جاتی اسے ہٹانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ یوں تو کیشو کو پہلے بھی کئی بار شہر آنے کا اتفاق ہوا لیکن محض چند گھنٹوں کے لئے۔ وہ ہر مرتبہ اپنے ساتھ کچھ اچٹتے ہوئے نظارے لے کر چلا جاتا جو گاؤں کی میلی کچیلی سادگیوں میں مدغم ہو کر رہ جاتے۔ اور شہر دیکھنے کی آرزو اس کے دل میں ہر بار نیا جنم لیتی تھی۔ شہر کی فضاؤں پر بھی کیشو کو ہر دفعہ ایک تازہ بہار نظر آتی۔ تانگوں کی چیت اور سرپٹ رفتار دیکھ کر اس کے ذہن میں گاؤں کی بیل گاڑی ہچکولے کھانے لگتی۔ کشادہ مکانوں کی بلندی اسے گاؤں کے کچے گھروندے سے مکانوں کی یاد دلاتی جن کے سامنے اکثر میلے کچیلے سوکھے سہمے بچوں کے گروہ ناچتے نظر آتے تھے۔ خوش پوش فیشن ایبل لڑکیوں کی شوخیاں دیکھ کر وہ دل ہی دل میں گاؤں کی ان سادہ لوح اور شرمیلی لڑکیوں پر مسکرا دیتا جو دیہاتی ملبوس میں سمٹی سمٹائی اسے اکثر پنگھٹ کی راہ پر ملتی تھیں اور کبھی گوبر اٹھاتی ہوئی۔ کیشو نے جھرجھری لی۔ گاؤں کے تخیلی ماحول پر گوبر کی بدبو چھا گئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے لبوں پر ایک نامعلوم عرصے تک شہر رہنے کا خیال مسکراہٹ بن کر پھیل گیا۔

کیشو کو "بابو جی" کے مکان سے زیادہ مکین بھلے لگے۔ وہ بچے (جن کی خدمت پر کیشو مامور کیا گیا تھا) بالکل پھول سے تھے۔ "بی بی جی" بھی ہنس مکھ تھیں لیکن چھوٹی بی بی جی کی تمکنت اور غصے نے کیشو کو پہلے ہی روز سہما دیا۔ وہ اسے کیشو کے بجائے "جانگلو" کہا کرتی تھیں۔ کیشو "جانگلو" کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ سمجھا شاید یہاں نوکروں کو اسی نام سے پکارتے ہوں گے لیکن اسے تسلی نہ ہوئی کیشو کتنے ہی دن ارادہ کرتا رہا کہ اس لفظ کا مطلب معلوم کرے۔ آخر ایک دن چھوٹی بی بی جی کو ذرا خوش دیکھ کر اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے بولا "بی بی جی یہ جانگلو کیسے ہیں؟ ..." "تمہیں!" وہ کھلکھلا دیں کیشو کے بھی ہونٹ پھیل گئے۔ "چل بدتمیز ہنستا ہے! خبردار جو آج سے پیچھے تیرے دانت نظر آئے کمبخت بھٹے کے سے دانے!" کیشو سہم کر چپ ہو گیا لیکن بھٹے کے دانے اس کے دانتوں کے نیچے پھر پھر آ گئے میٹھے میٹھے سوندھے سوندھے۔ کیشو کو بھٹے کھائے ہوئے کتنے دن ہو گئے تھے۔ آجکل تو گاؤں میں خوب بھٹے ہو رہے ہوں گے۔ رامو کہہ تو رہا تھا لانے کو۔ رامو کیشو کا پرانا ساتھی تھا۔ جو شہر کے کسی کپڑے کے مل میں کام کرتا تھا۔ کیشو اسی کے توسل سے یہاں ملازم ہوا تھا۔ رامو ہر تیسرے چوتھے دن کیشو سے ملنے آتا اور اونچ نیچ سمجھا بجھا کر چلا جاتا۔ وہ جب سے مل میں ملازم ہوا تھا اور شہر میں مستقل طور پر رہنے لگا تھا اس کی وضع ہی بدل گئی تھی۔ دھوتی کی جگہ پاجامے اور گاڑھے کے کرتوں کی جگہ رنگین قمیضوں نے لے لی تھی۔ سر پر پگڑی کے بجائے انگریزی بال نظر آتے تھے۔ کچھ دن سے رامو نے مل میں کسی منشی سے پڑھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ رامو کی موجودگی میں کیشو کو اپنی زبوں حالی کا احساس بہت تکلیف دیتا تھا۔ اپنے لباس پر نظر دوڑا کر وہ جھنجلا اٹھتا۔ گھٹنوں تک کا بوسیدہ جانگیہ، بابو جی کی پھٹی پرانی قمیص، گھٹا ہوا سر۔ کیشو نے اپنی قمیص کے دامن جانگیے کے اندر اڑس لئے اس طرح کچھ نیکر کی وضع ہو گئی تھی۔ وہ اپنے لباس کی طرف سے قدرے مطمئن ہو کر باہر نکلا ہی تھا کہ چھوٹی بی بی جی کی آواز آئی۔ "ذرا دیکھو تو مینڈک کو بھی زکام ہوا۔ نیکر کی حرص کر کے کیا اترا رہا ہے نامعقول!" چھوٹی بی بی جی کے ساتھ بچے بھی اسے دیکھ کر ہنسنے لگے اور کیشو کے چاروں طرف بھٹے کے سے دانے بکھر گئے۔ اس کا جی چاہا ان سب کے دانت بھٹوں کی طرح چبا ڈالے... ننھی کے دانتوں پر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔ اس کے ہنستے ہوئے لب بالکل چمپا کی طرح پھول کی پنکھڑیاں معلوم ہو رہے تھے۔ چمپا کیشو کی بہن تھی اس سے ڈیڑھ سال چھوٹی۔ راجکماریوں کی طرح حسین۔ کیشو کہتا تھا ماں اس سے گوبر نہ اٹھوایا کر۔ چمپا اور بھی پھول جاتی۔ جب کیشو گاؤں سے چلا تو چمپا نے مچل کر کہا تھا "بھیا میرے لئے گوٹے والی چندری لائیو شہر سے۔" "ارری ایک چندری! دیکھ تو کیا کیا لاتا ہوں تیرے لئے!" چمپا اپنی پھٹی ہوئی چندری میں انگلیاں پھنسا کر کھیلنے لگی۔ "بس اب تو یہی چندری رہ گئی..." "اچھا لاؤں کیسی؟" چمپا مسکرا دی اور آسمان پر نظریں گاڑتے ہوئے بولی: "ایسی لائیو جیسے دھنک میں رنگ ہوتے ہیں اور کنیوں پر گوٹا بھی ہو..." "دھنک کے رنگ" کیشو نے آہستہ سے کہا آج اسے چمپا یاد آ رہی تھی۔ اس کی پھٹی ہوئی چندری اور بھی پھٹ گئی ہو گی اب تو۔ چمپا اپنی نئی چندری کے لئے کس قدر بے چین ہو گی۔ اپنی سہیلیوں سے

ناچ ناچ کر گاتی ہوگی؛ امی اور چھیڑوں کو کیا دیکھتی ہو، بس تھوڑے دنوں کی بات ہے چھوٹی بی بی جی کی شادی ہو جائے گی، میری اچھی چندری! دھنک سے زیادہ رنگ میں گا...۔ کیشو نے اپنی جمع شدہ رقم ٹٹولی۔ ابھی تو صرف چند سکے کھنک رہے تھے۔ ابھی وہ دھنک بہت دور تھی۔ کیشو کو چندری سے بھی پیسے کمانے کی دھن سوار تھی۔ جس کے لئے اسے چھوٹی بی بی جی کو خوش رکھنا پڑتا تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں ان کا کمرہ بڑے شوق اور توجہ سے صاف کرتا۔ میز پوش میں نئے دھبے لگے اور کیشو نے چھوٹی بی بی جی کی تنبیہ کے بغیر ہی صاف ستھرا میز پوش بچھا دیا۔ کبھی قلمدان دھل رہا ہے تو کبھی کتابیں سجائی جا رہی ہیں۔۔۔ چھوٹی بی بی جی کبھی کبھی خوش ہو کر دونی چونی بطور انعام دیا کرتی تھیں۔۔۔ ایک دن کیشو اپنے پیسوں میں سے کاغذ کے خوبصورت پھول خرید لایا اور سنگار میز پر سجا دئے۔ جب چھوٹی بی بی اندر داخل ہوئی تو وہ باہر کی طرف کھڑکی میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ پھولوں کو دیکھ کر وہ بے ساختہ مسکرا دیں۔ "ارے!" کیشو کے لبوں سے مسکراہٹ ابلی پڑتی تھی۔ "ارے کیشو!" انھوں نے آج پہلی بار جانگلو کے بجائے کیشو کہہ کر پکارا تھا۔ "جی بی بی جی!" "بس تو آج سے جانگلو نہیں رہا۔ آج سے میرے کمرے کی صفائی محض تمہارے سپرد ہے۔۔۔ یہ لو اپنا انعام!" کیشو کے ہاتھ پر ایک روپیہ چمک رہا تھا۔

جوں جوں ڈبیا بھاری ہوتی جا رہی تھی اس کے ذہن میں بھی دھنک کے بھینے بھینے رنگ ابھرتے جا رہے تھے ہلکے ہلکے رکیلے رنگ جو پھیلتے پھیلتے چندری کی شکل میں لہرا اٹھتے تھے۔ دھنک کا خیال آتے ہی اسے گاؤں کی ندی یاد آجاتی جس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک دھنک کا جھولا کتنا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اسی ندی کے دوسرے کنارے پر ایک چھوٹی سی بستی آباد تھی۔ کیشو کو بچپن سے اس گاؤں میں جانے کا شوق تھا۔ لیکن وہ گاؤں اس سے امیدوں کی طرح دور ہی رہا۔ جس طرح آرزوئیں ناامیدی کے تنہا ساحل پر ہار کر بیٹھ جاتی ہیں اسی طرح کیشو ندی کے کنارے بیٹھ کر اس گاؤں کو پرشوق نظروں سے تکا کرتا تھا۔۔۔ لیکن اب تو وہ شوق آسانی سے خریدا جا سکتا تھا۔ جس کے لئے کیشو کو چار پیسے کی ضرورت اکثر پریشان رکھتی تھی۔ ندی پار کرنے کے لئے ملاح کو صرف پیسے دینے پڑتے تھے۔

ایک دن اچانک رامو نے خبر سنائی کہ چمپا بیمار ہے۔ کیشو دھک سے رہ گیا۔ اسے فوراً گاؤں جانا چاہئے تھا لیکن چندری؟ چمپا کی پیار آرزو راہ تکتے تکتے سو نہ جائے کہیں! کیشو نے اپنی جمع شدہ رقم ٹٹولی صرف چار روپے جو آنے پیسے گویا طنزاً مسکرا رہے تھے۔ ان سے کیا دال گلے گی۔ کیشو کا دل بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لئے تمام کائنات چمپا کے رنگیں لبوں میں بدل کر لرز اٹھی "چندری لائے بھیا؟"۔۔۔ کس منہ سے گاؤں جائے۔ یکایک کیشو کے چہرے پر بات جھلک اٹھی۔ اس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ بچے کھیل میں لگے ہوئے تھے بڑی بی بی جی اپنے کمرے میں سو رہی تھیں۔ کیشو ہر طرف سے مطمئن ہو کر سرلا (چھوٹی بی بی) کے کمرے میں داخل ہوا۔ سنگار میز پر اس کی امیدیں بکھری پڑی تھیں۔ چاندی کے چمکتے ہوئے سکے۔۔۔ کیشو نے آج سے پہلے کبھی چوری نہ کی تھی بلکہ چوری کا خیال ہی اس کے ہاتھوں کو بوجھل کر دیتا تھا جیسے سچ مچ اس کو اس خیال نے ہتھکڑیاں پہنا دی ہوں۔ لیکن آج وہ چمپا کے لئے ہتھکڑیاں پہن لینے پر بھی تیار تھا۔ کیشو نے دوبارہ چاروں طرف دیکھ کر روپوں کو چھوا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔۔ اچانک کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور کیشو کے دل کی دھک دھک دھم دھم میں بدل گئی۔ سامنے سرلا کھڑی تھی۔ کیشو کا ہاتھ جوں کا توں رہ گیا جیسے اس کا ہر عضو ہتھکڑیوں کی گرفت میں کھنچا جا رہا ہو۔ "ڈرو نہیں۔۔" سرلا نے صورت حال کو فوراً بھانپ لیا تھا۔ اس نے کتابیں میز پر رکھتے ہوئے ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ کہا "میں جانتی ہوں کیشو تم چور نہیں ہو۔۔۔۔ مجھے بتا دو آخر کس ضرورت نے تمہیں اس کام پر مجبور کیا؟" کیشو کے حلق میں سینکڑوں کانٹے ابھر آئے تھے زبان سوکھ کر تالو سے چپک گئی تھی۔۔۔ "چمپا بیمار ہے۔۔۔" کیشو کو اپنے جذبات پر قابو نہ رہا امید کی یہ پہلی ٹھیس کھا کر آنکھوں کے پیمانے چھلک پڑے۔ آج کیشو نے پہلی بار امید کا فریب کھایا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ جس طرح ایک بچہ اپنا کھلونا ٹوٹنے پر رو پڑتا ہے۔ "اچھا تو گاؤں جانا چاہتے ہو تم؟" سرلا نہایت ملائم لہجے میں بولی۔ "چمپا نے چندری منگائی تھی گوٹے والی چندری۔۔۔ اس کی سادی چندری پھٹ گئی تھی اور اب تو اور بھی جھیر جھیر ہو گئی ہو گی۔" "ہاں ہاں تم آج ہی گاؤں چلے جاؤ اور چندری بھی لیتے جانا۔" اس کے لئے سرلا کے چہرے سے دلی ہمدردی نمایاں تھی۔ اس نے اپنا بٹوہ کھولا اور کچھ نوٹ کیشو کے ہاتھ پر رکھ دئے۔ کیشو کے لبوں پر مسکراہٹ کھل گئی جو اس کی بے پناہ مسرت کا نچوڑ تھی۔ وہ مجسم شکریہ بنا کھڑا تھا لیکن شکریہ ادا کرنا نہ جانتا تھا۔

جب کیشو گاؤں سے لوٹا تو سرلا نے وہاں کی باتیں بڑے شوق اور توجہ سے سنیں چمپا کی باتیں سن کر خوب ہنسی۔ کیشو نے بتایا کہ چمپا چندری دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی میں اسے پہن کر گھونگھٹ اوڑھ کر جاؤں گی تو سچ مچ کی راجکماری معلوم ہوں گی۔ اور نہ بھلا راجکماریاں پانی بھرتی ہوں گی کہیں۔" اب کیشو اس دفعہ اس بستی میں بھی گیا تھا جو ندی کے اس پار بسی ہوئی ہے۔

سرلا کے کمرے کی صفائی کے بعد اسی کے کہنے سے کیشو نے پڑھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کے لباس، تہذیب، طور طریقے میں کافی تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ چند ہی روز میں کیشو کو کافی شدھ بدھ ہو گئی۔ اب کیشو رامو کے سامنے بجائے احساسِ کمتری کے فخر محسوس کرتا تھا۔ اس کے کپڑے بھی رامو سے کہیں بہتر ہوتے تھے۔ بعض مرتبہ کیشو اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتا۔ رامو کو کیشو کی یہ بے رخی کھٹکتی ضرور تھی لیکن اس کی کمتری نے کیشو سے شکایت کرنے کی ہمت نہ کی۔ آخر رفتہ رفتہ رامو نے کیشو کے پاس آنا جانا کم کر دیا۔

وقت کا دامن نہ کسی نے پکڑا ہے اور نہ کوئی پکڑے گا۔ دنوں سے ہفتے، ہفتوں سے مہینے اور مہینوں سے سال جنم لیتے چلے گئے... اب کیشو۔ کیشو نہیں بلکہ بابو کشور چند پکارے جاتے تھے۔ صباحت، پرکاش اور انیس جیسے دوستوں کے سامنے غریب رامو کا ٹھکانہ کہاں! سرلا کا خلوص اور بابوجی کی شفقت نے چمپا اور بوڑھی ماں کی محبت کو قطعاً بھلا دیا تھا۔ کیشو ہر ماہ ایک قلیل رقم گاؤں منی آرڈر کرتا تھا۔ چمپا نے ایک مرتبہ رامو کی زبانی کہلا کر بھیجا بھی کہ بھیا سے کہنا ہمیں پیسہ نہیں ہم وہ چاہئے..." لیکن یہاں تو وہی مضمون تھا "چکنے گھڑے پر بوند گری اور پھسل گئی"۔

ایک دن کیشو کلب سے واپس آ رہا تھا کہ رامو باغ کے دروازے پر کھڑا مل گیا۔ "کیشو بھیا! تم تو اب بالکل ہی بدل گئے..." "فضول باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے جلدی کہو کیا کہنا ہے۔" رامو کھسیانا ہو گیا۔ "کہنا کیا تھا بھیا۔ چاچی نے کہا تھا کہ کیشو سے کہنا گاؤں میں گلٹی کی بیماری پھیل رہی ہے۔ سب گاؤں والے گاؤں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں ہمیں بھی شہر لے جائے" "میں ایسا بیکار تو ہوں نہیں ان سے کہنا خود چلی آئیں۔" اور تیز تیز قدموں سے اندر چلا گیا۔ رامو بھی اسی جگہ کھڑا تھا حیران اور دم بخود۔

کیشو اپنے نئے آشیانے کے لئے سنہرے تار جمع کر رہا تھا۔ تخیل کی پرسکون نہر میں امیدوں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں تیرتی پھرتی تھیں۔ ہر طرف کلیاں ہی کلیاں، خوشبو ہی خوشبو بکھری پڑی تھی۔ اسے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ ہوا کا دھیما سا بگولہ بھی اس چمن کی زینت بدلنے کے لئے کافی ہے اور ان کاغذی کشتیوں کو ایک لمحے میں ڈبو سکتا ہے۔ اس نے ان کلیوں کا دامن کبھی نہیں ٹٹولا جس میں کانٹے ہی کانٹے بھرے ہوئے تھے...

کیشو کچھ دن سے پریشان سا رہنے لگا تھا۔ ایک عجیب سا غیر شعوری تذبذب اس کے ذہن پر چھایا رہتا۔ غالباً اس کی وجہ سرلا اور پرکاش کا حد سے زیادہ میل جول تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پرکاش ایک آوارہ شخص ہے۔ آخر ایک دن اس نے سرلا کو باتوں باتوں میں سمجھا بھی دیا۔ سرلا فوراً مان گئی اور پرکاش سے ملنا جلنا ترک کر دیا لیکن چند دن بعد کیشو نے محسوس کیا کہ سرلا کی توجہ اس کے نہایت عزیز دوست نریندر کی طرف رہتی ہے۔ جو رفتہ رفتہ دلچسپی میں بدلتی جا رہی ہے۔ نریندر نہایت شریف اور نیک دل شخص تھا اور کیشو کا مخلص بھی۔ کیشو بعض مرتبہ سوچتا کاش نریندر بھی آوارہ اور عیاش ہوتا... لیکن آخر یہ سب کس لئے؟ اسے کوئی حق نہیں کہ سرلا کو کسی طرح کی تنبیہ کرے یا کسی سے ملنے جلنے کو خواہ مخواہ منع کرے۔ کیشو نے تہیہ کر لیا کہ وہ سرلا کی راہ میں کسی طرح بھی حائل نہیں ہوگا۔ اس روز سرلا کی سالگرہ تھی۔ کیشو کلب سے آتے ہوئے سوچ رہا تھا بازار سے کوئی تحفہ خریدے لیکن نہ جانے کیوں اس کے قدم گھر کی راہ پر اٹھ گئے جیسے وہ ادھر آنے پر مجبور کر دیا گیا ہو...

گھر میں خوب چہل پہل تھی۔ سرلا کے کمرے میں قہقہوں پہ قہقہے لٹائے جا رہے تھے۔ کیشو سامنے سے گزرا۔ نریندر صاحب اس خوشی میں جھوم جھوم کر مہمانوں کو گانا سنا رہے تھے۔ سرلا نے کیشو کو جاتے دیکھا لیکن بلانا تو درکنار پوچھا تک نہیں۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سرلا کی یہ بے اعتنائی کہہ رہی ہے "تم وہی تو ہو... ایک دن پھٹے حال نوکر کی حیثیت سے آئے تھے"۔ کیشو نے آنکھیں بند کر لیں جیسے اس طعنے کی لے سے بچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن ان آوازوں کا دم کسی طرح نہ گھٹتا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس طرح بھی بے چینی کم نہ ہوئی تو کھڑکی کی راہ سے باغ میں آ گیا۔ اس کی طبیعت چاہ رہی تھی کہ اپنا تھکا تھکا بوجھل سر پھولوں جیسی بھینی بھینی آغوش میں رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ اسی ماں کی بوڑھی آغوش میں جو بچپن کی طرح اب بھی اس کے لئے وا ہوگی ایک بھکارن کی التجا بھری نظروں کی طرح۔ وہ بنچ پر بیٹھ گیا۔ خیالات کے شریر پنچھی ذہن میں پھڑپھڑا کر گاؤں کی طرف پر تول رہے تھے۔ "بابوجی!" کیشو نے سر اٹھایا سامنے چوکیدار کھڑا تھا۔ "یہ پرچہ رامو دے گیا تھا شام کو، اسے جانے کی جلدی تھی اس لئے..." کیشو نے چوکیدار کی بات کو پورا کرنے کا موقع بھی نہ دیا اور روشنی کے لئے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ پرچہ کھولا ٹوٹی پھوٹی اردو میں یہ چند سطریں لکھی تھیں۔

"کیشو بھیا! میں جانتا ہوں تمہیں یہ پڑھ کر زیادہ رنج نہیں ہوگا کہ چمپا اپنی دکھیا ماں کو روتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چل دی۔ اسے گلٹی کی بیماری ہو گئی تھی۔ وہ مرتے مرتے بھی تمہیں یاد کرتی رہی۔ اپنی چندری ماں کو دے کر صرف اتنا کہا کہ بھیا سے کہنا تمہاری لائی ہوئی چندری اتنی اچھی تھی کہ میں اسے اوڑھ نہ سکی۔"

... گئیں۔ جیسے کسی نے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا ہو۔ اس نے مسہری پر گر کر تکیے میں منہ چھپا لیا۔ اس قدر سخت سزا! میرے کئے کی یہ سزا تو نہ ہونی چاہئے تھی — کیشو تکئے میں منہ چھپائے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ کافی دیر بعد کیفیت اس کے آنسو تھم گئے وہ ایک دم نہایت چستی سے اٹھا۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر کھسیانی مسکراہٹ سے بولا "خیر!" میز پر سے قلم اٹھائی اور لکھنا شروع کیا۔

چھوٹی بی بی جی

آج تمہارا وہی دس گیارہ سال پہلے کا کیشو تم سے مخاطب ہے۔ ہم غریبوں سے تو قسمت بھی مذاق کرتی ہے مجھے اتنے دن تھپکیاں دیتی رہی آخر آج اس نے ٹھوکر مار کر جگا دیا جیسے تم لوگ کتے کو چمکار کر کھانا کھلاتے ہو اور پھر دھتکار دیتے ہو۔ میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔ جہاں کی سادگیاں مجھے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں۔ "آؤ کیشو بھیا ہم تو غریب ہی بھلے" مجھے نمک حرام نہ کہنا کیونکہ میں تمہارا دیا ہوا سب کچھ یہیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ دولت، عزت، تہذیب، تمدن، حتیٰ کہ لباس بھی۔ تمہارا نوکر کیشو

کیشو نے خط میز پر رکھا اور اپنے پرانے بکس میں سے وہی گاڑھے کا ڈھیلا ڈھالا کرتا اور دھوتی نکالی (جو اس نے اپنے پیسے سے نوکری کے زمانے میں بنائی تھی) قمیص اور پتلون کو حقارت سے فرش پر پھینک دیا اور کرتا دھوتی پہن کر مسکرایا۔ جیسے کوئی سہانا خواب دیکھ کر آنکھ کھلنے پر مسکرا کر رہ جائے۔ اور ادھر ادھر کا جائزہ لئے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

چند دن بعد گاؤں کے لوگوں کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ کیشو منہ اندھیرے اپنے بیل ہانکتا ہوا کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ندی کے کنارے ٹھہر کر ایک بار پر شوق نظروں سے اس بستی کو دیکھا جس کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں میں اس کی امیدیں دھڑک رہی تھیں۔

غزل

رضا ٹونکی

بجتی مری نظر دلِ تماشا دہاں سے کیا
رہتا ہے کوئی رازِ نہاں رازداں سے کیا

عاشق ہوں واسطہ مجھے رسمِ جہاں سے کیا
منزل نظر میں ہے تو غرض کارواں سے کیا

اللہ رکھے حوصلۂ ضبط برقرار
اتنک تو ہے خیال کہ حالِ فغاں سے کیا

رنگینیٔ بہار ہے کیوں آج بیشتر
میں دور اُڑ رہا ہوں کہیں آشیاں سے کیا

اُن کی نظر پہ چھوڑ دیا ہے معاملہ
اب مجھکو واسطہ مرے سود و زیاں سے کیا

مقبول گر نہ ہوں تو نہ ہوں سجدہ ہائے شوق
اب سر کو لے کے جاؤں ترے آستاں سے کیا

اک برق اب بھی کوند رہی ہے نگاہ میں
ہر چند نسبت اس نگہِ دلستاں سے کیا

اللہ رے حسن و عشق کی خاموش گفتگو
نظریں وہ کہہ رہی ہیں کہ کہیئے زباں سے کیا

آلامِ روزگار سے کیوں مل گئی نجات
دنیائے عشق کوئی الگ ہے جہاں سے کیا

وہ اور خوئے جور یہ ممکن نہیں کبھی
کیا جانے مدعا ہے مرے امتحاں سے کیا

تسکین کی ہے میرے دلِ ناشگفتہ کی
غنچے کو ورنہ کام رضا گلستاں سے کیا

نغمہ

[illegible]

شاطر

قطعات

بقائے خیال

اسیرِ دامِ فریبِ حیات ہیں دونوں
وجودِ غم کا مری ذات سے خوشی تجھ سے
تمہیں میں دل سے بھلا دوں یہ ہو نہیں سکتا
مرے خیال نے پائی ہے زندگی تجھ سے

یاد کرو

ہنس ہنس کے بزمِ عیش مری آباد کرو
آنکھوں میں سما کے بھی دل شاد کرو
وہ چاندنی رات وہ کہانی کی بات
گزرے ہوئے وقت کو بھی یاد کرو

حلیمی

اقوام متحدہ کا ادارۂ غذا و زراعت

سید علی رضا

۱۶ر اکتوبر سے یکم نومبر ۱۹۴۵ء تک کینیڈا کے پایہ تخت کیوبیک میں اقوام متحدہ کے قائم کئے ہوئے ادارۂ غذا و زراعت کے متعلق وہ عظیم کانفرنس منعقد ہوئی جو ارتقاء تمدن کی تاریخ میں نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ اس کانفرنس کے ذریعہ کیوبیک کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس کی سرزمین پر انسانی زندگی کی سب سے اہم بنیادی صنعت یعنی زراعت اور اس کے متعلقہ امور کی تنظیم کے لئے ایک ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ کانفرنس شیٹو فرنٹناک نامی اس ہوٹل میں منعقد ہوئی جو جنگ عظیم ثانی کے دوران میں مسٹر چرچل اور مسٹر روز ولٹ کی دو مرتبہ کی ملاقاتوں کے باعث پہلے ہی سے تاریخی اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ گویا یہی وہ ہوٹل ہے جہاں اتحادیوں کی فتح کی تدابیر مرتب کی گئی تھیں اور اس لحاظ سے یہی ہوٹل اس امر کے لئے بھی سب سے زیادہ موزوں تھا کہ اس کے صحن میں ایسا ادارہ قائم کرنے کے لئے مشورہ کیا جائے جس کا مقصد غذا کی پیداوار بڑھا کر نیز معلومات سائنس کو انسانی خدمت کے لئے صرف کرکے اور جنگ زدہ ممالک کو یا ایسے ممالک کے باشندوں کو جہاں جنگ کے اثرات بد نے اقتصادی تباہ کاری پھیلا دی ہے تمام ضروری امداد بہم پہنچا کر برکات امن کو عام سے عام تر کرنا ہو۔

کانفرنس کی ابتدائی نشست ۱۶ر اکتوبر کو ہوئی۔ اس کی صدارت کینیڈا کے سفیر متعینہ امریکہ یعنی مسٹر ایل بی پیرسن نے انجام دی۔ مندرجۂ ذیل تیس ملکوں کے نمائندوں نے دستور عمل پر دستخط ثبت کئے یعنی، آسٹریلیا۔ بلجیم۔ کینیڈا۔ چین۔ زیکوسلوویکیا۔ ڈنمارک۔ ڈومینیکن جمہوریت۔ مصر۔ فرانس۔ یونان۔ گواٹیمالا۔ ہیٹی۔ ہنڈوراس۔ آئس لینڈ۔ ہندوستان۔ عراق۔ لائبیریا۔ لکسمبرگ۔ میکسیکو۔ نیدرلینڈز۔ نیوزیلینڈ۔ نکاراگوا۔ ناروے۔ پناما۔ پیرو۔ فلپائن۔ جنوبی افریقہ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ وینزویلا۔ اور برطانیہ۔

ان کے علاوہ برازیل۔ کولمبیا۔ کیوبا۔ پولینڈ۔ یوگوسلاویا۔ شام اور لبنان کے نمائندوں نے بھی بعد میں دستور العمل پر دستخط ثبت کر دئے۔ اس طرح صرف ایک اہم ملک یعنی روس دستخط کرنے سے رہ گیا۔ وہ اس لئے کہ گو اس ملک کے نمائندے کانفرنس کی نشستوں میں نیز مختلف کمیٹیوں میں برابر شریک رہے لیکن دستخط کرنے کے لئے ان کی حکومت نے مزید غور کرنے کی مہلت ضروری خیال کی۔

کانفرنس کا افتتاحی جلسہ شیٹو فرنٹناک کے بال روم میں ہوا۔ ڈائس یعنی صدر کی نشست گاہ پر اقوام متحدہ کے جھنڈے نصب تھے۔ کینیڈا کے پوسٹماسٹر جنرل مسٹر ارنسٹ برٹرانڈ نے حکومت کینیڈا کی جانب سے تمام مختلف ملکوں کے نمائندوں کا خیر مقدم کیا۔ تمام بال روم روشنی سے جگمگا رہا تھا اور اس پر سے لحظہ بہ لحظہ فوٹو گرافروں کے کیمروں کی روشنی جھلکتی رہتی تھی۔ کیونکہ یہ لوگ اجلاس کے خاص خاص موقعوں کے فوٹو لے رہے تھے۔ ہندوستانی وفد کے صدر سر گرجا شنکر باجپائی اور فرانس کے وفد کے صدر نے حکومت کینیڈا کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور عبوری کمیشن کے صدر مسٹر پیرسن کو ان کے حسن خدمات کی داد دی۔

کانفرنس کے سات اجلاسوں میں مختلف ملکوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے ملک کے زراعتی اقتصادیات اور غذائی صورت حال پر مقالے پڑھے نیز یہ بتایا کہ ان کی نظر میں ان معاملات کو حل کرنے کے لئے ادارۂ غذا و زراعت کو کیا شکل اختیار کرنا چاہئے۔ آٹھویں اجلاس میں جو کہ ۲۲ر اکتوبر کو ہوا اسکاٹ لینڈ کے مشہور ماہر غذائیات عالم اور قانون دان سر جان بائڈ اور ادارۂ غذا و زراعت کے پہلے ناظم اعلیٰ (ڈائرکٹر جنرل) مقرر ہوئے۔ اس تقرر پر سر جان نے اپنی قومیت ترک کر کے تمام دنیا کی شہری کی حیثیت اختیار کر لی۔ سر جان نے اپنی تقریر میں ادارہ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس امر کی وضاحت کی کہ اس ادارہ میں شمولیت کے ذریعہ تمام ملکوں نے نہ صرف اپنے اپنے باشندوں کے لئے حتی الوسع صحت بخش غذا مہیا کرنے کا عزم کیا ہے بلکہ انھوں نے تمام عالم کے لئے ایسی غذائی تنظیم کی بنا ڈالی ہے جو باہمی تعاون کے ذریعہ تمام انسانوں کو بلا امتیاز نسل و رنگ قحط کے خوف اور امکان سے نجات دلائے گی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ جنگ کے ٹینک زراعتی مشینوں میں تبدیل ہو جائیں اور جنگی اسلحہ تیار کرنے والے کارخانے کیمیاوی کھاد بنانا شروع کر دیں تاکہ انسانیت پھر امن و افراط کی نعمتوں سے فیضیاب ہو سکے۔

زیادہ تر نمائندے ہوائی سفر کے ذریعہ کیوبیک پہنچے تھے۔ بعض تو بہت ہی دور دراز سے آئے تھے مثلاً چین۔ ہندوستان۔ افریقہ

اقوام عالم کے نمائندے سائنس داں اور ماہرین اقتصادیات نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ عصر جو کبھی تیس تیس یا چالیس چالیس روز میں طے ہوتے تھے صرف تین یا چار روز میں ختم ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ کانفرنس میں جمع ہونے والے افراد محسوس کرتے تھے کہ دنیا کی مسافتیں گھٹ کر پہلے کے دسویں حصہ کے برابر رہ گئی ہیں اور یہ کہ اب کسی ملک کے لئے باقی دنیا سے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں ہے۔ کانفرنس کی کل کارروائی ایک خاص احساس خوش دلی اور یکجہتی کے ساتھ ہوئی اور کانفرنس کے تمام مباحث پر ایک عام جذبہ تعاون کا اثر نمایاں تھا۔ یہ کانفرنس ایک ایسی ہولناک جنگ کے خاتمہ پر منعقد ہوئی جس نے انسانی خون اور اثاثہ کی تباہ کاری سے تمام عالم کی زراعت و صنعت کو یکسر ہلا ڈالا ہے۔ اور اسی کے ساتھ دماغوں میں یہ احساس بھی موجود تھا کہ جنگ ایک ایسے آلہ یعنی ایٹم بم کے استعمال سے اختتام پر لائی جا سکی ہے جس کا استعمال اگر معقول پابندی سے نہ کیا جائے تو وہ ہم کل انسانی تہذیب ہی کے لئے باعث فنا ہو سکتا ہے۔ سائنس کی اس نئی تحقیق نے انسانی تہذیب کے سامنے جو عقدہ پیش کر دیا ہے وہ آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اب انسانیت کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تعاون کے ذریعہ تدبیر عمل یا مکمل فنا۔ نیز یہ بھی محسوس کر لیا گیا کہ زیادہ تر ہماری افلاس اور بھوک ہی جنگ و جدال کے بنیادی عوامل ہیں، کیونکہ جیسا کہ نیوزی لینڈ کے ممبر مسٹر ولسن نے کہا جب تک دنیا افلاس، وبا اور قحط ایسی آفات سے بچ نہیں پاتی جنگ و جدال کو نہ سیاسی معاہدے روک سکتے ہیں اور نہ فوجی اتحاد بندیاں۔ ایٹم بم یا مقامی تنظیمیں۔ تقریباً تمام نمائندے اس امر پر متفق تھے کہ زراعتی پیداوار کی قیمتوں میں ۱۹۲۹ء کی سی تباہ کاری کو دوبارہ واقع ہونے سے روکنے کی ہر امکانی کوشش کرنا فرض ہے تاکہ کسانوں کو ان کی محنتوں کی مناسب داد اور قیمت ملنے میں دشواری نہ ہو۔ عام رجحان خیال اس جانب تھا کہ کسانوں کو زیادہ غلہ پیدا نہ کرنے یا فاضل غلہ کو ضائع کر کے مصنوعی قحط بنانے کے لئے امداد دینے کے بجائے ایسی حکمت زیادہ مناسب ہوگی جس میں پیداوار کی افراط اور روزگار کی فراہمی نمایاں ہو اور جس میں سائنس کی اعانت انسانی ضروریات کے پورا کرنے میں مدد دیں۔

ہندوستان کے نمائندوں نے اپنے ملک کی خاص ضروریات کو پرزور طریقہ پر کانفرنس کے روبرو پیش کیا۔ یہ توقع ہرگز نہیں ہے کہ ادارۂ غذا و زراعت ہمارے لئے مسیحائی کا کام کرے۔ کیونکہ ہمارے چار لاکھ سے زیادہ دیہاتوں پر سے روایتی مفلسی اور کساد بازاری کو دور کرنا ہمارا ہی کام ہے۔ البتہ ہم دوسرے ملکوں سے علمی مشورہ اور مشینیں ضرور چاہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کا عام افلاس ملک کے تمام وسائل کو جدید آلات کے استعمال کے ذریعہ دور ہو سکتا ہے لیکن اس کام میں ترقی یافتہ ملکوں کے تجربہ سے فائدہ اٹھائے بغیر خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی۔

کانفرنس کا مقصد اولین اتحادی ممالک کے لئے ایک ادارۂ غذا و زراعت کی تشکیل تھا۔ اس مقصد میں کانفرنس کامیاب ہو گئی۔ ادارۂ غذا و زراعت سائنسی معلومات اور بنیادی نظریات کے تجزیہ کے ذریعہ تعاون کی روح پیدا کرنے اور افراد کو دنیا میں از سر نو لانے کے یقیناً قابل ہوگا۔ اس ادارہ کا ایک مقصد یہ ہے کہ دنیا کی موجودہ پیداوار، کھپت اور خاص خاص جنسوں کی بین الاقوامی تجارت کا مقابلہ دنیا کی حقیقی ضروری مانگ سے ان اعداد و شمار کی روشنی میں کیا جائے تاکہ زرعی پیداوار کی فاضل مقداروں کا علم ہو سکے اور اس کے مطابق بین الاقوامی تجارت چلا سکے۔ اس کے ساتھ ہی انجمن کے مقاصد میں دنیا کی غذائی ضروریات اور ان تمام طریقوں کا مطالعہ بھی ہوگا جن کے ذریعہ غذائی اجناس کی تقسیم کی جائے۔ قیمتوں کی گاہ بگاہ رد و بدل کا تجزیہ کیا جائے یا قیمتوں میں استقلال قائم کرنے کی تدبیریں اختیار کی جائیں۔ کم آمدنی والے ایسے رقبات کے لئے جہاں محتور غذا کی کمی نمودار ہو فاضل اجناس بہم پہنچانے کے لئے خاص انتظام کرنا ہوگا۔

غزل

عزیز شیرازی

پھر تری یاد دل میں پاتا ہوں
پھر فلک سے الجھتا جاتا ہوں

پھر پکارا ہے عہد رنگیں کو
پھر جوانی کے گیت گاتا ہوں

اڑ کے آتی ہے پھر نسیم بہار
پھر ہواؤں کو گدگداتا ہوں

جھوم کر آ گئے ہیں پھر بادل
میکشوں کو بلانے جاتا ہوں

آرزوؤں نے لی ہے انگڑائی
پھر مقدر کو آزماتا ہوں

درد سا اٹھ رہا ہے پہلو میں
پھر کسی کو منانے جاتا ہوں

عہد ماضی کو یاد کرتا ہوں
اپنی حالت پہ مسکراتا ہوں

سب پہ تو نے کرم کیا ساقی
ایک میں تشنہ کام جاتا ہوں

تیری تصویر سامنے رکھ کر
قصۂ درد و غم سناتا ہوں

ہچکیاں آ رہی ہیں کیوں پیہم
شاید ان کو میں یاد آتا ہوں

جتنی منزل قریب آتی ہے
اتنا ہی دور ہوتا جاتا ہوں

پھر اٹھا ہاتھ جیب و داماں تک
پھر انہیں آج دل میں پاتا ہوں

اپنی ہستی مٹا رہا ہوں عزیزؔ
ان کی ہستی بنائے جاتا ہوں

تمام دنیا کے لئے ایک غذائی منشور تیار کرنے کے لئے دست و بازو میں ایک غذائی اعداد و شمار کی تجویز کیا گیا ہے تاکہ دنیا کی غذا اور زراعت کے متعلق ضروری اعداد و شمار مہیا ہو جائیں۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ادارہ غذا و زراعت لیگ آف نیشنز (سابق مجلس اقوام) کی طرح کوئی مرکزی ادارہ نہیں ہوگا جو صرف شریک ملکوں سے محض اپنے تبلیغی افسروں کے ذریعہ ارتباط قائم رکھے بلکہ اس ادارہ کے مقامی دفتر ہوں گے جن کے ذریعہ یہ ادارہ تمام مختلف ممالک کے باشندوں اور ان کے معاملات کے متعلق باخبر رہے گا۔ بہت ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی اس کا ایک مقامی محکمہ قائم کیا جائے۔ بیشتر ملکوں کو یہ اہم شکایت تھی کہ لیگ آف نیشنز کے کارکن تمام تر یورپین اشخاص تھے۔ اسی لئے ادارہ غذا و زراعت کے لئے طے کر دیا گیا ہے کہ اس کے کارکن حقیقی معنوں میں بین الاقوامی ہوں گے اور مختلف جغرافیائی خطوں کی نمائندگی کر سکیں گے۔ تمام عہدوں کے لئے افراد سے اعلان کیا جائے گا اور کارکنوں کا انتخاب ناظم اعلیٰ (ڈائرکٹر جنرل) مقابلہ کی رو سے کریں گے۔ یہ بھی فیصلہ ہوگیا ہے کہ اس ادارہ کا دفتر یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن (ادارہ اقوام متحدہ) کے صدر دفتر کے ساتھ ہی ہوگا۔ چونکہ ابھی آخرالذکر کے دفتر ہی کے متعلق قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے اس لئے سر دست ادارہ غذا و زراعت کا دفتر واشنگٹن میں قائم کر دیا گیا ہے۔

سطور بالا سے واضح ہوگا کہ یہ ادارہ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایگری کلچر، روم، کی مانند محض اعداد و شماری کا ادارہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے برخلاف پُرزور تعمیری پروگرام کا حامل ہوگا۔ اس ادارہ کے ماتحت سائنس کی تحقیقات کے نتائج مع تالیف کے ببلیک کتابی سلسلہ کے ذریعہ تمام شریک ملکوں کو بھیجے جایا کریں گے۔ یہ ادارہ افزائش پیداوار اور نسل کشی کے لئے سامان بھی مہیا کرے گا۔ یہ امداد ہندوستان کے مویشی پالنے والوں کے لئے خاص طور پر مفید ہوگی۔ سائنس کی تحقیقات میں تنظیم بھی اسی قدر اہم ہے جس قدر کہ خیالات پیدا کرنا۔ ہندوستان کے زراعتی تحقیقات کے اداروں کے لئے اس تنظیم کے فائدے نہایت قابل قدر ہوں گے۔ ہندوستان میں وقت کی اہم ضرورت سائنس کی تحقیقات کو کاشتکاروں تک پہنچانا ہے۔ کیونکہ یہ کام اب تک ابتدائی حالت سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ ادارہ غذا و زراعت کتابچے لکھے۔ اشتہار۔ اسکی تصویریں اور فلمیں اکٹھا کرکے یا ان خلاصے اور اقتباسات تیار کرکے

شریک ملکوں میں تقسیم کرے گا۔ ہندوستان کے لئے یہ تمام مسالہ بہت مفید ہوگا۔ اس ادارہ نے ابھی سے زراعتی مشینوں اور کیمیاوی کھادوں کی ایسی مساویانہ تقسیم پر جو ہر ملک کے لئے ایک معیار پر مبنی ہو زور دیا ہے۔ اسی طرح یہ تجویز ہے کہ غیر ترقی یافتہ ملکوں کو تعمیر ترقی کے بین الاقوامی بنک (انٹرنیشنل بنک آف ریکانسٹرکشن اینڈ ڈیولپمنٹ) کے ذریعہ قرض بہم پہنچا کر امداد دی جائے۔

اس ادارہ کے ماتحت ماہران فن مامور رہیں گے تاکہ عملی مشورہ طلب کرنے والے ملکوں کو ان کی خدمات سپرد کی جا سکیں۔ اس قسم کی امداد ہندوستان کے لئے نہایت کارآمد ہو سکتی ہے۔

(انڈین فارمنگ سے ماخوذ)

برطانیہ میں تیمارداری کا پیشہ — بقیہ صفحہ ۲

ٹریننگ کے ابتدائی زمانہ میں ہی نرسوں کو چھوت کی بیماریوں کے اندیشوں سے آگاہ کر دیا جاتا ہے اور یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ ان کو ڈیوٹی کے دوران میں کیا کیا احتیاطیں برتنا چاہئیں۔ جو جو بیماریاں ان کی ڈیوٹی کے سلسلہ میں ان کو لاحق ہو سکتی ہیں ان کے معالجہ اور تحفظ کا پورا پورا انتظام کیا جاتا ہے علالت کی صورت میں نرسوں کو چاہئے کہ فوراً اطلاع کر دیں۔ ان کی فوری صحتیابی کا ہر ممکن انتظام کیا جاتا ہے۔

ہر نرس کا اپنا علیحدہ کمرہ ہوتا ہے جس میں تمام ضروری سامان موجود ہوتا ہے۔ صفائی، روشنی اور گرمی کا بھی خاص انتظام ہوتا ہے۔ میدان کے کھیلوں کا مناسب انتظام کیا جاتا ہے اور جہاں جہاں ممکن ہوتا ہے ٹینس کورٹ ضرور ہوتا ہے۔ ہسپتال کی فضا سے باہر نرسیں قدرتی طور پر تفریحی کاموں میں دلچسپی لیتی ہیں۔ ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ نرسوں کا یہ شوق آسودگی پاتا رہے۔

نرس کی ایک خاص قسم بھی ہے جس کو (پبلک ہیلتھ نرس) کہتے ہیں۔ وہ یا تو گھر گھر مریضوں کی دیکھ بھال کرتی پھرتی ہے، بچوں کے شفاخانہ میں سپرنٹنڈنٹ ہوتی ہے، کسی اسکول میں متعین ہوتی ہے یا دق کے کسی ہسپتال میں۔ اس نرس کا فرض ہے کہ وہ اصل بیماری کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لوگوں کو اس سے بچائے اور گھروں اور مدرسوں میں صفائی اور تندرستی کا پرچار کرے۔ ملک میں صحت و تندرستی کو اعلیٰ پیمانہ پر برقرار رکھنے کے لئے یہ کام شفاخانوں میں مریضوں کی تیمارداری کے کام سے زیادہ اہم نہیں تو کم از کم اس کا ہم پلہ ضرور ہے۔ عام طور پر ہیلتھ نرس پورے طور پر سند یافتہ ہوتی ہے اور اس کے فرائض میں زچہ خانوں کے علاوہ حاملہ عورتوں، زچاؤں اور پانچ سال کی عمر تک کے بچوں کی دیکھ بھال شامل ہوتی ہے۔

غالب اور قنوطیت

علی حماد عباسی

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ مرزا غالب ان نا امید فلسفیوں میں سے نہیں ہیں جنہوں نے بالکل رونے پیٹنے کو اپنا شیوۂ زندگی بنا رکھا ہے بلکہ ان کی شاعری میں شوخی اور رنگینی کا عنصر غالب ہے، لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شاعری کی صد رنگ موجوں میں قنوطیت یعنی یاس و حرماں کا بھی رنگ پایا جاتا ہے جو کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کی شاعری کا سب سے بڑا امتیازی وصف کہا جا سکتا ہے کیونکہ انگریزی زبان کے شہرۂ آفاق شاعر شیلے کا مقولہ ہے کہ

وہی شاعری بہترین اور پر از تاثیر مانی جا سکتی ہے جس میں غم انگیز کیفیتوں کا تذکرہ ہو کیونکہ غمگین اور دردناک شاعری دل و دماغ دونوں سے کبھی محو نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے طرحدار اور لطف آمیز شاعری اگرچہ تھوڑی دیر کے لئے دل و دماغ کو مسرور کر دیتی ہے لیکن ہمارے دلوں پر کوئی دیرپا نقش نہیں چھوڑتی۔

اس سے پہلے کہ غالب کی شاعری اور قنوطیت پر کچھ لکھا جائے یہ ضروری ہے کہ قنوطیت کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ قنوطیت کے فلسفیانہ نظریہ کی تائید میں دو مخصوص دلائل پیش کئے گئے ہیں اور وہ یہ ہیں (۱) لذتی دلیل اور (۲) تاریخی دلیل — لذتی دلیل ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حیات انسانی میں خوشی سے زیادہ رنج ہے جیسا کہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

جہاں منزل درد و جائے غم است
دریں دام گر شادمانی کم است

شوپنہار جو کہ زمانہ جدید میں قنوطیت کا سب سے اچھا مفسر اور شارح مانا گیا ہے کہتا ہے کہ درد و الم ایجابی ہیں اور لذت مسرت محض سلبی۔ جب ہم کسی چیز کی خواہش کرتے ہیں تو ہمارے اندر ایک طرح کی مسرت یا لذت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جوں ہی خواہش پوری ہو جاتی ہے، لذت موقوف ہو جاتی ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ خواہش اور احتیاج ایک ہی چیز ہے اور زندگی کے معنی دائمی خواہش کے ہیں اور احتیاج درد و الم کے سوا کسی دوسری چیز کا نام نہیں۔ لہٰذا زندگی کو دوسرے الفاظ میں ہم دائمی الم کہہ سکتے ہیں — تاریخی دلیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تہذیب و تمدن میں انسان جس قدر آگے بڑھتا جاتا ہے اسی قدر ناشاد و نامراد ہوتا جاتا ہے۔

شوپنہار کہتا ہے کہ تہذیب سے رنج و الم اور درد و دکھ میں اضافہ ہوتا ہے اور فرانس کا مشہور مفکر روسو نہایت ہی زوردار طریقہ سے کہتا ہے کہ تہذیب اخلاق کو تباہ کرتی ہے اور انسان کو شریر و کینہ بناتی ہے۔ اگر ہم انسان کے تدریجی ارتقاء پر غور کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ جوں جوں اس کی عمر تجاوز کرتی جاتی ہے اس کو درد و تکلیف کا احساس شدت سے ہوتا جاتا ہے۔

میتھو آرنلڈ کا یہ ادعاء کہ شاعری تنقید حیات ہے" مرزا غالب کے کلام کا مطالعہ کرنے سے بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں اس وقت تک شوخی و رنگینی بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے جب تک کہ ان کی زندگی عیش و عشرت اور آسائش سے گذری لیکن جوں ہی ان کی زندگی میں غمناک حادثات پیدا ہونا شروع ہوگئے۔ ان کی شاعری پر قنوطیت کا رنگ چڑھنے لگا۔ جوانی کی پرکیف گھڑیوں میں مرزا غالب نوبہار کو تاکتے رہے، چہرۂ خوباں کو دیکھ کر ان کے آرزوؤں کے سمندر میں ایک ہلچل سی مچ جاتی تھی اور ہر گھڑی وہ شراب کے نشہ میں تصور جاناں کئے ہوئے بیٹھے رہتے تھے، لیکن جلد ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ بزم کی یہ "رنگ آرائیاں" ایک "طاق نسیاں" ہو کر رہ جائیں گی اور شباب کی یہ ہنگامہ خیزی جو کہ گل و لالہ میں لپٹی ہوئی ایک فریب مسلسل ہے رنگینی اور رنگ شکستی ہے۔ اس کے پس منظر میں دائمی کلفتوں کا ایک زبردست غار ہے۔ وہ خواب ہستی سے یک بیک چونک کر کہہ اٹھتے ہیں :-

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

یا

فنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

اور اس کے بعد آہستہ آہستہ کرکے غالب کو قنوطیت کا احساس ہونے لگتا ہے اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ جب تک زندگی ہے اور پہلو میں دل ہے رنج و الم سے کسی طرح چھٹکارا نہیں۔ انسان کی فطرت میں غم کا احساس ہمیشہ موجود ہے چاہے مستی اور بے خودی میں تھوڑی دیر کے لئے وہ اس کو فراموش کر دے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :-

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا

پھر

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

[illegible] رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
اور آخر کار زندگی کی ان تلخیوں سے تنگ آکر کہہ اٹھتے ہیں :-

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یا

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

یا

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ان کا خیال ہے کہ انسان کو دائمی آرام اس دنیا میں نہیں مل سکتا، اس کی زندگی عیش و عافیت سے عقبیٰ ہی میں کٹ سکتی ہے کیونکہ انسان کو دنیا کی چند روزہ زندگی میں بہت سے مصائب انگیز کرنے پڑتے ہیں اور وہاں نہ غمِ عشق ہے اور نہ غمِ روزگار۔

یوں تو مرزا غالب کی کتاب حیات کے ہر باب میں دل تنگیوں اور آلام کا تذکرہ ہے لیکن اس عظیم الشان انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اندوہناک واقعہ سلطنت مغلیہ کے زوال کی خونچکاں داستان ہے۔ جس کو ہم غدر ۱۸۵۷ء کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ انھوں نے لال قلعہ کی سطوت کو مٹتے ہوئے دیکھا، اپنے عزیزوں کو پھانسی کے تختہ پر چڑھتے ہوئے دیکھا، اپنی آنکھوں سے اذیت ناک اور خونریزی دور کا نظارہ کیا۔ اس ہنگامہ کی وجہ سے ان کی وہ پنشن بند ہو گئی جو کہ فیروز پور کی جاگیر سے ملتی تھی۔ بادشاہ بھی کس مپرسی کی حالت میں ہونے کی وجہ سے اس وقت ان کی کچھ مدد نہ کر سکا۔ میر مہدی مجروح نے ایک خط کے ذریعہ پنشن کے متعلق پوچھا تو جواب میں لکھتے ہیں :-

"کیسا پنشن اور کیا اس کا ملنا، یہاں تو جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں ؎

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو — آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

. . . . اگر زندگی رہی تو پھر مل لیں گے ۔"

ایک شعر میں اپنی حالت زار کے متعلق فرماتے ہیں :-

بلبل کو نہ لیجا درِ نہ میرے حالِ ... — ہر گل تر ایک چشم خوں فشاں ہو جائے گا

جب غالب اس سے اکتا گئے تو مجبوراً گھر کا دروازہ بند کر کے گوشہ نشین ہوئے اور قیدی کی طرح زندگی گذارنے لگے چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"میری یہ آرزو ہے کہ دنیا میں نہ رہوں، اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے ...... نہ جانے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی قید سے جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جان فرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل قرار دوں سر بسر آوارہ ہو جاؤں۔"

وہ اپنی بیتی ہوئی زندگی پر خون کے آنسو رویا کرتے تھے۔

ایک قطعہ میں جو کہ سوز و درد سے بھرا ہوا ہے فرماتے ہیں :-

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و سور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ان کی زندگی کو جس چیز نے شروع ہی سے مضطرب اور بے اطمینان بنا دیا تھا وہ ان کے یارانِ وطن کی بے مہری تھی۔ ذوق کے آگے ان کے کلام کو کوئی بھی ترجیح نہ دیتا تھا کیونکہ وہ شاہ وقت کے استاد تھے اور مرزا غالب محض ایک پیشہ ور شاعر۔ وہ اپنی ادبی کوششوں کو بے قدر ثابت ہوتا دیکھ کر اپنے اربابِ وطن کی شکایت کرنے لگتے ہیں :-

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب — تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

لیکن جب ان کی رسائی دربارِ شاہی میں ہو گئی اور بادشاہ نے ان کے کمالاتِ فن سے خوش ہو کر ان کو نجم الدولہ، دبیر الملک، اور نظام جنگ کے خطابات سے سرفراز کیا تو ہر طرف سے خوشامدی لوگ ان کے گرد جمع ہونے کیلئے آنے لگے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ انسان کی حالت اقبالمندی کے زمانہ میں ایک درخت کی سی ہے جس کے گرد لوگ اس وقت تک جمع رہتے ہیں جبتک کہ اس پر پھل رہتا ہے۔ جوں ہی پھل ختم ہوتا ہے لوگ اپنا اپنا راستہ لیتے ہیں اور اس درخت کو لُو اور سردی برداشت کرنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان مطلب پرست انسانوں سے دور چلے جانا چاہتے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار کا اک گھر بنایا چاہیئے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

انسان کی فطرت میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ جب اس پر غم کا بوجھ ہوتا ہے وہ خدا سے شکایت کرتا ہے اور اپنے آپ کو کوستا بھی ہے، لیکن شاعر شکایت کے ساتھ ساتھ طنز کا تیر بھی پھینکتا جاتا ہے جس کی وجہ سے شاعر کے تلخی آمیز اشعار میں ایک رفعت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں :-

مے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

ایک جگہ اور نہایت ہی زبردست تیر پھینکتے ہیں :-

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اور اس شعر میں تو طنز کی حد ہو گئی ہے :-

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

موت کا جنم

فجی جزیرے کی ایک لوک کہانی

۲

محمود ہاشمی

(۳)

برائی کا پہلا قدم

نیند گہری نیند مایوئی سو کر اٹھا تو اسے پتہ چلا کہ نہ وہاں اس کی کشتی ہے نہ ایٹالانگا اور نہ اس کے بچے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں ہیکولیو بھی نہ تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ مایوئی نے بغیر سوچے سمجھے سارا الزام ہیکولیو کے سر تھوپ دیا۔ "یہ سب اسی کی شرارت ہے میں سب سمجھتا ہوں۔ یہ سب اسی کی شرارت ہے۔" انتہائی غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہ چلایا۔ اور پھر اسی طرح دانت پیستے اور سر کو کھجاتے ہوئے اس نے سوچا۔ "مگر کیا ایٹالانگا بھی اس کے ساتھ ہی مل گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

مایوئی کی پریشانی کو شجر کلام نے اور بھی بڑھا دیا۔

دفعتاً "شجر کلام" کی شاخوں میں جنبش سی ہوئی اور اس کے پتے سسکیاں لینے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ان پتوں کے درمیان سے بارش کے قطروں سے ملتی جلتی پانی کی کچھ بوندیں بھی ٹپک ٹپک کر نیچے آب حیات کے چشمہ میں گرنے لگیں۔ جیسے وہ پتے آنسو بہا رہے ہوں۔

اس کے بعد "شجر کلام" کی شاخوں سے آواز آئی۔ "وہ آ چکی ہے۔ وہ برائی جس کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ آ چکی ہے۔ آہ اے مایوئی تم نے اپنا گھر کیوں چھوڑا تھا۔ کیوں گئے تھے۔ آخر کیوں گئے تھے؟"

اور مایوئی نے کانپتے ہوئے بے بسی کے سے انداز میں کہا "اے شجر کلام" اے آنے والی باتیں بتانے والے وجود۔ میں اپنے کیے پر نادم ہوں۔ مگر اب جبکہ سب کچھ ہو چکا ہے مجھے یہ تو بتا کہ وہ برائی کیا ہے اور وہ ہم میں کیسے داخل ہوئی؟"

شجر کلام نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا: "اے مایوئی، وقت سب کچھ بتا دے گا۔ البتہ ایک بات تجھے ضرور ابھی سے جان لینی چاہیے اور وہ یہ کہ ہیکولیو بے قصور ہے۔ اسے تو ادری نمکلا نے جا رہے ہیں اور وہ اس وقت اسی بستی میں ایک چٹان کے نیچے بیٹھا اپنی ہار پر چپکے چپکے دبی آنسو بہا رہا ہے۔ البتہ برائی کو جنم دینے والا تیرا اپنا بیٹا ہے۔ تیرا پیارا ایٹالانگا۔ اسی نے سب کو بہکایا۔ وہی سب کو لے گیا۔ اور اب اسی کی نافرمانی اور گستاخی کی وجہ سے برائی کو جرأت ہوئی کہ وہ آ جائے اور تمہیں ستائے۔"

"کیا ہم اب مٹ جائیں گے شجر کلام کیا ہماری ناتوانی زندگی ہم سے چھن جائے گی؟" مایوئی چلایا۔ اور اس کا چلانا ایسا تھا جیسے کوئی شیر شکاری کے کسی خونیں تیر کی چبھن سے بے چین ہو رہا ہو۔

"ہاں۔ اب وہ پہلی سی بات نہ رہے گی۔ اب برائی ہوگی۔ اور تمہارے بیٹے تمہارے پوتے اور آنے والی ساری نسلیں۔ اب بھوک ہوگی اور پیاس، دکھ ہوگا اور اداسی بیماری ہوگی اور موت۔"

"موت!——" اور مایوئی ایک مرتبہ پھر چلایا۔ "کیا آب حیات کا چشمہ ہمیشہ کے لئے ان سے دور ہو جائے گا۔ مگر اے شجر کلام کیا اس برائی کو کسی صورت نہیں روکا جا سکتا؟"

مگر "شجر کلام" اب خاموش ہو گیا تھا۔ البتہ اس کے پتوں کی سسکیاں تیز تر ہو گئیں اور ان کا رنگ بدلنے لگا۔ پہلے وہ نیلے تھے اب آہستہ آہستہ زرد پڑنے لگے۔ اور پھر جب وہ پوری طرح زرد ہو گئے تو ان میں سے ایک پتہ جیسے بے جان سا ہو کر نیچے آب حیات کے چشمہ میں گر گیا۔ اس کے بعد ایک اور پتہ گرا اور پھر ایک اور۔ اور یوں آہستہ آہستہ ایک پوری کی پوری شاخ خالی ہو گئی۔ اب اس شاخ میں سے ایک چیخ کی سی آواز آئی اور اس کے بعد وہ بھی نیچے پانی میں گر گئی۔

مایوئی اور چند دوسرے دیوتا جو بلوٹا میں رہ گئے تھے یہ دیکھ کر خوف سے لرز اٹھے۔ کیونکہ اس سے پہلے انھوں نے یہ باتیں نہ کبھی سنی تھیں نہ دیکھی تھیں۔

اب ان کے دیکھتے دیکھتے ایک اور انوکھی بات ہوئی۔ وہ شاخ جو پانی میں گری تھی اس کے اب تین ٹکڑے ہو گئے جن میں سے دو بڑے تھے اور ایک چھوٹا۔ پھر یوں ہی تیرتے تیرتے وہ تینوں ٹکڑے تین کشتیاں بن گئیں جن میں سے دو بڑی تھیں اور ایک چھوٹی۔ اس کے بعد یہ کشتیاں اسی پانی کی گہرائیوں میں کہیں غائب ہو گئیں اور ان کے غائب ہوتے ہی چشمہ کا پانی دھواں بن کر آہستہ آہستہ اڑنے لگا۔

"میں نے برا کیا—— بہت برا کیا۔" مایوئی نے ایک لمبی آہ بھری اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کے ساتھی بھی سر جھکائے اس کے ساتھ ہی ایک طرف کو چلنے لگے۔ سب اداس تھے اور غمگین۔ مگر اب کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ برائی آ چکی تھی اور اس سے نجات محال تھی۔

(۴)

انجام —— اصل موت

اس برائی نے جلد ہی اپنا روپ

ان کشتیوں میں بیٹھ کر پانیوں کی سیر کرنے والا اپنا ایک اپنے دفتر
ساتھیوں کے ساتھ جایا کرتا۔
نو عمر دیوتا اس نئی بستی میں بہت خوش تھے۔ انھوں نے ان بڑی کشتیوں کو جس میں بیٹھ کر وہ آئے تھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور اس سے آٹھ چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنا لی تھیں جنہیں وہ ہر وقت سمندر کے پانیوں پر کھگاتے پھرتے تھے۔ ان کشتیوں میں ہی بیٹھ کے وہ مچھلی کا شکار کیا کرتے اور جب اچھے خاصے شکار سے ان میں سے ہر ایک کی کشتی بھر پور ہو جاتی تو وہ خشکی پر اتر آتے جہاں ان کے بیوی بچے مسکراتے ہوئے ان کا خیر مقدم کرتے اور ان کا دل خوشی سے ناچ اٹھتا۔ وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں خشکی پر بھی اکثر گھوما کرتے اور اس وقت ان کے قہقہوں سے وادی میں بار بار ایک گونج سی پیدا ہوتی۔ اسی دوران میں ان کی بیویاں گھروں میں چولھے روشن کر کے اپنے شوہروں کے لئے مچھلی بھونتی رہتیں یا دور ساحل پر اپنے بچوں کو سیپ چنتے دیکھتیں اور ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ سے ان کا چہرہ دمکتا رہتا۔

یہ نئی زندگی یونہی ہنسی خوشی بسر ہو رہی تھی کہ ایک دن جب کہ نو عمر دیوتا فی فی تا مچھلیوں سے اپنی کشتی بھر کر ساحل پر اترا تو یہ دیکھ کر کہ ہمیشہ کی طرح اس کی بیوی موآ اور ان کی ننھی اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے وہاں نہیں ہیں وہ اداس ہو گیا۔ پھر جب وہ گھر پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر اور بھی رنج ہوا کہ اس کی بیوی مچھلیاں پکڑنے والے ایک جال پر آسمان کی طرف آنکھیں کئے دراز ہے اور ساتھ ہی ننھی اس کے پہلو کے ساتھ چمٹی رہی ہے۔

"آہ کاہل۔ بلوتو دور ہو گیا۔ مگر وہاں کی سستی سکھانے والی عادتیں نہ گئیں۔ موآ آخر نیند کی یہ ماتا کب تک تمہیں دھوکا دیتی رہے گی؟"

فی فی تا کی آواز سن کر اس کی بیوی نے نیم آنکھیں کھول دیں۔ مگر وہ اٹھی پھر بھی نہیں۔ اصل میں ہلنا اب اس کے بس کی بات ہی نہ تھی اس کی آنکھیں دھنستی جا رہی تھیں اور ان کا نیلا رنگ دھندلا ہو رہا تھا جیسے وہ آنکھیں بھی آب حیات کا ایک چشمہ ہوں جن کا نیلا پانی دھواں بن کر اڑ جانے پر تلا ہوا ہو۔

فی فی تا اب کچھ حیران سا ہو گیا۔ "پیاری موآ۔ یہ معاملہ کیا ہے۔ تمہاری آنکھوں کی چمک کہاں گئی اور یہ تمہارے ہونٹ کیوں سوکھتے جا رہے ہیں؟"

مگر موآ خاموش تھی۔

البتہ تھوڑی دیر بعد اس نے کراہتے ہوئے کہا: "فی فی تا مجھے کچھ ہو گیا ہے۔ اندر ہی اندر کوئی شے مجھے ڈس رہی ہے۔" اور پھر اس نے رک رک کے کہنا شروع کیا: "فی فی تا — میرے اچھے خاوند۔ آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دو — مجھے کوئی انجانی شے اوپر کو اٹھا رہی ہے اور میں محسوس کر رہی ہوں جیسے کوئی مجھے بہلا کے بہت دور لے جا رہا ہے۔ دور — بہت دور — ہم نے بلوتو چھوڑا۔ اور اس نئی بستی میں آ گئے۔ مگر اب یہ بستی بھی چھوٹ رہی ہے — کیا تم میرے ساتھ نہ چلو گے پیارے فی فی تا — کیا مجھے اجنبی دیس میں اکیلے ہی جانا ہو گا —"

"پگلی — اب تک خواب دیکھ رہی ہے" اور فی فی تا نے اپنی بیوی کے بازو کو پکڑ کر جھنجھوڑا۔ "اٹھو موآ اب جاگو۔ آخر کب تک سوتی رہو گی؟"

اور اس کی بیوی نے اپنے خاوند کے بھولپن پر مسکرانا چاہا۔ مگر اب وہ مسکرا بھی نہ سکتی تھی۔ بے جان سی آواز میں اب اس نے کہا: "یہ خواب نہیں فی فی۔ یہ خواب نہیں بھیانک حقیقت ہے۔ روز کی طرح تمہیں لینے آج جب میں ساحل پر ننھی سمیت گئی تو میں اس حقیقت سے پہلی بار سامنا ہوا۔ میں ان نیلے پانیوں پر جہاں سے کہ تمہیں آنا تھا نگاہیں جمائے بیٹھی تھی کہ ننھی سیپ چنتے چنتے بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی۔ جیسے وہ سہم گئی ہو۔ اور پھر سمندر کے اس طرف جہاں بلوتو آباد ہے اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگی: "امی وہاں سے ایک کشتی آئی ہے۔ مجھے لے جانے کیلئے" اور جب میں نے اس کے بھولپن پر ہنسنا چاہا اور پیار کرنے کے لئے اسے اپنی گود میں بٹھانے لگی تو مجھے محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ برف کا کوئی ٹکڑا ہو۔ میں نے چومتے وقت اس کے ماتھے پر بھی برف کی سی ٹھنڈک محسوس کی اور میں ابھی کچھ بھی سمجھ نہ پائی تھی کہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سر لٹک گیا اور میری چھاتی سے آ لگا۔ اس کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ میں نے بے چین ہو کر نیلے پانیوں کی طرف دیکھا کہ شاید تم آ جاؤ۔ مگر تم کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ چنانچہ میں ننھی کو اٹھائے گھر آ گئی۔"

اتنی باتیں کرنے کے بعد جیسے وہ تھک سی گئی تھی۔ اس لئے ایک لمحہ وہ گویا سانس لینے کے لئے رکی۔ پھر کہنے لگی: "اور فی فی پیارے۔ اب میری حالت بھی غیر ہو رہی ہے۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے ہمارا وہ سفر جو بلوتو سے شروع ہوا تھا ابھی ختم نہیں ہوا جیسے یہاں سے بھی کوئی کشتی مجھے کسی اور منزل پر لے جانے کے لئے آ رہی ہے۔"

اور اس کی آواز مدھم پڑ گئی۔ مگر پھر اس نے ایک سنبھالا سا لیا اور اپنی نیم جان آنکھیں کھول کر اپنے سامنے کی طرف بار بار دیکھا کئے ہوئے بولی: "لو فی فی پیارے۔ وہ کشتی آ پہنچی۔ اس کے ساتھ ہی ننھی والی کشتی

بھی ہے۔ اور دیکھو۔ ان کے ساتھ ایک تیسری کشتی بھی ہے۔ نہ جانے یہ کس کے لئے ہے وہ پر کیف۔ میں چلی پیارے۔ میں چلی۔ اچھا رخصت۔"
اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کے بازو ڈھیلے ہو کر گر پڑے۔
اور اس کا جسم ساکت ہو گیا۔
فی فی تا خوف سے لرزتا ہوا چیخا "موآ۔ اٹھو۔ موآ۔ اٹھو۔ پیاری میں تمہیں پکار رہا ہوں۔ آنکھیں کھولو۔ میری طرف دیکھو"
مگر موآ بے حس و حرکت پڑی تھی۔
پردہ بدستور چیختا رہا چیختا رہا۔
اس کی چیخیں سن کر اس کے سارے ساتھی دیوتا جمع ہو گئے "یہ کیا ہوا فی فی تا۔ کیا ہوا؟"
اور فی فی تا نے ان کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیں۔
"دوستو مدد کرو میری بیوی اور بچی کو کچھ ہو گیا ہے۔"
اور یہ کہتے ہوئے اس نے پاگلوں کی طرح اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا مگر ہونی ٹل نہ سکتی تھی اور جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔
پھر ذرا دیر بعد ہی جیسے ایک جھٹکا سا کھا کر فی فی تا کی گردن بھی تن گئی اور اس کی آنکھیں ڈراؤنی بن گئیں۔ اب بدلے ہوئے لہجے اور مدھم آواز میں وہ کہنے لگا: "دوستو دیکھو وہ دیکھو۔ وہ کشتیاں آگئی ہیں ہیں"
"کہاں ہیں وہ کشتیاں ہمیں تو کچھ نظر نہیں آرہا" سارے دیوتاؤں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے حیران سا ہو کر پوچھا۔
فی فی تا نے اس جانب اشارہ کیا جہاں ملو ٹو کی بستی تھی اور کہا: "وہ دیکھو تین کشتیاں ہیں۔ دو بڑی اور ایک چھوٹی چھوٹی کشتی میں میری ننھی بیٹھی ہے۔ اور بڑی کشتیوں میں سے ایک میں میری چہیتی بیوی ہے اور دوسری اب تک خالی ہے۔ وہ میرے لئے ہے۔ اور مجھے اب جانا ہے۔"
"کیا کہہ رہے ہو فی فی تا۔ تمہاری بیوی اور بچی تو یہ ہمارے سامنے پڑی ہیں" دیوتاؤں نے کہا۔ مگر خوف سے ان کی اپنی آواز بھی اب ہچکیاں کھانے لگی تھی۔
فی فی تا نے اب کچھ نہ کہا۔ البتہ ہنس ضرور دیا۔

اور دیوتاؤں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ اس طرح کی وحشیانہ ہنسی اس سے پہلے انھوں نے کبھی نہ سنی تھی۔
اس کے فوراً بعد ہی دیوتاؤں نے فی فی تا کی نگاہوں میں ایک انوکھی سی چمک دیکھی۔ ایک باوقار اور سنجیدہ چمک۔ مگر یہ چمک محض پل کا تماشا تھی۔ جلد ہی اس کی آنکھوں کے پپوٹے بند ہونے لگے۔ اس نے ایک گہری اور لمبی سانس لی، پھر بے دم سا ہو کر وہ لڑکھڑایا۔ اپنی بیوی کے پہلو میں جا گرا اور ڈھیر ہو گیا۔ دیوتاؤں نے اس کی آخری چیخ سنی۔ اور پھر قصہ ختم۔
اس کے بعد وہاں کی روشنی مٹنے لگی اور تاریکیاں لمحہ بہ لحظہ گہری ہونے لگیں۔ ان تاریکیوں کو چیرتی ہوئی اب کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے بہت دور کہیں کوئی طوفان بپا ہو، درختوں کے تنے ٹوٹتے ہوئے گر رہے ہوں اور ماتمی انداز میں کوئی رو رو کے سسکیاں لے رہا ہو۔
اور اسی وقت جبکہ حیرانی اور خوف سے ان دیوتاؤں کے منہ کھلے تھے اور وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، ان کے کانوں نے ایک ایسی آواز سنی جو آشنا معلوم ہوتی تھی۔ وہ چونک پڑے۔ یہ آواز "خنجر کلام" کی تھی۔ فضاؤں پر تیرتے ہوئے دور دراز سے آنے والی یہ آواز کہہ رہی تھی: "ان کے لئے بیماری ہے اور موت۔ اور ترٹینیا۔ وہ جنہوں نے بڑوں کی نافرمانی کی اور اپنے بزرگوں کو دھوکہ دیا۔ ان کے لئے آبِ حیات کے چشمہ کا پانی ختم ہو گیا۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے دھتکار دئے گئے۔ بیماری اور پھر موت۔ مگر اب مُردوں کو زمین میں دبا دو۔ تم سب کا یہی انجام ہوگا تم سب بھی ایک بیمار پڑو گے، اور مر جاؤ گے۔"
خنجر کلام خاموش ہو گیا۔ اب انہیں یقین ہو گیا کہ یہ سب کچھ موت کا کیا دھرا ہے۔ موت کا پہلا قدم اٹھ چکا ہے اور بدنصیبی کی پہلی قسط ادا کی جا چکی ہے۔ فی فی تا، اس کی بیوی اور ان کی ننھی۔ یہ تینوں موت کا پہلا شکار تھے اور موت کی کشتیاں انہیں دوسرے ساتھیوں سے کہیں دور لے جا چکی تھیں۔ اب نہ آنسو انہیں واپس لاسکتے تھے نہ آہیں اور نہ ہی کسی کی محبت بھرائی

دنیا

شور (علیگ)

خون اتنا بہائے گی دنیا — خون میں ڈوب جائے گی دنیا
گنڈروں میں سلگ رہی ہے جو آگ — سمندروں میں لگائیگی دنیا
غسل صحت کیواسطے اک بار — پھر لہو میں نہائے گی دنیا
جن کی لو سے چمن جھلس دینگے — پھول ایسے کھلائے گی دنیا
ساز تہذیب ٹوٹے تار دبیر — خونچکاں گیت گائے گی دنیا
جن کو ترسی ہیں کشتیاں برسوں — اب وہ طوفاں اٹھائیگی دنیا
اک طرف دیکھئیگی بہ نفرت — اک طرف مسکرائے گی دنیا
تاج قیصر عصائے سلطانی — ٹھوکروں میں اڑائیگی دنیا
روتے روتے فضا تھکی ہمدم — ہنستے ہنستے رلائے گی دنیا
خاک تہذیب نو کے تودوں سے — آدم نو بنائے گی دنیا

دیکھو وہ نبض سروری چھوٹی
وہ کرن انقلاب کی پھوٹی

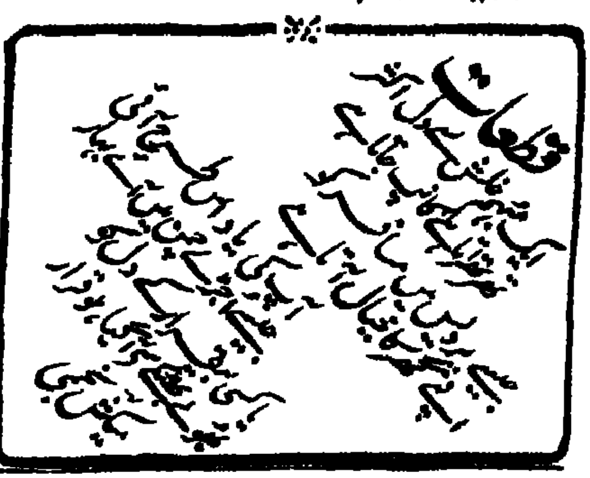
انسانوں پر ظلم ہوتا تھا۔

پھر کرام اے کے کہنے کے مطابق انھوں نے ایک گہری اور چوڑی کھودی اور اس میں ٹی ٹی تانا اور اس کی بیوی کو لٹا دیا گیا۔ نتنی کو انھوں نے اس کے بھائی کے ساتھ چٹا دیا۔ اور پھر قبر پر ریت بچھا دی۔

اس کے بعد انتہائی دکھ کے عالم میں ان تو آبا دیوتاؤں نے اپنی پنچایت بلائی اور فیصلہ کیا کہ وہ ایک بڑی سی کشتی بنائیں اور ان میں سے چند ہی اس کشتی میں سوار ہو کر واپس بلوتو جائیں اور دیوتاؤں سے اپنے قصور کی معافی مانگیں۔ اور ساتھ ہی اس سے یہ التجا بھی کریں کہ انھیں بلوتو میں واپس جا کے آباد ہونے کی اجازت دیدی جائے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ شاید اس طرح وہ بیماری اور موت کی لعنت سے بچ سکیں گے۔

چنانچہ انھوں نے ایک بڑی سی کشتی بنائی لیکن وہ بلوتو پھر بھی نہ پہنچ سکے۔ مدتوں وہ پانیوں میں ادھر ادھر بھٹکتے پھرے پر بلوتو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہا حتیٰ کہ انھوں نے ناکام و نامراد واپس لوٹنا پڑا۔

اس پہلے قافلے کے بعد بھی کئی قافلے بلوتو کی تلاش میں نکلے لیکن وہ دھند کے کسی ایسے غبار میں چھپ چکا تھا جہاں تک ان کی رسائی ممکن نہ تھی اور اس دن سے لے کر آج تک وہ بدنصیبی کے اس چکر سے نہیں نکل سکے۔ بیماری اور موت مایوئی کے نافرمان بیٹوں، بھتیجوں، اور پوتوں کا ازلی حق بن چکا ہے۔ وہ نئی بستی میں ہنسی خوشی رہتے ہیں لیکن ایک دن یہ دور ختم ہو جاتا ہے۔ بلوتو جو شاید اب موت کا جزیرہ بن چکا ہے آنے والی کوئی کشتی انہیں اپنے دوسرے ساتھیوں سے چھین کر لے جاتی ہے اور دوسرے اس کشتی کو دیکھ تک نہیں سکتے۔ زندگی کے پھول کے ساتھ موت کا کانٹا ہمیشہ کے لئے چسپاں کر دیا گیا ہے اور اس کی چبھن لاعلاج ہے۔



نقد و منظر

تبصرہ

فتراک

مصنفہ:- محترمہ جہاں بانو نقوی

ضخامت ۱۰۰ صفحے - ملنے کا پتہ:- دفتر رسالہ شہاب، بیرون دبیر پورہ - حیدرآباد دکن - قیمت دو روپے - یہ کتاب بیس دلچسپ مضامین کا مجموعہ ہے، جن میں علمی اور ادبی رنگ بہت نمایاں ہے - لطف و مزاح کی چاشنی کے ساتھ ساتھ طنز کی تلخیاں بھی موجود ہیں - دو تین سیاحتی مضامین دلچسپ ہونے کے علاوہ معلومات افزا ہیں - اشعار کے برمحل استعمال نے عبارت میں شگفتگی پیدا کر دی ہے - محترمہ کا طرز بیان خاص ہے جس میں دلکشی کے ساتھ گہرائی بھی ہے - پہلے ان کے مضامین شمالی ہند کے رسائل میں بھی چھپتے تھے مگر اب انھوں نے اپنی ادبی خدمات کو حیدرآباد دکن کیلئے وقف کر دیا ہے۔

عرفان حافظ

مترجم:- جناب شیاما چرن داس - ملنے کا پتہ:- ۱۶۴۹ وسان [illegible] اسٹریٹ - دہلی - قیمت ایک روپیہ -

حافظ شیراز پر اردو میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور ان کی غزلوں کے ترجمے بھی کئی حضرات کر چکے ہیں لیکن شیاما جی نے اخلاق و تصوف کے تیئیس مختلف عنوانات کے تحت اس لسان الغیب کے اشعار کا سلیس ترجمہ پیش کیا ہے جو بہت اچھا ہے - ہر عنوان کے اشعار شروع کرنے سے پہلے مختصر طور پر بتایا گیا ہے کہ اس خاص ضمن میں حافظ کا نقطۂ نظر اور زاویہ نگاہ کیا ہے - روحانیت اور عرفان کے دلدادگان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے - حسب ضرورت اشعار کا مطالعہ کرکے فیض روحانی حاصل کیا جا سکتا ہے - سر تیج بہادر سپرو نے مختصر سا پیش نامہ لکھا ہے۔

طبیب مرغی خانہ باتصویر

مصنف:- خواجہ عبدالسلام فوقی - ملنے کا پتہ:- دارالبلاغ، ریلوے روڈ، لاہور - قیمت تین روپے - اس سے قبل خواجہ صاحب کی دو کتابوں یعنی "کامیاب مرغی خانہ" اور "تجارتی مرغی خانہ" پر اظہار خیال کیا جا چکا ہے - یہ اسی سلسلے کی تیسری کڑی اور ایک لحاظ سے زیادہ اہم ہے - کیونکہ مرغیاں پالنے کا شوق پیدا ہو جانے کے بعد یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ ان کو مختلف بیماریوں سے کیونکر محفوظ رکھا جائے - اس کتاب میں حفظان صحت کے اصول سمجھانے کے بعد بیماریوں کی روک تھام، ان کی صحیح تشخیص اور طریقۂ علاج پر مفصل بحث کی گئی ہے - اس ضمن میں ڈاکٹری طریقوں سے لے کر معمولی ٹوٹکوں تک سبھی کچھ شامل ہے، ان اصولوں پر عمل کرتے ہوئے مرغیوں کو نہ صرف تندرست رکھا جا سکتا ہے بلکہ زیادہ تعداد میں انڈے اور تندرست چوزے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔

دنیا ہماری

مصنف:- جناب پرویز - ملنے کا پتہ:- راج محل پبلشرز - جموں (کشمیر) - قیمت ڈھائی روپے - افسانہ نگاری کی جدید روش اختیار کرتے ہوئے یہ بیس افسانے لکھے گئے ہیں - ان میں زندگی اور زندگی کے تاریک پہلوؤں پر گہری نظر ڈال کر نفسیاتی اعتبار سے ہر پہلو کا تجزیہ کیا گیا ہے - بیشتر افسانوں کا ماحول کشمیر اور وہاں کے غریب باشندوں کی قابل رحم زندگی ہے - جنسی مسائل بھی زیر بحث ہوئے ہیں مگر عریانی سے دامن بچاتے ہوئے زبان سادہ اور سلیس ہے۔

خوش انجام

مترجم:- جناب سعید الحق صاحب عاشق ایم اے - ملنے کا پتہ:- دانش محل، کوچہ ناہر خان - دہلی - قیمت سوا روپیہ - ولیم شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے (Twelfth Night) کا ترجمہ ہے - شیکسپیئر کے بہت سے ڈرامے اردو میں منتقل ہو چکے ہیں اور اس ڈرامے کا بھی ترجمہ چھپ گیا ہے تاہم سلاست و روانی اور صحیح ترجمانی مفہوم کے اعتبار سے اس کو نسبتاً زیادہ لائق وقعت سمجھا جا سکتا ہے - اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ عاشق صاحب نے اصل مکالمے کا ترجمہ کرنے کی بجائے عبارت کو محض اپنے الفاظ میں تبدیل کر دیا ہے لیکن ان کے لئے اس کے سوا چارۂ کار نہیں تھا کیونکہ شیکسپیئر کی زبان بہت مشکل اور پیچیدہ ہے - بہت سے اچھے پڑھے لکھے لوگ تو اسے سمجھنے ہی سے قاصر رہ جاتے ہیں - اس لئے اس سلسلے میں قلم اٹھانا ہی قابل داد ہے - یہ ڈرامہ بہت سی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہتا ہے، اس لئے مترجم نے ادبی خدمت کے ساتھ ساتھ درسی خدمت بھی انجام دی ہے

پیاسی آنکھیں

مصنف:- جناب دت بھارتی - ملنے کا پتہ:- ادبیات جدید - قرول باغ - دہلی - قیمت دو روپے - یہ بھارتی صاحب کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں روزمرہ کی زندگی کے عام واقعات و پہلوؤں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان میں افسانویت پیدا ہونے نہیں پائی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے افسانوں کے چند مجموعے پڑھ کر قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کر دیا - ذاتی مشاہدے کی ان میں سخت کمی ہے - زبان و بیان میں بھی ہنوز کچا پن موجود ہے - بعض الفاظ کی ہجے تک غلط ہیں اور ان غلطیوں کا ذمہ دار کاتب کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا - کتاب کے دیباچے میں موصوف نے ان تمام مدیران رسائل کو کوسا ہے جنہوں نے ان کے رشحات قلم چھاپنے سے انکار کیا - ان میں خود آزمائی کا مادہ بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے - یہ خرابی شاید ان کو آگے بھی بڑھنے نہ دے - چھوٹے سائز کے ۱۲۸ صفحات کی قیمت دو روپے زیادہ ہے۔

کنٹراکٹ برج

مصنف:- جناب محمد ابراہیم - ملنے کا پتہ:-

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

سید احتشام حسین: —— بقیہ صفحہ ۳۷

اگر کسی ادب و ادیب میں یہ خصوصیات نہیں ہیں تو وہ بے جان اور بے روح نظر آئیگا۔
احتشام صاحب کے تنقیدی خیالات و نظریات کا مفصل تجزیہ یہاں اس چھوٹے سے مقالے میں ممکن نہیں پھر بھی مذکورہ بالا خیالات اس حقیقت کو ضرور ظاہر کر دیتے ہیں کہ انھوں نے اردو تنقید میں اپنے رجحانات کے باعث کتنی بلندی پیدا کر دی ہے اور نہ صرف ادب کے لئے نئے راستے، نئی منزلیں اور نئے لائحہ عمل تیار کئے ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ زندگی کو بھی ان سے روشناس کیا ہے۔ کیونکہ زندگی اور ادب بہرحال ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں ﴿

نقد و نظر —— بقیہ صفحہ ۵۵

دفتر ماہنامہ شہاب۔ بیرون دبیر پورہ۔ حیدرآباد دکن۔ قیمت تین روپے۔
یہ تاش کے مشہور کھیل کنٹراکٹ برج پر زبان اردو میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ یہ کھیل مغربی دنیا سے تعلق رکھتا ہے لیکن مشرق میں اور خصوصاً ہندوستان میں بھی خوب کھیلا جانے لگا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ کتاب نئے کھلاڑیوں کیلئے بہت ہی مفید ثابت ہوگی۔ عام قاعدوں اور اصولوں کے علاوہ ایسے داؤ پیچ سکھائے گئے ہیں کہ اچھے پتے نہ ہوتے ہوئے بھی کس چالاکی اور ہوشیاری سے بازی جیتی جا سکتی ہے۔ پورے باون پتوں کی تقسیم کا نقشوں سے مکمل سمجھا دینا بھی کتاب کی خوبی ہے

آج کا جرمنی

گزشتہ تیس سالوں میں جرمنی نے دو عالمگیر جنگیں شروع کیں۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ دنیا جرمنی کی طرف سے غافل رہی۔ اگر دنیا کو اس خطرہ آفت سے بچانا ہے تو ہر ایک کو جرمنی کے معاملات میں دلچسپی لینا چاہیئے۔

اس وقت جرمنی کی باگ ڈور چار بڑے اتحادیوں برطانیہ، ریاستہائے متحدہ، روس اور فرانس کے ہاتھ میں ہے۔ ان میں سے ہر ایک جرمنی کے ایک حصہ پر قابض ہے اور ان چاروں علاقوں کی سیاسیات کو ہم آہنگ کرنے کے لئے اتحادی کنٹرول کمیشن موجود ہے۔ یہ اتحادی جرمنی پر کیوں قابض ہیں؟ اس کا جواب یالٹا اور پوٹسڈم کے اعلانات میں مل سکتا ہے۔ دنیا بار بار کی لڑائیوں سے بیزار ہو گئی ہے اور اتحادی چاہتے ہیں کہ جرمنی میں پھر کوئی صورت حالات رونما نہ ہو جس سے دنیا کا امن خطرہ میں پڑ جائے۔ وہ جرمنی میں اس مصمم ارادے کے ساتھ داخل ہوئے ہیں کہ عسکریت اور نازیت کا صفایا کر کے جرمنی کی زندگی کو نئے سرے سے امن پسند اور جمہوری بنیادوں پر قائم کریں۔ لیکن ابتداء میں چند فوری مسائل کا حل کرنا ضروری تھا۔ مثلاً سیاسی اور جنگی قیدیوں کو آزاد کرنا اور لاکھوں آدمیوں کا جو بے خانماں ہو چکے تھے انتظام کرنا۔ خوراک، ایندھن اور رہائشی مکانات کی انتہائی قلت اور وسائل آمد و رفت کے درہم برہم ہو جانے سے ملک کا حکومتی اور معاشی نظام سخت خطرے میں تھا۔ اتحادیوں نے سال بھر انتہائی کاوش کی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں کس درجہ کامیاب ہوئے اور اب جرمنی کی کیا حالت ہے۔

آبادی

لڑائی کے نتیجہ میں جرمنی کی وسعت اور آبادی میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ دریائے اوڈر کے مشرق کی جانب جو علاقہ جرمنی کے پاس تھا وہ سب کا سب پولینڈ نے لے لیا۔ پچیس لاکھ جرمن ضائع ہو گئے۔ ان میں سے کچھ تو مارے گئے، کچھ بیکار ہو گئے اور کچھ لاپتہ ہیں۔ ہمبرگ اور دوسرے جرمن شہروں میں بیس سے تیس سال عمر کے تنومند نوجوان بہت کم دکھائی پڑتے ہیں۔ ان لوگوں کا بھی صفایا ہو گیا ہے جو جرمن صنعت کو چلاتے تھے۔ وہ جرمن جو پولینڈ، چیکوسلوواکیہ، ہنگری، آسٹریا اور رومانیہ میں آباد کر دئے گئے تھے اب جرمنی میں لائے جا رہے ہیں اور آبادی کی کمی اس طرح پوری کی جا رہی ہے۔ معاہدہ پوٹسڈم کے مطابق پولینڈ کے جرمن جرمنی کے برطانوی اور روسی علاقوں میں اور آسٹریا، ہنگری کے جرمن امریکی، روسی اور فرانسیسی علاقوں میں آباد کئے جا رہے ہیں۔

خوراک

جرمنوں کی سب سے اہم ضروریات خوراک، ایندھن اور رہائش ہیں اور یہ ابھی تک بہت کم پوری ہو سکی ہیں۔ خوراک کی سخت کمی ہے۔ جرمنی کو اپنے بہترین حالات میں بھی گیہوں، چاول، مکئی وغیرہ باہر سے منگانا پڑتے تھے۔ اب تو ان میں سے بہت سی چیزیں قطعاً میسر نہیں ہو سکتیں۔ پچھلے سال کی فصل پندرہ فیصدی کم ہی اور اس سے حالات زیادہ بگڑ گئے۔ اس کمی کا اثر جرمنوں کے روزانہ راشن پر پڑا۔ برطانوی علاقہ میں (جہاں زراعت بہت کم ہوتی ہے) گزشتہ مارچ تک فی کس ڈیڑھ ہزار کیلوری راشن دیا جاتا تھا۔ اور عالمگیر کمی خوراک کے پیش نظر اب ایک ہزار کیلوری کرنا پڑا۔ فرانسیسی علاقہ میں بھی یہی حالت ہے۔ امریکی علاقہ میں بھی ۱۲۷۵ کیلوری کر دیا گیا ہے۔ روسی علاقہ کے بڑے شہروں اور صنعتی مرکزوں میں ڈیڑھ ہزار کیلوری ہے اور دوسری جگہوں میں ۱۲۵۰ کیلوری حالانکہ ایک شخص کے لئے ۲۷۰۰ کیلوری ضروری ہے۔ نتیجہ یہ کہ چاروں علاقوں میں جرمنوں کو پیٹ بھر خوراک نہیں ملتی۔ برطانیہ کی آزاد مزدور پارٹی کے سیاسی سکرٹری مسٹر فینر براکوے کے قول کے بموجب ہمبرگ کا ایک بچہ ڈاکٹر انسانی بالوں سے خوراک تیار کر کے اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ یہ خوراک مچھلی کی چٹنی کی مانند ہے اور توسوں پر لگائی جاتی ہے۔ ایک اور نامہ نگار کا کہنا ہے کہ اس نے کئی جرمنوں کو اپنی قیمتی چیزوں کے عوض آلو خریدتے دیکھا ہے۔ ایک امریکی نامہ نگار لکھتا ہے کہ جرمن بچے والدین کی شہ پر خوراک کے اڈوں پر دھاوا بول دیتے ہیں۔

رہائش

خوراک کے بعد رہائش کا مسئلہ ہے۔ انگریز اخبار نویس گنگز نے مارٹن لکھتا ہے کہ شہر ڈوسلڈورف میں اسی فیصدی مکانات ناقابل رہائش ہیں۔ برلن کے برطانوی حصے میں صرف تیرہ فیصدی مکانات بچ رہے ہیں۔ آس پاس کے ملکوں سے واپس آنے والے جرمنوں اور اتحادی فوجوں کی ضروریات کے باعث رہائش کا مسئلہ اور بھی نازک ہو گیا ہے۔ اب مکانات کی مرمت ہو رہی ہے، عارضی جھونپڑیاں بنائی جا رہی ہیں اور جنگی قید خانوں اور سرکاری دفتروں کی عمارتوں میں لوگ رہ رہے ہیں۔ تعمیر مکانات میں سات لاکھ آدمی کام کر رہے ہیں حالانکہ قبل از جنگ

شنکر دیال

[illegible] کی تعداد جتنی [illegible] کے لئے اسکول کھولے گئے ہیں [illegible] بعض اسکول پہلے عسکری اداروں کے ساتھ کام کرتے تھے۔ خوراک اور مکانات کی کمی کی وجہ سے صحت پر برا اثر پڑا ہے۔ زمانہ قبل از جنگ کی بہ نسبت [illegible] دق اور جلدی امراض بہت بڑھ گئے ہیں۔ صابن کی کمی [illegible] کی بیماری پھیل رہی ہے۔ انفلوئنزا، تپ محرقہ اور لال بخار کے پھیلنے کا اندیشہ ہوگیا تھا لیکن فوری تدابیر اختیار کی گئیں اور یہ بیماریاں دب گئیں۔ برطانوی علاقہ میں کئی جگہ دوا سازی کے کارخانے کھولے گئے۔ اس طرح دواؤں کی کمی پوری کی گئی۔ اسکولوں کے لڑکوں کو دوپہر کا کھانا دیا جاتا ہے اور کانوں اور کارخانوں کے مزدوروں کو خاص راشن دیا جاتا ہے۔

کوئلہ

نازیوں کے سقوط کے ساتھ جرمنی کا معاشی نظام بھی ابتر ہوگیا تھا لیکن اب اس میں پھر جان پڑ رہی ہے۔ اس بحالی میں کوئلہ کو بہت کچھ دخل ہے۔ جرمنی میں کوئلہ زیادہ تر رودہر میں پیدا ہوتا ہے جو برطانوی علاقہ میں واقع ہے۔ امن کے زمانہ میں جرمنی کی کوئلہ کی دو تہائی پیداوار رودہر ہی سے حاصل ہوتی تھی۔ برطانوی حکام نے رودہر کی تمام کوئلہ کی کانوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس وقت کوئلہ کی پیداوار چوبیس ہزار ٹن ماہانہ تھی۔ اب چالیس لاکھ ٹن ہے۔ اس کوئلہ سے نہ صرف جرمنی کے چاروں علاقوں کی صنعتوں اور شہریوں کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں بلکہ فرانس، ہالینڈ، ناروے اور ڈنمارک بھی بھیجا جاتا ہے۔ موجودہ پیداوار کافی نہیں ہے اور حکام اسے بڑھانے کی فکر میں ہیں۔

صنعت

صنعت ہی نے جرمنی کو اس قابل بنایا تھا کہ وہ دو لمبی اور خونیں لڑائیاں لڑ سکے۔ مثال کے طور پر کرپس کے کارخانے ہی کو لے لیجئے۔ یہ کارخانہ انیسویں صدی کے اوائل میں قائم ہوا۔ شروع میں اس کا مقصد محض تجارت تھا۔ بعد میں یہاں بہترین فولاد بننے لگا۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں اسی کارخانہ میں سب سے پہلی بڑی توپ بنی۔ چھوٹی توپیں بڑی ہوتی گئیں جن کا مصرف صرف لڑائی میں ہو سکتا تھا۔ اس کارخانے نے نہ صرف فولاد اور توپیں بنائیں بلکہ "خون اور فولاد" کی ایک روایت قائم کی۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جب تک جرمنی کی صنعتوں خاص کر بھاری صنعتوں کو قابو میں نہ لایا جائے اس وقت تک جنگ کا احتمال رہے گا۔ چنانچہ ۲۸ مارچ کو اتحادیوں نے جرمن صنعت کے انتظام کا ایک خاکہ تیار کیا جس کی رو سے جرمنی میں اتنے کارخانے رہنے دئے گئے ہیں [illegible] کہ نصف صنعتی پیداوار [illegible] بحال ہو جائیں اور مصنوعی چیزیں بنانا ممنوع کر دیا [illegible] کیمیاوی اجزا، مشینی آلات، رنگوں اور بجلی کی [illegible] البتہ عام استعمال کی چیزیں بنانے میں پوری آزادی [illegible] خاکہ پر بہت لے دے ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاکہ کے نتیجہ میں جرمنی کی اقتصادیات میں توازن نہیں رہے گا، جرمنی کی معاشی بحالی رک جائے گی کیونکہ جب برآمد کی چیزیں پیدا نہ ہوسکیں گی تو درآمد بھی نہ ہوسکے گی، اور یہ کہ جرمنی کی معاشی کمزوری اور زبوں حالی آئندہ انقلاب کا پیش خیمہ ہو جائے گی۔ لیکن یہ خاکہ عارضی ہے اور برطانوی نمائندے نے اسے اس شرط پر قبول کیا ہے کہ اگر جرمنی کا رقبہ کچھ اور کم ہو جائے، یا جرمنی کی آبادی چھ کروڑ پینسٹھ لاکھ سے بڑھ جائے یا اس میں باہر کی مطالبات پورا کرنے کی سکت نہ رہے یا اس کی معاشی وحدت جاتی رہے، تو اس خاکہ پر نظر ثانی ہوسکتی ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ عنقریب ان صورتوں میں سے کچھ رونما ہو جائیں اور خاکہ میں تغیر کرنا پڑے۔

بہرکیف، جرمن صنعت نسبتاً کم پیمانہ پر چالو ہوگئی ہے پتھر کے کوئلے اور مزدوروں کی قلت کے باعث فولاد کی پیداوار اتنی نہیں ہے کہ لازمی صنعتوں کی کم سے کم ضروریات کو پورا کرسکے۔ برطانوی علاقہ میں کھیتی باڑی کے آلات، موٹریں، شیشہ، کاغذ اور جوتے بھی بنائے جا رہے ہیں۔ امریکی علاقہ میں کئی کارخانے ہیں جہاں موٹریں، سائیکلیں اور ٹائپ رائٹر بنائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کھاد، دوائیں، رنگ، کیمرے اور بجلی کے بلب بھی بنائے جاتے ہیں۔ فرانسیسی علاقہ کی خاص پیداوار سوتی اور ریشمی کپڑے، چمڑے اور شیشہ ہے۔ روسی علاقہ میں لوہے، تانبے اور مصنوعی تیل کے کارخانے پھر سے کام کرنے لگے ہیں۔

عسکریت کا خاتمہ

اتحادیوں کا ایک بڑا مقصد ایک نئے جرمنی کی تشکیل ہے۔ اس کا مثبت پہلو بھی ہے اور منفی بھی۔ منفی پہلو سے مراد عسکریت اور نازیت کا استیصال ہے۔ مثبت پہلو سے مراد جرمن قوم کو نئے سرے سے ذہنی، اخلاقی اور سیاسی تعلیم دینا ہے۔ عسکریت کے استیصال میں شروع شروع میں ایک دقت یہ تھی کہ جرمن فوج اور اسلحہ ملک بھر میں پھیلا ہوا تھا۔ جب یہ سب اکٹھا کر لئے گئے تو کام آسان ہوگیا۔ اور یہ کام ہر علاقہ میں رو بہ تکمیل ہے۔ اب فوجیوں کی اکثر تعداد [illegible] صنعت، کان کنی اور دیگر پیشوں میں کھپ گئی ہے۔ جنگی سامان کی کثیر مقدار اتحادیوں کے ہاتھ آئی۔ برطانوی اور امریکی علاقہ [illegible]

[illegible] کے لئے موزوں تھا ان حصوں [illegible] نیا [illegible] ختم کر دیا گیا۔ وہ ہوائی میدان جو اتحادیوں [illegible] تھے زراعت کے لئے کسانوں کو دے دئے گئے [illegible] جرمن بحری بیڑہ اتحادیوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ عسکریت کے تمام نشانات مثلاً فوجی وردی، نازی سلام، نشانات اور جھنڈے ممنوع کر دئے گئے کسی شہری انجمن کو ایسے مشاغل اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے جو آئندہ کسی عسکری مقصد کے لئے کارآمد ہو سکیں۔ قرارداد پوٹسڈم کے مطابق جرمنی کی بھاری صنعتیں بیکار کی جا رہی ہیں۔

نازیت کا خاتمہ

اتحادیوں نے جرمنی میں داخل ہوتے ہی نازیت کو مٹانا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو نازی لیڈر، نازیت کے با اثر طرفدار، نازی پارٹی کے خاص عہدہ دار، خفیہ پولیس کے افسر، طوفانی دستے، اور وہ شہری عملہ جو اتحادیوں کے لئے مضر سمجھا گیا، سب گرفتار اور نظر بند کئے گئے۔ طریقۂ کار یہ اختیار کیا گیا کہ نازی حکومت اور صنعت کے سب عہدہ داروں سے یا ان جرمنوں سے جو ملازمت کے خواہاں تھے، ان کی گذشتہ سیاسی سرگرمیوں سے متعلق تحریری استفسارات کئے گئے۔ یہ طریق کار اچھا ثابت ہوا کیونکہ جب انھوں نے دیکھا کہ جو کوئی غلط جواب دیتا تھا اسے سخت سزا دی جاتی تھی تو صحیح صحیح جواب دینے لگے۔ جنوری سنہ ۱۹۴۶ء کے اخیر تک صرف برطانوی علاقہ میں ۷۷,۷۰۸ جرمن ملازمت سے علیحدہ کر دئے گئے اور ۵,۲۰۲,۱۷۴ (ملازمت کی) درخواستیں نامنظور کی گئیں۔ امریکی علاقہ میں ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۴۵ء تک ۱۴۱,۰۰۰ جرمن ملازمت سے برطرف کئے گئے اور فرانسیسی علاقہ میں ۱۴,۹۵۲۔ اس میں شک نہیں کہ ان جرمنوں کی برطرفی سے انتظامی اور صنعتی کاموں میں کچھ خلل پڑا لیکن یہ سب برداشت کرنا پڑا کیونکہ اس کے بغیر نازیت کا زہر نابود نہیں ہو سکتا تھا۔

تعلیم

توپوں، بمباروں اور فوجوں کی کثرت ذہنی روگ کی علامت ہے۔ جرمن ذہنیت کا سدھار عسکریت اور نازیت کا خاتمہ کرنے سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ذہنیت کے سدھار کے لئے نئے سرے سے تعلیم دینا لازمی ہے۔ جرمن بچوں اور نوجوانوں کی ذہنیت بگاڑنے کی غرض سے نازیوں نے ان کی تعلیم کو بہت پست کر دیا تھا۔ حقیقتیں ان سے چھپائیں اور غلط قدریں انھیں سمجھائیں۔ انھیں یہ جتایا کہ آزادی اور رواداری بری چیزیں ہیں اور ظلم و تشدد اچھی۔ اتحادیوں کے قبضہ سے بہت پہلے ہی نازیوں کا نظام تعلیم کئی علاقوں میں ابتری کا شکار ہو گیا تھا۔ مثلاً ڈسلڈورف میں ایک سال پہلے سے اسکول بند کر دئے گئے تھے۔ کولون میں باسٹھ فیصد ہی اسکولوں کی عمارتیں تباہ ہو چکی تھیں یا بیکار۔ کئی عمارتیں نازی حکومت نے فوجی اغراض کے لئے لے لی تھیں۔ ۸ مئی سنہ ۱۹۴۵ء کو جو اسکول چالو تھے اتحادیوں نے وہ بھی بند کر دئے اور یہ فیصلہ کیا کہ جب تک قابل اعتراض استادوں اور کتابوں کا صفایا نہ ہو جائے اور ایک مشترکہ نظام تعلیم وضع نہ ہو جائے اس وقت تک سب اسکول بند رہیں۔ جب اتحادی کنٹرول کمیشن قائم ہوا تو نئے نظام تعلیم پر غور و خوض کرنے کے لئے ایک تعلیمی کمیٹی قائم کی گئی جس نے نیا نظام تجویز کیا۔ فروری سنہ ۱۹۴۶ء تک برطانوی علاقہ میں ماسوائے برلن کے ۱۲,۵۲۴ اسکول کھولے گئے جن میں طلبا کی تعداد ۲۰,۱۰,۱۸۰ تھی۔ یہ اسکول خاص طور سے متعلق عمارات میں، نیز ان عمارات میں جو ہوائی حملوں سے بچاؤ کے لئے بنائی گئی تھیں قائم کئے گئے۔ جرمن استاد تعداد میں تو کم ہیں لیکن یہ وہ لوگ ہیں جن کی نازیت دشمنی مسلم ہے۔ استادوں کی کمی اس طرح سے پوری کی گئی کہ انگلستان سے قابل استادوں اور استانیوں کی ایک کثیر تعداد جرمنی لائی گئی۔ نئی کتابیں مرتب کی گئیں۔ بچوں کی تعلیم کے لئے خاص ریڈیو پروگرام اور فلم جاری کئے گئے۔

یونیورسٹیاں پھر سے کھلنے لگی ہیں۔ برطانوی علاقہ کی چھ یونیورسٹیاں (گوٹنجن، منسٹر، بون، کیل، کولون اور ہیمبرگ) کام کرنے لگی ہیں۔ طلبا تو بہت ہیں لیکن جگہ ابھی کم ہے۔ گوٹنجن یونیورسٹی ہی کی مثال لے لیجئے۔ کنٹرول کمیشن نے اس یونیورسٹی میں طلبا کی تعداد ساڑھے تین ہزار تجویز کی ہے لیکن سات ہزار درخواستیں آئیں۔ جو لوگ طوفانی فوج یا خفیہ پولیس میں رہے ہیں وہ نہیں لئے جاتے۔ ان بچوں کو جو لڑائی کے زمانے میں یتیم ہوئے، ان عورتوں کو جن کے شوہر لڑائی میں کام آئے، ان فوجیوں کو جو لڑائی میں کسی نہ کسی طرح بیکار ہوئے، ان لوگوں کو جن پر نازیوں نے ظلم ڈھائے اور طالب علموں کو جو کم عرصہ میں امتحان پاس کر سکیں داخلہ کے وقت ترجیح دی جاتی ہے۔

سیاسی جماعتیں

اتحادی جمہوریت پسند سیاسی جماعتوں کی تشکیل میں مدد کر رہے ہیں۔ اس طرح سے جرمن قوم کو نئی سیاسی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اس وقت جرمنی میں تین سیاسی جماعتیں ہیں۔ ایک اشتراکیوں کی ہے۔ دوسری اجتماعی جمہوریت پسندوں کی اور تیسری مسیحی جمہوریت پسندوں کی۔ روسی علاقہ میں اشتراکی اور اجتماعی جمہوریت پسند پارٹیاں آپس میں مل گئی ہیں

[illegible] ہو گیا تھا۔ چنانچہ [illegible] میں [illegible] تک نہیں [illegible] جا رہا ہے [illegible] تھا لیکن جب یہ دیکھا گیا [illegible] اشتراکیوں اور اجتماعیوں کے اختلافات [illegible] ہو جاتا ہے۔ دوسرے علاقوں میں "متحدہ اجتماعی پارٹی" [illegible] کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

برطانوی حکام اپنے علاقہ میں کچھ عرصہ تک غیر جانبدار رہے۔ اس [illegible] اشتراکیوں کو [illegible] کا موقع ملا کہ برطانوی علاقہ روسی علاقہ کے [illegible] سیاسی اقتدار سے بہت پست ہے۔ اب برطانوی حکام اجتماعی جمہوریت پسندوں کی پوری ہمت افزائی کر رہے ہیں کیونکہ نظریاً اجتماعی جماعت برطانوی نظریۂ جمہوریت کے قریب تر ہے۔ اب یہ پارٹی برطانوی حکام سے پورا تعاون کر رہی ہے۔ اس جماعت کا عمر رسیدہ لیڈر کرٹ شو میکر ہے جو مدت تک سیاسی قید خانے میں رہ چکا ہے۔

مجموعی حالت

گذشتہ سال میں جرمنی نے ہر لحاظ سے ترقی کی ہے۔ اتحادیوں نے نراج کی جگہ پھر امن قائم کر دیا ہے، جرمنی کو ہمہ گیر قحط اور وباؤں سے بچا لیا ہے اور جرمن اقتصاد کے مفلوج ڈھانچے میں نئے سرے سے جان ڈال دی ہے۔ جرمنی کی ابتر حالت، باہری دنیا کی معاشی کمزوری اور مشترکہ قبضہ کی قباحتوں کے پیش نظر، اتحادیوں کا یہ کارنامہ کافی شاندار دکھائی دیتا ہے۔

اتحادیوں کو اپنے [illegible] مقصد میں یقینی اور مسلسل کامیابی ہوئی ہے۔ جرمنی میں تخفیف فوج و اسلحہ عمل میں آ چکی ہے۔ حکومت، تعلیم اور اقتصادیات سے نازیت مٹا دی گئی ہے۔ لیکن جرمن قوم کو جمہوریت کے لئے تیار کرنا باقی ہے اور اس کے لئے وقت اور محنت درکار ہے۔

کلی

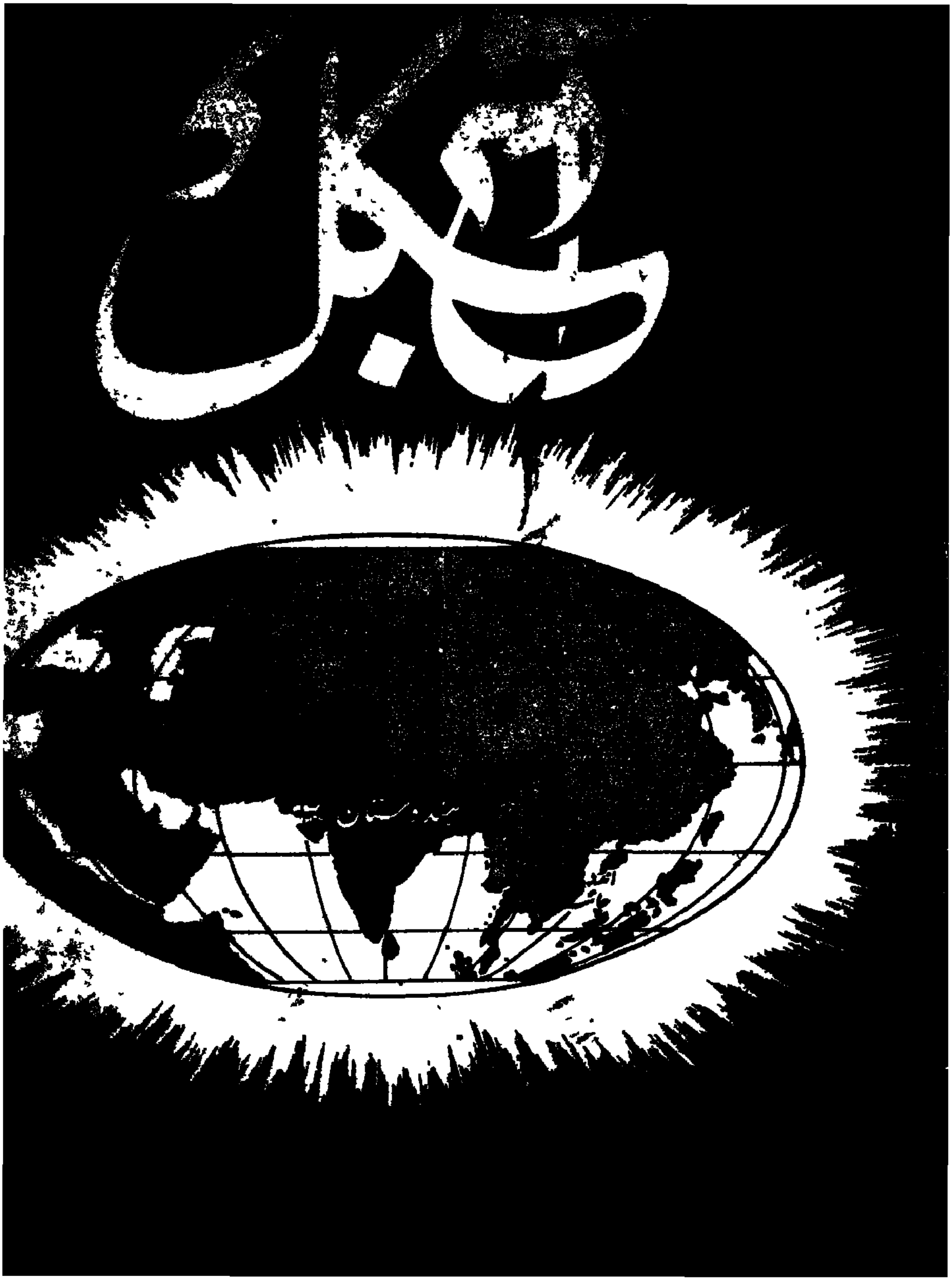
ہاشم عظیم آبادی

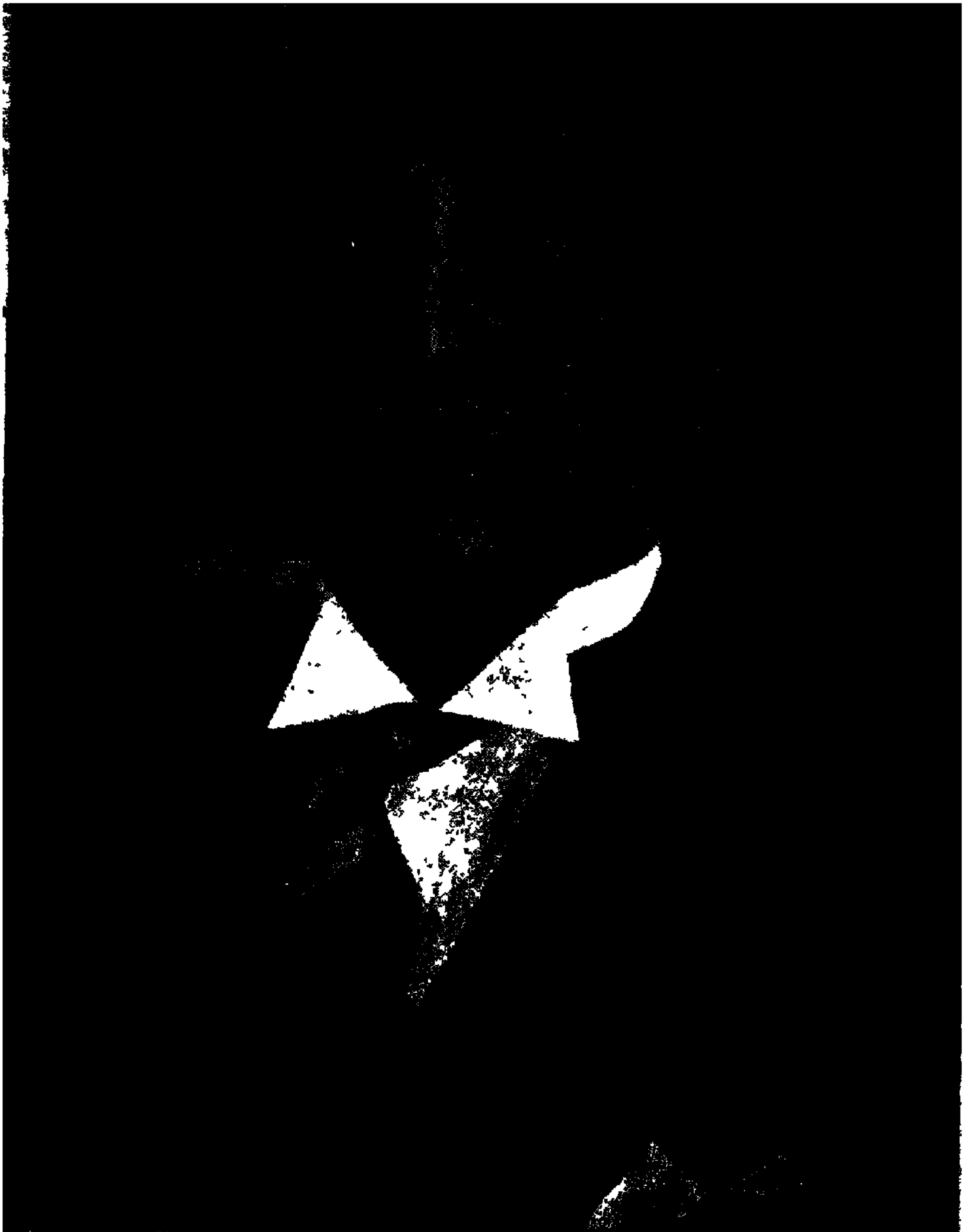
اے کلی تو اس طرح کیوں مضطر و دلگیر ہے
تو کلی ہے یا سراپا درد کی تصویر ہے
تیرے لب پہ مہر خاموشی ہے کیوں چھائی ہوئی
ہے سبب کیا اس طرح تو کیوں ہے خزانی ہوئی
کچھ تو کہہ ہے راز مخفی جس سے تو مجبور ہے
بیکلی دل کو ہے تیرے ظاہرا مسرور ہے
میں سمجھتا ہوں خموشی میں جو مخفی راز ہے
تیری ہستی بزم عالم کا شکستہ ساز ہے

آئندہ اشاعت کے چند اہم مضامین

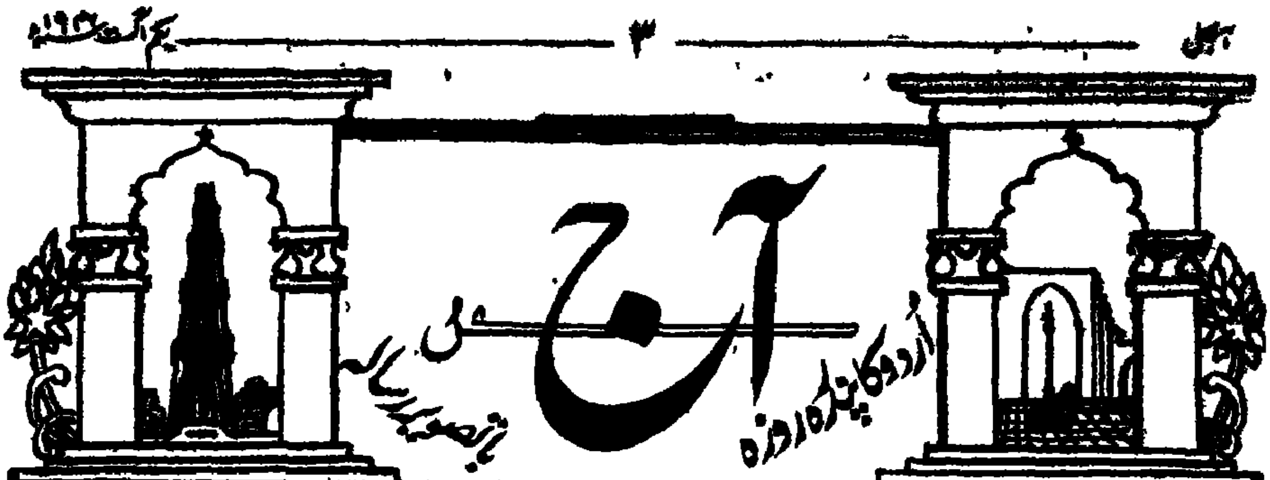
۱۔ [illegible] ... جناب فراق گورکھپوری
۲۔ مرزا محمد سلیمان (مع تصویر) ... ڈاکٹر محمد حنیف [illegible]
۳۔ مشرق وسطیٰ ... جناب [illegible]
۴۔ ننگے بھوکے گیدڑ (خلیل جبران) ... جناب حبیب اشعر دہلوی
۵۔ اقبال کے تضادات پر ایک نظر ... جناب بشیر [illegible] القادری
۶۔ افسانہ نگار خواتین ... جناب مظہر ممتاز
۷۔ ناکردہ گناہ (افسانہ) ... جناب علی عباس حسینی
۸۔ قدیم چین میں ہاتھی دانت کا کام ... محترمہ [illegible]
۹۔ نواب مرزا (افسانہ) ... جناب [illegible]
۱۰۔ دنیا کے دو سب سے بڑے کتب خانے ... جناب گوربچن سنگھ
۱۱۔ ۳ نظمیں ... جناب اطہر رضوی
۱۲۔ آسٹریلیا کی اونی صنعت ... جناب [illegible]
۱۳۔ تمناؤں کے مجرے میں (افسانہ) ... محترمہ شاہدہ [illegible]

مضامین [illegible] پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس نمبر ۱۲۴ سے شائع کیا۔


تجلی



سر شاہ محمد سلیمان مرحوم



چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۵ | فہرست | یکم اگست ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے (علیگ) ایل ایل بی

نائب مدیران
راجیندر ناتھ شیدا — فضل حق قریشی — مشیر احمد
ایم اے — (دہلوی) — ایم اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۴۶ دہلی

رفتارِ زمانہ

حیدرآباد میں دستوری تبدیلیاں

حکومت نظام کی مجلس انتظامیہ کے صدر اعظم نواب صاحب چھتاری نے ایک اعلان میں فرمایا ہے کہ نئی حکومت اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ایک نئی مجلس آئین ساز قائم کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ۱۹۳۹ء کی دستوری تجاویز میں اہم تبدیلیاں ہونے کے علاوہ مجلس آئین ساز کے ضابطے اور انتخاب وغیرہ کے قوانین میں بھی ترمیم و تنسیخ ہوگی۔ آئندہ انتخابات سے متعلق لائحہ عمل کے عنقریب شائع ہونے کی توقع ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ترمیم شدہ قوانین میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر طبقے کے مفاد و مقاصد برقرار رہیں۔ بعض ایسی اہم تبدیلیاں بھی ہوں گی جن کے دور اندیش نتائج کا لحاظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ حضور نظام رعایا اور حکومت کے مابین ایک قریبی تعلق اور یگانگت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ عوام کی طرف سے دو نمائندے مجلس انتظامیہ میں بھی ہوا کریں گے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مجلس آئین ساز کے مرتب کئے ہوئے قواعد و ضوابط کو مجلس انتظامیہ پوری طرح عمل میں لاتی ہے یا نہیں، حضور نظام نے چند ہدایات جاری کی ہیں جن کا اعلان عنقریب ہو جائے گا۔

ایران اور صلح کانفرنس

ایران کے وزیر اعظم ایم قوام السلطنت نے امریکہ، برطانیہ، روس، فرانس اور چین کے ان نمائندوں سے جو طہران میں موجود ہیں، گفتگو کے دوران میں کہا کہ ایران بھی صلح کانفرنس میں شامل ہونے کا آرزومند ہے اور اس کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔ انہوں نے ایک بیان میں جو پانچوں نمائندوں کو بھیجا گیا تحریر کیا ہے کہ ایران نے فتح حاصل کرنے کے سلسلے میں اتحادیوں کی پوری پوری مدد کی ہے اسلئے اسکا حق ہے کہ وہ صلح کانفرنس میں بھی شریک ہو۔ انہوں نے بتایا کہ ”اقوام متحدہ کے میثاق کی دفعہ ۳ کے بموجب ایران کو اس کانفرنس کے لئے دعوت دینی ضروری ہے۔ حالانکہ میثاق مذکور کی دفعہ ۳ میں صلح کانفرنس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کے پہلے پیراگراف میں کہا گیا ہے“ یہ ادارہ اس اصول پر قائم کیا گیا ہے کہ اس میں شامل ہونے والے تمام اراکین کامل آزادی میں برابر کے شریک ہوں گے۔

مفتی اعظم اور حکومت مصر

یروشلم کے مفتی اعظم الحاج امین الحسینی کے سرزمین مصر پر پناہ گزین ہوتے ہی حکومت برطانیہ نے حکومت مصر سے دریافت کیا تھا کہ مفتی اعظم کے آئندہ ارادے کیا ہیں اور وہ سیاسی معاملات میں عملی حصہ لیں گے یا نہیں۔ لندن کے محکمۂ امور خارجہ نے اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ حکومت مصر اس امر کے لئے بالکل تیار ہے کہ وہ مفتی صاحب کو سیاسی جھگڑوں سے، خصوصاً برطانیہ کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کرنے سے حتی الامکان باز رکھے اور جہاں تک ہو سکے وہ انہیں سرزمین مصر پر شاہی مہمان کی حیثیت سے پُرسکون زندگی بسر کرنے دے۔ اسوقت مفتی صاحب شاہ فاروق کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے شاہی محل میں خیر و عافیت کے ساتھ دن گذار رہے ہیں۔ سیاسی حلقوں میں یہی امید قائم کی گئی ہے کہ وہ خود بھی خاموش رہنے کو ترجیح دیں گے۔

سرخ فوجوں کا جال

واشنگٹن کے سیاسی حلقوں میں یہ یقین بڑی تیزی کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں جمتا چلا جا رہا ہے کہ روس اپنی خاص حکمت عملی سے اس کوشش میں ہے کہ تمام مشرقی یورپ میں جتنی دور تک ممکن ہو سکے اپنی فوجوں کو پھیلا دے۔ ایک طرف یہ چال چلی جا رہی ہے اور دوسری طرف پیرس میں صلح کانفرنس کا انعقاد عمل میں آ رہا ہے۔ ان باتوں سے صورت حالات کے نازک ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اسوقت امریکہ کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ قبضہ و تسلط حاصل کرنے والی فوجیں فوراً دوسرے ملکوں کو چھوڑ کر اپنے وطن چلی جائیں۔ اس غرض کے ماتحت امریکہ کے سیکرٹری آف اسٹیٹ کی کوشش ہے کہ بہت جلد رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری اور فن لینڈ کے ساتھ معاہدۂ صلح کر لیا جائے کیونکہ ایسا ہو جانے کے بعد ہی روسی فوجوں کو ان ملکوں سے دور رکھنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا جا سکیگا۔ مسٹر بائرنس کے لائحہ عمل کے مطابق قدرتی طور پر ان کا دوسرا قدم آسٹریا کے ساتھ معاہدۂ صلح کرنے کے لئے ہوگا نیز اس مسئلے کو طے کرنے کیلئے بھی کہ پولینڈ میں روسی فوج کتنی تعداد میں

اپنے عہدے سے الگ ہو رہے ہیں۔

پونہ کے قریب جنگی اکاڈمی

حال ہی میں ہندوستان کے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک پونہ تشریف لے گئے تھے۔ اس دوران میں انھوں نے ہندوستان کی قومی جنگی اکاڈمی قائم کرنے کے لئے جھیل کھڑک واسلا کے قریب ایک وسیع قطعہ زمین منتخب فرمایا جسے اکاڈمی کی مجلس عاملہ نے بھی پسند کر لیا۔ مکمل ہو جانے پر اس اکاڈمی کی عمارتوں میں سولہ ہزار سپاہی بیک وقت رہ سکیں گے جن میں سے دو ہزار چار سو کے قریب طالب علم، اساتذہ، جنگی عملہ اور ان کے کنبہ دار ہونگے۔ حکومت ہند کا محکمہ جنگ جھیل مذکور کے قریب پانچ ہزار ایکڑ زمین حاصل کرنے کے لئے حکومت بمبئی سے مدد لے رہا ہے۔ قوی امید ہے کہ موسم سرما کے شروع ہوتے ہی عمارت کی تعمیر شروع ہو جائے گی اور دو تین سال کی مدت میں اکاڈمی کا نظام عمل قائم ہو جائیگا۔ سنا گیا ہے کہ اس سب کمیٹی کی تجاویز بھی جو نصاب و طریق تعلیم اور تعمیر و ترتیب کی جزئیات پر غور و خوض کرنے کے لئے بنائی گئی تھی مجلس عاملہ نے منظور کر لی ہیں۔ مجلس مذکور نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اکاڈمی میں داخلے کی کیا صورت ہوگی، کس قسم کی تعلیم و تربیت دی جائیگی اور کتنے طلبا شروع میں داخل ہو سکیں گے۔ اس امر کا لحاظ رکھا جائیگا کہ اکاڈمی اپنی کیفیت اور قومی یادگار کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہو۔

ایران میں جمہوری جماعت

ایران کے وزیر اعظم قوام السلطنت نے طہران سے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ایک نئی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں جس کا نام ایران کی جمہوری جماعت ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ اسکی سب سے بڑی پالیسی یہ ہوگی کہ ہمیشہ کی طرح ایران کی آزادی اور اس کے مفاد کو برقرار رکھنے کے لیے وہ مناسب طریق کار اختیار کرے اور ان تعلقات کو جو اتحادی ملکوں خصوصاً روس، برطانیہ اور امریکہ سے قائم ہیں، زیادہ سے زیادہ استوار رکھے۔ انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ میں ایران کے اندرونی معاملات میں کسی غیر ملکی مداخلت کو ہرگز گوارا نہیں کروں گا کیونکہ دوسروں کے دخل در معقولات سے بچے رہنے ہی پر قومی زندگی کی بقا منحصر ہوتی ہے۔ اسی لئے خارجی تعلقات میں اس نقطے کو میں سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ میں ان تمام اصلاحات کو بروئے کار لاؤں گا جو تمام ایرانیوں کی فلاح و بہبود کا باعث ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں اہل وطن کا فرض ہے کہ وہ خود غرض اور فتنہ پرداز لوگوں کی طرف سے ہوشیار رہیں اور انکی کسی بات پر توجہ نہ دیں۔

چین میں پہلا افغانی سفیر

لڑائی کے دوران میں اور خصوصاً لڑائی کے بعد سے افغانستان کو عالمگیر سیاست میں خاص اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ اس سے قبل اس ملک کا کوئی سفیر یا سیاسی نمائندہ چین میں نہیں بھیجا جاتا تھا لیکن اب دونوں ملکوں کے مابین فیصلہ ہو گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ملک میں اپنے اپنے نمائندے بھیجیں تاکہ دوستانہ تعلقات اور بھی تقویت کے ساتھ قائم ہوں۔ چنانچہ مسٹر حبیب اللہ کو جو اس وقت افغانستان کے محکمۂ امور خارجہ کے نائب وزیر ہیں، نامزد کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ملک کے پہلے سفیر کی حیثیت سے چین تشریف لے جائیں۔ قوی امید ہے کہ یہ سلسلہ دونوں ملکوں کے تجارتی، ثقافتی اور سیاسی تعلقات کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ افغانستان نے ادارۂ اقوام متحدہ کی رکنیت کے لئے بھی درخواست دی ہے۔

کائناتی شعاعیں

اس کرۂ ارض کی فضا سے گذرتے وقت کائناتی شعاعوں کے صدہا قسم کے مفید اجزا تلف اور ضائع ہو جاتے ہیں۔ قیاس ہے کہ وہ اجزا بھی ہماری زندگی کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان نازک حصوں کی حقیقت جو فضائی چھلنی میں چھنتے رہنے کے باعث ہم تک نہیں پہنچ سکتے، پوری طرح سمجھنے کے لئے سائنسدانوں کو اس فضا سے باہر جانا پڑیگا۔ کم و بیش چالیس ہزار فٹ کی بلندی اس جانچ پڑتال کے لئے کافی ثابت ہوگی۔ چنانچہ حکومت نے ایک کثیر رقم کائناتی شعاعوں کے سب سے بڑے ماہر پروفیسر بلیکٹ کو پیشگی دیدی ہے تاکہ وہ اپنے تجربات میں مصروف ہو جائیں۔ بعض بہت اونچے اڑنے والے جہازوں کی شکل میں اپنے فضائی معمل بنانے ہونگے۔ ان کے تحقیقاتی لائحہ عمل کا انتظام ایئر بورن ریسرچ کمیٹی کے سپرد کیا گیا ہے جس کے صدر سر ہنری ٹزارڈ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سائنسدان ان اجزا کی جانچ پڑتال ہی پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ وہ ان کو اس دنیا میں خود تخلیق کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ ان چیزوں سے استفادہ کیا جا سکے جن سے قدرت ہمیں محروم کر دیتی ہے۔ اس قسم کی تحقیقات کے سلسلے میں بمبئی کے مشہور پروفیسر ایچ جے بھابھا مقرر کئے گئے ہیں۔ وہ اچھے سائنسدان ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ مصور بھی ہیں۔ یہ دو خوبیاں ہیں جو ایک ہی ذات میں بڑی مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔

ہندوستان اور مسئلہ خوراک

ادارۂ اغذیہ و زراعت کے ڈائرکٹر جنرل سر جان بائڈ اور نے ایک بیان میں فرمایا کہ ہندوستان میں کال پڑنے کا سبب آبادی کا ضرورت سے زیادہ ہونا نہیں ہے بلکہ اسکی وجہ قلت پیداوار ہے۔ لوگوں نے سائنس کے جدید ترین طریقہ ہائے زراعت کے ماتحت پیداوار میں اضافہ کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ حکومت ہند کے رکن اغذیہ سر جے پی سریواستو نے اپنے عہدے سے دستبردار ہوتے وقت مسئلہ خوراک پر تبصرہ کیا اور بتایا کہ

ان مصیبت کو دور کرنے کے لئے کیا کچھ کوششیں کی گئی ہیں۔ ریفت ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر ریاست میں بہت بڑا سرکاری عملہ اشیائے خوردنی فراہم کرنے اور انہیں منصفانہ اور مساوی طریقہ پر تقسیم کرنے میں مصروف عمل ہے۔ اس عارضی محکمے میں تقریباً ایک لاکھ نفوس کام کر رہے ہیں۔ درآمد کے اعداد و شمار بیان کرتے ہوئے موصوف نے کہا: سنہ ۱۹۴۶ء کے شروع سے اب تک ہم کو تقریباً پانچ لاکھ تینتیس ہزار ٹن گیہوں آٹا، اور جوار وغیرہ مل چکا ہے تینتیس ہزار ٹن چاول اس کے علاوہ ہیں۔ ایک لاکھ چھ ہزار ٹن اناج جہازوں پر لدا ہوا راستے میں ہے اور عنقریب ہندوستان پہنچنے والا ہے تین لاکھ بیالیس ہزار ٹن دوسرے ملکوں کی بندرگاہوں پر خالی جہازوں کے انتظار میں پڑا ہے۔ یہ اعداد و شمار کمبائنڈ فوڈ بورڈ کے الاٹمنٹ کے بموجب ہیں اور امید ہے کہ اگر مزید کوشش کی جائے تو ان میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

فلپائن میں آزاد جمہوریت

عین اس روز جبکہ امریکہ والے اپنے ملک کی آزادی کی سالگرہ منا رہے تھے فلپائن کے طول و عرض میں بھی نعرۂ آزادی گونج اٹھا۔ صدر ٹرومین کی جانب سے امریکی ہائی کمشنر مسٹر پال میکنٹ نے اسکا اعلان کیا۔ اس موقعہ پر جنرل میک آرتھر نے امریکی فوجوں کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ برطانیہ کی طرف سے لارڈ کلیرن موجود تھے جو جنوب مشرقی ایشیا میں برطانوی اسپیشل کمشنر ہیں۔ مسٹر میکنٹ نے فرمایا کہ امریکہ نے فلپائن کو آزادی دینے کے سلسلے میں اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ فلپائن پر امریکی تسلط اڑتالیس سال تک قائم رہا ہے۔ امریکہ آئندہ بھی اس نئی جمہوریت کو پروان چڑھانے میں ہر قسم کی مدد دیتا رہے گا۔ اس جمہوریت کے پہلے صدر ڈاکٹر مینوئل روکساس مقرر کئے گئے ہیں۔ جنرل میک آرتھر نے جشنِ آزادی میں حصہ لینے والے لاکھوں انسانوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ان تمام لوگوں کے کان جو جاپانیوں کے ظلم و ستم برداشت کر چکے ہیں، نعرۂ آزادی سننے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور ان کے دلوں میں ایک نئے اعتقاد کی روشنی فروزاں تھی۔ اس موقعہ پر اگر انہیں آزادی نہ دی جاتی تو یقیناً زبردست مایوسی ہوتی۔ صدر ٹرومین نے فلپائن والوں کے لئے اپنا پیغام نشر کرتے ہوئے کہا کہ فلپائن کو آزادی دے کر گویا جزائر بحر الکاہل میں جمہوریت کی بنا رکھنے کا ایک زبردست تجربہ کیا گیا ہے خدا کرے یہ تجربہ راس آئے اور کامیاب رہے۔

طبقاتی تقسیم

ادارۂ اقوام متحدہ کا ایک شعبہ تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی انتظامات سے متعلق ہے۔ اس کے سکریٹری ڈاکٹر جولین ہکسلے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے ادارے کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ ادارے کی مرکزی حیثیت ختم کر کے اس کو دنیا کے دس مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر طبقے کا نظام عمل بالکل جدا ہو۔ ان کے خیال کے مطابق تقسیم ان دس طبقات پر ہو سکتی ہے ۱۔ شمالی امریکہ ۲۔ کیریبین ۳۔ جنوبی امریکہ ۴۔ مغربی یورپ ۵۔ مشرقی یورپ اور سوویٹ روس کی ریاستہائے متحدہ ۶۔ مشرق وسطیٰ (معہ شمالی افریقہ) ۷۔ افریقہ ۸۔ صحرا کا جنوبی حصہ ۹۔ ہندوستان برما اور لنکا ۱۰۔ مشرق بعید اور آسٹریلیا۔ انھوں نے اس خاکے کے ساتھ یہ بھی تحریر کیا کہ ان میں سے ہر ایک نظام کو چلاتے اور قائم رکھتے وقت اس امر کا خاص لحاظ رکھنا پڑے گا کہ کہیں ایسی صورت پیدا نہ ہو جائے کہ کوئی طبقہ فکر و نظر کے اعتبار سے اپنی کوئی محدود انفرادیت پیدا کر کے ایک الگ ثقافتی قومیت بنا بیٹھے۔ یا وہ کلیۃً کسی بڑا قوت کے زیر اثر ہو کر اپنی انانیت کو ختم کر دے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اہم باتوں کے اعتبار سے بین الاقوامی نظام پھر بھی قائم رہیگا۔ مثلاً ایٹم بم کے معاملے میں ایک مرکز پر رہنا ضروری ہے لیکن دوسرے ثقافتی معاملات میں یہ تقسیم مفید اور قابل عمل بن سکتی ہے۔

برما میں تعمیر کا لائحۂ عمل

سب جانتے ہیں کہ جاپانی حملوں کے باعث برما میں شدید قسم کی تباہی رونما ہوئی اور جان و مال کے نقصانات کے ساتھ ساتھ عمارتیں بھی مسمار ہو گئیں۔ امن و عافیت کی فضا قائم ہوتے ہی بعد جنگ کے منصوبے عمل میں آنے شروع ہو گئے تھے۔ اب حکومت سب سے زیادہ توجہ سرکاری کوارٹروں کی طرف مبذول کر رہی ہے کیونکہ سرکاری اہلکار اور افسران جائے رہائش نہ ہونے کے باعث سخت دقتوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک خاکہ اور لاگت کا تخمینہ مرتب کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پر کم و بیش ایک کروڑ روپیہ خرچ ہونگے۔ سرکاری ملازمین کو وہ کوارٹر مل جانے کے بعد عوام کو خود بخود رہائشی سہولت حاصل ہو جائے گی۔

جرمنی کے حصے بخرے کرنے پر اعتراض

پیرس میں ہونیوالی مجلس وزرائے خارجہ کے ایک اجلاس میں سوویت روس کے نمائندے مسٹر مولوٹوف نے بڑی شدومد کے ساتھ کہا کہ جرمنی کو اس کے باشندوں کی مرضی کے بغیر تو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے اور نہ وہاں فاقہ قائم کرنے کی صورت پیدا کی جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہارے ہوئے دشمن سے بدلہ لینا کوئی قابل تحسین سیاسی حکمت عملی نہیں ہے۔ انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ جرمنی کو صرف کسانوں ہی کی نگری نہ بنایا جائے بلکہ اسکے صنعتی اداروں کو قائم رکھتے ہوئے کوشش کی جائے کہ وہاں فولاد کی پیداوار بدستور ترقی کرے بشرطیکہ حفاظت کے ایسے ذرائع بھی اختیار کئے جائیں کہ آئندہ اس کی طرف سے لڑائی کا امکان پیدا نہ ہو۔

موجِ ترنم

فراق گورکھپوری

بس اک دامنِ دل گلستاں گلستاں
گریباں گریباں بیاباں بیاباں

حجابات میں تو نمایاں نمایاں
فروزاں فروزاں درخشاں درخشاں

ترے زلف و رُخ کا بدل ڈھونڈھتا ہوں
شبستاں شبستاں چراغاں چراغاں

خط و خال کی تیرے پرچھائیاں ہیں
خیاباں خیاباں گلستاں گلستاں

وہی حیرتیں ہیں وہی وحشتیں ہیں
گلستاں گلستاں بیاباں بیاباں

سراسر ہے جمعیتِ دل کی تصویر
تری زلفِ پُرخم پریشاں پریشاں

ہو قوسِ قزح شبنم آلود جیسے
ترا قدِ رنگیں پشیماں پشیماں

وہی اک تبسم چمن در چمن ہے
وہی پنکھڑی ہے گلستاں گلستاں

لپٹ زلفِ مشکیں کی تا تار تا تار
دمک لعلِ لب کی بدخشاں بدخشاں

جنونِ محبت ان آنکھوں کی وحشت
بیاباں بیاباں غزالاں غزالاں

یہ سازِ خموش آج تو دے اٹھا ہے
سکوتِ نظر بھی غزلخواں غزلخواں

ہے سینہ کہ سنگیت پچھلے پہر کا
وہ چہرہ کہ اُوشا له پشیماں پشیماں

جھلاجھل سجل روپ کی رسمساہٹ
شبستاں چراغاں چراغاں

دھواں بوئے گیسو کا دشتِ ختن ہے
ان آنکھوں کا جادو پرستاں پرستاں

کمر سے خجل رقصِ شعلہ کی موجیں
نظر سے فضائیں گلستاں گلستاں

وہ تھے رازِ پنہاں جنہیں سب نے جانا
ہویدا ہویدا نمایاں نمایاں

یہی جذبِ پنہاں کی ہے داد کافی
چلے آؤ مجھ تک گریزاں گریزاں

زمیں تا فلک شامِ غم کا دھندلکا
محبت کی دنیا ہراساں ہراساں

کہاں اٹھ رہی ہے کہاں پڑ رہی ہے
نگاہِ محبت پریشاں پریشاں

چلے آ رہے ہیں چلے جا رہے ہیں
کدھر سے کدھر کو خراماں خراماں

ہر اک واقعہ درد آموزِ الفت
بس اک دیس ماتم دلبستاں دلبستاں

وہی اک نظر ڈوبتی جا رہی ہے
وہی ایک نشتر رگِ جاں رگِ جاں

کہیں یوں بھی بدلی ہیں غم کی فضائیں
وہی بادِ باراں بہاراں بہاراں

وہ شوخی میں اندازِ پنہاں حیا کے
حیا میں وہ شوخی نمایاں نمایاں

فراقِ حزیں سے تو واقف تھے تم بھی
وہ کچھ کھویا کھویا پریشاں پریشاں

له اوشا صبح کی دیوی جو پو پھٹنے سے پہلے شفق کے ہلکے نقوش کے پیچھے جلوہ گر ہوتی ہے

سر شاہ محمد سلیمان مرحوم

سر شاہ محمد سلیمان صاحب ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات چھیالیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا ۱۸۹۵ء میں چرچ مشن ہائی اسکول جون پور میں ہوئی تھی۔ اس وقت انھوں نے اس زمانے کا انگریزی مڈل امتحان فرسٹ ڈویزن میں پاس کیا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے بہت تیز طلبا میں سے تھے۔ ہر شخص ان کی ذہانت کا معترف تھا وہ بہت سادہ مزاج، شرمیلے اور کم گو تھے اور اپنے اسکول کے ذہین ترین طلبا میں سے تھے۔ ان کا نام آج تک وہاں کے طلباء میں ضرب المثل ہے۔ ان کے عادات و اطوار، ان کی محنت اور ان کی ذہانت کی داستان اب تک تازہ ہے۔

مرحوم نہ صرف ذہانت اور قوت حافظہ کے اعتبار سے اپنا جواب نہ رکھتے تھے بلکہ ان میں بڑا وصف یہ بھی تھا کہ وہ حد درجہ محنتی تھے جس کام کو شروع کرتے اس کو ختم کرکے ہی چھوڑتے۔ یہی وصف ان کا آخری دم تک قائم رہا۔ طالب علمی کے زمانے کی عادتیں کچھ ایسی راسخ ہوگئی تھیں کہ بیرسٹری اچھی، چیف ججی میں بھی ایک لمحے کے لئے نہیں چھوٹیں اور ان ہی پر ان کی کامیابی اور زبردست شخصیت کا انحصار تھا۔

۱۹۰۰ء میں محمد سلیمان انٹرنس کے امتحان میں اوّل نمبر پر پاس ہوئے اب وہ الٰہ آباد میں آگئے اور چار سال تک مسلم ہوسٹل میں مقیم رہے۔ ۱۹۰۲ء میں انھوں نے ایف اے کا امتحان شاندار طریقے سے پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں چوتھے نمبر پر رہے۔ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے بی اے کا امتحان بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ وہ اول نمبر رہے۔ سرکاری وظیفہ پایا اور مزید تعلیم کے لئے یورپ تشریف لے گئے۔

ہمارے یہاں طالبعلموں میں سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ تندہی کے ساتھ اپنی تعلیم میں مصروف نہیں ہوتے۔ نہ ان کے نوشت و خواند کے اوقات مقرر ہوتے ہیں اور نہ وہ جی لگا کر محنت کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں زیادہ تر ناکام رہتے ہیں۔ شاہ محمد سلیمان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ وہ شدید محنت کرتے تھے اپنے اوقات کی پوری پوری پابندی کرتے تھے۔ جس کتاب کو ہاتھ لگاتے اسے ختم کرکے چھوڑتے۔ جس مسئلے کو حل کرنے میں لگتے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچاتے۔ جب وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں پہنچ جاتے تو تاوقتیکہ ان کے پڑھنے کا وقت ختم نہ ہو جاتا وہ باہر نہ نکلتے۔ ان کی طالبعلمانہ زندگی کا شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جس میں انھوں نے اپنے پروگرام کے مطابق لکھنے پڑھنے سے گریز کیا ہو۔ ان کا اصول یہ تھا کہ پہلے اپنی درسی کتابیں پڑھ کر ان پر قابو کر لیتے اور پھر ادھر ادھر کی کتابیں پڑھتے۔

ان کے پاس بیکار باتوں کے لئے وقت بالکل نہیں تھا نہ تو وہ کسی سماجی کاموں میں دلچسپی لیتے تھے اور نہ کسی سیاسی تحریک میں۔ ان کا خیال تھا کہ ایک طالب علم کو خارجی تحریکوں سے الگ تھلگ رہنا چاہئے اور وہ اس پر خود سختی کے ساتھ عمل پیرا تھے۔

ولایت میں مرحوم نے کیمبرج اور ڈبلن یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں بھی انھوں نے محنت سے منہ نہ موڑا اور اسی تندہی کے ساتھ اپنی پڑھائی میں لگے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے سائنس میں اور قانون میں امتیاز حاصل کیا۔ وہ سر جے جے تامسن کے شاگرد رشید تھے اور ان کے زندگی بھر معترف اور احسانمند رہے۔

۱۹۱۱ء میں شاہ سلیمان ولایت سے واپس آئے اور قانون ہند کے عمیق مطالعے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۰ء تک یعنی الٰہ آباد ہائیکورٹ کے جج ہونے سے پہلے انھوں نے پبلک کے کسی کام میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ ان کے وقت کا ہر لمحہ ایک ہی کام کے لئے وقف تھا اور وہ تھا وکالت کا کام۔ اسی میں آپ ہر وقت محو رہتے تھے۔ آپ وکالت کو مشکل کام سمجھتے تھے اور اس پر کمال حاصل کرنے کے لئے اس میں زیادہ سے زیادہ محنت کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ چند ہی سال میں آسمان وکالت پر آفتاب بن کر چمکنے لگے اور اوائل عمری میں کامیابی اور کامرانی ان کے قدم چومنے لگی۔

جب آپ الٰہ آباد ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوگئے تو اپنے وقت کا کچھ حصہ قانون کے علاوہ اور دوسرے مشاغل کو بھی دینے لگے۔ آپکی ذہانت و ذکاوت ہمہ گیر تھی۔ آپ کو نہ صرف قانون سے حد درجہ شغف تھا بلکہ آپ کو دیگر علوم میں بھی کافی دسترس حاصل تھا۔ خصوصاً ریاضیات اور طبیعیات سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ آپ کو اردو شاعری کا بھی خاص ذوق تھا۔ چنانچہ آپ نے ذوق اور میر کے دیوان مرتب کئے اور ان کو اپنے حواشی کے ساتھ اپنے اخراجات سے چھپوایا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپکو اردو ادب سے کتنی محبت تھی۔ وکالت کے زمانے میں آپ کو دوسرے شہروں میں جانے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ آپ جس شہر میں تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں اردو کے پرانے قلمی نسخے تلاش کرتے تھے اور ان کو اپنے ذاتی کتب خانہ کے لئے خرید لیتے تھے۔ آخر میں آپ نے ایک ہزار سے زائد ایسے قلمی نسخے علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری کو پیش کر دئے تھے۔ آپ کو عربی میں بھی اچھی خاصی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ نے حدیث اور فقہ کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

محمد حفیظ سید

سائنس اور ریاضی کے ماہر ہوتے ہوئے بھی آپ کے عقائد ایک سچے مسلمان کے عقائد تھے۔ آپ قدیم و جدید فلسفے سے بھی واقف تھے۔ اور ہر لمحہ مزید تحقیقات اور معلومات حاصل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ نے مسئلہ (اضافیت) پر ایک لمبا لکچر دیا اور اس کی تاریخ یونانی حکما کے زمانے سے بیان کی۔ آپ کو مسئلہ کے بارے میں زمانہ سلف کے ہندوؤں کے خیالات کا علم بالکل نہ تھا۔ اتفاق سے ایک دوست نے آپ سے ذکر کیا کہ الہ آباد یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر رادھا کمار مکرجی نے مادے کے ہندوستانی تخیل پر ایک کتاب لکھی ہے۔ آپ نے فوراً اس کتاب کو منگوا بھیجا اور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ہندوستانی نقطۂ نظر کو بھی اپنے خیالات میں شامل کر لیا۔

شاہ محمد سلیمان مرحوم متوسط طبقے کے ایک فارغ البال گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے بچپن اور طالب علمی کے زمانے نسبتاً عیش و آرام سے گزرے۔ آپ ہمیشہ جمہوری خیالات کے حامی رہے اور ان کی تبلیغ بھی کرتے رہے۔ خداوند تعالیٰ نے آپ کو ایک دردمند دل عطا فرمایا تھا۔ آپ اپنے ملازموں تک سے مہربانی کا سلوک کرتے تھے۔ اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ چیف جسٹس کے ممتاز عہدے پر فائز ہونے کے بعد بھی آپ ملاقات کرنے کے مقررہ دنوں پر ہر کس و ناکس سے انتہائی شرافت سے ملتے تھے اور ملاقات کرنے والوں کو کرسی پر بٹھلاتے تھے اور پان سگریٹ سے ان کی تواضع کرتے تھے۔ دراصل خاطر تواضع کا یہ وصف آپ کو اپنے آباؤ اجداد سے ترکے میں ملا تھا۔ جن کا شمار علمائے جونپور میں ہوتا تھا۔

مرحوم ایک سچے پکے پاکباز مسلمان تھے اور اسلامی زندگی کا ایک پاکیزہ نمونہ۔ منصب اعلیٰ پر ہوتے ہوئے بھی آپ میں غرور نام کو نہ تھا۔ آپ مجسم نیکی تھے اور دوسروں کی نیکیوں کا اعتراف کرتے تھے۔ خود کام کرنے کے عادی تھے اور کام کرنے والوں کی عزت کرتے تھے۔

آپ نے جب انتقال فرمایا تو کوئی وصیت نامہ نہیں چھوڑا۔ آپ کا عقیدہ تھا کہ ایک مسلمان کو وصیت نامے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ترکہ کی تقسیم کے لئے احکامات ربانی موجود ہیں اور ان میں ترمیم کرنے کی مجال ایک مسلمان کو ہرگز نہیں ہے۔ آپ اتنے محتاط تھے کہ بنک میں جو روپیہ آپ کا جمع رہتا تھا اس پر سود نہ لیتے تھے۔ اسی طرح آپ زندگی کا بیمہ کرانے کے بھی خلاف تھے اور اپنی زندگی کبھی بیمہ نہیں کرائی۔ ولایت میں آپ نے اسلامی عقائد کی پابندی سختی کے ساتھ کی حتیٰ کہ آپ نے گوشت کھانے سے بھی اس لئے پرہیز کیا کہ وہ اسلامی طریقہ کے مطابق ذبیحہ نہ ہوتا تھا۔

شاہ مرحوم نے اپنی قوم کو مدد پہنچانے سے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ آپ کئی سال تک مسلم ہوسٹل الہ آباد کے اعزازی سیکرٹری اور مجیدیہ اسلامیہ کالج کے صدر رہے اور اس کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ آپ تین سال سے زائد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور جب کبھی آپ کو علی گڑھ جانا ہوتا تھا تو اپنے ہی اخراجات سے آتے جاتے تھے۔ الغرض جب کبھی قوم کو آپ کی خدمات کی ضرورت پڑی آپ نے فراخ دلی سے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

جب ۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر صاحب کو عارضی طور پر ہائی کورٹ کی ججی تفویض ہوئی اس وقت وہ وکالت کے پیشے میں سب پر فائق تھے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں وہ کچھ عرصے کے لئے عارضی طور پر جج رہے۔ بالآخر جب ۱۹۲۳ء میں سر محمد رفیق صاحب ریٹائر ہوئے اور ڈاکٹر صاحب کو ججی کا مستقل عہدہ ملا اس وقت وہ تمام وکالت پیشہ برادری کے سردار تھے، اور نہ صرف ہائی کورٹ میں بلکہ تمام صوبے میں ان کی وکالت کی دھوم تھی۔ آگرہ اور اودھ کے صوبہ میں شاید ہی کوئی اہم مقدمہ ایسا ہوگا جس میں وہ شریک نہ ہوئے ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف بحیثیت جج کی حیثیت سے نمایاں ترقی کی، بلکہ ان کی ججی کا کل زمانہ نہایت درخشاں رہا۔ ان کے وقاد ذہن کے لئے نہ کوئی مقدمہ پیچیدہ تھا نہ کوئی امر دقیق تھا، ان کی روشن طبعی فرد کار کے لئے بلا ہو جاتی تھی۔ وہ وکلا کی تقریروں اور ان کی مفروضہ پیچیدگیوں سے نہ گھبراتے تھے نہ ان کے الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنستے تھے، بلکہ ان کی تنبیہہ سے وکیل کو اس امر کا یقین ہو جاتا تھا کہ وہ کسی ایسے زبردست اہل دماغ کے سامنے حاضر ہے جس کا ذہن ہمہ وقت اخذ و غور اور استیقان کے لئے آمادہ ہے۔ ان کے ججی کے عہدے پر فائز ہونے کے قلیل عرصے ہی کے بعد اہل رائے اس امر پر متفق ہو گئے تھے کہ ڈاکٹر سلیمان صاحب کل ہند کے سربرآوردہ ججوں میں سے ایک تھے۔

۱۹۲۹ء میں ان کو نائٹ کا خطاب ملا، اور ۱۹۳۲ء میں چیف جج ہو گئے۔ اس کے بعد سرکار ہند کو فیڈرل کورٹ کے لئے قابل ججوں کی تلاش ہوئی تو ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان ہی پر نظر انتخاب پڑی۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں وہ فیڈرل کورٹ کے جج ہو کر دہلی تشریف لے گئے۔ اور وہاں بھی انہوں نے قابلیت و ذہانت اور کمال کا سکہ بٹھا دیا۔ اور غایت درجہ کامیابی حاصل کی۔ حق یہ ہے کہ ان کے فیصلے آئندہ نسلوں کے لئے ذہانت، محنت شاقہ اور قابلیت فائقہ کے نمونے ہوں گے۔ آئندہ نسلیں قانونی پہلوؤں کو پڑھنے اور مطالعہ کرنے کے بعد ان کی ان تھک محنت، فاضلانہ تحقیق، غائر مطالعہ، دلیل آفرینی اور استادانہ قوت بیان کی داد دیں گی۔ اور فخر کریں گی کہ ان کے وطن نے ایسی لائق و فائق ہستی بھی پیدا کی تھی۔

قانونی پیشے کے علاوہ سر سلیمان مرحوم طبیعات اور ریاضیات میں بھی کمال رکھتے تھے۔ آپ کی طباعی کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ

آپ نے مشہور زمانہ نیوٹن اور آئنسٹائن جیسے ماہرینِ ریاضی کے نظریوں کے مقابلے میں اپنا ایک الگ نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا جس سے آپکی دھوم ساری دنیا میں مچ گئی اور دنیا کو معلوم ہوگیا کہ الہ آباد ہائی کورٹ کا چیف جسٹس نہ صرف عدل و انصاف اور قانون کا ماہر ہے بلکہ سائنس میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا ہے۔ آپ کے نظریہ کا ئنات نے یورپ اور امریکہ سے صد ہا خراج تحسین وصول کیا۔ ڈاکٹر ڈسٹلے مشہور ہیئت داں نے ۱۹۳۵ء میں کہا تھا کہ سر سلیمان کا نظریہ گذشتہ سال کے علم ہیئت کا شاہکار ہے۔" اسی طرح امریکہ کے مشہور ڈاکٹر ماڈ سیکر سن نے بھی اس نظریہ کی بہت تعریف کی اور پیشنگوئی کی کہ "یہ نظریہ ثابت ہوگیا تو وہ نظام شمسی کے ارتقا کے متعلق موجودہ مقبول عام نظریوں میں انقلاب عظیم بپا کردے گا۔" آپ نے اپنا نظریہ بالکل مکمل کرلیا تھا البتہ وہ مشاہدات کا محتاج تھا۔ آپکو انتظار تھا کہ آپ پورا چاند گرہن دیکھیں اور اس موقع پر اپنے مشاہدات سے اپنے خیالات اور نظریوں کی صداقت آزمائیں۔ افسوس کہ دستِ اجل نے آپ کو یہ موقع نہ دیا۔

بظاہر ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور نے اس تمام علم و فضل اور وکالت میں تبحر اور کمال کے باوجود علم قانون یا مسائل قانون کے متعلق کوئی تصنیف یا تالیف نہیں چھوڑی۔ لیکن یہ حیرت بے جا ہے کیونکہ راقم کو بخوبی اور بصحت تمام معلوم ہے کہ جناب مغفور نے علم قانون پر ایک کتاب نہایت محنت اور قابلیت سے تصنیف فرمائی تھی۔ جسکا مسودہ بالکل مکمل ہوچکا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے فرزندان سعادت مند اس کتاب کو جلد سے جلد شائع کرکے اہل علم و فضل کے لئے ذہنی تسکین کا سامان فراہم کریں گے۔

ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب ابھی فیڈرل کورٹ کی ججی ہی پر فائز تھے کہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو وہیں دہلی میں ہارٹ فیل کی موت پر اس دنیائے ناپائدار سے عالم باقی کی طرف رحلت فرمائی۔

تاثرات

قمر مرادآبادی

چند بے ربط خیالات لئے بیٹھا ہوں ⁂ اپنے الجھے ہوئے حالات لئے بیٹھا ہوں
دل میں ہنگامۂ جذبات لئے بیٹھا ہوں ⁂ شورشِ ارض و سماوات لئے بیٹھا ہوں
وہ تو مدت ہوئی بیزار وفا ہو بھی چکے ⁂ میں ابھی شکوہ و شکایات لئے بیٹھا ہوں
تجھ کو آنے کی نہیں اب جانِ تمنا بن کر ⁂ میں تو جھگڑا ہی دن رات لئے بیٹھا ہوں
وہ وہاں وقف ادائے تغافل ہیں قمر
میں یہاں شوقِ ملاقات لئے بیٹھا ہوں

کانٹے

(میرے شعر)

ہیں یہ آثار مری جوانی کی ⁂ زہر میں ہیں بجھے ہوئے نشتر
ہیں مرے غم کی مختلف شکلیں ⁂ یہ مرے دل کے داغ ہیں اظہر

(بیزارگی)

زندگی کی "مسرتیں" — توبہ! ⁂ اور دل کو جلائے جاتی ہیں
ہوگئیں ختم کے سب تمنائیں ⁂ حسرتیں جان کھائے جاتی ہیں

(آرزوئے حیات)

دل کے زخموں سے کھیل لو اظہر ⁂ ابھی کچھ اور رات باقی ہے
زندگی ختم ہوچکی — لیکن ⁂ آرزوئے حیات باقی ہے

(خلش)

ایک چھوٹا سا ابر کا ٹکڑا ⁂ چاند کو اپنی گود میں لیتا
رات کو دیکھ کر خدا جانے؟ ⁂ کیوں مرے دل میں درد ہونے لگا؟

(مجبور زندگی)

رونا چاہوں تو رو نہیں سکتا ⁂ ایسی حسرت خدا کسی کو نہ دے
اور ہنسنا کہاں مقدر میں ⁂ آگ لگ جائے اس جوانی کو

(دیوانگی)

دوڑتا ہوں خیال کے پیچھے ⁂ جیسے دیوانہ ہوگیا ہوں میں
ہائے وارفتگی ہیں یوں اب تک ⁂ تم کو اپنا سمجھ رہا ہوں میں

(زندگی)

آہ اظہر یہ زندگی میری ⁂ ایک ناکامیوں کا دھارا ہے
جی رہا تھا کسی کی حسرت میں ⁂ اب خدا جانے کیا سہارا ہے

اظہر رضوی

مشرق وسطیٰ

نکولس رسکن

"مشرق وسطیٰ" کسی قدر نئی اصطلاح ہے۔ لڑائی سے پہلے اس کے معانی متعین نہیں تھے کبھی کبھی یہ حیوانات کے لئے استعمال ہوتی تھی اور کبھی اس سے مراد درہ دانیال سے لے کر دیوار چین تک کا سارا علاقہ ہوتا تھا۔ جنگ عظیم دوم کے دوران میں "مشرق وسطیٰ" کی اصطلاح شمالی افریقہ، شام، عراق اور ایران کی تمام لڑائیوں کے سلسلہ میں استعمال ہوئی۔

شمالی افریقہ کی جنگ کو مشرق وسطیٰ کی جنگ اس لئے کہا گیا کہ اس دوران میں اتحادی ہیڈ کوارٹر زیادہ تر قاہرہ رہا۔ ان لڑائیوں کے علاوہ، جو صحیح معنوں میں مشرق وسطیٰ کی لڑائیاں نہیں کہلا سکتیں، جنگ میں مشرق وسطیٰ کو اتنی اہمیت نہیں حاصل ہوئی جتنی کہ محوری خیال کرتے تھے۔ ایک زمانہ میں خیال کیا جاتا تھا کہ اٹلی، جرمنی اور جاپان کی فوجیں مغرب، شمال اور مشرق سے بڑھ کر کہیں ترکی میں مل جائیں گی لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اگرچہ مشرق وسطیٰ میں کوئی خاص لڑائی نہیں ہوئی تو کم سے کم اس کے ذریعہ دوسرے جنگی کاموں مثلاً روس کو سامان پہنچانے میں بڑی مدد حاصل ہوئی۔ اب جبکہ لڑائی ختم ہو چکی ہے مشرق وسطیٰ کو اور بھی زیادہ سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی ہے کیونکہ اس سے امریکہ، برطانیہ، روس اور کسی قدر کم فرانس کے مفاد وابستہ ہیں جن کی وجہ سے ممکن ہے دنیا کے امن کے لئے خطرہ پیدا ہو جائے۔

اس میں کچھ اختلاف ضرور ہو سکتا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں کون کون سے ممالک شامل ہیں لیکن عام طور پر اب مغرب میں مصر اور لیبیا کی سرحد سے مشرق میں افغانستان اور ایران کی سرحد تک اور شمال میں درہ دانیال اور روس اور ترکی کی سرحد سے سوڈان اور اریٹیریا کے بالکل جنوبی حصہ تک کا علاقہ مشرق وسطیٰ کہلاتا ہے۔ اس میں مصر، سوڈان، اریٹیریا، حبش، صومالی لینڈ، سعودی عرب، خلیج فارس، فلسطین، ماورائے اردن، شام، لبنان، عراق اور ایران شامل ہیں۔

بین الاقوامی معاملات میں مشرق وسطیٰ کی اہمیت سب سے زیادہ اس کے محل وقوع کی وجہ سے ہے۔ یہ دنیا بھر کی نقل و حرکت کا مرکز ہے۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے درمیان بری، بحری، اور ہوائی راستے یہیں سے گزرتے ہیں۔ روس کے لئے خلیج فارس اور مشرقی بحیرۂ روم کے گرم پانی کے راستوں تک پہنچنے کا ذریعہ بھی مشرق وسطیٰ ہی ہے اور نہر سویز جیسی اہم چیز اس کے تقریباً بیچ میں واقع ہے۔ اس کے بعد یہاں کے قیمتی قدرتی ذرائع کو اہمیت حاصل ہے جن میں تیل اور کپاس شامل ہیں۔ سو چونکہ یہاں کی آبادی چھ کروڑ سے زیادہ ہے اور زیادہ تر لوگوں کا پیشہ زراعت ہے اس لئے یہاں استعمال اور پیداوار کی چیزوں کی کافی مانگ ہو سکتی ہے۔ ان تینوں باتوں نے مل کر مشرق وسطیٰ کو بڑی طاقتوں کی تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں کی جولانگاہ بنا دیا ہے۔

قومیت کا ارتقا

گزشتہ چالیس پچاس برس میں مشرق وسطیٰ کے لوگوں میں قومیت کے جذبات نے بہت ترقی کی ہے۔ یہ جذبہ مختلف صورتوں میں رونما ہوا۔ سماجی انقلاب نے جمہوریت پسندی کے جذبات کو ابھارا۔ لوگوں کے پیش نظر ترکی کا نمونہ تھا۔ کسانوں کی رجعتی تحریک کا مقصد حالات کو بدستور قائم رکھنا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ بیرونی مداخلت کے مخالف ہیں (جو اب تک قومیت کا مشترکہ جذبہ رہا ہے)۔ اس کے علاوہ عربوں کی قومی تحریک ہے جو عرب تہذیب کی تجدید کی خواہشمند ہے۔ ان تحریکوں میں عرب قومیت سب سے اہم ہے لیکن یہ ایک لحاظ سے جمہوریت کی منافی ہے۔ یعنی اس کے رہنما عرب ملکوں کے بڑے بڑے جاگیردار ہیں جو اپنے ملکوں کی اقتصادیات پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ دوسری طرح کی زیادہ سیاسی قومی تحریکیں ایک حد تک اس کی مخالفت کرتی ہیں جو مختلف عرب ملکوں میں رونما ہوئی ہیں۔ اور پھر یہودیوں کی قومیت ہے جو جنگ جویانہ، جمہوریت پسند اور حریص ہے اور عربوں کے اتحاد کا ایک بڑا سبب بھی ثابت ہو چکی ہے۔

یوں تو مغربی طاقتیں اور روس مشرق وسطیٰ میں الگ الگ قومی حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ترکی اور ایک دو اور ملکوں کے علاوہ اس علاقہ کی ریاستیں مختلف وجوہات سے خود اختیاری اور جمہوری حکومتیں قائم کرنے کی قابلیت نہیں رکھتیں۔ صنعت کے لئے ضروری سرمایہ کی کمی ہے۔ جہاں کہیں خود اختیاری حکومت قائم بھی ہوئی ہے وہاں قدیم جاگیرداروں کا طوطی بولتا ہے جو تعلیم، صحت عامہ اور سماجی ترقی میں دلچسپی نہیں لیتے۔ یہ بھی تجویز ہے کہ اس سارے علاقے کی دیکھ بھال ادارۂ اقوام متحدہ کرے لیکن اس کی عملی صورت اختیار کرنے کے امکانات بہت کم ہیں کیونکہ برطانیہ غلبہ حاصل کرنے کی بجائے آزادانہ تعلقات قائم کرنے کا متمنی ہے، امریکہ خود اختیاری قومی حکومتیں قائم کرنا چاہتا ہے اور روس کسی بھی قسم کا بین الاقوامی قبضہ رکھنے کا مخالف ہے۔

برطانوی مفاد

یہ بات ظاہر ہے کہ مشرق وسطیٰ میں سب سے زیادہ مفاد برطانیہ کا ہے۔ پول ہٹا نے حال ہی میں ایک مقالہ "عہد حاضرہ کی تاریخ" میں لکھا ہے کہ "اس علاقہ میں سب سے زیادہ مفاد اور اثر برطانوی شہنشاہیت کا ہے" یہ مصنف مندرجہ ذیل واقعات

کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مصر میں مصر اور برطانیہ کے درمیان ۱۹۳۶ء کے صلح نامہ کے مطابق برطانیہ کو نہر سوئز کا علاقہ، اسکندریہ، ذرائع نقل و حرکت اور خاص ہوائی اڈے استعمال کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ سوڈان پر مصر اور برطانیہ کا مشترکہ قبضہ ہے جس میں برطانیہ کو برتری حاصل ہے۔ جبش بالآخر اطالوی قبضے سے آزاد ہو گیا ہے لیکن وہاں بھی صلح نامہ کے ذریعہ برطانیہ کے مفاد کو محفوظ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ برطانوی سمالی لینڈ اور عدن برطانیہ کی زیر نگرانی ہیں۔ اس طرح بحیرۂ روم سے جنوبی راستہ کی حفاظت ہوتی ہے۔

اریٹریا اور اطالوی سمالی لینڈ اس وقت تک برطانیہ کے زیر انتظام ہیں جب تک کہ اٹلی کی نو آبادیات کے متعلق فیصلہ نہ ہو جائے۔ بحرین اور کویت کی حکومتیں بھی برطانیہ ہی کے زیر اثر ہیں۔ سعودی عرب کے حکمران ابن سعود کو برطانوی حکومت سے روپیہ ملتا ہے۔ فلسطین اور ماوراء الشرق مجلس اقوام کے زیر اختیار ہیں اور ان کی نگرانی بھی برطانیہ ہی کرتا ہے۔ کچھ زمانہ پہلے عراق کا بھی یہی حال تھا لیکن وہ اب آزاد ہے لیکن مصر کی طرح اس نے بھی برطانیہ سے ایک صلح نامہ پر دستخط کئے ہوئے ہیں جس سے شاہی ہوائی بیڑے کو ملک میں ہوائی اڈے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ عراق پٹرولیم کمپنی جسے موصل میں تیل نکالنے کا حق حاصل ہے، ان بین الاقوامی کمپنیوں میں ہے جن میں چوتھائی سے زیادہ سرمایہ برطانیہ کا لگا ہوا ہے۔ موصل سے بحیرۂ روم کی بندرگاہ حیفہ تک تیل کا نل اور حیفہ کا تیل صاف کرنے کا کارخانہ برطانیہ کے قبضہ میں ہیں۔ جنوبی ایران میں عرصہ دراز سے برطانیہ کا اثر چلا آتا ہے۔ اینگلو ایرانین آئل کمپنی، اور آبادان کا تیل صاف کرنے کا کارخانہ اہل برطانیہ کا ہے۔"

یہ فہرست محنت سے مرتب کی گئی ہے اور دوسروں کے حسد کو ہوا دیتی ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ پچھلے پچیس برس سے برطانیہ جبر کی جگہ رضامندی سے پرانے نظام کو جنبش دینے کی کوشش کر رہا ہے مگر اس پر اس کی صاف گوئی سے بھی زیادہ اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ جس مقالہ نگار کا اقتباس اوپر نقل کیا گیا ہے وہ برطانیہ کے متعلق لکھتا ہے کہ "یہ اپنے جانوں کو اس امید میں قربان کر رہا ہے کہ اس کی قوت بدستور قائم رہے۔" دوسرے ناقد برطانیہ کو اپنے اثرات کو ختم کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں لیکن وہ یہ بھی ممکن سمجھتے ہیں کہ اگر برطانیہ ہٹتا نہیں تو کم از کم برطانیہ جیسا اثر قائم کرنے کے لئے دوسرے ملک بھی کوشش کریں گے۔ اگر برطانیہ کا اثر ہٹ جائے تو بہت ممکن ہے کہ مقامی لوگوں کی بجائے دوسرے ملکوں کا اثر بڑھ جائے لیکن سر ہنّا اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ جب تک باقاعدہ جدوجہد نہ ہوگی برطانیہ اپنے اثر میں کوئی خاص کمی برداشت نہیں کر سکے گا۔

غزل

شکایت دردِ دل کی تا زبان لائی نہیں جاتی ❊ یہ اک نعمت ہے قدرت کی جو ٹھکرائی نہیں جاتی
بکوشش جذبۂ الفت کبھی پیدا نہیں ہوتا ❊ یہ آتش خود بھڑک اٹھتی ہے بھڑکائی نہیں جاتی
حدیثِ عشق کی تشریح مجھ سے کیا کریں ناصح ❊ سمجھ میں خود تو آ جاتی ہے سمجھائی نہیں جاتی
شریکِ حالِ دل کوئی نہیں ناصح ہزاروں ہیں ❊ بھری محفل میں ہوں اس پر بھی تنہائی نہیں جاتی
مری الفت کے منکر دل کی حالت کیا کہوں تجھ سے ❊ حقیقت مادی صورت میں دکھلائی نہیں جاتی
نہ جانے کن حسین ہاتھوں نے لکھی ہے فنا اس کی ❊ یہ دنیا لاکھ بگڑے اس کی رعنائی نہیں جاتی
ازل میں حسن و الفت کا تعارف لے معاذ اللہ ❊ ہزاروں رنگ گو بدلے شناسائی نہیں جاتی
تجلی کو ازل میں داد کا ایسا پڑا چسکا ❊ کہ اب تک خوئے ذوق جلوہ آرائی نہیں جاتی
وہ گلگشت چمن ہو یا شب مہ کا کوئی منظر ❊ طبیعت جب بگڑتی ہے تو بہلائی نہیں جاتی

اخگر میں نے وفا کا ذکر جب ان سے کیا بولے
سنا تو ہے کہ ہوتی ہے مگر پائی نہیں جاتی

اخگر رامپوری

فرانسیسی مفاد

برطانیہ کے بعد فرانس کا مفاد سب سے اہم ہے جو اب بھی شام اور لبنان پر برائے نام قابض ہے اور جس کا فرانسیسی سمالی لینڈ پر قبضہ ہے۔ فرانسیسی سمالی لینڈ جبش کو جانے کے لئے بہترین راستہ ہے۔ اس کے علاوہ فرانس کا مصر پر بہت گہرا ثقافتی اثر پڑا ہے۔ فرانس کا مشرق وسطیٰ کے تیل میں بھی حصہ ہے کیونکہ یہ اب تک موصل اور بحیرۂ روم کے درمیانی نل کے شمالی طرابلس پر قابض تھا اور عراق پٹرولیم کمپنی میں اس کا حصہ ہے۔ اب فرانس کی طاقت بہت کم ہو گئی ہے لیکن اسے بھی لبنان کے عیسائیوں کی امداد کی امید ہے۔

روس اور مشرق وسطیٰ

اگرچہ روس کا مشرق وسطیٰ سے فرانس کے مقابلہ میں براہ راست تعلق رہا ہے لیکن اس میں روس کی اہمیت فرانس سے کہیں زیادہ ہے۔ روس اپنا محفوظ رہنے کا خواہشمند ہے اس لئے اسے اپنی جنوبی سرحدوں کا بہت خیال ہے اور پھر اسے مشرقی بحیرۂ روم کے ملکوں اور خلیج فارس میں اثر قائم بھی کرنا ہے۔ جیسا کہ روس بہت دنوں سے کوشش کر رہا ہے۔ روس ترکی پر اثر ڈال رہا ہے، تاکہ اردا ہان، قارس اور ارتوین کے صوبوں کی سرحدیں پھر سے متعین ہوں اور منترو کے فیصلہ پر نظر ثانی کی جائے جو بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم کے درمیانی

رہا ہے۔ شمالی عراق میں ہے۔ مصر اور عراق میں جو سفارت خانے قائم ہوئے ہیں ان میں روسیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور عربوں سے زیادہ گہرے تعلقات قائم کرنے کی کوشش جاری ہے۔ ساتھ ہی روس فلسطین، شام اور لبنان میں مشرق کے قدیم عیسائی مذہب کی طرفداری کر رہا ہے۔ اگرچہ روس یہودیت کے خلاف ہے لیکن بین الاقوامی ٹریڈ یونین کانفرنس میں روسی نمائندوں نے پچھلے سال یہودیوں کے اعلان کے حق میں رائے دی۔ حالانکہ کبھی کبھی یہ اقدامات متضاد نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ پھر سے مشرق وسطیٰ اور مشرقی بحیرۂ روم کے ملکوں میں روس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔

پچھلے زمانے سے ایران کے ساتھ روس کے تعلقات خاص اہمیت رکھتے رہے ہیں۔ روس کو صلح نامہ کے مطابق ۲ مارچ ۱۹۴۶ء تک ایران سے اپنی فوجیں ہٹا لینی چاہئے تھیں لیکن ظاہری طور پر روس نے آذربائیجان میں انتشار ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کیا۔ بہت سے لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ آذربائیجان میں ایسے حالات خود روس نے پیدا کرائے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ روس نے دوسری مارچ تک اس لئے فوجیں نہیں ہٹائی تھیں کہ اسے اس تاریخ تک برطانیہ کے فوجیں ہٹا لینے کا یقین نہیں تھا۔ لہٰذا غلط ہو یا صحیح بہرحال روس کو برطانیہ کی طرف سے اندیشہ رہتا ہے اور وہ اپنی حفاظت کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اسی لئے اس نے اس وقت تک ایران میں فوجیں رکھیں جب تک کہ برطانوی اثر کے مقابلہ میں وہ اپنا اثر قائم نہ کر سکا۔ برطانیہ کا اثر خوزستان کی اینگلو ایرانین آئل کمپنی کی وجہ سے ہے۔ اب ایک صلح نامہ پر دستخط ہو چکے ہیں جس سے روس کو اطمینان ہو گیا اور روس نے اپنی ساری فوجیں ہٹا لی ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں روس کی نئی سرگرمیوں کے متعلق معلومات آئندہ حاصل ہوں گی۔

امریکی مفاد

ابھی مشرق وسطیٰ میں امریکہ کا مفاد نسبتاً کم ہے لیکن اس کے تیزی سے بڑھنے کی امید ہے۔ بول ہینا نے امریکی مفاد کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں امریکہ کا بہت سا روپیہ اور کوششیں مشرق وسطیٰ میں بری، بحری اور خصوصاً ہوائی حمل و نقل کے ذرائع کی تعمیر پر صرف ہوئیں۔ اب امریکہ کی فضائی اور بحری آمد و رفت کی کمپنیاں ان حقوق کی حفاظت کی متمنی ہیں۔ امریکہ نے حکومت برطانیہ سے مشرق وسطیٰ میں فوجوں کو سامان پہنچانے کے مرکز کے سلسلہ میں تعاون کیا اور ایک وسیع اقتصادی منصوبہ پر عمل کیا تاکہ مشرق وسطیٰ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنی ضروریات خود پوری کرے۔ پھر جہازوں کی کمی کی وجہ سے زراعت اور صنعت کو خوب ترقی دی گئی جس سے امریکہ کا خاص تعلق رہا [illegible] لینڈ لیز اس ملک میں آیا جو مشرق وسطیٰ میں

امریکی تجارت کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ آجکل امریکہ والے خیال کرتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کا تیل تجارت سے زیادہ فوجی اہمیت رکھتا ہے۔ نیو جرسی اور سوکونی ویکیوم کی اسٹینڈرڈ آئل کمپنی عراق پیٹرولیم کمپنی میں تقریباً ایک چوتھائی کی حصہ دار ہے۔ عراق پیٹرولیم کمپنی کو عراق، قطر اور عمان وغیرہ میں تیل نکالنے کا حق حاصل ہے۔ امریکہ کی ایک اور کمپنی کویت میں تیل نکالنے کے لئے آدھے کی حصہ دار ہے۔ ٹیکساس کمپنی اور اسٹینڈرڈ آف کیلیفورنیا کی عرب امریکن آئل کمپنی سعودی عرب کے تیل کے خطہ میں تیل نکالنے کا حق رکھتی ہے۔ یہ کمپنیاں بحرین کے کنوؤں کی بھی مالک ہیں۔ امریکہ کے مشرق وسطیٰ سے ثقافتی تعلقات بھی ہیں خاص طور پر پادریوں اور بیروت (شام) اور قاہرہ (مصر) کی امریکی یونیورسٹیوں کے ذریعہ۔ اس کے علاوہ امریکہ میں یہودیوں کی کافی آبادی ہونے کی وجہ سے بھی امریکیوں کو فلسطین اور وہاں کے یہودیوں سے دلچسپی ہے۔

شہنشاہیت قدیم اور جدید

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ چار بڑی طاقتوں میں سے کم سے کم تین کو مشرق وسطیٰ کی اقتصادیات اور سیاسیات میں بہت دلچسپی ہے اور روس اور امریکہ کو تو اپنے اثرات میں اضافہ کرنے کی خواہش ہے۔ ان دونوں کے خیال سے برطانیہ کا موجودہ رویہ صحیح نہیں ہے۔ اگر برطانیہ حقیقتاً اپنے مفاد کی حفاظت کی حکمت عملی کی بجائے مشرق ادنیٰ میں رضاکارانہ معاہدوں کی حکمت عملی اختیار کرے تو اس پر شہنشاہیت کے جو اعتراضات عرصہ دراز سے کئے جا رہے ہیں بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ گزشتہ سالوں کی برطانوی حکمت عملی پر مختلف طرح کے اعتراضات کئے جا سکتے تھے لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ مشرق وسطیٰ برطانیہ کے مقابلہ میں روس اور امریکہ سے معاہدہ کرانا یا دوا پسند کرے گا۔ برطانیہ کی معرفت ہندوستان سے گفت و شنید اور عراق اور ماوراء النہر سے موجودہ صلح ناموں پر روس اور ایک حد تک امریکہ کے اعتراضات نہایت دلچسپ ہیں۔ ان کی بنیاد یہ ہے کہ برطانیہ آزاد معاہدوں کے متعلق جو کچھ کہتا ہے ان معترضوں کو اس کی صداقت اور خلوص پر اعتماد نہیں ہے لیکن یہ بات صاف ظاہر ہے کہ نئے شہنشاہیت پرست برطانیہ کی آزاد معاہدوں کی حکمت عملی کو غلط نہیں بتاتے بلکہ انہیں یہ خطرہ ہے کہ برطانیہ کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ برطانیہ کی یہ نئی حکمت عملی ان ملکوں کے حق میں مفید ثابت نہیں ہو سکتی جو برطانیہ کا مشرق وسطیٰ پر اثر کم ہونے سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے پر کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

ایک نئی بات

ایک نئی بات مشرق وسطیٰ پر بے حد اثر انداز ہوگی اور وہ ہے ہندوستان کا ایک آزاد اور بڑی طاقت بننا۔ فی الحال مشرق وسطیٰ والوں کو ہندوستان کے متعلق بہت کم

[illegible] ہیں جھکا کر یہ ہندوستانی قوم بہت
[illegible] بہانا بتاتے ہیں مگر یہ بھی [illegible]
[illegible] کہ ہندوستان میں بڑے گھروں کی تعداد
[illegible] کے ملکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ
ہے۔ [illegible] ہندوستان کے لاکھوں بلکہ کروڑوں بیوپاری دنیا
کے دوسرے ملکوں سے اشتراک عمل کر کے مشرق وسطیٰ کی سیاسیات
میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیں گے۔ اسی لئے جب روس کو یہ احساس
ہوا کہ برطانیہ کا اقتدار تو محض ہندوستان سے ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ ہندوستان کے
قوم پرست برطانیہ کی نیت اور خلوص سے مطمئن ہیں اور ممکن ہے کہ ہندوستان
اور برطانیہ میں بہتر تعلقات قائم ہو جائیں تو وہ بہت مایوس ہوا۔ اسی شخص
مسٹر [illegible] نے "نیو ٹائمز" میں لکھا ہے کہ برطانیہ اور ہندوستان میں
کسی قسم کی مفاہمت کا امکان نہیں ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اس کی
ہندوستان سے متعلق معلومات کی قلعی کھلتی ہے بلکہ ذہنی پریشانی کا بھی
راز افشا ہوتا ہے۔ مگر روس کا یہ ردعمل محض قلق معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر اسے
یہ اطمینان ہو گیا کہ برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات سے اسے کوئی
خطرہ نہیں ہے تو وہ معاہدہ کی مخالفت نہیں کرے گا۔ لیکن اس کا یقین
آہستہ آہستہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ساری دنیا کو صبر اور
استقلال سے کام لینا چاہئے۔

دنیا کے کسی حصہ میں بین الاقوامی تعاون اتنا ضروری اور دشوار
نہیں ہے جتنا کہ مشرق وسطیٰ میں۔ ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ ساری متعلقہ
[illegible] کا نقطۂ نظر مغربی ہے۔ اس لئے ہندوستان کا اثر گہرا اور مفید
ثابت ہوگا۔ ہندوستان لازمی طور پر اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے
ایشیا کی سب سے بڑی طاقت بن جائے گا۔ اسے مشرق وسطیٰ کی ثقافت
اور مقاصد سے بھی ہمدردی ہے اور یہ ہمدردی قائم رہے گی۔ اس
ہمدردی کی بدولت ہی اور [illegible] شہنشاہیت کا خاتمہ ہو کر ایک ایسا
نظام قائم ہو جائے گا جس میں ہر ملک آزادی اور رضامندی سے شریک
ہو کر ترقی کے راستہ پر گامزن ہوگا۔

ضروری

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نظم و نثر اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔

ادارہ

غزل

اب اسکا ہے فیصلہ تمہیں پر کہ تم اس کو نظر کا دھوکہ
تمہاری جلوہ نمائی پر ہے طلوع شمس و قمر کا دھوکہ

یہ کائنات مسرت و غم تمام علم و خبر کا دھوکہ
فغان پیہم فریب تسکیں دعائے نیم شب ہے اثر کا دھوکہ

یہ رنگ و بو کا نگار خانہ نگاہ حسرت نگر کا دھوکہ
ہر ایک رنگ مجاز میں ہے حقیقت منتظر کا دھوکہ

رہ طلب میں گزر گیا ہوں میں درد و درماں کی منزلوں سے
مگر میرے چارہ گر کو اب تک وہی ہے درد جگر کا دھوکہ

یہی ہے تکمیل راز ہستی یہی ہے معراج رہ نوردی
بہ ہر نفس احتمال منزل بہ ہر قدم رہگزر کا دھوکہ

نہ پوچھ اے ہمنشیں یہ مجھ سے طلسم ہستی کا راز کیا ہے
فروغ خورشید و ماہ و انجم یہ سب کے سب ہیں نظر کا دھوکہ

یہ زندگی بھی ہے اک قیامت بہ ہر نفس انقلاب تازہ
وجود میں ہے عدم کا پرتو قیام میں ہے سفر کا دھوکہ

تمہاری زلف سیاہ کیا ہے نمود شب کی حسیں تجلی
تمہارا روئے جمیل کیا ہے فقط جمال سحر کا دھوکہ

ادھر ہے پردہ ادھر ہے جلوہ نگاہ حیراں ہے مضطرب ہے
حقیقتاً اب کھلا ہے ہم پر کمال فکر و نظر کا دھوکہ

ادھر تو صیاد تاک میں ہے ادھر یہ گلچیں کی فتنہ خیزی
میرے نشیمن کے چند تنکوں پہ ہے انہیں بال و پر کا دھوکہ

متاع تسکین جاودانی بس اک نگاہ کرم تھی ان کی
بہت ہی محدود و مختصر تھا نوازش مختصر کا دھوکہ

یقیں ہے عہد وفا کا تیرے میں واقعی بدگماں نہیں ہوں
مگر یہ تیری سرشت [illegible] مگر یہ لفظ مگر کا دھوکہ

میں آج قصداً کسی سے اٹھائے عہد باطل کا منتظر ہوں
میں آج دانستہ کھا رہا ہوں جیسا کہ نامعتبر کا دھوکہ

ابھی تو تاروں میں روشنی ہے ابھی تو کچھ دیر رات کی ہے
ابھی تو آغاز شب ہے کوثر ابھی سے ہے کچھ سحر کا دھوکہ

کوثر القادری

ناکردہ گناہ

افسانہ

علی عباس حسینی

کچھ دیر سے تیز بارش ہو رہی تھی اور گرا تھا جیسے
عصر سے پہلے بارش کی لڑی سی آنکھوں میں بچھی تھی
ریتیلی سڑکوں پر بکھرتی — وہ بیٹھے اس کے راستے سے گزر
چلا — وہ میں سامان سے دور ہی سینما گراؤنڈ
خاموشی کا بار آنکھوں میں جھکائے ، سنسان پہلو کو دیکھتا
وہ جلالی ہمک کر دفعۃً پہلو کا پلو پر اضافہ کر کے کھڑا ہو گیا ۔ اس نے بہت تو گرفتار کی طرح ان پر خوف زدہ نظر ڈالی ۔

رشیدہ گڑگڑا کے بولی : " اللہ منور صاحب ، ہم غریبوں سے کبھی تو دو کلام ہنس بول لیا کیجئے ! "

فیروزہ نے ہاتھ چلا کر کہا : " تم جانو تم کیسے ہو ، ہم ورا ... ، مجھکو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو ؟ "

منور نے رومال جیب سے نکال کر پسینے بھرے ہاتھ پونچھے ۔ اس کی زبان پر سوائے " جی ! جی ! " کے کچھ نہ نکلا ۔

جمیلہ عطر بیز ہو کر بولی : " ہم اپنی یونیورسٹی کے صاحب اندر سے پوچھنے آئے ہیں کہ ان کی باندیوں سے کیا قصور سرزد ہوا ہے ..... "

رضیہ نے لمبی سانس لی : " بہن میں نے تو آج تک اس شکل صورت ، اس قد و قامت کا جوان نہیں دیکھا ..... "

فیروزہ نے منور کے سر سے ایک فٹ لمبی ہو اس طرح نظر ڈالی جیسے وہ سچ مچ چھ فٹ ہی کا تو ہے : " ہاں بہن اس بگڑے ملک میں جسے دیکھو سوا بالشت کا ہے ، اب یہ ماشاء اللہ ذرا لمبے ، بالا قد و قامت کے ہوئے ... "

منور نے زبان ہونٹوں پر پھیر کے کہا : " آخر ... آخر ... آپ ... ب ... لوگ ... لوگوں کا مطلب کیا ہے ؟ "

انور چمک کے بولی : " لے ہے بہن دیکھو تو کیسی شیریں زبان ہے ۔ اللہ اللہ کیا طلاقت ہے ، کیا روانی ہے ..... "

شیلا نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا : " چہ اچھا ! چہ ! اب اگر یہ ذرا ہکلاتے ہیں تو اس میں اس غریب کا کیا قصور ..... ؟ "

انور جھٹ کہ بیٹھی : " قصور کی بھی ایک ہی کہی ۔ یہی تو ان کا سب سے بڑا حسن ہے ۔ سچ مانئے منور صاحب ! مجھے آپ کا ہکلانا اتنا ہی پسند ہے جتنا کہ حضرت موسیٰ کا ہکلانا اللہ میاں کو پسند تھا ..... "

—— اور منور بھاگا ۔ بے تحاشا بھاگا ، تیز تیز قدم رکھتا ، الحمد کا ورد ہونٹوں پر ، بھی بھاگتا ، خشک سسکیاں لیتا ۔ گھر پہنچا ، اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا ۔ اس سے لگا ہی ہوا پہنچا ، پاس سے گھبرا کر اوندھی کرسی پر ڈالی ۔ اس نے خود کو بستر پر گرا دیا ۔ لڑکیوں کے قہقہوں کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں ۔ اس کا

سے رنگین ہونٹوں کی کمانیں اب بھی کھنچی رہی تھیں ۔ بالشت پر بل کھاتی ہوئی تھیں ۔ اب بھی منور کے حلق کا سپنا بن رہی تھیں — " یہ بیوی کے ساتھ اندر نے شکر پاؤں تک لحاف اوڑھ لیا ..... "

سینما ہال میں اندھیرا ہو گیا ، چاپلین نے تہذیب کو جھٹلانے کے لئے باہر کی زندگی بتائی میں حمیدہ سے عشق شروع کر دیا ۔ اس نے چوری بھی کی اور سینہ زوری بھی ۔ اس نے معمولی آدمی بن کر حمیدہ سے بے باکی کی اور وہ شہزادہ بنکر قابل معافی بھی ٹھہرا ۔ منور کی بغل میں بیٹھی ہوئی ایک حسینہ کے دل میں چاپلین کی پکار آ لگی ۔ اسکا ہاتھ خود بخود منور کے زانو پر اس طرح آ گرا جس طرح گلاب کی پنکھڑی گلے کے ہار سے ٹوٹ کر جلتے کلائی کو دیکھا پڑتی ہے ۔ منور نے اپنی مٹھی میں اسی طرح بند کر لیا جس طرح بچے ناچتی ہوئی تتلی پکڑ لیتے ہیں ۔ ایک برقی رو رگوں میں دوڑ گئی ۔ ایک معطر جسم قریب تر کھسک آیا ۔ کندھے سے کندھا ، زانو سے زانو مل گیا ۔ منور نے کان میں کچھ کہا ۔ مسکرا کر انہوں نے جواب دیا ۔ انگلیوں میں انگلیاں پھنستی رہیں ، گرم گرم سانسیں نکلتی رہیں ، تماشا ہوتا رہا ۔ باہر نے محل ہی جان صدقہ کر دی ، چاپلین اور حمیدہ کا عشق جاری رہا ..... "

کمرہ میں پلنگ کے پائینتی دیوار پر قد آدم آئینہ نصب تھا ۔ چہرہ پر نظر پڑا ۔ سوکھا ، لمو تراہ فاقہ زدہ سا ۔ " یہ اس شکل صورت کا جوان ! "

" جھٹ پٹا وقت ہے ۔ دن کے نورانی چہرے کو رات نے اپنی زلف سیاہ سے چھپانا شروع کر دیا ہے ۔ چڑیاں شفق کے رنگین دامن میں لپٹتی اپنے گھونسلوں کی گودوں میں جا رہی ہیں ۔ منور اپنی نئی " بیوک " ڈرائیو کرتا ہوا نکلا ہے ۔ آج اس نے حیدرآباد کی بنی ہوئی ہیرو کی نئی شیروانی پہن رکھی ہے ۔ اسے خود محسوس ہو رہا ہے کہ وہ حسین ہے ، جوان ہے ، دولت مند ہے ، لیکن اس کے دل میں مسرت و طمانیت کے جذبات سے ملی جلی ایک بے اطمینانی بھی ہے ۔ اس کے ان آثار دولت و شباب سے کوئی لطف اندوز ہونے والا کوئی نہیں ۔ ایسا شریک نہیں جو چند پیسوں میں خرید لیا جائے ۔ ایسی عورت نہیں جو سونوں میں بہلایا جائے ۔ بلکہ جس کی خوشی اپنی روح کے جشن کی بنا ہو ، جو قربانی کو تقدیر سمجھے ، جو اپنا ، اچھے ہوئے سوتوں کی طرح سے ایک لمحے بے فکری سے رقص کرے اور پھر خاک وسیع دامن میں اس طرح غائب ہو جائے کہ نہ تو اس انتظاری قرار کے بعد کسی شے کی تمنا ہو ، نہ خواہش ، نہ جستجو ، نہ ملاقات کا شوق ، نہ جدائی کا خطرہ ، اور نہ بعد کی ذمہ داریاں ۔ منور اس سے بالکل اسی طرح جیسے وہ شفق میں پک کر لیا ، کچھ دیر کے لئے تیکھے " ایک شریک " تلاش کرتی ہیں ، پھر تنگ ہو کر رو جاتی

ان سے چاچا ... روشن ... جالا لگ جائیں وہ ساتھ ... شخصیت ... شباب شاید ہی کسی کو ... کو نیر تو رہا ہیں اور پھر ... غائب ہو جائیں۔ اگلی انگاروں جیسی جگنو کی چمک ابھر دیتی ہم پائندہ ... نشانیاں!—

منو نے ... شہر سے باہر مولوی لے ... مضافات سے گذرتی سلسلے ... بجے تک رہ ... ہے ۔ تمام ... دلی ، برگد ، پیپل کے سایہ میں پروان چڑھتی ... کی طرح سپید ... دوہ دتی کی ڈھلی ۔ موٹر فاصلہ کو پھلانگتی چلا جا رہا ہے۔ وہ خود سیٹی سجا رہا ہے اسلئے نہیں کہ وہ مگن ہے بلکہ اس سے ... سیٹیاں ... میں دعوت نامہ کا کام دیتی ہیں — دفعتہً بیچ سڑک پر ایک ارغوانی ... میں ملبوس ایک منحنی دوشیزہ ... رومال ہلاتی کھڑی دکھائی دیتی ہے ۔ خواب کی تعبیر مل گئی! جادوانی وابدی لوح عورت! ایک غیرفانی مستقل بھینی بھینی خوشبو...."

کان چیرتے ہوئے نقارے بجنے لگے : "اب ہو یہ ما شاء اللہ ذرا بلند بالا قدوقامت کے ہوئے" خبرتھی نے پردہ ڈال دیا ...

"لکھنؤ میں دنگل ہے ہماری دنیا کے پہلوان سمٹ کر آگئے ہیں۔ ہر ایک ہیں وہاں ، ہر ایک رستم زماں ، ... لوگ جوق جوق ان کی کشتیاں دیکھنے آئے ہیں ۔ ... کو یں بچھاڑ ہے کبھی زبسکو کے تن ... آتی ہے کبھی کریمر کی اکرم ... کبھی تعجب سے ... دیکھتا ہے، کبھی غلام حسین کو کبھی ... چھوٹے چھوٹے لڑ رہے ہیں۔ ان جھوٹی جوڑوں میں مزہ نہیں آرہا ہے۔ بارے کریمر کی باری آئی ۔ مقابل جگیشر ہے ... اکھاڑے میں آنا بھی ہے تو چنگھاڑتا ہوا ۔ ہندوستانی سمجھ رہے ہیں کہ اب جرمن کی شامت آئی۔ ... ہمیشہ ... کا ... مگر ... ملاتے ہی معاملہ

جرمن ... پڑا ... کی گردن اس طرح دبا لی جس طرح ... منہ میں ... کی گردن ، اور ہندوستانی پہلوان ... کی طرح تڑپتا ہوا زمین سے مل گیا۔ پچاس ہزار ہندوستانیوں کا چہرہ شرم سے عرق عرق ہو گیا۔

جرمن نے للکارا: "کوئی ہندوستانی پہلوان آئے، ... ہیں ، پچھاڑ دے ہم کو ... دیکھا!" سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے ... بھائی بھتیجے ... انہیں آنکھوں کے اشارے سے روک دیا۔ پہلوانوں کی قطار پر نظر حقارت ڈال کر جرمن پھر بولا "ہم کشتی مانگتا ہے، ابھی ابھی!"

منو کو تاب ضبط نہ رہی ۔ وہ ملکی توہین برداشت نہ کر سکا ۔ اچکتا پھاندتا ، اچکن کے بٹن کھولتے اکھاڑے کے پاس پہنچ گیا سب ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے اس نوجوان کو کیا ہو گیا ہے اس نے جرمن کریمر سے کہا! "میں تم سے لڑوں گا" وہ ہنسا : "ہم بچوں سے نہیں لڑتا ۔" منو نے امپیریل بنک کی چیک بک نکالی ۔ دس ہزار کی چیک لکھ کے اکھاڑے کی مینڈھ پر رکھ دی "اگر مجھے چت کر دو تو یہ دس ہزار تمہارے" جرمن اتنی بڑی رقم دیکھکر تیار ہو گیا۔ لوگوں نے کہا "بھیا اکڑتا ... اتار ڈالئے ، چٹ لنگوٹ باندھ لیجئے" منو نے کہا: "اس جرمن سے لڑنے میں میرے کپڑے مٹی میں نہ بھریں گے!" اکھاڑے میں اسطرح اترا جیسے گلگشت چمن کو جا رہا ہے۔ جرمن گھبرا گیا۔ ... سے لڑنے آئی ہے کوئی بھید ضرور ہے ہندوستانی جادو کا کوئی ... یقینی ہے ... ہزاروں آنکھیں پیدا کر کے ہر طرف کے وار کو دیکھتا ہے۔ منو نے زیادہ ... موقع ہی نہ دیا ۔ ... اسکی ... اور جرمن ... کی طرح زمین پر چت ... جرمن کے سینے پر پاؤں رکھکر وہ بولا "اب پھر ہندوستانیوں کو اس طرح نہ للکارنا!" شیروانی پہنکر جب وہ اپنی چیک بک جیب میں ڈال رہا تو ...

غزل — بلقیس اکبرآبادی

کسقدر حسن نظر ہے ترے دیوانوں میں
کلیاں دامن کی سجائی ہیں گریبانوں میں

حسن کو کھینچ کے لے آئی محبت کی کشش
آکے خود شمع کو جلنا پڑا پروانوں میں

کیا خبر ہم کو حرم کیا ہے کلیسا کیا ہے
زندگی ہم نے گزاری ہے انہیں میخانوں میں

ہم نے دیکھی ہے تری مست جوانی کی ادا
جیسے پھولوں میں چھلکتے ہوئے پیمانوں میں

پھول کھلتا ہے جو کوئی تو خیال آتا ہے
یہ بھی شاید ہے ترے چاک گریبانوں میں

دل ناکام کے اجڑے ہوئے گیسو توبہ
ایک محفل بھی تھی شاید انہیں ویرانوں میں

ہمکو بلقیس تکلف کی ضرورت کیا ہے
پی لیا کرتے ہیں ڈھلتے ہوئے پیمانوں میں

پک کر اسے کندھے پر بٹھاتے ہوئے کہا: "میں نے جہاں بھر کے پہلوانوں کو زیر کیا مگر اتنی صفائی، اتنی پھرتی، میں بھی یہ جنگ نہ دکھا سکا!......"

پھر وہی بے بسی، وہی دم گھٹنے والی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ وہی موجوں کے تھپیڑوں سے سانس رک جانے والا احساس۔ "باندیوں سے قصور سرزد ہونے" والا فقرہ دماغ میں گونجنے لگا۔ اس نے کروٹ لی، لب بند، مٹھیاں بند، آنکھیں بند!......

"کل ہند کرکٹ ٹیم سے اور آسٹریلیا والوں سے میچ ہے۔ آسٹریلیا والے پہلے "بیٹنگ" کر چکے ہیں۔ ہندوستانیوں کی بولنگ اچھی خاصی رہی ہے۔ آسٹریلیا والوں نے چار سو رن کئے۔ اب ہندوستانیوں کے کھیلنے کی باری ہے۔ ہندوستانیوں کو بڑا ڈر ہے کہ اب کے ضرور ہاریں گے۔ ابتدا بھی کچھ اچھی نہیں ہوئی۔ بارھویں رن پر ایک کھلاڑی آؤٹ ہوگیا۔ اب منور جاتا ہے۔ اس نے پہنچتے ہی وہ رنگ جمایا کہ سب دنگ رہ گئے۔ اس نے وہ وہ ہاتھ نکالے کہ بار بار تحسین و آفریں کے نعروں اور تعریفی تالیوں سے میدان گونج اٹھا۔ اس نے اکیلے تین سو پچھتر رن کئے اور ایک بھی مشکوک ہاتھ نہ مارا۔ اس نے پچیس باؤنڈریاں لگائیں اور دس چھکے جھاڑے۔ جب وہ بغیر آؤٹ ہوئے شام کو میدان سے پلٹا تو ہندوستانی ٹیم کے کپتان رنجیت نے اسے گود میں اٹھا لیا اور آسٹریلیا کے کپتان ہیٹ نے کہا: "آج تم نے بریڈمین کو بھی مات کر دیا!"

کھیل سے زیادہ اس کی انگلیاں کالج کی لڑکیوں کی ڈائریوں اور نوٹ بکوں پر دستخط کرتے کرتے دکھ گئیں۔ اور لوسی، وہی جو کسی ہندوستانی لڑکے سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتی تھی، آپے سے باہر ہوگئی۔ وہ اسے زبردستی موٹر میں بٹھا کر گھر لے گئی۔ وہ بڑے پیار سے بولی: "تم تھک گئے ہوگے، گرم پانی سے نہالو۔" وہ منور کو اپنے سونے کے کمرے میں سے ہو کر حمام میں لے گئی۔ اس نے سنگ مرمر کے بڑے ٹب میں گرم پانی کا نل کھول دیا۔ منور اس عجیب طرح کی گرمناوی پر گھبرا گیا اور کھڑا رہا۔ لوسی نے ہنس کر اسے کرسی پر بٹھایا اور خود جھک کر اس کے جوتے کے فیتے کھولنے لگی۔ منور نے روکتے ہوئے کہا: "ارے یہ کیا کر رہی ہو؟" وہ اپنی لٹوں کو چہرے سے ہٹاتی ہوئی بولی: "میں ایک داسی کی طرح تمہیں آج اپنے ہاتھوں سے نہلاؤں گی، میرے دیوتا!"......

منور نے آنکھیں کھول دیں، پھر وہی ہنستے ہوئے چہرے، وہی اشارہ کرتی ہوئی آنکھیں، وہی زہر اگلتے ہوئے شیریں لب! "کیسی شیریں زبان ہے۔ اللہ، اللہ کیا طاقت ہے، کیا روانی ہے!"........

یونیورسٹی میں تقریر کا مقابلہ ہے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہے۔ ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں کے طلباء آئے ہیں۔ ڈھاکہ، کلکتہ، پٹنہ، بنارس، الہ آباد، آگرہ، علی گڑھ، دہلی، لاہور، بمبئی، ناگپور، حیدرآباد، مدراس، سب جگہ کے بولنے والے بلائے گئے ہیں۔ دنیا کے مشہور مقرر، چرچل، بیون، مسکی اسٹالن، مالوٹو، ٹرومین، مادام شنکائی شیک، مسز پنڈت، سروجنی نیڈو، گاندھی، پٹیل، راجگوپال آچاریہ، سری نواس شاستری، سرت چندر بوس، مسانی، بھوپت، جناح، کچلو، ذاکر حسین، آزاد، ہادی حسن، غلام السیدین، کلب عباس، سب ہی موجود تھے۔ ریزولیوشن ہے "اس ایوان کی رائے میں سائنس کی جدید ایجادات دشمن انسانیت ہیں۔"

منور اس ریزولیوشن کی تحریک کرنے کھڑا ہوا۔ چند ہی منٹ کی تقریر میں اس نے مجمع کو مسحور کر دیا۔ لوگ جھومتے تھے، تالیاں پیٹتے تھے، ہنستے تھے، روتے تھے، غصہ سے بوٹیاں نوچتے تھے، ہوا سے لڑتے، آگ میں پھاندنے کے لیے تیار تھے۔ معلوم ہوا فیاض خاں کے خیال کا ابھیایا بزرجی نے ایک قلمی گانا گایا۔ یہی کیا یہ گت نہ ہی بلکہ ایک ایک کر کے سب بولے۔ چھوٹے بڑے، ملکی غیر ملکی، مگر سب کی تقریر اس کے آگے بالکل ویسی ہی تھی جیسے کہکشاں کے سامنے پھلجھڑی! منور نے آخر میں جوابی تقریر کی۔ تمام اعتراضوں کے مسکت جواب، اس البیلے انداز، اس اچھوتے ڈھنگ سے پیش کئے کہ شک نے یقین کا درجہ حاصل کر لیا۔ دشمنی دوستی میں تبدیل ہوگئی، اور مخالفت موافقت بن گئی۔ لڑکوں نے نعرے لگائے، لڑکیوں نے ہار پہنائے۔ لیڈروں نے تعریفیں کیں۔ شاستری نے کہا: "مجھے اس نوجوان کے ہندوستانی ہونے پر فخر ہے!" آزاد نے کہا: "میرے بعد کانگریس کی صدارت اسی کو ملنا چاہیے۔" جناح بولے: "میرے پاکستان کا پہلا وزیر اعظم یہی ہوگا!" گاندھی نے کہا: "اس کی زبان میں میرے برت سے زیادہ زور ہے۔" چرچل نے کہا: "اگر میری جگہ یہ نوجوان برطانیہ کا وزیر اعظم ہوتا تو جنگ عظیم چٹکیوں میں ختم کر دیتا اور باتوں باتوں میں ہٹلر کا قلع قمع کر دیتا۔" اسٹالن نے مونچھوں میں مسکرا کر کہا: "اس کی باتوں میں اسٹالن گراڈ سے زیادہ استحکام ہے۔" ٹرومین عینک سیدھی کر کے بولے: "اس کی زبان میں ایٹم بم سے زیادہ زور ہے!"......

اس نے شان سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ شیروانی اور ٹوپی کرسی پر، کتابیں کاپیاں میز پر بے ترتیب پڑی تھیں۔ دیکھتے ہی پھر گھبراہٹ عود کر آئی۔ فیروزہ نے کس طرح شعر پڑھا تھا ؎

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ٭ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟

"شکیلہ کو اپنی حاضر جوابی اور شعر خوانی پر بڑا گھمنڈ تھا۔ نہ جانے کتنے دیوان حفظ تھے اس کو۔ اس پر آواز بھی غضب کی پائی تھی۔ گانے کے فن سے بھی واقف تھی۔ خود بھی اچھا خاصا کہہ لیتی تھی۔ اسی سے تو کہتی تھی: "اگر کوئی مجھ سے اچھے اشعار برمحل پڑھ کر سنا دے تو میں اس کی عمر بھر کے لئے کنیز بن جاؤں گی:"

ایک دن لڑکیوں نے زبردستی اسکا منور سے مقابلہ کرا دیا۔ کئی گھنٹے دونوں شعر پڑھا کئے۔ منور پہلا تو شعر کے جواب میں شعر پڑھتا رہا پھر اس نے پورے پورے قصیدے، مثنویاں کہہ ڈالیں۔ بیلا سے بابِ حافظہ ختم کر دئے۔ شکیلہ کچھ کسی بیہودہ سے کمپا نہیں۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں منور سے کہا: "میں ہاری نہیں تمہاری کہہ دوں۔ لیکن ہم حقیقیل میں ذلیل نہ کرو!" منور اس کا پیغام سمجھ گیا۔ اس نے ایک عجیب طرح کا مدہوش کن سرور محسوس کیا۔ اس نے اپنے دل کو تھا دیں وہ نہ تنگ لئے گلے کا بٹن کھولنا چاہا ہو وہ نہ جانے کیوں الجھ گیا اور منور کے جلتا دینے پر ٹوٹ کر الگ جا گرا۔

شکیلہ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سراج دکنی کا شعر پڑھ دیا۔

خبرِ تحیرِ عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بیخودی نے عطا کیا مجھے وہ لباسِ برہنگی
کہ نہ عقل کی جامہ دری رہی، نہ خرد کی بخیہ گری رہی!

منور یہ کہتا اٹھ آیا کہ اگر اس شعر کے بعد کہیں گلا کیے مرے پھاڑ ڈالا جائیں گے" — اسی شب میں جب وہ اپنے کمرے میں آکر لیٹا تو تھوڑی دیر بعد شکیلہ آئی شب خوابی کے کپڑے پہنے، لٹیں چھٹکائے، چہرہ گلنار کئے، جام بدستِ مے بجام! منور نے کنکھیوں سے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اور قریب آئی خراماں خراماں، گل بکھیرتی، فضا کو معطر کرتی! اپنی مسکراہٹ سے ہر چیز کو جگاتی۔ وہ آہستہ سے اس کے سرہانے جھک کر جھکی۔ اس نے گدگدانے والی آواز میں پوچھا: "ماسے عاشق شوریدہ من خوابست ہست؟"

ماں نے دروازہ کھٹکھٹایا "منور! منور!"

اس نے لحاف ہٹا کر جواب دیا "کیا ہے امی؟"

"ارے تو یہاں لحاف میں منہ لپیٹے کمرہ بند کئے پڑا ہے، وہاں تیری بہن نے آج کالج کی ساری لڑکیوں کو چائے پر بلا رکھا ہے۔ وہاں چل۔ سب تیرا انتظار کر رہی ہیں۔" ماں نادری حکم سنا کر چلی گئی۔ رنگ آمد و نخوت آمد۔

منور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مٹھیاں کس لیں، دانت بھینچ لئے، سر اونچا کیا اور سینہ تان کر دروازے کی طرف اسی شان، اسی تمکنت اور اسی خودداری کے ساتھ چلا جو دار پر چڑھتے وقت چارلس اول نے دکھائی تھی۔ اس نے بڑی بے پرواہی سے دروازہ کھولا — نقرئی قہقہوں کے ساتھ جانی پہچانی آواز میں کوئی کہہ رہا تھا: "وہ بھاگے بے تحاشا بھاگے!"

— منور نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ کیواڑوں کے سہارے کھڑا ہو کر جھلملاتے چراغ کی لو کی طرح کانپنے لگا!!

نوٹ:- خط و کتابت کرتے وقت حوالہ نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیں۔ (ادارہ)

آسٹریلیا کی اونی صنعت

ڈبلیو۔ پی۔ گڈون

آسٹریلیا میں تقریباً دس کروڑ پچاس لاکھ بھیڑیں ہیں۔ یعنی دنیا کی کل بھیڑوں کا چھٹا حصہ ان کا اون دنیا بھر کے اون کا چوتھائی حصہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اس عمدہ باریک اون میں سے جو ملینا بننے کے کام آتا ہے نصف آسٹریلیا میں پیدا ہوتا ہے۔ گوشت کی فراہمی کے اعتبار سے بھی اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ہر سال ایک ارب پونڈ اون کی پیداوار سے تقریباً اسی کروڑ تیس لاکھ روپے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ آسٹریلیا کی برآمدی تجارت کا تیس فیصدی حصہ ہے۔ زمانۂ جنگ میں آسٹریلیا میں اون کی پیداوار کا ریکارڈ سب سے زیادہ بڑھا اور تقریباً اسی فیصدی کی زیادتی رہی اور یہ صورت بھی اس وقت رہی جبکہ مسلسل شدید آندھیوں کے باعث بھیڑوں کی تعداد بقدر ڈیڑھ کروڑ کم ہو گئی۔ اور اس سلسلے میں کام کرنے والے مزدور بھی ناپید رہے۔ زمانۂ جنگ کی پانچ فصلوں پر حکومت برطانیہ نے ۴۴،۲۰،۰۹،۸،۷،۱ گانٹھیں خریدیں جن کی قیمت ۳،۲۰،۶،۶۵،۰۰۰ روپے ہوئی۔

جنگ کے دوران میں ملک کے اون والے کارخانوں نے کپڑے کے تھان اور کمبل اس قدر زیادہ تیار کئے کہ وہ دس لاکھ امریکی، برطانوی اور آسٹریلوی سپاہیوں کے کام آسکے بھیڑ کی کھال سے بنی ہوئی ہزاروں گریاں روسی اور برطانوی سپاہیوں کیلئے فراہم کی گئیں جنگ شروع ہونے کے بعد سے ۳۱ مارچ ۱۹۴۳ء تک بھیڑ اور بکری کا سوکھا ہوا گوشت جو آسٹریلیا سے بھیجا گیا تیراسی کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ تھا اور ۳۰ جون ۱۹۴۶ء تک ایک ارب اٹھاون کروڑ چھبیس لاکھ اٹھتر ہزار پونڈ۔

آسٹریلیا میں بھیڑوں کی پرورش کا علاقہ جنوب میں تسمانیہ سے شمالی وکٹوریہ اور جنوب مشرقی نیو ساؤتھ ویلز کے پہاڑی خطوں سے ہوتا ہوا اور پھر مغربی نیو ساؤتھ ویلز کے میدانوں سے ہوتا ہوا کوئنزلینڈ تک پھیلا ہوا ہے۔ جنوبی آسٹریلیا میں اور بہت کچھ مغربی آسٹریلیا میں بھی بھیڑوں کی پرورش کی چراگاہیں موجود ہیں۔ نصف سے کچھ کم بھیڑیں نیو ساؤتھ ویلز میں پلی ہوئی ہیں۔

زیادہ گلّے ایسے ہیں جن میں پانچ سو سے ایک ہزار تک بھیڑیں ہیں۔ ایسے گلوں کی تعداد ڈھائی سے پانچ سو تک ہے۔ اعداد و شمار لینے کے پچھلے موقعہ پر معلوم ہوا کہ اڑتیس گلّے ایسے ہیں جن میں پچاس ہزار سے زیادہ اور بعض میں ایک لاکھ سے بھی زیادہ بھیڑیں ہیں۔ بھیڑوں کی ایسی بعض آبادیاں ایک ہزار اور پانچ ہزار ایکڑ کے درمیان جنگہ گھیرے ہوئے ہیں۔ بھیڑوں کے ۱۵۴۳ مرکز ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پچاس ہزار ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ ان میں سے ۷۴۳ مغربی آسٹریلیا میں ۱۹۸ نیو ساؤتھ ویلز میں اور باقی ۱۸۷ کوئنزلینڈ میں ہیں۔ ان میں ہر ایک کم و بیش ایک لاکھ ایکڑ کے رقبے میں ہے۔ چنانچہ اس قدر وسعت کے باعث بھیڑوں کے بعض علاقے ایکڑوں کی بجائے مربع میلوں میں محسوب کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اعداد و شمار کے لحاظ سے یہ نہیں کہا جاتا کہ ایک ایکڑ میں کتنی بھیڑیں رہتی ہیں بلکہ یہ کہ ایک بھیڑ کے لئے کتنے ایکڑ درکار ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں بارش بہت کم ہوتی ہے اور اس لئے ان کے چارے کی پیداوار زیادہ نہیں ہوتی۔

آسٹریلیا میں عمدہ باریک اور گھنی اون والی جو بھیڑیں ہوتی ہیں جن کو باعتبار قسم "میرینو" کہا جاتا ہے۔ اور ان کی نسل کا رشتہ ہسپانوی بھیڑوں سے ملتا ہے۔ وہ قد آور جسیم اور توانا ہونے کے علاوہ اون سے لدی ہوتی ہیں۔ یہ صورت تقریباً سو سال کے بعد پیدا ہوئی ہے جبکہ ان کی پرورش کا غائر مطالعہ اصل حالات کے تحت ہوتا رہا ہے۔ شروع میں ہر ہسپانوی میرینو بھیڑ سے سال بھر میں چار پونڈ اون حاصل ہو جاتا تھا لیکن آج آسٹریلیا کی ہر بھیڑ سے پیدا ہونے والی اون کی اوسط نو پونڈ سالانہ ہے جبکہ تار بھی مقابلتاً زیادہ طویل ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ آسٹریلوی بھیڑ زیادہ بڑی اور جسمانی اعتبار سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ میرینو قسم کی بھیڑ خاص طور پر حوادث روزگار کا مقابلہ کرنے میں مشہور ہے۔ مثلاً نیو ساؤتھ ویلز میں بھیڑ کا ایک مرکز ایسا ہے کہ وہاں تیس ہزار ایکڑ کے علاقے میں پانی بالکل ناپید ہے۔ کہیں کہیں زمین کھود کر تالاب بنائے ہیں اور کہیں بہرے لگا رکھے ہیں۔ نہ چراگاہیں اچھی ہیں نہ قدرت ساتھ دیتی ہے۔ پھر بھی بھیڑوں کا گزارہ ہو جاتا ہے۔ اس مرکز کے گلّے قدرتی گھاسوں، جھاڑیوں اور کسیلے پتوں پر اوقات بسر کرتے ہیں۔ گذشتہ چھبیس سال میں بارش کی اوسط چودہ انچ سالانہ رہی ہے۔ اور ۱۹۴۰ء سے تو بالکل خشک سالی کا دور دورہ ہے۔ بعض موسموں میں بارش بالکل نہیں ہوئی پھر بھی ۱۹۴۳ء کی ½ ۵ انچ بارش کے باوجود ہر بھیڑ سے

پیدا ہونے والی اون کا اوسط فی بھیڑ سوا تیرہ پونڈ تھا۔

بھیڑوں نے بچے جننے میں بھی کمال کر دیا۔ اوسط بیاسی فیصدی کے قریب رہی [illegible] علاقہ بہت ہی بھاگوان رہا۔ بچوں کی اوسط ۱۰۱/۱۱ فی صدی رہی۔

پورے سو سال تک اہل آسٹریلیا نے اپنی توجہ میرینو والی بھیڑوں پر مبذول رکھی۔ کیونکہ آسٹریلیا سمندر پار کی منڈیوں سے اس قدر دور ہے کہ گوشت وہاں تک نہیں بھیجا جا سکتا۔ لیکن جب یخ خانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو میرینو والی بھیڑوں کے ساتھ ساتھ ان بھیڑوں کی پرورش بھی عمل میں آنے لگی جو صرف کھائے جانے کے لائق ہیں۔ ایسی بھیڑیں عموماً دوغلی نسل کی ہوتی ہیں۔ گوشت کھانے کے علاوہ ان کا اون بھی کام میں لایا جا سکتا ہے۔ ان کی پرورش زیادہ تر ساحل کے قریب ہوتی ہے یا اس سے ملحق قصبوں میں جہاں گھاس اور پانی کی زیادتی ہو۔ ملک کے اس حصے میں جو چٹیل میدانوں کی طرح ہموار، بنجر اور خشک ہے میرینو نامی بھیڑیں رہتی ہیں۔

برے دن آنے پر جس طرح اس کاروبار میں شدید نقصان اٹھانا پڑتا ہے یعنی ایسا نقصان جو لاکھوں تک پہنچ جائے اسی طرح اچھے دنوں میں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ کامیابی کا منہ دیکھنا صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو کاروبار سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں۔ گلوں کو بہت سے دشمنوں سے محفوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے مثلاً خرگوش اور کنگرو چراگاہوں کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ جنگلی کتے بھیڑوں کو زخمی کر ڈالتے اور مختلف قسم کی بیماریاں اور کیڑے ان کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ نوزائیدہ بچوں کی زبردست احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ خاص قسم کی بھیڑوں کے لئے خاص زمین کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ ایک مربع میل میں کتنی بھیڑیں آسانی سے پرورش پا سکتی ہیں۔ ان کو نہلانا دھلانا اور صاف حالت میں رکھنا بھی ایک اہم کام ہے۔ اس کے بعد بالوں کی کٹائی کا نمبر آتا ہے۔ بال کاٹنے والا اگر اچھا مشاق ہو تو آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرنے کے دوران میں دو سو بھیڑوں کو بھگتا سکتا ہے۔ اس طرح ایک موسم میں اس کی آمدنی مبلغ ۴۲۰ روپے ہو سکتی ہے۔ بال کاٹنے کے مرکزوں پر دو، چار حتیٰ کہ چالیس تک مشینیں لگی ہوتی ہیں۔ ایک اونچے سے تختہ پر بال کاٹنے کی مشین ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر بجلی سے چلتی ہیں۔

بعض مرکز بہت ہی بڑے ہیں جن میں ایک سو کے قریب مشینیں لگی ہوتی ہیں جہاں ایک موسم میں چار پانچ لاکھ بھیڑوں کے بال کاٹے جا سکتے ہیں۔

بال کاٹنے والا گھسیٹ کر بھیڑ کو تختے پر لاتا، اسے ٹھیک حالت میں لٹاتا اور فوراً کام شروع کر دیتا ہے۔ اس کی کمر کے جھکتے ہی مشین تیزی سے چلنے لگتی ہے۔ اس کے ساتھی بھی اس کی طرح جھکے ہوتے ہیں اور ان سب کو کام کی جلدی ہوتی ہے۔ ایک جانور کے ختم ہوتے ہی دوسرا اس کی جگہ گھسیٹ لیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ قائم رہتا ہے حتیٰ کہ سارا گلہ ختم ہو جاتا ہے۔

جب تمام اون اتر چکتا ہے تو اسے مختلف اقسام میں رکھا جاتا ہے۔ آسٹریلیا میں اون کی کم و بیش سولہ سو قسمیں ہوتی ہیں، جن کی قیمتیں ان کی نفاست، عمدگی کے لحاظ سے مختلف رہتی ہیں۔ اقسام جانچنے والے سات سو سے ایک ہزار قسم کی اون میں امتیاز پیدا کر سکتے ہیں۔ جانچ لینے کے بعد اون کی گانٹھیں تیار کر لی جاتی ہیں اور ان کو قریب ترین اسٹیشن پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے وہ خرید و فروخت کی منڈیوں میں چلی جاتی ہیں۔

دوران جنگ میں آسٹریلین وول بورڈ نے برطانیہ کے ساتھ سامان کی فراہمی کا معاہدہ کر لیا تھا۔ اب پھر کام کو نئے سرے سے منظم کیا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں برطانیہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ کے مابین نیا معاہدہ ہوا ہے۔

تقریباً سو سال تک آسٹریلیا والوں نے اون کی بیرونی تجارت ہی کو اپنے لئے کافی سمجھا۔ لیکن اب مقامی طور پر مستقل صنعتی ادارے

رسمساہٹ

دل کے گوشوں میں اک تمنا
رنگین شمعیں جلا رہی ہے
دل کی رگ رگ میں خون کی رُو
میٹھے سُر میں بجا رہی ہے
جو برگ ہے تال دے رہا ہے
جو موج ہے گنگنا رہی ہے
سورج برسا رہا ہے سونا
شبنم موتی لٹا رہی ہے
چلتے چلتے ٹھٹھک رہا ہوں
کوئی آواز آ رہی ہے
دھندلے دھندلے سے آنسوؤں میں
تصویر سی مسکرا رہی ہے
مُنہ بند کلی کھلی نہیں ہے
کھلنے ہی کو کسمسا رہی ہے
رہ رہ کے ہوائے سیر صحرا
در شوق کا کھٹکھٹا رہی ہے
بھونرا رس پی رہا ہے چھپ کر
تتلی خوشبو چرا رہی ہے
مستی ظلمت کی وادیوں میں
سیمیں تارے لٹا رہی ہے
فرش امید پر تمنا
کچی کلیاں بچھا رہی ہے

سنسان گلی میں کھلکھلا کر
ہنسنے کی صدا سی آ رہی ہے

کے قیام کی اہمیت محسوس کی جا رہی ہے۔ یہ صورت زمانۂ جنگ کے کاروبار سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اونی کپڑا بنانے والوں نے اس بات کا ٹھیکہ لیا ہے کہ وہ ۱۹۵۰ء تک ہر شخص ادارہ فلاح متحدہ مشترک کے لئے دس لاکھ گز کپڑا تیار کریں گے۔ حالانکہ وہاں کی مقامی ضرورتوں میں کپڑے کی مانگ بہت بڑھی ہوئی ہے۔ کام بہت زیادہ ہے اور اس بات کا امکان ہے کہ تیس لاکھ مرد و عورت جن کی واپسی جنگ سے ہوئی ہے شہری آبادی میں شامل ہو کر اس کام میں ایک ہو جائیں۔ اب بھی بہت سی قسم کے خصوصاً گرم کپڑے بنانا ممکن ہے۔ اس نے انہیں مدد کے طور آزاد کرائے ہوئے ممالک کو کپڑا سب سے پہلے دیا جا سکتا ہے۔

برطانیہ کے ایک سو بیس کارخانوں میں جو اونی اور دوسرے گرم کپڑے بناتے ہیں تقریباً ستائیس ہزار آدمی ملازم ہیں۔ نیز ان کے تقریباً سوا تین سو کارخانے ہیں جن میں بیس ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ یہ صنعتی ادارے ہر سال تقریباً چھ کروڑ مربع گز اونی کپڑا تیار کرتے ہیں۔ ہاتھ کے بنے ہوئے اون اور مشین سے تیار کئے ہوئے لباس اس مقدار کے علاوہ ہیں۔ بہت سے کارخانوں کے مالک اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کا مال سو فیصدی خالص اون کا ہے اور اس میں خوبی یہ ہے کہ یہ دھلنے کے بعد سکڑ نہیں سکتا۔

زمانۂ جنگ میں آسٹریلیا کے کارخانوں نے اپنی ملکی ضروریات راشن کے مطابق پوری کرتے رہنے کے علاوہ بہت سامان باہر بھی بھیجا۔ مثلاً انہوں نے اونی کپڑے کے پچاس لاکھ بلاوز اور جیکٹ، پچاس لاکھ پاجامے، ایک کروڑ پانچ لاکھ کمبل اور تین کروڑ دس (لاکھ گز) اونی کپڑا دوسری ضروریات کے لئے فراہم کیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کارخانوں کی زیادہ توجہ جنگی احتیاج کی جانب مبذول رہی۔

گزشتہ دس سال میں اس صنعت کی کل پیداوار بے قیاس بڑھی ہے۔ ۱۹۳۲-۳۳ء میں آسٹریلیا کے کارخانوں میں ۲۱۷۲ اور ۲۰۴ گانٹھوں کی کھپت ہوئی جو کل پیداوار کا ۷۶ء۹ فیصدی ہے۔ ۱۹۴۲-۴۳ء میں انہوں نے ۱۴۵۰۷۰ گانٹھیں صرف کیں یعنی ۲۰ء۳۱ فیصدی۔ ۱۹۴۵-۴۶ء میں کسی قدر کمی واقع ہوئی کیونکہ مزدوروں کی کمی تھی۔ اس سال ۲۴۴۷۰۳ گانٹھیں کام آئیں یعنی ۱۶ء۲۱ فیصدی۔ ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۱۰۲ مل تھے، ۱۹۴۵-۴۶ء میں ۱۱۸ ہو گئے۔ اس زمانے میں کاروبار کی کل رقم بائیس کروڑ اڑتالیس لاکھ پچاس ہزار روپے سے تینتیس کروڑ پچیس لاکھ پچاس ہزار روپے ہو گئی۔ اس کے علاوہ سلائی سے بنے کے کارخانوں کا کل کاروبار تقریباً تیرہ کروڑ اکیانوے لاکھ اڑتیس ہزار روپے سالانہ کا رہا۔

اس حقیقت کے باوجود کہ آسٹریلیا میں اونی صنعت نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے، اس کے مرکز اب بھی نیو ساؤتھ ویلز میں زیادہ ہیں جہاں ابتدائی حالت میں ان کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ پہلا کارخانہ ۱۸۶۳ء میں سڈنی کے قریب پیرامٹا میں قائم ہوا تھا جو اب بھی قائم ہے۔

ولائتی کپڑے سے مقابلہ ہونے کے باعث اس کی ترقی رکی رہی حتی کہ ۱۹۱۴-۱۸ء کے دوران میں جنگ کے باعث پہلی بار شہ ملی۔ اس کے بعد سے برابر آسٹریلیا میں یہ صنعت شاندار ترقی پر گامزن ہے۔ واقفیت اور تجربے کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس وقت ماہرین فن آسٹریلیا کے مال کا مقابلہ دوسرے ملکوں کے مال سے کر سکتے ہیں۔ باہر جانے والا مال خصوصیت کے ساتھ اعلیٰ اور نفیس ہوتا ہے۔

عشرتِ ناتمام

ابتک تصورِ ماہ وشاں کے لئے مدام — تعمیر کو میں نے اپنا بنایا ہے بارہا
ہر اک امیدِ زیست کا حاصل تھی جو کبھی — ہر آرزو نے دل کو مسلا ہے بارہا
ان دامنوں کی سمت جو میری نہ ہو سکے — میں نے نحیف ہاتھ بڑھایا ہے بارہا
ان مسکراہٹوں کے لئے جو حسیں تھیں — اپنے وفورِ غم کو چھپایا ہے بارہا
اکثر دوستوں کی جدائی کا غم رہا — جن کے طفیل خود کو ہنسایا ہے بارہا

اک خاص دُھن میں گیت کے گاتا رہا ہوں میں
اکثر اسیرِ دامِ تمنا رہا ہوں میں

لیکن میں آج اپنا ہی ماتم گسار ہوں — ہر گام پر امید نے دھوکا دیا مجھے
از خود تو احتیاط سے آگاہ کر چکا — جن دامنوں نے بڑھ کے ہٹا دیا مجھے
جن کے لئے میں خود کو دیتا رہا فریب — ان مسکراہٹوں نے بھی ٹھکرا دیا مجھے
احباب نے سنا تھا مجھ سے ہزار بار — وہ نغمۂ بہار بھی لوٹا دیا مجھے
ناکامیوں کے فیض نے دل کو جلا دیا — میری مسرتوں نے بھلا دیا مجھے

خوش رنگ ساعتوں کا یہ انجام کیا کروں
کیسے جیوں میں حسرتِ ناکام کیا کروں

احمد ریاض

رنگے ہوئے گیدڑ

مصنف: جبران خلیل جبران
مترجم: حبیب اشعر دہلوی

(۱) سلمان آفندی

پینتیس سالہ مرد — خوش پوشاک، خوش قامت، چڑھی ہوئی مونچھیں، پاؤں میں چمک دار جوتا اور ریشمیں جرابیں، منہ میں قیمتی سگریٹ اور ہاتھ میں حسین و نازک بیت، جس کی سنہری موٹ، اعلیٰ درجہ کے جواہر سے مرصع عالی شان ہوٹلوں میں کھانا کھاتا ہے، جہاں شہر کے بڑے بڑے لوگ جمع ہوتے ہیں اور شاندار گاڑی میں مشہور تفریحی مقامات کی سیر کو جاتا ہے جسے دو نہایت نفیس گھوڑے کھینچتے ہیں۔

سلمان آفندی کو اپنے باپ سے ایک کوڑی ورثہ میں نہیں ملی۔ اللہ بخشے اس کا باپ ایک غریب و مفلس آدمی تھا، جس نے نہ کبھی تجارت کی نہ دولت کمائی۔ وہ حد درجہ سست اور کاہل تھا، کام سے نفرت کرتا اور اسے اپنے مرتبہ سے گری ہوئی چیز سمجھتا۔ ہم نے ایک مرتبہ خود اس کی زبان سے سنا ہے کہ "میرا جسم اور میری فطرت کام سے میل نہیں کھاتی۔ کام ان لوگوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے، جن کی فطرت، بے کیف اور جسم، کمزور سے ہیں"۔

تو پھر سلمان آفندی نے اتنی دولت کہاں سے حاصل کی اور وہ کون سا جادوگر تھا جس نے مٹی کو اس کی مٹھیوں میں سونے چاندی سے بدل دیا؟ یہ رنگے ہوئے گیدڑوں کے بے شمار رازوں میں سے ایک راز ہے، جو عزرائیل نے ہمیں بتایا، اور ہم اب تمہیں بتاتے ہیں:

پانچ برس ہوتے ہیں کہ سلمان آفندی نے سیدہ فہیمہ سے شادی کی۔ سیدہ فہیمہ مرحوم پطرس نعمان تاجر کی بیوہ ہے، جو اپنی کوشش، استقلال اور دیانت کے لئے اپنے تمام ہمسروں میں شہرت رکھتا تھا۔ اس وقت سیدہ فہیمہ کی عمر پینتالیس سال ہے اور اس کے جذبات کی عمر سولہ سال۔ وہ ہرچند اپنے بالوں میں خضاب اور اپنی آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہے، اپنے چہرہ کو کریم اور پاؤڈر سے چمکاتی ہے لیکن سلمان آفندی آدھی رات سے پہلے کبھی گھر میں نہیں گھستا۔ شاید ہی کوئی گھڑی ہوتی ہو، جب وہ اپنے شوہر کی تیز تیز نظروں اور نا ملائم کلمات سے محفوظ رہتی ہو، جس کی وجہ یہ ہے کہ سلمان آفندی نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اس دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے، جو اس کے پہلے شوہر نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے جمع کی تھی۔

(۲) ادیب آفندی

ستائیس سالہ جوان — لمبی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ناپاک چہرہ، ہاتھ روشنائی میں بھرے ہوئے، ناخن میل سے اٹے ہوئے، جسم پر پھٹے پرانے کپڑے، جن پر جا بجا تیل، چکنائی اور قہوہ کے چھینٹے۔

اس مکروہ حالت کا سبب، ادیب آفندی کی غربت و محتاجی نہیں، غفلت و بے پروائی ہے، وہ مصر رہیت ہے جس نے بلند مسائل، معنوی امور اور الہیاتی مباحث کی تحقیق و تلاش کے سلسلہ میں اس کے دماغ کو گھیر رکھا ہے، چنانچہ ہم نے خود اسے ابن جندی سے کہتے سنا ہے کہ "طبیعت دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتی" یعنی ادیب ایک وقت میں انشاء پردازی اور پاکیزگی، دونوں کا خیال نہیں رکھ سکتا۔

ادیب آفندی بہت بولتا ہے اور ہر وقت بولتا ہے۔ اس کے نزدیک بولنا، دنیا کی ہر چیز سے افضل ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس نے بیروت کے کسی مدرسہ میں دو سال تک ایک مشہور استاد سے علم بدیع کا درس لیا ہے۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس نے بہت سی نظمیں کہی ہیں مضامین لکھے ہیں اور کتابیں مرتب کی ہیں، جو مختلف اسباب کی بنا پر، جن میں سب سے بڑا سبب عربی صحافت کا انحطاط اور پڑھنے والوں کی جہالت ہے، ہنوز طبع و اشاعت سے محروم ہیں۔

کچھ دنوں سے ادیب آفندی اپنی توجہ قدیم و جدید فلسفہ کی باریکیوں پر صرف کر رہا ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں سقراط کا بھی عقیدت مند ہے اور نیٹشے کا بھی۔ وہ آگسٹس کے ملفوظات بھی اسی شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہے، جس شوق و دلچسپی کے ساتھ والٹیر اور ژاں ژاک روسو کی کتابیں۔

ہم پہلی مرتبہ اس سے ایک شادی میں ملے تھے۔ لوگ اس کے چاروں طرف، نغمہ و شراب میں مست تھے اور وہ اپنے مشہور بلیغ انداز میں شکسپیر کے ڈرامہ، ہملٹ پر تبصرہ کر رہا تھا۔

دوسری مرتبہ ہم نے اسے ایک رئیس کے جنازہ میں دیکھا۔ لوگ، اس کے پہلو میں غمگین چہرے بنائے، سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور وہ اپنی مخصوص فصیح البیانی کے ساتھ فارض کی غزلوں اور ابو نواس

کی نفسیات پر بحث کر رہا تھا۔

ان حالات میں ادیب آفندی کیوں جی رہا ہے؟ پرانی کتابوں اور بوسیدہ اطلاق میں اپنے شب و روز برباد کرنے سے اس کا کیا مقصد ہے؟ وہ ایک گدھا کیوں نہیں خرید لیتا اور اسے کرایہ پر چلا کر، دولت مند کرایہ چلانے والوں کی صف میں شامل کیوں نہیں ہو جاتا؟

یہ رنگے ہوئے گیدڑوں کے بے شمار رازوں میں سے ایک راز ہے، جو عنتر بول نے ہمیں بتایا اور ہم اب تمہیں بتاتے ہیں:

تین برس ہوئے، ادیب آفندی نے پادری یوحنا شمعون کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اور حبیب بک سلوان کے گھر میں اس کے سامنے پڑھا۔ قصیدہ ختم ہو جانے کے بعد پادری نے اسے بلایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا:

"بیٹا! خدا تجھے زندہ و تندرست رکھے! تو بڑا نکتہ رس شاعر اور فطرت شناس ادیب ہے۔ میں تجھ جیسے باکمال پر فخر کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تو ایک دن مشرق کی بڑی شخصیتوں میں شمار کیا جائے گا۔"

اس دن سے لے کر آج تک ادیب آفندی اپنے باپ، چچا اور ماموں کی تحسین و ستائش کا مرکز ہے۔ وہ فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

"کیا پادری یوحنا شمعون نے ارشاد نہیں فرمایا تھا کہ وہ ایک دن مشرق کی بڑی شخصیتوں میں شمار کیا جائے گا؟"

(۳) فرید دعیبس

چالیس سال کا پختہ عمر انسان —— لمبا قد، چھوٹا سا سر، بڑا دہانہ، تنگ پیشانی، اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ، سینہ نکال کر آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ اس کی رفتار اس اونٹ کی رفتار سے متوازن ہے جس کی پیٹھ پر بوجھ ہو۔ جب وہ بلند آواز اور پر وقار انداز میں گفتگو کرتا ہے تو انجان آدمی یہ سمجھتا ہے کہ حکومت کا کوئی وزیر لوگوں کے معاملات سدھارنے اور رعایا کی تکلیفیں دور کرنے میں مصروف ہے۔

فرید بک کو اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ محفلوں میں صدر مقام پر بیٹھے اور اپنے بزرگ خاندان کے کارنامے گنوائے یا اپنی عالی نسبی کی خصوصیات بیان کرے۔ وہ نپولین اور عنترہ عبسی جیسے بہادروں اور بڑے لوگوں کے حالات اور کارنامے بہت دلچسپی سے سنتا ہے۔ نفیس اسلحہ جمع کرنے کا اسے خاص شوق ہے اور وہ اس کے گھر کی دیواروں پر ترتیب سے سجے ہوئے بھی ہیں لیکن وہ ان کو استعمال کرنا نہیں جانتا۔

اس کا قول ہے کہ اللہ نے انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک گروہ خدمت کرنے کے لئے ہے اور دوسرا خدمت لینے کے لئے۔" اس کا دوسرا قول ہے کہ "عام انسان ایک اڑیل ٹٹو ہے، جو اس وقت تک ٹھیک نہیں چلتا جب تک کوئی اس کی پیٹھ پر سوار نہ ہو جاتے۔" یہ تیسرا قول بھی اسی سے منسوب ہے کہ "قلم کمزوروں کے لئے ہے اور تلوار قوت والوں کے لئے!"

اچھا تو وہ اسباب کیا ہیں جن کی بنا پر فرید بک اپنی بڑائی کے لئے شیخیاں مارتا ہے؟ از راہ غرور اپنی عالی نسبی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے؟ اور خود بینی و خود پسندی کا اظہار کر کے لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے؟

یہ رنگے ہوئے گیدڑوں کے بے شمار رازوں میں سے ایک راز ہے، جو سلنائیل نے ہمیں بتایا اور ہم اب تمہیں بتاتے ہیں:

انیسویں صدی کے ثلث اول میں سلطان بشیر شہابی اپنے امیروں کے ساتھ لبنان کی وادیوں میں سیر و تفریح کے لئے آیا۔ اتفاق کی بات کہ جب وہ اس گاؤں کے قریب سے گذرا جس میں فرید بک دعیبس کا دادا منصور دعیبس رہتا تھا، تو دھوپ تیز ہو گئی اور سورج کی باریک باریک شعاعیں زمین کا سینہ چھیدنے لگیں۔ سلطان گرمی کی تاب نہ لا کر گھوڑے سے اتر پڑا اور ساتھیوں سے کہا:

"آؤ! تھوڑی دیر اس بلوط کے سائے میں دم لے لیں!!"

جب منصور دعیبس کو اس کا علم ہوا تو اس نے اپنے ہمسایہ کسانوں کو بلایا اور انھیں خبر دی کہ سلطان ان کے گاؤں کے قریب رونق افروز ہے۔ یہ سن کر وہ سب کے سب انجیر اور انگور کے خوان اور دودھ، شراب اور شہد کی تھلیاں لئے منصور کے پیچھے پیچھے بلوط کے درخت کی طرف چلے، جہاں سلطان بشیر شہابی قیام فرما تھا۔ منزل مقصود پر پہنچ کر منصور دعیبس آگے بڑھا اور عبائے شاہی کو بوسہ دیا پھر اس کے قدموں میں ایک بکرا ذبح کیا اور بلند آواز میں کہا:

"یہ سب جہاں پناہ کی مراحم خسروانہ کا اثر ہے!"

سلطان نے اظہار خوشنودی کے طور پر اسے خلعت عطا فرمایا اور کہا:

"تم آج سے اس گاؤں کے سردار ہو، جسے ہماری خصوصی عنایتیں نوازتی رہیں گی۔ جاؤ! ما بدولت نے تمہارے گاؤں والوں پر سے اس سال کا شاہی لگان معاف فرمایا!"

امیر کے چلے جانے کے بعد اس رات کو گاؤں کے تمام آدمی سردار منصور دعیبس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسے اپنے رنج و راحت کا آقا تسلیم کر لیا —— اللہ ان سب پر رحم کرے!

رنگے ہوئے گیدڑوں کے اور بھی بہت سے راز ہیں، جن سے شیطان ہمیں دن رات آگاہ کرتے رہتے ہیں اور ہم، اس سے پہلے

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

قدیم چین میں ہاتھی دانت کا کام

لیونیا ایل بیلی

قدیم زمانے سے ہاتھی دانت کی چیزیں مقبول عام ہیں چاہے ... کی ہوں چاہے استعمال کی۔ یہ ایسی شے ہے جس پر نہایت عمدہ اور ... کندہ کاری ہو سکتی ہے اور جو رنگ اور ملائمت میں ... جیسی ہوتی ہے، وقت کے ساتھ ساتھ عنبر کا ہلکا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

چین میں ہاتھی دانت کا کام آغاز تاریخ ہی سے ہوتا ہے۔ چینیوں کو ہاتھی دانت ہمیشہ سے بہت پسند ہے جنہوں نے ہر قسم کے فن میں مہارت حاصل کی ہے لیکن ہاتھی دانت کو چین کی صنعت میں سینکڑوں برس سے اہمیت حاصل ہے اور اس کی کندہ کاری میں انھوں نے بڑے کمالات دکھائے ہیں۔ قدیم چین میں ہاتھی دانت کا جو کام ہوتا تھا اسے فلسفی خاص طور پر پسند کرتے تھے۔ اس زمانے کی اشیاء بہت کم لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ اس موضوع پر لکھا بھی ... کم گیا ہے اور اہل یورپ کو تو ان کے متعلق بہت ہی کم معلومات حاصل ہیں۔ عہد منگ اور ... کے فن کے نمونے تو بہت ہی نایاب ہیں کیونکہ یہ باہر بھیجنے کے لئے تیار نہیں کئے جاتے تھے۔ ... خاندان کے عہد کے اواخر میں چینیوں نے اہل مغرب کے ... ہاتھی دانت کی چیزیں بنائیں۔ اس کے بعد زوال کا زمانہ شروع ہو گیا۔ ... کی تہذیب کے نئے رجحانات کے لئے جگہ پیدا کی۔ اب ایسی چیزیں بننے لگیں جو عوام کو پسند آئیں مثلاً کارڈ رکھنے کے ڈبے، پنکھے اور جواہرات وغیرہ۔ ان سب پر بہت زیادہ کام ہوتا تھا لیکن ان ... میں ... کی تہذیب کے خاص اثرات نمایاں نہیں ہیں۔

جہاں تک چین میں ہاتھی دانت کے کام کا تعلق ہے ایک ... کے سامنے صرف برآمد کئے ہوئے نمونے ہوتے تھے۔ اہل مغرب ہاتھی دانت کے قدیم فن کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ چین کئی صدیوں تک مختلف ملکوں کے نمائندوں کو ... اشیاء تحفتہً پیش کرتا رہا لیکن ان میں ہاتھی دانت ... بہت کم شامل ہوتی تھیں۔

چنگ خاندان کے عہد حکومت کے آخری زمانے سے چنگ عہد حکومت کا اسلوب بالکل مختلف تھا جو قدیم اور سادہ ... نہیں اور اہم تہذیب کا پتہ دیتی ہیں۔ اب فن کے ہر شعبے میں احتیاط برتی

جانے لگی خواہ ... ہو، کندہ کاری ہو، ... ڈل بنانا ہو۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس وقت تہذیب ... گئی تھی۔ ہاتھی دانت کا کام کرنے والوں کے جوش اور جذبہ کا پتہ فلسفیوں اور بزرگوں کے مجسموں سے چلتا ہے جنھیں بڑی اہمیت دی گئی تھی اور ہر ایک کی خصوصیات نمایاں تھیں۔

ہاتھی دانت سے ... کا ... ساری چیزیں ... معانی کی حامل ہیں۔ ان کے فن ثقافت اشاریت اور روایت پر اتنا عرصہ گزرنے پر بھی کوئی اثر نہیں پڑا۔ چینی فن سے لطف اندوزی کے لئے چینیوں کے قدیم فلسفہ اور روایات کا علم ہونا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں جن لوگوں کو بار بار دہرائے جانے والے ... موضوعات میں بہت کم مزہ آتا ہے وہ بھی ان چیزوں سے لطف حاصل کرتے ... ہاتھی دانت کے ... چھوٹے ... بت اور تاویذ مذہب کے مندروں اور گھریلو سجاوٹ کے کام آتے تھے۔ ان فنکاروں نے ان مجسموں میں ارضی اور سماوی جذبات پیدا کئے ہیں کیونکہ چین کے سارے قدیم فن کی روح رواں شدید مذہبی جذبہ ہے اور ہر ایک فنکار کا خیال اور ... ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ عمدہ ہاتھی دانت پر ماہر فنکار ہی کندہ کاری کرتے تھے۔ شکل، جسم، رنگوں کا اتار چڑھاؤ اور سایہ اور روشنی ہاتھی دانت میں کشش پیدا کر دیتے تھے۔ خوبصورت چیز بنانے میں وقت کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ ہر ممکن احتیاط برتی جاتی تھی اور نہایت باریک کام کیا جاتا تھا۔

چینی فنکار بڑی توجہ اور سنجیدگی سے ہاتھی دانت منتخب کرتا ہے کیونکہ اسے بخوبی معلوم ہے کہ کس قسم کے ہاتھی دانت کی ضرورت ہوگی۔ وہ شروع ہی سے اپنے تخیل کو ہاتھی دانت کے ٹکڑے میں سمونے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ اندھے کی لاٹھی بنانا چاہتا ہے تو ہاتھی دانت پسند کرتے وقت بھی اس کا ... رکھے گا۔ سنجیدہ فنکار ہاتھی دانت کے ایک ہی ٹکڑے میں کندہ کاری کر کے ایک چیز تیار کرتا ہے کیونکہ اگر ہاتھی دانت کا ٹکڑا جوڑا جائے اور ڈیزائن بنانے کے بعد جوڑا اضافہ کیا جائے تو نکتہ شناس کے نقطۂ نظر سے ڈیزائن بے مزہ ہو جاتا ہے۔ چینی فنکار ایسا بہت کم کرتے ہیں لیکن جاپانیوں کے یہاں ایسا اکثر پایا جاتا ہے۔ عام طور پر ایک

کاریگر ایک چیز پر سالوں صرف کر دیتا ہے۔ وہ کام کے دوران میں کئی مرتبہ ارادہ بدل سکتا ہے مثلاً یہ کہ سوچنے کی کشتی بنائی جائے یا پردہ وغیرہ بنائے لیکن وہ عموماً اپنی پسندیدہ چیز ہی بناتا ہے اور چونکہ وہ ٹھیک ہی طرح کی کندہ کاری کرتا ہے اس لئے اپنے موضوع کا ماہر ہو جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں جو چیز بنا رہا ہوں وہ میرے بلکہ میری یاد کے مٹ جانے کے بعد بھی عرصہ دراز تک باقی رہے گی۔ اس لئے وہ بڑے استقلال اور محنت سے کام میں لگا رہتا ہے کیونکہ آخرکار وہ بھی تو ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے نسل بعد نسل اپنے کام کو بڑے شوق سے انجام دیا۔

اگر کسی شخص کے پاس ہاتھی دانت کے ایسے چینی نمونے ہوں جن پر دستخط موجود ہوں تو اسے خوش قسمت سمجھنا چاہئے کیونکہ ایسی چیزیں بہت ہی کمیاب ہیں۔ چینیوں کے یہاں ہاتھی دانت پر نام کندہ کرنے کا دستور کبھی نہیں تھا۔ ایسا صرف خاص حالات میں ہوتا تھا۔ بادشاہ ہسی اور چین لنگ کے عہد ہی میں شہنشاہ کے حکم سے کچھ چیزیں تیار کی گئی تھیں جن پر فنکار کا نام اور کبھی کبھی کندہ کاری کی تاریخ کندہ کی گئی تھی۔ حکام کو ہاتھی دانت کے نشان، عالموں کو برش دان وغیرہ تحفۃً پیش کئے جاتے تھے۔

ہاتھی دانت کے بہترین کام کا مرکز پیکنگ تھا کیونکہ شہنشاہ کانگ ہسی یہاں کی کارگاہوں کی سرپرستی کرتا ہے اور اس طرح انکے معیار بلند کرنے میں مدد پہنچاتا تھا۔ کانٹن کے کاریگر بھی پیچیدہ اور مثالی کندہ کاری کے لئے مشہور ہیں۔ فنی نقطہ نظر سے چند نمونے حیرت انگیز ہیں۔ مثلاً متحد الذکر چیزیں سادہ اور پیچیدہ ڈیزائن میں متحرک گولیاں ہوتی ہیں۔

انیسویں صدی میں فوچو، کانٹن اور اموئے کے مقامات پر خصوصاً برآمد کے لئے ہاتھی دانت کا کام ہوتا تھا یہ اسلوب کے لحاظ سے پیکنگ کے کام سے بالکل مختلف تھا۔ اول الذکر کا ڈیزائن نہایت پیچیدہ ہوتا تھا جبکہ دوسرا چینی تہذیب اور ثقافت کا صحیح نمائندہ تھا۔ ہاتھی دانت کی کندہ کاری کا طریقہ ہمیشہ جیسا ہی ہے۔ بالکل معمولی آلات میں۔ تیز دھار کی آری، چاقو، ہتھوڑی، اور چھوٹے چھوٹے برمے۔ کندہ کاری کے لئے ایک اور تیز نوک والے آلے کی بھی ضرورت پڑتی ہے جسے اسٹائلس کہتے ہیں۔ ٹیڑھے میڑھے ہاتھی دانت کے ٹکڑے پر کندہ کاری شروع کرنے سے پہلے کاریگر ایک سادہ ٹکڑے پر ڈیزائن بنا لیتا ہے۔ اسی کی مدد سے وہ کندہ کاری کرتا ہے یہاں تک کہ ہاتھی دانت پر صرف ڈیزائن باقی رہ جاتا ہے۔ ہوشیار فنکار کی مہارت کا نتیجے کی کندہ کاری سے چلتا ہے۔ کبھی کبھی مختلف ہلکے رنگوں کی لائنیں بنانے کے ساتھ سنہری رنگ بھی ہوتا ہے۔ قدیم کندہ کاری کے اب بھی ایسے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔ غالباً یہ پیکنگ میں بنے تھے کیونکہ اس ہاتھی دانت کی رنگ سازی کی صنعت اسی دارالخلافہ کی تین سو برس تک مخصوص رہی ہے لیکن ہاتھی دانت کی صنعت یہاں پانچویں صدی سے قائم ہے۔

ہاتھی دانت کی کچھ ایسی چیزیں جن میں زیادہ کندہ کاری ضروری تھی جیسے پردے صرف کم اسارے گئے ہیں اور ان کے آر پار دھندلی روشنی بھی نظر آتی ہے مثلاً اگر روشنی کی طرف کر کے دیکھا جائے تو گلابی سی روشنی نظر آئے گی۔ جب ہاتھی دانت میں تخلیق اور فطرت کی گرمی داخل ہو جاتی ہے تو وہ ایک حد تک باقی رہتی ہے۔ انسان ایسا نہیں کر سکتے۔

("اپالو" میگزین سے ماخوذ)

غزل

جب بلا نسبت ہے تو کیوں ہیں آج تک بیگانہ ہم
حسن کی تفسیر تم ہو عشق کا افسانہ ہم

ہچکیاں ہیں نزع کی اور اے غمِ جانانہ ہم
کہہ رہے ہیں اب نئے رخ سے نیا افسانہ ہم

اپنے ہی ہوش و جنوں سے یہ جہاں آباد ہے
رونقِ ہر خانہ ہم ہیں زینتِ ویرانہ ہم

کیف افزا ہچکیاں رگ رگ میں دوڑاتا ہے عشق
پیتے جاتے ہیں شرابِ درد کا پیمانہ ہم

ناز ہے پردے پہ تجھ کو یہ خبر شاید نہیں
رہ گئے ہیں بن کے دنیا میں ترا افسانہ ہم

ذرہ ذرہ طور ہے اپنے فروغِ نور سے
جس کے جلوے عام ہیں وہ ہیں تجلی خانہ ہم

ضبطِ مہمل بن کے رہ جائے گی ساری کائنات
کہہ گئے تفصیل سے جس دن ترا افسانہ ہم

ربطِ حسن و عشق ساحر کیوں نہ کرتا اپنا کام
جب بنے وہ شمعِ محفل بن گئے پروانہ ہم

ساحر بریلوی

سکون

نعیم صبا

ایک مدت سے تری زیست کی تابانی میں
اپنی سوئی ہوئی اُمید کو رخشاں کرکے
جا رہا تھا میں لرزتے ہوئے قدموں سے مگر
تیری آنکھوں نے مجھے زلف سیہ کے جالے
اپنی سلجھی ہوئی دزدیدہ نگاہوں سے کبھی
تجھ کو پیغام محبت کا دیا تھا میں نے
اپنے ایام محبت کی اندھیری راتیں
تیری تخئیل سے تابندہ کیا تھا میں نے
جب کبھی تیری محبت کا خیال آ ہی گیا
اپنی بجھتی ہوئی یادوں کو پکارا میں نے
تیری بھیگی ہوئی پلکوں کا تصور کرکے
اپنی راتوں کو کئی بار سنوارا میں نے
آہ لیکن غم ایام مری راہوں میں
چھیڑ دیتا ہے محبت میں وہ ڈوبا ہوا ساز
جس کے نغموں میں فسردہ ہے کہانی میری
اور آنکھوں میں بکھر جاتے ہیں وہ راز و نیاز
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی اُن لمحوں میں
جب تری یادمیں افسردہ رہا کرتا تھا
تیری مخمور نگاہوں سے میں اپنی نظریں
یک بیک ملنے پہ اکثر میں ڈرا کرتا تھا
اب تجھے دیکھ کے نفرت سے نگاہیں اپنی
پھیر لوں گا تجھے آخر یہ بتانے کے لئے
میرے دل میں نہیں باقی ہے محبت تیری
تجھ کو تڑپاؤں گا اک بار ستانے کے لئے
ایک مدت سے تری زیست کی تابانی میں
یوں ہی خاموش پڑا تھا کہیں مجبور و حزیں
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں فروزاں کب تھا؟
دل کی بجھتی ہوئی یادوں میں ترا عکس حسیں

جرعاتِ تازہ

ہم تلاش جلوۂ جاناں میں جو سرگئے ؛ کچھ پا گئے کچھ اپنی ہی ہستی سے کھو گئے
شاید نجات کشمکش غم سے مل گئی ؛ کیوں ورنہ غم نصیب سر شام سو گئے
آلام روزگار سے بگڑے کچھ اپنے طور ؛ تم بھی غرور حسن سے کچھ اور ہو گئے
سنجیدگی سے جب غم دنیا نہ سہہ سکو ؛ بیزار اپنے ہوش و خرد ہی کو ہو گئے
جو بیٹوا کچھ اور نہ دنیا میں کر سکے ؛ الفت کے بیج مزرع ہستی میں بو گئے
جو لا سکے نہ تاب غم ہجر دوست کی ؛ وہ عاشقی کا نام جہاں میں ڈبو گئے
یہ بھی ستم ظریفیٔ قدرت نہ ہو کہیں ؛ جاگیں جو سر نہیں تو مرے بخت سو گئے
دم بھر حریم ناز کے سائے میں بیٹھ کر ؛ اک ایک تار اشک میں موتی پرو گئے
سرکار حسن سے انھیں کیا کچھ صلا ملا ؛ جو جان لیکے کوچۂ محبوب کو گئے
تنہائی کبھی رہے نہ غموں سے دل و جگر ؛ عالم یہی رہا ہے کہ جا کے نہ رو گئے
کیا جانئے کہ آگئی کیا ان کے جی میں آج
کعبے سے اُٹھ کے شاد صنم خانے کو گئے

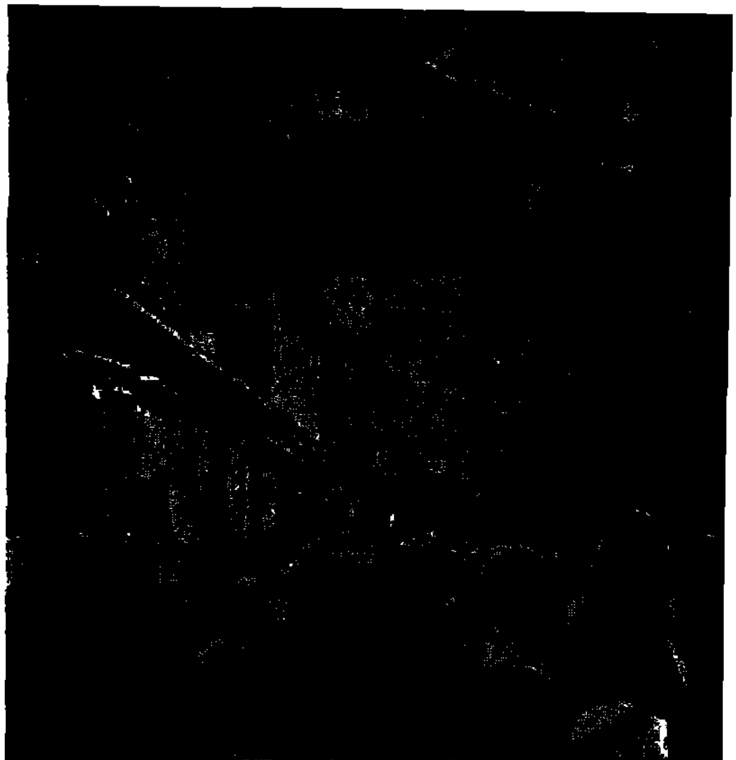
شاد قدوائی

حقائق

محیط بیکراں ذوق نظر ہے ؛ خرد لیکن ہلاکت کا بھنور ہے
حریف اس کی نہیں تہذیب حاضر ؛ انا الحق نکتۂ باریک تر ہے
جہاں بان و جہانگیر و جہاندار ؛ قلندر کا فسانہ مختصر ہے
فقیری پستیوں کی سرفرازی ؛ فقیری انقلاب بحر و بر ہے
صنم خانے بنے سنگ حرم سے ؛ فرنگی کا یہ افسون ہنر ہے
فضائے لامکاں میں پر فشاں ہوں ؛ ثریا سے ثریا زیر پا ہے
خودی جاگ اٹھی ہے خواب گراں سے ؛ قفس بہت فزائے بال و پر ہے
محبت مستی ارباب حیرت ! ؛ محبت دل سے سینے دل سفر ہے
وہ ہنگامے ابھی کچھ کچھ ہیں باقی ؛ اگرچہ اب نہیں لیکن مگر ہے
غنیمت ہے میرا اشک تمنا ؛ گھر یہ آپ ہی آب گہر ہے
بہت مشکل ہے ضبط حال انور
مری رگ میں نوائی پردہ در ہے

انور کرمانی

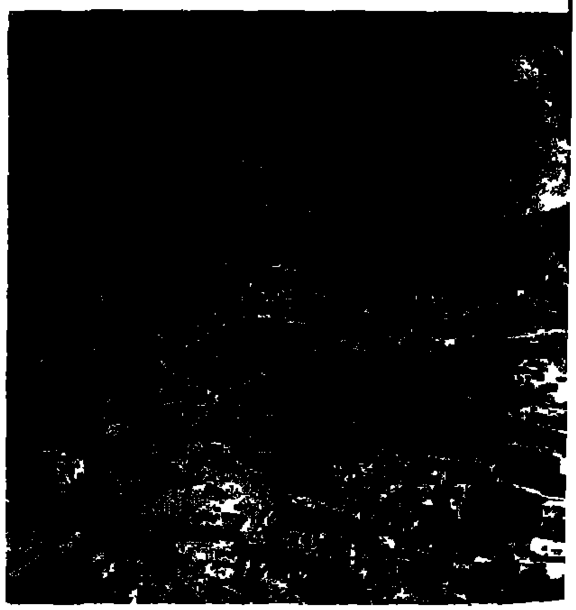
امیر عبداللہ کی واپسہ



امیر عبداللہ کی واپسی پر ہر شہر اور گاؤں میں خوشیاں منائی گئیں اور امیر کو خوش آمدید کہا گیا۔



شرق الاردن کے قائم مقام وزیر اعظم (صاقہ اور فارموش ہیں) وزیر مالیات کا استقبال کر رہے ہیں۔



شرق الاردن کا پایۂ تخت عمان ہر طرف سے چٹانوں سے گھرا ہوا ہے۔ پچھلی جنگ کے بعد سے اس نے بڑی ترقی کرلی ہے۔



برعداللہ کو شاہی ہوائی بیڑہ کا ایک دستہ سلامی دے رہا ہے

چین میں ہاتھی دانت کی دستکاریاں



پھولوں کی ڈبوی۔ ہوا ہیں (لمبائی ۱۲ انچ)

شاؤ لاؤ عمر کا دیوتا (لمبائی ۱۱ انچ)

لافانی لاؤتزے (لمبائی ۱۲ انچ)



ردان۔ ڈھکنہ پر کنتا ہے' بینل پر
ہوا ہیں، مع ایک خادمہ کے
ے اور داھنی جانب "ھان
ھسیانگ تزو" ہے۔



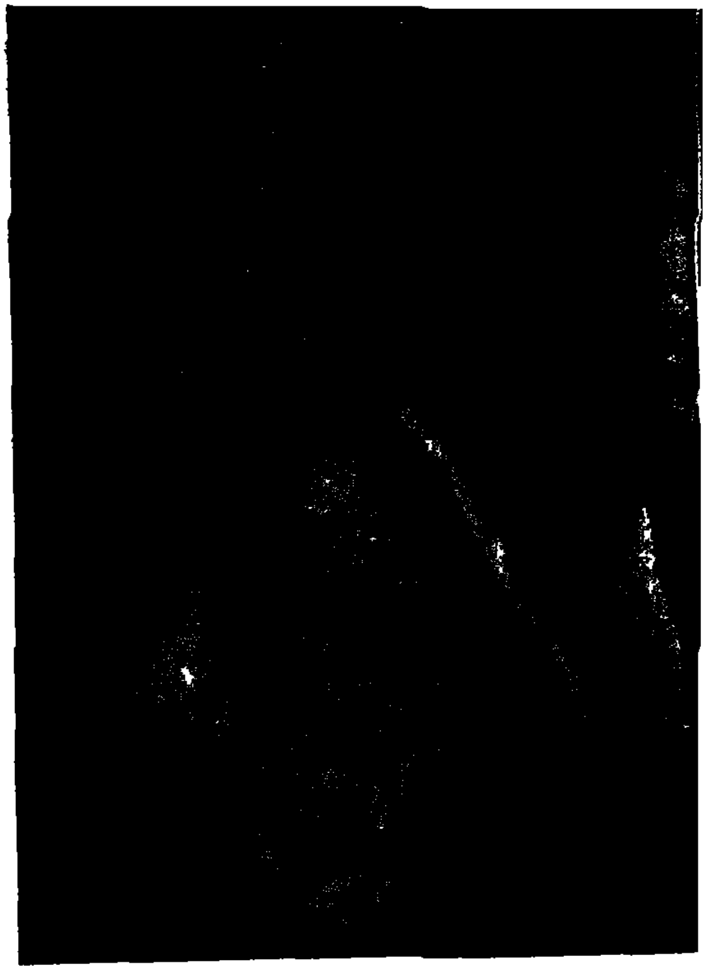
اس واز کی لمبائی ۱۹ انچ ہے۔ اس کے بالائی حصہ پر شہنشاہ کا محل اور صحن ہے اور نیچے کی جانب ایک بالاخانہ ہے جسمیں تین عورتیں موجود ہیں



(بائیں طرف) مغربی بہشت کی ملکہ "ھسی وانگ مو" عنقا پر سوار ہے۔
(بیچ میں) ایک بخوردان جو خاندان سنگ کے زمانہ میں بنا۔
(داھنی طرف) ملکۂ فردوس کی خادمہ "ڈنگ سوانگ" ہرن پر سوار ہے اور ہاتھ میں کنول کا پھول لئے ہوئے ہے۔

ریچھ بلاؤ





یہ ریچھ بلاؤ اپنے پانی کے برتن سے کھیل رہا ہے

ریچھ بلاؤ کی خاص غذا بانس کی کونپل ہے

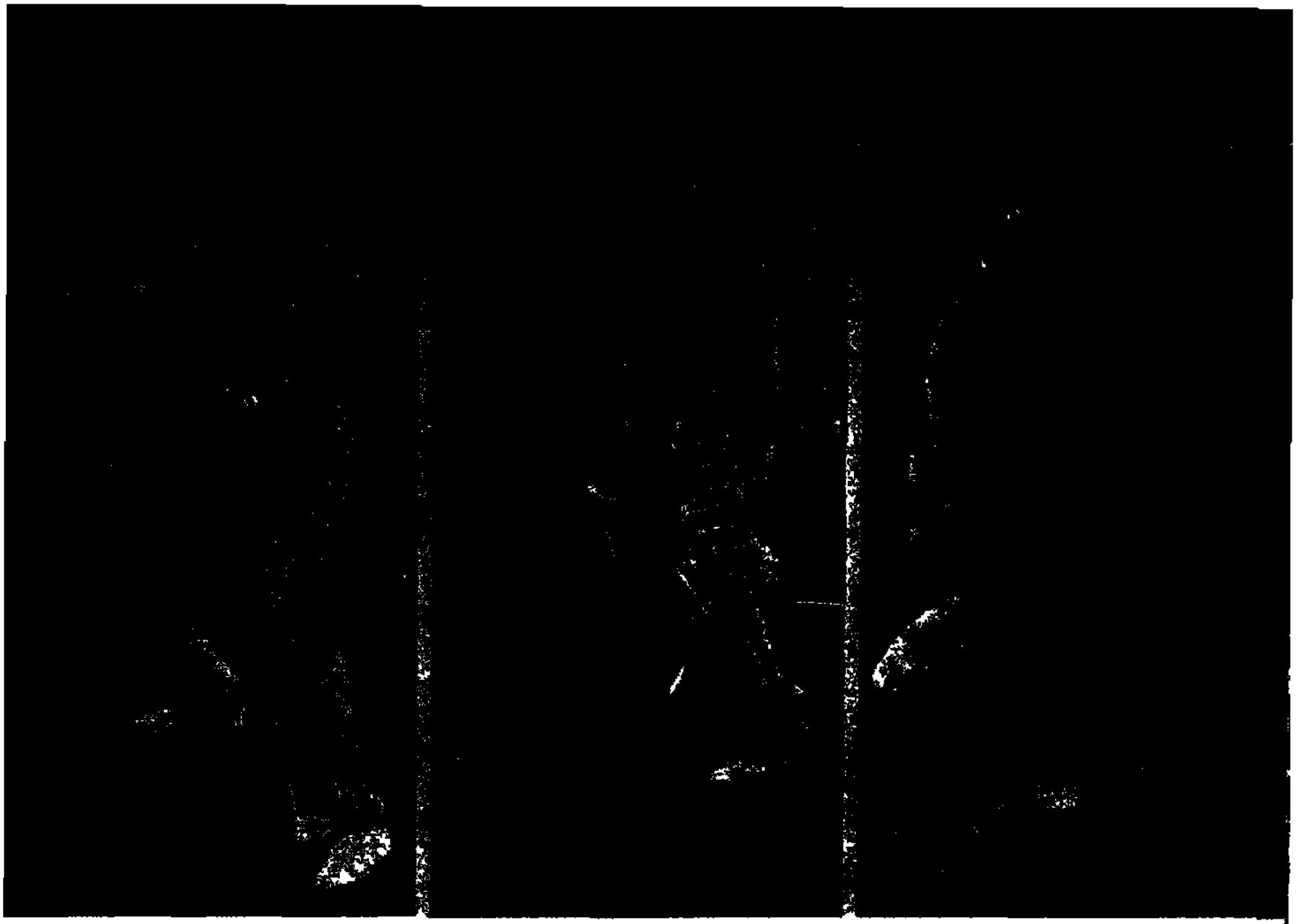


یہ ریچھ بلاؤ حال ہی میں چین سے آیا ہے اور آجکل لندن کے 'چڑیا گھر' میں ہے۔ دیکھنے والوں میں بچے خاص طور پر اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کو ایک ننھا سا ایلچی سمجھنا چاہئے جسے چین نے دوستی کا پیغام دے کر انگلستان بھیجا ہے۔

اس کٹہرے میں ابھی نیا ہی آیا ہے لیکن گھبراتا نہیں۔ ←



بجائے وہ اپنے کھانے کی کونپلوں سے کھیلنے لگا۔



شتاق علی ہندوستانی تماشائیوں میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کی کلائی اور پاؤں کی پھرتی اس کے کھیل کو بہت ہی دلکش بنا دیتی ہے۔

پٹودی کے نواب اور ٹیم کے کیپٹن نواب افتخار علی انگلستان میں پہلے ہی سے مشہور ہیں۔ ہاکی، کرکٹ اور بلیرڈس میں کیمبرج یونیورسٹی میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی نمائندگی کر چکے ہیں۔

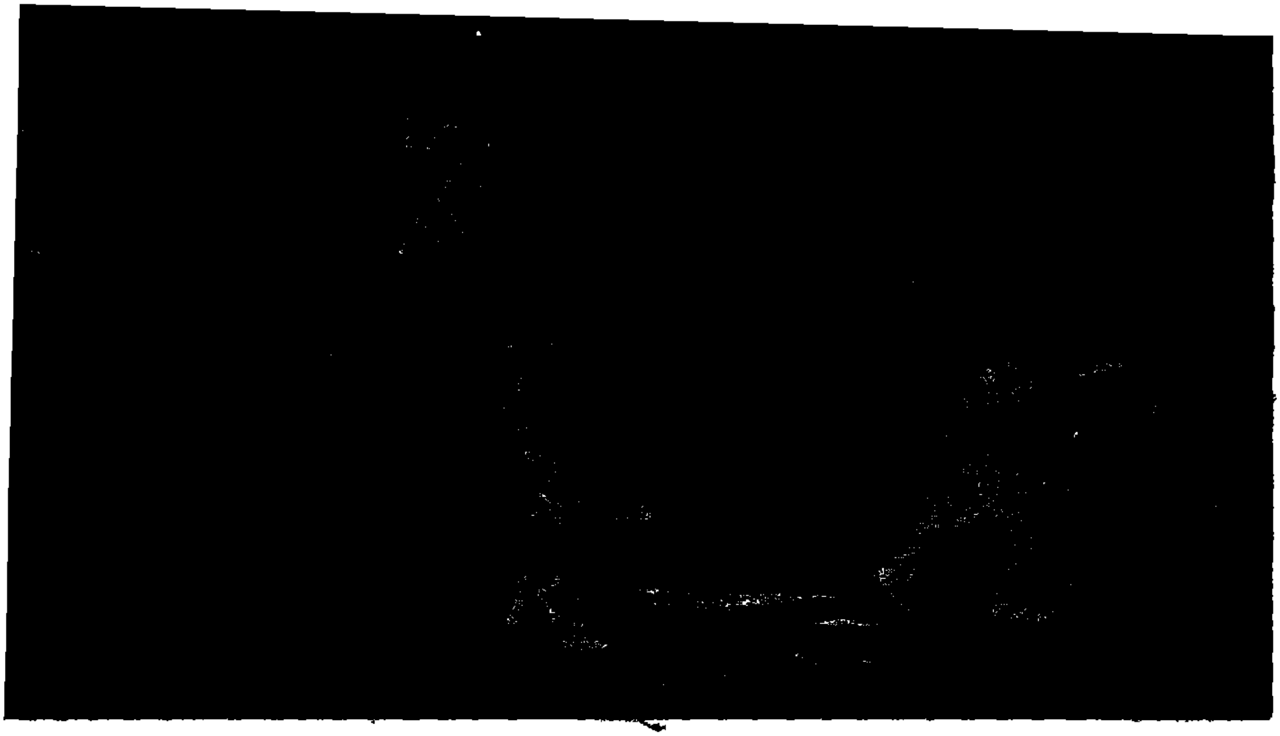
مودی عمر کے لحاظ سے بالکل بچہ ہی ہے۔ شروع شروع میں ہچکچاتا ہے لیکن آہستہ آہستہ رن خوب بنا لیتا ہے۔

کرکٹ کی ہندوستانی ٹیم کے پہونچ جانے سے انگلستان کا یہ موسم گرما بڑا بارونق بن گیا ہے ورنہ بارش کی وجہ سے بے کیف ہی گزرتا۔

ہندوستان میں کرکٹ کا رواج پچھلے پچاس سال سے ہے لیکن اس تھوڑے سے عرصہ میں اتنی ترقی کرلی ہے کہ شاید جلد ہی آسٹریلیا کی طرح ہندوستان بھی انگلستان پر خود اسی کے سکھائے ہوئے کھیل میں اپنی برتری کا سکہ بٹھا دے

نواب پٹودی نے اس میچ میں کھیل کر رنجیت سنگھ اور دلیپ سنگھ کی یاد اور رکارڈ کو زندہ کر دیا ہے۔ نواب پٹودی نے ایک سیزن میں تین ڈبل سینچریوں کا رکارڈ قائم کر دیا۔ امرناتھ بھی ناقابل فراموش کھلاڑی ہے۔ پچھلی دفعہ ہندوستانی ٹیم سنہ ۱۹۳۶ء میں انگلستان گئی تھی۔ اب دس سال بعد پھر پرانی دوستی تازہ ہورہی ہے۔

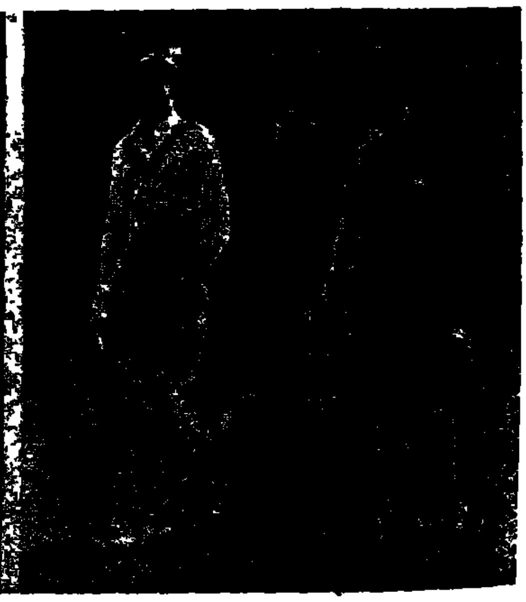
(تصویریں "پکچر پوسٹ" سے لی گئیں)



میچ کا ایک عجیب لمحہ۔ رن بنانے کے لئے مودی دوڑ پڑا ہے۔ نواب پٹودی کچھ مذبذب ہیں لیکن وکٹ کیپر نواب کا وکٹ توڑ چکا ہے۔

ہندوستان کی کرکٹ کی ٹیم انگلستان میں





مشتاق علی (بائیں) اور مرچنٹ (دائیں) میچ شروع کرنے جارہے ہیں۔

ٹیم انگلستان کے موسم کا مقابلہ کر رہی ہے۔ ہندوستانیوں کے لئے انگلستان کا موسم گرما بھی گرم نہیں ہوتا۔ ہوا ٹھنڈی ہے اور وکٹ گیلے ہیں لیکن کھیل کی دھن اور شوق میں سب ہی کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

طہران میں زراعتی نمائش

حال ہی میں ایران کے پایۂ تخت طہران میں ایک شاندار نمائش ہوئی۔ اس کا افتتاح شاہ ایران نے خود کیا۔ نمائش بہت بڑے میدان میں ہوئی تھی اور ہر چیز کے لئے دوکانیں بڑے سلیقہ کے ساتھ سجائی گئی تھیں اس نمائش گاہ میں گائے' بیل' بکرے' مرغے' مرغیاں' طرح طرح کا اون اور کھالیں دکھائی گئیں اور مختلف قسم کی مشینوں کے علاوہ چاہ' کپاس' سولے' جانوروں اور پودوں کی بیماریوں کی دواؤں کی بھی نمائش کی گئی۔



ایران کی خوش رنگ' خوشبودار و خوش ذائقہ چاہ کے نمونے نمائش کی ایک دوکان پر



اعلیحضرت شاہ ایران نمائش کی افتتاح
[illegible]



نمائش کے سوتی شعبہ کا داخلہ



یہ نوعمر انجینئر ہوائی جہازوں کے موڈل بنا رہے ہیں۔ اس کام کیلئے بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔

موڈل بنانے والے



برطانوی شاہی گاڑی کا موڈل بنایا جارہا ہے۔

ہندوستان اب صنعت و حرفت میں بڑی ترقی کر رہا ہے۔ اس لئے یہاں زیادہ سے زیادہ انجینئروں اور فنکاروں کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے بہت سے نوجوان انجینئری میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ کالجوں میں جو اعلی فنی تربیت دی جاتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ طلبا پہلے ہی سے ابتدائی تعلیم حاصل کرکے وہاں داخل ہوں۔ چنانچہ متعدد ادارے اس ابتدائی تربیت کیلئے ہندوستان میں قائم ہوگئے ہیں۔ انہی اداروں میں سے ایک بمبئی کی «سوسوئٹی آف موڈل انجینئرز» ہے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں مسٹر پولسن نے اسکو قائم کیا تھا۔ اسوقت سے ابتک یہ برابر ترقی میں آگے بڑھتا جارہا ہے اس ادارے میں بنی ہوئی چیزیں فوراً ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ ان کی بکری کے داموں ہی سے اس ادارے کے کل اخراجات پورے ہوجاتے ہیں۔



ماهوش بیگم پاره

افسانہ نگار عورتیں

مظہر ممتاز

مختصر افسانہ، مرد اور عورت دونوں کی کوششوں سے ترقی کی سنہری منزلیں طے کرتا جا رہا ہے۔ چنانچہ میں نے اس مضمون میں صرف موجودہ افسانہ نگار عورتوں کے زندہ گروہ کو منتخب کیا ہے۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ میں ان کو مردوں کی مخالف صف میں کھڑا کر رہا ہوں بلکہ میں ان کو مردوں کے دوش بدوش ہی سمجھتا ہوں۔ اور زندگی سے میرا مقصد یہ ہے کہ یہ تمام بقید حیات ہیں اور مختصر افسانے کو زندہ رکھنے، اس کو ترقی دینے میں مکمنہ کوشش کر رہی ہیں۔ اس گروہ میں آپ کو چند ایک عورتیں ایسی نظر آئیں گی جو ابتدا سے افسانوی میدان میں حصہ لے رہی ہیں۔ اور چند ایک ایسی بھی دکھائی دیں گی جو ابھی ابھی حصہ لینے لگی ہیں۔ میں نے اس چناؤ میں دونوں طرح کا خیال رکھا ہے۔ مقبول اور غیر مقبول عورتوں کا چناؤ۔ ایک وہ جنکا فن پختہ ہو چکا ہے۔ ایک وہ جنکا فن ابھی کچا ہے تازہ کلیوں کی طرح!

چونکہ مختصر افسانے کی عمر بہت کم ہے اس لئے ان عورتوں کی افسانہ نگاری کی عمر اس سے بھی کم ہے صرف ایک دو ایسی عورتیں ہیں جو اس کی اولین تحریک سے حصہ لے رہی ہیں۔

ڈاکٹر رشید جہاں، عورتوں میں سب سے پہلی خاتون ہیں جنہوں نے ترقی پسند مصنفین کی جماعت میں شرکت کی۔ اور اس جماعت کی شعلہ ریز کتاب "انگارے" میں حصہ لیا۔ جس کو بعد میں حکومت نے شر انگیز، باغیانہ کتاب سمجھ کر ضبط کر لیا۔ رشید جہاں کے افسانے اس کتاب میں قدامت اور روایت کے خلاف حد درجہ بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اور یہ اثر اب تک ان کے افسانوں میں رچا بسا ہوا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "عورت و دیگر افسانے" میں بھی "انگارے" ایسا جوشیلا پن، بیزاری اور بغاوت نظر آتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے وہ پرانی سماج، پرانے نظام، پرانی روایتوں کی بنیادوں کو ڈھا دینا چاہتی ہیں۔ اور نئی سماج، نئے نظام اور نئے رسوم کی بنیادیں رکھنے کی آرزومند ہیں۔ جھوٹی مذہب پرستی پر بھی وہ بے باکانہ طنز کرتی ہیں۔ اور ساتھ ساتھ موجودہ سوسائٹی کی گندگیوں، کمزوریوں کو بھی بیان کرتی جاتی ہیں۔ جہاں جہاں قدامت پرست طبقہ جھنجھلاتا ہے وہاں پر وہ ایک جوشیلا نعرہ بلند کرتی ہیں۔ اور اپنے صحت مندانہ نظریوں کو بیان کرنے سے نہیں چوکتیں۔ ان کو انسانی فطرت کی کمزوریوں کی تصویریں کھینچنے میں بھی بڑی قدرت حاصل ہے۔ ان کے افسانے ایک ایسی عورت کے گرد گھومتے ہیں جو قدامت میں پلی بڑھی لیکن اس قدامت کی گھٹن سے دور بھاگنا چاہتی ہے۔ نئی زندگی کی تلاش، پاک صاف فضائیں، جہاں سکون کی چاندنی اپنی سنہری کرنیں پھیلا رہی ہو —!

آپ محترمہ ... شیخ عبداللہ کی صاحبزادی ہیں اور صاحبزادہ محمود الظفر کی بیوی۔ آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ آپکے خاندان کو ہندوستان بھر میں یہ فخر ہے کہ خاندان کا ہر فرد ڈگری یافتہ ہے۔ (آجکل آپ اپنے شوہر کے ساتھ لکھنؤ ہی میں رہتی ہیں)

اس کے بعد عصمت چغتائی ایسی خاتون ہیں جو اپنے آپ کو نہ تو ترقی پسند کہتی ہیں، نہ رجعت پسند۔ شاید وہ کسی لیبل کو لگانا پسند نہ کرتی ہوں کہ اس سے آجکل تعصبی جذبات زیادہ پھیلتے جا رہے ہیں۔ عصمت کی افسانہ نگاری کی ابتدا ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتی ہے۔ انھوں نے ڈرتے ڈرتے جب پہلا مضمون "فسادی" رسالہ "ساقی" کو بھجوایا تھا جس پر مدیر نے لکھا تھا "آپ کا مضمون اچھا بلکہ بہت اچھا ہے۔ میں نے ایک نشست میں ختم کر لیا۔ اسے ساقی کے لئے رکھ لیا گیا ہے"۔ اسی ہمت افزائی کی وجہ سے وہ آجکل صف اول کی افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔ سچ تو یہ ہے ان میں ابتدا سے ہی افسانہ نگاری کی فنی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اور پھر عظیم بیگ کے ماحول نے ان کو اپنی صلاحیتوں کو ابھارنے کا صحیح موقع دیا۔ بقول عبادت بریلوی "وہ عظیم بیگ سے زیادہ بے باک، زیادہ انتہا پسند ہیں۔ عظیم بیگ کا فن اردو میں کھوکھلی رومانیت اور جذباتیت کا ردعمل تھا جسکو عصمت نے منتہائے کمال پر پہنچا دیا"۔ پچھلے سالوں میں جب عصمت نے "لحاف" ایک جنسیاتی نفسیاتی، اور انقلابی افسانہ لکھا تھا تو ملک کے رجعت پسند ذہنوں میں بھونچال سا آ گیا تھا کیونکہ عصمت نے بعض سماجی ممنوعات کا ذکر کیا ہے۔ بقول پطرس "اس افسانے کا مرکز ثقل یا تاکیدی نقطہ کوئی دل کا معاملہ نہیں بلکہ ایک جسمانی حرکت ہے"۔ لیکن میں سمجھتا ہوں عصمت کا یہ افسانہ فنی اعتبار سے اردو ادب کا شاہکار افسانہ ہے۔ اگر وہ افسانے میں ذہنی لذت سے نفرت کا تاثر پیدا کرتیں تو ان کی یہ کوشش بہت کامیاب رہتی —!

اب تک عصمت کے افسانوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "کلیاں" "چوٹیں" اور "ایک بات" — ایک ناول "ضدی" (ان کا ایک اور ناول "ٹیڑھی لکیر" اور ڈراموں کا مجموعہ "شیطان" زیر طبع ہیں) ان کا پہلا مجموعہ "کلیاں" جیسے نام سے ظاہر ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی واقعی کلیاں ہیں۔ ننھی منی کلیاں، جن میں رنگت ہے، خوشبو ہے، جاذبیت ہے۔ اور جو پھول بننے کی آرزومند ہیں۔ "کلیاں" کے افسانے ایک ایسی لڑکی کے گرد گھومتے ہیں جو ابھی ابھی جوان ہوتی ہے اور جو ابھی ابھی اسکول سے کالج میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ "کلیاں" میں گھریلو ملازموں کی مجبوریوں اور ان کی امنگوں کے بھی بہترین نقوش نظر آتے ہیں۔ لیکن عصمت کی فکری تلخیاں "چوٹیں" میں زیادہ ہیں۔ "چوٹیں" میں عصمت پہلے سے زیادہ

کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے وہ ایک چابکدست ناظر کی طرح اپنے اردگرد کی چیزوں کا مشاہدہ کر رہی ہیں۔ اور اس ماحول میں سانس لینے والی زندگیوں کے تجزیے کرتی جا رہی ہیں اور ان کے افسانوں کو جو چیز جاندار بناتی ہے وہ ان کی بے باک طرز نگارش ہے۔ بقول پطرس عصمت کے فقروں میں بول چال کی سی لطافت، روانی ہے جیسے کوئی "بیدم روز مرہ کا ساپھر تیلا زیر و بم ہے"۔ ان کا اسلوب موضوع سے پورا پورا مناسبت رکھتا ہے عصمت اپنے افسانوں میں ذاتی رائے کا کم اظہار کرتی ہیں اور جو موضوع پسند آئے زندگی کے جس پہلو سے وہ زیادہ واقف ہیں اسی کو اپنے افسانے کا موضوع بناتی ہیں۔ شاید وہ انہی چیزوں کو بیان کرنے پر مجبور بھی ہیں۔ بقول منٹو "جب تک عورتوں مردوں کے جذبات کے درمیان موٹی دیوار حائل رہے گی عصمت اس کے چھلکے کو اپنے تیز ناخنوں سے کریدتی رہے گی"۔ سعادت حسن منٹو کا یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے "چوٹیں" میں یہی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ایسی چوٹیں بھی ہیں جو سماج نے عورت پر لگائی ہیں اور ایسی بھی چوٹیں ہیں جو عورت نے سماج پر لگائی ہیں۔ عمل اور ردعمل یہ سائنسی نظریۂ عصمت کے افسانوں میں نمایاں نظر آتا ہے ہمیں یہ جان کر خوشی ہوتی ہے عصمت کو اپنی جنس سے حد درجہ ہمدردی اور خلوص ہے۔ وہ چاہتی ہیں نوجوان لڑکیاں قوت، اعتماد اور یقین حاصل کریں اور اس انتشاری زمانے میں اپنی ہستی کا صحیح مقصد سمجھیں ورنہ جانوروں کی طرح گھروں میں بند ہوکر سوکھتی رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ اس سے قوم کو زیادہ حصہ گل سڑ کر خراب ہو جائے گا اور ان کی نسلیں تباہی کے انگاروں پر دم توڑتی رہیں گی۔ مولانا صلاح الدین احمد نے بہت صحیح کہا تھا: "عصمت اپنے افسانوں میں معیاری ہستیاں پیش نہیں کرتیں۔ وہ گوشت و خون کے پتلے ہمارے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں جن میں محاسن و معائب کا ایسا ہی قدرتی امتزاج ہے اور کمزوریوں خوبیوں کی ویسی ہی سی نئی ترکیب پائی جاتی ہے"۔ عصمت کے افسانوں کی ہیروئین مجھ کو امریکی فلم "وائٹ کارگو" کی ہیروئین ہیڈی لیمار جیسی نظر آتی ہے جو سفید نسل کے مردوں سے اپنی عزت آبرو بیچ کر انتقام لیتی تھی اور مردوں کو زہر دیکر مار ڈالتی تھی۔ میں عصمت کو موجودہ افسانہ نگاروں میں بہترین فنکار سمجھتا ہوں۔ بقول پطرس "عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے اور عصمت کے کارناموں کے لئے اردو خوانوں کو ہی نہیں بلکہ اردو ادیبوں کو بھی ان کا ممنون ہونا چاہیے"۔

عصمت عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی چھوٹی بہن ہیں۔ علی گڑھ سے انھوں نے بی۔ اے، بی ٹی پاس کیا ہے اور علی گڑھ ہی میں ان کو علم نفسیات کے مطالعے کا زیادہ موقع ملا۔ اور یہیں سے ان کے نفسیاتی، جنسیاتی نفاذ اور جنسیات نگاری کا زور بڑھ جاتا ہے کچھ دنوں عصمت بے پور، بمبئی کے

اسکولوں میں استانی بھی رہیں لیکن آجکل وہ پونا میں اپنے شوہر شاہد لطیف کے ساتھ مقیم ہیں۔

اب ایک خالص رومانی افسانہ نگار حجاب امتیاز علی ہیں جو رومان، خالص رومان کو ہی اپنے افسانوں میں لکھے جاتی ہیں۔ میرے خیال میں خالص رومان، خاص حقیقتوں کو پیش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ رومانیت کی پروازیں عقلی نہیں ہوا کرتیں۔ اس میں ذاتی وجدان کا عنصر حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اور پھر موجودہ ترقی پسند دور میں خالص رومانیت کچھ بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ وہ ایک نئے ماحول نئی سوسائٹی میں رہتے بستے ہوئے بھی ایک تخیلی دنیا کی تصویریں کھینچتی ہیں جس میں نہ کوئی حقیقت ہے نہ کوئی زندگی — ان کے رومانی افسانوں کے موضوع، کردار، ماحول، سب ایک مخصوص رنگ میں پلتے ہوتے ہیں۔ میرا تو یہ خیال ہے ان کے افسانوں کا دور اب ختم ہو چکا۔ اب ان کے افسانے بیتابی سے پڑھے نہیں جاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے انہوں نے اپنے مخصوص ماحول خوبصورت، اشائل سے انحراف نہیں کیا ہے۔ اب کسی جوان لڑکی کی یہ خواہش نہیں ہوتی وہ روحی بنے، روحی بننے کی تمنا محض بہلاوا اور میٹھا خواب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اب زمانہ، ماحول اور زندگی — سب کچھ بدل چکے ہیں۔ ان کے افسانے "بیتاب کا اور خوفناک" ہیں کچھ کچھ مغربی اثرات کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ ان کے ایسے افسانے بہت کامیاب ہوا کرتے ہیں اور ان کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن پر بھی خوفناک اثرات چھا دیتی ہیں اور اس کو سی وحشتناک ڈراؤنے ماحول میں گم سم کر دیتی ہیں۔

حجاب — سید محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم کی صاحبزادی ہیں جو نظام سرکار کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اور حجاب حیدرآباد میں ہی پیدا ہوئیں آپکی والدہ عباسی بیگم مرحومہ بھی ایک مشہور ادیبہ تھیں ۱۹۳۲ء کے بعد سے ازدواجی زندگی میں بھی آپ کو امتیاز علی تاج کا ادبی ماحول نصیب ہوا جہاں آپ کی ادبی صلاحیتوں کو ابھرنے کا زرین موقع ہاتھ آیا۔ آپ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مشہور ہوا باز بھی ہیں ۱۹۳۶ء میں آپ نے ہوا بازی کا (A) لائسنس حاصل کیا ہے۔ لیکن مصروفیت کی وجہ سے چند سال بعد صحت خراب ہوگئی اور ڈاکٹروں نے نفسیاتی علاج کا مشورہ دیا چنانچہ آپ نے سگمنڈ فرائیڈ مشہور نفسیاتی ماہر کے شاگرد جو لاہور میں رہتے ہیں — ان سے نفسیاتی علاج کرایا جس سے آپ کی صحت اب بہت اچھی ہے۔ اب تک آپکی نو کتابیں شائع ہو چکی ہیں: "لمعۂ حیات"، "ادیب لیلیٰ"، "میری ناتمام محبت"، "لاش"، "صنوبر کے سائے"، "خلوت کی انجمن"، "ظالم محبت"، "تحفے"، "ممی خانہ"، "کاؤنٹ الیاس کی موت"۔

ایک اور خالص رومان پسند لکھنے والی خیرازی ہیں۔ یہ آجکل زیادہ

لکھا نہیں کرتیں بہت پہلے لکھا کرتی تھیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان کے افسانوں کا قدر بھی ختم ہو چکا۔ ان کی تحریریں نیازی رنگ میں رنگی ہوتی تھیں۔ اور افسانوں کی ہیروئین کا کردار بھی "نیازی" "عورت" کا سا تھا۔ ان کی کتاب "سحر و شمال" میں یہی چیز نمایاں ہے۔ وہ جذبات کی رنگین بیانی سے شاعرانہ ماحول پیدا کر کے ہیرو ہیروئین کو محو کر دیتی تھیں لیکن اس میں کوئی حقیقت نہ ہوتی تھی محض شاعرانہ مبالغہ — انکا موجودہ ترقی پسند ادب میں کوئی نمایاں درجہ نہیں۔ ان کو چاہئے کہ "ادب برائے ادب" کے نظرئے کے بجائے "ادب برائے زندگی" پر کاربند ہوں۔

طاہرہ نسلاً ہندو اور ازدواجاً مسلمان ہیں۔ آپ کو فرانسیسی فارسی یا اردو سے بھی اچھی طرح واقفیت ہے۔ آپ کو شانتی نکیتن میں تعلیم حاصل کرنے کا بھی موقع ملا۔ طاہرہ کو سیر و تفریح سے زیادہ دلچسپی ہے۔ ایران، چین کی سیاحت بھی کر آئی ہیں۔

دہلی گروپ کی لکھنے والیوں میں زیادہ ترقی پسند صدیقہ بیگم سیوہاروی ہیں۔ رشید جہاں کی طرح ان کے خیالات بھی اشتراکی ہیں اپنے افسانوں میں غریب، مزدور کے ساتھ سرمایہ داری کی کشمکش کو دکھلاتی ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ غریب مزدور بھی انسان ہے گوشت و خون کا انسان ہے۔ اسکو بھی سکون، آرام، خوشی کی ضرورت ہے وہ کولہو کا بیل نہیں جس سے سرمایہ دار من مانے کام لیتے ہیں اس کو اس کے کام کا معمولی معاوضہ بھی نہیں دیتے۔ بقول احتشام حسین "احساس غریبوں کی زندگی جو مفلسی، ناداری اور بھوک کی وجہ سے اپنی ایک الگ نفسیاتی کیفیت رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں بہت آتی ہے۔ اور اس بڑی حقیقت کی قائل معلوم ہوتی ہیں کہ مادی حقیقت ہی اصلی حقیقت ہے۔ اس میں جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہ خیالوں کی رو بھی بدل سکتے ہیں۔"

اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں متوسط طبقے کے گھریلو واقعات کی جھلکیوں کا بھی عکس نظر آتا ہے اور کہیں کہیں تلخ حقیقت نگاری سے زندگی کی خوفناک سچائیوں کو عریاں کرتی ہیں جو ان کے ترقی پسند ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔ ان کا انداز بیان سیدھا سادھا اور شگفتہ ہے۔

صالحہ عابد حسین کی افسانہ نگاری کی مقبولیت زیادہ نہیں پھر بھی دہلی گروپ کی عورتوں میں ان کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پاس اکثر ایسی عورتیں ہیں جن کے ورثے میں ادبی میراث ملی ہے۔ آپ کا تعلق مولانا حالی سے ہے۔ آپ کے والد خواجہ غلام الثقلین مرحوم بھی بلند پایہ ادیب تھے۔ آپ کے بڑے بھائی ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین ہندوستان کے مشہور ادیبوں میں سے ہیں۔ اور پھر آپ کے شوہر ڈاکٹر عابد حسین جرمنی فلسفے کے ایک نامور ترجمان ہیں۔ اسی ادبی پس منظر اور ماحول کے اثرات کی وجہ سے ان میں ادبی رنگ زیادہ رچا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کا اصلی میدان ٹھوس تنقیدی ادب کے بجائے افسانوی ہلکا پھلکا ادب ہے لیکن آپ کو ترقی پسند اس لئے سمجھتا ہوں کہ آپ زیادہ تر حقیقی واقعات کی عکاسی کرتی ہیں جس میں انسان کے غم اور اس کی خوشیاں ظاہر کرتی ہیں۔ خود آپ کا خیال ہے "گزرے ہوئے واقعات جو دل پر گہرا اثر ڈال سکیں، وہ افسانے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ انسان کی زندگی اور موت کو ہمدردی سے دیکھوں اور سچائی سے دکھلاؤں۔ اور اپنے قصے کے کردار سے اس طرح گھل مل جاؤں کہ ان کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ سکھ سمجھ سکوں۔"

ایک اور ابھرتی ہوئی افسانہ نگار سحاب قزلباش ہیں۔ ان کا تعلق بھی ادبی سرپرستوں سے ہے۔ آپ کے والد آغا شاعر قزلباش مرحوم دہلی کے مشہور شاعر تھے۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ "بدلیاں" پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے آپ میں لکھنے کی فنی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کتاب کے افسانے ایک ایسی نوجوان لڑکی کے گرد گھومتے ہیں جو رومان کو ہی زندگی کا سنہری مقصد سمجھتی ہے۔ لیکن سحاب کے افسانے حجاب کی طرح خالص رومان کے عکاس نہیں۔ ان میں سچی بے لوث اور پاک محبت کا بیان ہے۔ محض خیالی

غزل

رعنا اکبر آبادی

یہ دردِ محبت ہوسِ خام نہیں ہے ✦ آغاز یہاں تشنۂ انجام نہیں ہے
جز مرگِ وفا عشق کا انجام نہیں ہے ✦ تو سوگ میں کیوں ہے یہ ترا کام نہیں ہے
دیکھے تو کوئی کوششِ اخفائے محبت ✦ مرتا ہوں مگر لب پہ ترا نام نہیں ہے
اس بزمِ تماشا میں ہے محیطِ نظر و دل ✦ جلوہ ترا عریاں ہے مگر عام نہیں ہے
تقصیر مری ہستی کے ہیں بےخودی کے پیچھے ✦ رنگین فضاؤں پہ کچھ الزام نہیں ہے
پیغام محبت کا جواب آ ہی چکا ہے ✦ کیا بےخبری حسن کا پیغام نہیں ہے
اب خود ہوں محبت میں تمنائے مجسم ✦ اب دل کی تمنا سے کوئی کام نہیں ہے

آتے ہیں وہ خود پرسشِ احوال کو رعنا
کس منہ سے یہ کہہ دوں مجھے آرام نہیں ہے

ناشستہ پن نہیں۔ اور حجاب کو مستقبل قریب میں حجاب سے جو چیز نمایاں درجہ دلائیگی وہ افسانوں میں تاثر اور شگفتگی ہے۔ حقیقت افروز واقعات کی صحیح عکاسی اور گہری معنویت ہے!

پنجاب گروپ میں حجاب کے بعد نا ہید عالم ادب کے نیلگوں آسمان پہ چمکتی نظر آتی ہیں۔ بہت قلیل عرصے میں انہوں نے شہرت حاصل کرلی ہے۔ ان کے افسانے جو اب تک ساقی "تخیلستان" "عالمگیر" میں شائع ہوتے ہیں، ان کو پڑھ کر میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ناہید میں ابھی فن کی صلاحیتیں زیادہ ہیں۔ ان کے افسانے ایک کنواری لڑکی کی امنگوں، آرزوؤں، تمناؤں کی مختلف تصویریں کھینچتے ہیں، جن میں میٹھی میٹھی سی چبھن اور کسک ہے۔ افسانہ "کھلاڑی" میں انہوں نے دبی دبی محبت کا اظہار بہت ہی دلچسپ فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ "شاید" میں بھی انہوں نے ایک نوجوان لڑکی کے اندیشوں کا ذکر بہت عمدگی سے کیا ہے۔ لاشعوری ذہن کے نفسیاتی افسانے کو شاہکار بنا دیا ہے۔ ہمیں ناہید سے بہت سی امیدیں ہیں کیونکہ وہ اس تاریک دنیا میں ناہید بنکر چمکی ہیں تاکہ ادب جدید کی تمام کمیوں کو دور کرسکیں!!

اب لکھنوی گروپ میں تین بہنوں کا ایک چھوٹا سا گروپ زیادہ مشہور ہے۔ یہ گروپ بیگم درانی۔ خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور پر مشتمل ہے۔ ان میں بیگم درانی بہت کم لکھا کرتی ہیں۔ شاید ازدواجی زندگی کی الجھنوں کی وجہ سے —— لیکن خدیجہ اور ہاجرہ زیادہ لکھا کرتی ہیں۔ پہلے پہلے ان دونوں بہنوں کے افسانوں میں ایسی یکسانیت ہوا کرتی تھی کہ یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا تھا فلاں افسانہ کس نے لکھا؟ خدیجہ نے یا ہاجرہ نے! شاید اس یگانگت کی وجہ ان کی یکرنگی کا پس منظر ہو۔ کیونکہ دونوں کی پیدائش میں دو سال کا فرق ہے خدیجہ ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں اور ہاجرہ مسرور ۱۹۲۹ء میں۔ دونوں ابتداء سے ہی ساتھ پلی بڑھیں اور پڑھیں۔ ایک ساتھ افسانے لکھے اور پھر غضب یہ کہ ایک ہی رسالہ میں چھپے لیکن اب ان کے افسانوں کی فضا مواد، موضوع اور طرز بیان میں کچھ کچھ نمایاں تبدیلی ہو چکی ہے۔ خدیجہ مستور کے افسانوں میں پختگی ابھرتی ہے، اور ہاجرہ کے افسانوں میں روانی اور فن کا زیادہ احساس پایا جاتا ہے۔ انکی پروفیسر وقار عظیم "خدیجہ کے افسانے گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے حوادث اور ان کے اندر کی جرأت اور بے باکی زندگی کے معمولی سے واقعہ میں بھی ایک نیا پہلو تلاش کرتی ہے۔ زبان کی صفائی، سادگی، ہلکی پھلکی ادبیت اور ... چمک اور افسانے میں خود بخود ابھرتے ہوئے تصور زا اشارے ... دلکشی، تازگی پیدا کر دیتے ہیں" اور ہاجرہ کے افسانوں میں ... ہوا کرتی ہیں۔ وہ عورت جو ماں، بہن، بیوی بن کر اور ... سے الگ صرف عورت رہ کر طرح طرح کے ارمانوں آرزوؤں

اور ان گنت حسرتوں کا گہوارہ ہے جو دکھتی ہے جلتی ہے، قربانیاں کرتی ہے مہر اور وفا کی آگ میں جلتی ہے۔ ہاجرہ نے اپنے افسانوں میں عورت اور اس کے دل کی کہانی ماحول کو بدل بدل کر سنائی ہے اور اس نئی نئی فضا میں ہر جگہ کہانی کا عنصر دلچسپ ہے؟

یہ تینوں بہنیں حضرت احمق پھپھوندوی کی لڑکیاں ہیں جن میں سے بیگم درانی کی شادی ہو چکی ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ خدیجہ کی "کھیل"۔ ہاجرہ کی "چرکے" (اور خدیجہ کی "بوچھار"، ہاجرہ کی "ہائے اللہ" زیر طبع ہیں)!!

ایک اور لکھنوی گروپ سے تعلق رکھنے والی قرۃ العین حیدر ہیں۔ آپ بھی اردو کے مشہور افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم مرحوم کی صاحبزادی ہیں۔ آپکی والدہ نذر سجاد حیدر بھی اچھی افسانہ نگار رہیں۔ قرۃ العین کو ادبی میراث ماں باپ کی طرف سے ملی ہے جسکا وہ صحیح استعمال کر رہی ہیں۔ قرۃ العین نے پچھلے سال دہلی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور آجکل لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ان کے افسانے بقول تیریں پہلے پہلے حجاب کے انداز میں رنگے ہوتے تھے لیکن ان کے افسانوں کا پس منظر تخیلی ماحول کے بجائے جدید انگریزی ماحول سے بنا ہے۔ اور ان کی تحریریں زیادہ رومانی اور حسین ہے اور ہی اونچے متوسط طبقے کے ساز و سامان اور عشرتوں کا ذکر —— لیکن بعد میں وہ ان چیزوں کو اس طرح پیش کرنے لگیں جیسے ان کا مقصد اس زندگی کی سطحیت، کھوکھلا پن دکھلانا ہو۔ لیکن میرا خیال ہے حجاب سے زیادہ ان پر اپنے ابا مرحوم کا اثر زیادہ ہے (یہ اقرار اس وجہ سے کر رہی ہے کہ سجاد حیدر مرحوم افسانوں کے باپ سمجھے جاتے تھے اور قرۃ العین ان کی بچی سمجھی جاتی تھیں) اور ان کے افسانوں میں مشرقی مغربی ماحول کا بھی کچھ ایسا دلکش امتزاج ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مغربی ماحول کو مشرقی ماحول میں ڈھال رہی ہیں مگر یہ مزید کہا جا سکتا ہے کہ ان کو مغربی اسلوب، مغربی موضوع مغربی تکنیک سے زیادہ دلچسپی ہے (اس کی وجہ ان کی کانونٹ اور مخلوط کالجوں کی تعلیم کا اثر معلوم ہوتا ہے) لیکن یہ ہمارے اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسی بھی افسانہ نگار ہیں جو اونچے متوسط طبقے کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔ اور ان کے بیان میں زیادہ سچائی اور خلوص ہوا کرتا ہے جو دوسری افسانہ نگار عورتوں میں کم نظر آتا ہے۔ ان کے افسانے ایک کنواری لڑکی کے گرد گھومتے ہیں جو مغربی فیشن کی دلدادہ ہے جسکو سفید نسل کی عورتیں اور مرد مغربی ماحول مغربی موسیقی سے حد درجہ محبت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ افسانے خود ان کی اپنی زندگی کے سچے مرقع ہیں یا ان کے مشاہدے کے عکاس ہیں۔ غرض ان کے افسانوں کی ہیروئن حد درجہ رومانی ہے۔ وہ مغربی نظموں میں

دلچسپی لیتی ہے اور ایکٹنگ کرتی ہے۔ وہ بلیرڈس، ٹینس، چائنیز چیکر، کیرم کھیلتی ہے اور ان سب کے علاوہ اس کی دلی تمنا ہے کہ خاردار پہاڑوں پیکا اُڑ ڈی کے ڈبلیو موتی بلین کی ایڈیگون پر بیٹھ کر چاندنی کی خاموش سڑکوں پر گھوما کرے۔ مجھ کو ان کے افسانے پڑھ کر نہ جانے دو چیزوں کا کیوں خیال آتا ہے۔ ایک کشمیر کی بہار کا۔ دوسرے امریکی فلموں کی ایکٹرس سوکا ہونی۔ شاید یہ دونوں ان کے افسانوں کے پس منظر میں کہیں نہ کہیں سے اپنے تاثرات ضرور بکھیر دیتے ہیں اور اسی سے ان کے افسانوں کا پس منظر شفیق الرحمٰن کے افسانوں کے شوخ رنگوں کی طرح سرخ، نارنجی، زعفرانی نظر آتا ہے۔ افسانے کے عنوان بھی بڑے طویل رکھتی ہیں جیسے "دیودار کے درخت" "دریچے کے سامنے" "گوتم بہتی رہی" "پرانز کے بعد" "ستاروں سے آگے" "آہ اے دوست" اور بعض وقت مصرعوں کو افسانوں کا عنوان بنا دیتی ہیں، جیسے "میری گلی میں ایک پردیسی" "سنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیاگر تھا" — سچ تو یہ ہے کہ ان کا ہر افسانہ ایک مکمل شعر و نغمہ میں ڈوبا ہوا گیت ہے جس کا ہر بول شیریں اور میٹھا ہے!!

ایسے ہی رنگ میں لکھنے والی بیگم تسنیم سلیم چھتاری ہیں۔ آپ کا اصلی نام میمونہ تسنیم ہے لیکن نواب صاحب مالک نگر کے فرزند نواب سلیم سے شادی کرنے کے بعد آپ نے اپنا نام تسنیم سلیم رکھ لیا ہے۔ آپ نواب صاحب چھتاری وزیرِ اعظم ریاست حیدرآباد کی صاحبزادی ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں نینی تال میں پیدا ہوئیں۔

لیکن تسنیم کے افسانے قرۃ العین حیدر سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کے افسانوں کا رنگ شفق کے افسانوں کی طرح سرخی مائل ہو رہا ہے۔ اور کہیں کہیں زردی مائل شیالا۔ کیونکہ ان کے افسانوں میں بہاروں کی تازگی نہیں ہوتی، بلکہ خزاؤں کی سی ویرانی رہتی ہے۔ اندر غم و الم کے شعلے رقص کرتے رہتے ہیں۔ اور قرۃ العین کے افسانوں میں زندگی ناچتی گاتی، چلتی پھرتی، ہنستی کھیلتی نظر آتی ہے۔ دونوں اپنے نرم دلوں کے جذبات کا اظہار کرتی ہیں۔ لیکن تسنیم کے افسانے یوں معلوم ہوتا ہے، سکون آمیز جھیلیں! اور قرۃ العین کے افسانے دوڑتی لپکتی ہوئی نہریں!! ان کا خود خیال یہ ہے۔ "ہمیشہ المیہ چیزوں سے دلچسپی رہی ہے۔ میرے افسانوں کا مقصد نہ اصلاحی ہے نہ اخلاقی۔ میں صرف اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں" افسانہ "کسک" ایسا معلوم ہوتا ہے خود ان کی زندگی کا عکس ہے۔ اور ان کا نیا افسانہ "خجلی" بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ کوئی غم ہے جو ان کو اپنے غمگین جذبات کے اظہار کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ مجھ کو ان کے افسانے پڑھ کر اس سے خوشی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ نوابی شان و شوکت میں رہنے والی لڑکیوں کی زندگیوں کے تجزیے کرتی ہیں۔ انکا نوابی ماحول جس کے قدموں پر دفن ہو جاتا ہے۔ مسز تسنیم آجکل اپنے شوہر نواب سلیم کے ساتھ "بارہ چکیہ" میں رہتی ہیں جہاں فطرت کا خاموش حسن بکھرا پڑا ہے۔)

گتی رشید بھی نئے چاند کی طرح ابھرتی جا رہی ہیں۔ یہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی صاحبزادی ہیں۔ (اور آجکل مسلم گرلز کالج علیگڑھ میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں) اپنے ابا کی طرح ان کی تحریریں شگفتگی، طنز اور مزاح کی جھلکیاں ہیں جو دوسری عورتوں سے ان کو امتیاز کرتی ہیں۔ کیونکہ دوسری عورتیں زیادہ تر سنجیدہ افسانے لکھتی ہیں۔ مگر یہ اسی طرح شامل رہیں لکھتی رہیں تو مستقبل قریب میں اپنے ابا کا درجہ حاصل کر سکتی ہیں!

اب ایک کہنہ مشق محبوب آباد کی لکھنے والیوں میں سے شفیق بانو ہیں۔ ان کی ایک کتاب "باغی لڑکی" بھی شائع ہوئی ہے۔ ان کے افسانوں میں گھریلو جھگڑوں کا ذکر بہت عمدگی سے ہوا کرتا ہے۔ اور وہ ان جھگڑوں کے نتائج کو دکھلا کر یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ یہی جھگڑے ہماری زندگی کو گھن لگا رہے ہیں۔ ان کو ختم کر دینا چاہئے۔ بقول آصف علی "اردو لکھنے والیوں میں شفیق بانو نے اپنے لئے جو جگہ پیدا کی ہے وہ ان کی فطرتی ذہانت، خداداد استعداد اور اس زبان کے قلمبند کرنے کا قدرتی نتیجہ ہے۔ حقیقت کو فطری، سادہ زبان میں ظاہر کر دینا ہی ادبی عمارتوں کی بنیاد ہے" غرض ان کے افسانوں میں بھی مسکراہٹوں اور خوشیوں کا ذکر کم ہوتا ہے۔ اور بے زاری اور غم کا ذکر زیادہ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا دل بہت حساس ہے جو ہر معمولی دکھ سے گہرا اثر قبول کرتا ہے!!

صوبہ بہار کے گروپ میں شکیلہ اختر بلند مقام پر نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانے موجودہ کالج گرل، غریب، مزدور، بورڈنگ ہاؤس کے لڑکے اور لڑکیوں کے جذبات، احساسات اور ان کی امنگوں کے عکاس ہوتے ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا بنا ذخیرہ اتنا اچھا ہے کہ افسانے میں نگینہ کا کام دیتا ہے۔ مگر یہ ان کی نفسیاتی کیفیت اور زندگی کی چہل پہل اور نشیب و فراز کو دکھلانے کے ساتھ ساتھ منظر کشی زیادہ کرتی ہیں جس سے بعض وقت اکتاہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ لیکن شکیلہ میں فن کا زیادہ احساس پایا جاتا ہے۔ ان کے تمام افسانے فنی لحاظ سے بہت کامیاب ہوا کرتے ہیں۔

شکیلہ آجکل ہردل میں مقیم ہیں۔ ان کی ایک کتاب "درپن" بھی شائع ہوئی ہے۔

ان ہی کے ساتھ ساتھ چلنے والی عصمت صفدر بھی ہیں۔ جو غریبوں، مزدوروں کے دکھ درد کی تصویریں کھینچتی ہیں۔ ان میں بھی پختگی اور گہرائی ہے۔ عورتوں کی نفسیات، گھریلو زندگی کی کشمکش کی تصویر کشی اچھے انداز میں کرتی ہیں!

کوشلیا اشک بھی اچھا لکھنے لگی ہیں۔ ان کو عورت کے جذبات و احساسات کے ابھار کرنے میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے اکثر افسانوں میں کسی چیز کو بیان کیا ہے۔ مجھ کو ان کے افسانوں کا رنگ زردی مائل پیلا نظر آتا ہے جو کسی قدر غمگین جذبے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ

ہندو عورتیں بھی اردو میں افسانے لکھ رہی ہیں۔ یہ پہلے ہندی میں لکھا کرتی تھیں لیکن اب اردو افسانے میں بیش بہا اضافہ کرتی جا رہی ہیں۔ آپ کوشلیہ ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئیں، انھوں نے بی اے فرسٹ کلاس پاس کیا اور ۱۹۵۱ء میں بی۔ ٹی۔ آپ اردو ہندی کے ترقی پسند ادیب اپیندر ناتھ اشک کی بیوی ہیں۔

ایک اور ابھرتی ہندو فنکار سرلا دیوی ہیں۔ آپ اردو کے مشہور ادیب کرشن چندر کی چھوٹی بہن ہیں۔ ان کے افسانے "ساقی" "نیا دور" میں شائع ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے ان کے دل و دماغ میں ... اور ظالم مرد کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑک رہے ہیں کیونکہ وہ عورت کو ایک حقیر شے نہیں سمجھتیں بلکہ ایک انسان کی طرح اس کو جینے کی تلقین کیا کرتی ہیں۔ ان کی طرز نگارش میں ایک باغیانہ پن ہے لیکن ان کا باغیانہ نعرہ زندگی کی تخریب نہیں کرتا بلکہ تعمیر کرتا ہے۔ غرض جذبات کی بے باکی، پلاٹ کی گٹھی فضا، نئی ترکیبیں، نفسیاتی الجھنیں، انوکھی تشبیہیں، اشارے ان سب کا امتزاج ان کے افسانوں کو جاندار بنا دیتا ہے۔ جن کا مستقبل شاندار نظر آتا ہے۔ سرلا آجکل دہلی میں رہتی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی نوجوان افسانہ نگار عورتوں میں مجھ کو زینت ساجدہ زیادہ پسند ہیں۔ ان میں ترقی پسند رجحانات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اور ہمیں ان کے افسانوں میں ہم کو ایسا ماحول ملتا ہے جس کی جھلک بہت کم ملتی ہے۔ وہ ہے حیدرآباد کا ماحول۔ کیونکہ ہمارے اردو افسانے میں ہندوستان کے ہر صوبے اور ریاست کی تصویریں جھلکتی دکھائی نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانے ایک ایسی لڑکی کے گرد گھومتے ہیں جو رومان کرنا چاہتی ہے لیکن پردہ کی وجہ سے مجبور ہے۔ اس کے جذبات سینے میں ہی دفن ہو جاتے ہیں۔ اور کہیں وہ اپنے افسانوں میں اس پردہ نشین لڑکی کے جذبات دکھلاتی ہیں جس کی شادی ہونے والی ہوتی ہے۔ جو اپنے شوہر کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو جاتی ہے ــــ ان کی تحریر میں ہم آہنگی اور تنوع ہے۔ تشبیہوں

کون سنے گا من کی بات ـــــ عرش ملسیانی

من کی بات سناؤں کس کو کون سنے گا من کی بات

مجھ دکھیا کی بھول بھلیاں بیتا جائے کالی رات

... گرجے بجلی چمکے اور برسے برسات

ایسے میں اپنے ساجن کو ڈھونڈت ڈھونڈت ہاری

من کی بات سناؤں کس کو کون سنے گا من کی بات

من میں راکھوں من کی بات

دیس میں رہ کر اب کیا ہوگی پیا گئے پردیس

تن پر مانگ ہے ہاتھ میں مالا جوگن کا ہے بھیس

پریتم میرا سب سے نیارا میں پریتم سے نیاری

من کی بات ہے مجھ سے نیاری من میں رکھوں من کی بات

چپ سے کہوں گی من کی بات

ساگر سے ملنے پر ندی پا گئی ہے بسرام

ساجن مجھ کو آپ ملے گا کھوج ہے میرا کام

اچھے آپ ... تیرا کو ترستے ہیں دو ساری

پریتم من کی بات سنے گا پی سے کہوں گی من کی بات

استعاروں کی بھی بہتات خوب ہوا کرتی ہے۔ زینت نے پچھلے سال جامعہ عثمانیہ سے بی اے پاس کیا ہے اور اب ایم اے میں پڑھ رہی ہیں!

جیلانی بانو بھی ایک اچھی ادیبہ ہیں۔ ان کے افسانے مضامین معانی رنگین دلچسپ اور معلومات افزا ہوتے ہیں۔ آپ نے جامعہ عثمانیہ سے ایم اے پاس کیا اور کلیہ اناث میں لکچرار ہیں۔ آپ کی ادبی دلچسپی کی وجہ سے کلیہ اناث کی نوجوان لڑکیوں میں ادب سے زیادہ لگاؤ پیدا ہو چکا ہے۔ آپ کی ابتک چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک افسانوں کا مجموعہ "رفتار خیال"، ایک خطوط کا مجموعہ "بربط ناہید" اور مضامین کا مجموعہ "فتراک" اور تنقید کی کتاب "محمد حسین آزاد"!!

اب ایک اور جنوبی ہند کی ترقی پسند افسانہ نگار ممتاز شیریں ہیں جن کے افسانے ساقی، نیا دور، عالمگیر، ادب لطیف میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ افسانہ "انگڑائی" کا مرکز ایک اہم نفسیاتی حقیقت ہے۔ ایک نوخیز پردہ نشین لڑکی اپنی ہی جنس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ اور جب وہ اپنی محبوب کو مدتوں بعد دیکھتی ہے تو اس کی خفتہ امنگیں جاگ اٹھتی ہیں۔ لیکن اس کی ہم جنسی محبت ناپائیدار رہتی ہے کیونکہ جب اس کی نظریں مخالف جنس سے دوچار ہوتی ہیں تو وہ اس کی طرف بے اختیار کھنچ جاتی ہے اور اپنی پہلی محبوب سے بے پروا ہی نہیں ہو جاتی بلکہ اس کو اپنے نئے محبوب کا ذکر کر کے جلانا چاہتی ہے۔ یہ ایک بہترین نفسیاتی نکتہ ہے جس کو ممتاز شیریں نے عصمت چغتائی کی طرح فن کی نزاکت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے "آئینہ" "شکست" "گھنیرے بادل" "اپنا نگر" گہری نفسیاتی کیفیت، مشاہدہ کی باریک بینی کے عکاس ہیں۔ ان کے کنایوں، استعاروں اور تشبیہوں میں نیا پن ہوتا ہے اور تحریر کی روانی اور شگفتگی افسانوں میں زندگی پیدا کر دیتے ہیں۔ آپ ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئیں ۱۹۴۲ء میں مہارانی کالج بنگلور سے بی اے پاس کیا ...

تمناؤں کے جھولے میں

افسانہ

شاہدہ خاتون ملک چکوی

اور یکے بعد دیگرے اس کے چار بڑے بھائی بہن لقمۂ اجل ہوتے گئے۔ اس کی بڑی بہن ریحانہ اسے اس قدر پیار کرتی تھی۔ دن رات اسے پالنا جھلاتی۔ اور وہ پالنے میں جھولتے جھولتے بچپن کی میٹھی نیند سو جاتی ——— معصوم نیند ——— !
پھر جب وہ ذرا اور بڑی ہوئی تو بھی ریحانہ کی محبت ویسی ہی تھی۔ اس کی نظر میں وہ اب بھی پالنا ہی جھلانے کے قابل تھی۔ گھر میں اُگے ہوئے نیم میں ریحانہ نے جھولا ڈال دیا تھا اور اسے اپنی گود میں لے کر ہلکی ہلکی پینگیں لیا کرتی اور گنگناتی جاتی ——— "آ جا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا"۔ ہلکی ہلکی پینگوں سے اس کی باجی کے اڑتے ہوئے آنچل کی سرسراہٹیں۔ اور پھر مشفقانہ تھپکیاں ——— اسے خواب کی دنیا میں لے جاتیں۔ اور جھولا کرتی ——— مسلسل ——— متواتر ——— !

وہ جب آٹھ سال کی ہوئی تو شہر میں ہیضہ پھیل گیا ——— اور یکے بعد دیگرے اس کے چار بڑے بھائی بہن لقمۂ اجل ہوتے گئے۔ کوئی اتنی زیادہ سمجھ تو اسے ہوئی نہ تھی ——— ماں کو روتے دیکھ کر ——— جانے کیوں وہ بھی معصومانہ انداز سے بلک کر رو دی ——— مگر اس کے معصوم قطرات اشک بھی فرشتۂ موت کے دل کو نرم نہ کر سکے ——— بھلا آنسوؤں کی التجا کو قدرت کیوں شرف قبولیت بخشے ——— ؟ وہ تو دنیا کے غم و آلام سے بے فکر ——— لاپروا ——— اپنے قوانین پر عمل کرتی ہے ——— اور اس نے دیکھا کہ اسے محبت کے جھولے میں جھلانے والی آپا ——— چند آدمیوں کے کاندھوں پر جھولتے ہوئے چلی جا رہی ہے ——— جانے کہاں ؟ اور وہ دیکھتی رہی ——— حد نگاہ تک ——— !
اور تب وہ ماں باپ کی اکلوتی رہ گئی ——— ساعتیں ——— پہریں ——— دن ——— راتیں ——— مہینے ——— سال ——— گزرتے گئے ——— نقوش ماضی مدھم ہوتے چلے گئے۔ پنہاں ہوتے چلے گئے ——— وہ بڑی ہوتی گئی ——— !
اور اسے جھولنے کی عادت ہو گئی تھی ——— اتنے بچوں کو کھونے کے بعد ——— ماں کی محبت صرف اس کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھی ——— وہ ماں کی تمناؤں کے جھولے میں ——— جھولتی رہی ——— جھولتی رہی ——— بعض وقت وہ ایسا محسوس کرنے لگتی جیسے وہ تمناؤں کے جھولے میں بیٹھی ہوئی ——— اڑی جا رہی ہو ——— آسمان کی بیکراں وسعتوں میں ——— افق کے پار ——— جھولے کے مانند لٹکتے ہوئے چاند کی طرف ——— چاندنی جھولے میں ——— چاندنی راتوں میں ——— سفید چاندنی راتوں میں ——— برگزیدہ ضعیف کے قلب کی طرح سفید ——— چاندنی راتوں میں ——— چاندنی جھولے میں جھول رہی ہو ——— تکتے لگے ہوئے مخملیں جھولے میں ——— مگر یہ صرف خواب ہوتا ——— حسین خواب ——— !

بتدریج اس کی آشائیں ——— اس کے معصوم دل کے پالنے میں جھولنے لگیں ——— نت نئی امنگیں ——— ارمانوں کی ڈال پر ——— آرزوؤں کے جھولے میں ——— تمناؤں کے سہارے جھولنے لگیں ——— اب وہ سولہ برس کی تھی ——— شباب کی امنگیں ——— یکبارگی ——— اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ——— اس دل میں کسک پیدا کرنے لگیں ——— اور اب وہ جھولتے جھولتے ——— ایک دوسرے عالم میں پہنچ جاتی ——— افق سے پرے ——— بہت پرے ——— رومان کی دنیا میں ——— ! اور کسی فردوسی محل میں محو ——— وہ ایک عجیب انداز سے جھولے میں سو جاتی ——— جانے عالم خواب میں وہ کیا سوچتی ہو۔ وہ اب خود سے پینگیں لینا پسند نہ کرتی ——— محض تنہا جھولنا ——— دل کے کسی نامعلوم گوشہ میں ایک دبی دبی سی تمنا پیدا ہوئی ——— کوئی اسے پینگیں دیتا اور لوری دے کر جھولے جھلاتا ——— سو جا را جکماری سو جا ——— وہ اداس غمگین، خموش خموش رہنے لگی ——— !

ایک دن ایسے ہی ——— جھولے میں بیٹھی بیٹھی ——— خیالات میں غرق وہ نیند کی آغوش میں دراز ہو گئی ——— ایک گلزار ——— رشک فردوس ——— چمن میں پہنچ گئی ——— وہ گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی ——— حیران تھی کہ کہاں پہنچ گئی ——— ؟ اور پھر اس کی نگاہ گلاب کے پودوں کی کیاریوں کے درمیاں ایک جھولا دکھائی دیا۔ جس کی ڈوریوں سے عشق پیچاں کی بیلیں یوں لپٹی تھیں کہ ڈوریاں نظر ہی نہ آئیں ——— وہ اس جھولے میں بیٹھ گئی ——— اور ——— ایک تمنا ——— مبہم سی تمنا اس کے دل میں پیدا ہوئی ——— کوئی اسے جھلاتا ——— پتوں کی کھڑکھڑاہٹ پر اس نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا ——— ایک حسین نوجوان ——— شاہانہ لباس میں ملبوس ——— تاج زریں ——— سر پر رکھے ——— اس کی جانب بڑھا آ رہا تھا۔ آنکھیں چار ہوئیں ——— اس کی خمار آگیں آنکھیں حیا سے جھک گئیں ——— وہ شرما کر سمٹ گئی ——— وہ قریب سے قریب تر ہوتا گیا ——— اور پھر جھولے کی ڈوریں پکڑ کر اسے جھلانے لگا ——— اس کی ماں اسے بیدار کر رہی تھی ——— وہ آنکھیں میچتی ہوئی اٹھ بیٹھی ——— نہ وہ چمن تھا ——— نہ شہزادہ ——— ! خواب ——— ! مگر یہ خواب ایک دن پورا ہوا ——— اسے پینگیں دینے والا مل گیا ——— وہ اسے جھلاتا ——— اپنی تمناؤں کے جھولے میں ——— !

اقوام متحدہ کی تعلیمی سائنسی اور ثقافتی مجلس

واشنگٹن ۲۰ جون:- اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی مجلس - امن عالم کیلئے کیا کیا کچھ کر سکتی ہے؟ اس موضوع پر این-بی-سی یونیورسٹی کی ہفتہ وار تقاریر کے سلسلہ (ہماری خارجی پالیسی) کی تقریروں میں گزشتہ حسب مندرجہ ذیل حضرات نے حصہ لیا:-

(۱) انگریز سیاستدان ڈاکٹر جولین ہکسلے جو اس مجلس کے موجودہ سکریٹری بھی ہیں آپ نے نیویارک سے تقریر نشر کی (۲) ڈاکٹر ایستھر سی - برونور جو اس مجلس میں امریکی نمائندہ ہیں اور (۳) چارلس ٹامسن جو بین الاقوامی اطلاعات، ور ثقافتی معاملات کے محکمہ میں مشورہ دینے کار ہیں - آخری دو مقرروں نے واشنگٹن سے تقریریں نشر کیں -

سب سے پہلی بات جو ان تقریروں میں کہی گئی یہ ہے کہ اقوام متحدہ کی سائنسی، تعلیمی اور ثقافتی مجلس کا ابھی تک کوئی وجود نہیں ہے - ہکسلے نے کہا کہ یہ مجلس ابھی موجودہ شکل میں اصل مجلس کی تشکیل کے واسطے بنی ہے - آپ نے مزید کہا "اس وقت تک ہمارا کام عملاً تیار کرنا اور ان مسائل پر رپورٹ مرتب کرنا ہے جن سے اس مجلس کو دوچار ہونا پڑے گا"

مجلس کے دستور پر اکتالیس اقوام کے دستخط

تقریر کے دوران میں ٹامسن اور ہکسلے نے کہا کہ مجلس کے اس دستور پر جو گزشتہ نومبر میں لندن میں طے ہوا تھا اکتالیس اقوام کے دستخط ہو چکے ہیں اور ان تمام اقوام کو موجودہ مجلس میں نمائندگی حاصل ہے - ٹامسن نے کہا کہ سات ممالک (برطانیہ، فرانس، نیوزی لینڈ، میکسیکو، ہندوستان، شام اور سعودی عربستان) نے اس دستور کو منظور کر لیا ہے اور بہت سی دوسری قومیں اپنی منظوری بھیجنے والی ہیں (نار وے کی پارلیمنٹ نے جمعہ کے دن اس مجلس کی رکنیت کو منظور کر لیا)

ہکسلے نے بیان کیا کہ اس مجلس کا دستور رفتہ رفتہ کام دے گا - اکثر ممالک کے محکمہ خارجہ اور مجالس قانون ساز اس دستور کا تجزیہ کریں گی - اسکا جو ربط معہ کیا جائے گا - اسکے بعد منظوری ملے گی - ٹامسن نے کہا خود ہماری مجلس نمائندگان نے بھی اس تجویز کو ابھی پندرہ دن سے بھی کم پہلے منظور کیا ہے سینٹ کی مجلس خارجہ امید ہے عنقریب اس تجویز پر غور کرے گی - ہکسلے کو یقین ہے کہ اس مجلس کو عالم وجود میں لانے کیلئے جن دستخطوں کی ضرورت ہے وہ جلد ہی حاصل ہو جائیں گے -

ڈاکٹر برونور نے کہا "اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اس مجلس کو فی الفور صحیح راستہ پر ڈال دیا جائے - تعلیم رفتہ رفتہ ہی اپنا رنگ اور اثر دکھاتی ہے - اگر ہمیں اس مجلس سے تعمیری کام لینا ہے اور بقول وزیر اعظم اٹیلی کے لوگوں کے دماغ میں امن کے استحکامات بنانا ہیں تو ہمیں فوراً ہی یہ قدم اٹھا لینا چاہیئے"

اس مجلس کا خاص مقصد

ڈاکٹر برونور نے کہا "اس مجلس کا خاص مطمح نظر یہ ہے کہ انسانی معلومات کا کل خزانہ اقوام متحدہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا جائے متحدہ طور پر سیکھنے، پڑھانے اور غور کرنے سے دنیا والے تمام جہان میں امن عامہ قائم کرنے کے لئے قریب تر ہو جائیں - مجلس کا یہ مقصد کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟ اسکے طریقے بتاتے ہوئے ٹامسن نے کہا: "ایک طریقہ تو یہی ہوگا کہ تعلیمات سائنس اور فنون میں جو کچھ ترقیاں ہوتی ہیں یا ہوں گی ان سے ہر ملک کو متمتع ہونے کا موقع دیا جائے" آپ نے یہ بھی فرمایا "یہ مجلس فرداً فرداً بھی لوگوں کو مستفیض ہونے کا موقع دیگی مثلاً طلبا، اساتذہ اور کتابوں کے تبادلہ کے ذریعہ سے - گویا یہ مجلس ہر قسم کی رکاوٹوں کو دور کر کے جملہ اقوام عالم میں خیالات کی ایک رو بہا دیگی - ریڈیو، اخبارات و رسائل اور سینما سے پورا پورا استفادہ کیا جائے گا - ایک طریقہ یہ بھی ہوگا کہ جو کام بین الاقوامی مزدور سبھا کی مرکزی مجلس گزشتہ پچیس سال سے کر رہی ہے یہی کام اس مخصوص سلسلہ میں یہ مجلس بھی انجام دے گی - اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ بین الاقوامی جلسے کئے جایا کریں گے"

ہکسلے نے اس مجلس کے عملہ کے اراکین کا ذکر کرتے ہوئے کہا "اسوقت تیس اعلیٰ درجہ کے فضلا جو ہر ملک کی نمائندگی کرتے ہیں اس مجلس کے عملہ میں موجود ہیں اس وقت ہم لوگ صرف یہ کام کر رہے ہیں کہ جنگ سے متعلقہ ملکوں میں جنگ کی وجہ سے جو تعلیمی، ثقافتی اور سائنسی تخریب ہوئی ہے اس کا ازالہ کر دیا جائے - ہم لوگ پہلے ضروریات معلوم کرتے ہیں اور پھر جنگ کے ستائے ہوئے ملکوں کی ان ضروریات کو ادارہ

فلاح و رفاہِ مشترک" پیدا کر دیتا ہے"۔

جہالت

ہکسلے نے کہا "اس وقت سب سے زیادہ جو چیز ہماری توجہ کی محتاج ہے وہ ناخواندگی ہے۔ ہم لوگ جلد ان طریقوں کا مطالعہ کرنے والے ہیں جو چین، روس، میکسیکو ترکی، برطانوی نوآبادیات اور دوسرے ممالک میں جہالت کو دور کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں۔ مثلاً میکسیکو میں جہالت دور کرنے کے واسطے جو طریقے اختیار کئے گئے انہوں نے گزشتہ سال بڑے حیرت انگیز نتائج ظاہر کئے ہیں۔ دوران جنگ کے اختیارات کے زمانہ میں صدر اویلا کماچو نے حکم دیدیا تھا کہ چھ اور چالیس سال کی درمیانی عمر کا ہر ناخواندہ شخص تعلیم حاصل کرے اور ہر تعلیم یافتہ کا فرض ہے کہ وہ غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو پڑھائے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سترہ لاکھ آدمی لکھنا پڑھنا سیکھ گئے"۔

ڈاکٹر بروونور نے ہکسلے سے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا "ناخواندگی واقعی ایک اہم مسئلہ ہے لیکن اگر اس مجلس سے حقیقی طور پر امن عالم کو قائم رکھنے کا کام لینا ہے تو ہم کو چاہیئے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں خبریں وغیرہ بے روک ٹوک جانے دیں۔ اس مجلس کا فرض ہے کہ وہ معلوم کرے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے واسطے کیا کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔ اس مجلس کو چاہیئے کہ اخبارات، سینما اور ریڈیو کو بے جا اور فضول پابندیوں سے آزاد کردے"۔

ہکسلے نے کہا: "مجھکو یقین ہے کہ "ڈوکیومنٹری" فلموں کے ذریعہ سے بین الاقوامی اتحاد و مفاہمت ایک بڑی حد تک پیدا کی جاسکتی ہے"۔

ڈاکٹر بروونور نے ریڈیو کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا "میں یقین کرتی ہوں کہ ریڈیو لاکھوں کروڑوں اشخاص سے تعلقات پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے" آپ نے کہا کہ اس مجلس کو اپنی آواز الگ رکھنی چاہیئے بلکہ اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں اس کو اپنے ذاتی ریڈیو گھروں کا ایک جال پھیلا دینا چاہیئے۔

ہکسلے نے ریڈیو کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا "بی۔ بی سی نے جنگ کے زمانہ میں یہ تجربہ حاصل کیا ہے کہ ریڈیو بلاشک زیادہ سے زیادہ آدمیوں تک پہنچنے کا بہترین ذریعہ ہے"۔

طامسن نے کہا "نیویارک میں "وائس آوف امریکہ" سے جو کثیر اللسانی نشریات ہوتے ہیں ان کو ابتک بڑی مقبولیت حاصل ہے"۔ آپ نے یہ بھی کہا "مجھکو بنٹن کے نائب معتمد سے پورا پورا اتفاق رائے ہے کہ ایک ایسی مرکزی ریڈیائی مجلس ہونا چاہیئے جسکے اختیارات مقرر ہوں اور جو یا تو اقوام متحدہ کو جوابدہ ہو یا اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی مجلس کو"۔ آپ نے مزید فرمایا "اگر اقوام متحدہ ٹیکنیکل پہلو کو اپنے ذمہ لے تو پر زور طریقہ پر کہوں گا کہ نشریات کا ۷۵ فیصدی حصہ اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی مجلس کے سپرد کر دیا جائے"۔

ٹیکنیکل مشکلات (مثلاً بہروں اور زبان وغیرہ کے مسائل) کے بارے میں طامسن نے کہا "روسی ریڈیو نے ایک بڑی بھاری گتھی سلجھا دی ہے۔ مجھکو معلوم ہوا ہے کہ روسی ریڈیو اپنے ملکی حدود کے اندر ستر زبانوں میں اپنے پروگرام نشر کرتا ہے اور بیرونجات کے لئے تیس اور زبانوں میں۔ اگر ہم ایسی چھوٹی چھوٹی مشکلات پر قابو نہیں پا سکتے تو ہم کو کیا امید ہو سکتی ہے کہ ہم متحدہ طور پر جوہری بم ایسے اہم مسئلہ کو آپس میں طے کرسکیں گے۔

بین الاقوامی یونیورسٹی

اس مجلس کی مجوزہ تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں طامسن نے کہا "ہمیں تاریخ کا سبق دینے میں وسعتِ نظر اور ژرف نگاہی دونوں کی ضرورت ہے" ڈاکٹر بروونور نے بین الاقوامی یونیورسٹی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا "ایسی یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے بہترین عملی اقدام یہ ہو سکتا ہے کہ اساتذہ کیواسطے موسم گرما میں تعلیمی ادارے کھول دیئے جائیں"۔ ہکسلے نے کہا کہ بین الاقوامی سول سروس کی ٹریننگ کی بھی سخت ضرورت ہے۔ طامسن نے کہا "یہاں امریکہ میں سائنسی اور فنی معلومات کے پرچار میں بڑی دلچسپی لی جاتی ہے" انہوں نے یہ بھی کہا کہ جب اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے اراکین عملہ جو اقوام متحدہ کی تعلیمی، ثقافتی اور سائنسی مجلس میں کام کرتے ہیں ماہرین تعلیم اور ماہر سائنسدانوں سے ملے جلے تو علاقہ جاتی اطلاعی مراکز قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا، آپ نے کہا کہ اگر اس مجلس کو پورے طور پر موثر بنانا ہے تو ایسے اطلاعی مراکز ضرور قائم کئے جانے چاہئیں۔ ہکسلے نے کہا کہ یہ مراکز اقوام متحدہ کے تمام اداروں اور سرگرمیوں کے واسطے ہونا چاہئیں نہ کہ صرف اس ثقافتی تعلیمی اور سائنسی مجلس ہی کے لئے۔

اس مجلس میں روس کی شمولیت کے متعلق استفسار کا جواب دیتے ہوئے ہکسلے نے کہا "میرے خیال میں اس سلسلہ میں سوویت حکومت کا نظریہ یہ ہے کہ تعلیمی سائنسی اور ثقافتی مجلس بھی مجلس اقوام متحدہ ہی کا ایک جزو ہے اور تاوقتیکہ ان دونوں میں مفاہمت نہ ہو جائے۔ اس مجلس کا کوئی وجود تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مجھکو یقین ہے کہ روس اس مجلس میں ضرور شریک و شامل ہو جائے گا۔ پورے طور پر مفید ہونے کے لئے روسی اشتراک کی یقیناً ضرورت ہے، اور مجھے یقین ہے

کہ روس حکومتِ عالم کے ضمن میں اس مجلس کی اہمیت کو ضرور محسوس کریگا۔"

مکینلے نے بتایا کہ اقوامِ متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی مجلس کے موجودہ اراکین کو مجلس اقوام متحدہ کے ساتھ پورا تعاون حاصل ہے اور ہمیں امید ہے کہ جنرل اسمبلی ستمبر میں اس کو منظور کرے گی اور خود یہ مجلس بھی نومبر میں اس طرف قدم بڑھائے گی۔"

مکینلے نے یہ بھی کہا کہ یہ مجلس لیگ آف نیشنز کے "انسٹی ٹیوٹ آف انٹلیکچول کوآپریشن" کی قائم مقام نہیں ہے۔ انہوں نے بیان کیا "فی الحال ان دونوں اداروں کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ نئی مجلس بہت زیادہ وسیع پیمانہ پر کام کرے گی۔ ہماری تجویز ہے کہ ہم انسٹی ٹیوٹ سے مستفیض ہو سکیں۔"

چند اندیشے

ڈاکٹر برنور نے کہا کہ اس مجلس کے ناکام رہنے کا بھی خدشہ ہے۔ مجھے تنبہ کرنا ہے اور میں جانتی ہوں کہ اگر نبٹین اسسٹنٹ سکریٹری اس وقت یہاں موجود ہوتے تو وہ بھی یہی کہتے۔ لوگوں کے آپس کے مذاکرہ میں بہت سی چیزیں حائل ہو سکتی ہیں مثلاً ناخواندگی، افلاس اور اجارہ داری۔ ان سب پر قابو پاتا ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ بہت کم لوگ اس قسم کے ارتباطِ معنوی کے فوائد کا یقین رکھتے ہیں۔ بہت سوں کو جمہوریت پر بنیادی طور پر اعتماد نہیں ہے۔

"اگر رجعت پسند سائنسدان اور پروفیسر اور غیر ضروری حد تک محتاط سرکاری حکام اس امر کو پس پشت ڈال دیں تو یہ مجلس اپنے اغراض و مقاصد میں ناکام رہے گی اور یہ بڑے افسوس کی بات ہوگی کیونکہ ہمیں اس مجلس کو غیر موثر اور کمزور نہ ثابت نہیں کرنا ہے۔ لوگوں کو غلط امیدیں دلانے اور پھر ان کو مایوس کرنے سے تو کہیں اچھا یہ ہے کہ اس مجلس کو قائم ہی نہ کیا جائے۔ مجھکو پھر بھی امید ہے کہ یہ مجلس آپس کے ربط ضبط کا ایک اچھا آلہ ثابت ہوگی۔"

طامسن نے کہا "اگر واقعی ایسا ہوا تو یہ مجلس اقوام متحدہ کی مجلس امن سے بھی کہیں زیادہ اہم ثابت ہوگی۔"

مکینلے نے آخر میں کہا "ہم کو یقین ہے کہ امن عالم کا انحصار عوام اور خواص کے آپس کے ربط ضبط ہی پر ہے اور اقوام متحدہ کی اس تعلیمی سائنسی اور ثقافتی انجمن کو ایک زندہ اور جاندار چیز بنانے کی ہمیں ہر ممکن کوشش کرنا ہے۔"

("امریکن نیوز فائل" سے ماخوذ)

غزل — صبا اکبر آبادی

پیہم اسیرِ مرحلۂ جسم و جاں ہے
کس سخت بند شوں میں ترے ناتواں ہے

آنکھوں سے یہ کہو جو قسم غم فشاں ہے
وہ تو چراغ ہو گئے آنسو کہاں ہے

آسودۂ نشاطِ جہاں مصلحت سے ہوں
دل میں خوشی رہے تو محبت کہاں ہے

آتی ہی دیر دل کی لگی کچھ دبی رہی
آنکھوں سے جتنی دیر تک آنسو رواں ہے

گھبرا کے پھر قفس کی طرف لوٹنا پڑا
جب ہم قفس سے چھوٹ کے آئے آشیاں ہے

وہ میری اعتکافِ حرم پر نداشتیں
ساقی کا وہ سوال کہ اب تک کہاں ہے

اب مل گیا ہے تیری تجلی کو اک مکاں
جلوے نگاہِ شوق سے پہلے کہاں ہے

اے حسنِ یار شرم کہ بے سوز سا چراغ
اس گھر میں روشنی بھی ہو تو جہاں ہے

مسرور ہم نہیں تو صبا اغنیا رکیا
ناشادماں رکھے گئے ناشادماں ہے

غزل — غنی کانپوری

اظہارِ محبت رہنے دے بے پردہ کسی کا راز نہ کر
اے طائرِ شوقِ خدا کیلئے بس حد سے سوا پرواز نہ کر

کیا حسنِ مجازیہ اترانا کیا جوشِ شباب میں تن جانا
دو دن کی یہ جوانی ہے اس عالمِ ہیچ پہ ناز نہ کر

قربان میں سر پہ چڑھا کے مجھے یہ دل نے گرا دیا کیا
اے جانِ تمنا بہرِ خدا یوں مجھکو نظر انداز نہ کر

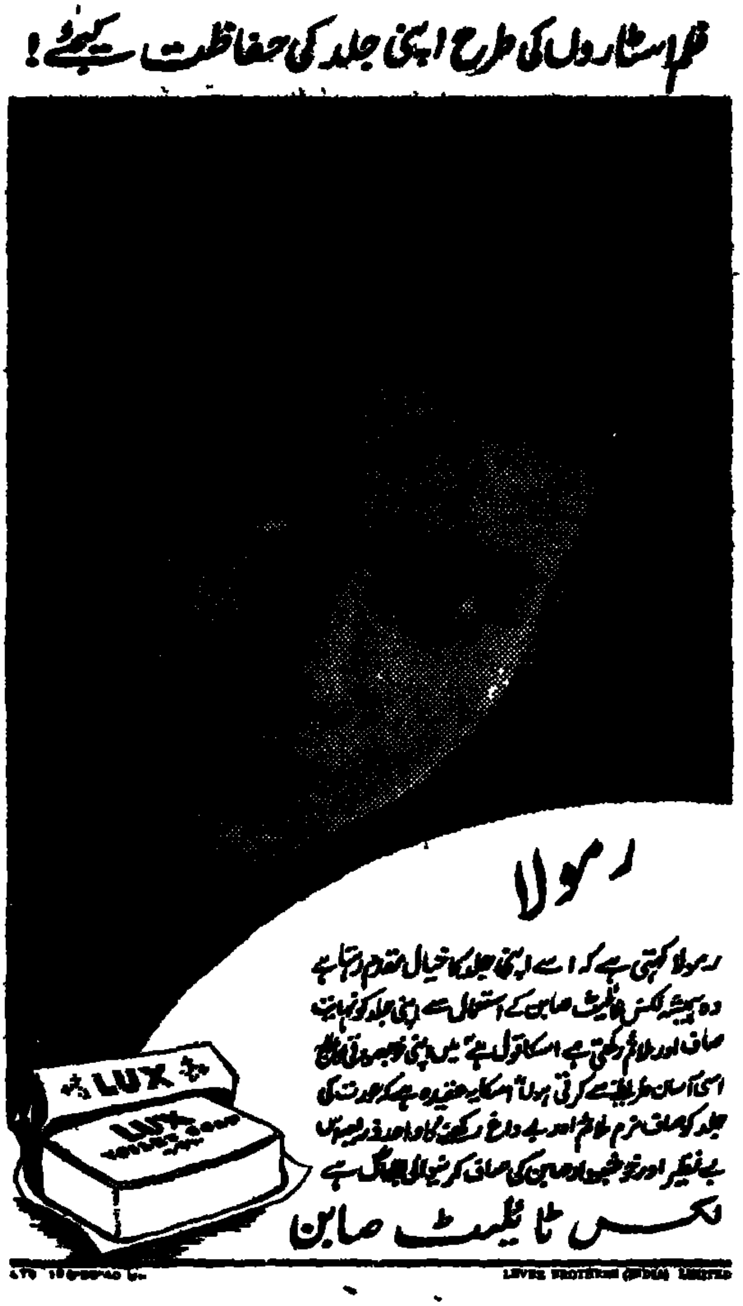
صد شکر کہ خوبی قسمت سے وہ آج میرے گھر آئے ہیں
اس بزمِ مسرت میں اے دل افسانۂ غم آغاز نہ کر

دنیا میں جہاں والوں سے غنیؔ بس دور کا ملنا بہتر ہے
بنجائے جو وجہ کلفتِ دل اس درجہ کسی سے ساز نہ کر

رنگے ہوئے گیدڑ —

بقیہ صفحہ ۲۳

کہ زمانہ ہمیں فضائے نیلگوں کے اس پار پہنچا دے ہمیں ان سے آگاہ کریں گے لیکن اس وقت رات آدھی ہو چکی ہے اور بیداری نے ہماری پلکوں کو تھکا دیا ہے اسلئے ہمیں اجازت دو کہ ہم سو جائیں، بہت ممکن ہے خوابوں کی پری ہماری روح کو اس عالم میں لے جائے جو عالم سے کہیں زیادہ صاف ستھرا ہے!


فلم اسٹاروں کی طرح اپنی جلد کی حفاظت کیجئے!
رمولا
رمولا کہتی ہے کہ اسے اپنی جلد کا خیال مقدم رہتا ہے
وہ ہمیشہ لکس ٹائیلٹ صابن کے استعمال سے اپنی جلد کو نہایت
صاف اور ملائم رکھتی ہے اسکا قول ہے "میں اپنی خوبصورتی کا علاج
اسی آسان طریقے سے کرتی ہوں" اسکا یہ عقیدہ ہے کہ عورت کی
جلد کو صاف نرم ملائم اور بے داغ رکھنے کا واحد ذریعہ یہی
بے نظیر اور خوشبودار صابن کی صاف کرنیوالی جھاگ ہے
لکس ٹائیلٹ صابن
LUX
LUX
LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

اقبال کے تضاد پر ایک نظر
(۱)

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبالؔ
مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ فرزانہ

میں اپنے محترم کرم فرما حضرت میکش اکبرآبادی اور جناب ڈاکٹر تاثیر صاحب کے مضامین پڑھ کر چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں ہر دو مضامین کے متعلق مختصری گزارش کروں۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب کے نزدیک اقبالؔ میں تضاد نہیں ہے۔ اقبالؔ جامع اضداد ہے اور تضاد بالذات نہیں، اور یہی اقبالؔ کے تمام شاعرانہ اور حکیمانہ محاسن اور مختلف نظریات کی بنیاد ہے۔ اقبالؔ نے اپنے مختلف ادوار میں خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کی نوعیت سے بالواسطہ تعلق رکھتے تھے۔ آپ ایک بالغ نظر محقق اور حقیقت کے متلاشی بھی تھے۔ مختلف ماحول کے تاثرات نے آپ کی فکر و نظر پر جا آثار مرتب کئے۔ اس کا اظہار آپ کے مختلف شاعرانہ اور مفکرانہ احساسات کے ذریعے ہوتا رہا ہے۔ اب اسے "تضاد" فی الحقیقت سمجھا جائے یا نہیں؟ لیکن ایک محقق کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ ہر پہلو پر نظر ڈالے اور اپنے مقاصد کی صداقت کے لئے غور و فکر سے ایک مفید راستہ اختیار کرے۔ اس لحاظ سے میرے نزدیک میکش صاحب کی مساعی بھی اچھا کچھ معیوب نہیں۔ ڈاکٹر تاثیر نے میکش صاحب کے چند شبہات دور کرنے کے لئے اقبالؔ کے تضادِ فکر پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ ایک صحیح الخیال متجسس اور جویائے حقیقت کی طرح مختلف ماحول سے متاثر تھے۔ لیکن صداقت کے انکشاف پر آپ کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی۔ آپ کے سامنے جن مسائل کا مقابلہ تھا اس کے ہر پہلو پر غور کرنے اور صحیح نتائج کی تلاش آپ کی فکر و نظر میں نمایاں صورت سے موجود ہے گو تاثیر صاحب کے مضمون کے چند پہلوؤں سے مجھے اتفاق نہیں تاہم اس حقیقت کے اظہار سے متفق ہوں کہ اقبالؔ کے نظریات کے مختلف پہلوؤں کا باہمی تضاد فی الحقیقت تضاد نہیں بلکہ اس کے کلام حسن شاعرانہ و حکیمانہ کا تجزیاتی تقاضا ہے جبکہ اقبالؔ کی زندگی ہی میں اقبالؔ نے اپنی شاعری اور حکیمانہ احساسات کے تقاضے میں مختلف تاثرات کا انکشاف کیا۔ جب تک اقبالؔ کے تمام سیاسی، مذہبی، سماجی اور شاعرانہ حکیمانہ عارفانہ اور متصوفانہ انقلابات خیالات کا کلی مفہوم پیش نظر نہ ہو گا صحیح معنوں میں ان نظریات کا پس منظر اور اس کا حقیقی پہلو سامنے نہیں آسکتا۔ اس کا مفید نتیجہ اخذ کرنا اقبالؔ کی جامعیت اور ان کے مقصود کو سمجھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ اقبالؔ نے مختلف خیالات کا اظہار بیک وقت نہیں کیا بلکہ مختلف ادوار میں بحیثیت ایک شاعر و حکیم و فلسفی نیز بالغ نظر محقق و عارف اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ یہ عقدہ جب ہی حل ہو گا کہ اقبالؔ کے مختلف اور متضاد نظریوں کو غور و فکر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

اس سلسلے میں اقبالؔ ہی کی جملہ تحریرات کی روشنی میں ہم ایک مفید اور یکساں مقصد حاصل کر سکتے ہیں، بشرطیکہ تجسس و تحقیق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ اقبالؔ کی فکر و نظر اپنے مختلف ادوار و کیفیت کے لحاظ سے متضاد ماحول سے وابستہ ہے۔ سب سے پہلے اس بات کا تجزیہ ضروری ہے کہ اقبالؔ کے تمام مجموعہ ہائے فکر کے ادوار کا انتخاب کیا جائے پھر ہر دور کی خصوصیات کو ان کی بنیادی اور بالاصالت حیثیت سے سمجھ کر اس کا مفہوم حقیقی طور پر لیا جائے جیسا کہ جناب غلام محمد صاحب بی اے (عثمانیہ) نے اپنے ایک مضمون "کلام اقبال کا تحلیلی مطالعہ" میں اقبالؔ کے مختلف "ادوارِ فکر" کی تقسیم کی ہے۔ آپ نے اقبالؔ کے کلام کا "بلحاظ فکر" اور "بلحاظ ماحول" تجزیہ کرتے ہوئے حسبِ ذیل خصوصیات کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے:-

(۱) بہ لحاظ فکر	استفہام	تجسس	یکجہتگی
(۲) بہ لحاظ اثرات ماحول	سفر یورپ سے پہلے	سفر یورپ	سفر مغرب کے بعد

آپ نے ان ادوار کی ہر خصوصیت پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے مطالعے سے مولانا میکش صاحب کو کافی تشفی ہو جائے گی اور اسباب کا انکشاف بھی ہو جائے گا کہ اقبالؔ کے متضاد نظریات کا پس منظر کیا ہے اور کن اصول و وجوہ کی بنا پر آپ کے کلام میں تضاد پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی مضمون میں غلام محمد صاحب اقبالؔ کے "آخری دور" کے متعلق لکھتے ہیں:-

"اس سفر (سفر یورپ) سے جب علامہ موصوف واپس ہوئے تو چونکہ مشرقیت اور مغربیت کے حقائق یکساں طور پر واضح ہو چکے تھے پھر ان کے مقابل اسلام کی حقیقت اور کاملیت بھی ظاہر ہو چکی تھی ان کو اب اطمینان اور ایقان نصیب ہو چکا تھا۔ قرآنی حقائق ان کے قلب میں ایمان کامل کے درجے تک پہنچ چکے تھے وہ ایک حقیقت کے متلاشی تھے۔ ان کی طبیعت میں "توحید" تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کلام اللہ سے انہوں نے صحیح رہبری حاصل کی۔ حقائق و معارف کھلتے گئے اور کچھ کھلتے جب خود سمجھنے لگے اپنی کتاب میں بے جھجک لکھا تا کہ کتاب ازبس خود ہی تحقیق۔"

بشیر مخفی القادری

فرشتوں میں جب سوار کھلے گئے۔ جب ہم نے ان کو ملا کر دیکھا تو صحت ہمارے سامنے رکھ دیا۔ غلط تحقیقات نے وقتاً فوقتاً پیش کی گئیں تھے ان کی بنا مذہب تو ہے ہی لیکن اس وقت ان کے خیالات اور نتائج فکر اتنے بدل گئے تھے اور اپنی فطرت کا ظہور کر چکا تھا یہ چیزیں ان کی وقعت نہیں گرا سکتیں بلکہ ہوئے حقیقت ہونے پر علامت ہے اور حقیقتاً یہی وہ مقام ہے جو اقبال کو عام مفکرین سے جدا کر دیتا ہے۔ حقانیت کے تقاضے اور غلط تخیلات کے بت خانہ پر ضرب کلیمی لگائی اس سے وہ مومن حق کی منزل میں شامل ہو گئے اگر وہ اس بت خانہ پر ضرب نہ لگاتے تو دیا اسی بت خانہ اور وہ جلوۂ حقیقت سے دور جا ہو سکتے ہیں جو صرف "مومنین" کا مقام ہے۔ اس دور کی ہدایات سے ... صوف ... اور ... بھی ہو ... معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمات محمدی ان کے قلب و دماغ سے منعکس ہو کر ہم تک پہنچ رہی ہیں" (آثار اقبال)

اقبال کے مختلف ادوار کے اثرات اور متضاد نظریات کے اسباب کو ان توجیہات سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ باقی اقبال کا متعین نظام فکر جدید پہلوؤں کے لحاظ سے عصر حاضر کے مختلف مسائل سے دوچار ہو کر جس تعمیر کا متقاضی ہے اس پر مختصر طور سے ڈاکٹر تاثیر صاحب نے بھی روشنی ڈالی ہے۔ "جہاں وہ اصلاح اور تجدید فکر کے ماحول دماغ میں ایک بلند نظر محقق و مفکر کو کن صورتوں سے اپنے تاثرات کا اظہار کرنا چاہیئے اس کے لئے اس دور کے حالات و انقلابات وقتی احساسات کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ اس کی ضرورت نہیں کہ ہر فکر کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ اختلاف اتفاق یا لا اصول ہو سکتا ہے۔ اسی تضاد کو دیکھ کر بعض اہل فکر سطحی نظر سے کام لے کر یہ سمجھتے ہیں کہ اقبال نے مختلف و متضاد خیالات کا ... رہے ہیں حالانکہ اسباب و علل اور بنیادی خصوصیات کو ہر فکر سے وابستگی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ اقبال ہی کے مجموعۂ مکتوبات کو گہری نظر سے دیکھنے پر کوئی حقیقی نتیجے تک پہنچنا بہت

پنکھڑیاں

سلام سندیلوی

رازِ ہوا جو آشکار، راز کی زندگی گئی
جونہی کلی ذرا کھلی، توڑی، ملی، دلی گئی

شمع کو زندگی بھی کیا، رنج و الم کی دی گئی
آئی، جلی، لٹی، مٹی، روئی، بجھی، چلی گئی

سبزہ نکلنے کے لئے زیر زمیں تھا بے قرار
دیکھی چمن کی جو فضا ساری ہنسی خوشی گئی

موت بھی کم نہ کر سکی، ظلمت بخت آدمی
کالے کفن سے رات کے تربت غم ڈھکی گئی

کتنا حسیں تھا یہ چمن جس سے ارم کو تھی جلن
آئی تھی کس لئے بہار، سوچ کے کیا چلی گئی

صبح کے حالِ زار پر بکھری پڑی کرن ذرا نظر
مانگ شب کو تیری مانگ موتیوں سے بھری گئی

نظروں نے رکھا تھا بھرم، اشکوں نے کر دیا تمام
تھوڑی سی آبرو جو تھی، وہ بھی بہی بہی گئی

کیسے اٹھا تا حشر تک آہ یہ بارِ غم سلام
سجدۂ شکر چاہیئے، عمر جو تھوڑی سی دی گئی

خیال ہے۔ اسی مجموعہ کو دیکھ کر حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ اقبال کے سامنے فکر و نظر کن کن ماحول و اثرات پر مبنی ہیں۔ جنہوں نے اس مجموعہ کے مرتب جناب شیخ عطاء اللہ صاحب ایم۔ اے پروفیسر معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو خاص طور پر اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے کہ مجموعہ کے ساتھ اقبال کے تمام متعلق اثرات اور آپ کی نگارشات و تحریرات کے مجموعہ پر عمیق نظر ڈالنے کی ضرورت تھی۔

اقبال کے تصوفانہ کمالات و عرفانی محسوسات و خیالات کا تجزیہ کرنے سے قبل یہ دیکھنا بھی ہے کہ اقبال نے کن کن تاثرات کی بنا پر اپنے خیالات میں تبدیلی پیدا کی اور اس ماحول اور اس فکر کے تعمیری خصوصیات میں کن ذرائع کو منتقل کیا گیا۔ مولانا میکش صاحب نے اکثر متضاد نظریات فلسفہ عجم سے اخذ کئے ہیں جو یورپ اور مستشرقین یورپ کے ماحول میں تصنیف کی گئی تھی۔ جس کے مترجم کو آپ نے خود ہی بعد میں تحریر فرمایا تھا کہ یہ کتاب اس سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس وقت سے بہت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے۔"

اس انکشاف و انقلاب کے لئے علامہ علیہ الرحمۃ نے اپنے مکاتیب میں بھی روشنی ڈالی ہے۔ بالخصوص علامہ سلیمان ندوی کے نام اپنے خطوط میں آپ نے تحقیقی اور متجسسانہ فکر نیز مختلف نظریات و ماحول کے تاثرات کا اظہار بھی فرمایا ہے۔ آپ نے خواجہ حافظ شیرازیؒ، ابن عربیؒ وغیرہم کے نظریات پر پہلے تو مختلف خیالات کا اظہار فرمایا تھا لیکن بعد میں اپنے ان نظریات بالخصوص "تصور زمان و مکان" فلسفہ و تصوف کے متعلق حضرت شیخ اکبر ہی کے فیضان خاص سے خوشہ چینی کی ہے بلکہ یورپ میں دوبارہ خاص طور پر مفکر اسلام حضرت شیخ اکبر و حضرت شیخ مجدد سرہندی پر لیکچر دینے کے لئے دور آخر کے مشہور روحانی رہنما حضرت قبلہ عارف کامل سیدنا پیر مہر علی شاہ علیہ الرحمۃ قادری چشتی گولڑوی کے نام عریضہ لکھ کر استفادہ کی خواہش ظاہر کی۔ خیر میں اپنے موضوع سے بہت دور نہیں جانا چاہتا۔ اتنا عرض کرنا ہی کافی سمجھتا

رہوں کو تصوف کے خاص مسائل اور "وحدت الوجود" کے متعلق تو اقبال کے مرشد معنوی، عارف اعظم، مولائے مفخر اسلام حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ العزیز کے ہی ارشادات قولِ فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے خود اقبال نے معنوی و روحانی تربیت پائی۔ بقول مکرمی جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب پرنسپل اورینٹل کالج لاہور۔

"ڈاکٹر اقبال کے مآخذ میں رومی کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے اقبال رومی کو اپنا ہادی اور پیشوا خیال کرتے ہیں اور بار بار اعلان کرتے ہیں کہ میرے میکدے کی شراب ساحل پیر رومؒ کے خمخانے کی حاصل کردہ ہے۔ اقبال زندگی کے اسرار کی نقاب کشائی کرتے ہیں مگر اس انکشاف کا سہرا اپنے مرشد رومیؒ کے سر باندھتے ہیں۔ یہی رومیؒ جاوید نامہ کے زندہ رود کے لئے خضرِ راہ بنتے اور اسے آسمانی دنیا کی لامکانی فضا کی سیر کراتے ہیں اور جب حکیم مشرق زندگی کے کلام کی تکمیل کر چکنے کے بعد اقوامِ مشرق کو آخری پیغام دیتا ہے تو اس وقت اسی حکیم کی روح نزولِ سروش بنکر مژدۂ انقلاب لاتی ہے۔ یہ مولانا جلال الدین رومی ہی ہیں جو اقبال کی نظر میں کلیم بھی ہیں اور حکیم بھی، مجتہد بھی ہیں اور مصلح بھی، شاعر بھی ہیں اور ساحر بھی، ولی بھی ہیں اور مجذوب بھی۔ طریقت کے دشوار گذار راستوں کے راہبر بھی ہیں اور حقیقت کے مرحلوں کے ہادی بھی، شریعت کے نوامیس کے عقدہ کشا بھی ہیں، اور حکمت کے دقائق کے شارح بھی۔ غرض اقبال کے نزدیک ہماری "موجودہ کرم خوردہ" ملت کے تمام روحانی اور ذہنی امراض کو شفا بخشنے والا رومیؒ ہے جس کی تعلیمات کو اقبال نے اپنے افکار میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ استغراق اس درجہ ہے کہ اقبال اپنے آپ کو "مثیلِ رومی" قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عہدِ قدیم میں رومی ملت کے لئے پیغامِ حیات لائے تھے اور اس پر آشوب دورِ حاضر میں وہ خود اس کے مبلغ ہیں۔"

مرشدِ رومی حکیم پاک زاد ٭ سرِ مرگ و زندگی بر ما کشاد
زندگی گیر اسرار فقیری ٭ کہ آں فقر است محسودِ امیری (اقبال)

"وحدت الوجود" اور تصوفانہ مسائل کے متعلق مولانا میکش صاحب نے کچھ مدت گذری کہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب سے میری خط و کتابت شائع ہونے پر ایک مضمون لکھا تھا۔ علامہ صاحب نے اقبال اور اس کے مقاصد، بالخصوص تصوفانہ مسائل کے متعلق ایک حد تک مفید اور ابھی رائے کا اظہار فرمائی تھی مگر مجھے آپ کے چند الفاظ پر طالبِ علمانہ اظہار خیال کی ضرورت لگی ہوئی مگر مزید استفادہ کا موقع نہ ملا۔ اقبال کے تصوفانہ اور فلسفیانہ مسائل یا آپ کی فکر و نظر کو یکساں کرنے کی بجائے ہر مسئلہ کی بنیادی حیثیت اور نوعیت کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اقبال کی فکر و نظر میں "اہلِ عرفان و مشاہدات" کے "نکات و رموز" اور گوہرِ مقصود کو ذہنی عقل و ادراک میں محدود کرنا حقائق و معارف اقبال سے بڑی حد تک ناآشنائی کا ثبوت دینا ہے۔ "تعمیر نو یا کہن" کی بنیاد رکھتے ہوئے یہ فیصلہ بھی ضروری ہے کہ اقبال کی "تعمیرِ کہن یا نو" کے تعین میں کیا صورت رکھتی ہے اور کس طرح اسے اقبال ہی کے مفہوم و مقاصد کے لئے مستعمل کیا گیا ہے۔

"توحید وجودی" ہو یا ایسے دوسرے مسائل، ان کو اقبال نے "ارباب کشف و عرفان" ہی کے مشاہدات کا نتیجہ قرار دے کر ان سے اپنے خیالات کو جلا دی ہے۔ افسوس کہ ایسے خالص عرفانی مسائل کو صرف فلسفیانہ نکات کے دائرے میں فکر مغربی مفکرین کے تصورات پنتھی ازم (Pantheism) یا مسٹی سیزم (Mysticism) کے مطابق پیش کیا جاتا ہے۔ اقبال نے بھی اپنے پہلے دور میں اس امتیاز کو قائم نہ رکھ کر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے ان مسائل کو دیکھا اور سمجھایا لیکن اپنے آخری دور میں اپنے خیالات کے "انقلاب" کے اظہار سے اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ "فلسفۂ عجم" میں آپ نے صوفی مفکرین کے مسئلہ "توحید وجودی (وحدت الوجود)" کو سمجھانے کے لئے قرآن حکیم کی روشنی میں ان کے خیالات کا بھی "مرکزی نکتہ" بیان فرمایا ہے۔

گذشتہ دو تین سالوں میں مجھ فقیر حقیر پر تقصیر نے ملک کے مشہور فضلا اور اہلِ علم حضرات سے انہیں مسائل کے متعلق گفتگو کی سعادت حاصل کی ہے۔ ان شاء اللہ ان کوششوں کے مفید نتائج کا اظہار میری آئندہ مساعی سے ہوگا۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رئیس دار المصنفین اعظم گڑھ، مفکر سندھ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم، مولانا ماہر القادری، پروفیسر خواجہ عبدالحمید مصنف "اقبال کے چند جواہر ریزے" کرچی، شیخ عطاء اللہ صاحب پروفیسر معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، وغیرہم سے مبادلۂ افکار اسی سلسلے میں ہو چکا ہے۔ انہیں بزرگوں میں سے خاص طور پر میرے عزیز و محترم دوست جناب مولانا شاہ عبدالغنی صاحب قادری چشتی نیازی پروفیسر مارلین کالج ناگپور سے بھی کافی گفتگو کا موقع مجھے ملا ہے۔ میں نے اپنی خاموشانہ فضا میں رہ کر اقبال کے مختلف نظریات کو سمجھنے کے لئے کافی سعی کی۔ ہنوز میری تشنگی باقی ہے۔ شکر ہے کہ اب مولانا میکش ایسے بزرگ علم دوست بھی ان مسائل پر توجہ فرما رہے ہیں۔

(باقی آئندہ)

مضمون نگار حضرات مضمون صاف اور کاغذ کے ایک طرف تحریر فرمائیں

دُنیا کے دو سب سے بڑے کتب خانے

برطانوی عجائب خانے کا کتب خانہ

انگلستان کے بہت سے اداروں (مثلاً پارلیمنٹ اور بنک آف انگلینڈ) کی طرح برطانوی عجائب خانہ کا کتب خانہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ یہ کتب خانہ فرانس کے قومی کتب خانے سے دوسرے درجہ پر ہے لیکن دنیا کے دوسرے بڑے سے بڑے کتب خانوں میں ممتاز ہے۔ ملکیت اور انتظام کے لحاظ سے یہ ملحقی کتب خانہ ہے لیکن جو خدمت یہ کتب خانہ کر رہا ہے اس پر برطانیہ جتنا فخر کرے بجا ہوگا۔ اس میں عہد حجری سے لے کر موجودہ زمانے تک کی چیزیں موجود ہیں۔ ہڈی کے ٹکڑوں پر کھدی ہوئی تصویروں سے لے کر بڑے بڑے برطانوی مفکروں کے خطوط اور نجی کاغذات بھی ہیں اور قطب جنوبی کے کھوجیوں کا آخری روزنامچہ بھی ہے۔ غرض، یہ عجائب خانہ تاریخ اور قبل تاریخی آثار کا گراں بہا خزانہ ہے۔ کچھ لوگ تو اپنی عمریں اس کتب خانہ میں گذار دیتے ہیں اور کچھ گاہے ماہے آتے ہیں اور اس وسیع منبع علم سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں۔

اس ودیا مندر کی ابتدا ۱۷۵۳ء میں ہوئی۔ پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے وہ سب کتابیں، قلمی نسخے اور دیگر عجائب جو سر ہنس سلون نے اپنی وصیت کے ذریعہ قوم کے استعمال کے لئے چھوڑے تھے اس کتب خانے کو مل گئے۔ ۱۷۵۷ء میں جارج دوم نے انگلستان کے شاہی کتب خانے کی کتابیں اس کتب خانہ کو دے دیں۔ پہلے پہل عجائب خانہ اور کتب خانہ دونوں مانٹیگو ہاؤس میں تھے اور ۱۵ جنوری ۱۷۵۹ء کو اعلان کیا گیا یہ دونوں ہر خاص و عام کے لئے ہیں۔ جارج سوم، رائٹ آنریبل ٹامس گرینویل، ریورنڈ سی۔ ایم کریشروڈ اور سر جوزف بینکس نے بھی اپنی کتابیں اور قلمی نسخوں کے نادر اور کثیر ذخیرے اسی کتب خانہ کو دے دیے۔ کتب خانہ کی موجودہ عمارت کا افتتاح ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ دار المطالعہ کے گرداگرد لوہے کی الماریوں میں جن کی مجموعی لمبائی پچپن میل ہے کتابیں چنی ہوئی ہیں ۱۹۳۸ء میں کتابوں کی تعداد تخمیناً اکیالیس لاکھ تھی۔ جنوبی کنسنگٹن کا طبیعی تاریخ کا عجائب خانہ بھی اسی برطانوی عجائب خانہ کا جزو ہے۔

برطانوی عجائب خانے میں ہر دیس اور ہر زمانے کے آثار موجود ہیں لیکن یہ عجائب خانہ عتیق چیزوں کا محض انبار نہیں ہے بلکہ نگراں اہلکاروں نے ان نادرات کو اس سلیقہ سے ترتیب دی ہے کہ دنیا کی تاریخ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ دستاویزوں کے دیوان خانہ میں ہزاروں فرمان اور دستاویزوں کے پلندے موجود ہیں۔ پیپرس کے اوراق پر لکھی ہوئی یونانی اور لاطینی تحریروں سے ان قدیم قوموں کے جاننے میں بہت مدد ملتی ہے۔ عجائب خانہ میں کچھ پتھر بھی ہیں جن پر گلاب کے نقش بنائے ہوئے ہیں۔ یہ پتھر اسکندریہ سے لائے گئے تھے۔ ان پتھروں سے ماضی بعید کے کتبوں کا سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ دنیا کی قدیم ثقافت کے سمجھنے میں کتابوں، مخطوطات پیپرس اور کتبات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ عجائب خانہ میں بہت سی ایسی چیزیں بھی ہیں جن سے لوگوں کی سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال پہلے کی روزمرہ کی زندگی پر پوری روشنی پڑتی ہے مثلاً مکانات، کھلونوں، اوزاروں اور جواہرات کے چھوٹے چھوٹے ڈھانچے جو آج سے چھ ہزار سال پہلے مصر میں بنائے گئے تھے ہوا کو کے کھیلتے اور ناچتے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کی بنائی ہوئی مٹی کی مورتیاں ـــ ان چیزوں کی تاریخ میں جان پڑ جاتی ہے اور چھوٹے سے چھوٹے بچے بھی انہیں دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ ہر قسم کے لوگ۔ طالب علم، اہل قلم، تماشائی، عورتیں، بچے۔ اتوار کے دن عجائب خانہ کی گیلریوں میں گھومتے اور ماضی کے علمی اور ثقافتی آثار کا آسانی اور اطمینان سے معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ گذشتہ عالمگیر جنگ کے دوران میں یہ عجائب خانہ بند رہا کیونکہ یہ سب ذخیرے ویلز کے مختلف مقامات میں چھپا دئے گئے تھے۔ اب وہاں سے واپس لائے گئے ہیں۔ عجائب خانہ کے تہ دس میں ایک بم پھٹا تھا جس سے اس کی عمارت کو کچھ گزند پہنچا۔ لیکن اس کے ذخیرے سب صحیح و سالم ہیں اور اب عام لوگ ان سے استفادہ کر سکتے ہیں جو فنکار، سنگتراش اور اہل قلم لڑائی سے واپس آئے ہیں اب اس عجائب خانہ وہ پر لطف سکون حاصل کر سکتے ہیں جس کو وہ ترستے تھے۔

گربچن سنگھ

نیویارک کا پبلک کتب خانہ

نیویارک کی بہت سی شاندار عمارتوں میں اس کتب خانہ کی عمارت بھی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ میں عام لوگوں کے لئے ساڑھے چھ ہزار بڑے کتب خانے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کتب خانہ بھی ہے۔ اس کتب خانہ کا آغاز ۱۸۹۵ء میں ہوا۔ جب تین نجی کتب خانے ملا دیئے گئے۔ اب شہر نیویارک میں اس کتب خانہ کی اکسٹھ شاخیں ہیں۔ اس میں دنیا کی ہر بڑی زبان میں چھپی ہوئی پینتالیس لاکھ کتابیں ہیں صرف ہسپانوی کتابوں کی تعداد سات ہزار ہے۔ ان کے علاوہ چینی، ہالینڈ، فنلینڈ، فرانس، جرمنی، یونان، ہنگری، اطالیہ، ناروے، پولینڈ، رومانیہ اور سویڈن کی زبان کی کتابوں کے علاوہ عبرانی کتابیں بھی ہیں، پراگ کو چھوڑ کر چیکوسلوواکیہ کی کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ اسی کتب خانے میں ہے۔ پینتالیس لاکھ کتابیں الماریوں میں چنی ہوئی ہیں اور ان الماریوں کی کل لمبائی ستّر میل ہے۔ ہر الماری اور کتاب پر نمبر پڑے ہوئے ہیں
اس کتب خانہ میں سات سو لائبریرین اور کلرک ہیں۔ دس ہزار سے زیادہ لوگ روزانہ اس کتب خانے میں آتے ہیں۔

اس کتب خانے کے جنوب میں "برائنٹ پارک" ہے جہاں موسم گرما میں لوگ درختوں کے سائے اور کھلی ہوا میں مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کتب خانے میں دو نگار خانے ہیں جن میں منجملہ دیگر تصویروں کے، مشہور مصوروں رینالڈز، ریبورن، کوپلے، ٹرنر اور گلبرٹ سٹوارٹ کے فن کے نمونے ہیں۔ ایک بڑے کمرے میں تمام ملکوں کے بڑے بڑے نقشے لگے ہیں۔

اس کتب خانہ کا انتظام ڈائرکٹروں کے ایک بورڈ کے سپرد ہے جن کا تقرر چناؤ سے ہوتا ہے۔ اس بورڈ کے فرائض، کتب خانہ کی پالیسی اور عملہ سے متعلق قواعد و ضوابط ریاست نیویارک نے بذریعہ قانون معین و مرتب کر دیئے ہیں۔ کتب خانہ کا لائبریرین اس بورڈ کا ایگزیکیٹو افیسر ہے۔

معمولی کتابیں دو ہفتے کے لئے دی جاتی ہیں اور مقررہ میعاد کے اندر واپس نہ کرنے پر روزانہ جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔ نئی کتابوں کا چناؤ خود بورڈ بھی کرتا ہے لیکن یہ کام عام طور پر لائبریرین سے متعلق ہے۔

(فارین ریویو سے ماخوذ)

نواب مرزا

افسانہ

بھیم شنکر پروانہ

نواب مرزا سے میری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ پہلے پہل کالج ہوسٹل میں داخل ہوئے تھے۔ مرزا کے والد ایک اچھے رئیس اور زمیندار تھے۔ تحصیل فتح آباد ضلع لکھنؤ میں ان کی زمینداری تھی۔ باپ کو اس بات کی بڑی حسرت تھی کہ بیٹا کسی طرح انگریزی پڑھ کر کلکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کے قابل ہو جائے۔ بی۔ اے۔ ایم۔ اے کرانے کی انہیں خواہش نہ تھی۔ اور مرزا صاحب نے بھی باپ کے اس حکم کو خیال میں رکھ کر ہی کالج میں قدم رکھے تھے۔ انہیں درجہ پاس کرنے کی بالکل پروا نہ تھی۔ خدا نے سب کچھ دے رکھا تھا۔ نوکری تو کرنی نہ تھی پھر مرزا صاحب جھوٹے دکھاوے کی فکر کیوں کرتے۔ ہاں ادھر ادھر بیٹھ کر سوسائٹی والا بننا تھا۔ اور سوسائٹی والے کام کے لئے خدا کے فضل سے ہم لوگوں کا کالج سب کالجوں سے بڑھا چڑھا تھا۔

اسے خاندانی وراثت سمجھئے یا کچھ بھی خیال فرمائیے مرزا صاحب انتہا درجہ کے باتونی تھے۔ اگر باتونی ہی ہوتے تو غنیمت تھا۔ مرزا صاحب باتونی ہونے کے ساتھ ساتھ بے سر و پا کی اڑانے کے بھی عادی تھے۔ اور بے سر و پا کی اڑانے کی وجہ سے اکثر بیوقوف بھی بنائے جاتے تھے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے مرزا صاحب کو خوب سوجھی۔ فرمانے لگے "بھئی یہ ہوسٹل کے نوکر بھی کمبخت کس قدر بدذات ہیں۔ ابھی حال ہی میں نئی اچکن بنوائی تھی۔ کھونٹی پر ٹنگی دیکھی تو وہ رمضانی کہنے لگا مرزا صاحب یہ اچکن کس قدر نفیس ہے۔ یہ تو بیاہ میں دولہا کے پہننے کے لائق ہے۔" میں سمجھ گیا میاں کی شادی جو ہونے والی ہے اسی سے نیت بگڑی ہے۔ فوراً کھونٹی سے اتار کر اس کے حوالے کر دی۔

ہم لوگ جانتے تھے کہ مرزا بے سر و پا کی ہانک رہے ہیں۔ گھر کے رئیس کتنے بھی ہوں، پر یہی بھی تو بہت خسیس۔ بھلا نوکر کو نئی اچکن کیوں دینے لگے۔ میں نے مرزا کو آڑے ہاتھوں لیا۔ کہا: "مرزا یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہوئی۔ جب پہلے پہل میں آیا تو اپنا نیا پانچسو روپیہ کا سوٹ جسے لندن سے اسپیشل آرڈر کر کے منگایا تھا اتار کر رکھ دیا۔ کمبخت فراش کی نظر اس پر پڑ گئی۔ پھر کیا تھا جان بوجھ کر اس نے اس پر دو قطرے روشنائی کے دوات سے گرا دئے۔ بھلا بتلائیے پھر وہ سوٹ میرے کس کام کا رہ گیا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس کمبخت کی میں اچھی طرح خبر لیتا۔ مگر اس کے حال پر رحم فرما کر میں نے وہ سوٹ اسی کو بخش دیا کیونکہ مرزا صاحب آپ جانتے ہیں جن کپڑوں پر روشنائی کے داغ پڑ جائیں وہ پھر ہم لوگوں کے پہننے کے لائق تو رہتے نہیں۔"

"بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ ہم لوگوں کے کس کام کے وہ داغدار کپڑے۔" سب یار لوگ کہہ اٹھے۔ اور پھر قہقہہ مار کر اس زور سے ہنسے کہ مرزا صاحب جھینپ گئے۔

ایک بار مرزا صاحب گھر گئے۔ گھر سے لوٹتے وقت بہت اچھا قسم کا حلوا جس میں بہت سی مقوی چیزیں پڑی ہوئی تھیں، اور جو گھی میوے اور انڈے ڈال کر بنایا گیا تھا، اپنے ساتھ لائے۔ حلوے کو حضرت کپڑے والے صندوق میں بند کر کے اس لئے لائے کہ کہیں اس کی خوشبو اڑ کر ہم لوگوں کی ناک میں نہ پہنچ جائے، اور اس حلوے کی خیریت نہ رہے۔ جب کوئی اپنے گھر سے کوئی اچھی چیز لاتا تو باقاعدہ وہ میس میں چن دی جاتی اور ہم سب بیٹھ کر اسے برابر برابر بانٹ کھاتے۔ اور اگر کوئی ہم لوگوں سے چرا کر چیزیں کھانے کی کوشش کرتا تو پھر اس کی خیر نہ تھی۔ یہی حال بیچارے مرزا کا بھی ہوا۔ صندوق میں بند کر کے وہ حلوا اس بیچارے نے رکھا مگر ہمارے جاسوس بھی کم نہ تھے پتہ چل گیا۔ اور پھر حلوا وہاں سے غائب ہو کر ہم لوگوں کے پیٹ میں پہنچ گیا۔ اور مرزا تاکتے رہ گئے۔ بعد کو لوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ سینکڑوں گالیاں دیتے تھے۔ مگر اس کی پروا کسے تھی۔ منہ پر کہنے کی ہمت انہیں نہیں تھی، کیونکہ برابر ہم لوگوں کے گھر کی سوغاتوں میں حصہ دار بن چکے تھے۔ پھر کہتے کیا۔ ہاں جب نظریں چار ہوتی تھیں تو کھسیانے سے نظر آتے تھے۔ یہ دوسرا سبق تھا، جو مرزا کو ہم لوگوں نے پڑھایا۔

ایک دن مرزا صاحب ذرا مزے میں آئے۔ فرمانے لگے: "بھئی شہر میں گھومنا محال ہو رہا ہے۔ کوئی سواری ہوتی تو مزا رہتا۔ گھر سے چلتے وقت والد کا ارادہ تھا کہ ایک کار ساتھ کر دیں۔ مگر پھر خیال ہوا کہ کہیں کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا تو خاصی مصیبت رہے گی۔ یہی سوچ کر میں نے کار رکھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔"

مرزا صاحب نے یہ بات ہم لوگوں پر رعب گانٹھنے کو کہی تھی۔ منشا یہ تھی کہ ہم لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کے گھر پر کار بھی ہے۔ مگر ہم لوگ مرزا صاحب سے دو قدم آگے تھے۔ ایک صاحب نے فرمایا "کیوں مرزا صاحب آپ کے گھر کتنی کاریں ہیں۔"

"ایک والد کے پاس ہے ایک چچا جان کے پاس۔"

"بس دو۔"

مرزا ذرا چونکے۔ بولے: "ہاں صاحب ارادہ ایک اور لینے کا

تھا۔ مگر جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا تھا فی الحال معاملہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔"

انھیں صاحب نے ارشاد کیا: "مرزا صاحب بالکل ٹھیک کیا۔ کار بہت بری چیز ہے۔ میرے گھر پر آٹھ موٹریں تھیں۔ دو والد کی، دو والدہ کی، دو چچا کی، اور دو چچی کی۔ ان سب موٹروں کے لئے ایک بڑا بھاری گیرج بنا ہوا تھا اس میں یہ سب موٹریں رہا کرتی تھیں۔ ایک بار میں کھیلتا کھیلتا اس گیرج کے پاس پہنچ گیا۔ شب برات کا دن تھا۔ میں نے جو ایک سُرسُری چھوڑی تو وہ سیدھی گیرج کی طرف بھاگی۔ گیرج تھا کھلا ہوا، اُس میں پیٹرول ڈالا جا رہا تھا۔ بس وہ سرسری جو اس پیٹرول سے ٹکرائی تو بس کہرام مچ گیا۔ میں بھاگ کر ماں کی گود میں جا چھپا۔ اور وہاں جو آگ لگی تو سارا موٹر خانہ جل کر خاک ہو گیا۔ اور موٹریں تو راکھ ہو ہی گئیں۔ اس کے بعد جو ہوا تیز چلی تو وہ راکھ بھی اڑ کر نہ معلوم کدھر گئی۔ اب نہ وہ موٹر خانہ ہے، نہ موٹریں۔ خیریت اتنی ہوئی کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا، اور میں یہ واقعہ سنانے کے لئے زندہ رہ گیا۔"

سب لوگوں نے اس پر اتنا اظہارِ افسوس کیا، اور مرزا صاحب کو موٹر ساتھ نہ رکھنے کی اتنی تائید کی کہ مرزا صاحب اپنے جھینپ کے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

مرزا صاحب کو ہم لوگوں نے اتنے سبق سکھائے اور اتنا بنایا کہ رفتہ رفتہ انھوں نے دون کی ہانکنا چھوڑ دیا۔ بے سر پیر کی اب بھی اڑاتے مگر ذرا ہوشیاری کے ساتھ، یہ دیکھ کر کہ کوئی خاص آدمی ان کو الو بنانے والا تو نہیں بیٹھا ہے۔ ایک بات اور ہوئی۔ مرزا صاحب اب ہم لوگوں سے دور دور رہنے لگے۔ شام کو ہم لوگ دیکھتے کہ مرزا صاحب فرسٹ کلاس سوٹ پہن کر گھومنے چلے جاتے ہیں۔ پتہ لگانے پر معلوم ہوا کہ ہمارے ہوسٹل سے تھوڑی دور پر جو گرلس ہوسٹل ہے آپ اسی کا چکر کاٹا کرتے ہیں۔ کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے یا نہ دیکھے مگر مرزا صاحب کٹے پتنگ کی طرح ادھر ادھر چکر کاٹتے ضرور نظر آتے۔ بس پھر کیا تھا کمیٹی بیٹھ گئی اور اسکیمیں بننے لگیں۔ مرزا صاحب کے رومان کو کس طرح زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنایا جائے اسکی ترکیبیں کی جانے لگیں۔

ایک دن مرزا صاحب کو ایک خط لکھا گیا۔ مضمون یہ تھا۔

مائی ڈیر

تمہیں دیکھ کر دل ہاتھ سے جا تا رہا ہے۔ حد بےقرار ہوں۔ آج ٹھیک چھ بجے شام کو گرلس ہوسٹل سے ملے ہوئے پارک میں ملنا، وہیں جہاں بینچ پڑی رہتی ہے۔ مولسری کے درخت کی آڑ میں۔ دیکھو بھولنا نہیں ٹھیک چھ بجے۔

... تمہاری کوئی

خط، لکھنے کے بعد ڈاک میں ڈال دیا گیا۔ اور وہ وقت سے مرزا کو مل گیا۔ خط کی لکھاوٹ سے اور اس کے مضمون سے مرزا صاحب کے اگر دماغ ہوتا تو وہ سمجھ لیتے کہ یہ سب ان کے بنانے کی ترکیب ہے۔ بھلا سوچئے کہ کسی لڑکی کو ان کا نام اور پتہ کیسے معلوم ہوا جو اس نے انھیں اس قسم کا خط لکھا۔ اور پھر مرزا صاحب ایسے کہاں کے بڑے حسین تھے کہ کوئی حسینہ ان پر فدا ہو جاتی۔ مگر یہ سب باتیں تو ہیں سمجھداروں کے لئے۔

ہم لوگ خوب جانتے تھے کہ خط دیکھتے ہی مرزا سب کچھ بھول کر اس حسینہ سے ملنے کی چاہ میں پڑ جائیں گے۔ انھیں تو آجکل رومان کی سوجھ رہی ہے۔ بس کسی سوسائٹی گرل کو اپنانا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس اتنا دماغ کہاں کہ وہ اس خط کی باریکیوں پر نظر ڈالیں۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ دیکھا مرزا صاحب چار بجے ہی غسل خانہ میں داخل ہیں۔ خوب نہا دھو کر اچھے سے اچھا کریم پاؤڈر وغیرہ لگا کر بن سنور رہے ہیں۔ فرسٹ کلاس سوٹ آئینہ میں دیکھ دیکھ کر پہنا جا رہا ہے۔ ادھر مرزا صاحب کی یہ تیاری ہو رہی تھی، ادھر ہم لوگ اپنے داؤں پیچ میں لگے ہوئے تھے۔ کسی طرح مرزا صاحب کو پریشان کرنا تھا۔

معلوم ہوا کہ اب مرزا صاحب کمرہ سے نکلنے ہی والے ہیں۔ بس، ہم میں سے ایک ان کے کمرہ میں جا پہنچا۔ کئی مہینوں سے مرزا صاحب نے ہمارے ہوسٹل یونین کا چندہ نہیں دیا تھا اور نہ دینے کی ان کی نیت ہی معلوم پڑتی تھی۔ اب مرزا صاحب سے اس چندے کے بارے میں بحث چھڑ گئی۔ دھیرے دھیرے چار اور بھی جا دھمکے۔ یونین سے فائدہ ہے یا نہیں، اس پر بحث شروع ہو گئی۔ دو ایک مرزا کی طرفداری کرنے لگے، دو ایک ان کے خلاف بکنے لگے۔

ادھر گھڑی میں چھ بج گئے۔ مرزا صاحب گھڑی دیکھ کر گھبرائے جھٹ پٹ چندہ ادا کر دینا چاہا۔ مگر ہم لوگوں میں جو صاحب مرزا کی طرف سے بول رہے تھے انھوں نے مرزا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولے: "پہلے طے ہو جانے دو یہ معاملہ۔ چندے کی کوئی بات نہیں۔ معاملہ اصول کا ہے۔"

مرزا صاحب نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح وہاں سے نکل جائیں، مگر اس دن سات بجے سے پہلے انھیں نجات نہ ملی۔ آخر معاملہ طے ہوا۔ مرزا صاحب نے چندہ دیا اور سیدھے گرلس ہوسٹل کی طرف بھاگے۔

بھوت کی طرح ہم لوگ بھی مرزا صاحب کے آگے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ جب مرزا صاحب اس جگہ پہنچے تو بینچ پر بیٹھ کر انھوں نے دیکھا کہ مولسری کے پیڑ کی ایک ڈال میں ایک خوبصورت ریشمی رومال بندھا ہوا ہے۔ لپک کر مرزا صاحب نے اس رومال کو اتارا۔ اس میں ایک کاغذ بندھا تھا پنسل سے اس پر لکھا تھا۔

مائی ڈیر

اتنی دیر تک تمہارا راستہ دیکھا۔ اب ہوسٹل جا رہی ہوں۔ ہائے ظالم، تجھے کسی کی کیا خبر۔ میری نشانی یہ رومال رکھ لینا اور اپنی کوئی نشانی چھوڑ دینا۔ اسی جگہ کل رات کاٹوں گی۔ تمہاری کوئی۔

مرزا صاحب نے خط آنکھوں سے لگایا، اور رومال کو چومنے لگے۔ اس کے بعد اپنا پارکر فاؤنٹین پن ایک کاغذ میں لپیٹ کر مولسری کے ایک کھوکھلے تنے میں رکھ کر وہاں سے چلتے بنے۔

ان کے جاتے ہی وہ قلم ہمارے قبضہ میں آگیا۔ ہمارے جاسوس نے لاکر اسے ہمیں دے دیا اور مرزا صاحب کی ساری حرکتیں سنائیں۔ سن کر مارے ہنسی کے سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اور ادھر مرزا صاحب اپنے کمرہ کا دروازہ بند کر کے آہ بھر رہے تھے، اور اس رومال کو ہاتھ میں لے کر اور بار بار آنکھوں سے لگا کر اس کا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ سارے ہوسٹل میں یہ خبر پھیل چکی تھی۔ مگر مرزا صاحب کو اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ اپنے "رومان" اور محبت میں اتنے گہرے ڈوبے ہوئے تھے کہ ان کی آنکھ، کان، ناک، منہ سب نے انہیں جواب دے رکھا تھا۔ اس وقت وہ مجسم پورے مجنون بنے ہوئے تھے۔ مگر کس کے، یہ انہیں خود بھی معلوم نہ تھا۔ مزیدار بات یہ تھی کہ مرزا کے بیوقوف بننے سے کتنوں کی تفریح طبع کا سامان ہو رہا تھا۔ کالج کی زندگی کا مزا ہی اس میں ہے۔

مرزا صاحب نے دوسرے روز اپنے ایک دوست سے کہا: "بھائی آج میں کالج نہ جا سکوں گا۔"

دوست نے پوچھا: "کیوں۔ خیریت تو ہے؟"

"ایسے ہی کچھ بازار میں خریداری کرنا ہے۔"

"تو شام کو بازار چلے جانا۔ پڑھائی کا کیوں نقصان کرو گے؟"

"نہیں، کچھ ایسا ہی سامان لینا ہے۔ شام کو ٹھیک نہیں رہے گا۔"

"آخر کیا خرید و گے؟"

"ایک بنارسی ساڑی لوں گا۔"

"بنارسی ساڑی۔ کس خوش نصیب کو وہ تحفہ دیا جائے گا؟"

"توبہ توبہ۔ آپ کا بھی کیا خیال ہے۔ آپ جانتے ہیں، میں ایسی خرافات میں نہیں پڑتا۔ بھئی عید آ رہی ہے۔ گھر جانا ہو گا۔ ہمشیرہ کے لئے ایک اچھی سی ساڑی لے جانے کی سوچ رہا ہوں۔"

"اوہ۔ تو آپ اپنی بہن کے لئے کچھ لے جانا چاہتے ہیں۔ معاف کیجیے مجھے معلوم نہیں تھا۔ ضرور ساڑی خریدیئے۔ بیچاری بہن راہ دیکھتی ہو گی کہ بھائی جان آئیں گے تو کچھ ضرور لائیں گے۔ پھر عید کا موقع ٹھہرا۔"

"جی ہاں۔ اسی سے تو ارادہ ہے کہ ابھی روپے پاس ہی میں خرید لوں۔ پھر نہ جانے کدھر اٹھ جائیں۔"

"تو، مرزا جی، چلوں، خریدوا دوں؟"

"خاہ مخواہ تکلیف کرو گے"

اس کے بعد مرزا اور ان کے دوست مشفق ساڑی خریدنے بازار روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت وہ ساری کہانی ہم لوگوں کو بتلاتے گئے۔ یہ تو ہم سمجھ ہی گئے کہ مرزا اپنی کون سی ہمشیرہ کے لئے وہ ساڑی خریدنے جا رہے ہیں۔

مرزا صاحب کے دوست نے اس دن مرزا صاحب کو خوب پریشان کیا۔ ایک بازار سے دوسرے بازار اور دوسرے سے تیسرے بازار انھیں لئے لئے پھرے۔ ایک فرضی دوکان والے کا نام گھڑ لیا اور ہر بازار میں پوچھتے پھرے۔ "بھائی، جھنڈو مل پنو لال بنارسی ساڑی والے کی دوکان کہاں ہے؟"

اب اس نام کی کوئی دوکان ہو تو پتہ چلے۔ مرزا صاحب کہتے: "بھئی، دام نقد دینا ہیں۔ کسی دوکان سے بھی لے لو۔"

اور ان کے دوست فرماتے: "پھر مجھے آپ لائے ہی کیوں۔ اس دفعہ فلاں صاحب اسی دوکان سے ساڑی لے گئے ہیں، نہایت عمدہ اور بہت سستی۔ میرے رہتے تو آپ روپیہ برباد کر نہیں سکتے۔ اچھی سے اچھی چیز اور اچھی سے اچھی دوکان سے لینی ہو گی۔"

مرزا صاحب چپ ہو جاتے۔

جیسا کہ ہم لوگوں نے پٹی پڑھا رکھی تھی، منشا کسی طرح مرزا صاحب کو بازار میں گھماتے رہنا تھا کہ کسی صورت سے ملاقات کا وقت گزر جائے۔ اور اس کام کو وہ بڑی خوبی سے نباہ رہے تھے۔

خیر، بڑی محنت کے بعد مرزا صاحب ایک نایاب ساڑی سو روپیہ کی لے کر ساڑھے پانچ بجے شام کو واپس آئے۔ صرف آدھ گھنٹہ چھ بجنے میں باقی رہ گیا تھا۔ اس سے مرزا صاحب ابھی بے تاب ہو رہے تھے۔ آج ہم سب لوگ بھی وہاں سے ہٹ گئے کہ مرزا کو کسی قسم کا شبہہ نہ ہو جائے۔

اب مرزا صاحب جیب سے چابی نکال کر تالے میں لگا رہے ہیں مگر کمبخت تالا کھلتا ہی نہیں۔ ہم لوگوں نے اس کی ترکیب پہلے سے ہی کر دی تھی۔ سیسہ گلا کر تالے کے سوراخ میں بھر دیا تھا۔ اب تو کنجی اس تالے کے لئے بیکار تھی۔ بیچارے مرزا تالا کھولتے کھولتے عاجز آ گئے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

ادھر ہم لوگ اپنے کمرہ میں بیٹھے بیٹھے مرزا کے پسینے پسینے ہونے کا مزہ لے رہے تھے۔ آخر محبت کرنا خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں۔ خون پسینہ ایک کرنا ہوتا ہے۔ اور یہاں سچ مچ مرزا صاحب کا خون پسینہ ایک ہو رہا تھا۔ جب گھڑی کی سوئی سوا چھ پر پہنچ گئی اور مرزا ناامید ہو گئے تب ہم لوگ اپنے کمرہ سے نکلے اور مرزا کی خیریت پوچھنے لگے۔ آخر تالا توڑا گیا۔ مرزا صاحب کمرہ میں داخل ہوئے۔ ہاتھ منہ دھو کر، سوٹ بدل کر، اور ہمشیرہ کے لئے لائی ہوئی ساڑی بغل میں دبا کر، ادھر ادھر چور کی طرح نظر ڈالتے ہوئے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے، وہ اپنے رومان والے اڈے کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر آج بھی ہونے سے پہلے پہنچ کر

غرضیکہ جس طرح اس دن پچاس روپیہ کا پارکر فاؤنٹین پین ہمارے ہاتھ لگا تھا اسی طرح آج سو روپیہ کی ساڑی بھی ہمارے ہاتھ آ گئی۔

اب ہم لوگوں کی کمیٹی میں یہ پاس ہوا کہ اس طرح تو مرزا بالکل تباہ ہو جائے اب یہ مذاق ختم کیا جائے اور اس کھیل کا آخری پردہ گرا دیا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز ہی اس کی نوبت بھی آ گئی۔

ہوسٹل یونین کی طرف سے کالج میں ایک "انٹر کالج ڈبیٹ" ہوا کرتا تھا۔ اس ڈبیٹ میں گرلس کالج کی لڑکیاں بھی "پارٹ" لیا کرتی تھیں۔ وہ مگر دن "ڈبیٹ" تھا۔ کالج ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ "ڈبیٹ" ہونے لگا۔ مرزا صاحب سب سے آگے بیٹھے ہوئے "ڈبیٹ" میں آئی ہوئی لڑکیوں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی خیالی معشوقہ کا تصور کر رہے ہوں۔ سوچ رہے ہوں کہ شاید ان کی منظور نظر بھی ان کی نذر کی ہوئی ساڑی پہنے اور بڑھیا پارکر فاؤنٹین پین لگائے مسکراتی، اٹھلاتی چلی آ رہی ہو۔

ادھر ہماری دوسری اسکیم چل رہی تھی جس کی مرزا صاحب کو کانوں کان خبر نہ تھی۔

ڈبیٹ ختم ہوا۔ انعامات دئے جانے لگے۔ ہماری یونین کے سکریٹری نے یونین کی طرف سے، اول نمبر آنے والی مناکشی دیوی کے لئے بطور تحفہ ایک خوبصورت ساڑی نذر کی۔ اور دوسرا تحفہ، ایک خوبصورت پارکر فاؤنٹین پین مس زیب النسا قادری کو نذر کیا گیا۔ ساڑی اور فاؤنٹین پین کی نمائش کی گئی۔ سارا ہال دیکھنے والوں کے تعریفی نعروں سے گونج اٹھا۔

لوگوں نے دیکھا، مرزا صاحب کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ اس وقت تو وہ ان حسینوں کی طرف دیکھ کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا رہے تھے، اور نعرہائے مسرت سے اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ اس کے بعد پھر مرزا صاحب کو کسی گرلس ہوسٹل کے گرد چکر کاٹتے نہیں دیکھا۔ کچھ کھو کر سیکھنا شاید اسی کو کہتے ہیں۔

تلخی

کونسی رات تھی جو اشک بہائے نہ کٹی ٭ کونسا دن غم فرقت میں گزارا نہ گیا
کب تبسم مرا اشکوں سے سنوارا نہ گیا ٭ ابر رحمت سے بھی قسمت کی سیاہی نہ چھٹی

٭

آسماں چاند ستاروں سے سنورتا ہی رہا ٭ ڈھل سکا پھر بھی نہ تاریک خلاؤں سا لباس
بن نہائی کی تصویر حسین دلدار ٭ نور ہر ذرۂ عالم پہ بکھرتا ہی رہا

٭

چین بھی لیتا ہے تب مجھ سے اگر غم اپنا ٭ تیرے غم کے سوا غم ہائے دگر اور بھی ہیں
منظر درد بھی محتاج نظر اور بھی ہیں ٭ اتنی محدود نہیں میرے دکھوں کی دنیا

٭

غم سے تپتے ہوئے لمحات جوانی کی قسم ٭ چاندنی موسم گل بزم ہوا کچھ بھی نہیں
نغمہ و ساز مئے ہوش ربا، کچھ بھی نہیں ٭ موت اور خون کے دریا کی روانی کی قسم

٭

ذہن میں بنتے ہیں جنت کے نرالے نقشے ٭ دوزخیں ناچنے لگتی ہیں ان ایوانوں میں
اہرمن کھینچتا ہے جنگ کے میدانوں میں ٭ خون میں ڈوبنے لگتے ہیں سنہری سپنے

٭

قیصری بھینٹ لیا کرتی ہے انسانوں کی ٭ جال پھیلائے ہوئے آہنی دستوروں کا
خسروی خون بہا کرتی ہے مجبوروں کا ٭ کس قدر تلخ حقیقت ہے ان افسانوں کی

٭

نکہت نسیم

عورت!

نعیمہ سلطان بیگم

اس جہاں میں زندگی تیری ہے ننگ زندگی
تیری دنیا ایک مسلسل خواب بے تعبیر ہے
گر مجھے اتنی اجازت ہو تو پوچھوں ایک بات
تیری دنیا میں وہ معبود، وہ مسجود وہ خدا
خود ہی گھڑ بیٹھی ہے تو اپنا وقار و احترام
تو اسی کو سوچتی ہے اک کمال لازوال

تیری ہستی بار ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جوش حرارت کے سوا کچھ بھی نہیں
تجھ میں کیا خوبی نزاکت کے سوا کچھ بھی نہیں
اس کی دنیا میں تو عورت کے سوا کچھ بھی نہیں
تیری دنیا اب اطاعت کے سوا کچھ بھی نہیں
تیری نظروں میں یہ ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں

ڈالتی ہے بزدلی پر کیوں نقاب شرم تو
یہ حیا فقدان جرأت کے سوا کچھ بھی نہیں

علیگڑھ کے بکسوؤں کی صنعت پر ایک اجمالی نظر

سعد احمد و اعتقاد الدین

دنیا کی موجودہ اعلیٰ ترقی یافتہ مرکباتی پیداوار اور تجارتی تنظیم کے دور میں عملی تعلیم کتابی تعلیم کے دوش بدوش نہایت مفید اور ضروری ہے۔ ہندوستان میں طلبائے کومرس کو عملی تعلیم کے وہ مواقع میسر نہیں ہیں جو امریکہ اور انگلستان جیسے اعلیٰ صنعتی ترقی یافتہ ممالک میں عام ہیں۔ عملی تعلیم کو ہمارے نظام تعلیم میں یقیناً نمایاں اور مستقل جگہ ملنی چاہئے کیونکہ اول الذکر سے ہماری قوت تخیل اور ادراک پر وہ پائیدار اثر ہوتا ہے جو محض قیاسی تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بجا طور پر کہا گیا ہے کہ "عملی تعلیم ایک روٹی اور کتابی تعلیم ایک لویا عقیلہ افادہ مساوی ہیں"۔ ہم طلبائے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ محترم ایس۔ ایم شفیع صاحب (صدر شعبۂ کومرس) جیسے ہمدرد استاد کو پاکر خوش نصیب ہیں جو طلباء کی تعلیم کے عملی پہلو پر زور دینے کے زیادہ قائل ہیں تاکہ طلباء کو محض کومرس کی کتابوں کے حافظ ہونے سے محفوظ رہ سکیں۔

۲ر نومبر ۱۹۴۵ء کو ہمیں (طلبائے بی کوم کلاس) علیم اینڈ سنس علیگڑھ کے کارخانہ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اب سے پیشتر یہ تالوں کا کارخانہ تھا لیکن موجودہ جنگ کی مسلسل مانگ کی بنا پر اس کارخانہ میں بجائے قفلوں کے بکسوئے بنائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں علیگڑھ میں تقریباً پندرہ کارخانے اور ہیں جن میں یہی کام ہوتا ہے۔ کارخانوں کے علاوہ لوگ اپنے گھروں پر بھی بکسوئے کے کام کو کرتے ہیں۔ عورتیں اور لڑکیاں بھی اس کام میں مدد دیتی ہیں۔ معمولی کام مثلاً تار کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹنا اور بکسوؤں میں تار کے پن لگانا یہ کام عورتیں آسانی سے کر لیتی ہیں۔ ذیل میں ان بکسوؤں کے بنانے اور تیار کرنے کے تدریجی طریقہ کو مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) پیداوار خام

الومونیم، پیتل، جست اور لوہا وہ ضروری فلزات ہیں جو اس صنعت کے قیام میں درکار ہوتی ہیں۔ پیتل کی چادروں کی درآمد ریواڑی اور جگادھری (پنجاب) اور آہنی چادروں کی درآمد بمبئی سے ہوتی ہے۔ جنگ سے پیشتر الومونیم انگلستان سے دستیاب ہوتا تھا لیکن دوران جنگ کی مشکلات کی بنا پر اس کی ساخت اندرون ہند میں ہی ہونے لگی ہے چنانچہ اب الومونیم دہلی سے بھی مل سکتا ہے۔

(۲) طریق ساخت

پیتل، آہنی پیتل اور لوہے کی طویل چادروں کی قطع و برید چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں مشینوں کے ذریعہ کر لی جاتی ہے۔ بعد ازاں ان پتیوں کی چھدائی ہوتی ہے۔ سوراخ ہونے کے بعد ان پتیوں کو بکسوؤں کی شکل میں منتقل کیا جاتا ہے۔ جب یہ پتیاں بکسوؤں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو ان میں مضبوط تار کے پن لگائے جاتے ہیں۔ ان تمام کاموں میں تقریباً آٹھ یا دس مشینیں درکار ہوتی ہیں۔ بعض مشینیں قطع و برید کے کام میں لائی جاتی ہیں اور دوسری چیزوں کو بکسوئے کی شکل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منتقل کرنے کے کام میں آتی ہیں۔ آخر میں ملمع کرنے کی غرض سے ان کو نکل پلانٹ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ملمع کا طریقہ حسب ذیل ہے۔

سب سے پہلے ان بکسوؤں کو بدرپور کی مٹی کے ساتھ ایک ڈھول میں ڈال کر برقی قوت سے گھمایا جاتا ہے اس طریق عمل سے بکسوؤں کی زمین کو ہموار کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں ان کو شفاف پانی میں دھو کر لکڑی کے برادہ میں خشک کیا جاتا ہے جب بکسوئے سوکھ جاتے ہیں تو ان کو ایک اور ڈھول میں جو چمڑے کی کترنوں سے پر ہوتا ہے قلعی کرنے کی غرض سے ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد تیسرے روزن شدہ ڈھول میں ان بکسوؤں کو ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ ڈھول ایک پر آب حوض میں جس میں ریٹھا اور سوڈا کا نمک حل کیا ہوا ہوتا ہے برقی قوت سے گھومتا ہے اور اس عمل سے چمڑے کی کترنوں سے پیدا شدہ چکناہٹ کو دور کیا جاتا ہے۔ ان بکسوؤں کو دوبارہ صاف پانی سے دھو کر چوتھے ڈھول میں جس میں سوراخ ہوتے ہیں ملمع ہونے کے لئے ڈال دیتے ہیں۔ جس حوض میں یہ ڈھول گھومتا ہے اس میں امونیکل سالٹ حل کیا ہوتا ہے اور نکل پلیٹس اس پانی میں ٹانگے جاتے ہیں۔ ملمع ہونے کے بعد بکسوؤں کو صاف پانی میں دھو کر پانچویں ڈھول میں جس میں لکڑی کا برادہ بھرا ہوتا ہے خشک کرنے کے لئے ڈال دیتے ہیں اور اس طرح بکسوئے استعمال کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔

(۳) تقسیم عمل

تقسیم عمل موجودہ صنعت و حرفت کا سب سے

اہم جزو ہے۔ بکسوؤں کی صنعت میں بھی ہر کاریگر کو جدا جدا عمل سپرد کر دیا جاتا ہے۔ کسی مزدور کو چادر کے کاٹنے میں اور کسی کو چھوٹی چھوٹی پتیاں بنانے میں اور کسی کو ان پتیوں کو بکسوؤں کی شکل میں منتقل کرنے میں لگا دیا جاتا ہے۔ ایک یوم میں ایک مزدور مشین کی مدد سے تقریباً ۱۲۰۰۰ چھوٹی چھوٹی پتیوں کو بکسوؤں کی شکل میں منتقل کر دیتا ہے۔ دوسرے طریق میں تقریباً تین من بکسوے دس گھنٹے میں قلعی کئے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک تحقیق ہو سکی علیگڑھ کے کارخانوں میں تقریباً ایک ہزار روپے یومیہ کی قیمت کے بکسوے تیار ہو جاتے ہیں ملمع کے کام میں دو یا تین آدمی درکار ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ تمام کام برقی قوت کی امداد سے کئے جاتے ہیں اس لئے بہت جلدی پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔ اور دستی محنت کو اس میں کوئی خاص دخل نہیں ہوتا۔ اس طریق میں مزدور کا کام محض ڈھول کو بکسوؤں سے بھرنا اور اس کو مشین میں لگا کر بجلی سے چلا دینا ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل قلعی وغیرہ کے کام میں انسانی محنت درکار ہوتی تھی لیکن زمانۂ جنگ میں میسرز کیٹنگ اینڈ کمپنی برمنگھم نے بیرل سسٹم کے ذریعہ ملمع کاری کا طریقہ روشناس کرایا۔

(۴) بازار کی وسعت

بکسوؤں کے لئے بڑے وسیع بازار موجود ہیں۔ پیٹیوں، گھڑیوں کے تسمے اور فیتے اور مختلف قسم کی دوسری چیزوں میں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنگ سے پیشتر علیگڑھ کے بکسوؤں کی درآمد برما میں بھی ہوتی تھی۔ اگرچہ آجکل تمام ہندوستان میں ان کی مانگ ہے لیکن علیگڑھ کے ان کارخانوں کی سالانہ مصنوعات کا بیشتر حصہ کلکتہ، بمبئی، مدراس، کانپور اور آگرہ چلا جاتا ہے جہاں ہندوستان کے چمڑے کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔

(۵) اجرت

عاملین پیدائش میں محنت بھی ایک عامل ہے اور دوسرے عاملین کی طرح یہ عامل بھی اپنے صلہ کا مستحق ہے۔ اس کارخانے میں اجرت مزدور کی کارکردگی کے مطابق دیجاتی ہے۔ لڑکے اور مرد جو غیر بھاری کام میں لگائے جاتے ہیں بالترتیب پچیس اور تیس روپے ماہوار پاتے ہیں۔ جنگ سے قبل ان کو بالترتیب آٹھ اور دس روپے ماہوار ملتے تھے۔ کاریگروں اور مستریوں کو جو فٹنگ وغیرہ کا کام کرتے ہیں پچیس روپے سے لے کر اسی روپے تک دیئے جاتے ہیں۔ جنگ سے پیشتر ان کو پندرہ روپے سے پچاس روپے تک ملتے تھے۔ جنگ کی وجہ سے ضروریات زندگی کی قیمت میں عام اضافہ ہونے کی بنا پر اجرتیں دوگنی سے زیادہ ہو گئی تھیں اب جنگ ختم ہو چکی ہے لہذا اجرتوں میں آہستہ آہستہ کمی واقع ہو رہی ہے۔

(۶) مزدوروں کی حالت

پیدائش بر پیمانۂ کبیر کا نتیجہ ہمیشہ گنجان شہروں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور مزدوروں کی رہائش کا سامان قابل اطمینان میسر ہوتا ہے۔ یہاں کے مزدوروں کی حالت دیگر مقامات کے مزدوروں سے کہیں بہتر ہے جہاں پیدائش بر پیمانۂ کبیر ہے۔

(۷) قوت

علیگڑھ کے کارخانے عموماً برقی قوت کی امداد سے چلائے جاتے ہیں لیکن کارخانہ میں بجز قلعی اور ملمع کے کام کے کوئی مشین برقی قوت کی امداد سے نہیں چلائی جاتی ہے البتہ اس امر کی پوری طرح گنجائش ہے کہ برقی قوت کو دوسری مشینوں میں بروئے کار لایا جائے۔

(۸) باقیات

الومونیم، پیتل، ٹین اور آہن کے باقیات جو بیکار کترنوں کی شکل میں ہوتے ہیں بیچ دیا جاتا ہے جس سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ الومونیم اور پیتل کی بیکار کترنیں اصل قیمت سے نصف پر فروخت ہو جاتی ہیں۔ اکثر ان کو پگھلا کر دوبارہ چادروں کی شکل میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ بعض لوگ ان سے ضروریات زندگی کی مختلف اشیا تیار کرتے ہیں۔ ٹین اور آہن کی بیکار کترنوں سے اصل قیمت کا ۱/۲ حصہ حاصل ہوتا ہے۔ آہن کی کترنیں چھوٹے اوزار بنانے کے کام میں آتی ہیں اور ٹین کی کترنوں سے چمچے اور مختلف قسم کے کھلونے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔

(۹) صنعت کے مستقبل کے امکانات

اگرچہ علیگڑھ میں بکسوؤں کی صنعت کو قائم ہوئے کئی سال گذر چکے تھے لیکن بیرونی مقابلہ کی بنا پر جنگ سے پہلے اس کو فروغ نہ حاصل ہو سکا۔ جنگ کے سبب اور چونکہ ان کی درآمد بند ہو گئی اس لئے علیگڑھ کے بکسوؤں کی صنعت نے ہندوستان میں نمایاں اہمیت اور حیثیت حاصل کر لی ہے۔ جنگ نے اس صنعت کی ترقی کی رفتار میں اضافہ کر دیا ہے اور اس امر کی امید کی جاتی ہے کہ بعد جنگ حکومت کی امداد سے یہ صنعت غیر ملکی صنعتوں کا مقابلہ کر سکے گی۔

اعلان

دفتر رسالہ "آجکل" میں مضامین نثر و نظم کافی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے رشحات قلم روانہ نہ فرمائیں۔

(ادارہ)

نقد و نظر

لاجونتی

مصنف:- ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر۔ ملنے کا پتہ:- جناب آنند سروپ بھٹناگر ۲۹/۲ روڈ - نئی دہلی ضخامت ۱۴۲ صفحات - قیمت ۱۸/۵ نہیں

فلسفے کی طرح عملی سائنس بھی ایک ایسا موضوع ہے کہ اسکے جاننے والے شعر و ادب سے عموناً کنارہ کش رہا کرتے ہیں لیکن اگر ہندوستان اقبال جیسا فلسفی شاعر پیدا کر سکتی تھی تو وہ بھٹناگر جیسا سائنسداں شاعر کیوں نہ تخلیق کرتی۔ بھٹناگر صاحب کی شخصیت سائنس کے دائرے میں جس عالمگیر شہرت کی مالک ہے اتنی ہی شاعری کی دنیا میں زبان زد خلائق ہے۔ موصوف کو یہ عطیہ اپنے نانا منشی ہرگوپال تفتہ سے ورثے میں ملا ہے۔ تاہم انھوں نے گل و بلبل کے افسانہائے عشق سے دامن بچا کر وہ ترقی پسند شاعری اپنے لئے اختیار کی جسے صحیح معنوں میں زندگی سے تعلق ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں مطالعۂ قدرت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ چند نظمیں شاعر کی شریک حیات سے متعلق ہیں جن میں جذبات قلب کی ترجمانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ خصوصاً وہ نظمیں جن کا تعلق ان کی علالت اور حسرتناک موت سے ہے اسقدر دلسوز اور روح فرسا ہیں کہ پڑھنے کے بعد کوئی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لاجونتی اور شانتی ——— ان دو لفظوں کے آخری تین حروف کی یکسانیت ان کی ازلی و ابدی محبت کا پتہ دیتی ہے۔ بعض نظموں میں قومی اور سیاسی رنگ بھی جھلک رہا ہے۔

نقش و نقاش

مصنف:- جناب سلطان حیدر جوش ملنے کا پتہ:- نذیری پریس بک ایجنسی۔ بدایوں ضخامت ۱۵۲ صفحات۔ قیمت ڈھائی روپے۔ اس ناولٹ میں دلچسپ رومانی کیفیات سے قطع نظر آرٹ اور آرٹسٹ کے موضوع پر جو مفید بحث کی گئی ہے وہ بجائے خود ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ کنز، روادر سلیم ——— دو آرٹسٹ ——— اور ان کے دو موڈل سوتی اور سرلا۔ اسی دنیائے آب و گل کی جیتی جاگتی ہستیاں ہیں۔ ان کے کردار پیش کرنے میں تصنع اور بناوٹ سے بالکل کام نہیں لیا گیا۔ بعض مقامات پر تجزیہ نفسی کرتے ہوئے کسی قدر بے باکی سے اظہار خیال کیا ہے لیکن وہ بیباکی داغ عریانی سے اپنا دامن بچائے رکھتی ہے اور اسی لئے اس کتاب کے مطالعے کی سفارش بلا تامل کی جاسکتی ہے۔ زبان پاکیزہ اور دلپذیر ہے۔ مگر بعض الفاظ کی املا میں انھوں نے جدت طبع کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً خود اور خوش کو خدا اور خش لکھا ہے۔ بعض الفاظ کے ٹکڑے کر دئے ہیں۔ مثلاً پی جے گا، سیے نے، مانگ گو وغیرہ۔ جینڈ نے مصدر گڑھے ہیں۔ مثلاً تلاشنا سے تلاشنا۔ ان تجربات کی صحت و افادیت آنے والا زمانہ ہی کرسکے گا کہ وہ عوام میں مقبولیت حاصل کرسکتے ہیں یا نہیں۔

جدید اردو شاعری

مصنف:- جناب عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی۔ ناشر:- کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور بڑے سائز کے ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

سروری کی یہ کتاب چند اضافوں کے ساتھ تیسری بار شائع ہوئی ہے۔ اس میں شعر کی حقیقت و ماہیت پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد جدید اردو شاعری کے آغاز و ارتقا کا اس کے پس منظر کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر شاعر کی خصوصیات شاعری اور کلام کے نمونے پیش کئے ہیں۔ موصوف کی رائے نہایت آزاد لیکن ہر قسم کے تعصب سے پاک ہے۔ انھوں نے نہ کسی خاص دبستان شاعری کو سراہا ہے نہ کسی کی مذمت کی ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۸ء میں چھپاتے وقت موجودہ دور سے متعلق باب میں ان شاعروں کو نظر انداز کر دیا جو اس وقت دنیائے ادب میں اپنے لئے مقامات پیدا کر چکے ہیں، کسی قدر تعجب خیز ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر ان کو بھی موجودہ دور کے گروپ میں شامل کر لیا جاتا۔ آخری باب "نئی تحریکیں" بالکل تشنہ ہے۔ حالانکہ اس پر سب سے زیادہ بحث ہونی چاہئے تھی کیونکہ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شاعری کا ذکر خیر کیا گیا ہوگا جس کے تجربات اس وقت اردو شاعری میں کئے جا رہے ہیں۔ کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔

لکھنؤ کا دبستان شاعری

مصنف:- ڈاکٹر محمد ابواللیث صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی۔ (علیگ) ملنے کا پتہ مسلم یونیورسٹی پریس، علیگڈھ۔ مجلد۔ قیمت درج نہیں ہے۔

ابواللیث صاحب نے بڑے سائز کے چھ سو صفحات کا یہ طویل مقالہ پیش کر کے علیگڈھ یونیورسٹی سے زبان اردو میں پی ایچ ڈی کی سب سے پہلی سند حاصل کی اور اس طرح دوسروں کے لئے اس منزل تک پہنچنے کا راستہ کھول دیا۔ اس کتاب میں لکھنؤ کے شعرا اور ان کے کلام کو دس ابواب میں تقسیم کر کے بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ ایک باب میں لکھنؤ کے تمدن پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ایلان کی شاعری کا اس پر کیا اثر پڑا۔ چھٹا باب شاہان اودھ کی شاعری کے لئے مخصوص ہے۔ پانچویں باب میں ان شعرائے دہلی کا تذکرہ ہے جو ترک وطن کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ یہ امر مسلم ہے کہ مرثیہ گوئی کو سب سے زیادہ ترقی لکھنؤ کی فضا میں حاصل ہوئی نواں باب اسی موضوع خاص سے متعلق ہے۔ آخری دور کے لکھنوی شعرا میں سے حسرت، طباطبائی، صفی، ثاقب، عزیز، آشا اور آرزو جیسے اساتذہ کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے بحیثیت مجموعی یہ کتاب ایسی خوبیوں کی حامل ہے کہ اس موضوع کے تمام تذکرے اس کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ شعر و شاعری سے ذوق رکھنے والے حضرات کیلئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

لہو ترنگ

مصنف: جناب سکندر علی وجد۔ ملنے کا پتہ: عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن۔ مجلد قیمت تین روپے۔ یہ وجد صاحب کی تقریباً ساٹھ نظموں اور متعدد غزلوں کا دلکش مجموعہ ہے جسے بڑی نفاست سے چھاپا گیا ہے۔ غزلوں میں پرانا رنگ کارفرما ہے لیکن نظموں میں ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ اچھوتے پن کی جھلک نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں بڑا وزن اور زور ہے۔ اشعار کی محترم کیفیات ان پر مستزاد ہیں جن کا لطف سن کر ہی نہیں پڑھ کر بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ وجد صاحب ابھی جوان ہیں۔ اگر ان کا ذوق ادب نوازی اسی طرح قائم رہا تو وہ بہت جلد دنیائے شعر میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کر لیں گے۔

مسیح الملک کا علاج

مرتب: سید غیر حکیم محمد ظفر الدین احمد علوی۔ ملنے کا پتہ: دفتر مسیح الملک پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی۔ قیمت دو روپے۔ مسیح الملک ایک ماہانہ طبی رسالہ ہے جو دواخانہ مجلس اطبا کے کارکنوں کے زیر اہتمام دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ اس سال اس کا خاص نمبر بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلا ہے۔ اس میں تمام بیماریوں کی تشخیص، ان کے لاحق ہونے کے اسباب، ان کی روک تھام اور ان سے ہمیشہ کے لئے نجات پانے کے طریقے طبی اور عقلی نقطۂ نظر کے ساتھ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ ہر مرض پر بحث ختم کرنے کے بعد وہ مجرب نسخے درج کئے ہیں جن کو استعمال کراتے ہوئے حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اپنے مطب میں آنے والے مریضوں کا علاج کرتے تھے۔

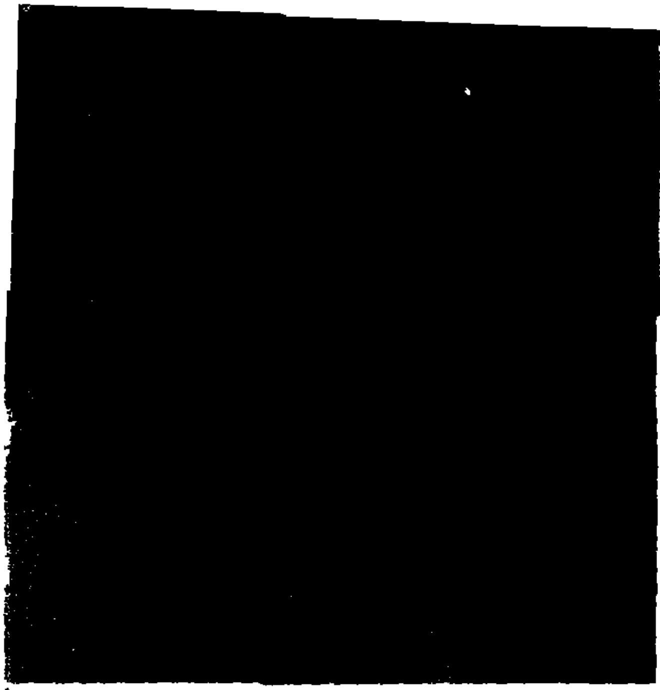
آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ [illegible] (رباعیات) .... حضرت مانی لکھنوی ......
۲۔ دو غزلیں .... جناب ثاقب کانپوری ......
۳۔ ثاقب کانپوری .... ڈاکٹر محمد لیب شادانی ......
۴۔ تارہ خالم (ازبک افسانہ) ...... جناب کل احمد ....
۵۔ واسوخت (ڈرامہ) .... جناب محمد عمر (نور الٰہی) ......
۶۔ سائنس دوربین .... جناب علی مہدی نقوی ......
۷۔ ریختی اور جان صاحب .... مشیر احمد ....
۸۔ مٹلی کا پیشہ .... ڈاکٹر غلام السیدین ......
۹۔ جولین [illegible] .... پروفیسر زو کرین ......
۱۰۔ زیب میلسل (افسانہ) .... محترمہ شفیق بانو شفق ......
۱۱۔ جاپان کا مستقبل .... جناب جگن ناتھ ماتھر ......
۱۲۔ اہرام مصر کی تعمیر .... جناب خوشحال رائے ......
۱۳۔ لغزش (نظم) .... جناب عبد المجید [illegible] ......
۱۴۔ اقبال کے تضاد پر ایک نظر (۲) ... مولانا بشیر [illegible] القادری ......

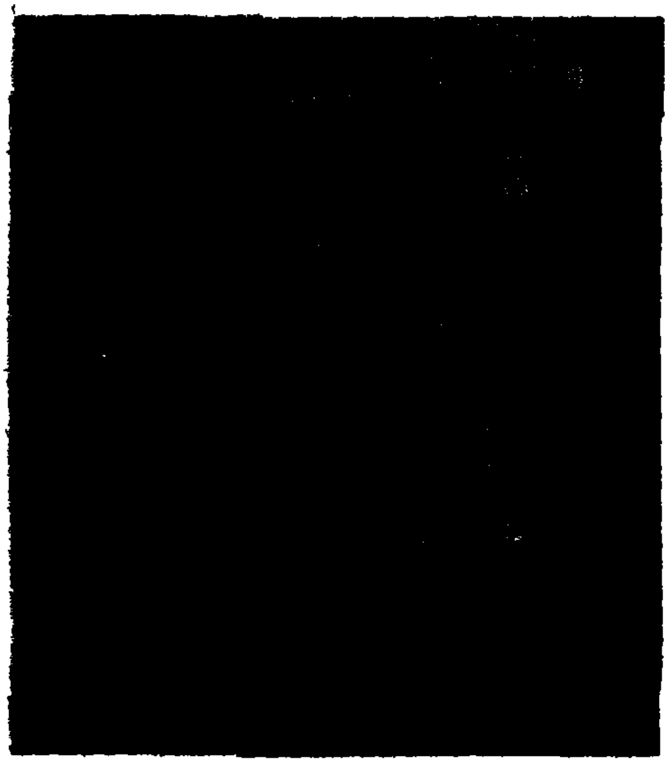
مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۲۲۲ سے شائع کیا۔

سیوہ

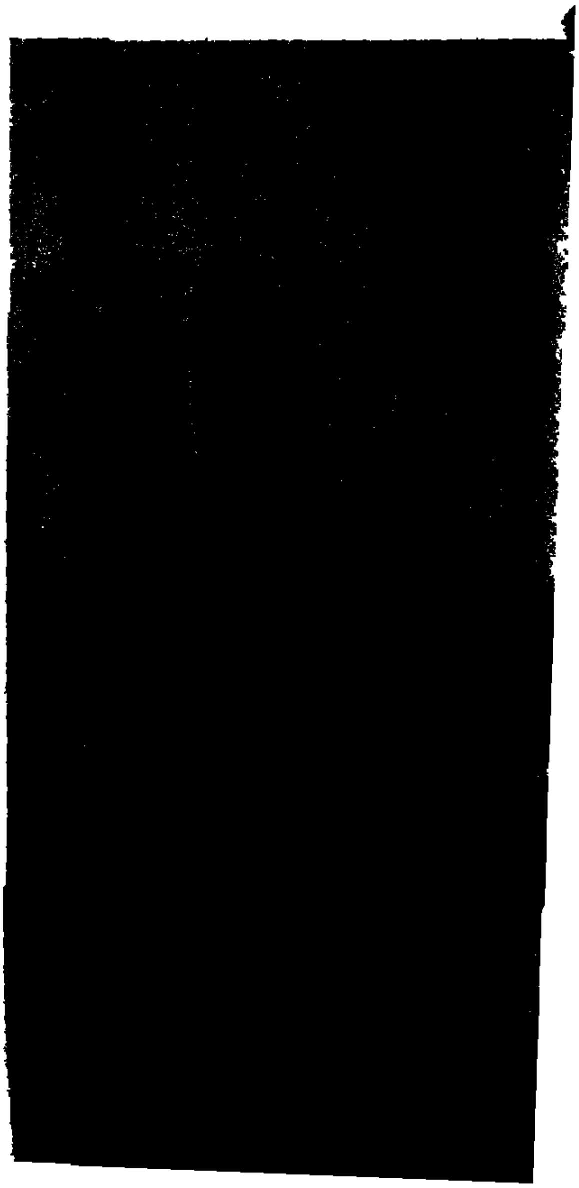
سیوہ مصر کی مغربی سرحد پر ایک چھوٹا سا سرسبز
شاداب علاقہ ہے۔ مصر کی طرح یہاں کی تہذیب بھی بہت
م ہے۔ موجودہ ایجادات اور نئی روشنی کے اثرات کے
جوہ سیوہ کے باشندے اپنے قدیم اخلاق و عادات اور
، معاشرت کو نہیں بھولے ہیں۔ یہ لوگ اب بھی
، خوش باش، خوش خلق اور مہمان نواز ہیں۔



سیوہ کے دو بچے



سیوہ کے چند پرانے مکانات جن کی چہار دیواریاں ابتک موجود ہیں۔



سیوا کے چند کھنڈر۔ بیچ میں ایک
→ مسجد کی اونچی مینار نظر آرہی ہے۔

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			چندہ سالانہ	فی کاپی
النفیر	(عربی)	(ماھوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیپور	(فارسی)	(ماھوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آھنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماھی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
العرب	(عربی)	(ماھوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ھندی)	(ماھوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماھوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ھے ڈے	(انگریزی)	(ماھوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماھوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اون ورڈ	(انگریزی)	(ماھوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی - چینی)	(سہ ماھی)	تین روپیہ	چار آنہ
پرسپیکٹو	(انگریزی)	(سہ ماھی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی - فارسی) (اردو - ھندی) (پشتو - روسی) (برمی - رومن اردو)	(ماھوار)	تین روپیہ	چار آنہ
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)	—	ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا ٹریڈ بلیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

انڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں — ایک سو اسی صفحات — دو نقشے — کپڑے کی جلد — قیمت دو روپیہ (بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں) —

«میران یور ایٹر» (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (محصول ڈاک معاف) —

خاص رعایت «عربی - انگریزی جلیے» نوے صفحات — گتے کی جلد — قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ — کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ —

«فارسی انگریزی جلیے» کپڑے کی جلد — قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) —

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ — پوسٹ بکس نمبر ۱۹۹ — دھلی

لڑکیوں کی شادی کا ایک اچھا تحفہ

رضیہ کا شاہی دسترخوان
کھانا پکانے کی بہترین کتاب
قیمت ۱۰/
علاوہ محصول

رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری
کشیدہ کاری کا حسین مجموعہ
قیمت ۱۰/ — علاوہ محصول

رضیہ کے خطوط
زنانہ خطوط بطرز جدید
قیمت ۸/

باپ کا خط بیٹی کے نام
باپ کی نصیحت
قیمت بارہ آنے

تازیانہ
دلچسپ ناول
قیمت ڈیڑھ روپیہ

فاطمہ رضہ کا لال
شہادت حسینؓ پر رو کر ٹکڑے کر دینے والی کتاب
قیمت — ۱۲/

پتھر سے ہیرا
اخلاقی ناول
قیمت ۱۲/

چھالے
نئے افسانوں کا مجموعہ
قیمت ۳/

مذکورہ کتابوں کا سیٹ ہے۔ پورے سیٹ کی قیمت سترہ روپے چار آنے ہے۔ پورا سیٹ منگانے پر محصولڈاک وغیرہ معاف

نیا کتاب گھر اردو بازار (اے) سی، دہلی

آج کل

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۷ | فہرست | یکم ستمبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ: آغا محمد یعقوب دواشی، بی۔ اے (علیگ) ایل ایل۔ بی

ناشر: رلچند ناتھ ستیرا، ایم۔ اے

مدیران: فضل حق قریشی دہلوی — مشیر احمد، ایم۔ اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ دہلی

رفتار زمانہ

سفر حج اور ہوائی جہاز

اس سال تقریباً ۱۰ فیصدی حاجیوں کو ہوائی جہاز کے ذریعہ حجاز لیجانے کے انتظامات عمل میں آ رہے ہیں۔ پہلا اجتماع حج شروع ہونے سے تین ہفتے قبل جدہ پہنچے گا۔ حج سے پہلے ہی ان حاجیوں کو زیارت مدینہ کرا دی جائے گی اور حج ختم ہوتے ہی واپس آ جائیں گے۔ دوسرا اجتماع حج شروع ہونے سے چند ہی دن پہلے جدہ پہنچے گا۔ اس میں جانے والے حاجی حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ شریف کی زیارت کریں گے۔ ان کی واپسی تین ہفتے بعد عمل میں آئے گی۔ حکومت ہند نے ہوائی جہازوں کی کمپنیوں سے جہاز کرایہ پر مانگے ہیں۔ یہ سفر صرف اسی وقت شروع ہو سکے گا جبکہ ہر پھیرے کے لئے پورے تینتیس مسافر اپنی اپنی نشستیں مخصوص کرا لیں۔ ہر حاجی کا کل خرچ جس میں آنا جانا شامل ہے تقریباً چار ہزار روپے ہوگا۔ ہر مسافر اپنے ساتھ پچاس پونڈ وزن لے جا سکے گا۔ دو سال سے کم عمر کے بچوں سے کرایہ کا دس فیصدی لیا جائے گا لیکن اسباب میں کوئی رعایت نہیں ہوگی۔ دو سال سے زیادہ عمر کے بچوں کو پورا کرایہ دینا ہوگا۔ انھیں علیٰحدہ سیٹ بھی مل سکے گی۔ پردہ نشین خواتین کے لئے کوئی خاص انتظام نہیں ہوگا۔ سفر کا معیار بالکل وہی ہوگا جو عام یورپین مسافروں کیلئے ہوا کرتا ہے۔

ارجنٹائن کی مکئی

حال ہی میں ہندوستان کا خوراکی وفد دیوان چمن لال کی قیادت میں ارجنٹائن پہنچا ہے۔ خط و کتابت ہی کے ذریعہ تین لاکھ ٹن مکئی ہندوستان کے لئے خریدی جا چکی ہے۔ اس میں سے ساٹھ ہزار ٹن مکئی جہازوں پر لادے جانے کے لئے بندرگاہ پر موجود ہے صرف برآمدی لائسنس ملنے میں کسی قدر دشواری کا سامنا ہو رہا ہے۔ دیوان صاحب کا کہنا ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ارجنٹائن کی حکومت اس لائسنس کے جاری کرنے میں کیوں تاخیر کر رہی ہے۔ تاہم انھیں یقین ہے کہ وہ بہت جلد اس معاملے کو طے کر لیں گے۔ اور باقی دو لاکھ چالیس ہزار ٹن مکئی بھیجنے کا انتظام بھی ممکن ہو جائے گا۔ وہ اس ملک کی حکومت سے دوسری اشیائے خوراک خریدنے کے لئے بھی بات چیت کریں گے۔ ان میں چاول بھی شامل ہوگا۔

ان چیزوں کے تبادلہ میں سن کا کپڑا اور ٹاٹ وغیرہ دیا جائے گا۔ وفد مذکور جنوبی امریکہ جانے سے پہلے ایکویڈور سے بھی چاول خریدنے کی کوشش کریگا۔ ارجنٹائن میں غلے وغیرہ کی اس قدر بہتات ہے کہ لڑائی کے زمانے میں مشینوں کو چلانے کے تیل نہ ملنے کی صورت میں تقریباً بیس لاکھ ٹن مکئی اور چھیانوے ہزار ٹن گیہوں جلا دینا پڑا۔ لیکن اس سے اس ملک کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اناج بیچنے والی کمپنیاں بہت فائدے میں رہیں۔ نیز روشنی اور حرارت فراہم کرنے والے کارخانے بدستور کام کرتے رہے۔

جرمنی میں ہندوستانی

سرکاری ریکارڈ کے مطابق تنانوے ہندوستانی جنگ چھڑنے کے وقت جرمنی میں موجود تھے۔ ان میں سے اٹھتر اشخاص کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اکتر اب بھی جرمنی میں موجود ہیں۔ دو ڈنمارک میں ہیں اور باقی پانچ کا تبادلہ عمل میں آ چکا ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ باقی لوگوں کا بھی سراغ مل جائے۔ اس سلسلے میں ایک وفد جس کے قائد میجر جنرل اسٹوورٹ ہیں۔ جرمنی میں تحقیق و تفتیش کر رہا ہے۔ اس کے ذمے تین اہم کام ہیں۔ اہل جرمنی کے ہتھکنڈوں کا مطالعہ کرنا خصوصاً اس اعتبار سے کہ دوران جنگ میں کن چالبازیوں کے ساتھ جرمن دستوں نے ہندوستانی دستوں کا مقابلہ کیا۔ ہندوستانی اسیران جنگ کو تلاش کرنا جو لاپتہ اشخاص کی فہرست میں شامل ہیں۔ اور ہندوستانیوں کو اپنے وطن یا کسی دوسری جگہ پہنچنے میں مدد دینا۔ نصف سے زیادہ ہندوستانی واپس آنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ باقی سہولت سفر نصیب ہوتے ہی وطن بھیجے جائیں گے۔ ان ہندوستانیوں کی قبریں جو جرمنی میں مارے گئے "سر فہرست" لائی جا رہی ہیں۔ فیصلہ ہوا ہے کہ ان کی یادگار قائم کرنے کے لئے ایک عمارت تعمیر کر دی جائے۔ ان تین ہندوستانیوں میں سے جو دوران جنگ میں برلن سے اردو زبان کی تقریریں نشر کرتے تھے ڈاکٹر فاروقی اور مسٹر حبیب الرحمٰن برطانوی علاقے میں مقیم ہیں۔ ان پر کسی قسم کی سختی نہیں کی جا رہی ہے سوائے اس کے کہ وہ ہر مہینے میں دو بار فوجی حکام کے سامنے آکر اپنی موجودگی کا

ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مسٹر عبدالرؤف ملک سقوطِ المانیہ کے وقت برلن میں موجود تھے لیکن اس کے بعد وہ لاپتہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسوقت سوئستان میں ہیں۔

انگریز عورتیں مردوں کے دوش بدوش

برطانیہ کی مقامی حکومتوں کے ہر شعبے میں عورتوں کی عملی سرگرمیاں بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ اس وقت وہ مردوں کے بالکل دوش بدوش ہیں۔ اکیس یا اکیس سال سے زیادہ عمر کی ہر عورت کو رائے دینے یا انتخابات میں امیدوار کی حیثیت سے حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔ پورے اعداد و شمار کا علم نہیں تاہم یہ یقین ہے کہ رائے دہندگی کے سلسلے میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں مجلس بلدیہ کا انتخاب ہوا تو لندن کے دس انتخابی علاقوں میں عورتوں کے چار لاکھ چونتیس ہزار اور مردوں کے تین لاکھ باون ہزار ووٹ تھے۔ ایسی مجالس کے اراکین میں بھی عورتیں اپنے قدم جما رہی ہیں۔ بلکہ کئی شہروں میں تو انھوں نے میئر تک کی حیثیت حاصل کر لی۔ مثلاً لورپول میں جو انگلستان کا چوتھا بڑا شہر ہے ایک ہی عورت نے دو بار "لارڈ میئر" کے عہدے پر کام کیا۔ اس میں شک نہیں کہ عورتیں ایسے عہدوں پر زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہیں کیونکہ شہری نظام کے بہت سے شعبے عورتوں ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ ان کا عمل دخل دفتروں میں بھی بڑھ رہا ہے۔ اعلیٰ افسران کی اسامیوں سے لے کر معمولی محرروں تک وہ ہر جگہ چھا گئی ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ لڑائی چھڑ جانے پر مقامی حکومتوں کے ایک لاکھ پچاس ہزار میں سے تقریباً پچاس ہزار افسران میدان جنگ میں بھیج دئے گئے۔ قدرتی طور پر ان کی جگہ عورتوں نے لے لی۔ ان سرکاری ملازمتوں سے قطع نظر مختلف اقسام کے کاروبار میں بھی ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ انھوں نے ہر کام میں ہاتھ ڈال کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ دماغی قابلیت اور جسمانی قوت، دونوں لحاظ سے مردوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

ایرانی کابینہ کے نو نکات

ایران کی نئی حکومت کے لائحہ عمل میں جو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے مرتب کیا گیا ہے نو نکات خاص طور پر قابل ذکر اور اہم ہیں۔ وزیر اعظم قوام السلطنہ نے اس سلسلے میں ایک اعلان حال ہی میں فرمایا ہے۔ وہ اہم نکات حسب ذیل ہیں۔

(۱) ملکی اقتصادیات کی تنظیم اور سرمایہ لگانے کے سلسلے میں حوصلہ افزائی کرنا (۲) بجٹ کی رقم کے بہت بڑے حصہ کو تعلیم، حفظان صحت اور زراعت کی ترقیوں کے ضمن میں صرف کرنا (۳) جمہوری اصولوں اور اقوام متحدہ کے میثاق کے مطابق قوانین ملک میں اصلاح کرنا (۴) ان لوگوں کو سزائے موت دینا جو سرمایۂ عوام کو ضائع کریں یا جو مسلح ہو کر لوٹ مار مچائیں (۵) باغیوں کو مناسب سزائیں دینا (۶) زمینداروں اور کسانوں کے مابین تعلقات استوار کرنا (۷) زراعتی طریقوں میں اصلاح اور کسانوں میں اراضیات تقسیم کرنا (۸) ملک کے نظام زر میں اصلاح پیدا کرنا۔ اور (۹) عوام کی فلاح و بہبود کے لئے دوسرے مفید کام انجام دینا۔

نیستی میں آٹا گیلا

اسوقت دنیا بھر میں خوراک کا مسئلہ ایک نازک صورت اختیار کر گیا ہے حتیٰ کہ وہ ممالک بھی جن کے پاس غلہ بیشتر فالتو مقدار میں جمع رہتا ہے اور وہ اس سے دوسرے ملکوں کی مدد کرتے رہے ہیں اسوقت اپنے کھیتوں کے خزاں رسیدہ مستقبل کا اندازہ لگا کر کسقدر پریشانی ظاہر کر رہے ہیں۔ ہر جگہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اناج کا ایک دانہ یا روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ضائع ہونے نہ پائے لیکن بعض دفعہ قدرت کا کھلنڈرا پن انسانی منصوبوں میں رخنہ ڈال دیتا ہے۔ حال ہی میں ایک اطلاع ملی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس اطلاع نے بڑی مایوسی پیدا کر دی ہے کہ امریکہ کا ایک جہاز جو امریکہ سے آٹھ ہزار ٹن سامان خوراک لے کر برطانیہ کی جانب روانہ ہوا تھا بحر اٹلانٹک میں ایک دوسرے جہاز سے ٹکرا کر نذر امواج ہو گیا۔ نہ سامان بچا نہ سامان لے جانے والے۔ اس آٹھ ہزار ٹن سامان خوراک میں پانچ ہزار چار سو پچاس ٹن گیہوں بھی شامل تھا۔ ہر چند یہ مقدار کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن موجودہ قحط کے زمانے میں اسے ایک نعمت سمجھا جا سکتا ہے۔ اسے کہتے ہیں نیستی میں آٹا گیلا ہونا۔

ترکی کابینہ کا نیا دور

گذشتہ ماہ بالکل غیر متوقع طور پر ترکی میں سراج اوغلو کی وزارت نے استعفیٰ دیدیا۔ صدر جمہوریت عصمت انونو نے نئی کابینہ تیار کرنے کے لئے ایم پیکر کو دعوت دی جو کچھ عرصہ پہلے قومی مدافعت اور امور داخلہ کے وزیر تھے۔ انھوں نے مئی ۱۹۴۳ء میں ناسازئ طبع کی بنا پر اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا تھا۔ انھوں نے صدر جمہوریت کا دعوت نامہ ملتے ہی ارباب سیاست سے گفتگو شروع کر دی ہے۔

قیاس ہے کہ سراج اوغلو کی وزارت کا کوئی رکن نئی کابینہ میں شریک نہیں کیا جائے گا سوائے حسن سقا کے جو وزیر خارجہ تھے۔ ڈاکٹر سراج اوغلو کی وزارت کا نام "پیپلز ری پبلکن پارٹی" تھا اور اس کو ترکی کی قومی مجلس میں اکثریت حاصل ہے۔ ابھی دو مہینے ہوئے نئے انتخابات میں اس جماعت کے اراکین کو ۳۹۶ نشستیں حاصل ہوئی تھیں جبکہ مخالف جماعت کے صرف ۶۲ امیدوار منتخب ہو سکے۔ مخالف جماعت کا نام "ڈیموکریٹک پارٹی" ہے۔ یہ صورت صرف اسی سال پیدا ہوئی ہے ورنہ کمال اتاترک کے زمانے سے صرف ایک ہی جماعت برسر اقتدار رہی اور اسی نے کثرت رائے کے ساتھ ترکی کی قسمت کے ہر معاملہ کا فیصلہ کیا۔ سراج اوغلو کے استعفے کے دوسرے ہی دن

صدر جمہوریت کا انتخاب عمل میں آیا۔ اکثریت کی بناء پر جنرل عصمت انونو ایک بار پھر صدر مجلس منتخب ہو گئے۔ اس سلسلے میں بھی رائے دہندگی کی صورت صرف اسی سال پیدا ہوئی ورنہ یہ انتخاب ہمیشہ اتفاق رائے سے ہوا ہے۔ مخالف جماعت کے اراکین نے مارشل چقماق کے حق میں ووٹ دئے۔

چین اور ہندوستان میں تجارت

فروری ۱۹۴٦ء میں ہندوستان سے ایک تجارتی وفد چین گیا تھا۔ چھ ہفتے میں اس کے اراکین نے آٹھ ہزار میل کا ہوائی سفر کیا۔ اس اثناء میں اہم صنعتی مرکزوں کا دورہ کرنے کے علاوہ انھوں نے چین کے مشہور تاجروں اور سرکاری افسروں سے ملاقاتیں کیں۔ وہ جنرلیسیمو چیانگ کائی شیک سے بھی ملے جنھوں نے ہندوستانی معاملات میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ وفد مذکور کا خیال ہے کہ اشیائے خام کی کمیابی اور ذرائع حمل و نقل کے فقدان کے باوجود یہ امید قائم کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں چین اور ہندوستان کے مابین حسب سابق تجارتی تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ شروع میں ان کا تذکرہ زیادہ نہیں ہو سکے گا لیکن یہ کمی عارضی رہے گی کیونکہ ہندوستان کی بہت سی چیزیں چین کے لئے ضروری ہیں۔ جرمنی اور جاپان کو ایک مدت طویل کے لئے چین کی منڈیوں سے نکالا گیا ہے۔ اب ہندوستان ہی چین کی ضروریات پوری کر سکے گا۔ یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ چین اور ہندوستان کے تعلقات کوئی نئے نہیں ہیں بلکہ یہ رشتہ صدیوں پہلے سے قائم ہے۔

دو ہزار سال پرانی لاش

مارلبورو کے قریب علاقہ فالڈین میں چند مزدور ایک کھائی کھود رہے تھے کہ اچانک ایک شخص کی لاش برآمد ہو گئی۔ ماہرین علم الاجسام نے تحقیق کے بعد اندازہ لگایا کہ وہ شخص تقریباً دو ہزار سال پہلے زندہ تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ تھا۔ مرنے کے وقت اس کی عمر تقریباً ستر سال تھی لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کے منہ میں پورے دانت موجود تھے۔ اس لاش کو دیکھ کر اس قدیم زمانے کے لوگوں کے قد و قامت عمر اور عام جسمانی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ علمی تحقیقات کے سلسلے میں کوئی ایسی دریافت بیش بہا خزانوں سے بھی زیادہ قیمتی سمجھی جا سکتی ہے۔

وھیل مچھلی کا شکار

دنیا بھر میں مختلف روغنوں اور چربیوں کی کمی محسوس کرتے ہوئے جنرل میک آرتھر نے جاپانیوں کو اجازت دیدی ہے کہ جنوبی سمندروں کی طرف جا کر وھیل مچھلی کا شکار دوبارہ شروع کر دیں۔ انھوں نے ایک مختصر سا بحری بیڑا استعمال کرنے کا اختیار دیدیا ہے جس میں کارخانوں کے دو جہاز، وھیل مچھلی کے بارہ شکارے اور بار برداری کی سات کشتیاں شامل ہیں۔ یہ اجازت ماہ دسمبر سے ماہ مارچ تک کے لئے ہے۔ کیونکہ اس قسم کے شکار کے لئے یہی مناسب موسم ہے۔ اس مچھلی کا گوشت اور تیل کثیر مقدار میں صرف ہوتا ہے کیونکہ ان دونوں چیزوں میں جزو بدن بننے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ گوشت کا زیادہ حصہ جاپان ہی کی منڈیوں میں ختم ہو جائیگا البتہ اس کی چربی دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی بھیجی جائے گی۔ ان کا یہ دورہ تقریباً چھ ہزار میل کے دائرے میں ہوگا اور وہ مقررہ چار ماہ کے اندر بڑی تعداد میں مچھلیاں مار کر دنیا بھر کی ضرورت پوری کر سکیں گے۔

ہندوستان کی امداد کیلئے پرزور اپیل

ہم آجکل کے پچھلے شمارے میں امریکہ کے اس خوراکی وفد کی بابت اظہار خیال کر چکے ہیں جو غیر سرکاری طور پر غذائی صورت حالات کا مطالعہ کرنے ہندوستان آیا تھا۔ اب چند دن ہوئے اس کے ایک رکن مسٹر جوزف وکن نے جن کو بہت قریب سے ہندوستان کے صحیح حالات کے مطالعے کا موقع ملا تھا، نہایت پر زور الفاظ میں حکومت امریکہ خصوصاً ورلڈ فوڈ کونسل سے اپیل کیا ہے کہ ہندوستان کو ۳۱ دسمبر سے پہلے پہلے ۲۰ لاکھ ٹن اناج لازمی طور پر مل جانا چاہئے۔ ان کا بیان ہے کہ اگر جلدی ہی اس امداد کا سلسلہ شروع نہ کیا گیا تو آئندہ رونما ہونے والا قحط ایک قومی سانحۂ عظیم کی صورت اختیار کرلے گا۔ مسٹر وکن نے واشنگٹن کے موجودہ نظام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اناج کاشتکاروں سے حاصل کرنے اور عوام میں تقسیم کرنے کے اتنے اچھے طریقے اختیار کئے گئے ہیں کہ اب ۱۹۴۳ء والے حادثۂ بنگال کی بازگشت کسی حصہ ملک میں ممکن نہیں ہو سکے گی۔

سانحۂ ارتحال

نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر سننے میں آئی ہے کہ ۱۳ اگست ۱۹۴٦ء کی شام کو چار بجے دنیائے ادب کے مشہور و معروف مصنف ایچ جی ویلز کا انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۷۹ سال تھی۔ موصوف کو عرصہ دراز سے ذیابیطس کی شکایت لاحق تھی اور انجام کار یہی موذی مرض ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ سائنس، سیاست، تاریخ اور ناول نگاری کے میدان میں موصوف کو اتنا بلند مرتبہ حاصل تھا کہ اب سرزمین برطانیہ ان کا نعم البدل مشکل ہی سے پیدا کر سکے گی۔ انھوں نے غور و فکر کی ایسی نئی راہیں نکالیں کہ متمدن دنیا کا کوئی شخص بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مندرجہ بالا موضوعات پر انکی متعدد کتابیں موجود ہیں جن کا مطالعہ لاکھوں آدمی کر چکے ہیں۔ سینما کی دنیا میں انکی کہانیوں پر تیار کئے ہوئے کئی فلم بھی بے حد مقبول ہو چکے ہیں۔

حال و قال

سیماب اکبرآبادی

فسردگی یاس کی ہے دل میں شگفتگی کا خیال بھی ہے
یہ آئینہ ماند ہی نہیں ہے اس آئینے میں تو بال بھی ہے

ہے سہل اس کا وصال لیکن، یہ حال ہو تو محال بھی ہے
تجھے تو ہے فکر یا سوا بھی! تجھے تو اپنا خیال بھی ہے

عروجِ عالم ابھی ہے مشکل، عروجِ عالم محال بھی ہے
ابھی تو دنیا میں آدمیت ذلیل بھی پائمال بھی ہے

نشانِ منزل میں کھونے والو تمہیں کچھ اس کا خیال بھی ہے؟
تمہاری اس رہ گزار میں اک مسافرِ پائمال بھی ہے

ہے تیرا ہی آئینہ یہ انسان، تو کیوں اسی میں تجھے نہ دیکھوں؟
اسی میں تیرا جمال بھی ہے، اسی میں تیرا جلال بھی ہے

وہی تباہی ہے یا الٰہی! وہی ہے جینا وہی ہے مرنا
ہے داستانِ طویل دنیا، مگر کچھ اس کا مآل بھی ہے

تمہاری محفل میں باریابی، ہے قابلِ رشک کامیابی
اگر نہ ہو ناگوارِ خاطر تو حسرتِ عرضِ حال بھی ہے

فقیر مجھ کو سمجھ کے، خاموش بیٹھے، کیا منہ کو تک رہے ہو؟
زبان دی ہے تو یہ بھی پوچھو کہ تیرا کوئی سوال بھی ہے؟

خموش و سرگشتۂ تحیر نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے
جو تیری تصویر کی ہے صورت وہی تصور کا حال بھی ہے

وہ اک جمالِ لطیف و تنہا اور اس پہ ہنگامۂ تماشا!
خیال سب کو ہے اپنا اپنا کسی کو اسکا خیال بھی ہے؟

وہ دل میں پیوستہ جلوہ گر ہو تو روح بھی اس سے بہرہ ور ہو
یہی تقرب کا ہے خلاصہ یہی مرادِ وصال بھی ہے

خزاں ہے دیباچۂ بہاراں، ہے آخرِ شب سحر کا عنواں
زوال سے تو ہو کیوں پریشاں کہ اس ہی میں کمال بھی ہے

ملال سے بھی تجھے خوشی ہو، اگر سمجھ لے یہ بات میری
خوشی میں تھا جو شریک تیری، وہی شریکِ ملال بھی ہے

ہے سبزہ پژمردہ، میں ہوں آزردہ، آشیاں ہے شرار خوردہ
کلی فسردہ ہے پھول مردہ، چمن میں کوئی نہال بھی ہے؟

یہ نہرِ تسنیم و حوضِ کوثر، یہ صاف شیشے، یہ پاک ساغر!
یہاں کہیں خستہ و شکستہ ہمارا جامِ سفال بھی ہے؟

میں طورِ موسیٰ کے دور ہی سے جلال کا آپ کا ہوں قائل
یہ صرف ہے پاس پردہ داری کا اعترافِ جمال بھی ہے

میں اہلِ کردار بھی ہوں سیماب، مردِ گفتار ہی نہیں ہوں
یہ خاصہ ہے مری غزل کا کہ حال بھی اور قال بھی ہے

جان بیرڈ

آلۂ عجیب بینی کا موجد

مشیر احمد

سائنس نے فی زمانہ اس قدر ترقی کر لی ہے کہ کوئی بات ناممکن نہیں رہی ہے۔ اگر آج کوئی بات بظاہر ممکن نہیں بھی معلوم ہوتی تو کل وہی بات ایک مسرور واقعہ بن کر ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے جب ٹیلیفون ایجاد ہوا تھا اور لوگوں نے پہلے پہل کئی میل کے فاصلہ سے اس نئے آلے کے ذریعہ آواز سنی تھی تو ایک شخص نے کہا تھا: "بھائیو! آج ہم تم میلوں پرے کی آواز اور بات چیت سن رہے ہیں۔ ایک دن وہ آئے گا جب میلوں کی دوری پر چلتے پھرتے آدمی اور طرح طرح کی چیزیں گھر بیٹھے نظر آیا کریں گی"۔ اس بات میں محض ایک ارمان کی طرف اشارہ تھا۔ نہ تو اس کہنے والے کو اور نہ سننے والوں کو یہ خبر تھی کہ کچھ ہی عرصہ بعد ایک اسکاچ نوجوان جان بیرڈ اس بات کو واقعی ایک ٹھوس حقیقت کر کے دکھا دے گا۔

ٹیلی ویژن کا موجد جان بیرڈ اسکاٹ لینڈ میں بمقام ہیلنسبرگ پیدا ہوا۔ بیرڈ کے والد پریسبیٹیرین مذہب کے پیرو اور ایک گرجا میں پادری تھے۔ بیرڈ کو بچپن ہی سے سائنس میں خاص دلچسپی تھی اور وہ جس زمانہ میں مدرسہ ہی میں پڑھتا تھا اس کا دماغ ہر وقت سائنسی ایجادات و اختراعات میں لگا رہتا تھا۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ اس نے خود اپنے ہاتھ سے ایک ٹیلیفون بنایا جس کے ذریعہ سے وہ اپنے چار ہم جماعتوں سے ان کے گھروں پر بات چیت کر سکتا تھا۔ ٹیلیفون بیرڈ اس نے اپنے سونے کے کمرے میں پلنگ کے پاس رکھا تھا اور عام طور پر یہ معصوم گر ذہین بچے سونے سے پہلے بہت بہت دیر تک مزے مزے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اس نے ان ٹیلیفون کے تار اپنے مکانوں کی سڑک پر (شاید درختوں سے) باندھے تھے۔ ایک روز ناگاہ ایک ایسا دلچسپ واقعہ پیش آیا جو بیرڈ کے لئے سخت مشکل ثابت ہوا اور اس نے کچھ مدت تک کے لئے بیرڈ کی طفلانہ سائنسی سرگرمیوں کے سلسلہ کو منقطع کر دیا۔ بات یہ ہوئی کہ اس رات کو آندھی زور کی چلی اور بیرڈ کے ٹیلیفون کے تار اپنی جگہ سے اکھڑ کر ایک گاڑی بان کی گردن سے جو اس وقت ادھر سے گذر رہا تھا لپٹ گئے۔ گاڑی بان گاڑی سے نیچے گر پڑا۔ اگلے دن اس نے "نیشنل ٹیلی فون کمپنی" پر جو اسی زمانہ میں قائم ہوئی تھی ہرجانہ کا دعویٰ کر دیا۔ کمپنی نے تحقیقات کی تو بیرڈ کے ٹیلیفون کا حال معلوم ہوا۔ چونکہ یہ کارروائی خلاف قانون تھی اسلئے بیرڈ کے اس ٹیلیفون کو اکھاڑ دیا گیا۔ اگر بیرڈ اس قدر کم عمر نہ ہوتا تو شاید اس کو زیادہ خمیازہ بھگتنا پڑتا۔

اسکول کے بعد بیرڈ نے رائل ٹیکنیکل کالج اور گلاسگو یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ اب بھی اس کا خاص مضمون سائنس ہی رہا۔ اس زمانہ میں اس کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ یہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی پرانی مشین یا موٹر وغیرہ اٹھوا لانے خرید لاتا تھا۔ اس پر خوب طبع آزمائی کرتا اور اپنے فطری جوہر کو جلا دیتا۔ کل پرزوں کی دنیا سے وہ اس قدر مانوس ہو گیا کہ اس نے یونیورسٹی کی تعلیم ختم کر کے موٹروں کے ایک کارخانہ میں بحیثیت ایک مستری کے ملازمت کر لی۔ اس ملازمت نے اس کو محنت و مشقت کا عادی بنا دیا۔ کیونکہ یہ کارخانہ صبح کے ساڑھے پانچ بجے کھل جاتا تھا اور وہاں رات تک کام کرنا پڑتا تھا۔ بیرڈ کو اکثر پو پھٹنے سے پہلے ہی گھر سے چل دینا پڑتا اور رات کو بہت دیر سے گھر میں گھسنا نصیب ہوتا۔ کچھ عرصہ تک اس کارخانہ میں مستری کا کام کرنے کے بعد اسکو ہائی الیکٹریسٹی کمیشن کے ماتحت کلائڈ ویلی الیکٹریکل پاور کمپنی میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کی جگہ مل گئی۔ ملازمت کے کچھ ہی عرصہ بعد جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ بیرڈ نے ایک سچے محبِ وطن کی طرح اپنی خدمات فوجی ملازمت کے واسطے پیش کر دیں لیکن بیرڈ کی صحت اچھی نہ تھی اس لئے اس کو فوج میں ملازمت نہیں مل سکی۔ البتہ جنگ کے دوران میں وہ "پاور کمپنی" میں ملازم رہا اور اسی حیثیت سے ملک و قوم کی خدمت کرتا رہا کیونکہ کلائڈ کے اسلحہ جات کے کارخانوں میں بجلی اسی کمپنی سے جاتی تھی۔

صحت کی خرابی کی وجہ سے بیرڈ کو یہ ملازمت بھی ترک کرنی پڑی۔ اب پھر فرصت ملی تو اس نے سائنسی ریسرچ کے کام کی طرف پھر توجہ دی لیکن کمزور صحت کی بنا پر وہ زیادہ محنت نہ کر سکا۔ بیرڈ کا دماغ سائنسدان کے علاوہ ایک پکے تاجر کا ایسا بھی تھا۔ پچھلی جنگ کے بعد جب وہ بیکار تھا تو اس نے ایک ایسا موزہ ایجاد کیا جس میں ہر موسم میں پاؤں گرم و خشک رہ سکتے تھے۔ ان موزوں کا کاروبار خوب پھیلا اور بیرڈ نے بہت سا روپیہ کما لیا۔ کچھ تو روپیہ کی طرف سے بے فکری کچھ صحت کی خرابی اس بات کی محرک ہوئی کہ وہ اس تجارت کو چھوڑ دے۔ چنانچہ اس نے گلاسگو کے ایک بیوپاری کو اپنے موزوں کا کاروبار سونپ دیا۔ اب اس کو سفر کا شوق چرایا۔ روپیہ تو پاس تھا ہی جزائر غرب الہند کی سیاحت کو چلا گیا۔ وہاں سیر و تفریح بھی کرتا رہا اور آسٹریلیائی شہد کی تجارت بھی۔ اس کام میں بھی خوب منافع ہوا لیکن جی نہ لگا۔ اس کو یہ کاروبار بھی چھوڑنا پڑا اور اگست ۱۹۲۲ء میں وہ واپس اپنے وطن آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے صابن کی تجارت شروع کر دی لیکن پھر ڈاکٹروں نے یہی مشورہ دیا کہ صحت کی خاطر کاروبار چھوڑ دینا چاہئے۔ بیرڈ نے اس کے بعد پھر کوئی کاروبار نہیں کیا بلکہ جب بھی صحت اجازت دیتی اپنے سائنسی تجربات میں منہمک ہو جاتا۔

ٹیلی ویژن بنانے کی دھن ایک مدت سے متعدد سائنسدانوں کو لگی ہوئی تھی۔ جس زمانہ میں بیرڈ اسکول میں پڑھتا تھا تو تب بھی وہ اکثر اس کا چرچا سنتا رہتا تھا لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اسے یہی معلوم ہوا کہ امریکہ اور یورپ کے سائنسدانوں میں سے کوئی بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

لگے دور ہوسکتا تھا اور اس سائنسی دریافت میں کوئی خاص ترقی ابھی تک نہ ہوئی تھی۔ دوسرے سائنسدانوں کی ناکامی سے مایوس ہونے کے بجائے بیرڈ دوبارہ مصروف کار ہوگیا۔ اس نے ہیسٹنگز میں ایک مکان کے اوپر کا کمرہ کرائے پر لیا اور چند مہینے تک اسی دھن میں لگا رہا کہ ٹیلی ویژن کا آلہ تیار کرلے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب بھی ہوگا اور ہنسی بھی آئے گی کہ بیرڈ صاحب کا آلہ جس سے اس کو کامیابی ہوئی تھی کیا چیز تھا۔ کاٹھ کی چائے کے ایک پرانے صندوق پر بسکٹوں کے ایک خالی ڈبے کو رکھ کر پرانے لینس جو دو تین پنس میں آیا تھا اور بجلی کے ایک ایسے کھلونے پر مشتمل تھا جس کی قیمت چھ شلنگ سے بھی کم تھی۔ یہ عجیب اور مضحکہ خیز آلہ آج بھی ساؤتھ کینسنگٹن کے سائنس میوزیم میں محفوظ ہے۔ نہیں معلوم بیرڈ اپنی کوششوں کے تکمیل کے درجے پر پہنچ جانے کے بعد جب اس آلہ کو دیکھتا ہوگا تو اس کے دلی جذبات کیا ہوتے ہوں گے۔

بیرڈ کے اس آلے سے جو حالات رونما ہوئے وہ کچھ نئے نہ تھے کیونکہ امریکی سائنسدان جینکنس بھی اس منزل تک پہونچ چکا تھا لیکن اس آلہ کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ اس سے پہلی دفعہ بیرڈ کو اپنی مساعی میں پوری پوری کامیابی ہوتی نظر آئی۔ اس نے ایک روشن صلیب کا عکس سامنے دیکھا۔ کامیابی کی سنہری پری اس کی آنکھوں کے آگے ناچنے لگی۔ بیرڈ کے اس تجربہ کی رپورٹ جب کامل جب اخبارات میں شائع ہوئی تو سینماٹوگرافی کے ایک کارخانے کے مالک کو اس طرف دلچسپی پیدا ہوگئی۔ یہ شخص بیرڈ سے ملا اس نے اس کے آلہ کو پرکھا اور پھر پر نظر ثانی تصور کر کے بیرڈ کی ذہانت کا قائل ہوگیا اور اس کو یہ بھی یقین ہوگیا کہ وہ ایک نہ ایک دن ایک مکمل ٹیلی ویژن بنانے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ اس نے دو سو پونڈ کا ایک حصہ بیرڈ سے خرید لیا تاکہ اس سے بیرڈ کو مالی امداد مل جائے۔ ہیسٹنگز میں اس دکان پر جس کے اوپر کے کمرے میں بیرڈ نے اپنا پہلا آلہ بنایا تھا اس یادگار میں اب تک ایک بورڈ لگا ہوا ہے۔

پہلے پہل ٹیلی ویژن کے پردے پر صرف ایک پرچھائیں سی نظر آتی تھی۔ اس کے بعد روشنی منعکس ہوتی نظر آنے لگی یہ ترقی کا اگلا قدم تھا۔ مزید تجربات کرنے کے لئے زیادہ روپیہ کی ضرورت تھی۔ اس غرض سے بیرڈ لندن آیا۔ یہاں فرتھ اسٹریٹ (سوہو) میں اس نے ایک کمرہ کرایہ پر لیا یہ جگہ وہ تھی جہاں ٹریسبری کے فکسر نے اپنا فریز گرین سے سینماٹوگرافی کی پہلی مشین بنائی تھی اور یہ زمانہ تھا جب ایڈیسن کینیٹو اسکوپ بنانے کی دھن میں لگا ہوا تھا۔ بیرڈ لندن آ تو گیا لیکن اس وقت تک وہ اپنا کل اندوختہ خرچ کر چکا تھا اور اس کے پلے اب کوڑی بھی باقی نہ رہی تھی۔ کسی اہل ثروت کو اس کے کام میں دلچسپی نہ تھی کیونکہ کسی کو اس کی کامیابی کا یقین نہیں تھا۔ آخر کار مجبور ہوکر بیرڈ کو اس زمانے میں فاقے بھی کرنے پڑے تھے۔ اس نے اپنے احباب کے آگے دست سوال دراز کیا اور اس میں بالکل نئی کی منزل ملی تھی۔ اس کی مدد کی۔ جرمنی سے ریڈیو سے ایک چھوٹی سی کمپنی قائم کی گئی اور اپنے دوستوں کے ساتھ بیرڈ نے ریسرچ کا کام از سر نو شروع کر دیا۔ اپریل ۱۹۲۵ء میں بیرڈ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بجلی کے خاکوں اور سیدھے خطوط کی ترسیل میں تو کامیاب ہوگیا لیکن انسانی چہرہ یا کسی چیز کے رنگوں کی تدریجی کیفیت نہیں نظر آتی تھی۔ البتہ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں یہ مہم بھی سر ہوگئی۔

اپنے تجربہ کے لئے بیرڈ کاغذ کی ایک مورت استعمال کرتا تھا۔ شروع شروع میں پردے پر اس مورت کی صرف دھندلی سی پرچھائیں نظر آتی تھی مگر اکتوبر ۱۹۲۵ء میں ایک روز سہ پہر کے وقت یہ مورت اپنی پوری تفصیلات اور رنگوں کی تدریجی کیفیتوں کے ساتھ نظر آگئی۔ بیرڈ مارے خوشی کے بے تحاشا اچھلنے لگا۔ وہ فوراً دوڑا دوڑا زینہ سے اتر کر نیچے سڑک پر آیا تاکہ مورت کی جگہ کسی آدمی کو بٹھا کر تجربہ کر دیکھے۔ سب سے پہلا شخص جس پر اس کی نظر پڑی وہ نیچے والے دفتر کا چپراسی تھا۔ یہ چپراسی ایک پندرہ سالہ لڑکا تھا اس لئے اپنے اوپر تجربہ کرانے کے واسطے بڑی مشکل سے تیار ہوا۔ بیرڈ نے اس کو اوپر کمرے میں لے کر ٹرانسمیٹر کے سامنے بٹھایا اور خود دوسرے کمرے میں پردے پر اس کی شبیہ دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ بیرڈ نے ہر چند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن پردہ بالکل سپاٹ رہا۔ بیرڈ کو بڑی مایوسی ہوئی اور وہ اس ناکامی کی وجہ دریافت کرنے کے لئے اس کمرے میں گیا جہاں وہ لڑکے کو بٹھا کر آیا تھا۔ کمرے میں پہنچتے ہی اصل سبب کھل گیا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ لڑکا تیز روشنی کی تاب نہ لا کر ٹرانسمیٹر کی طرف پشت کر کے اور زیادہ فاصلہ پر بیٹھ گیا تھا۔ بیرڈ نے اس کی بڑی دلجوئی کی اور پورے طور پر اطمینان دلایا کہ اس کو ٹرانسمیٹر کے آگے منہ کر کے بیٹھنے سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ پھر بھی لڑکا ڈرتا ہی رہا۔ آخر کار بیرڈ نے اس کو ایک ہاف کراؤن دیا تب جا کر وہ مقررہ جگہ پر بیٹھا اور امید کے مطابق اس کا چہرہ دوسرے کمرے میں پردے کے اوپر صاف طور پر نظر آگیا یعنی تاریخ کا یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ پہلا انسان جس کو ٹیلی ویژن کے ذریعہ دیکھا گیا بڑی دقت سے کام کے لئے تیار ہوا تھا۔

تجربہ کامیاب ہو چکا تھا اس لئے بیرڈ نے چاہا کہ پبلک کے نمائندے اور سائنسدان اس کی ایجاد کو تنقیدی نظر سے دیکھیں۔ چنانچہ رائل انسٹی ٹیوشن آف گریٹ برٹین کو اس نے اس مقصد سے دعوتی رقعہ بھیجا۔ اس کی دعوت اس ادارہ کے پچاس اراکین نے منظور کی اور وہ مقررہ دن بیرڈ کے کمرے میں آئے لیکن اس کمرے میں صرف چھ آدمیوں کی سمائی ہو سکتی تھی اس لئے ان پچاس اشخاص نے چھ چھ کی ٹکڑیاں بنا کر بیرڈ کے آلہ کا مشاہدہ کیا۔ تجربہ واقعی کامیاب تھا اور جیتے جاگتے انسان کا چہرہ پردہ پر صاف طور پر نظر آ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے ہاؤس کے ایک جرنلسٹ نے ٹائمز کے اخبار نویس نے اس منظر کے بارے میں لکھا کہ ہم نے پہلی دفعہ اصلی

ٹیلی ویژن دیکھی ہے اور جہاں تک ہمیں علم ہے مسٹر بیرڈ پہلے آدمی تھے جنہوں نے اس عجیب و غریب علم کو سر انجام دیا؟

اس تجربہ کا عام چرچا ہوگیا بار گیا۔ سب کو کامیابی کا یقین ہوگیا۔ اب دو بیرڈ کی بھی کمی شہرت ہوگئی تھی۔ چنانچہ بیرڈ وہ تنگ کمرہ چھوڑ کر ایک بڑی وسیع جگہ چلا گیا جہاں تجرباتی سامان زیادہ سے زیادہ سما سکتا تھا۔ پہلے تجربہ میں آدمی کی تصویر ایک سے دوسرے کمرے میں نظر آئی تھی لیکن دو سال بعد تصویر دو منزلوں کی دوری پر نظر آگئی۔ پھر نہ صرف چہرہ ہی نظر آتا تھا بلکہ ہونٹوں کی تمام حرکات صاف طور پر دکھائی دینے لگیں۔ بیرڈ کی کوششیں یہیں ختم نہیں ہوئیں بلکہ وہ برابر اسی دھن میں لگا رہا کہ اپنا آلہ میں زیادہ سے زیادہ قوت اور کمال پیدا کرے۔ چنانچہ فروری ۱۹۲۸ء میں ترقی کی یہ منزل آگئی کہ جن لوگوں کی تصویریں نیویارک میں دیکھی گئیں وہ بالکل اصل کے مطابق تھیں اور دیکھنے والوں نے ان کو فوراً پہچان لیا۔ ایک اور دشوار گزار وادی اگلے سال طے ہوگئی جس سے معلوم ہوا کہ جہاز کی حرکات اور ہوا کی خلل اندازیاں بھی اس سلسلہ میں حائل نہیں ہوتیں۔ یہ اس طرح ہوا کہ جہاز "بیرنگاریا" کے وائرلیس آفیسر مسٹر ڈاکن نے اپنی منگیتر کو پردے پر دیکھ لیا جو اس وقت لندن میں تین ہزار میل کے فاصلہ پر ٹرانسمٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔ اب تصویریں رنگین بھی آنے لگی تھیں۔

بیرڈ کی یہ شاندار کامیابی دیکھ کر امریکہ اور یورپ کے سائنسدان پوری توجہ کے ساتھ اس طرف لگ گئے یہاں تک کہ بعضوں کو خیال ہونے لگا کہ اب برطانیہ اس دوڑ میں پیچھے رہ جائیگا۔ ۱۹۳۰ء میں بی بی سی سے ٹیلی ویژن کا خاص پروگرام پابندی کے ساتھ ہونے لگا مگر محسوس کیا گیا کہ کام زیادہ اطمینان بخش طریقہ پر نہیں ہو رہا ہے اسلئے ۱۹۳۴ء میں ایک مجلس مشاورت مقرر ہوئی۔ اسکی تشخیص اگست ۱۹۳۶ء میں بارآور ہوئیں۔ حتی کہ آج انگلستان کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ وہاں بہترین اور جدید ترین آلۂ غائب بینی موجود ہے۔ برطانوی ٹیلی ویژن کا مرکز الگزانڈرا پیلس ہے۔

اس ایجاد سے فارغ ہوکر بیرڈ نے ٹیلی ویژن ٹیلی فلمز کی ریسرچ کا کام شروع کر دیا تھا اسکی انتہائی ترقی اور تکمیل اسکے سامنے نہ ہو سکی۔ بہ ٹیلی ویژن کو مکمل شکل ۱۹۲۵ء میں دیکھا جا چکا تھا ۱۹۲۸ء میں وہ عملی کر دکھائی بھی ایجاد کر چکا تھا۔ جان بیرڈ کی کوششوں، احسانات اور خدمت خلق کے جذبہ کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ دنیا کو یہ مفید تحفہ دینے کے لئے جان بیرڈ نے رات دن ایک کر دیئے تھے۔ اسی دھن میں انہوں نے کئی کئی روز فاقے بھی کئے اور لوگوں کے آگے ہاتھ بھی پھیلایا۔ اس میں انکی کوئی ذاتی غرض پنہاں نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے صرف خدمت خلق کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ مسٹر بیرڈ جسکا ٹیلی فون ایک چشم زدن میں مکمل بے رحمی کے ساتھ اکھاڑ کر پھینک دیا گیا تھا آگے چل کر ایک ایسی چیز کا موجد ہوا جس کو دنیا ہمیشہ ہمیشہ سراہتی رہے گی۔ جان بیرڈ کا انتقال اٹھاون سال کی عمر میں ۱۴ جون ۱۹۴۶ء کو بکس ہل کے مقام پر ہو گیا۔

بادِ شمال ـــ خورشید اسلام

جس پہ ہے آج ہمیں ریزۂ مینا کا گماں
یہ جہاں بادۂ گلرنگ کبھی تھا کہ نہیں
یوں تو مسلم یہ جہاں خون بھی ہے سنگ بھی ہے
موجۂ خون رگِ سنگ کبھی تھا کہ نہیں
جس تلاطم میں ہے آواز مگر سوز نہیں
اس تلاطم میں بھی آہنگ کبھی تھا کہ نہیں

جو مرے شیشے میں باقی ہے وہ آنسو بھی نہیں
تیرے شیشے سے جو چھلکی تھی وہ مے کیا ہوگی
جو مرے ساز سے نکلی ہے نوا سے کم ہے
جو ترے ساز سے نکلی تھی وہ لے کیا ہوگی
نرم کرنوں میں لجاتی ہوئی نرگس کا خمار
اے مرے دیدۂ بے خواب وہ شے کیا ہوگی

نہ فسوں ہے نہ فسانہ نہ تسلی نہ فریب
تجھ پہ اے پیرِ مغاں ناز کریں یا نہ کریں
دل میں پرواز کی حسرت تو ہے اے جذبۂ دل
ہمنفس ہمتِ پرواز کریں یا نہ کریں
سر میں یہ دورِ قیامت ہے تو اے تشنہ لبی
پھر نئے دور کا آغاز کریں یا نہ کریں

خم کے خم تر ہیں خیال مے و مینا کے نثار
خم کے خم تر ہیں ادھر بادِ شمال آتی ہے
میکدہ آج کفِ دست پہ نہ لپکے تو کہیں
اس خرابے سے مگر بوئے جمال آتی ہے
لاؤ تیشہ کہ در میکدہ پھر باز کریں
میکشو آؤ کہ وہ جانِ وصال آتی ہے

آخری تاجدار اودھ کے منظوم خطوط

سید اقبال عظیم

تاریخ شاہد ہے کہ انسانی فطرت کا اپنے ماحول سے متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کے لئے اب کسی مزید استدلال کی ضرورت باقی نہیں۔ اس لئے کہ چھان بین کرنے والوں نے جدید تحقیقات کی روشنی میں جو معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ اس بات پر بالتصریح دلالت کرتی ہیں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ کا کوئی جزو بھی ایسا نہیں جو قدرت کے اس اٹل قانون کا پابند نہ ہو۔ یہ چیز دوسری ہے کہ ہمارا فطری رجحان اسے میدان عمل میں اپنے مذاق کے مطابق ایک نئی شاہراہ اختیار کرلے لیکن اس امتیازی صورت میں بھی جو چیز سب سے پہلے ہمارا سہارا بنتی ہے وہ ہمارے گردوپیش کے تاثرات ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارا ماحول ایک سانچہ ہے جس میں ہمارے ذوق سلیم کی تکمیل ہوتی ہے، ایک سرچشمہ ہے جس سے احساس لطیف سیراب ہوتا ہے، ایک پس منظر ہے جس کے اشارے پر زندگی رقص کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی ادیب کا ادبی کارنامہ۔ کسی شاعر کا شعر۔ کسی مصنف کی تصنیف یا کسی اہل فن کا فنی شاہکار، تصویر ہوتی ہے ان تاثرات کی جن کی آغوش میں اس کی ذہنی قوتیں پرورش پاتی ہیں۔ اپنی انفرادی صلاحیتوں کے باوجود یہ کام اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ ان تاثرات سے دامن بچا کر نکل جائے۔ اس کے ہر لفظ میں اس کے گردوپیش کی جھلک اور اس کے ہر نقش میں اس کے ماحول کی کارفرمائی موجود ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے بذات خود اس چیز کا علم نہ ہو لیکن یہ تاثرات غیر محسوس طریقہ پر اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور اس کی فطرت غیر ارادی طور پر ان سے اثر قبول کرتی رہتی ہے۔

اس کلیہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم آخری تاجدار اودھ یعنی سلطان عالم نواب واجد علی خاں اختر کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی زندگی کے دو مختلف اور متضاد دور ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک روشن اور دوسرا تاریک۔ روشن دور کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب زندگی کی تمام رنگینیاں سلطان عالم کے قدموں پر سجدہ ریز تھیں۔ یعنی تخت و تاج دولت و ثروت۔ جاہ و حشم اور عزت و وقار کے ساتھ ساتھ انہیں وہ سب کچھ میسر تھا جو شاہی اقتدار کا حصہ ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ اس لئے رنگ و شباب کے اس دور میں جہاں رقص و سرود اور لہو و لعب کا بازار گرم تھا سلطان عالم نے اپنے فرائض منصبی کی طرف سے بھی آنکھیں بند کرلی تھیں تاکہ زندگی کا ایک واحد لمحہ بھی فکر و بے اطمینانی سے مکدر نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا وہ کلام جو اس دور کی پیداوار ہے شوخ و شاداب تو ضرور ہے لیکن بے اثر اور بے کیف ہے۔ اس میں وہ ہوک نہیں جو دلوں کو تڑپا دے، وہ کسک نہیں جو روح کو بیدار کر دے۔ بقول حالی۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں — پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو

شعر اسی وقت شعر ہے جب اس میں سوز و گداز ہو اور اس سوز و گداز کے لئے درکار ہے ایک درد مند دل جس میں ناکامی اور حرمان و یاس کی تڑپ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ سلطان عالم کی زندگی جس رنگین ماحول میں سانس لے رہی تھی وہاں ان چیزوں کا ذکر کہاں! نتیجہ لازمی طور پر وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی الابتدا تا انتہا ان کا وہ کلام جو اس زمانہ سے متعلق ہے پھیکا اور بے مزہ ہے۔

لیکن زمانہ کی گردش کو یہ کمال دکھانا مقصود تھا۔ وقت کا پانسہ پلٹا اور زندگی نے کروٹ لی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پرکیف فضائیں جو گھنگروؤں کی جھنکار اور شیریں نغموں کی الاپوں سے گونج رہی تھیں یک بیک خاموش اور اداس ہو گئیں یعنی تاجدار اودھ نے ہمیشہ کے لئے تخت و تاج کو خیرباد کہا اور حاکموں کی صف سے نکل کر محکوموں کی صف میں جا کھڑا ہوا۔ دل پر ایسا کاری زخم لگا کہ وہ درد و کرب کی شدت سے چیخ اٹھا اور یہ شعر پڑھتا ہوا با حسرت و یاس اپنے وطن سے رخصت ہوا

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں — خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

یہ شعر گویا سلطان عالم کے اس دیوان کا مطلع اول تھا جو ان کی زندگی کے تاریک دور کے ہاتھوں مرتب ہوا۔ اب سلطان عالم شاہ اودھ نہ تھے بلکہ ایک شاعر تھے اور محض ایک شاعر اس لئے کہ اب ان کے سامنے عالم رنگ و بو کے بجائے محرومی و ناکامی کا ایک بحر ناپیدا کنار تھا اور ان کے دل میں وہ تڑپ تھی جو ایک شاعر سے شعر کہلواتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب ہمارے سامنے ان کا وہ کلام آتا ہے جو اس دور کی تصنیف ہے تو اکثر و بیشتر ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور ہمارا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

اس سلسلے میں ان کے کلام کا جو حصہ بالخصوص قابل توجہ ہے وہ

سلطان عالم کے وہ منظوم خطوط ہیں جو انہوں نے عالم غربت میں اپنی محبوب بیگمات کے نام لکھے ہیں۔ چنانچہ ان کی وہ شہرۂ آفاق مثنوی جس کا خطاب سیتلن کی طرف سے ہے اور جسے میں لکھنؤ سے کلکتہ تک کی حال بیان دینے والی معاملات قلم بیان کی گئی ہے اپنی مثال آپ ہے۔ فن اور بیان کے لحاظ سے تو خیر اس کی جہاں تک تعریف کی جائے کم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں روانی، سلاست اور فصاحت اس بلا کی ہے کہ وہ اردو کی کسی اچھی سے اچھی مثنوی سے ٹکر لے سکتی ہے۔ تیج حقائق کو شاعرانہ تاثرات قلبی میں کچھ اس طرح حل کیا ہے کہ اس مثنوی کو ایک ادبی شاہکار تسلیم کرتے ہی بن پڑتا ہے۔ اگر سلطان عالم تقدیر کے ہاتھوں ایسی گہری چوٹیں نہ کھاتے تو شاید ان کا یہ کارنامہ کبھی عالم ظہور میں نہ آتا۔ اس خط کی ابتدا ملاحظہ ہو ؎

اے مری جان مونس و غمخوار — حال لکھتا ہے تیرا اختر زار
دل بھلاتا ہے خدا کی قسم — کیا ہی بیدرست وہ ہے غم پیہم
دم بدم سر پہ آہ و نالہ و زار — نہ کوئی دوست نہ شفیق و نیار
خود صحرا و تھا دیسہ وطن — پھاڑ کے کھاتا ہے مجھکو سند و بن
جبسے آئے ہیں شہر کلکتے — دامن دل کے ہو گئے ٹکڑے
سیتلن تیری یاد میں واللہ — کھو گیا رو تے روتے نور نگاہ
کبھی آنکھوں سے اشکباری ہے — کبھی یہ شعر لب پہ جاری ہے
اپنے اختر کی لے خبر جانی — کشتیٔ دل ہوئی ہے طوفانی

اس حالکا وسفر کے دوران نواب کو جن جن مصائب و مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ان کا دردناک بیان بالتفصیل اس خط میں منظوم ہے۔ کانپور میں جو مکان انہیں قیام کے لئے ملا تھا اس کا ذکر خود انہیں کی زبانی سنئے ؎

وہ برنگون کا ایک بنگلا تھا — اپنی قسمت سے بھی تھا تنگ سوا
رات دن سب کے لیں خطوں پہ — پاؤں پھیلئے تو پھر عدم کو دان
ہاتھ پنچے کا کہنہ سا چھپر — ساتھ سائے کے دھوپ تھی پھر
لو کے جھونکے ہوا گرم تیز — جلتے مانند کہیں نہ پائے گریز

گویا صاف شفاف پانی کا ایک چشمہ ہے کہ ابلتا چلا جاتا ہے۔ نادر تشبیہات، خوبصورت استعارات اور پھر محاورات فارسی کا استعمال بے تکان صرف! اس قیام کے سولہ روز بعد جہاز کا سفر شروع ہوتا ہے۔ پڑھئے اور دیکھئے کہ جس تاجدار نواب نے کبھی پھولوں کی سیج اور مخمل و کمخواب کے فرش سے باہر قدم نہ نکالا تھا اپنی بدنصیبی کی بدولت کہاں سے کہاں پہونچتا ہے ؎

سولہویں دن جہاز پر بیٹھے — جوں نگس جا کے بانس پر بیٹھے
کیا کہیں کیسے تھی ستم ہائے — کیسے وہ دے فلک نے دکھلائے
آندھیاں وہ جہاز پر ان رات — دل کی تھی منہ سے یہی کچھ بات

برق کا شور ہو رعد کا وہ زور — برق کی روشنی سے چشم کو کور
وہ تماشا ہے جو شین ہوں میں — مثل فرہاد کوہکن ہوں میں
لیلیٔ دلربا مہر بانی کر — اپنے ہاتھوں سے کچھ نشانی کر

سلطان عالم کو زبان پر جو ملکہ اور قدرت حاصل ہے ہر ہر لفظ اس کا گواہ ہے۔ بالخصوص آخری دو شعر قابل صد تحسین و آفریں ہیں کہ شاعر نے کس خوبصورتی سے گریز کیا ہے یہ خوص تھا طلب اور یہ التجائے معصوم! سبحان اللہ! غالب نے نثر میں خط کو ایسا انداز دیا کہ جیسا کہ تاج تک صحیح معنوں میں اس کی تقلید کسی سے نہ ہو سکی لیکن اب یہ بھی دیکھئے کہ سلطان عالم نے کس خوبی سے نظم میں اسی نثر کا لطف پیدا کیا ہے جو غالب کا طرۂ امتیاز ہے یعنی وہی سلیقۂ خطاب۔ وہی بے تکلفی۔ وہی روزمرہ اور وہی دو بدو گفتگو کی چاشنی۔ مطلعاً حسن و عشق کو اس بیچارگی اور سادگی سے نظم کرنا کچھ آسان کام نہیں ؎

یاد رخ میں یہ حال ہو چکا ہے — روز گنتا ہوں کہ نظر مل ہو چکا ہے
ملکہ سیتلن خدا کے لئے — خط لکھو کا تجھ غریب کی جئے
ایک پرچہ لکھا دل اے گل تر — اپنے احوال کی بھی کی نہ خبر
کہو احوال آج کیسا ہے — دل لگا ہے، مزاج کیسا ہے
اپنے عاشق کو یوں جلاتے ہیں! — اتنا بھی دیر میں ستاتے ہیں؟
جلد لکھکر جواب بھیجو انا — اپنے اختر کے پاس پہونچانا

ایک دوسرے خط کا جو ملکہ امتیاز محل کے نام ہے آغاز یوں ہوتا ہے ؎

اے مری جان امتیاز محل — یاد کرتا ہوں تجھ کو میں ہر پل
خط جو آیا تو مہربانی کی — مجھ غریب پر شانی کی
دیکھکر اس کو دل ہوا خرم — اشک شادی مرے بہے پیہم
اس کی ہر بیت بیت ابروتھی — سطر ہر ایک چشم آہو تھی

کچھ دور آگے بڑھکر شاعر نے دو شعر ایسے لکھدیئے ہیں جو لفظی الفاظ نظر آتے ہیں مگر لاجواب ہیں ؎

گو دکھاتے تھے ہم جہینہ کا پاس — پر بجلی رہتی تھی ملنے کی آس
پاس رہتی ہے وہ پری کا جہاں — جا ہی بادہ بخش گے ایک پل [illegible]

سب کچھ کہے جانے کے بعد سلطان عالم اپنی اس ملکہ کو دلاسا دیتے ہیں جو ان کی جدائی میں بے چین اور بیتاب ہے اور اس دلاسے میں اپنی تسکین قلب بھی منظور ہے۔ یہ وہ منزل ہے جب انسان پے در پے ناکامیوں کے بعد تھک کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کا سہارا صرف وہ امید رہ جاتی ہے جو شکم تو ڑ رہی ہو لیکن اس انتہائی مایوسی کے عالم میں بھی تقدیر سے جنگ جاری ہو ؎

درد دل کی نہیں دوا سمجھو — مرض ہجر کو گیا سمجھو
کیا جدائی کبھی نہیں ہوتی — ہجر میں آنکھ کیا نہیں روتی
وصل بھی پھر نصیب ہوتا ہے — روتے روتے کا [illegible] ہوتا ہے

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

برمیوں کے رنگ ڈھنگ

نریندر کمار

برما کے معاملات میں ہندوستانیوں کو بڑی گہری دلچسپی رہتی ہے۔ برما کی ترقی اور خوشحالی میں ہندوستان بڑے پرانے زمانہ سے برما کی امداد کرتا رہا ہے۔ ابھی کی بات ہے کہ ہندوستان نے اس کو جاپانیوں کے چنگل سے بچانے میں نمایاں حصہ لیا اور آج بھی یہ برما کی نئی تنظیم میں برابر اس کا مددگار بنا ہوا ہے۔ یہ بھی ایک قدرتی امر ہے کہ ہندوستان اپنی بعد از جنگ تدابیر کا مقابلہ برما کی تجویزوں اور خاکوں سے کرتا رہتا ہے کیونکہ آخر کار ان کی ایک دوسرے پر اثر اندازی لازمی ہے۔

اگرچہ برما کی سرزمین پر ساڑھے تین سال کی لڑائی کی تباہ کاریوں کے اثرات اب بھی موجود ہیں لیکن وہاں سیاسی بیداری اور حقوق کی لگن بھی پیدا ہو چکی ہے اور بڑی حد تک اہل برما کے جائز مطالبات پورے بھی کئے جا رہے ہیں۔ سِول حکومت کا قیام وہاں اکتوبر ۱۹۴۵ء میں ہو گیا تھا اور اب وہاں کی حکومت گورنر کے ہاتھ میں ہے اور وہ مجلس مشاورت اور مجلس آئین ساز کی مدد سے وہاں کا کام چلا رہا ہے۔ حالانکہ ۷ امئی ۱۹۴۵ء کے برطانوی قرطاس ابیض کا منشا یہ تھا کہ ۱۹۳۵ء کے برما ایکٹ کا احیا دسمبر ۱۹۴۵ء میں ہو لیکن دارالعوام کے تازہ بل کے مطابق نئے انتخابات اپریل ۱۹۴۷ء میں ہو جائیں گے۔

برما کی سیاسی فضا

برما کی سیاست بڑی عجیب ہے۔ ایک طرف تو انتہائی ترقی پسندی نظر آتی ہے اور دوسری طرف ذاتیات کی جا بجا کشمکش اور تنازعات۔ برما کی موجودہ سیاسی جماعتوں میں فاشیت کی مخالف جماعت "پیپلز فریڈم لیگ" بہت نمایاں ہے۔ اس جماعت کے نوجوان لیڈر "جنرل اونگ سان" ہیں۔ اس جماعت کا خاص مطالبہ یہ ہے کہ برما میں فوری طور پر عارضی قومی حکومت قائم کر دی جائے اور آئین ساز مجلس کے اعیان وہ ہوں جنہیں جمہور انتخاب کریں۔ (۱۸ سال سے اوپر کے ہر مرد عورت کو رائے دہندگی کا حق حاصل ہونا چاہیئے)۔ یہ جماعت شروع ہی میں مجلس مشاورت اور مجلس آئین ساز کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی کیونکہ گورنر اس وقت اس مجلس کے تمام مطالبات ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس جماعت کے رویّہ میں اور بھی زیادہ شدت پیدا ہو گئی ہے۔ اس واقعہ سے کہ گورنر نے اس جماعت کے رضا کاروں کو فوجی پریڈ وغیرہ کرنے سے منع کر دیا۔ دوسری مضبوط جماعت سنیاتا جماعت ہے جس کے خیالات مذکورہ بالا جماعت کے خیالات سے بہت ملتے جلتے ہیں لیکن یہ لوگ اب تک ڈاکٹر باؤ موہی کے منتظر ہیں جو اب تک جاپانی قید میں ہیں۔ برما کی اشتراکی جماعت بھی کافی مضبوط ہے لیکن اس جماعت میں اندرونی طور پر بہت سے تفرقے ہیں۔

برما کا نیا بل

اس پس منظر کا خیال رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ۲۸ جون ۱۹۴۶ء کو جو بل پاس ہوا ہے اس سے آگے چل کر برما کی تمام سیاسی خواہشات پوری ہو ہی جائیں گی۔ اصل تو یہی کہ دارالعوام میں مسٹر ہینڈرسن نے جو وعدہ کیا ہے اس سے امید پڑتی ہے کہ برما میں آئینی حکومت کے احیاء کی تاریخ ڈیڑھ سال پہلے آ گئی ہے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں نئے انتخابات ہو جائیں گے۔ تقریباً ہر بالغ برمی رائے دے سکے گا۔ اس وجہ سے برما کے رائے دہندگان کی تعداد تیس لاکھ کی بجائے ستر لاکھ ہو گئی ہے۔ وزارت انتخابات کی تابع ہو گی اور ایک آئین ساز مجلس قائم کر دی جائے گی۔ اسی کے ساتھ ساتھ مسٹر ہینڈرسن نے کہا: "حکومت برطانیہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ برما میں کسی قانون کا نفاذ زبردستی کیا جائے۔"

یہ ظاہر ہے کہ برما کے دیہات میں شدت پسندی کا بہت زور ہے۔ مسلح ڈاکوؤں کے جتھے کسانوں کو ڈراتے اور لوٹتے پھرتے ہیں۔ برما کے قائم مقام گورنر سر ہینری نائٹ نے کہا "ڈاکو برما کا سب سے بڑا دشمن ہے"۔ برما کی حکومت اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے اور اس اہم کا حل سوچ رہی ہے لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ گزشتہ مارچ سے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔

ہندوستان کی امداد

برما کے مذکورہ بالا سیاسی حالات اور جرائم وغیرہ کی کثرت کی وجہ سے اس وقت برمی لوگ مثلاً زمیندار، کاشتکار، بیوپاری اور مزدور اقتصادی نئی تنظیم کے بڑے خواہاں ہو رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ پچھلے سال کی بہ نسبت اس سال بیس لاکھ ایکڑ زیادہ زمین جوتی اور بوئی جائے گی اور وہاں تقریباً بیس لاکھ ٹن چاول بچ رہے گا جس کی برآمد کی جائے گی۔ ہندوستان کی مدد سے اگلی فصل میں یہ مقدار اور بھی بڑھ سکتی ہے۔ آٹھ کروڑ کا برطانوی قرضہ جس پر کوئی سود نہیں لیا جائے گا برما کو تنظیم نو میں کافی مدد دے گا۔ اس قرضہ کا کچھ حصہ ہندوستانی سکوں میں بھی تبدیل کیا جا رہا ہے تاکہ برما اپنی ضرورت کی اشیاء ہندوستان سے

بقیہ صفحہ ۱۸ پر

قاتلہ

افسانہ

مصنفہ
محمود کامل (مصری)

مترجمہ
صلاح الدین قریشی دہلوی

اسکندریہ کی فوجداری عدالت میں لوگوں کا ہجوم تھا ہزاروں آدمی خیریہ بالم فوزی کے مقدمے کی کارروائی دیکھنے کے لئے عدالت کے کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ خیریہ فوزی پر الزام تھا کہ اس نے پستول سے اپنے خاوند تسلیم بک فوزی کو عمداً قتل کر دیا ہے۔

اخبارات میں اس خبر کے شائع ہو جانے کے بعد لوگوں کا اس طرح عدالت میں جمع ہو جانا اور اس واقع کی اہمیت کا بڑھ جانا بالکل قدرتی امر تھا۔ اس سلسلے میں پولیس کی تفتیش ہوئی تو قطعی دلائل اور خود مقتول کے مختلف رشتہ داروں کے بیانات نے یہ ثابت کر دیا کہ ملزمہ کو اپنے خاوند سے بے حد محبت تھی۔ اسلئے یہ ناممکن سی بات ہے کہ وہ ایسے قتل کی مرتکب ہو یا اسے کوئی معمولی سی اذیت پہنچانے کا بھی خیال کرے۔

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ ملزمہ لوہے کے کٹہرے میں آئی اور بالکل آخر میں حاکم کی میز کے قریب سر و قد کھڑی ہو گئی۔ اسکا چہرہ بالکل اترا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود حسن اور جوانی کے تیور دہی تھے۔ اسکی عمر تئیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ لمبا قد، چھریرا جسم اور متناسب اعضا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے متعجبانہ انداز میں کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسکا ہاتھ کبھی کٹہرے پر نظر آتا اور کبھی ایک چھوٹا سا رومال اس میں چھپے رہتا۔ اس کی کنپٹیاں بار بار سختی سے دانت بھینچنے کی وجہ سے ابھرتی نظر آ رہی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سخت اعصابی کشمکش اور روحانی الجھن میں مبتلا ہے۔

حاکم عدالت مع جیوری اور سرکاری وکیل کے کمرے میں داخل ہوا۔ ان لوگوں نے اپنا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ ملزمہ انہیں دیکھکر لرز اٹھی اور کھوئی کھوئی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بہت ضروری چیز کی تلاش میں ہے۔

لوگوں نے جب اسے رہ رہ کر دروازے اور وکیلوں کے بنچ کی طرف تکتے دیکھا تو اسکا مقصد سمجھ گئے۔ اخبارات میں یہ خبر شائع ہو چکی تھی کہ ملزمہ نے فوجداری مقدمات کے ماہر اور شہر کے مشہور وکیل عبدالرؤف بک سلام کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے لیکن وہ موجود نہیں تھے اور کہیں ان کا پتہ نہیں تھا۔

مجسٹریٹ نے پکارا:- خیریہ فوزی!

نوجوان ملزمہ نے دبی ہوئی گلوگیر آواز میں جواب دیا:- جی حضور!

اسی وقت استاد ابراہیم صدقی اپنی جگہ سے اٹھا اور ملزمہ کے وکیل استاد عبدالرؤف بک کی طرف سے اچانک بیمار ہو جانے کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکنے کی معذرت کرتے ہوئے ملزمہ کی طرف سے خود پیش ہونے کی اجازت چاہی۔

ابراہیم صدقی اسوقت تک اکثر دوسرے نوجوان وکیلوں کی طرح غیر مشہور تھا۔ عدالت کے کمرے میں جو لوگ موجود تھے انہوں نے جب ایک نوجوان کو جس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی ملزمہ کی طرف سے پیش ہوتے دیکھا تو ایک حد تک ناامید ہو گئے۔ اسکا رنگ گورا، بال سنہری اور آواز دھیمی تھی۔ شرم اور ہیبت اسکی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے لوگ ایک پرانے عمر رسیدہ وکیل کی امید پر بیٹھے تھے جو دور دور مشہور تھا۔ اس ناامیدی کا اثر سب سے زیادہ ملزمہ کے رشتہ داروں پر تھا۔ وہ لوگ لڑکی کے بری ہو جانے سے قطعی مایوس ہو چکے تھے۔ حالانکہ عبدالرؤف بک نے انہیں پورا یقین دلایا تھا کہ یا تو لڑکی کو بالکل بری کر دیا جائیگا یا زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کی قید کی سزا ہو سکے گی۔ لیکن نوجوان وکیل نے جب لڑکی کی طرف سے بحث شروع کی تو لوگوں کی مایوسی آہستہ آہستہ دور ہونے لگی یہاں تک کہ بالکل ختم ہو گئی۔ بلکہ اس کے بجائے لوگوں کو مقدمے کی تفصیلات کے بارے میں اسکی باریک بینی اور صحیح سوجھ بوجھ پر ایک قسم کی حیرت ہونے لگی۔

اس نے خاص طور پر ان جذبات انگیز واقعات پر زور دیا جن سے مغلوب ہو کر ملزمہ نے اقدام قتل کیا تھا اور ساتھ ہی یہ چیز خصوصیت سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قطعی دلائل سے یہ حقیقت بالکل صاف ہے کہ لڑکی کو اپنے خاوند سے بہت محبت تھی۔ اس کے ثبوت میں اس نے ان دونوں کے وہ خفیہ خطوط پیش کئے جو شادی سے پہلے اور اس کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کو لکھے تھے۔ ان تمام چیزوں کو یہ ثابت تھا کہ لڑکی اپنے خاوند کی رضامندی اور خوشی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو ہر وقت تیار تھی۔ اسکا خاوند تسلیم بک فوزی، انجینیر تھا اور ایک غیر ملکی کمپنی میں ملازم تھا۔ کسی نہ کسی طرح دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ لڑکی اس زمانے میں قاہرہ کے ایک انگریزی اسکول میں تعلیم پا رہی تھی یہ سلسلہ دنوں تک قائم رہا یہانتک کہ وہ دل دے بیٹھی اور اسکی محبت کا دم بھرنے لگی۔ آخر اس نے اپنے خاندان کی سخت مخالفت کے باوجود شادی کر لی۔ شادی کے بعد وہ اسکے ساتھ اسکندریہ چلی آئے جہاں وہ ملازم تھا یہاں وہ آٹھ سال تک اپنے خاوند کے ساتھ رہی۔ اس دوران میں اسکی محبت برابر بڑھتی رہی۔ وہ ہمیشہ ایسے کام کیا کرتی تھی جن کے متعلق وہ جانتی تھی کہ اس کے خاوند کو خوشی ہوگی، یہی نہیں بلکہ وہ ان فرائض کو بہت ہی خوش اسلوبی

سے انجام دیتی تھی۔ تفتیش کے دوران میں اس قسم کا ایک عجیب واقعہ علم میں آیا۔ تسلیم کا یہ معمول تھا کہ اکثر اتوار کے دن وہ شکار کے لئے جایا کرتا تھا۔ وہ اکثر افسوس کیا کرتا تھا کہ بندوق نہ چلانے کی وجہ سے وہ اس کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اس کے ایک دوست کی بیوی، اپنے خاوند کے ساتھ برابر شکار کو جاتی ہے اور ایک حد تک ہر کام میں شریک رہتی ہے۔ خیریہ نے اپنے خاوند کو خوش کرنے کے خیال سے ہتھیار لیا اور نشانہ کی مشق کرنے لگی۔ ایک دن وہ ریوالور میں کارتوس رکھ رہی تھی کہ وہ چل گیا اور اسکی پنڈلی میں بڑا سخت زخم آیا ایسا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی...... آہ! اسکا پیارا شوہر! لیکن خیریہ کی اس گہری اور فراموش محبت کا جواب کبھی نہیں ملا۔ ایک دوسرے کے ساتھ اتنا طویل عرصہ گذارنے کے بعد تسلیم کا جی بھر گیا۔ کچھ دنوں بعد وہ گھر کے کام کاج کے لئے قاہرہ سے ایک ملازمہ کو لایا جو اس کے والد کے یہاں ملازم تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا اور جب تک اس نے شادی کر کے گھر کے ترجیحی اپنی شرعی بیوی کی طرح اسے ایک اور مکان میں آباد نہ کر لیا بیچاری خیریہ کو خبر تک نہ ہونے پائی۔

خیریہ نے بیوی کی حیثیت سے اپنی اتنی بڑی توہین ہونے پر بھی اس سے کوئی انتقام نہیں لیا۔ اس کے باوجود وہ تسلیم سے برابر محبت کرتی رہی! یہ چیز اسکے ایک خط سے ثابت ہوئی جو اس نے تسلیم کی نئی بیوی کے گھر پر اس کے نام بھیجا تھا اور مرنے کے بعد اس کے کاغذات میں سے نکلا۔ اس میں لکھا تھا۔

"...... تسلیم پیارے میں تم سے اب بھی محبت کرتی ہوں ...... میں ان لمحوں کو کبھی نہیں بھولوں گی جو میں نے تمہاری حسین آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گذارے ہیں۔ میں تم سے ناراض ہونا نہیں چاہتی۔ میرا اب یہ حق نہیں ہے کہ تمہیں زبردستی اپنے سینے سے لگاؤں۔ یہ حق اب ایک دوسری عورت کے حصے میں آچکا ہے۔ میں صرف اتنا چاہتی تھی کہ تمہیں اس انتخاب میں ذرا سمجھ سے کام لینا چاہئیے تھا۔ تمہیں بھی تو میرے گھر والوں کی مخالفت کا حال معلوم ہی ہے ...... تم نے جو مجھے تکلیف پہنچائی ہے میرے نزدیک اسکی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ تمہارا اپنا فعل ہے میں تم سے اس سلسلے میں معذرت چاہتی ہوں۔ اسلئے کہ ہر مرد کی روح میں ایک ایسا گوشہ ضرور ہوتا ہے لیکن میں تو اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں اور جب اپنے پیارے بچے شکری کی آنکھوں کو دیکھتی ہوں تو بے اختیار تم یاد آجاتے ہو ...... کیا تم مجھی آنے کی تکلیف گوارا نہیں کروگے؟ ہمیں اس معصوم ننھے بچے کے مستقبل کا کوئی انتظام کرنا ہے۔"

ظالم شوہر نے اس مجبور درخواست کو قبول کر لیا اور خیریہ نے اس سے اپنے لڑکے شکری کے متعلق کچھ باتیں کرنی چاہیں۔ اس نے خواہش کی کہ شکری کو اسکا آخری سہارا سمجھ کر اسی کے پاس چھوڑ دیا جائے تو تسلیم نے بڑی سختی کیساتھ جواب دیا۔ "میں اپنے بچے کو ایک مطلقہ عورت کے پاس چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

خیریہ نے اس سے دریافت کیا۔ "کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ ایک ملازمہ اسکی تربیت کرے؟"

تسلیم نے اکھڑتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ اب میری بیوی ہے، میں اس کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔"

اس نے تسلیم کا دامن پکڑ لیا اور چلانے لگی: "لیکن مجھے میرا لڑکا چاہیئے ...... میں اسے کسی طرح نہیں چھوڑ سکتی ...... پیارے فوزی ایسا کبھی نہیں ہو سکتا چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔"

تسلیم نے زبردستی اس کو فرش پر دھکیل دیا۔ آنسو برابر اسکی آنکھوں سے جاری تھے۔ دروازے کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"وہ تجھ سے زیادہ بہتر ہے!"

اس کے بعد ہی اسکا ہاتھ بے اختیار ریوالور کی طرف بڑھا اس نے فائر کیا گولی پیٹھ پر لگی اور وہ وہیں گر پڑا، ساتھ ہی خیریہ بھی اس کی لاش کو چومتی ہوئی اور اس کے خون سے اپنا چہرہ رنگتی ہوئی اس کے پہلو میں گر پڑی۔ وہ بڑی طرح رو رہی تھی اور شور مچا رہی تھی ......

لوگوں کو نوجوان وکیل کی بحث کے دوران میں ان تمام واقعات کا پتہ چلا اور ہر شخص کو خواہ مخواہ اس سے ہمدردی ہو گئی۔ ان واقعات کا علم ہو جانے کے بعد لوگوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ وہ قاتلہ نہیں بلکہ دیوانی ہے!

سرکاری وکیل کو بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ یہ جرم جذبات سے مغلوب ہو کر سرزد ہوا ہے اور اس اعتبار سے یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی طرف فرانس میں خاص طور پر توجہ دی جاتی ہے اور اکثر بری کر دیا جاتا ہے۔ اسکا خیال تھا کہ اس وقت مصر کی موجودہ سوسائٹی بھی کچھ ایسے ہی حالات سے گزر رہی ہے۔ آخر میں اس نے عدالت سے درخواست کی کہ ملزمہ کو جو حالات درپیش تھے انہیں ضرور سامنے رکھا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مختلف دلائل سے جرم کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور ملزمہ کو ایک قاتلہ کی حیثیت سے سزا دینے کی طرف توجہ دلائی۔

عدالت جیوری سے مشورہ کرنے کی غرض سے برخاست ہوئی اور تھوڑی دیر بعد خیریہ فوزی کو چھ مہینے کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ فیصلے میں ان مختلف حالات کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا تھا جو ملزمہ کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے کے متقاضی تھے۔

خیریہ عدالت کے کٹہرے سے ہنسی خوشی نکلی چونکہ وہ اب پھانسی کی کال کوٹھڑی سے بچکر نکل آئی تھی۔ وہ اپنے وکیل کی طرف شکریہ ادا کرنے کے خیال سے بڑھی اور اسے بتایا کہ اپنی زندگی کے لئے وہ ہمیشہ اسکی کوششوں کی احسان مند رہیگی۔

خیریہ اس نوجوان وکیل کے متعلق سوچتی ہوئی گھر آئی اور دیر تک اس راز پر غور کرتی رہی جس نے ابراہیم عدلی کو ایسے عجیب طریقے پر اسکی وکالت کرنے پر مجبور کیا ...... ادھر ابراہیم عدلی بھی خیریہ کے مقدمے کا فائل جیس

اس عشق و محبت سے لبریز واقعہ کی تفصیلات، مقتول شوہر کے نام اس کے محبت بھرے خطوط، اسکی فطرت کی باریک سے باریک حقیقتیں، الفاظ و جذبوں سے گرمائے ہوئے جذبات، یہ سب چیزیں لپٹی ہوئی تھیں جو اپنی بغل میں دبائے گھر آیا۔

وہ دیر تک اس عورت کے متعلق سوچتا رہا جس کے مقدمے نے اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک غیر معمولی درجہ حاصل کر لیا تھا .... آہستہ آہستہ وہ اس مقتول شوہر کی حالت پر ایک قسم کا رشک کرنے لگا جو ایک زمانے میں اس محبت سے مالا مال تھا جسکی کہانی کے مختلف اجزاء اس کے سامنے کھلے ہوئے فائل میں بکھرے پڑے تھے۔ اچانک اسے اس گہری حقیقت کی جھلک نظر آئی جو اس کی لوح کی تاریکی میں دُبی ہوئی تھی ..... اس نے سمجھ لیا کہ خیریہ کے مقدمے میں استقدر جانفشانی اور جبل کی کال کوٹھری سے بچا لینے کے لئے اسکی یہ تمام جدوجہد صرف اس لئے تھی کہ وہ ـــ صرف وہ اسے اپنا بنا سکے۔

دن گزرتے گئے۔ خیریہ ہانم اپنی ضمانت کی رقم کے سلسلے میں کئی مرتبہ عدلی کے دفتر میں آئی ..... عدلی کے سینے میں بھی بعض دوسرے نوجوانوں کی طرح جذبات کا شعلہ بھڑک رہا تھا۔ ادھر خیریہ ہانم کے دل کا زخم بھی اس منحوس حادثہ پر کافی عرصہ گزر جانے کے بعد آہستہ آہستہ بھرنے لگا تھا ...... نانچہ عورت اور مرد کی محبت کے پرانے قصّے کے تار پود پھر نئے سرے سے بُنے جانے لگے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوگئی اور نتیجے کے طور پر ان کی شادی ہوگئی۔

ابھی کچھ دن گزرنے نہ پائے تھے کہ مصیبت کی گھٹائیں پھر گھر گھور کر اُٹھنے لگیں۔ قدرت کو یہی منظور تھا کہ جب خیریہ کے لئے سکون و اطمینان کے اسباب مہیا ہوں پریشانیاں اسکو ہر طرف سے گھیر لیں۔

یوں تو خیریہ سے شادی کر لینے کے بعد ابراہیم عدلی کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس سے واقعی محبت کرتی ہے اور اس کو اس سلسلے میں ذرا بھی شک نہیں تھا .. لیکن اس کے ساتھ ہی وہ محسوس کرتا تھا کہ یہ محبت بالکل بیجان، بیحد سنجیدہ اور کچھ گھٹی گھٹی سی ہے۔ ایک ایسی محبت جو اس محبت سے بالکل مختلف بھی، جسکا اظہار وہ اپنے پہلے خاوند سے کیا کرتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ عدلی اپنی لائبریری کے دروازے بند کرکے اپنی بیوی کے مقدمے کی فائل کو بار بار پڑھا کرتا تھا اور رشک و حسد کے شعلے اس کے سینے کو جھلسا دیتے تھے۔ وہ اپنے مقتول شوہر کو کیسے کیسے خط لکھا کرتی تھی اور کس کس طرح اسے خوش کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی، اس نے اپنے خاوند کے ساتھ کیسے کیسے خاص انداز میں فوٹو کھنچوائے تھے۔ ہر فوٹو سے اپنے خاوند کے لئے اسکی شدید محبت کے جذبات ٹپکے پڑتے تھے۔

• عدلی نے دیکھا کہ خیریہ کچہری جاتے وقت صرف ایک بیجان سا بوسہ لیکر دروازے تک پہنچانے آتی ہے لیکن اس نے ایک خط میں جو پہلے خاوند کو لکھا گیا تھا پڑھا:۔

"..... تم جانتے ہو کہ کچہری جاتے وقت صرف ایک دفعہ تمہارا بوسہ لے لینے سے مجھے چین نہیں آتا تھا، بلکہ بعض اوقات میں تمہارے پیچھے دوڑتی تھی اور جلدی جلدی سیڑھیوں سے اترتی تھی کہ جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر تمہارے جسم کو چوم سکوں خود تمہاری آنکھوں کے سامنے! ایک مرتبہ جب تم قاہرہ گئے تو میں نے اپنی روزانہ زندگی میں ایک غم آلود کمی محسوس کی۔ اسی غرض سے میں نے اپنے معمول کو نہیں چھوڑا۔ میں روزانہ شکری کو عین اسی وقت جگاتی تھی جس وقت تم کو جگایا کرتی تھی۔ پھر میں اس کے رخساروں کو چوم لیا کرتی تھی اور جب وہ سیڑھیوں سے اترتا تھا تو میں دوڑ کر دوبارہ اس کی آنکھوں کے بوسے لیتی تھی .... یہ تم خود جانتے ہو کہ شکری کی آنکھیں بالکل تمہاری جیسی ہیں!..."

اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ محبت کے بارے میں معمولی سے معمولی چیز کو شک کی نظروں سے دیکھا کرتی تھی ..... یہانتک کہ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اسکی کوئی قریب ترین عزیزہ بھی اس سے ملنے گھر پر آئے۔ خود مقتول کے ایک رشتہ دار نے گواہی دی تھی کہ اس نے ایک دفعہ خود اسکے خاوند کو کہتے سنا۔

"تم آخر اتنا شک کیوں کرتی ہو؟ کیا تمہیں میری محبت کے سلسلے میں کسی قسم کی بدگمانی ہے؟"

اس پر خیریہ نے جواب دیا: "نہیں، نہیں، ہرگز نہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم صرف میرے لئے ہو اور میرے سوا کوئی تمہیں نہ دیکھے!"

عدلی کے سامنے یہ سب حقائق موجود تھے۔ ان کے علاوہ روزانہ زندگی کے بعض معمولی معمولی واقعات تھے، جنہیں دیکھکر اس کے سینے میں رشک و حسد کا طوفان امنڈ آتا تھا ... یہ سب بدگمانیاں بیچارے مرحوم سلیم فوزی کی وجہ سے تھیں۔ اس پہلے شوہر کی وجہ سے جسکا سایہ ہر وقت اس کے پیچھے لگا رہتا تھا ..... عدالت میں ..... دفتر میں ..... گھر میں ..... بستر پر، ہر جگہ یہ سایہ اسکے پیچھے تھا اور اس کی زندگی حرام کر دی تھی۔

عدلی کی پریشانیاں اس زہریلے احساس کی وجہ سے جس نے اسکی گھریلو زندگی کو تباہ کرکے رکھدیا تھا برابر بڑھتی چلی گئیں حالانکہ ابھی ازدواجی زندگی کی ابتدا ہوئی تھی اور اسکا خیال تھا کہ یہ دن بڑے آرام سے گزریں گے۔ خیریہ کی حرکات میں جو سنجیدگی اسے نظر آتی تھی اور اسکی فطرت میں جو اچانک ایک انقلاب رونما ہوا تھا ان سب سے اس کی سرد مہری اور بے پروائی ظاہر ہوتی تھی۔ ان تمام واقعات کے لئے کوئی ایسی معقول تاویل کر لینا جس سے اسکا قلب مطمئن ہو جائے اور بے چینی اور پریشانی کے بادل چھٹ جائیں عدلی کے بس کی بات نہیں تھی اسلئے کہ اور تمام باتوں میں وہ دیکھتا تھا کہ اسکا برتاؤ

محبت سے لبریز ہے۔ وہ گھر سے باہر بہت کم جاتی تھی۔ خانہ داری کے تمام کام پوری دلچسپی سے انجام دیتی تھی۔ اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی تھی اور بغیر کہے ہر چیز تیار رکھتی تھی۔

ایک دن عدلی کی چچا زاد بہن اس سے ملنے آئی۔ خیریہ سے شادی ہونے سے پہلے ان دونوں کی نسبت ہو چکی تھی اور اس نے عدلی کی طرف سے نا امید ہو جانے کے بعد شادی کر لی تھی۔ اب وہ اپنے خاوند سے طلاق لینے کے سلسلے میں اس سے کچھ مشورہ کرنے آئی تھی..... ملاقات کے کمرے میں وہ اس کے ساتھ بالکل تنہا تھی۔ اس نے عدلی کو اپنا وعدہ یاد دلایا اور بتایا کہ شادی سے اس کی کیسی کیسی امیدیں وابستہ تھیں..... باتیں کرتے کرتے وہ اس کے قریب آ گئی اور اسکا ہاتھ کھینچ کر اپنے چہرے پر رکھ لیا۔ اس کے بعد محبت، غصے اور امید کی بھری ہوئی نظروں سے اسکی طرف تکنے لگی!

دروازہ اچانک کھلا اور خیریہ سامنے سے آتی نظر آئی جب اس نے یہ منظر دیکھا تو دروازہ فوراً بند کر دیا اور چپ چاپ چلی گئی۔

دونوں اس حادثے سے بوکھلا گئے، اور لڑکی فوراً وہاں سے چلدی۔ عدلی بیوی کے سامنے آنے کے خیال سے جھجکتا رہا۔ لیکن آخرکار اس نے خود بیوی کے کمرے میں جا کر معذرت کرنا مناسب سمجھا۔ اسکا خیال تھا کہ وہ اسے اصل بات بتا دے یعنی کہ اس لڑکی سے پہلے اسکی نسبت ہو چکی تھی اور اسی وجہ سے وہ اس طرح بے تکلف باتیں کرنے کی عادی ہے اس میں اس کی کوئی خطا نہیں بلکہ خود میری غلطی ہے کہ میں نے اس کو یہ نہیں بتایا کہ میری شادی ہو چکی ہے اور اب اسکی حیثیت اس گھر میں بالکل مہمان کی سی ہے..... عدلی نے بیوی کے کمرے میں جانے سے پہلے ان تمام باتوں کو خوب سوچ لیا۔۔۔ پھر وہ بوکھلایا ہوا کمرے میں داخل ہوا لیکن جونہی اس نے خیریہ کو کرسی پر بیٹھے اور لڑکے کو سینے سے لگائے اور بھینچ بھینچ کر پیار کرتے دیکھا تو لرز اٹھا۔ خیریہ نے جب اس کو دیکھا تو بے پروائی سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسوقت وہ کھسیانی ہنسی ہنس رہی تھی وہ طعن آمیز لہجے میں پوچھنے لگی:-

"کیا آپ کی بہن آ گئی ہیں؟"

اس کے ساتھ ہی پھر اس نے اپنے لڑکے کو سینے سے لگا لیا اور خوب پیار کرنے لگی۔ اس دوران میں وہ رہ رہ کر اس کی آنکھوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ عدلی یہ منظر دیکھکر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اسی لمحے اچانک اسکے خیالات بدل گئے ذرا سی دیر پہلے وہ اپنی غلطی سے شرمندہ تھا اور بیوی کے غصے سے ایک حد تک ڈر رہا تھا۔ اب اسے خود اسکو غصہ آنے لگا گویا خیریہ سے کوئی بڑا جرم سرزد ہوا ہے..... جب اس نے اس رد کھے برتاؤ کا مقابلہ پہلے خاوند کے ساتھ اس کے پرجوش اور محبت آمیز رکھ رکھاؤ سے کیا تو یہ خیال اسکے دماغ میں اور بھی جم کر رہ گیا۔ وہ اس کے قریب آیا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہنے لگا:- "آخر تم چپ کیوں ہو؟"

اس نے اپنے لڑکے کے بالوں کو سنوارتے ہوئے جواب دیا:- "آپ مجھ سے کیا سننا چاہتے ہیں؟"

اس نے ذرا جھک کر خیریہ کے بازو پکڑ لئے اور کہنے لگا: "کیا آج ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جسکے متعلق کچھ کہا جا سکے؟"

"اس سلسلے میں کچھ کہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے؟"

اسپر عدلی نے اسکو سختی سے جھنجھوڑا اور چلا اٹھا: "تم نہیں جانتی کہ مجھے تمہارے اس رویے سے کتنی تکلیف پہنچی ہے..... تمہاری یہ بے رخی اور لاپرواہی مجھے پاگل بنائے دے رہی ہے، سنا تم نے؟ واقعی پاگل بنائے دے رہی ہے۔"

یہ سنکر وہ سہم گئی، آنسو اسکی آنکھوں میں ڈبڈبانے لگے۔ اس نے پوچھا:-

"میری وجہ سے؟ یہ کیسے؟"

عدلی برابر گرجتا رہا:-

"اچھا تو تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ کیسے؟ اس لئے کہ تم مجھ کو ایک بیوی کی طرح بالکل محبت نہیں کرتیں۔ میں یہ سب جانتا ہوں تمہیں مجھ سے بالکل محبت نہیں ہے۔"

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا:-

"تم غلطی پر ہو..... عدلی! مجھے تم سے واقعی محبت ہے اور میں تمہاری احسانمند ہوں، میں قسم کھا کر کہتی ہوں مجھے تم سے بہت محبت ہے!"

"نہیں..... جیسی محبت تم اپنے پہلے شوہر سے کرتی تھیں مجھ سے تمہیں وہ محبت نہیں ہے..... جسطرح تم نے اس کی زندگی کو خوشی، محبت اور پیار سے گھر بنا دیا تھا میرے ساتھ کچھ بھی نہیں کرتیں..... جیسے تم نے اس کو اپنا لیا تھا مجھے اپنا نہ بنا سکیں..... میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے اس خیال نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ میں نے ہر طرح تمہاری دونوں زندگیوں کو جانچ لیا ہے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمہارا برتاؤ میرے ساتھ بہت برا ہے۔ کیا اس سے بڑھکر کوئی لعنت ہو سکتی ہے کہ تم مجھے ایک ایسے شخص سے جلنے پر مجبور کرو جو مر چکا ہے۔ یہ اذیت مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی، ہرگز نہیں ہو سکتی۔" خیریہ کرسی سے اٹھی اور عدلی کے کندھے پر ہاتھ رکھکر بڑے پیار سے بولی:-

"آپ کیوں خواہ مخواہ ایسی باتیں سوچتے ہیں۔ میں بار بار آپ کو یقین دلا چکی ہوں کہ واقعی مجھے تم سے محبت ہے اور..... بات ختم کرنے سے پہلے عدلی نے اسے دھکیل دیا اور وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔

"ان باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں خوب جانتا ہوں تمہیں اس سے بہت محبت تھی۔ مجھ سے بھی زیادہ!"

"یہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ وہ بہت ممکن ہے اسکی وجہ یہ ہو کہ اسوقت میری نوجوانی تھی۔ جب میں اور اب میں بہت فرق ہے۔ عدلی! جوانی کی محبت میں ذرا جوش، شدت اور تڑپ ہوتی ہی ہے۔ اس سے ابتدائے زندگی میں مجھے واسطہ پڑا تھا۔ وہ اس دنیا کا پہلا دروازہ تھا جو میرے لئے ان کے سامنے کھلا....

لیکن تم تو اب تک اس سے محبت کرتی ہو؟ اس کا چہرہ پھر تمتما اٹھا اور کہنے لگی: یہ آپ سے کس نے کہدیا؟

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل ٹھیک ہے۔ تم جب اپنے لڑکے کی آنکھوں کو دیکھتی ہو بے اختیار اس کی یاد آ جاتی ہے---- تم نے بار بار اسے کہا ہے کہ اس کی آنکھیں اس کے باپ جیسی ہیں۔ میں تو اس کے تصور سے پاگل ہو جاتا ہوں، حالانکہ وہ بیچارا کبھی کا مر چکا ہے جب یہ لڑکا بڑا ہو کر بالکل اپنے باپ جیسا ہو جائے گا تو تمہارا کیا حال ہوگا؟ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تمہارا پہلا شوہر اس طرح دوبارہ زندہ ہو جائے اور میرا جینا حرام کر دے۔

اوہو! تو یوں کہئے آپ کو میرے بچے کی محبت بھی بری معلوم ہوتی ہے میرے اکلوتے بچے کی محبت!

ہاں! تم اس سے اس کے باپ کی وجہ سے محبت کرتی ہو تم جب اس کو سینے سے لگاتی ہو یا اس کے لبوں کو چومتی ہو اس کے باپ کا تصور تمہارے سامنے ہوتا ہے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا!

خیریہ نے سر جھکا لیا آنسو اس کی آنکھوں سے بہ نکلے اور اس نے اپنا چہرہ اپنے معصوم بچے کے بالوں میں چھپا لیا جو حیرت سے کبھی دونوں کو تک رہا تھا۔ پھر وہ حسرت و غم کے بوجھ سے دبی ہوئی آواز سے کہنے لگی:

تب تو پیارے! ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہو جانا چاہئے۔

عدلی دروازے کی طرف پلٹا اور باہر نکلتے ہوئے کہنے لگا:

ہاں! ہاں!! ضرور

کچھ دنوں بعد ابراہیم عدلی نے خیریہ خانم کو طلاق دے دی بیچاری خیریہ اپنے اکلوتے لڑکے کو لے کر باہر، اپنے گھر واپس آ گئی۔ اس کے سینے میں دونوں شوہروں کی یاد دفن تھی ——— ایک سے اس نے محبت کی لیکن وہ محبت نہ کر سکا ——— دوسرے سے اس نے محبت کرنی چاہی لیکن وہ خواہ مخواہ پہلے شوہر سے جلنے لگا، حالانکہ وہ بیچارہ اس دنیا میں موجود نہ تھا۔

برہموں کے رنگ ڈھنگ ——— بقیہ صفحہ ۱۲

لے سکے۔ اس طرح پر گویا برما کو ہندوستانیوں کی پوری ہمدردی حاصل ہے۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ حکومت ہند نے برما کو ۹۶ لاکھ گز کپڑا ہندوستان سے لینے کی اجازت دی ہے۔ برما کے وفد کو حکومت ہند کے محکمہ جات کے ذریعہ پوری پوری سہولت دی جا رہی ہے کہ وہ ہندوستان سے اپنی ضرورت کا کل کپڑا، ادویات وغیرہ، سیمنٹ، لوہا اور کوئلہ یہاں سے حاصل کر سکے حالانکہ ان چیزوں کی خود ہندوستان میں کمی اور قلت ہے۔

تبرکات سخا دھلوی مرحوم

وہ چند ہو گیا وہ بنا جو سنگھار سے — قدرِ کتاب بڑھ گئی نقش و نگار سے
پیہم صدا بلند ہے خلخال یار سے — دیکھوں تو کون کون نہ اٹھے مزار سے
میں نے کیا قیاس رخ و زلف یار سے — روز فراق کم ہے شب انتظار سے
دوزخ بھڑک اٹھا ہے دل شعلہ بار سے — منکر نکیر دور کھڑے ہیں مزار سے
میں مر مٹا تو عارض تاباں چمک اٹھی — آئینے صاف ہوتے ہیں میرے غبار سے
جاؤں بہشت میں کہ سنجاؤں یہ فکر ہے — کہتے ہیں مختلف ہے ذرا کوئے یار سے
رہنے دو بجلیوں پہ عتاب آپ کیوں کریں — نکلے گی کچھ دیکھ تو صدا آبشار سے
اچھا ہوا کہ معجزہ کی بات رکھ لی — موسیٰ کو سابقہ نہ پڑا زلف یار سے
آنکھیں لڑیں ہیں غیر کو دیکھیں وہ کس طرح — سی دی ہے چشم یار نگاہوں کے تار سے
دعویٰ صفائی کا ہے تو اچھا ثبوت دو — ڈھلوا دو آئینہ مرے سنگ مزار سے
مانا کہ انتظار قضا سے شدید ہے — ہاں شدید تر ہے مگر انتظار سے
کیا کم ہے رو دست حنائی کا چومنا — کیوں سرکشی ہو کوئی گلے رہ گذار سے
کوئی نہ آئے دل میں پریزادوں کے سوا — میں نے حصار کھینچا ہے اس انحصار سے
ہیں تو مکدر اب بھی وہ اپنے شہید سے — تلوار صاف کی ہے مگر خاک مزار سے
اس بت نے التجا پہ بڑے ناز سے کہا — مانگو دعا کہ قتل نہ ہو درد گار سے
اس سے پرے ضیا کو نہ پہنچے گا آفتاب — آگے نکل گیا ہے یہ پیدل سوار سے
مے چھوڑ دوں آج وعدۂ فردا پہ کس طرح — تو لفظ مجھ کو اچھے ہیں تیرے ادھار سے
مر کر بھی ایک جا نہیں قسمت میں بیٹھنا — یعنی بگولے اٹھتے ہیں خاک مزار سے
لے ہاتھ اٹھتے عاشق و معشوق حشر میں — دو چار روز میں لپٹتے ہیں اک مزار سے
جینے سے تنگ ہوں مجھے زندہ ہی گاڑ دو — لے لو حلف جو مر کے بھی نکلوں مزار سے
پستی کا نام ہجر بلندی کا نام وصل — یہ ہے طریق عشق چڑھاؤ اتار سے
پیدا الم کی یوں ہے مرے دل میں یاد دوش — ملتے ہیں جس طرح سے مجاور مزار سے
گن گن کے ہو گئی ہے شب انتظار بسر — اور کیوں جی کر گنا ہوں باہر شمار سے
فرقت کے بعد وصل ہے مستی کے بعد نشہ — یہ دائرہ بنا ہے چڑھاؤ اتار سے
زنجیر پا نہیں گے یہ لڑکے شباب میں — بچپن میں دفعتاً کھلے زلف یار سے

واعظ ہی سخا جو کل تھے وہاں ایک خدا کی شان
منبر پہ وعظ کہتے ہیں کس افتخار سے

مرسلہ جناب ضیاء الحسن نقوی


مرد برائے صحتِ جلد
ریکسونا
استعمال کرتے ہیں
Rexona
REXONA PROPRIETARY LIMITED

ہندوستانی ثقافت وفنون پر مصری اثرات

کے حسین

فراعنہ نے خصوصاً اور مصریوں نے عموماً نوع انسان کے جملہ افراد سے اپنے آپ کو کہیں زیادہ برتر و اعلیٰ سمجھا۔ انھوں نے غیر ملکیوں کے ساتھ میل جول رکھنے سے احتراز کیا اور ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کی صورت ان کے حاشیۂ خیال میں بھی کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ یہی سب سے بڑی دقت تھی جس کا سامنا رومیوں اور یونانیوں کو کرنا پڑا جب وہ علم نجوم و سطحات سیکھنے اور طب و جراحی کے ضمن میں معلومات بہم پہنچانے کے ارادہ سے مصر میں وارد ہوئے۔ غیر ملکیوں سے اجتناب و احتراز کا سبب یہ تھا کہ مصری اپنے چہرے صفاچٹ رکھتے اور دن میں دو تین بار غسل کرتے تھے۔ ان کے برعکس نو واردوں کی لمبی گھنی ڈاڑھیاں اور میلے کچیلے غلیظ کپڑے ان کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتے تھے۔ چنانچہ سبھی غیر ملکیوں کو پلید سمجھا جانے لگا۔ بادشاہ کا گھٹنا چومنے کی اجازت وہ سب سے بڑا اعزاز ہوتا جو فرعون کی طرف سے کسی درباری کو عطا کیا جا سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑی حد تک یہی برتری کا احساس ہندوستان کے ہندوؤں کو ورثے میں ملا ہے۔ اگرچہ ہندوستان پر انگریزی تسلط ہونے کے بعد سے بہت کچھ حالت بدل گئی ہے تاہم جذبۂ تنفر ابھی تک اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے اور واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ صدہا سال تک ہمارا قریبی تعلق مصریوں کے ساتھ رہا ہے۔ یہ ربط ضبط سکندر یونانی کے حملے کے وقت تک قائم رہا۔ لفظ "فرعون" دو مصری لفظوں سے مرکب ہے "فیرا" بمعنی "بڑا مکان" اور "اون" بمعنی "رب رع" یا "سورج دیوتا"۔ اب اگر اس کا تقابل ہندی لفظ "مہاراجہ" سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ تین ٹکڑوں کے ملنے سے بنا ہے۔ "مہا" بمعنی "بڑا" "را" (رع) بمعنی "سورج دیوتا" (بزبان مصری)، اور "جہ" بمعنی "بجائے" یا "پسر فلاں"۔

جب ہم سوچتے ہیں کہ تقریباً دو سو سال میں انگریزوں سے قریبی تعلق رہنے کے باعث ہندوستانی ثقافت، رنگ ڈھنگ، طرز بود و معاش اور فکر و خیال میں کتنی زبردست تبدیلیاں ہوئی ہیں تو یہ باور کرنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان اصلی آریاؤں کی زندگی میں بھی جو دریائے سندھ کے کنارے آباد ہوئے تھے ایسے ہی تعلقات کی بنا پر صدہا سال کی مدت میں بہت کچھ تغیرات رونما ہوئے ہوں گے۔

ابتدائی حالات کا جائزہ لینے پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ علم التشریح البدن پر سب سے پہلی کتاب دوسرے شاہ مصر آتھوتس نے لکھی جو تقریباً ۴۳۶۶ ق۔م میں حکومت کرتا تھا۔ اس طرح توت نے جس کا یونانی نام ہرمیس تھا علم الادویات پر چھ کتابیں لکھیں جو مندروں میں رکھی رہتی تھیں۔ ادویات کے موضوع پر چار اہم بردی مخطوطات بھی ملے ہیں۔ ایک مسودہ ٹکسر کے قریب ایبرز نے برآمد کیا جس کا وہ ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔ دوسرا جو کسی قدر ضائع بھی ہو گیا برلن کے عجائب خانہ میں ہے تیسرا برطانیہ کے عجائب خانے میں ہے۔ اسپر اٹھارویں خاندان کی تاریخ ہے جو تقریباً ۱۷۰۰ ق۔م میں حکومت کرتا تھا۔ چوتھا ایک امریکن کے ہاتھ لگا اور وہ اس نے نیویارک ہسٹوریکل سوسائٹی کو پیش کر دیا۔ بعض کا موضوع تاریخ ہے اور بعض تشخیص امراض اور طریقۂ علاج سے متعلق ہیں۔ ہومر کی نظموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کو ایک ایسی مفید سرزمین بتایا گیا ہے جس میں دوائیں بکثرت موجود ہیں۔ کچھ اچھے کاموں کے لئے ہیں اور کچھ برے کاموں کے لئے اور وہاں ہر شخص طبیب ہوتا ہے اور اس کی واقفیت عام لوگوں سے ہوتی ہے۔ وہ سب کے سب صحت و تندرستی کے دیوتا کی اولاد سمجھے جاتے ہیں۔

ہیرو ڈوٹس (۴۰۰ ق۔م) کا بیان ہے کہ سب سے اہم علاج عمدہ غذاؤں اور غذائی پابندیوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ آنکھوں، سر، دل اور دانتوں کے علاج کے لئے الگ الگ ماہرین فن ہوتے تھے۔ دنداں ساز بھی موجود تھے۔ اور وہ کھوکھلے دانتوں میں سونا یا چاندی بھر دیتے تھے۔ (ملاحظہ ہو قدیم اہل مصر مصنفہ ولکنسن۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۵۰) فوج کے سپاہیوں کا علاج بلا اجرت کیا جاتا تھا۔ اگر غلط طریقۂ علاج سے کوئی مریض مر جاتا تو طبیب پر قتل انسانی کا الزام لگایا جاتا تھا۔ ان ڈاکٹروں کو شاہی خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی لیکن اہم مشوروں کے سلسلے میں وہ فیس وصول کر لینے کا حق رکھتے تھے۔ علاج زیادہ تر جڑی بوٹیوں کے جوشاندوں، قے آور دواؤں، پرہیزوں یا دوا کی ہلکی خوراکوں سے کیا جاتا تھا۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ بہت سی بیماریاں ضرورت سے زیادہ کھانے اور معدے کی خرابی یا سوء ہضمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ پلائنی کا بیان ہے کہ اہل مصر نوعیت مرض کی تحقیق و تشخیص کے سلسلے میں مرنے والے کے مردہ جسم کا معائنہ کرتے تھے

تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ موت کس وجہ سے واقع ہوئی ہے۔

ایتھنیا اور روما کے لوگ مصری طبیبوں سے بہت زیادہ مشورہ لیتے تھے ان کی شہرت اتنے دور دراز حصوں تک پھیل گئی تھی کہ سیاوکس (۶۰۰ ق م) اور دارا (۵۲۹ ق م) نے مصر سے طبیبوں کو بلا بھیجا۔

نیرو کے زمانے میں طبابت کرنے والے ایک شخص پیڈوسیس فائیو سکوریڈیز کے کچھ ایسے نسخے ہاتھ آئے ہیں جو بالکل ان نسخوں کی نقل ہیں جو مذکورہ بالا بردی کا غذات پر نقش ہیں۔ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں ڈائیو سکوریڈیز کا ایک ترجمہ موجود ہے جو ہارون الرشید کے بیٹے اور خلیفہ المامون کی خاطر آرمینیہ کے ایک عالم اسٹیفن نے کیا تھا۔ یہ کتاب جو اپنی قسم کا واحد نسخہ ہے " کتاب الحشیش " کہلاتی ہے۔ تقریباً یہی طریقہ ادویات آریاؤں کے ابتدائی عہد میں بھی رائج تھا۔

یقین کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے علم طب کا بہترین زمانہ سشرت سے چرک تک تھا جن کا ذکر مہابھارت میں کیا گیا ہے لیکن ترمیم و تنسیخ ہوتے رہنے کے باعث اس کی قدامت حملۂ سکندر یونانی سے پہلے کی نہیں بھی جا سکتی بالفاظ دیگر ۳۲۷ قبل مسیح سے ۵۰ سن عیسوی تک کہا جا سکتا ہے۔

بالکل مصریوں کی طرح ہندوؤں میں بھی پجاریوں کو طب اور جراحی کے اسرار و رموز کا محافظ سمجھا جاتا تھا حقیقت یہ ہے کہ ویدوں اور طبی کتابوں کا علم اس فن کا ایک حصہ بن گیا وہ صرف ہندوستان کے پجاریوں سے ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ طب و جراحی کے ضمن میں ہندوستان میں رہنے والے آریائی لوگ بدھی زمانہ کے دوران میں پورا عروج حاصل کر چکے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی یقینی ہے کہ مصر ان کا وطن تھا ہو سکتا ہے کہ حملے کے بعد یونانیوں سے تعلقات بڑھنے پر کچھ ترقیاں ہوئی ہوں۔ ہندوستان کے ہندو اب بھی ایسے منتر جپنے کے عادی ہیں جو مصریوں کے قدیم عہد میں مریضوں کے علاج کا ایک جزو سمجھے جاتے تھے قدیم آریاؤں کی نباتاتی ادویات کے سلسلے میں ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جڑی بوٹیوں کو چاند کی خاص خاص تاریخوں میں توڑا جاتا تھا اور اس اعتبار سے بھی قدیم مصریوں اور ہندوستان کے ہندوؤں میں مشابہت کا پتہ چلتا ہے۔ اب بھی جلدی امراض اور دوسری متعدی بیماریوں کے سلسلے میں منتروں کو ساز کے ساتھ گا بجا کر علاج معالجہ کیا جاتا ہے۔

عربی اور فارسی لفظ " یونانی " دراصل یونانی زبان کے لفظ " آئیونین " کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ سنسکرت میں بھی لفظ " یونا " ہے جو یونانیوں کے لئے بولا جاتا تھا۔ ڈاکٹر اولیری نے اپنی کتاب " عرب قبل از محمد " (صفحہ ۱۱۳) میں لکھا ہے :- " برہمی رسم الخط

تاثرات

زہے ناخن غم کی سینہ خراشی کہ قلب و جگر ہو گئے پارا پارا
ہوئے اپنے ناوک سے ہم آپ زخمی۔ کسی کی نگاہوں نے کیا تیر مارا؟

یہ مانا محبت نے اب تک کسی کی نہ دنیا بنائی نہ دیں کو سنوارا
خدا کی قسم پھر بھی ترک محبت۔ نہ ان کو گوارا نہ مجھ کو گوارا

اگرچہ خرد نے بہت کھیل کھیلے۔ اگرچہ جنوں نے بہت زور مارا
مگر یہ طلسم مشیت نہ ٹوٹا۔ ازل سے یہی تجربہ ہے ہمارا

وہ کب کے گئے بھی مگر دل کو اب تک نہیں ترک شوق و تمنا گوارا
جہاں کوئی آہٹ ہوئی میں یہ سمجھا کہ جیسے وہی آ رہے ہیں دوبارا

ہر اک منزل نشو و بالیدگی میں ہے کیوں خار گل کی نگہباں ہر فطرت
اگر پردۂ رنگ و بو میں نہیں ہے کوئی جلوہ گستر تو کوئی مجلا آرا

کوئی ناؤ کو مولت کچھ نہیں ہو جہاں میں حوادث کو ممکن نہیں رستگاری
بھلا پھر طوفاں سے کیا بچ سکیگا۔ کوئی ناؤ کو ساحل سے کرکے کنارا

وہ عالم ہے پیہم صف آرا رہوں گا کہ ہے میرا مقسوم زور آزمائی
ہزیمت کا اپنی مجھے غم نہیں ہے۔ مقدر سے لڑکر مقدر سے ہارا

کوئی ہے حوادث کو پیغام دیدے۔ ابھی میرے دل میں تمنا ہے باقی
کوئی باد صرصر سے جاکر یہ کہدے مری خاک میں ہے ابھی اک شرارا

بہار چمن کروٹیں لے رہی ہے خزاں کی غم انگیز ویرانیوں میں
شب غم کی ظلمت پتہ دے رہی ہے زمیں کی نئی قسمت کا چمکا ستارا

رئیس امروہوی

بلاشبہ سانس مادّے سے نکلا ہے اور اگر پوری صحت کے ساتھ اس کی تاریخ کا تعین کرتے ہوئے یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ ساتویں صدی قبل مسیح میں رائج ہوا تو پھر یہ تسلیم کرنا آسان ہو جائے گا کہ باہمی تعلقات اس وقت سے مسلسل قائم رہے۔ حالانکہ قدیم ترین ہندوستانی کتبہ جو دستیاب ہو سکا ہے تیسری صدی عیسوی کا ہے۔ (روزنامہ "ڈان" کے شکریہ کے ساتھ)

حشر کا ڈرامہ

عشرت رحمانی

محلہ "آجکل" کی اشاعت مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں جناب محمد عمر نور الٰہی کا ایک مضمون عنوان بالا کے تحت شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون جناب جگدیش ناتھ بیتاب بریلوی کے اس مضمون سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ جو آجکل کی اشاعت مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۶۱ء میں درج ہوا تھا۔ اور اس سلسلہ میں راقم الحروف رسالہ آجکل ہی کی کسی گذشتہ اشاعت میں ایک مختصر مقالہ پیش کر چکا ہے۔ کرمی محمد عمر صاحب کا یہ مضمون بیتاب صاحب کے مضمون پر ایک حاشیہ سمجھنا چاہئے جس کا مقصد اس کے آغاز سے واضح ہے۔

محمد عمر صاحب (نور الٰہی مرحوم) سے ادبی دنیا متعارف ہے اور ناٹک ساگر کے مصنف سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ کم سے کم اردو ڈرامہ نگاری کے ابتدائی ابواب پر انھیں معقول عبور ہوگا لیکن آغا حشر مرحوم سے جس قسم کی ناواقفیت کا اظہار انھوں نے اس مضمون میں فرمایا ہے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اور بعض تو یہ "پردہ داری" چاک ہوتا نظر آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

جناب بیتاب بریلوی کو جو غلط فہمیاں ہوئی ہیں اور انھوں نے آغا حشر مرحوم سے ذاتی واقفیت کے پردہ میں جس ناواقفیت کا اظہار فرمایا ہے میں اپنے مضمون میں کسی حد تک تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ اس لئے یہاں اس سے گریز ہی مناسب ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بیتاب صاحب کے وہ کون سے انکشافات ہیں جن کی نسبت محمد عمر صاحب جیسے فن ڈرامہ کے دعویدار یہ فرمانے پر مجبور ہو گئے کہ "ایسے انکشافات کے جن کی بڑی ضرورت تھی اور جو مجھے ناٹک ساگر کی تکمیل میں بڑا کام دیں گے۔" یہاں سب سے پہلے تو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ "آیا ناٹک ساگر اسی قسم کی معلومات سے مکمل کی گئی ہے، کیا ڈرامہ کے فن اور فن کاروں کے بارے میں اسی قسم کی بے پر کی تو نہیں جمع کر دی گئی ہیں؟" حالانکہ جہاں تک میں واقف ہوں ایسا نہیں ہے۔ ناٹک ساگر اس فن میں وقعت کے قابل اضافہ سمجھا جاتا ہے مجھے محمد عمر صاحب سے جو غائبانہ تعارف حاصل ہے اور جو مضامین انھوں نے عرصہ دراز ہوا میرے رسالہ نیرنگ اور نیرنگستان کے لئے لکھے وہ سنجیدہ معلومات پر مبنی تھے۔ اس لئے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ڈرامہ کے فن پر انھیں سطحی عبور بھی نہیں۔ انھیں وجوہ کی بنا پر مجھے تعجب ہے کہ ایک ایسے غیر معتبر مقالہ سے وہ اس قدر متاثر کیوں ہوئے اور بیتاب صاحب کے "ذاتی الہامات" کو "انکشافات" کیوں تصور فرما بیٹھے۔ جبکہ انھیں خود آغا حشر مرحوم سے اس سے زیادہ حد تک واقف ہونا چاہئے ان سب امور پر غور کرنے کے بعد ان کے اس مضمون کا انداز صرف بتا دیتا ہے کہ ان کے لئے "چیز نامت کہ بھرے بیٹھے ہیں" والی مثل صادق آتی ہے۔ اور غالباً حشر مرحوم کے بارے میں جو کچھ ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایسے ہوتے یا ایسے مانے جاتے وہ بیتاب صاحب کے غیر ذمہ دار قلم کے ذریعہ انھیں مل گیا۔

اس مضمون میں محمد عمر صاحب خود مانتے ہیں کہ "حشر ہندوستانی ڈرامہ کے ایک دور کے خاتم ہیں"۔ چونکہ جناب بیتاب کے متن پر پہلے لکھ چکا ہوں اسلئے محمد عمر صاحب کے حاشیہ پر لکھنا ضروری ہے۔ مجھے سب سے پہلے اپنے ایک سہو کا اعتراف کرنا ہے کہ ناٹک "چترا کاولی" کو میں سہواً اپنے گذشتہ مقالہ میں احسن لکھنوی مرحوم کی تصنیف کہہ چکا ہوں۔ درحقیقت وہ منشی کریم الدین بریلوی مرحوم کی تصنیف ہے۔

محمد عمر صاحب نے حشر مرحوم کے متقدمین کا ذکر کرکے رحمت کو بھی ناٹک نویس مانا ہے۔ یہ اور تعجب کی بات ہے۔ حالانکہ انکی حیثیت ایک نقال سے زیادہ کی نہیں۔ گو وہ ڈائرکٹر بننے کے بھی دعویدار رہے۔ گماچنے دوراد رنگ کے ایک اچھے ایکٹر اور پڑھ باز ضرور تھے۔ اور یہ صحیح ہے کہ انھوں نے حشر اور عباس کے ساتھ نام بھی پیدا کیا۔ اس حقیقت کو سب سے زیادہ جناب محشر شیرازی جانتے ہیں۔ اس دور کے ناٹکوں کا ذکر کرتے ہوئے پلاٹ وغیرہ کی جو خصوصیت بتائی ہے اس میں محمد عمر صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ "ٹریجیڈی سے شاذ ہی اعتنا کیا جاتا تھا۔ انجام یا عاقبت کبھی بخیر ہوتی تھی" تعجب ہے آپ نے یہ کس دور کے ناٹکوں کا ذکر فرما دیا۔ حالانکہ ان ناٹکوں کی سب سے پہلی خصوصیت تو جاننے والے یہی مانتے ہیں کہ انجام "سب خوش" ہونا لازمی تھا۔ اور اسی کو ان میں سے اکثر ناٹکوں کا نقص سمجھا جاتا ہے کہ پلاٹ سے انجام میں خوشی پیدا ہو یا نہ ہو Anti-climax ہی کیوں نہ بنا دیں مگر کھینچ تان کر المیہ پلاٹ کو بھی کومیڈی بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ خود آغا حشر مرحوم کے کئی ناٹکوں میں یہ نقص نمایاں ہے۔ جو اگر سیدھے سادے انداز میں پلاٹ کی مطابقت کے لحاظ سے جائز Climax پر ختم ہوتے تو نیچرل اختتام ہوتا۔ مگر عوام کو انجام کے وقت خوش خوش اٹھانے کے لئے غیر فطری کھینچ تان کے ذریعہ سب کو خوشی خوشی ملا کر "عاقبت بخیر" کر دکھائی ہے۔ اور یہ یقیناً مالکان کمپنی کی مرضی کے مطابق مجبوراً کرنا پڑتا۔ بنگالی ڈرامہ کے بارے میں جو بیتاب صاحب نے تذکرہ کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ حشر مرحوم کے ڈراموں پر اس طرز نگارش کا اثر بہت کچھ ہوا۔ یہ بات محمد عمر صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی یا سمجھ کر اسے الجھانے کی کوشش کی ہے۔ آپ دریافت فرماتے ہیں کہ "آغا حشر مرحوم نے کن بنگالی ڈراموں سے اثر قبول کیا ہے" بندہ نواز! میں یہ دریافت کروں گا کہ آپ نے آغا حشر مرحوم کے کون کون سے ڈرامے ملاحظہ فرمائے ہیں؟ زیادہ طویل بحث یا تمہید کی ضرورت نہیں۔ آغا صاحب مرحوم کے تیسرے دور کے ناٹک "بن دیوی" کو بنگالی ڈرامہ کے ایک کامیاب اثر کا بلند نمونہ نہ سمجھے۔ اس کے بعد ان کے آخری دور کے ناٹک "پریمی بالک" "دھرمی بالک" "آنکھ کا نشہ" "دل کی پیاس" "ہندوستان" اور "پہلا پیار" میں ہندی اور بنگالی کا

مہیا ہوا دلکش اور موثر انداز موجود ہے۔ یہاں یہ میں بھی نہ سمجھ سکا۔ آپ نے جو دریافت فرمایا ہے کہ "یہ بتایئے آغا صاحب کس اسکول سے موثر ہوئے؟" تو پہلے آپ کو بتانا ہے کہ موثر ہونے سے آپ کی مراد کیا ہے؟

آپ کا یہ فرمانا بجا ہے کہ "جب تھیٹر ختم ہو گیا اور متکلم فلم نے ڈرامہ کی سرپرستی قبول کر لی تو یہی حشر اسکول کا ڈرامہ اسے وراثت میں ملا اور اسی کو اس نے سنگ میل بنایا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حشر اسکول میں سنگ میل بننے کی بدرجۂ اتم صلاحیتیں موجود تھیں اور اس کے سوا اور کوئی راستہ کسی کے سامنے نہ تھا۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ "وہ پہلی بولتی فلم "عالم آرا" تھی حشر اسکول کی گہری جھلک نظر آتی ہے۔ خیر میں زیادہ دلچسپ ہیں بھی حسینی میاں ظریف جھلکتے ہیں"۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ آپ سیدھی بات کہہ کر پھر بھٹک گئے۔ حشر اسکول سے حسینی میاں ظریف کو کیا نسبت؟ یہ غور نہیں فرمایا شاید۔ آپ فرماتے ہیں "خود آغا ڈرامہ یہودی کی لڑکی، فلم میں عہد عتیق کی یادگار رہے۔ دور حاضر کے ڈرامہ کار حکیم احمد شجاع اپنے فلموں میں حشر اسکول کو یاد کر جاتے ہیں۔"

قبلہ! ایک یہودی کی لڑکی ہی کیا، عہد عتیق کی کامیاب یادگاریں تو آجتک فلم میں بکثرت ہیں۔ آپ کس کس کا رونا رو دیجئے گا۔ دھارمک اور تاریخی فلموں میں شروع سے آجتک حشر اسکول کی خوشہ چینی ہے۔ کیا دور حاضر کی ایک کامیاب ترین فلم "رام راجیہ" حشر مرحوم کے "سیتا بن باس" سے الگ ہے؟ فلم "پکار"، "سکندر"، "بابر" اور "ہمایوں" وغیرہ میں کس اسکول کے چربے ہیں؟

حالانکہ یہ کچھ زیادہ خوشی کی بات نہیں مگر مجبوری کا کیا علاج کہ ہمارے آج کے اکثر ڈرامہ نگار جدت سے قاصر ہیں اور فلم کمپنیاں بھی لکیر کی فقیر ہیں۔ علاوہ ازیں آغا حشر مرحوم کو آپ کسی انداز میں بھی دیکھئے اور کچھ بھی نقائص نکالئے لیکن ڈرامہ کی دنیا مرحوم کے احسانات نہیں بھول سکتی۔ مکرمی حکیم احمد شجاع سے بھی آپ واقف ہیں۔ وہ حشر اسکول کو کیسے بھول سکتے ہیں جبکہ وہ اپنے آپ کو اس اسکول کا خاص فخر شاگرد سمجھتے ہیں۔ (حوالہ کے لئے ملاحظہ فرمایئے حکیم صاحب کی تازہ شائع شدہ "آپ بیتی" "خوں بہا")۔ آغا حشر مرحوم کی تصانیف آپ نے ملاحظہ کی ہوتیں تو یقیناً اس انداز کی ناواقفیت کا اعتراف نہ فرماتے۔ سوشل فلموں میں بھی حشر مرحوم کے ڈراموں کے چربے موجود ہیں۔ دور کیوں جایئے "فیشن" دیکھ لیجئے اور "بغیر دل کی پیاس" پڑھ لیجئے۔ آپ نے فرمایا ہے "کلکتہ، بمبئی، میرٹھ اور بریلی میں انگریزی تھیٹروں کے قیام نے ہندوستانی ڈرامہ میں انقلاب کی صورت پیدا کر دیا" یہ انگریزی تھیٹروں سے آپ کی مراد کیا ہے؟ تشریح طلب امر ہے کہ ان شہروں میں انگریزی تھیٹر کب قائم ہوئے۔ اس کے بعد آپ کا یہ تحریر فرمانا کہ "فلم حشر اسکول سے فرار پر مجبور ہو گئی۔ پلاٹ ایک رہ گیا۔ زبان مقفیٰ ہونے کے بجائے سادہ روزمرہ میں تبدیل ہو گئی۔ بیت بازی ختم۔ مکالمہ چھوٹے فقروں میں۔ یہ انقلاب تھا جو ڈرامہ میں آیا اور حشر اسکول کو بہا لے گیا"۔ تیا یدگر ست"

والا معاملہ ہے۔ حشر اسکول کے تتبع کا تذکرہ تو مندرجہ بالا سطور میں کر چکا ہوں کہ آج بھی فلمی دنیا حشر اسکول کی خوشہ چینی کر رہی ہے۔ تازہ ترین ہندوستانی فلمیں ملاحظہ فرما کر انصاف سے بتا دیجئے کہ پچاس فیصدی سے زیادہ میں حشر اسکول بول رہا ہے یا نہیں۔ اب رہا پلاٹ، زبان اور مکالمہ کا مسئلہ تو گذارش احوال واقعی یہ ہے کہ حشر مرحوم کے آخری دور کی تصانیف جو جدید دور کے رجحانات کا تقاضہ ہیں ان میں بھی سب خصوصیات موجود ہیں۔ آپ کی معلومات کے لئے چند ڈراموں کے نام یہ ہیں: "آنکھ کا نشہ"، "دل کی پیاس"، "پہلا پیار" — انھیں پڑھئے اور فرمایئے کہ ان کے پلاٹ میں یکسوئی، زبان سادہ اور روزمرہ ہے یا نہیں۔ بیت بازی آغا صاحب مرحوم اس دور میں خود ہی متروک قرار دے چکے تھے۔ آپ کے سامنے ان کے جدید دور کی ایک تصنیف بھی نہیں ورنہ آپ یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ "حشر اسکول کا انقلاب دقیانوسی ڈرامہ نویسی کو بہا لے گیا اور حشر اسکول کے ہاتھوں چند لوکی اسکول وغیرہ کی مٹی عزیز ہو گئی" اور یہی ہے وہ قلمرو سخن جس کا بادشاہ حشر کو سمجھا جاتا ہے۔ بیتاب صاحب بھی سب کچھ کہہ کر ٹھنڈے دل سے یہی ماننے پر مجبور ہوئے اور یقیناً غالب و احسن اس کے حقدار نہیں۔ بیتاب صاحب کے اس دعوے کو آپ نے "ہنگامی زاویہ" فرمایا ہے۔ یہ بھی تشریح طلب ہے! یہ "ہنگامی زاویہ" یعنی چہ!

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ (۱) دوسرے ڈرامہ نگاروں سے حشر کی استعداد علمی زیادہ تھی۔ (۲) آغا نے دوسرے ڈرامہ نگاروں سے بڑھ کر ادب کی خدمت کی۔ (۳) آغا نے دنیائے ادب میں جو حشر بپا کیا اس کی تفصیل رسالہ "آجکل" کی گذشتہ اشاعت میں آپ نے میرے مضمون میں ملاحظہ فرمائی ہوگی۔ رہا فن ڈرامہ میں حشر کی اصلاح کا سوال۔ تو حقیقت یہ ہے کہ حشر کی استعداد علمی کا تقاضہ تھا کہ انھوں نے زمانے کے ساتھ ساتھ اپنی روش اور انداز کو بدلا۔ اور ان کی تصانیف کا ہر دور ایک نیا انقلاب لے کر آیا۔ اگر کسی نقاد کی نظر میں خوبصورت بلا' آج کے فن ڈرامہ کے لحاظ سے نکتہ چینی کے قابل ہے تو یہ فنکار کا قصور نہیں۔ اسے نقاد کی کم نگاہی ماننا پڑے گا۔ آغا صاحب مرحوم نے جس دور میں جو ڈرامے لکھے اور جس مقصد سے لکھے اس عہد کے رجحانات کا وہی تقاضہ تھا۔ اگر ایک مصلح عام روش کے خلاف آواز بلند کرے اور جبر و اکراہ سے عوام کی اصلاح کرنا چاہے تو قطعاً ناممکن ہوگا۔ عوام کی بغاوت اسے کامیابی کے رُخ پر آنے سے پہلے ہی ختم کر ڈالے گی۔ اور اس کی آواز "صدا بصحرا" ثابت ہو کر گم ہو جائے گی۔ اس کلیہ کو ایک کامیاب مصلح بخوبی سمجھتا ہے اور اگر وہ اصلاح کا بیڑا اٹھاتا ہے تو رفتہ رفتہ صحیح راستہ پر لانے کے لئے عمل پیرا ہوتا ہے۔ یہی انداز حشر مرحوم کا ہے۔ ان کے ابتدائی دور سے لے کر آخری عہد تک کے ڈرامے غور سے پڑھ کر انصاف کی نظر سے اس حقیقت کو پرکھ لیتی ہیں کہ انھوں نے وقت کی مصالح اور عوام کے رجحانات کا غائر مطالعہ کر کے رفتہ رفتہ دنیائے ادب میں حشر بپا کیا اور افسوس ہے کہ اس کی تکمیل سے پہلے ہی رخصت ہو گئے

بے رحم چنگل نے انھیں اس دنیا سے چھین لیا۔ ورنہ آج ہمارے سامنے کئی حشر انگیز اصلاحی پروگرام کی وہ مکمل تصویریں ہوتیں جن کی آج کے زمانہ کو ضرورت ہے اسلئے یہ کہنا یقیناً بجا ہوگا کہ "اگر حشر مرحوم اس زمین سے نہ اٹھا لئے جاتے تو اسی زمین کو آج کاسانوں کا آسمان بنا دیتے" اب تو قابل ہے محترم صاحب کے لئے) اس اختصار کو کسی مزید توضیح کی ضرورت نہیں۔

اب رہ گیا اداکاری کا مسئلہ! یہ آپ جانتے ہیں کہ اکثر کامیاب ڈرامہ نگار کامیاب اداکار بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار کو (خواہ عملی حیثیت سے نہ سہی) کم سے کم اداکاری کے فن میں مہارت ضرور ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ کامیاب فنکار نہیں بن سکتا۔ اس کے بعد ہی آپ دریافت فرماتے ہیں کہ "وہ (حشر) پردہ کش سے ڈرامہ نگار اور سوتر دھار کی حد تک پہنچے تو خدا کے لئے بتلائیے کہ انھیں ایکٹری سے کیوں بیر ہو گیا اور وہ ایکٹری سے کیوں کنارہ کش ہوئے" بندہ پرور! بیتاب صاحب کو کیا علم پہلے تو آپ یہ فرمائیے کہ "حشر پردہ کش کب تھے؟" اور یہ "آرتی خبر! اگر آپ تکلیف نہ کریں گی ہے" زبانی طیور ڈکی۔ تو خدا کے لئے صاحب لیور کا نام آپ بتلائیے۔ اب حقیقت سنئے! حشر نے ناٹک کی دنیا میں جب قدم رکھا تو ڈرامہ نگار ہی بن کر۔ اور رفتہ رفتہ اسی حیثیت سے اداکاری اور تمثیل نگاری کا فنی طور پر مطالعہ کرکے عملی حیثیت سے کامیاب فنکار بنے۔ آپ کہتے ہیں "وہ اونے پارٹ بھی نہ سنبھال سکے اور اسٹیج پر ان کے قدم نہ جمے" یہ خوش انداز بیاں گر کے مؤلف کے قلم سے ایسی بے پر کی زیب نہیں دیتی۔ تھوڑی بہت پوچھ گچھ کر لیجئے۔ یہ جدید تنقید کی دنیا ہے۔ نئی تحقیق کا دور ہے۔ یہاں چھان بین کے بعد مستند بیان مانا جاتا ہے۔ آغا حشر مرحوم کے معمولی معمولی سے شاگرد بھی آج اسٹیج اور فلم کی دنیا میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا کر کامیاب ہو رہے ہیں اور انھیں اس پر فخر ہے کہ آغا صاحب نے اداکاری کا فن سکھایا۔ ذرا اپنے قریب ہی حکیم احمد شجاع صاحب اور سید امتیاز علی صاحب تاج سے دریافت کرکے دیکھئے کہ حشر کا اداکاری کی دنیا میں کیا درجہ تھا؟ پھر آپ کو قرائن دوڑانے اور مزید تجسس کی ضرورت نہ رہے گی۔

باقی جو پھبتیاں آپ نے کس کر آغا صاحب سے کسی "طلائی ایجنٹ" کی شہادت دی ہے۔ اس کی نسبت کچھ کہنے کی حاجت اس لئے نہیں کہ یہ سب باتیں سنجیدگی سے گری ہوئی ہیں۔ علمی ادبی تنقیدی دنیا میں ہر قسم کی ذاتیات معیوب سمجھی جاتی ہیں۔ آپ بیتاب صاحب کے اس بیان کو اعجاز کا رتبہ دے رہے ہیں کہ "آغا مرحوم نے کسی یورپین خاتون کو رفیقۂ حیات بنا لیا" اور پھر خود ہی اس کو ایک "کہانی" بھی لکھتے ہیں۔ یہ واقعی ایک لغو کہانی ہے جس کا پلاٹ بیتاب صاحب نے بنایا اور آپ نے اس پر حاشیہ آرائی فرمائی۔ حیرت ہے کہ اس فرضی یورپین خاتون کو آپ قرائن سے بلند مرتبہ قرار دیتے ہوئے آغا صاحب مرحوم کو "خیالات سے محروم۔ ناخواندہ، لا اُبالی، سدا کا تنگ دست" گردانتے ہے اور مرحوم کا قصور یہ قرار دیا گیا کہ وہ انگریزی اخلاق سے بے بہرہ تھے۔ یہ بیتاب صاحب یا آپ کا کمال نہیں بلکہ ہماری غلامانہ ذہنیت کا تقاضہ ہے کہ انگریزی اخلاق سے بے بہرہ ہونا سوتیلوں کا ایک عیب ہے جس کا آپ کو بھی دلجوئی انصاف ماتم کرنا چاہئے۔ یہ سب افترا پردازی ہے ورنہ واقعہ اصل یہ ہے کہ ایک انگریز خاتون جو مغربی اور مشرقی علم و ادب کی ماہر اور ہندوستانی ڈرامے دیکھ چکی تھی۔ آغا صاحب مرحوم کے کمالات فن کی معترف تھی۔ موصوفہ نے آغا صاحب کو دیکھا تک نہ تھا۔ صرف ان کے ڈرامے دیکھے اور سن کر اس نے مرحوم سے خط و کتابت شروع کی جس کا سلسلہ کچھ مدت تک جاری رہا۔ وہ خطوط آغا صاحب مرحوم کے بیش بہا ذخیرہ میں ابھی تک موجود ہیں اور میں بنارس میں انھیں دیکھ چکا ہوں۔ اس سے زیادہ کوئی جائز یا ناجائز تعلق اس داستان کا کچھ نہیں۔

علاوہ ازیں شیکسپیئر کے ناٹکوں کا ترجمہ براہ راست یا بالواسطہ آغا صاحب کے لئے چنداں وجہ امتیاز بھی نہیں۔ ڈرامہ نگاری کے جوہر ان کی طبع خداداد اور فطرت نے ودیعت کئے تھے۔ اور اہل نظر ان سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔

آغا صاحب مرحوم کے ہندی ڈراموں کے بارہ میں بیتاب صاحب کے بیان کو جو آپ نے سراہا ہے اس کی نسبت اتنا عرض کرنا ہے کہ خاکسار کے پچھلے مضمون میں اس کی پوری صراحت شائع ہو چکی ہے جس میں تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ "حشر نگاری" کی اہلیت کسی دوسرے میں نہ تھی۔ اس ثبوت کے لئے کہ ہندی ڈراموں کا مصنف کوئی غیر شخص تھا جو ہندی داں ہونے کی حیثیت سے حشر کا ہم پلہ گردانا گیا، حشر کی طرز نگارش کو کیوں نہیں پرکھ لیا جاتا۔ حشر کے اردو ڈراموں کا جیتا جاگتا انداز حشر کے ہندی ڈراموں میں کیسے آیا۔ اس پر جب آپ یا کوئی معترض بھی غور کرے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ "بن دیوی" ہو یا "گنگا اوترن"، "سیتا بن باس" یا "بھیشم پرتگیہ"۔ حشر اسٹائل کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں اور بلاشک حشر کی تصانیف۔ ان میں سے ایک لفظ بھی کسی غیر کا لکھا ہوا نہیں، البتہ حشر مرحوم کے منشی جنہیں مرحوم پورے پورے ڈرامے بول کر لکھایا کرتے اگر یہ دعویٰ کریں کہ نقل کا نام تصنیف ہے اور اس لئے وہ ان ڈراموں کے مصنف ہیں اور بلا دلیل بیتاب صاحب یا آپ انھیں مان لیں تو کس کا اجارہ ہے۔ ورنہ ایک نہیں بے گنتی واقفین موجود ہیں جو شاہد ہیں کہ آغا صاحب مرحوم کو ہندی زبان پر کافی عبور تھا۔ آخر میں آپ کا بیان کہ "کردار نگاری سے آغا صاحب کو کیا واسطہ" افسوسناک ہے۔ آپ کی اس لاعلمی پر مجھے بیحد حیرت ہے کہ "آغا حشر اس صنعت (کردار نگاری) ہی سے ناآشنا تھے"۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ حشر کے ڈراموں کے چھوٹے چھوٹے کردار بھی چلتی پھرتی زندہ یادگاریں ہیں حقیقت یہ ہے کہ حشر کی کردار نگاری پر ایک مستقل مبسوط باب کی ضرورت ہے۔

"یہودی کی لڑکی" کا عذرا۔ "سلور کنگ" کا افضل اور پروین، "خوبصورت بلا" کا توفیق۔ "سوروداس" میں رام داس (باپ کا کیرکٹر) خود بلوامنگل (سورداس)، چنتامنی (طوائف) رتنجا (بیوی) "آنکھ کا نشہ" میں تیلی، جگل، کام لتا، سرو جنی اور کانتی۔ "سیتا بن باس" میں سیتا جی اور دھوبن کے کردار، "سہراب و رستم" میں تہمینہ

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

پیا پیا مت بول

بول بول رے پران پپیہے! اگت کی بانی بول
ایسی بولی بھول رے پنچھی! آرکی لاگی دونی ہوئے
جیون کے سب سوت کھلیں اور من بھوری ہیں دھونی ہوئے
بھاؤں میں بھاؤں ان شبدوں کو ٹیک نہ بولیں ڈھنگ تیرے
آگ لگے اس جیب کو تیری، رام کرے یہ گونگی ہوئے

پیا پیا مت بول

کوئی سواگت بول بول پپیہے! اگت کی بانی بول
ہردے بھیتر کیا بیتت ہے؟ کیا بتادے بھولی نار
کلپے، تڑپے، تکس تکس رو دے، رہے صبر سا مار
آہ، کراہ کی سن سن پاکے پیٹ میں لیتا ڈار
ہے رے مورکھ باورے! تو کوک بھرا سنسار

پیا پیا مت بول

کوئی سواگت بولی بول پپیہے! اگت کی بانی بول
اونچا اٹھا آڑ بادل پھاڑے، اِت اُت ڈولے ٹھانوا ڈول
نکی مار کے پنچھی رو دے، ٹپ ٹپ انسوا ہیں آن مول
دکھی جی سب رہنے دے! دبی لگی مت کھول
بیتس لاگی کو نہ جانے، تو کیوں پیٹت ڈھول

پیا پیا مت بول

کوئی سواگت بولی بول پپیہے! اگت کی بانی بول
اُت پت کی یہ بھول ہے پنچھی! اگا و لگے اب کچھ نہ ہوئے
کاہے پھل جب پاک گئے تو ہوت کے اب کچھ نا ہوئے
ہونی تھی سو ہو گئی پیارے، بیتے ہتھے اب کچھ نا ہوئے
گیا سمے پھر ہاتھ نہ آوے، ہاتھ ملے اب کچھ نا ہوئے

پیا پیا مت بول

کوئی سواگت بولی بول پپیہے! اگت کی بانی بول
بول بول رے پران پپیہے! اگت کی بانی بول

سوامی مارہروی

نظروں کا سلام

اس عشق کے ہاتھوں ایسا بھی اک منظر عام آجاتا ہے
خود حسن تماشا کرنے کو کھینچ کر لب بام آجاتا ہے

تارے ڈوبے نبضیں چھوٹیں ایسے میں تو کوئی غمخوار نہیں
یہ وقت وہ نازک ہوتا ہے جب غیر بھی کام آجاتا ہے

تم نے تو نہیں توڑا دل کو تم کس لئے برہم ہوتے ہو
جب ظلم کے قصے چھڑتے ہیں ظالم کا بھی نام آجاتا ہے

جب عشق کے جلوے ہوتے ہیں عرفان نظر کی محفل میں
خود حسن تقاضا کرتا ہے اک ایسا مقام آجاتا ہے

دامن کا کوئی بھی گوشہ بیکار نہیں ہے دامن میں
جو پھولوں سے بچ رہتا ہے کانٹوں کے وہ کام آجاتا ہے

جب ملتا ہوں تو وانستہ ہوتے ہیں تجاہل آمادہ
جب کھنچتا ہوں تو چپکے سے نظروں کا پیام آجاتا ہے

ہنستی ہوئی کلیوں سے کہہ دو پھولیں نہ شمیم گلشن پہ
اک ایسی ہوا بھی چلتی ہے رونے کا مقام آجاتا ہے

میں درد کو یوں بھی تعظیماً سینے سے لگائے رکھتا ہوں
جس وقت یہ کروٹ لیتا ہے لب پر ترا نام آجاتا ہے

بیگانہ روی سر آنکھوں پر اے دوست مگر بے عرفی اتنی
دنیا اسے اپنا کہتی ہے جو وقت پہ کام آجاتا ہے

وہ نیم کشادہ چلمن سے محجوب نگاہی کا عالم
جس طرح نکلتے سورج کی کرنوں کا سلام آجاتا ہے

جب نیت صادق ہوتی ہے رحمت نہیں ہوتی اٹھنے کی
جس جام پہ نظریں جمتی ہیں اٹھ کر وہی جام آجاتا ہے

ان کافر گیسو والوں سے اللہ بچائے ہر دل کو
جب زلفیں بکھرا دیتے ہیں عالم تہ دام آجاتا ہے

وہ ہم سے گریزاں ہو بھی چکے مدت ہوئی اس کو اے محشر
لیکن اب بھی گاہے گاہے نظروں کا سلام آجاتا ہے

فاروق محشر بدایونی

یہاں وہاں سے



لڑائی ختم ہوچکنے کے باعث یہ 'ہیلی کو پٹر' (بالائی پنکھے کا جہاز) کھیتوں میں ایسی ادویات چھڑک رہا ہے جس کے اثر سے نہ صرف خس و خاشاک بلکہ بیماری اور تباہی پھیلانے والے کیڑوں کا قلع قمع ممکن ہے۔ یہ طریقہ بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے۔



→ دریائے ٹیمز کے کنارے ایک کشتی میں نئی وضع کا پانی کاٹ انجن لگا کر اسکا معائنہ کیا جارہا ہے۔ یہ انجن رولس رائس کمپنی کے ایک انجینئر کی ایجاد ہے۔ عنقریب ایسے انجن بہت تعداد میں تیار کرکے باہر بھیجے جائینگے۔



فٹ بال کا کھیل عراق کے لوگوں کو بہت زیادہ پسند ہے اس تصویر میں عراقی 'ہوائی بیڑے' اور متحدہ دونوں ٹیموں کے کھلاڑی ایک ساتھ نظر آرہے ہیں۔ حال ہی میں ایک مقابلہ کے آخری کھیل میں عراق کے قائم مقام بادشاہ تشریف لائے اور انعامات تقسیم کئے۔

ٹ کے قدیم نمونے



ایک ہوشیار ماہر فن مٹتے ہوئے نقوش کو دوبارہ اجال رہا ہے۔ یہ ظروف
اپنے زمانے کے قابل یادگار نمونے ہیں۔



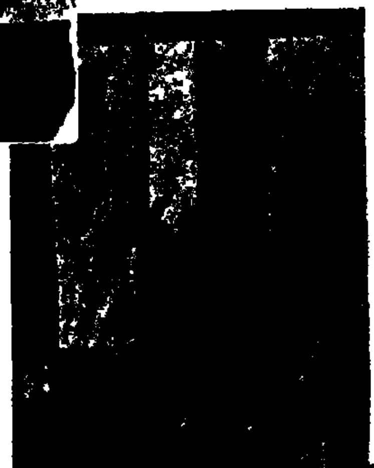
لاکھی مٹی کا بنا ہوا ایک
پرندہ جو چھ سو سال
پہلے ایرانی کاریگروں نے
تیار کیا تھا

آج سے سینکڑوں سال پہلے آرٹ کے یہ بیش قیمت نمونے
جو چین، ایران، ترکی اور ہسپانیہ سے مصر لائے گئے تھے
حوادث روزگار کے باعث مٹی کے نیچے دب گئے۔ حال ہی
کی کھدائی میں انکو برآمد کیا گیا ہے۔ پانچ سال بعد ان
کی عام نمائش شروع ہوئی۔ انہیں دیکھکر عہد قدیم کی
لائق تحسین صناعی کا اندازہ ہوتا ہے۔



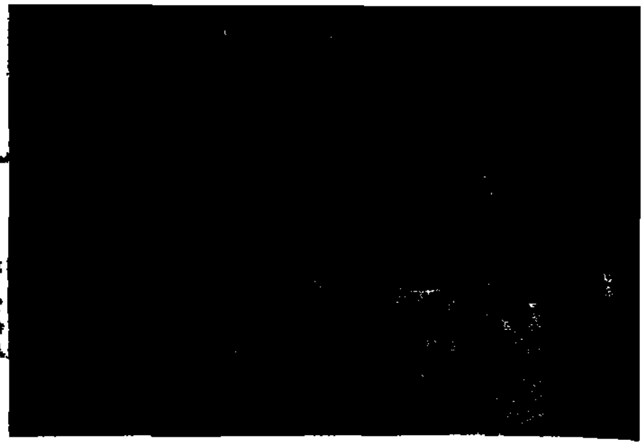


کانسے کا بنا ہوا چھ سو سال پرانا جھاڑ
جسکے بارہ پہلو ہیں۔ تیل میں ڈوبی
ہوئی متعدد بتیاں اسے روشن رکھتی
ہیں۔



کانسی کا ایک خوبصورت آفتابہ لوٹی
کی جگہ ایک مرغ اپنے پر پھیلائے
کھڑا ہے۔

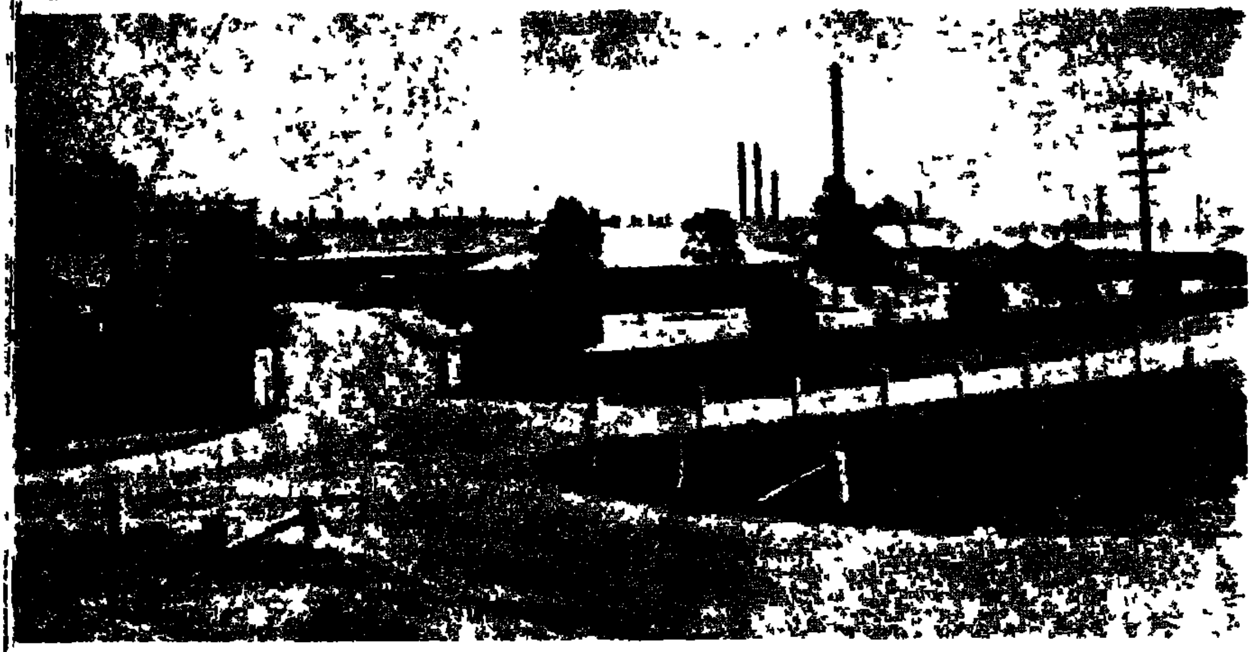
چودھویں صدی کے ایرانی فن کا نمونہ قرمزی رنگ کی
[illegible]



مکھن بنانے کی مشین میں سے مکھن نکل رہا ہے۔



مکھن کی ٹکیاں کاٹنے اور کاغذوں میں لپیٹنے کی مشینیں



سٹریلیا کے ڈیری فارم

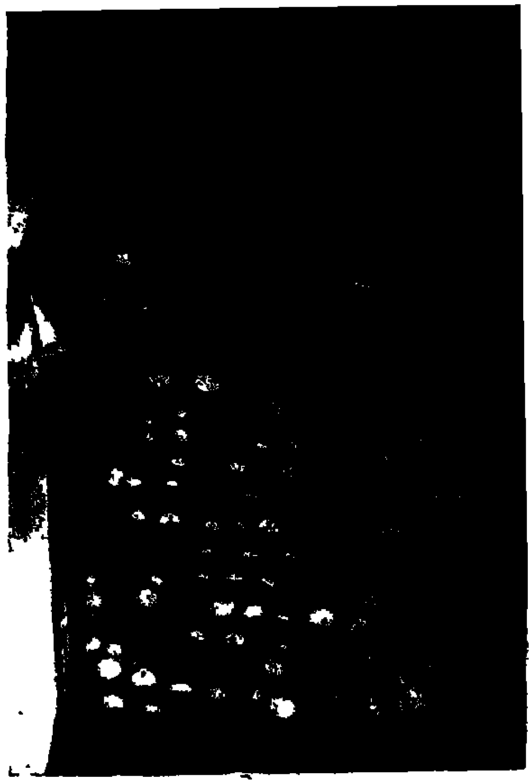
نیو ساؤتھ ویلز میں مکھن بنانے والے ایک کارخانے کا عام نظارہ۔

مکھن بنانے والے کارخانے کی ایک لیباریٹری۔



صحت و صفائی کا لحاظ رکھتے ہوئے مکھن کے ڈبے بند کئے جارہے ہ





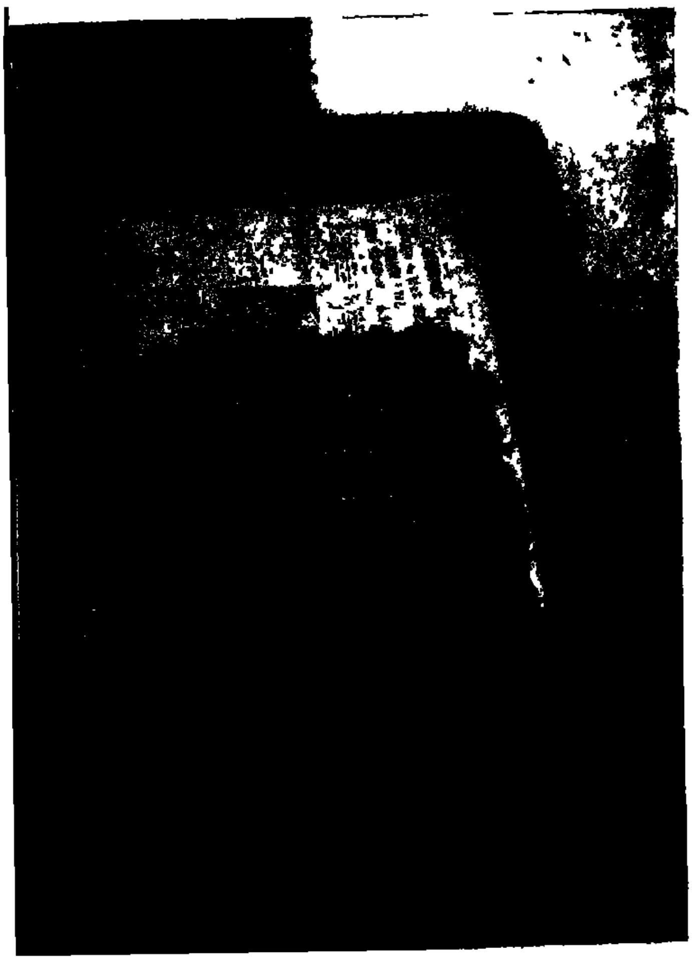
س کی کشتی میں ریشم کے کوئے۔ ایسی ہی
شتیوں میں ریشم کے کیڑے کوئے تیار کرتے ہیں۔



روشن اور ہوادار کمرے جنمیں کیڑے اور انڈے
پرورش پاتے ہیں۔

ہندوستان میں ریشم

شیا میں چین کے بعد ہندوستان بھی ریشم سازی کی صنعت کے ے مشہور ہے۔ قدیم ترین زمانے سے یہاں ریشم کے کپڑے فیرہ تیار ہوتے رہے ہیں۔ اس وقت اس صنعت کا سب سے بڑا رکز ریاست میسور میں ہے۔ ورنہ قابل ذکر کارخانے تو دوسرے ہروں میں بھی موجود ہیں۔ ریشم کے کیڑے شہتوت کے نوں پر پرورش پاتے ہیں اسلئے کیڑوں اور انکے انڈوں کی یکھ بھال کے علاوہ شہتوت کے درختوں کی صحیح نشو و نما کا ی خیال رکھا جاتا ہے۔ اچھا ریشم صرف اسی کارخانے میں تیار و سکتا ہے جسکے زیر اہتمام کیڑوں اور انڈوں کا سائنسی معائنہ رنے کیلئے عمدہ تجربہ گاہیں ہوں۔ شہتوت کے پتوں کو چاٹ اٹ کر ننھے کیڑے خاصے بڑے ہو جاتے ہیں انہیں کیڑیلز ہا جاتا ہے۔ تقریباً چھ ہفتے بعد وہ اپنے ہی جسم کے گرد تار یلنے لگتے ہیں۔ چند دن بعد وہ مکوڑوں کی شکل میں وئے سے باہر آجاتے ہیں اور پر نکلنے تک آرام کرتے ہیں۔ ن میں سے ماداؤں کو خاص طور پر ریشم کی تھیلیوں میں بند رلیا جاتا ہے تاکہ وہ حدود سے باہر جاکر انڈے نہ دے سکیں۔



ریشم کے ایسے کیڑوں سے بھری ہوئی کشتی جنکی عمر
صرف سات یوم ہے۔

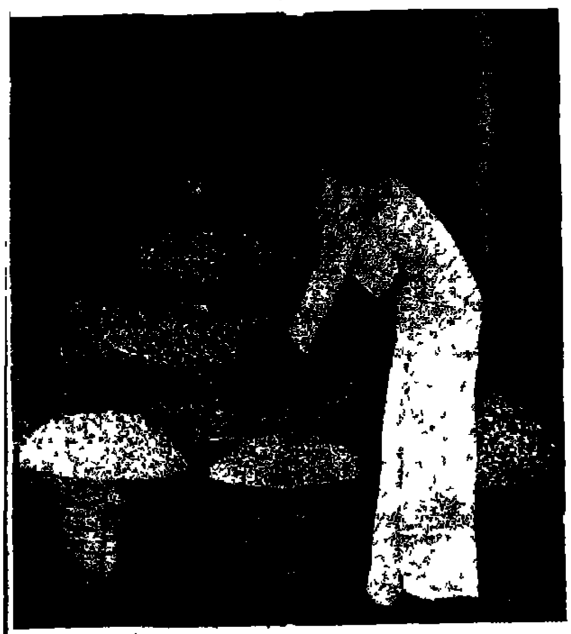


میسور کے حکومتی کارخانوں
میں اتنے زیادہ انڈے نکلوائے
جاتے ہیں کہ ریشم سے قطع
نظر انکی تجارت بجائے خود
بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ دوسرے
شہروں کے چھوٹے ریشم ساز
ان کیڑوں کو خرید کر اپنا
کام چلاتے ہیں ہندوستان کا
ریشمی کپڑا یا صرف ریشم
بڑی مقدار میں آس پاس کے
ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔
اس سلسلے میں حکومت بھی
خاطر خواہ مدد دیتی ہے تاکہ
یہ ہندوستانی تجارت اچھی
طرح فروغ پاسکے۔

...ی صنعت

مائکروسکوپ والے کیمرے کے ذریعہ ریشم کے انڈوں
کی تصویریں لی جا رہی ہیں۔ انہیں دیکھ کر اندازہ
لگایا جائیگا کہ کونسے کارآمد ہیں اور کونسے بیکار۔





کیڑوں کی مادائیں انڈے دے رہی ہیں۔ انکی صلاحیتوں کا
صحیح اندازہ لگانے کیلئے انکا شجرۂ نسب محفوظ رکھا جاتا ہے۔

ذخیرے کے کمرے میں کوئے ٹوکروں میں بھرے رکھے ہیں۔
یہ ہندوستان بھر کے ریشم سازوں کو بھیجے جائینگے۔ ←



چینی طالبات

چین کی نئی پود ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔ اس سلسلے میں [illegible] لڑکوں سے [illegible] پیچھے نہیں [illegible] کے خطرناک ماحول کے باوجود انہوں نے دوسرے مشاغل کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھی ہے۔ اس صفحے کی تصاویر میں کن لنگ [illegible] کی لڑکیاں نظر آرہی ہیں جو صوبہ [illegible] کے شہر چنگ تو میں واقع ہے یہ لڑکیاں بھی [illegible] ہیں کہ آج چین کو حیات نو بخشنے میں بڑی مدد دینگی

کالج کی چند طالبات مطالعے میں مصروف ہیں۔ پشت کی جانب دیوار میں لگا ہوا صوبے کا نقشہ غور طلب ہے۔ ←



کالج کی عمارتوں اور میدانوں کا ایک خوشنما منظر۔ اس حصہ ملک کو جاپانی بمباری سے نقصان پہنچ چکا ہے۔



ایک طالبہ اپنے ذاتی کمرے میں۔ اسکا لباس بالکل نئی وضع کا ہے جس کا رواج سارے ملک میں ہو چلا ہے۔

عراق

عراق کی سرزمین قدیم زمانے سے آج تک عظیم الشان محلوں اور مستحکم مقبروں کیلئے مشہور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طرز تعمیر میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن نفاست و پاکیزگی کا ہمیشہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہر محل اور مقبرے کے ساتھ شاداب باغیچے اور عمدہ روشیں بنائی جاتی ہیں۔ سابق شاہ عراق کو بھی عمارتیں بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ انکے عہد کے دو محل قصر الزہور اور قصرالرحاب خاص طور پر مشہور ہیں۔



قصرالرحاب کا ایک دلکش منظر۔ آجکل اس میں عراق کے قائم مقام بادشاہ رہتے ہیں۔ یہ تصویر عراق کے فضائی محکمے نے کھینچی ہے۔



سابق شاہ فیصل کے مقبرے کا طائرانہ منظر۔ یہ تصویر بھی عراق کے فضائی محکمے نے کھینچی ہے۔



مس ستارہ — فلم ایکٹرس

ترجیح

افسانہ

دیوندر ستیارتھی

یہ نمائش کا آخری دن تھا۔

اس نے آئینے کے سامنے کھڑے کھڑے تیوری کو عجیب سا ترشول بنایا جو نیل کمل کی منہ بولی ماں یعنی اصلی بڑھیا بجھوسن کے ماتھے پر اکثر نظر آجاتا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کنگھی چوٹی کی اور سنٹرل ہیل آگئی۔ یہ طے تھا کہ وہ ٹھیک وقت پر نیل کمل کے ہاں پہنچے۔ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ آج نمائش کے راستے میں وہ دل کی بات کہہ ڈالے گی۔ آخر کوئی کب تک راز کو چھپا کر رکھ سکتا ہے؟ اس سے فائدہ؟ ایک لطیف سا خوف اس کی روح کی پہنائیوں سے ابھرتا اور رہ رہ کر اس کے پاؤں دبے پڑ جاتے۔ آخر یہ بات وہ نیل کمل سے کیسے کہے گی؟ وہ کیسے اسے سمجھائے گی کہ اس کی سونیا خوشی اور غم کے درمیان معلق ہے۔ وہ کیسے اسے جتائے گی کہ اسے دنیا والوں سے ڈر لگتا ہے۔ ان دنیا والوں سے خدا ہی بچائے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہر عورت کو کچل کر رکھ سکتی ہے۔ آج اسے نیل کمل کی مدد کی ضرورت تھی۔ آج اسے بے پناہ خلوص کا ثبوت ملنا چاہئے۔ ورنہ بات بہیں جانے کے بعد معاملہ بگڑ جائے گا۔ جیسے وہ ایک گہری جھیل میں ڈوب رہی ہو۔ نمائش کا خیال آتے ہی وہ سنبھل گئی۔ یہ طے تھا کہ آج نیل کمل وہ سبھی چیزیں خریدے گا جنہیں وہ دو تین دکانداروں سے ریزرو رکھنے کو کہہ آئے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ نمائش سے لوٹتے ہوئے نیل کمل سے اپنا قصہ کہے گی، پہلے نہیں۔ اس کی بے چینی کسی قدر کم ہو گئی اور وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ نیل کمل غیر حاضر ہے۔ بڑھیا بجھوسن نے حسب معمول ماتھے پر تیوریوں کا ترشول بنا کر اس کے ہاتھ میں چابی تھماتے ہوئے کہا "تم بیٹھو، سونیا۔ نیل کمل کا تو سبھاؤ ہی ایسا ہے۔ وعدہ کر کے بھول جاتا ہے۔"

وہ جانتی تھی کہ ایک طرف ہی نمائش کا راستہ تاپے۔ شاید ادھر کہیں نیل کمل بھی مل جائے۔ لیکن بے دلی سے کمرہ کھول کر وہ صوفے پر جا بیٹھی۔ بڑھیا نیچے کی طرف چلی گئی تھی۔ چلو اچھا ہوا اس نے سوچا، اس چڑیل سے تو چھٹی مل گئی۔ یہاں آ بیٹھتی تو وہی پرانا راگ چھیڑ دیتی — یہ آجکل کی لڑکیوں کو کیا ہو گیا، سونیا۔ لاج نہ شرم۔ تم ان سے الگ ہو۔ نیل کمل ہمیشہ تمہیں سراہتا ہے۔

دیوار گیر پر رکھے ہوئے مجسمے کی طرف اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ یہ مجسمہ اسے پسند تھا۔ فنکار نے ایک حسینہ کو کچھ اس انداز میں پیش کیا تھا کہ دیکھنے والے کو خواہ مخواہ خیال آ جائے کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس کا رنگ کچھ اس طرح بدل گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا آنے والے مہمان کے خیال ہی سے اسے کوفت ہو رہی ہے۔

صوفے کے قریب فرش پر ڈھیر کی ڈھیر کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اٹھ کر انہیں درست کرنے لگ جاتی۔ اس وقت اس کی یہ حالت تھی جیسے کسی نے اسے دنیا کی نصف مسرتوں سے محروم کر دیا ہو۔ اسے یاد تھا کہ ایک روز نیل کمل نے اسی ایک کتاب سے کسی عورت کے جذبات پڑھ کر سنائے تھے ۔۔۔ پہلے وقتوں میں دیوتا دھرتی پر اترتے تھے اور عورتوں سے محبت کرتے تھے۔ اب وہ نیچے نہیں اترتے۔ اگر وہ مر چکے ہیں یا بوڑھے کھوسٹ ہو چکے ہیں تو کیا مجھے وہ محبت نصیب نہ ہوگی جو زندگی کے ساز پر درد بھرے گیت چھیڑ سکے؟ ......

اٹھ کر وہ اس کتاب کی تلاش کرنے لگی۔ یہ خیال اسے گدگدانے لگا کہ نیل کمل معمولی انسان نہیں، کوئی دیوتا ہے جو آسمان سے دھرتی پر اتر آیا ہے۔ ایک کالی کلوٹی لڑکی کے روبرو محبت کا اظہار کرنے والا شخص ضرور کوئی دیوتا ہوگا۔ لیکن اپنی شکل کا خیال اسے بری طرح ستا رہا تھا۔ آج وہ سب بات کہہ ڈالے گی۔ اگر دیوتا نے مجھے ٹھکرا دیا تو میرا کیا حشر ہوگا؟ یہ فنکار قسم کے لوگ بہت بے پروا ہوتے ہیں۔ لیکن اب اس کا بھی کیا علاج کہ نیل کمل کا نام میری روح پر کچھ اس طرح نقش ہو گیا ہے، جیسے کسی نے مرمریں سطح پر لکڑ دار چاقو سے اپنا نام کندہ کر دیا ہو۔ دیوار گیر پر رکھے ہوئے مجسمے کی طرف اس نے اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔

آئینے کے سامنے اس نے پھر سے بال کھول ڈالے اور تیزی سے کنگھی کرنے لگی۔ کمرے کی بکھری ہوئی چیزوں پر اسے غصہ آ رہا تھا۔ کنگھی نہ کی جائے تو بال الجھ جاتے ہیں۔ کمرہ بھی صفائی چاہتا ہے۔ بھلا کوئی پوچھے پہیلی کے چھلکے میز کے پاس کیوں پڑے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ تو دیوار گیر کے مجسمے کو منہ چڑا رہے ہیں۔ چھت کے قریب مکڑی نے جالے تن رکھے ہیں۔ دیواروں پر شاید برسوں سے سفیدی نہیں کرائی گئی۔ یہ فنکار قسم کے لوگ اپنے لئے تھوڑا بہت اصول وضع کر لیں تو ذرا بہتر طور پر زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ہم مل کر رہیں گے، مل کر کمائیں گے۔ نیل کمل میری آواز پر مرتا ہے۔ کہتا ہے، سونیا تیری آواز تو بلبل کو شرمائے۔ مجسمے کے قریب پہنچ کر وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ مجسمے کی حسینہ اس جیسی سولہ کنواریوں پر بھاری ہے۔ لیکن جب ایک بار نیل کمل اسے اپنی کہہ چکا ہے تو وہ اپنا فیصلہ کبھی رد نہ کرے گا۔ لیکن ملتے ہی لمحے وہ مجسمے کے قریب سے ہٹ گئی۔ کیلے کے چھلکے اٹھا کر اس نے باہر پھینک دئے اور فرش پر بیٹھ کر کتابوں کو قرینے سے رکھنے لگی۔ اچانک اس کے دل میں یہ چاہت پیدا ہوئی کہ بڑھیا بھی آ جائے

اور اس کی مدد کرے۔ اس نے بڑھیا کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ شاید وہ کہیں باہر چلی گئی۔ اسے خیال ہوا کہ بڑھیا ابھی یہاں چلی آئے تو پھر سے پرانے قصے نکالنے لگے کہ چاند سورج کی جوڑی اچھے گھروں سے ملتی ہے۔ ایک امیر گھرانے کی لڑکی کو چاند سے تشبیہ دینا، یہ کچھ بڑھیا ہی کے حصہ میں آیا ہے۔ اس کے کہیں آ کر ٹونا ٹوٹکا کر آئینے میں اپنا روپ دیکھے۔

نمائش کا آخری دن تھا اور وقت یوں اٹھتا چلا جائے۔ وہ گھبرا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کیلی ہی نمائش کا رخ اختیار کرے آخر اس حماقت کا کیا مطلب کہ نمائش کا آخری دن یوں بدمزگی کا شکار ہو جائے۔

نہ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ اب نیل کمل کبھی اس گھر میں نہیں آئے گا۔ جیسے اس کا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا ہو۔ ان تین مہینوں میں انہوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ اب اسے دوبارہ آنکھ مچولی کھیلنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوگی؟ نہ میں نے اس پر یقین کیا ہوتا نہ آج میری یہ حالت ہوتی۔ میری بددعائیں اسے کھا جائیں گی۔ میں وہ انتقام لوں گی کہ دنیا میری ہمت کی داد دے گی۔ لیکن نیچے زینے سے پاؤں کی آہٹ سن کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی جیسے کوئی ناگن پھن پھیلائے گت کا انتظار کر رہی ہو۔

"مجھے معلوم تھا کہ کمل ابھی تک نہ آیا ہوگا" بڑھیا نے نیچے سے آکر کہنا شروع کیا۔ "بس ایسا ہی ہے میرا منہ بولا بیٹا سونیا۔ اس سے تو تم ہی اچھی ہو"

بڑھیا دہلیز پر بیٹھ گئی۔ سونیا اٹھ کر سڑک کی طرف کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ رات اتر آئی تھی۔ ننھے روشن ہوا [illegible] تھے وہ [illegible] میں دور دور کہیں کسی کو آتے ہوئے دیکھنے کیلئے بیقرار ہو اٹھی۔ ایک بھاری بھرکم ٹرک سڑک کی چھاتی کو دہلاتا ہوا نکل گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھی ایک سڑک کی طرح ہو۔

اس نے مڑ کر دیوار گیر کے مجسمے کی جانب دیکھا جس کے انگ انگ سے درد و رنج کا علامتی تصور واضح ہو اٹھا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ اپنی بات بڑھیا سے کہہ ڈالے

بڑھیا کہہ رہی تھی "تم اداس کیوں ہو سونیا؟ آؤ تمہیں ایک کہانی سناؤں"

کہانی! — کیسی کہانی؟ اس سے پیشتر کہ وہ ہاں یا نہ کہتی، بڑھیا نے کہنا شروع کیا "بہت پہلے دیس میں بہت بھیانک کال پڑا۔ چشمے، تالاب اور کنوئیں سب سوکھ گئے۔ رات کا وقت تھا۔ ایک لڑکی پانی کی تلاش میں نکلی۔ تھک ہار کر اس نے سوکھی زمین پر سر رکھا اور سو گئی۔ آنکھ کھلی تو آنسو ڈھلک گئے۔ جگہوں کی کرامت اس کی گگری تازہ پانی سے بھر گئی۔ وہ بہت پیاسی تھی۔ لیکن ماں کو پانی پلائے بغیر ایک بوند تک حلق میں ٹپکانا پسند نہ تھا۔ گھر پہنچی تو ماں کے سوکھے جسم دو دن گزر چکے تھے۔ ماں بولی "بیٹی میرا آخری وقت قریب ہے۔ اب پانی تمہارے لئے ہے" جونہی اس نے کٹورہ بھر کر پانی پینا چاہا کہیں سے ایک اجنبی آ گیا۔ لڑکی نے اپنا کٹورا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سات قطرے لڑکی کی گود میں آ گرے۔ گگری سے ایک ندی بہہ نکلی جو آسمان پر پہنچ کر آکاش گنگا (کہکشاں) بن گئی۔ اور وہ سات قطرے سات ستارے بن گئے"۔۔۔۔۔ کوئی اور وقت ہوتا تو سونیا یہی کہتی کہ تم نے یونہی نیل کمل پر رعب جما رکھا ہے۔ یہ بکواس ہے کہ گگری سے گنگا بہہ نکلی۔ بھلا یہ گنگا آسمان پر کیسے جا پہنچی؟ اجنبی کے ہاتھ میں تھامے ہوئے کٹورے سے لڑکی کی گود میں سات قطرے گرے اور جیسا کہ نیل کمل نے مشہور کر رکھا ہے، تم بھی سات بیٹیوں کی ماں رہ چکی ہو۔ یہ بہت بڑی گپ ہے۔ دیکھ لی تمہاری گیان گودڑی۔ اسے نیل کمل کے سامنے ہی کھولا کرو۔ لیکن یہ سوچ کر کہ یہ وہی بڑھیا ہے جس نے ابھی ابھی کہا تھا — بس ایسا ہی ہے میرا منہ بولا بیٹا، سونیا۔ اس سے تو تم ہی اچھی ہو۔ وہ بڑھیا سے کہنا چاہتی تھی کہ دادی اماں، تمہاری یہ آکاش گنگا والی کہانی تو بہت بڑی حقیقت ہے۔ شاید میں ہی وہ لڑکی ہوں جو پیاسی ماں کیلئے پانی کی تلاش میں بھٹکتی رہی تھی۔ نہ معلوم نیل کمل ایک راہی کی طرح ہمارے ہاں چلا آیا اور میں نے وہی سلوک کیا جو ہمیشہ ایک مہمان کا حق ہوتا ہے۔

ایک طرف صلیب پر چڑھے ہوئے مسیح کی رنگین تصویر آویزاں تھی جو ابھی کچھ ہی روز اپنے جنم دن کے موقع پر اس نے نیل کمل کو پیش کی تھی اور جسے لیتے ہوئے اس نے ایک ادیب کا کوئی اچھوتا خیال پڑھ کر سنایا تھا — "یعنی معصوم بھیڑوں پر کئے گئے ظلم کی خدا کا بیٹا تاب نہ لا سکا اور اس نے صلیب پر چڑھنا قبول کیا یہی نجات کا ایک سچا طریقہ ہے" اس کے ذہن میں نجات کا خیال بجلی کی سی تیزی سے کوندے کی طرح لپکا۔ اور وہ کھڑکی سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

بڑھیا نہ جانے کیا بڑبڑا رہی تھی۔ وہ بول اٹھی "لڑکی کے لیکھ تو بیچارے جنم سے پہلے ہی لکھے جاتے ہیں، سونیا"

سونیا نے ایک رسمی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بڑھیا کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو یہ لیکھ ویکھ کا قصہ میری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ وہ بولی "چھوڑو کوئی کام کی بات کرو، دادی اماں"

بڑھیا نے اس روکھے جواب سے ذرا برا نہ مانا۔ وہ تو اپنی گزشتہ زندگی کے خیال میں الجھ رہی تھی۔ نہ جانے کیا سوچ کر وہ کہہ اٹھی "[illegible]

روٹی کو بھرتے سینک کر کھانے میں مزہ آتا ہے سونیا؟

سونیا چاہتی تھی کہ بڑھیا سے کہے، یہ پہیلیاں کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ مجھے نپٹ انجان مت سمجھو۔ تم یہی کہہ رہی ہو نا کہ ہمارا بیاہ ہو جائے تو تمہیں کسی کے ہاں کام کر کے روٹی کمانے کی ضرورت ہی نہ رہ جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر ہم تمہیں گھر کا کام سونپ دیں تو تمہاری بیتی ہوئی خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں گی۔ بارہا اس تمہاری زندگی میں سات بیٹے آئے۔ مگر کچھ بھی تو نہ رہا۔ نیل کمل تمہارا اسنا ہوا بیٹا ہے۔ کبھی کبھار تمہارے ہاتھ پر دو چار آنے رکھ دیتا ہے تو تم خوش ہو جاتی ہو۔ ہمارا بیاہ ہو جائے تو میں اسے بھی خوش کیا کروں گی۔

بڑھیا اپنے تمام خیالات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے بولی۔ "میں تو تمہارے بیاہ پہ تمہیں چاندی کا چھلا بھی نہیں دے سکوں گی، سونیا!"

اس کے جواب میں سونیا جھٹ کہہ اٹھی۔ "وہ تم نے ہی تو کہا تھا، دادی ماں کہ روپ کو زیور کا نہیں چاہیئے!"

بڑھیا کھسیانی سی ہو گئی۔ "میں دھنوان ہوتی تو بہو کو سونے میں پیلی کر دیتی۔ میں تو تمہارے بیاہ کے دن گن رہی ہوں، سونیا!"

سونیا مسکرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ بیکار دن گنتے رہنے سے کیا فائدہ۔ کل کل کرتے رہو تو وہ کل کبھی نہ آتا ہے۔ نیل کمل کا تصور دھندلا ہے۔ یہ آج، بہت انتظار کے بعد آیا ہے۔ اگر یہ آج بھی بیکار رہا تو سمجھو دو زندگیاں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے پرے ہٹ گئیں۔ دیوار گیر پہ رکھے ہوئے مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے اب اسے پہلی سی کوفت محسوس نہ ہوئی۔ غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں صلیب پر چڑھتے ہوئے مسیح کی طرف گھوم گئیں۔

بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے۔ جیسے سات بیٹوں کو کھو کر آٹھواں بیٹا پا لیا ہو۔ اب اس بیٹے کا بیاہ ہو گا۔ بہو بری نہیں کرسٹان ہے تو کیا ہوا۔ وہ میموں کی طرح بال تو نہیں کٹاتی۔ جیسا دیس کا رواج ہے، وہ ساڑھی پہنتی ہے۔ سونیا کی سفید ساڑھی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کہہ اٹھی۔ "سانولے رنگ پر سفید کپڑا ہی خوب پھبتا ہے، سونیا!"

سونیا نے ہنس کر کہا۔ "مگر بیاہ کے موقع پر تو لال ساڑھی چاہیئے نا کیوں دادی اماں؟"

بڑھیا جھٹ کہہ اٹھی۔ "اپنے ہاتھ سے میں تیری مانگ میں سیندور بھروں گی، سونیا!"

سونیا کہنا چاہتی تھی کہ نیل کمل تمہارا بہت ادب کرتا ہے۔ تم کہو گی تو کل ہی مجھ سے بیاہ کر لے گا۔ ہاں، اب تو فیصلہ ہو ہی جانا چاہیئے۔ آج میں نیل کمل کو اپنی حالت سے آگاہ کر دوں گی۔ مہینے ڈیڑھ مہینے کا حساب تو آسانی سے ادھر ادھر کیا جا سکتا ہے۔ اگر نیل کمل انکار کر دے تو میں کیا کر سکتی ہوں! میری ماں بھی شاید میری مدد نہ کرے۔ چھوٹی بہن مجھے بیوقوف سمجھ سکتی ہے۔ شاید میں یونہی ڈرتی ہوں۔ نیل کمل خوشی سے اچھل بھی تو سکتا ہے۔

وہ چاہتی تھی کہ صوفے سے اٹھ کر بڑھیا کے قریب دہلیز پر جا بیٹھے اور اس سے کہے کہ خدا نے چاہا تو کل ہی میرا بیاہ ہو جائے گا۔ نیل کمل بازار سے لال ساڑھی لیتا آئے گا۔ سیندور تم دے دو گی۔ لیکن نہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ سکی نہ منہ سے ہی کچھ کہہ سکی۔ چپ چاپ پتلی کی طرح بیٹھی اپنے جذبات کو بیاہ کے دھاگے میں پروتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ نیل کمل کی رگوں میں ایک شریف گھرانے کا خون دوڑتا ہے اور تھوڑا سا زور دکھانے ہی سے وہ مان جائے گا۔ آج تو اب ختم ہو چلا ہے۔ کل ہمارا بیاہ ہو جانا چاہیئے۔ بڑھیا سب سے پہلے بدھائی دے گی۔ نیل کمل کے دوست کتنے خوش ہوں گے۔ سب سے زیادہ خوشی شنکر کو ہو گی جو ابھی اس روز ہنس کر کہہ رہا تھا — "کمل بھیا، تمہارے بیاہ پر میں تمہارے ساگوان کے صوفے پر نیا پالش کرا دوں گا۔ پھر دیکھنا یہ کتنا خوبصورت نظر آنے لگا۔" جواب میں نیل کمل نے آداب عرض کرتے ہوئے کہا تھا — "خوبصورتی پالش نہیں چاہتی۔" اسے یاد تھا کہ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی تھی جب کہ نیل کمل کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے شنکر کہہ اٹھا تھا "سچ ہے، میاں مجنوں۔ . . . . . اور وہ جو روپ نے کہا تھا خوبصورتی اور بدصورتی کے درمیان ہمیشہ ایک مرئی یا غیر مرئی حد فاصل موجود رہے گی لیکن فن کی سطح تک ابھر کر بدصورتی بھی بدصورتی نہیں رہتی۔ دیوار گیر کے مجسمے کی طرف ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر اس نے سوچا نہ جانے روپ کیا کہنا چاہتا تھا۔ کل ہی ہمارا بیاہ ہو جائے تو نہ جانے روپ کیا بھینٹ لائے گا۔

بڑھیا کہہ رہی تھی۔ "ایسی سب گن پوری بہو تو ہر ساس کو ملے سونیا!"

جواب میں سونیا کہنا چاہتی تھی کہ تم دیکھ لو گی، دادی اماں، میں ناشکری نہیں ہوں۔ خوبصورتی تو صرف ایک گن ہے۔ اس دیوار گیر کے مجسمے کی حسینہ ہی کو لے لو۔ وہ خوبصورت ضرور ہے، سب گن پوری نہیں۔

ہر لحظہ ایک اچھی بہو بننے کا خیال اس کے خون کو گرمانے لگا۔ وہ جو اس روز روپ نے پدمنی، چترنی، ہستنی اور سنکھنی کا قصہ چھیڑ دیا تھا اور عورت کی ان چار قسموں کا ذکر کرتے ہوئے نیل کمل کہہ اٹھا تھا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ پدمنی خوبصورت ترین ہونے کے باوجود بدصورت ترین دماغ رکھتی ہو۔ "دادا، مجھے پدمنی نہیں چاہیئے۔" وہ بڑھیا سے کہنا چاہتی تھی کہ مجھے تم سے کوئی زیور نہیں چاہیئے، دعا ہی کافی ہے۔

بڑھیا کہے جا رہی تھی "لال ساڑھی دہلی لائی جا سکتی تو کیا سیندور ہی بہت ہے ! سونیا !"

سونیا نے جواب میں صرف اتنا کہا۔ "نیل کمل چاہے گا تو مجھے سیندور سے مانگ بھرانے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ روحوں کے ملاپ کیلئے بیاہ تو ضروری ہے "

ایک بار سونیا کا خیال اپنی سہیلیوں کی طرف چلا گیا - ہر کسی نے اپنی پسند کا دولہا چنا تھا۔ موہنی کا یہ قطعی فیصلہ تھا کہ اچھا خاوند وہی ہے جو ہر روز جارجٹ کی نئی ساڑھی لا سکے۔ جارجٹ کی ساڑھی ! اس کے بہنار کو ٹھیس سی لگی - کیا روحوں کے ملاپ کیلئے جارجٹ کی ساڑھیاں نہایت ضروری ہیں ؟ نندنی شہرت کی بھوکی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک فلم ایکٹر سے شادی کر لی - سلاجی کو دو جارجٹ کی ساڑھیاں چاہئیں نہ شہرت۔ اس نے سو فیصدی مرد قسم کا خاوند چن لیا ہے۔ مجھے بھی چاہئے کہ نیل کمل کو ہر قیمت پر خوش رکھوں - فنکار قسم کا شخص غریب ضرور رہتا ہے لیکن اگر اس کا انتخاب کرتے وقت یہ بات ذہن میں رہے تو بہ خوبی زندگی مزے سے گزر سکتی ہے ۔ نیل کمل ہی میری مشکلات کا واحد حل ہے۔ مکمل مرد تو بھلا کہاں ملے گا ؟ مکمل مرد ! جیسے نیل کمل کو مکمل مرد سے کچھ کم نمبر دے کر اسے امتحان میں اول رکھنے کے باوجود اسے ذہنی کوفت ہو رہی ہو - اور مکمل عورت ! — اس کا بھی صرف تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب روحوں کا ملاپ ہو جاتا ہے تو مرد عورت کا جوڑا دنیا بھر کی خوشیاں محسوس کرتا ہے -

وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ سڑک پر بے حرکت سائے رینگ رہے تھے - ان سایوں میں لحظہ بہ لحظہ اپنی طرف آتے ہوئے نیل کمل کا تصور اس کے ذہن کو گدگدانے لگا ساتھ خیال آیا کہ لو پھر کچھ دنوں سے نیل کمل پر ایک فلمی کہانی لکھنے کا خبط سوار ہے - میں لاکھ سمجھا چکی ہوں کہ یہ ایک چٹان سے ٹکر لینے والی بات ہے - فلم والے کہانی نہیں چاہتے ، چوں چوں کا مربہ چاہتے ہیں - وہ کہتا ہے ، ایک کہانی بک جائے تو تین چار ہزار روپیہ آ جائے میں کہتی ہوں فلم کمپنی والوں کا بھی ایک نہ ایک چور دروازہ ضرور ہوتا ہوگا - فلمی کہانی لکھنے سے پیشتر اس دروازے کا پتہ چلا لو - شاید وہ اس وقت اسی دروازے کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہو ...... کھڑکی کے باہر جیسے تاریکی کی سطح پر دھندلے دھندلے نقطوں سے ترتیب دیا ہوا "سواگتم" (خوش آمدید) ابھرنے لگا - وہ بڑی شدت سے نیل کمل کی فلمی کہانی کا تجزیہ کرنے لگی - سات سال تک ایک کشمیری لڑکی اپنے ہونے والے شوہر کیلئے ایک خوبصورت شال پر "سواگتم" کاڑھتی رہتی ہے اور اس کے ڈیزائن میں قدیم اور جدید فن کا امتزاج دکھانے میں کامیاب ہو جاتی ہے ۔ لیکن ملتے ہی ہیں اس کے ہونے والے شوہر کی دلچسپیاں کسی اور نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہیں - پھر آخر وہ مایوس ہو کر وہ اپنی ہنرمندی کے ہاں پہنچتا ہے ۔ وہ متواتر غیر ارادی طور پر اس کی راہ دیکھتی رہی تھی ۔ لیکن "سواگتم" پیش کرتے وقت اس کے ہاتھ کانپتے ہیں اور اس کی دہشت زدہ روح ڈوبنے لگتی ہے - لحظہ بہ لحظہ اس کی زندگی میں وہ نہم سرایت کرنے لگتا ہے جس سے وہ اب تک بچی ہوئی تھی - شوہر کو اس ماحول میں ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس کے ناقابل ہے - اور جو چیز وہ "سواگتم" کے جواب میں پیش کر سکتا ہے ، اسے وہ راستے ہی میں کھو آیا ہے ... . وہ نیل کمل کے روبرو اس المیہ کی بیحد تعریف کر چکی تھی حالانکہ اسے یقین تھا کہ کوئی کمپنی اسے قطعاً نامنظور کرے گی -

بڑھیا نہ جانے کیا سوچ کر کہہ اٹھی "تیرا بیاہ خوش ہو تو اچھا ہی ہنستا ہے سونیا !"

سونیا نے بے دلی سے بھی ہنکارا بھرنے کی ضرورت نہ سمجھی - اسے ڈر تھا کہ بڑھیا کوئی فرسودہ روایتی قصہ نہ چھیڑ دے - اس کی ذہنی کیفیت مائل پرواز ابابیل سی تھی جیسے بار بار خیال آ رہا ہو کہ اڑنے سے پہلے اپنی منزل کا فیصلہ کر لینا چاہئے وہ کسی فلم کمپنی کی ایکٹرس ہی کیوں نہ ہو میں نیل کمل کے قابل ہوں اور نیل کمل میرے قابل - فیصلے بار بار نہیں کئے جاتے - اسے یاد آیا کہ ابھی اگلے ہی روز کمل کہہ رہا تھا — عورت کو چاہئے کہ حسد کو چین کی دیوار کی طرح راستہ روکنے کا موقع نہ دے ....

پھر اسے خیال آیا کہ بڑھیا کی پیٹھ پر زور سے ایک ٹھوکر جما کر کہے - دور ہو جا یہاں سے بڑھیا چڑیل - بڑی آئی ہے وہ - میری ساس - اونہہ ! میں کسی ساس کو نہیں پہچانتی - اس نے زہر آلود نگاہوں سے بڑھیا کی طرف دیکھا اور دیر تک دانتوں سے ناخن نوچتی رہی - وہ ہمیشہ کے لئے اس پریشانی کا حل ڈھونڈ لینا چاہتی تھی - بڑھیا خاموش تھی ، جیسے کوئی فرسودہ روایت ماضی کے کھنڈروں کے نیچے ہمیشہ کی نیند سونے کا بہانہ نہ پا کر افسوس کر رہی ہو - نیل کمل سے کہہ کر یہ گھر بدلنا ہوگا - ہم اپنی جوانی پر اس چڑیل کا عکس کیوں پڑنے دیں -

اسے گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی - غیر شعوری طور پر اس کا غصہ نیل کمل کی بجائے بڑھیا کی طرف منتقل ہوتا چلا گیا - اسے خیال آیا کہ اگلے ہی روز نیل کمل کہہ رہا تھا — غصے کو ہمیشہ کے لئے تھوک دو ، سونیا .... اور نیل کمل نے یہ بھی تو کہا تھا کہ تم بلا کی انتہا پسند ہو سونیا - زندگی ہمیشہ یک رُخی اختیار کرنے والوں کو سزا دیتی ہے - بیحد نفرت اچھی ہے نہ بیحد محبت - بیحد غصہ اچھا ہے نہ بیحد رحم - انتقام نہ خود کشی

نکاوٹ ہے، بے اعتنائی نہ عزت افزائی نہ تذلیل، ان میں سے کسی کو بھی ہمارے احساس کے گرد تیزی سے گردش کرنے کی اجازت نہ ملنی چاہئیے۔ جبھی یہ ممکن ہے کہ ہماری رگوں میں خون یکساں رفتار سے چلتا رہے۔ جبھی وہ سکون ممکن ہے جس کی تلاش فنکار کو پریشان کئے رہتی ہے۔ کاش نیل کمل یہاں سے جھٹ آجائے اور ہم ناٹک ختم ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر پھر سے بال ٹھیک کر لیں۔ اب تو اسے آ ہی جانا چاہئیے۔

بڑھیا نہ جانے کیا بڑبڑا رہی تھی۔ پھر وہ کہہ اٹھی "میں نیل کمل سے کہوں گی، سونیا کہ پچھلے جنم میں کوئی سو سو موتی دان کرتے تو سب گن پوری دلہن ملتی ہے۔"

سونیا نے فیصلہ کر لیا کہ بڑھیا کی کسی بات کا جواب نہ دے گی۔ خفگی کی لہر کے نیچے یہ خیال بھی دب گیا کہ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر پھر سے بال بنا لے۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے نیل کمل کی زبان سے سنے ہوئے اس خیال کا تجزیہ کرنے لگی کہ "حسن تخیل حسین صورتوں کی نسبت زیادہ مسحور کن ہوتا ہے ......" اسے خیال آیا کہ بڑھیا تو جوانی کے ساتھ سب حسن تخیل بھی لٹا چکی ہے ورنہ اس کا دماغ فرسودہ روایتوں کے گرد ہی گھوم سکتا ہے۔ یہ کہاں کا حسن تخیل ہے؟ میرا حسن تخیل بہت بلند ہے۔ اور یوں بھی تو میں ایک حسینہ ہوں! جیسے کسی نے اسے چونکا دیا ہو۔ جھٹ سنبھل کر وہ سوچنے لگی کہ نیل کمل کے ہاں حسن کا پندار نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ میں اس کے جوہر قابل کی نشو و نما میں ہاتھ بٹا سکتی ہوں، تخلیقی کام میں برابر کا ساتھی بن سکتی ہوں۔ میرے پاؤں نہ تھکیں گے کہ ننھی ٹھیک گت بجا سکا ہے یا نہیں مجھ میں صلاحیت ہے کہ رقص کو عروج تک لے جاؤں۔

بڑھیا پھر کہہ اٹھی۔ "جب بیاہ ہوتا ہے تو سورگ دیوتا آنند سے پھولے نہیں سماتے، سونیا!"

سونیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ ابھی اگلے ہی دن نیل کمل کہہ رہا تھا کہ حسن عظمت ہے، ضعف نہیں...... اس نے بڑے غور سے بڑھیا کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ اپنی بے تکی باتوں کو بند بھی کرو گی یا نہیں۔

یک لخت نیچے زینے سے تیز تیز اٹھتے ہوئے قدموں کی آواز آنے لگی اور بڑھیا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ سونیا بدستور صوفے پر جم کر بیٹھی رہی۔ اس وقت اس کی نگاہیں نہ دیوارگیر کے مجسمے کی طرف اٹھ سکتی تھیں نہ صلیب پر چڑھے ہوئے مسیح کی تصویر کی طرف۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں بہت جلد نیل کمل کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا چاہتا تھا۔

نیل کمل نے اندر آتے ہی نیلگوں کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز پرے رکھتے ہوئے سونیا کی طرف بازو پھیلا دئے۔ سونیا نے نہ اس کے ہاتھ جھٹکے، نہ یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ کتنی شدت سے اس کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، جیسے کہنا چاہتی ہو "تمہیں کچھ یاد نہیں رہتا، تم فنکار جو ہو نا۔"

بڑھیا کہہ اٹھی "آج بیاہ کا فیصلہ کر لو بیٹا ــــ کل بیاہ کر لو۔"

نیل کمل اور سونیا ہنسی ٹھٹھوں میں کھو گئے۔ سونیا چاہتی تھی کہ بڑھیا اور آگے بڑھ جائے۔ وہ نیل کمل سے مخاطب ہونے ہی کو تھی لیکن جیسے چھینک آتے آتے رک جائے، وہ پھر عجیب سی چپ رہ گئی۔

نیل کمل برابر ہنس رہا تھا۔ سونیا شرما کے بولی "ہاں ہاں ــــ آج فیصلہ کر لو، کل بیاہ ہو جائے۔ دادی اماں سچ ہی تو کہتی ہے۔"

نیل کمل کی ہنسی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک رنگ جا رہا تھا۔

گیلی لکڑیوں کے بھبکے سے دھوئیں کی طرح آنے والے طوفان کا خیال سونیا کے ذہن پر چھا گیا۔ دیوارگیر کے مجسمے پر اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ اسے خیال آیا کہ یہ مجسمہ کمرے کی زینت میں اضافہ کر رہا ہے۔ وہ اپنی تشویش نیل کمل پر ظاہر کر دینا چاہتی تھی لیکن موضوع سخن اس کے ہونٹوں تک پہنچ کر خاموشی کی پہنائیوں میں کھو گیا تھا۔

نیلگوں کاغذ کو الگ کرتے ہوئے ایک مجسمہ نکال کر نیل کمل نے اسے دیوارگیر پر پہلے مجسمے کے بالمقابل رکھ دیا۔ سونیا نے ادھر توجہ نہ دی۔ وہ کہہ اٹھا "ادھر دیکھو سونیا! دیکھو"

یہ ایک حبشن کا مجسمہ تھا، جسے پیتل میں ڈھال کر ایک خاص عمل کی مدد سے چاکلیٹ کا رنگ دے دیا گیا تھا۔

سونیا نے نئے مجسمے پر نظریں گاڑ دیں، وہ کہنا چاہتی تھی کہ یہ سوجے ہوئے موٹے موٹے ہونٹ، ساونہہ۔ یہ پکوڑا سی ناک، بال تو جیسے سوکھی ہوئی گھاس۔ بھدی بے ڈول گردن۔ دائیں بازو کے بالمقابل بری طرح اوپر کو اٹھا ہوا بایاں بازو۔ چھاتیاں ایسی جیسے پھوڑے ابھر رہے ہوں۔

پہلے مجسمے کی طرف انگلی اٹھا کر وہ کہہ اٹھی "معلوم ہے نیل کمل، اس حسینہ کی طرح میں بھی اپنا بدن پیش کرتے جا رہی ہوں۔ مگر اب سونیا کے میاں بیوی کی حیثیت کو کھڑے ہو جانا چاہئیے۔"

نیل کمل نئے مجسمے کو نئے انداز سے دیوارگیر کے ایک سرے پر رکھتے ہوئے کہنے لگا "اس کی کیا ضرورت ہے؟ تم اور حبشن، زندگی اور فن، بدصورتی اور خوبصورتی، ان میں بہت تضاد ہے۔ فن میں بدصورتی بھی خوبصورتی میں بدل جاتی ہے مگر زندگی تو زندگی ہے۔ نہیں سونیا، نہیں ــــ"

بڑھیا دیر تک بڑبڑاتی رہی تھی۔ سونیا نے دونوں مجسموں کی طرف دیکھتے ہوئے صلیب پر چڑھے ہوئے مسیح کی طرف آنکھیں گھمائیں اور بغیر کچھ کہے بجلی کا بٹن دبا کر روشنی گل کر

البانیہ

کرشن چیتنیہ

البانیہ ناہموار پہاڑی چوٹیوں اور کالے پہاڑی کووں کا ملک ہے۔ اس کے متعلق انگریز مورخ گبن نے کہا ہے کہ اس ملک کے متعلق، جو اٹلی سے بالکل قریب ہے، امریکہ کے اندرونی حصوں سے بھی کم معلومات حاصل ہیں۔ لیکن یہ کہے ہوئے ایک زمانہ گزر چکا اور اب البانیہ اور امریکہ کے اندرونی حصوں کے بارے میں ہماری معلومات کافی وسیع ہو چکی ہیں۔

اگر البانیہ میں امن چین رہتا تو بلقانی ریاستوں کا سوئزرلینڈ بن سکتا تھا۔ اب بھی ممکن ہے یہ کسی روز یورپ میں سوئزرلینڈ کے مقابلہ میں تفریح گاہ بن جائے۔ اگرچہ اس کے پہاڑ جو ساڑھے آٹھ ہزار فٹ تک اونچے ہیں سوئزرلینڈ کے آلپس نامی پہاڑ جتنے اونچے نہیں ہیں لیکن شمالی البانیہ کے مسلسل مناظر کو سوئزرلینڈ کے بہترین مناظر کے مقابلے کا کہا جاتا ہے۔ البانیہ دینارک آلپس کے کوہستانی سلسلہ کے آر پار پھیلا ہوا ہے لیکن شمال میں ڈالمیشیا اور جنوب میں یونان کے خلاف، یہ سلسلہ بحیرہ سمندر سے فاصلہ پر ہے کیوں کہ اس کے اور سمندر کے درمیان نشیبی زمین ہے جس کو کئی دریا پار کرتے ہیں لیکن جب شمال اور جنوب دونوں میں پانی کے کنارے پر چونے کے پتھروں کی پہاڑیاں نظر آنے لگتی ہیں تو ساحل کی نشیبی زمین غائب ہو جاتی ہے۔ یہاں سمندر کا پانی صاف ہلکے نیلے رنگ کا نظر آتا ہے جبکہ درمیانی علاقہ میں دریاؤں کی بہائی ہوئی مٹی سے ساحل کا پانی گدلا ہو جاتا ہے۔

ساحل کے عقب کے علاقہ میں پہاڑی چٹانوں نے اونچی اور تنگ تنگ وادیاں پیدا کر دی ہیں۔ ان وادیوں میں بہت کافی پیداوار ہوتی ہے اور ان میں کافی گنجان آبادی کی گزر اوقات ہو سکتی ہے حالانکہ باہر سے یہاں آنے والوں کے لئے صرف خچروں کا راستہ ہے۔ جب لارڈ بائرن اس ناہموار جگہ سے گزر رہا تھا تو یہ اسے بہت پسند آئی تھی۔ اسی زمانہ میں اس نے اپنی نظم "چائلڈ ہیرلڈ" کا پہلا اور دوسرا باب کہا تھا۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ یونان میں بھی، جس کا عظمات اور تاریخ میں اس قدر ذکر آتا ہے، البانیہ جیسی خوبصورت پہاڑیاں اور وادیاں نہیں ہیں۔

اس چھوٹے سے ملک کی آب و ہوا ایک سی نہیں ہے۔ ساحل کے قریب کی نشیبی زمین کی آب و ہوا بحیرۂ روم کے ملکوں جیسی ہے۔ گرمیوں میں بارش نہیں ہوتی اور کبھی کبھی درجۂ حرارت بہت بڑھ جاتا ہے۔ مگر جیسے جیسے بلندی بڑھتی جاتی ہے آب و ہوا میں فرق آتا جاتا ہے اور بارش کسی قدر زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اندرونی البانیہ کے جنوبی حصہ میں کم سے کم دامنوں کے قریب گرمی زیادہ پڑتی ہے لیکن سردیوں میں کہر پڑتا ہے۔ آب و ہوا کے اختلاف کی وجہ سے نباتات کی پیداوار میں بھی اختلاف ہے۔ ساحل کے قریب بحیرۂ روم کے ملکوں کی مخصوص جھاڑیاں وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔ جنوب میں شاہ بلوط کے درخت بہت عام ہیں اور کچھ وہ بھی ایسے کہ سدا بہار ہوں اور خشک سالی کو برداشت کر سکیں۔ یہ بطور ایندھن ہی کام میں نہیں آتے بلکہ سردیوں میں مزید چارہ کی طرح بھی استعمال ہوتے ہیں۔ البانیہ کے مویشی اور گھوڑے نہایت مضبوط، محنتی اور صابر ہوتے ہیں۔ وہ شاہ بلوط کے پتے کھانے سے نہیں اکتاتے۔ شمال میں بارش بڑھنے کے ساتھ ہی ساتھ شاہ بلوط کے جنگلات کی جگہ ملے جلے گھنے جنگلات نظر آنے لگتے ہیں۔ یہاں صنوبر اور ایک قسم کے سرو کے درخت ہیں مگر زیادہ تعداد بیچ کے درختوں کی ہے۔

البانیہ کے شہر جادیوں جتنی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کا دارالخلافہ تیرانہ، جدید کشادہ سایہ دار سڑکوں اور تنگ گلیوں کا عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ جدید قسم کے ایک سرکاری دفتر کے باہر ایک عام لوگوں کے خط لکھنے والا بیٹھا رہتا ہے۔ اگر آپ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تو وہ بہت ہی کم اجرت لے کر آپ کے لئے جذبات سے پُر خطوط لکھ سکتا ہے۔ اس کا خاص صنعتی علاقہ کورتزا ہے جو البانیہ کا مانچسٹر کہلاتا ہے اور خاص بندرگاہ دورازو ایک ایسے میدان میں، جہاں ملیریا پھیلا رہتا ہے، نہایت کریہہ جگہ ہے اس کی بندرگاہ کی تہہ میں بہت جلد کیچڑ جم جاتی ہے۔ دوسرے شہر اتنے اہم نہیں ہیں جتنے کہ خوبصورت۔ اگر البسان میں، جو جغرافیائی اعتبار سے مرکز میں ہے، پہنچنا آسان ہو جائے تو یہ سیاحوں کیلئے کشش کا باعث ہو۔

البانیہ کی تاریخ بھی طرح طرح کے واقعات سے پُر ہے۔ اٹلی سے صرف چالیس میل بحیرۂ ایڈریاٹک کے پار، ہونے کی وجہ سے اس کا سلطنت روما میں شامل ہونا ضروری تھا۔ اس سلطنت کے خاتمہ پر اس پر کئی مرتبہ گوتھوں، سربیوں، بلغاریوں، یونانیوں، وینسیوں، سسلی والوں اور یہاں تک کہ نارمنوں نے حملے کئے۔ اکثر حملہ آور صرف ساحلی علاقوں پر قابض ہو سکے اور وہاں کی آبادی ہٹ کر اپنے پہاڑی قلعوں میں چلی گئی۔ ترکی حکومت پندرھویں صدی کے وسط سے ۱۹۱۲ء تک، ابھی اندرونی پہاڑی علاقوں میں محض برائے نام تھی۔ اس پر انیسویں صدی میں ۱۸۳۵ء، ۱۸۳۶ء، ۱۸۴۲ء، ۱۸۴۷ء، ۱۸۶۹ء، ۱۸۸۱ء اور ۱۸۵۲ء کے نصف درجن سے زیادہ بغاوتیں ہوئیں۔

خدرے خونریزیاں لگیں۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں البانیہ نے آخر کار ترکی حکومت کا قصہ پاک کر دیا۔ بڑی طاقتوں نے اس کی آزادی کو تسلیم کیا اور ایک جرمن شہزادے ولیم فان ویڈ کو عنان حکومت سونپ دی۔ یہ حکمران اوپرا کیا (ایک ایکٹ کی ناحیہ غنائی تمثیل) کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے۔ دورازو میں اس کا محل جلدی جلدی بنوایا گیا لیکن وہ پہنچے سے پیشتر ہی بڑے جلیوں اور مسکوں کے تمغے ایجاد کر چکا تھا۔ شاہی دستے کی وردی کا خاکہ اس نے خود ہی بنایا تھا۔ وہ شاہی محل کے اتھاسی چھوٹے بڑے خشکیوں کو ساتھ لیتا گیا۔ یہ سب بڑے بڑے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے مگر وہ البانوی زبان کی لغت خریدنی بھول گیا۔ اطالویوں کی سازشوں نے چھ مہینے کے اندر اندر اس کی شاہانہ شان و شوکت کا خاتمہ کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد البانیہ نے دوبارہ آزاد ہو کر جمہوری حکومت قائم کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔

بلقانی ممالک کے لوگ بہت خوبصورت ہوتے ہیں لیکن غالباً البانیہ والوں سے زیادہ نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ انھیں انسانیات کا علم نہ ہو لیکن اگر آپ انھیں بتائیں کہ وہ یورپ کے چند قدیم ترین قبیلوں (یا یونانیوں، تھریسیوں اور الیریوں) کی نسل سے ہیں تو شاید وہ بتائیں کہ ہمیں اس کا پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ یہ "عقاب کے بچے" جیسا کہ وہ خود کو کہتے ہیں اپنے قدیم نسب پر بڑا فخر کرتے ہیں۔ جنوبی البانیہ کے ناخواندہ گڈریے آج بھی "زا" اور "ایتھانا" کی قسمیں کھاتے ہیں جو محض یونان کے قدیم دیوتا اور دیوی "زیوز" اور "اتھینا" کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ مشہور تاریخی شخصیتوں میں جنھیں وہ البانوی بتاتے ہیں، سکندر اعظم، ایپرس کا بادشاہ پرہس جو قدیم روم کے خطرناک ترین دشمنوں میں تھا، جزیلیس کا شہنشاہ جسٹنین اور پاپائے روم کلیمنٹ یازدہم شامل ہیں۔ ان کا قومی ہیرو پندرھویں صدی کا سکندر بیگ ہے جس نے بیس برس تک مراد ثانی اور محمد فاتح کے عثمانی سپاہیوں کو روکے رکھا۔ جب وہ آزادی کی حالت میں مرا تو اس کی قبر پر قبضہ کر لیا گیا لیکن البانیہ کے دیہاتی گیتوں میں یہ یقین دلایا گیا ہے کہ کسی نہ کسی دن سکندر بیگ دندانے دار پہاڑ کی چوٹیوں سے روشنی کی شعاعوں پر چل کر واپس آئے گا۔

اہل البانیہ فرقوں اور قبیلوں میں منقسم ہیں۔ ان کے خاندانی جھگڑے اور لڑائیاں قدیم عاشقی زمانہ سے چلی آ رہی ہیں۔ البانیہ والوں کی اس قومی خصوصیت کے متعلق جو آج بھی بدستور قائم ہے بہت سی رومانی کہانیاں مشہور ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اپنے کسی اہل خاندان کی موت واقع ہو جائے خواہ اتفاقیہ ہی کیوں نہ ہو، تو اس کے بدلے مجرم یا اس کے کسی رشتہ دار کو قتل کرنا ضروری ہے لیکن اس سنگدلانہ جذبہ کے ساتھ ہی عورتوں کو قتل کرنے کی مخالفت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان لڑائیوں میں اہل البانیہ دشمن کی کسی عورت کو قتل کرنا ایسا ہی احمقانہ فعل خیال کرتے ہیں جیسا کہ اپنی کسی بکری کو ذبح کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ زوغو کو جسے کم سے کم آٹھ سو آدمیوں کے خون کا ذمہ دار خیال کیا جاتا تھا اپنے محل میں تقریباً محبوس رہنا پڑا جبکہ اس کی چھ بہنیں کہیں بھی آ جا سکتی تھیں لیکن ان لڑائیوں کا تعلق "بیسا" یعنی قول سے بھی ہے جس شخص کو قول دے دیا جاتا ہے وہ بالکل محفوظ رہتا ہے۔ بیسا کل عورتوں کو دی جاتی ہے ساتھ ہی ہر وہ شخص بھی محفوظ رہتا ہے جو عورتوں کے ساتھ ہو۔ اسی طرح سولہ برس سے کم کے لڑکے، مذہبی لوگ اور عموماً وہ سب جو ہتھیار استعمال نہیں کر سکتے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ لوگ بیسا کی اتنی قدر کرتے ہیں کہ آخری عثمانی سلطان عبد الحمید نے قد آور جسیم اور بیباک البانویوں کو اپنا محافظ بنایا اور انہی کی وجہ سے وہ محفوظ رہا کیونکہ انھوں نے اس کی حفاظت کا وعدہ کر لیا تھا۔

اسٹوئن پیٹرسی چیوچ جو بلقانیوں کی تاریخ کا ماہر ہے ایک کہانی بیان کرتا ہے جو ان ہنگامہ آرا لوگوں کی مہمان نوازی پر روشنی ڈالتی ہے۔ کافی سال گزرے ایک البانوی چھاپہ مار کو جو ترکوں کے خلاف لڑ رہا تھا، مقدونیہ کے وزیر نے پکڑ کر پھانسی کا حکم دیا۔ جلاد پھانسی دینے کو تیار ہی تھا کہ وزیر نے کہا "ٹھہرو" اور ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پڑے ہوئے بے حس البانوی کی طرف رخ کر کے چپکے سے کہا: "تم مرنے سے پہلے مجھے ایک بات بتاؤ کیا تم کبھی اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ حالت میں رہ چکے ہو؟" اس نے منہ پھیرتے ہوئے کہا "ہاں"۔ "وہ کب؟" وزیر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ البانوی نے انتہائی شرمندگی کے ساتھ کہا: "دو مرتبہ ترک میرے گھر آئے اور میرے پاس انھیں کھلانے کے لئے روٹی تک نہ تھی اس لئے وہ بغیر کھائے ہی سو گئے۔" وزیر نے ایک لمحہ کے لئے خاموشی سے آنکھیں نیچی کر لیں اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے رہا کر دو۔

یورپ میں مسلمانوں کے اس چھوٹے سے ملک میں جس کی دس لاکھ سے زیادہ آبادی میں سے ستر فی صدی مسلمان ہیں، شان اور رنگینی صرف روایات تک محدود ہے اور حقیقتیں بے رنگ اور تلخ ہیں۔ کل زمین کا رقبہ ۱۱٬۰۰۰ مربع میل ہے لیکن تقریباً دس فی صدی قابل کاشت ہے۔ اقتصادی حالت کو جس کا انحصار انگور، تمباکو، شہتوت اور چاول کی کاشت اور بھیڑیں پالنے پر ہے، بہت ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ اسی صورت میں ملک کا معیار حیات بلند ہو سکے گا۔ مستقبل میں اس چھوٹی سی جمہوریت کے سامنے یہی سب سے بڑا مسئلہ ہوگا۔ دوسرا مسئلہ قبائلی

رسوم سے آہستہ آہستہ نجات حاصل کرتا ہے کیونکہ یہ جدید حالات کے لئے مناسب نہیں ہیں۔ ملک کی قانونی روایات کی بنیاد قانونِ تک کے قوانین پر ہے۔ یہ سینکڑوں برس گزرے البانیہ میں رہتا تھا۔ ان قوانین نے خود حضرت موسیٰ کے قوانین سے "لات کی جگہ لات گھونسے کی جگہ گھونسہ" کا مقولہ اخذ کیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے ازراہِ مردانگی عورتوں بچوں اور غیر ملکیوں کو ان لڑائیوں کے ضابطوں کی سخت گرفت سے مستثنیٰ کیا ہے پھر بھی ان کے قائم رہنے سے جدید ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ اقتصادیات میں مناسب درستی کرنے اور قانونی روایات میں اصلاح

کرنے سے ثقافتی مسائل بہت جلد حل ہو جائیں گے۔ صرف چند ہی برس گزرے، جبکہ البانیہ کے بچے تیرانا کے امریکی اسکول میں انگریزی یا یا درازو اور والانا میں ایک طلیانوں کے ساتھ فرانسیسی یا کسی اطالوی نوآبادی میں اطالوی سیکھ سکتے تھے، لیکن البانوی زبان لکھنا سکھانا منع تھا اور اس کے لئے سخت سزائیں مقرر تھیں۔ عثمانی حکام البانوی زبان کی کتابوں کو پوشیدہ ڈائنامیٹ سے بھی زیادہ خطرناک خیال کرتے تھے۔ لیکن آج البانیہ کا مستقبل خود اس کے ہاتھوں میں ہے اور ہم امید کرسکتے ہیں کہ البانیہ کی چھوٹی سی لیکن مضبوط جمہوریت بہت جلد اپنے مسائل خود حل کرلے گی۔


ونمالا آپ سے کہتی ہے - کہ کس قدر لکس ٹائیلیٹ صابن ہی اسکے حُسن کا نرالا راز ہے
میں لکس ٹائیلیٹ صابن کا بھرپور جھاگ تیار کرتی ہوں اور اسے اپنی جلد پر ملائمیت سے لگاتی ہوں۔
اسکے بعد میں صاف ستھرے اور ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالتی ہوں۔
آخرش باہستگی اپنا چہرہ نرم تولئے سے خشک کرتی ہوں۔
LUX TOILET SOAP
فلمی اسٹاروں کا حسن بخش صابن
LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

نئی شاعری

شوکت تھانوی

میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں بڑے سے بڑا ظلم سخت سے سخت گالی، بدصورت سے بدصورت قلم، شمار، مگر نہیں معلوم کیوں تاریخی غلط بیانی پر خون کھولنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ حقائق کی تاریخ دلائل نکال کر رکھ دوں۔ مثلاً آجکل آزاد شاعری کو دور جدید کی صنعت یا بدعت کہا جا رہا ہے اور بڑے بڑے ذمہ دار لوگ تاریخ کیلئے یہ غیر ذمہ دارانہ بیان دے رہے ہیں کہ شاعری کی یہ غیر شاعرانہ قسم اسی زمانہ کی پیداوار ہے، حالانکہ خود ہمارے خاندان میں اب سے تقریباً سو برس پہلے ایک ترقی پسند بزرگ گذرے ہیں اور ان کے ترقی پسندانہ کلام کا جو نمونہ سینہ بسینہ ہم تک پہنچا ہے وہ ہمارے اس دعوے کی ایک مستحکم دلیل ہے کہ ترقی پسند شاعری کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ بزرگ نوجوانی، جوانی اور پیرانہ سالی کے ابتدائی دور تک اچھے خاصے شاعر تھے۔ اس کے بعد بیچارے سٹھیا کر ترقی پسند شاعر بن گئے اور اب ان کا یہ حال ہو گیا کہ ایک مصرعہ بحر طویل میں ہے تو دوسرا بحر بسیط میں اور تیسرا بحر خفیف میں۔ بلکہ اکثر مصرعے بحر الکاہل اور بحر اوقیانوس میں بھی ہونے لگے۔ ماسوا کنبے کے جدت پسند لوگ ان کی طرف توجہ بھی نہ کرتے تھے سلام کی اور دنیا تو درکنار۔ جو سنتا تھا یہی کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ کاش ان لوگوں کو معلوم ہوتا کہ جن بزرگ کو وہ مرفوع القلم اور مخبوط الحواس سمجھ رہے ہیں وہ کس پایہ کے ترقی پسند شاعر ہیں اور جس کلام کو مجذوب کی بڑ سمجھا جا رہا ہے وہ اب سے سو سال بعد لٹریچر میں کیسی ممتاز جگہ حاصل کر سکتا ہے۔

خیر یہ تو ایک مثال تھی مگر میری قطعی رائے یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری میں ترقی کی تمام علامتیں جیتی جاگتی نظر آتی ہیں۔ شاعری کی بھی بالکل ایک عمر تھی۔ اردو شاعری دلی کے ساتھ پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں تک آغوں آغوں کرتی رہی پھر تتلا کر بولی۔ پھر بھولی بھولی باتیں کرنے لگی۔ اس کے بعد ہوش کی آنکھیں کھولیں۔ پتے کی باتیں ہونے لگیں۔ شباب آیا تو باتوں باتوں میں شوخی بڑھی۔ شباب ڈھلا تو باتوں میں متانت پیدا ہو گئی۔ بات بات میں عاقبت اندیشی شروع ہو گئی۔ پند و نصیحت کے سلسلے شروع ہو گئے۔ رفتہ رفتہ اس بڑھاپے نے بوکھلانا اور سٹھیانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ آزاد شاعری بن گئیں۔ اب چاہے کوئی اسے سر پیٹے یا منہ نوچ لے اور چڑھائے، مگر ان کی عمر میں ترقی سے انکار کی گنجائش نہیں۔ دنیا اسی کا نام ہے اور دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔

اور صاحب سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ ہم شاعر ہیں، شاعری کرتے ہیں۔ نہ ہم مجاز ہیں اور نہ کسی گھوڑے کو ہمارا تجربہ، فکر ذرا سا بھی کھٹکتے ہیں آپ رہتے ہیں اس کا ایک ایک پایہ کہ اگر ذرا بھی کوئی چھوٹا یا بڑا ہو گیا تو گھر اڑ کے جائے گا۔ پھر نہ ہم خیاط ہیں کہ کتر بیونت میں سر کھپاتے رہیں تاکہ دامن کی جگہ گریبان نہ بن جائے اور جیب کی جگہ چولی نہ آ جائے۔ ہم ٹھہرے شاعر ہم کو اس ناپ تول اور کتر بیونت سے کیا واسطہ۔ ایک تخیل ہمارے ذہن میں آتا ہے ہم اسکو بے تکلف اور بے تکلیف سے آزادانہ کرکے ذہن پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر وہ برجستگی کے ساتھ بحر رمل میں آ جاتا ہے تو شوق سے آئے اسکا گھر ہے لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ اس تخیل کے اب جسقدر اجزا ذہن میں آئیں ان سب کو بحر رمل میں آنا چاہئے ورنہ وہ تشریف لانے کی زحمت ہی گوارا نہ کریں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ ایک سلسلۂ خیال ہے اس کا ایک حصہ بحر رمل میں نظم ہو گیا، دوسرا بحر مضارع میں، تیسرا بحر خفیف میں، چوتھا بحر مجتث میں اور کوئی ٹکڑا ایسا بھی ہے جو کسی بحر کے کسی ایک آدھ رکن میں ادا ہو رہا ہے۔ تو اب اس کے لئے پورا مصرعہ ضائع کرنا فضول خرچی نہیں تو اور کیا ہے۔ یعنی مقصد تو یہ ہے کہ شاعر کے ذہن میں جو خیال پیدا ہوا ہے وہ کسی نہ کسی طرح بغیر کسی خارجی آمیزش کے ادا ہو جائے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ اس کے لئے ان پابندیوں کی کیا ضرورت ہے کہ وہ خیال اور اس خیال کا ہر جزو اور ہر جزو کا ہر خفیف سے خفیف جزو گریباں، گلستاں، بیابان وغیرہ قوافی کے ساتھ "سے" کی ردیف لیکر بحر مقتضب مثمن مطوی مقطوع ہی میں ادا ہو اور فاعلات مفعولن فاعلات مفعولن کے دائرے سے ذرا بھی نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے۔ گویا مصرعہ نہ ہوا نقب زنی کا مجرم ہوا اور شاعری نہ ہوئی کوئی قابل دست اندازی پولیس جرم ہوا۔ باز آئے صاحب ہم اس شاعری سے ہم لنڈورے ہی بھلے۔

لنڈورے پر یاد آیا کہ آخر شاعری کی اس قسم کو لنڈوری کیوں نہ کیا جائے۔ ردیف کا یہاں ذکر نہیں۔ قافیے سے اسکو سروکار نہیں۔ بحر کا طوطا یہ نہیں پالتی۔ مطلع اس کے یہاں نہیں، مقطع اس کے حرکات میں۔ ابتدا نہ جانے ہوتا ہو نہ ختم اور ختم بھی کہاں سے۔ سان ہی تمام امراض کی وجہ سے مطلع تک ہاتھ سے دھو بیٹھا کہ نہ بانس رہے گا نہ بانسری بجے گی۔ مطلع کہیئے نہ شاعری کے تھانہ دار صاحبان ایسا نہ ہو کہ مطلع خفی کا وارنٹ دکھا کر گرفتار کرینگے۔ مختصر یہ کہ اس قسم کی کوئی پابندی سرے سے ہی نہیں۔ جو جی چاہے کہتے چلے جاؤ اور اگر کوئی ناسمجھ پوچھ بیٹھے کہ کیا کہہ رہے ہو تو کہہ دیا جائے کہ یہ علمی معاملات ہیں ان میں دخل نہ دو اور اگر پھر بھی دخل دے تو اسی قسم کی دو چند نظمیں سنا دو۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ سر پر پیر رکھ کر بھاگے گا اور پھر تمہارے علمی مشاغل میں کبھی مخل نہ ہوگا بلکہ خود اسکو ہمارے دماغ میں خلل کا یقین ہو جائے گا جو تمہارے لئے یقیناً مفید ہے۔

اس شاعری کے نقصانات تو خیر وہ لوگ گنائیں گے جو ردیف و قوافی

کے گنبد میں پر واز چھوڑکر مفعول فاعلات مفاعیل و فاعلن کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور ۔ ۶ ۔ تام اس قید کا رکھا ہے رہا ہو جاتا۔ مگر فوائد ہم سے پوچھئے وہ بھی ایک دو نہیں ہزار دو ہزار بلکہ بے شمار سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ آپ کو شاعری کا یہ ڈھنگ اختیار کرنے کے بعد اس موذی سے ہمیشہ کیلئے نجات مل سکتی ہے جسکو مصرعہ طرح کہتے ہیں۔ امتحان کا پرچہ کہیں کا کمبخت جس نے ہزاروں کو بر سر مشاعرہ ذلیل کیا ہے۔ لاکھوں کے پول کھولے ہیں۔ سینکڑوں کو شاعر ہونے سے روکا ہے یعنی جو اس نمونے کی کھمی پر کھمی بٹھا سکے وہ تو گویا شاعر ہے، باقی سب چڑی مار ہیں گویا مشاعرہ طوطری ہوتا ہے اس بدبخت کے بدولت۔ دنگل ہوتا ہے، اچھا خاصہ دنگل جہاں ایک سے ایک پہلوان ایک سے ایک رستم سخن ایک ایک قافیہ۔ اپنے داؤں دکھاتا ہے اور سننے والے مصرعے اس طرح اٹھاتے ہیں گویا شاعر کو اٹھا کر پیخ ہی تو دینگے۔ اس عذاب سے نجات حاصل کرنا کوئی معمولی بات ہے یہ سمجھ لیجئے کہ مصرعہ طرح سے آزاد ہو جانا ایک قسم کا ادبی سوراج ہے جس کے بعد شاعری آپ کی ہوگی۔ جو چاہیں کہیں اور جس زمین میں چاہے کہیں۔ اور یاد رکھئے کہ مصرعہ طرح سے اگر آپ ایک مرتبہ آزاد ہوگئے تو وہ دن دور نہ ہوگا جب شاعروں سے بھی آپ کو نجات حاصل ہو جائے اور اس رات رات بھر کی جگائی اور چیخ پکار سے جو یقیناً کسی مہذب قوم کا مشغلہ نہیں ہو سکتا آپ کی جان چھوٹ جائے گی۔ پھر تو چھوٹا سا ایک جلسہ سر شام ہو جایا کرے گا جس میں غزل کے صرف ایک شعر کو بہتر ٹکڑوں میں تقسیم کرکے سنا دیا گیا۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ یہ نہیں کہ نو بجے رات سے کوئی نڈا لیکر مصرعہ طرح کے پیچھے جو پڑے تو سویرا کر دیا۔ دو موٹے موٹے فائدے تو اس شاعری کے یہ ہوئے۔ باقی فائدے کہاں تک سنئے گا۔ مثلاً ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ اس قسم کی شاعری کرنے کے لئے کچھ یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ شاعر ہی ہوں۔ جی نہیں۔ اگر آپ بساطی ہیں تو بھی شعر کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ کے یہاں بندر بگڑنے کا کاروبار ہوتا ہے تو بھی آپ اس قسم کے مختلف البطن مصرعے پکڑ سکتے ہیں۔ اگر آپ کو محض ریس کا شوق ہے تو بھی آپ ان چھوٹے بڑے ہلکے اور بھاری مصرعوں کا ہینڈی کیپ خود مقرر کر لینگے اور اگر آپ کچھ بھی نہیں ہیں تو اس شاعری کے بدولت کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائینگے۔ سب سے بڑی خوبی جو خداوند کریم نے اس شاعری کو عطا کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا جا اور بے جا استعمال دیکھ کر ہوں کے قوال، اعراس کے مغنی، مجروں کے مطرب اور مطربات نہ کر سکینگے۔ یعنی یہ شاعری گائی بجائی نہ جاسکے گی۔ اور اگر گانے والے اس کے باوجود مصر رہے تو ان کو اس ترقی پسند شاعری کے ساتھ ہی ساتھ ترقی پسند سرگم اور ترقی پسند ہارمونیم فوراً بنانا پڑیگے۔ البتہ اس شاعری کا ایک مصرف تھوڑی سی توجہ کے ساتھ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ فلم کمپنیاں اس شاعری کی سرپرستی شروع کر دیں۔

اسلئے کہ اس راز کو ابھی تک پولیس والے بھی نہیں سمجھ سکے ہیں کہ ترقی پسند شاعری فلمی گانوں کی ماں ہے یا فلمی گانوں نے اس شاعری کو جنم دیا ہے۔ بہرحال سی۔ آئی۔ ڈی کی تازہ رپورٹ سے یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ دونوں کا خون کیمیادی امتحان کے لئے بھیجا گیا تھا اور اس میں ایک دوسرے سے مشابہ قسم کے جراثیم پائے گئے ہیں۔ اگر یہ بات واقعی تصدیق کی حد تک پہنچ گئی تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ ترقی پسند سرگم اور ترقی پسند سازوں کی بھی ضرورت نہیں یہی ساز جو عام طور پر رواج میں ہیں۔ اس شاعری کو بھی جھولینگے اور یہ بے بحری شاعری کبھی کم سے کم بے سری نہ ہونے پائے گی۔ خواہ وہ تم ہندوستانی موسیقی سے تعلق رکھتے ہوں یا انکو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو۔ اگر یہ شاعری فلموں کے لئے سازگار ثابت ہوئی تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ شاعری پر نحوست اور ادبار کا جو الزام نسلوں سے چلا آرہا ہے وہ یقیناً دور ہو جائیگا۔ اور پھر تو یہ شاعری دھن برسانے لگے گی۔

میں چونکہ ترقی پسند شاعری کی حمایت کرنا چاہتا ہوں لہذا میں ترقی پسند شاعروں کو ایک دوستانہ مشورہ یہ بھی دینا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی تائید میں یہ دلیل کبھی پیش نہ کریں کہ اس بے بحری شاعری کے ماتحت شاعر اپنے نفسی تجزیہ اور جذباتی تسلسل کے بہاؤ میں ہم آہنگی پیدا کرکے ذہن لاشعور میں سے آزاد تسلسل کو وجود میں لاتا ہے۔ یہ دلیل ذرا بودی ہے اسلئے کہ اگر خدانخواستہ میں خود اپنی مالی حالت سے مجبور ہو کر اپنے شاعروں سے رشوت لینے کیلئے مجبور ہو گیا تو پھر مجھ ہی کو یہ کہنا پڑے گا کہ ان حالات میں شعر کہنا ہی حماقت ہے۔ ان رہی سہی پابندیوں کو بھی توڑ کر آدمیوں کی طرح نثر کیوں نہ لکھو۔ رہ گیا تسلسل وہ اس لنگڑی لولی شاعری کے علاوہ اپنے پورے خدوخال کے ساتھ نثر میں بھی ممکن ہے اگر میرے اس جواب پر بھی آپ نے ہٹ دھرمی سے کام لیا تو میں بڑا صاف آدمی مجھکو مجبوراً یہ بھی کہہ دینا پڑیگا کہ حضرات آپ شاعری سرے سے کرتے ہی نہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو نثر کی توڑ مروڑ کو شاعری سمجھ بیٹھے ہیں۔ لہذا میں پھر آپ کو یہ مشورہ دونگا کہ یہ کمزور دلیل آپ بحث ہی میں نہ لائیں تو اچھا ہے کیا فائدہ کہ اچھے دل برے ہوں اور پھر کوئی فائدہ بھی نہ ہو۔ ہاں آپ اپنی اس شاعری کے جواز میں اور بہت سی باتیں کہہ سکتے ہیں مثلاً یہ کہ یہ زمانہ راشننگ کا ہے۔ ہر چیز پر کنٹرول ہے سوائے بڑھنے کے۔ مصرعے کے ارکان بھی پرمٹ پر ملتے ہیں اور راشن کے حساب سے یہ تو شاعری ہے مٹی کا تیل تک آپ حسب حوصلہ صرف نہیں کر سکتے۔ پاجامے کیلئے چھالٹین تک تو ملتی نہیں، آپ سلئے پھرتے ہیں مصرعوں کیلئے ردیف اور قافیہ۔ آپ معترض سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بھائی سنو وقت وہ آلگا ہے کہ کم کھاؤ زیادہ بچاؤ۔ لہذا ہم اگر ایک آدھ مصرعہ میں بچت دکھاتے ہیں تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ آئندہ سال کا بجٹ شاندار ثابت ہو بلکہ آپ صاف صاف یہ کہہ دیجئے

کہ جناب یہ کنجوسی نہیں بلکہ کفایت شعاری ہے۔ مطلب اگر آدھے مصرعے میں ادا ہو جاتا ہے تو باقی آدھا مصرع محض تقطیع پوری کرنے کیلئے ضائع کرنا غلط ہے۔ باقی آدھا مصرع ان غریبوں کے کام آسکتا ہے جنکو پورا روٹی نہ ملنے کی وجہ سے طرح طرح کی معدے کی شکایتیں پیدا ہو گئیں ہیں اور جو محض ہماری فضول خرچیوں کی وجہ سے موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ جب فارغ البالی تھی، جب قحط نہیں پڑا تھا ہم نے جسطرح چاہا اپنے مفہوم کو ادا کیا مگر اب ہم نظم غریبوں کیلئے چھوڑ رہے ہیں جو دال روٹی کو ملا کر مطلع عرض کرتے رہیں۔ ہم کو وقت کی ضرورت کا احساس ہے۔ ہم انڈا مچھلی، پھل اور دودھ پر گذارہ کر رہے ہیں۔ اس کو آپ چاہے بدعت کہیں یا آزاد شاعری لیکن ہم اس کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس قسم کی باتوں کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں یا تو مخاطب آپ کو فاتر العقل سمجھکر صبر کرلے یا آپ کا قائل ہو کر قدموں پر گر پڑے۔ ایک بات آپ اور بھی سمجھا سکتے ہیں کہ موزونیت تو خیر تھوڑی بہت بازگانے اور رونے والے کو قدرت کی طرف سے ملتی ہے لیکن باضابطہ سخن طرازی ہمارے امکان میں نہیں اور اس سلسلہ میں بلیک مارکیٹ کی حوصلہ افزائی بھی ہم کو منظور نہیں۔ لہذا حاضر میں حجت نہیں۔ جو ہمارے امکان میں ہے ہم پیش کر رہے ہیں گو آپ اس سے مطمئن نہیں ہیں تو ملک الشعراء کا خطاب آپ لے جائیے۔ ہم کو صرف زندہ رہنے کا حق بخش دیجئے۔ اگر آپ ہماری شاعری کو شاعری تسلیم کرنا نہیں چاہتے تو آپ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش۔ زیادہ سے زیادہ داد کی "واہ" سے محروم کر دیجئے گا۔ ہم سمجھ لیجئے کہ ہماری شاعری خود ہمارے لئے ہے آپ کے لئے نہیں۔ اور اگر ان تمام باتوں کے باوجود معترض فوجداری پر تل جائے تو یہ گر بھی گرہ میں باندھ لیجئے کہ آپ نہایت اعتقاد کے ساتھ اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر دیجئے گا واضح رہے کہ پرانے شاعروں کی سب سے زبردست کمزوری یہی ہے کہ اگر آپ نے ان کو استاد تسلیم کر لیا تو آپ کے سات خون مع ذاتی خودکشی کے معاف ہو جائیں گے۔ پھر چاہے آپ استاد ہی سے زندگی بھر ترقی پسند شاعری کراتے رہئے۔ نہ صرف وہ خاموش رہینگے بلکہ آپ کو بلائے آفات ارضی سماوی سے بچانے کے لئے ایک آدھ تعویذ بھی دے گذریں تو کوئی تعجب نہیں۔ استادی کا یہ آخری گر بتانے کے بعد اب ہم آپ سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے لئے دعائے مغفرت میں ترقی پسندی سے کام نہ لیں کم سے کم اس دعا کے تمام ارکان برابر کے ہوں تو اچھا ہے۔

چلتے چلاتے ایک بات اور سنتے جائیے کہ آپ عوام کے سامنے تو آزاد شاعری کے متعلق ہر ڈینگ ہانکنے کے لئے آزاد ہیں مگر کسی پڑھے لکھے آدمی سے الجھنے کی کبھی کوشش نہ کیجیے گا۔ مثلاً آپ لوگ ایک بات عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ ہماری تخیئل اچھوتی ہے، ہماری فکر بلند ہے اور ہم عنقا کے آشیانے سے اپنا آرٹ لاتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو ممکن ہے کہ وہ لوگ کوئی اہمیت دیں جنکو شاعری سے ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا ہو۔ ورنہ ہر وہ معمولی سمجھ کا آدمی جس نے کبھی کوئی شعر دیکھا یا سنا ہے آپ کو ان باتوں کا کوئی ایسا جواب دیدے گا کہ آپ تو خیر کیا مگر ہمکو آپ کی ہمدردی میں شرمندہ ہونا پڑے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ تمام کہی ہوئی باتیں آپ بھی فرماتے ہیں البتہ فرق یہ ہے کہ پہلے ان باتوں کو ذرا سلیقہ سے کہا گیا تھا اور اب آپ سلیقہ کے قائل نہیں رہے ہیں۔ مثلاً ایران میں ہم سب کے ایک چچا گذرے ہیں۔ یہ آج کی بات نہیں ہے بلکہ اسکو اتنا زمانہ گذر چکا ہے کہ تخیئل کمنی بھول جائے۔ بہر حال ان ہی ایرانی چچا کے چار مصرعے سنئے ؎

من آن مورم کہ از پایم بمالند ۔۔۔ نہ زنبورم کہ از نیشم بنالند

چہ گونہ شکر این نعمت گذارم ۔۔۔ کہ زور مردم آزاری ندارم

اسی مفہوم کو آپ کی آزاد شاعری کے چودہ مصرعے والے ایک شاہکار میں جس کا عنوان شرابی ہے یوں پیش کیا گیا ہے ؎

آج پھر جی بھر کے پی آیا ہوں میں
دیکھتے ہی تیری آنکھیں شعلہ ساماں ہو گئیں
شکر کر اے جان کہ میں
ہوں دیارِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
صدرِ اعظم یعنی دریوزہ گرِ اعظم نہیں
ورنہ اک جامِ شرابِ ارغواں
کیا بجھا سکتا تھا میرے سینۂ سوزاں کی آگ
غم سے مر جاتی نہ تو
آج پی آتا جو میں
جام رنگیں کے بجائے
بے کسوں اور ناتوانوں کا لہو
شکر کر اے جان کہ میں
ہوں دیارِ فرنگ کا ادنیٰ غلام
اور بہتر عیش کے قابل نہیں

اور اگر یہی شاعری ہے تو لیجئے شرابی کے ساتھ ایک نظم اس خاکسار کی بھی سن لیجئے۔ عنوان ہے "جواری" ؎

ہار آیا ہوں جوئے میں آج میں
دیکھکر جیبیں مری غصہ ہوا تجھ پر سوار
شکر کر بیٹا کی ماں

میں ہوں اک ادنیٰ جواری تاش کا
عشق گھوڑے کا نہیں مجھ میں ریس کا رسیا نہیں
ورنہ یہ ادنیٰ سی بار
ریس میں جاتا ہزاروں لیکے میں سودی ادھار
دم نکل جاتا مرا
یا مکر جاتا جو میں
چند نوٹوں کے بجائے
سو کے دس اور دس کے سو
ٹھکر کر بھیا کی مال
میں بھی اک ادنیٰ جواری تاش کا
کم ہے یونجی ریس کے قابل نہیں۔

اس قسم کی نظمیں تو جتنی کہتے کہتے چلے جائیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی معلوم ہوگا کہ اونٹ ببول چر رہا ہے۔ لیکن سعدی کے چار مصرعوں کے جواب میں سوائے نظمیں جاگنے کے اس اونٹ کیلئے بھی اور کوئی چارہ نہیں۔ تو مطلب یہ کہ کہنے کو تو خیر آپ کو اختیار ہے مگر ڈینگ ہانکنے سے پرہیز کرنا خود آپ کے لئے مفید ثابت ہوگا اور خدا کرے ہمارے لئے بھی مضر نہ ہو۔

آخری تاجدار اودھ کے منظوم خطوط ——— بقیہ صفحہ ۱۲

بدرگاہِ خدا ہیں دست کشا   خالی جائیگی کیا سموں کی دعا

غرض یہ ہے کہ سلطان عالم نے اپنے اس دور میں جو کچھ بھی کہا ہے اس کا بیشتر حصہ ان کے کلام کے برعکس سوز و گداز کا حامل ہے۔ چنانچہ ان کے متعدد خطوط ان کی محبوب بیگمات کے نام نظم کی صورت میں موجود ہیں اور ان سب میں بالعموم یاد وطن، عالم غربت اور فراق و دور ماضی کی المناک روداد بیان کی گئی ہے۔ جن بیگمات کے نام نمایاں طور پر اس سلسلے میں لئے جاسکتے ہیں وہ یہ ہیں۔ ملکہ پیرپوش بلقیس النساء۔ نواب سلیمان محل صاحبہ۔ نواب نردی محل صاحبہ۔ نواب سلطان جہاں محل صاحبہ۔ نواب جتر محل صاحبہ۔ نواب نام صاحبہ۔ نواب شہنشاہ محل صاحبہ اور نواب اختر پیاری صاحبہ۔ گو جیسے جیسے نواب کے زخم مندمل ہوتے گئے ہیں ان کے خطوط کا رنگ بھی پھیکا ہوتا گیا ہے لیکن ان میں بھی جہاں کہیں جذبات و محسوسات کو دخل ہے اکثر و بیشتر تیز نشتر بن جاتے ہیں۔ اور یہ سب کا سب راز ہائے ان بے پناہ چرکوں کی جو نواب نے اپنے دور آوارگی میں کھائے۔

طوفان ——— کامل رشید

چاند میری رات یہ طوفان کی آمد کا شور
چشمکیں بجلی کی بادل کی گرج پانی کا زور

یہ گھٹائیں ناشکیبا یہ ہوائیں نا صبور
خامشی کے کان میں پہونچا ہے ہنگامے کا شور

تیرگی میں حل ہوئی جاتی ہے ساری کائنات
شورش عالم کو سوتے سے جگا جاتی ہے رات

تند نغمے ہیں تصادم لرزشوں کے ساز پر
چاک ہے گردوں کا سینہ برق کی یلغار پر

بج رہے ہیں جھیلتی وادی پہ خیمہ زن کے ڈھول
تیز جھونکوں میں ہیں کھل کر ہو رہے بھونچال غول

جھکڑوں میں دیدے بچھے ہیں جنات کے راگ
ہو سمندر کی جنوں انگیزیوں میں جیسے جھاگ

وہ اٹھے بیباک بادل وہ گری بوندوں کی مار
رتھ پہ اک دیوتا بادل کے گھوڑوں پر سوار

جاگ اٹھیں وحشتیں خاموش آہیں سو گئیں
سر بہ گردوں چوٹیوں کی گردنیں خم ہو گئیں

بادلوں کے ساز پہ بجنے راگ سنانے لگے
چھاتیوں پر جھیل کی گرداب چکر کھانے لگے

آندھیاں غرا کے اٹھیں جھکڑ ابھی کھو گئیں
کوہساروں کی جبیں کالی گھٹائیں دھو گئیں

کانپتی کمزور دیواروں کے دل ہلنے لگے
ادھ کھلے بوٹے مکانوں کے جگر پھٹنے لگے

جنگلے بہنے لگے سینے پہ درختوں کے ہزار
ہو گئی باغوں میں بے ترتیب پودوں کی قطار

بھیگے بھیگے سے درختوں کا لہو پینے لگے
تار ہوئے رنگینیوں کی قبا سینے لگے

رفتہ رفتہ تیز سانسیں وقت کی رکنے لگیں
وحشتیں سنجیدگی کے سامنے جھکنے لگیں

کم ہوا طوفان دیوانی ہوائیں تھم گئیں
سو گئی جھیلوں پہ بجلی کی کمانیں پھر جم گئیں

بادلوں کی اوٹ سے پھر مسکرایا ماہتاب
پھر سکوں چھایا ہوا آباد ویرانوں میں خواب

مسکراتا ہے فلک پھر گنگناتی ہے زمیں
میرے سینے کا مگر طوفان کم ہوتا نہیں

حشر کا ڈرامہ ——— بقیہ صفحہ ۲۵

(وطن پرست خاتون) اور رستم و سہراب کے کردار ان کے علاوہ کومک کیرکٹر زمانہ خیر سلا۔ تیمو۔ نیل کنٹھ۔ سارنگ وغیرہ کس کس کو گنایا جائے۔

حشر مرحوم کی اکثر تصانیف کو میلوڈرامہ۔ دور جدید کی ڈرامہ نویسی سے دور گذرے ہوئے زمانہ کی یادگاریں۔ یا بعض میں پلاٹ کی خامیاں یہ سب کچھ آپ کہتے تو تسلیم کے قابل ہو سکتا ہے لیکن انصاف کی آنکھیں اس طرح تو بند نہیں کی جاسکتیں۔ حشر کا ہر ڈرامہ کردار نگاری کا ٹکسالی نمونہ تسلیم کرنا پڑیگا۔ ان کی کردار نگاری صحیح اور سچے مطالعہ کا زندہ نتیجہ کہی جاتی ہے۔ ان کے کردار ضرب المثل کے طور پر شہرت پاچکے ہیں۔ اس قسم کی ناواقفیت کے نتائج سے اگر آپ اپنا ناک ماگر کو مکمل کرنا چاہتے ہیں تو اس دور میں ایسی ناقص تالیف ناقدین کی نظر سے گر جائیگی۔ براہ کرم حشر کے تمام ڈرامے غور سے پڑھ لیجئے اور چند واقفین سے صحیح معلومات فراہم کیجئے۔ یہ زمانہ حقیقی طبعیت اور سچی تنقید کا ہے سنی سنائی سے کام نہیں چلتا۔ ع برسولاں بلاغ باشد و بس۔

چوہے کا ارتقا

عبدالرشید خاں

ویسٹر انسٹی ٹیوٹ (امریکہ) نے نسل کشی اور تربیت کے ذریعہ چوہوں میں ایک نسل پیدا کی ہے جن کی اولاد تاریکی سے زیادہ روشنی کو پسند کرتی ہے۔ کھیلنے کے واسطے کھانا چھوڑ دیتی ہے آدمیوں سے اس قدر مانوس ہے کہ ان کی آہٹ سے نہیں بھاگتی بلکہ ان کی طرف دوڑتی ہے اور پیارے بلی کتوں کی طرح ان کے پیر چومتی اور گود اور بغل تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ ساز اور موسیقی سے اثر قبول کرتی ہے اور کسی مستقل عبادت خانہ میں توجہ کے ساتھ مصروف عبادت بھی ہو سکتی ہے۔

ان چوہوں کے چھوٹے جیسے قد و قامت پر صاف ستھرے سفید بال بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور جب یہ بے خوف ہو کر اپنی ننھی ننھی گلابی آنکھوں کو اپنے پالنے والوں کو دیکھتے اور ننھے ننھے لال پنجوں سے ان کے پنجوں کو گدگداتے اور تھپکتے ہیں تو بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سلاس نے جنہوں نے اس تجربہ گاہ کا معائنہ کر کے ان چوہوں کی ترقی یافتہ کیفیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پہلی مرتبہ جب میں نے ان چوہوں کو دیکھا اور یہ دوڑ کر میری طرف آنے لگے تو میں جھجکا۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ ایک گرد اور خاتون کے جس نے چوہے گھر کا دروازہ کھول کر ان کو باہر نکلنے کا موقعہ دیا تھا جیسے دوڑے اور یکبارگی بہت سے چوہے اس پر چڑھ گئے کوئی اس کے مونڈھوں پر جا بیٹھا کوئی بغل میں چھپ گیا کوئی آستین میں چلا گیا اور کوئی چھاتی پر کھڑا ہو کر اس کی ٹھوڑی چاٹتا تھا۔

میں حیرت سے دیکھتا اور سوچتا تھا۔ انسان کی دماغ سوزیوں نے ان چوہوں کی طبیعت کو بھی بدل دیا ہے۔ اپنی جبلی عادت پر کاٹنا اور کترنا تو درکنار کسی چیز میں اس کا خیال بھی نہیں معلوم ہوتا ایسے طبعی انقلاب میں یہ کہنا تو مشکل ہے کہ نسل کشی یا تربیت میں کس درجہ یا کس حد تک زیادہ دخل ہے۔ یہ ایسی بحث کا موقعہ بھی نہیں ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی ایک میں کوتاہی ہوگی تو دوسری حالت کا اثر ضرور پڑے گا۔ نسل کشی کا جہاں تک تعلق ہے ان میں یہ خوبی تواتر کئی نسلوں کے تبادلہ، تغیر اور اصلاح کے بعد آئی ہے۔ آبائی خون اور اس کی خرابیوں کی کشش نے ان کو مدت تک اپنا دامنگیر رکھا ہوگا یعنی موروثی پیشہ چوہوں کی عادات چوری، فرار، روپوشی، بے چینی، بلا وجہ موش کشی کے فراموش کرنے کرانے کی بہت سی منزلیں طے کرنی پڑی ہیں تب کہیں یہ فرشتہ سیرت اور پری صورت موشزادے بن سکے ہیں۔

چونکہ انسان کی طبیعت تقلید پسند ہے یعنی ہر وقت کا ساتھی ہے جب اس کو گھر کا انسان کی طرح بہت سا شوق بھی تھا اور دوسرے جانوروں کی طرح یہ بھی قالین اور گدوں میں پہنچا تھا اور یہ اس کے بچوں میں کھیلا کرتے تھے اور اس کے دسترخوان میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ غرضیکہ چوہے کو اس کی پرانی شناسائی ہے اور شاید اسی لئے ویسٹر انسٹی ٹیوٹ کے منتظمین نے چوہوں کی اصلاح کی طرف یہ سمجھ کر توجہ دی ہے کہ چوہا بھی چھوٹی قسم کا انسان ہے جسے قصہ الیس نے کہیں کہیں بالشتیے کے خطاب سے بھی یاد کیا ہے لہذا دیکھنا چاہئے کہ اس کے اندر ارتقائی کوششیں کس حد تک کارفرمائی کرتی ہیں۔

بقول ڈاکٹر موصوف یہاں کی پرورش سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مہذب چوہوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو معیار تہذیب سے تین فیصدی زیادہ ترقی کر چکے ہیں مقصود یہ کہ ان کی جسامت پر چربی اتنی غالب آ گئی ہے کہ اب ان کی زندگی آرام سے بیٹھے بیٹھے ہی گزرتی ہے۔ خیال آتا ہے کہ اگر موجب بوجھ ہوتی تو یہ چوہے کھانا تحلیل کرنے کی غرض سے گالف کھیلنے جایا کرتے۔ اب ان میں چہل قدمی کرنے کی بھی ہمت نہیں معلوم ہوتی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ انسٹی ٹیوٹ سے ڈاکٹر صاحب کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جسمانی کیفیت سے زیادہ ان کی دماغی استعداد نے ترقی کی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان چوہوں کا دماغ ان کے بزرگوں کے دماغوں سے پانچ فیصدی زیادہ وزنی ہو گیا ہے اور یہ ان سے بہت زیادہ ذہین اور ذکی ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ اور تحقیق اس سلسلہ میں نہیں ہو سکی جس سے ان کی ذہنی قابلیت کا اندازہ معلوم ہو سکتا اور ہم دیکھ سکتے کہ ہمارے قاضی کے چوہوں سے کتنے فاصلہ پر ہیں۔ کالجوں میں نئے طالب علموں کی بھرتی کے وقت پہلے طالب علم کی ذہنی قابلیتوں کا جس طرح جائزہ لیتے ہیں شاید ویسا ہی کوئی طریقہ یہاں بھی رائج کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ نازک بحث ہے جس نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو بھی خاموش رکھا ہے۔

دسترخوان پر دعوت دینا تو ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے لیکن مشکل تر چیز کو اعتدال پر رکھنا اور کھانے سے دستکش کرانا اور وہ بھی چوہوں کو! مشکل ہے۔ لیکن انسٹی ٹیوٹ نے اس عقدہ کو گراموفون ریکارڈ بجا کر حل کر لیا ہے۔ بتایا گیا کہ کھانے کے دوران میں جب گانے کے ریکارڈ بجتے ہیں تو یہ لیٹ کر جھومنے لگتے ہیں کہ کھانا بھول جاتے ہیں۔ خیال آتا ہے کہ اگر مرثیہ یا سوز کے ریکارڈ بجائے جائیں تو یہ چوہے درد کی ٹیس سے ضرور آبدیدہ ہو جائیں گے۔ ان کا ایک عبادت خانہ بھی تھا۔ ایک کوٹھری میں ایک طشت میں دو موم بتیاں جل رہی تھیں بتیوں کے بیچ میں ایک سکہ رکھا تھا۔ اوپر کسی مورت کا ٹھپہ تھا شاید کسی مولی دیوی کی مورت تھی۔ یہ تو معلوم نہیں کہ ان کے جذبات مذہبی کو ان کے اخلاق کے بلند کرنے میں کس قدر دخل ہے لیکن

بظاہر ہم ان چوہوں کو غذا و تربیت کا حاصل سمجھتے ہیں۔ ایک مشہور ناول نویس نے اپنے افسانے کے چوہوں کے ذکر میں لکھا ہے کہ کھاتے کھاتے شیر کے قد و قامت کی برابر ہو گئے تھے اور اس جسمانی ترقی کے ساتھ وہ عذاب الٰہی بھی بن گئے تھے، حالانکہ شیر جیسے ہو کر وہ اس جیسے خونخوار بھی بن گئے تھے پس جسمانی ترقی کے مفید مطلب اچھی غذا اور خاطر خواہ آسائش اسی وقت جائز ہو سکتی ہیں کہ یہ جبلتیں خطرناک صورتیں اختیار کرنے کے بجائے اخلاق و محبت میں بھی ترقی کر سکیں۔ یہی خوبیاں متوازن خوراک اور پابندی اوقات سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔

ان چوہوں میں ایک گروہ ایسا بھی دیکھا گیا جو بظاہر بہت مصیبت زدہ اور غمگین تھا۔ یہ چوہے دبلے اور سست تھے اور مرجھائے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ شاید ان کو ٹھیک کھانا نہیں ملتا تھا یا نگرانی میں لاپروائی سے کام لیا جاتا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ صورت حال برعکس تھی۔ اس گروہ کے چوہوں کو دوسرے چوہوں کی طرح نہ صرف یکساں خوراک ملتی اور نگرانی میں رکھا جاتا تھا بلکہ دوسروں سے زیادہ ایک مقوی دوا بھی دی جاتی ہے جس کے اشتہار اخبار اور رسالوں میں بڑے دعووں اور شان کے ساتھ شائع ہوتے ہیں اور صحت اور طاقت کے طلبگار روزانہ حصول طاقت میں اسکی مسیحائی پر ایمان لاکر دائمی وظیفہ بنائے ہوئے ہیں مصلحت اجازت نہیں دیتی کہ اس مفید چیز کا نام بتا دیا جائے۔ تاہم یہ تو واقعہ تھا کہ اس غذا کے نہ کھانے والے چوہوں کی صحت کھانے والے رئیس چوہوں سے بہتر تھی۔ یہی امتیازی کیفیت انسانی طبقوں میں بھی ہو سکتی ہیں لہٰذا اگر ہم ان اشتہاری غذاؤں پر روپیہ صرف کرنے کے بجائے ان کا تجربہ پہلے چوہوں پر کر لیا کریں تو کثیر رقمیں اور ان سے زیادہ بہت سی قیمتی جانیں بچ سکتی ہیں۔ مثلاً انسانی خوراک اور غذاؤں کی نسبت اب تک جتنی معلومات بہم ہوئی ہیں اور ان پر جس قدر عمل درآمد کیا گیا ہے ان کے نتائج اگر استعمال سے پہلے معلوم ہو جاتے تو ضعف معدہ اور سوکھے کے عارضوں سے لاکھوں جانیں بچ سکتی تھیں۔

ان چوہوں میں سے اب بلوں میں گھسنے اور زمین دوز سوراخوں کی تاریکیوں میں دوڑنے کا خوف زائل ہو گئے ہیں۔ اب وہ آدمی سے نہیں ڈرتے اس لئے اب ان کے لئے چھپنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ اب تو وہ دوڑ کر اس کے پاس آ سکتے ہیں گود میں بیٹھ جاتے ہیں ان کو کاٹنے کے موقعے ملتے ہیں مگر نہیں کاٹتے۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ دشمنی لڑائی اور خونریزی خوف سے پیدا ہوتی ہیں جب خوف نہیں رہتا تو دشمنی کی بنیاد بھی ہٹ جایا کرتی ہیں۔ رہا گئے اور آپ کا خوف تو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ تذکرہ مہذب حیوانیات کا ہے جہاں سماج کے تمام اہل معاملہ مہذب اور متمدن ہیں اور اپنے مرشد انسان کے حلقۂ ارادت کے مرید ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ انسٹی ٹیوٹ نے یہ بھی بیان کیا کہ ان چوہوں میں چالیس پشتوں سے دشمنی خونریزی۔ لوٹ کھسوٹ اور دغا کے آثار دیکھنے میں نہیں آئے لیکن یہ انسان کا کمال ہے کہ وہ قدیم زمانہ سے جنگل کے وحشیوں کو زیر کرکے آگ پانی ہوا اور زمین کے طاقتور عناصر کو سمجھ کر بھی مانوس ہو گیا ہے اور انہیں مفید مطلب آلۂ کار بنائے ہوئے ہے پھر بھی وہ اطمینان سے سانس نہیں لے سکتا۔ اس کو چین نصیب نہیں ہوتا وہ خونریزی، قتل، غارتگری، چوری سے ہر لحظہ اور ہر موقع نہیں ہے تو غور کیجئے کہ اب اسکو کس کا خوف ہے؟ اب نہ تو لڑائی جنگل کے وحشیوں سے کی رہی نہیں۔ سانپ بچھو کا بھی خوف نہیں۔ سمندر کی بے پناہ وسعتوں اور گہرائیوں سے بھی اندیشہ نہیں۔ بجلی اور زلزلوں کا کھٹکا بھی بے معنی ہو گیا۔ ان میں کوئی اسکا مخالف نہیں سب غلام اور چاکر ہیں اب اسکی دشمنی جنگ بے چینی اور خوف اپنے ہم جنس انسان سے ہے یعنی انسان کی چپقلش سے حرص اور نفس سے ہے۔ ان چیزوں نے ترقی کرکے منظم طاقتوں کی سلطنتوں کی شکلیں اختیار کر لی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ علم الاخلاق، ادبیات اور اعتقادات میں اصلاح نفس کے نسخوں کے بے شمار ذخیرے موجود ہیں مگر یہ قرابادین اس وقت کے ہیں جب امراض اتفاقی کمزور اور عارضی ہوا کرتے تھے اور علاج میں چٹکیوں سے کامیابی ہو جایا کرتی تھی۔ اس وقت کے خوفناک طاقتوں کے پیش نظر مقتضائے ضرورت ہے کہ

باقی صفحہ [illegible] پر

رومان، شادی، اور فرض!! — زیب عثمانیہ

عقد در رومان ہیں فطرت ہی کے آئین دونوں　　یہ جو با واسطہ ہے تو وہ بلا واسطہ ہے
یوں تو دونوں ہی تصویریں خوش آئند مگر　　دیکھنا یہ ہے انہیں ذہن میں کیا واسطہ ہے

کوئی رومان کہ انجام ہو جسکا شادی　　نوع انساں کے لئے گرم ہے پیغام سرور
نہیں لیکن سبب تکمیل رشتۂ زوج　　کہ ہے کسب ہمہ خستگی انجام سرور

ہاں زن و شو کے لئے ہے جو کوئی راہ وثوق　　تو وہ تکمیل فرائض کے سوا اور نہیں
محرکی ہے فرض، محبت کی بنا ہی جذبات　　زوج ہے زوج ہی، محبوب کسی طور نہیں

یوں محبت کو ملا ہے کوئی کتنا ہی مگر　　بھول سکتا نہیں یہ بات زمانہ ہرگز
فرض ہے زیست کا وہ تیغ لوا ملائے زیب　　قند الفت سے مزا جس کا نہ بدلا ہرگز

ہندوستان میں شکر سازی کی تاریخ

بی این استھانا

شکر ہندوستان میں بہت ہی پرانے زمانے سے بنتی چلی آرہی ہے بلکہ اصل خاص ہندوستان ہی کی پیداوار ہے اور تمام دنیا میں جس قدر اراضی میں گنا بویا جاتا ہے اُس کا نصف حصہ ہندوستان کی اراضی کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکر سازی کی صنعت ہندوستان کی صنعت و حرفت کی تاریخ کا ایک دلچسپ اور رنگین باب ہے۔ چونکہ مناسب محصولات اس کی پشت پر ہیں اس لئے اس صنعت نے عالمگیر اقتصادی کساد بازاری کے زمانہ میں بھی نمایاں ترقی کی۔ محافظتی قانون نافذ ہونے کے بعد دس سال سے بھی کم عرصہ میں ہندوستان میں اتنی شکر بننے لگی جو اس کی اپنی ضروریات کے واسطے کافی تھی۔

ہندوستان میں شکر سازی کی ابتدا بنگال میں ہوئی۔ ۲۵۰ ق م کے لگ بھگ زمانہ میں ڈیوسکریڈیز (Dioscrides). نے لکھا تھا ہندوستان کے سرکنڈے میں ایک طرح کا میٹھا رس پایا جاتا ہے۔ سنہ ء میں پلینی (Pliny) نے لکھا تھا کہ شکر مغربی ممالک میں عربستان اور ہندوستان سے آتی ہے اور یہ کہ ہندوستان کی شکر زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ سنہ ء میں ایرین (Arian). نے لکھا کہ سرکنڈے سے نکلے ہوئے رس سے شکر بنائی جاتی ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کی تجارت ہندوستان اور بحیرۂ احمر کی بندرگاہوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ شکر ہندوستان میں بہت ہی قدیم زمانہ سے بنتی چلی آرہی ہے بلکہ اس کی تجارت بھی غیر ممالک کے ساتھ ہوتی رہی ہے۔ سنہ ۲۱۴ء میں سکندر ایفروڈیوکس نے لکھا ہے "جس چیز کو ہندوستانی شکر کہتے تھے وہ ایک طرح کا جما ہوا شہد ہوتا تھا جو سرکنڈے سے نکلتا تھا"۔ اسی طرح مارکو پولو نے بھی سنہ ۱۲۹۸ء میں شکر کا ذکر کیا ہے کہ وہ بنگال میں تیار ہوتی ہے۔ گنے کی باقاعدہ کاشت اور شکر بنانے کی صنعت کا زمانہ ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں سولہویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ آئین اکبری کی رو سے سولہویں صدی سے بہت پہلے ہندوستان میں یہ صنعت کامل ہو چکی تھی۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں شکر بہت بڑی مقدار میں ہندوستان سے باہر بھیجی جاتی تھی۔ شکر کی برآمد کی تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی کرتی تھی۔ جو شکر کمپنی ہندوستان سے انگلستان بھیجتی تھی اس پر کمپنی کو پچاس فیصدی کا منافع ہوتا تھا۔ ایک قدیم مورخ نے جو اعداد و شمار دئے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ کمپنی کو اس سلسلہ میں کس قدر منافع ہوتا تھا۔ وہ اعداد و شمار یہ ہیں:۔ سنہ ۱۷۹۰ء میں کمپنی نے ۵۲۴۲ ٹن شکر انگلستان میں درآمد کی۔ شکر کی قیمت ۹۹۶۰۲ پونڈ تھی۔

جہاز وغیرہ کا کرایہ	۱۰۴۸۳۸	پونڈ
محصول	۶۹۴۶	پونڈ
بکری پر لاگت	۴۹۳۰	پونڈ
کل لاگت	۲۱۷۳۹۶	پونڈ
قیمت فروخت	۳۳۲۳۸۱	پونڈ
منافع تقریباً	۵۰	فیصدی
کل منافع	۱۱۴۹۸۵	پونڈ

شکر کی برآمد پر جب اس قدر منافع ہوتا تھا تو برآمد کی مقدار بڑھنا ایک لازمی امر تھا۔ مندرجہ ذیل گوشوارہ سے پتہ لگے گا کہ مختلف سالوں میں کمپنی سوداگروں نے کتنی شکر باہر بھیجی:۔

سال	قیمت سنتی	انگلستان کو	امریکہ کو
۱۷۹۲ء	۸۲۰۱۸۹	۳۰۵۵۱	۱۲۶۱۷۱
۱۷۹۸ء	۸۴۷۶۵۲	۱۸۲۶۵۰	۵۱۹۸۳۳
۱۸۰۰ء	۲۳۸۹۷۹۱	۶۹۸۴۴۲	۷۵۹۳۴۰
۱۸۰۲ء	۱۲۰۱۷۹۸	۲۱۷۸۹۹	۲۱۰۳۷۹
۱۸۰۴ء	۱۰۷۱۳۶۶	۶۴	۸۵۳۲۱۲
۱۸۰۶ء	۳۳۲۴۱۶۸	۵۴۴۷۸	۱۱۷۶۲۵۱

سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۰۶ء تک برآمد میں کمی رہی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہوئی کہ اس کی تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی زیادہ کرنے لگی۔ دوسرے یہ کہ جزائر غرب الہند میں بھی شکر بننے لگی۔ انیسویں صدی میں ہندوستان سے شکر کی برآمد بند ہو گئی بلکہ یہاں اس کی درآمد ہونے لگی۔ جن ملکوں سے شکر یہاں آنے لگی ان میں جزائر موریشیس اور جاوا خاص ہیں۔ انگریز، فرانسیسی اور پرتگالی سوداگروں نے انگلستان کی شکر کی منڈی پر قبضہ کرنے کی جو مشترکہ کوششیں شروع کیں تو اس سے ہندوستانی صنعت کو شدید نقصان پہونچا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے مفاد کے مطابق شکر کی برآمد کو جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن زیادہ کامیابی نہیں ہوئی جب ہندوستانی شکر جزائر غرب الہند کی شکر کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئی

قائم ہوئیں جو حفاظتی محصول لگا دیا۔ اسی زمانہ میں چقندر سے شکر کی برآمد میں ۱۸۶۰ء و ۱۸۸۰ء سے کمی آتی جا رہی ہے۔

حالات اور بھی زیادہ خراب اس وقت ہوگئے جب ۱۸۸۴ء سے یورپ میں چقندر سے شکر بننے لگی۔ امریکہ میں اس شکر پر محصول لگا دیا گیا اور ہندوستان خسارہ میں رہا۔ جاوا میں گنا اگانے کے لئے سائنسی طریقے اختیار کئے گئے جس کی وجہ سے وہاں بہتر قسم کی شکر بننے لگی۔ ان باتوں کی وجہ سے یورپ کی بہت سی منڈیاں ہندوستان کے ہاتھوں سے نکل گئیں۔ گزشتہ پچاس سال کے اندر ہندوستان میں اتنی ہی شکر کی درآمد ہونے لگی جتنی کی برآمد ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ آئندہ پچاس سال میں ہندوستان بجائے برآمد کرنے والے ملک کے درآمد کرنے والا ملک بن گیا۔ انیسویں صدی کے اختتام تک صرف یوپی ہی میں تقریباً دو سو شکر سازی کے کارخانے بند کر دینے پڑے۔ کچھ ایسے محصولات لگائے گئے جو ہندوستانی شکر سازی کی صنعت کے لئے مفید ہو سکتے تھے لیکن چونکہ اس صنعت کو محفوظ کرنے کے لئے کوئی باقاعدہ منظم کوشش نہیں کی گئی اس لئے ان محصولات سے بھی کچھ کام نہ بنا۔ غیر ملکی شکر سے مقابلہ بازی کی وجہ سے ہندوستانی شکر کی قیمت گرتی ہی گئی۔ ایک وجہ اس زوال کی یہ بھی ہوئی کہ یہاں شکر گڑ سے بنائی جاتی تھی اور وہ بھی پرانے بھدے اور بھونڈے طریقوں سے جس کی وجہ سے بہت کچھ مال ضائع بھی ہو جاتا تھا۔ پھر بھی ہندوستانی شکر ایسی عمدہ نہیں بن سکتی تھی جیسی غیر ملکی ہوتی تھی شکر بہت کم مقدار میں بنتی تھی اور نئی مشینوں کا استعمال بھی زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ چونکہ حکومت نے راب سے رم (شراب) بنانے کی اجازت نہیں دی اس لئے شکر بنانے والوں کا منافع بھی کم رہا۔

باہر کے گنے کے مقابلہ میں ہندوستانی گنا پتلا ہوتا تھا اور اس میں سے رس بھی کم نکلتا تھا۔ اس کے علاوہ فی ایکڑ پیداوار اتنی کم ہوتی تھی کہ گنا ملک کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ناکافی رہتا تھا۔ کیونکہ ہندوستان کے بہت سے باشندے سبزی خور ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل ہی میں اس صنعت کو جدید سائنسی طریقوں پر ترقی دینے کی باقاعدہ کوششیں شروع ہوئیں۔ حکومت ہند کا محکمہ زراعت ملک کے بارے میں خیال ہے کہ ہندوستان میں گنے کی پیداوار کو بہتر اور زیادہ بنایا جائے۔ کوئمبٹور کے تجربوں نے بہت اچھے نتائج دکھائے ہیں۔ گنوں کی حفاظت کے بہت سے طریقے ایجاد اور اختیار کئے گئے ہیں اور آب و ہوا کے مطابق گنوں کی فصل کو بہتر بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ اچھی قسم کے گنے اگانے کے واسطے ہر قسم کی تدابیر بتائی جا رہی ہیں۔ کوئمبٹور کے امپیریل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" اور مختلف صوبوں کے گنوں کے محکموں کی کوششوں سے گنوں کے ایسے قلم لگائے گئے ہیں جن سے زیادہ لمبے زیادہ موٹے اور زیادہ رسیلے گنے پیدا ہونے لگے ہیں۔ کوئمبٹور کے محکمہ شکر نے جو نئی قسم کے گنے اگائے ہیں (مثلاً ۲۱۰، ۲۱۳، ۲۱۴ کو کے گنے) وہ دیسی گنوں سے کہیں بہتر ہیں۔ آج کل گنے تقریباً چالیس لاکھ ایکڑ زمین میں بوئے جاتے ہیں۔

دور حاضر میں شکر سازی کی تاریخ نئے محصولات اور نئی قسم کی پالیسیوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ۱۹۳۲ء سے پہلے (جبکہ حفاظتی قوانین پاس ہوئے) صاف شکر کی صنعت بہت ہی خراب حالت میں تھی۔ غیر ملکی مقابلہ بازی، شکر سازی کے عمدہ طریقوں کا فقدان اور رس کی کمی۔ یہ سب چیزیں اس صنعت کی ترقی کی راہ میں حائل تھیں۔ ۱۸۹۴ء میں صرف برائے نام محصول بشرح ۵ فیصدی لگایا گیا تھا اور اس کا مقصد محض سرکاری آمدنی بڑھانا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں یہ محصول دس فیصدی ہو گیا۔ ۱۹۲۱ء میں ۱۵ فیصدی اور ۱۹۲۲ء میں ۲۵ فیصدی۔ ۱۹۲۵ء میں اس معمولی محصول نے چار روپیہ آٹھ آنے فی صدی محصول کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۹۳۰ء میں یہ محصول ۴/۸ روپیہ سے چھ روپیے ہو گیا اور ۱۹۳۱ء میں ۷/۴ روپیہ فیصدی ہو گیا۔ دوران جنگ اور ما بعد جنگ کے زمانہ میں مالی خسارہ کو پورا کرنے کی نیت سے درآمدی شکر کے محصول میں بھی زیادتی کی جاتی رہی۔ ۱۹۱۹ء میں ہندوستان شوگر کمیٹی اسلئے بنائی گئی کہ وہ شکر سازی کی صنعت کو منظم کرے اور اس کو ترقی دے۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ ایک شوگر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے بے اعتنائی سی ہوتی رہی ہے اور اس کی حفاظت کا کچھ زیادہ خیال نہیں رکھا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں امپیریل کونسل آف ایگریکلچر ریسرچ کے ایما پر حکومت نے اس طرف خاص توجہ دی اور حفاظتی قوانین کے زیر سایہ شکر سازی کے محکمے قائم کئے جانے لگے۔ حفاظت کا مسئلہ "ٹیرف بورڈ" (Tariff Board) کے حوالہ کیا گیا۔ "مختلف مالی کمیشن" نے جو شرائط لگائی تھیں ان کی روشنی میں اس بورڈ نے کل معاملہ پر غور کیا۔ ۱۹۳۲ء میں "شوگر انڈسٹری پروٹیکشن ایکٹ" پاس ہوا۔ پہلے سات سال کیلئے ۷/۴ روپیہ فیصدی کا محصول لگایا گیا اور آئندہ آٹھ سال کے لئے ۶/۴ روپیہ فیصدی کا، یہ بھی شرط رکھی گئی کہ ضرورت کے وقت اس شرح میں کمی یا زیادتی کی جا سکتی تھی۔ یہ صورت حال کچھ بہتر ہو گئی تھی۔

لیکن بدقسمتی سے درآمدی شکر پر سرکاری محاصل کے نقصانات کو پورا کرنے کی غرض سے ۱۹۳۴ء سے ابکاری محصول بشرح ۱۰ آنہ فی ہنڈریڈ ویٹ اور بشرح [illegible] فی صدی کارخانوں کی شکر پر لگایا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس محصول کی رقم بھی [illegible] روپیہ جس کی مقدار سات روپیہ تک پہنچ گئی تھی)

یک آنہ فیصدی کے حساب سے تمام صوبوں کو دیا گیا تاکہ وہ اس روپیہ سے کو آپریٹو سوسائٹیاں قائم کریں جو گنا پیدا کرنے والے کسانوں کی امداد کریں۔ گنا اور شکر کی صنعت کو ترقی دینے کے واسطے دس لاکھ روپیہ امپیریل کونسل آف اگریکلچر ریسرچ کو دیا جانا طے ہوا۔ محصول درآمد ۲۵ فیصدی کر دیا گیا اور جو سرچارج یا الائی محصول ۱۹۳۱ء میں لگا تھا وہ بھی ختم کر دیا گیا۔ فروری ۱۹۳۴ء سے ڈیوٹی ختم کر دی گئی اور سرچارج ڈیوٹی بشرح ۱۲ فی ہنڈرویٹ ملک میں تیار ہونے والی شکر پر لگا دی گئی۔ اس سے شکر پر کل درآمدی محصول ۹ روپے ہو گیا۔ کھنڈسازی پر جو آبکاری محصول تھا اس میں بھی ۱۰ روپیہ کی کمی کر دی گئی۔ ۱۹۳۹ء میں ٹیرف بورڈ نے سفارش کی کہ حفاظتی محصول کو ۷ فیصدی کر دیا جائے اور کھنڈسازی پر آبکاری محصول ۸ فیصدی کر دی جائے۔ یکم مارچ ۱۹۴۰ء سے حفاظتی محصول پھر کچھ کر دینا پڑا۔ چونکہ آبکاری محصول ۳ سے ۱۲ ہو گیا تھا حفاظتی محصولات سے شکر سازی کی صنعت کو بڑی تقویت پہنچی لیکن آبکاری محصول کے لگ جانے سے کھنڈسازی کی پیداوار میں بڑی کمی آگئی۔

جس اراضی میں گنے کی کاشت ہوتی تھی اس کی مقدار بھی بڑھتی ہی رہی ہے۔ ۱۹۲۲-۲۳ء میں ۲۶،۶۷،۰۰۰ ایکڑ زمین میں گنا بویا جاتا تھا لیکن ۱۹۳۴-۳۵ء میں اس کی مقدار ۳۲،۴۱،۰۰۰ ایکڑ ہو گئی۔ ۱۹۲۹-۳۰ء میں تقریباً ۹،۴۰،۰۰۰ ٹن شکر کی ہندوستان میں درآمد ہوئی تھی لیکن ۱۹۳۱-۳۲ء سے درآمد کی مقدار برابر گھٹتی رہی یہاں تک کہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں اس کی مقدار صرف ۲۳،۰۰۰ ٹن رہ گئی۔ ۱۹۲۹ء میں شکر سازی کے کارخانوں کی تعداد ۲۹ تھی لیکن ۱۹۳۶-۳۷ء میں یہ تعداد ۱۳۷ ہو گئی اور ۱۹۴۵ء میں ۱۴۰ تک پہنچ گئی۔ یہ کارخانے زیادہ تر بہار اور یوپی میں ہیں۔ ۱۹۴۰-۴۱ء میں یو۔پی میں ۷۱ کارخانے تھے اور بہار میں ۳۲۔ حالانکہ ۱۹۳۱ء میں یو۔پی میں صرف ۱۴ تھے اور بہار میں ۱۲۔ حفاظتی محصول کے لگ جانے سے ہندوستان میں شکر سازی کی صنعت کو بڑی تقویت پہنچ گئی۔ ۱۹۲۹-۳۰ء میں یہاں صرف

۹۰،۰۰۰ ٹن شکر بنتی تھی لیکن ۱۹۴۴-۴۵ء میں یہ مقدار ۱۲،۳۳،۰۰۰ ٹن تک پہنچ گئی۔ اس میں سے یوپی میں ۵،۹۵،۵۰۰ ٹن بنی اور بہار میں ۱،۰۰،۲۳۲ ٹن۔ ۱۹۳۲ء کے حفاظتی قانون سے اس صنعت کی جو توسیع اور ترقی ہوئی اس کا اثر قدرتی طور پر درآمد پر پڑا۔ درآمد کی مقدار میں جو کمی ہوئی اس سے ملک کو ۱۵ کروڑ کی بچت ہوئی اور حکومت کو تقریباً ۱۰ کروڑ کا نقصان ہوا۔

ہندوستان کی اس صنعت کی ترقی کی داستان بہت دلچسپ ہے۔ اس کی خاص وجہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے وہی ۱۹۳۲ء کا قانون ہوا جس کے بغیر یہ ترقی اس سرعت کے ساتھ ناممکن تھی۔ اس ترقی کے کچھ اور اسباب بھی تھے جو اسی قدر اہم ہیں۔ اقتصادی کساد بازاری، مشینوں اور دوسری چیزوں کی ارزانی نے بھی اس سلسلہ میں بڑی مدد کی۔ اس کے علاوہ سود کی شرح کی کمی بھی کافی مددگار ثابت ہوئی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ اس زمانہ میں زمینوں کی قیمت بھی گری ہوئی تھی اور بجلی کے کنوؤں اور آبپاشی کی دوسری سہولتوں کی وجہ سے بھی بڑی آسانی بہم پہنچ گئی۔ اس صنعت کے سلسلہ میں ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اس کے مزدوروں کی اجرت مقابلۃً کم ہوتی ہے اور اس کے کارخانے انہی مقامات میں ہیں جہاں گنا بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ شکر سازی کے علاقوں میں ریلوں کے جال بچھے ہوئے ہیں اور کچا اور پکا مال بھی سستے داموں میں ادھر اُدھر بھیجا جا سکتا ہے۔ "امپیریل شوگر ٹیکنالوجی انسٹیٹیوٹ" کی مساعی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ غرض ان تمام اسباب نے مل جل کر اس صنعت کو اس قدر نمایاں ترقی بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا شکر ساز ملک ہے۔ اس صنعت میں جس قدر سرمایہ لگا ہوا ہے اس کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ ۲۵ اور ۳۰ کروڑ کے درمیان ہے۔

اس صنعت نے جہاں اس قدر سرعت کے ساتھ ترقی کر لی ہے اس نے کئی الجھنیں بھی پیدا کر دی ہیں مثلاً گنے کی پیداوار کے علاقوں کی تخصیص، شکر سازی کے کارخانوں کو گنے کی باقاعدہ اور مسلسل بہم رسانی، گنے کی کم از کم قیمت کا تعین،

پیامِ سجدہ — سلام ساگری

کسی کی بزم میں کرنا ہیں کچھ دن رائیگاں مجھکو
کہاں لیجا رہی ہے اے عمرِ رواں مجھکو

جلالِ برق کا مقصود ہے اب امتحاں مجھکو
بنانا ہے ابھی ہر شاخ پر اک آشیاں مجھکو

جلاتا کس شبابی انجمن کا رنگ آنکھوں میں
جہاں دیکھا دیے ہر شے نظر آئی جواں مجھکو

جہاں تک میری رودادِ وفا سے وہ نہ اکتائیں
سنانی ہے وہیں تک زندگی کی داستاں مجھکو

سمجھتا ہوں بخوبی گردشِ ایام کا پہلو
زمانہ آزماتا ہے وہاں اُن کو یہاں مجھکو

جہاں گرتا ہوں تھک کر کے ٹٹولیتا ہوں میں منزل
غبارِ کارواں سمجھیں نہ اہلِ کارواں مجھکو

تماشا غیر سمجھیں ہیں یہ کیوں کر دیکھ سکتا ہوں
ترے جلوے کی ارزانی بھی ہوتی ہے گراں مجھکو

بیانِ عشق کی خاطر زباں سے کام لینا ہے
تمہارے سامنے آنکھیں بھی بنتی ہیں زباں مجھکو

سلامؔ اپنی محبت اصل میں خودداریٔ فن
"پیامِ سجدہ" دیتا ہے کسی کا آستاں مجھکو

کارخانوں اور ٹھیکہ داروں کو لائسنس دینا، تول اور قیمت کی ادائیگی کی نگرانی، حمل و نقل کی سہولتیں اور مزدوروں کے فائدہ اور آرام کی باتیں۔ حکومت نے ان تمام مسائل پر کماحقہٗ اپنی توجہ صرف کی ہے۔

ہندوستان میں اور بالخصوص یو۔پی اور بہار میں یہ صنعت بہتر ہی منظم صورت میں ہے۔ گنے کی قیمت مقرر کرنے کے لئے حکومت نے ۱۹۳۴ء میں گنے کا قانون (شوگر کین ایکٹ) پاس کیا۔ اس کی رو سے صوبجاتی حکومتوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ قیمت مقرر کرنے، تول اور گنے کی خرید کو منظم کرنے کے مناسب قوانین بنائیں۔ حکومت یوپی نے گنے کی قیمت "ہمہ کمیٹی" کی سفارش پر مقرر کی۔ اس کمیٹی میں کسانوں اور کارخانہ جات کے مالکوں، دونوں کے نمائندے شریک تھے۔ شکر کی منڈی پر بھی نگرانی رکھی گئی اور اس کام پر نظر رکھنے کے لئے انسپکٹروں کا تقرر ہوا۔ حکومت نے اس سلسلہ میں جو مزید دلچسپی لی اس کا اندازہ ۱۹۳۸ء کے "شوگر فیکٹریز ایکٹ" سے ہو سکتا ہے۔ یہ ایکٹ مندرجہ ذیل امور پر حاوی تھا۔

(ا) شکر کے کارخانوں کو لائسنس دینا۔
(ب) کارخانوں کو گنا مہیا کرنا۔
(ج) "شوگر کنٹرول بورڈ" اور مشاورتی مجلسوں کا قیام
(د) گنے کی کم از کم قیمت کا تعین۔
(ہ) گنے کی بکری پر محصول لگانا۔

حکومت نے جو اقدامات ۱۹۳۰ء کے بعد سے کئے ان سے اس صنعت کو بڑی تقویت پہونچی۔ حکومت نے یہ قوانین اس لئے بنائے تاکہ اس صنعت کی سریع ترقی سے جو مشکلات پیدا ہو گئی تھیں وہ حل ہو جائیں۔

اس صنعت کو دو دفعہ بڑے نازک دوروں سے بھی گذرنا پڑا۔ پہلی دفعہ ۱۹۳۴ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۴۲ء میں۔ ۱۹۳۶ء میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شکر کی قیمت بڑھتی ہی چلی جائے گی اس لئے گنے کی پیداوار زیادہ سے زیادہ کی جانے لگی۔ شکر ۱۲،۳۰،۰۰۰ ٹن تک تیار ہونے لگی حالانکہ اس کی کھپت کا اندازہ ۱۱،۵۰،۰۰۰ ٹن کا تھا۔ کثرت پیداوار کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی قیمت گر گئی۔ اس کثرت پیداوار اور باہمی مقابلہ بازی سے منافع میں جو کمی آگئی تھی اس کو دور کرنے کے لئے "شوگر سنڈیکیٹ" بنا اور شوگر کنٹرول ایکٹ بنائے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں شکر کے بارے میں جو معاہدہ ہوا اس میں ہندوستان کی صنعت شکر سازی کا قطعی کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ اس معاہدہ کی رو سے ہندوستان سے شکر سمندر کے راستہ سوائے برما کے اور کہیں نہیں بھیجی جا سکتی تھی۔ اگرچہ ہندوستان میں اس زمانہ میں شکر کی پیداوار ضرورت سے زیادہ ہوئی لیکن ہمارے ہمسایہ ممالک مشرقی [illegible] نہیں [illegible] ۱۹۴۲ء میں جبکہ ہندوستان میں انتہائی کثرت سے شکر تیار ہو رہی تھی یہاں سے لاکھوں ٹن شکر بڑی آسانی سے باہر بھیجی جا سکتی تھی۔ اس بین الاقوامی معاہدہ سے ہندوستان کی اس صنعت کو بڑا نقصان پہونچا اور ۱۹۴۲ء میں تو اس کے لئے ایک بہت ہی نازک دور آگیا۔

ہندوستان کی اس صنعت کو بہت سی دقتیں پیش آئیں لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود یہ صنعت برابر ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ آج شکر سازی ہندوستان کی سب سے بڑی صنعتوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ گنے کی فصل کی زیادتی اور مرکزی حکومت اور صوبجاتی حکومتوں کے درمیان یکسانی کے فقدان نے اس صنعت کو ہر قدم پر نقصان پہونچایا۔ گنے کی کوئی ایک قیمت کبھی مقرر نہیں ہوئی جس کی وجہ سے زیادہ پیداوار اور کم پیداوار کے سالوں میں قیمتیں برابر گھٹتی بڑھتی رہیں۔ ۱۹۴۲ء میں جبکہ شکر کی گرانی نے اس کی پیداوار میں بڑی زیادتی کر دی تھی حکومت ہند کے واسطے اس کی برآمد کا انتظام ضروری تھا۔ اگر ایسا ممکن ہو جاتا تو ۱۹۴۲ء والا نازک دور کبھی نہ آتا۔

ہندوستان میں شکر سازی کی صنعت دوسرے درجہ پر ہے۔ پہلے درجہ کی صنعت سوت کی ہے۔ حفاظتی محصول کی مدد سے اس صنعت نے بڑی نمایاں ترقی کر لی ہے اور تقریباً ۱۲ لاکھ آدمی اس صنعت کی بدولت پیٹ پال رہے ہیں۔ ان میں ۳۰،۰۰۰ گریجویٹ بھی شامل ہیں۔ اس صنعت نے نہ صرف یہ کیا کہ لاکھوں روپیہ دوسرے ملکوں کو جانے سے بچا لیا بلکہ لاکھوں کسانوں اور مزدوروں کو خوشحال بنا دیا۔ کارخانوں کے مالکوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ اس صنعت کا مستقبل بہت روشن ہے۔ بمبئی کے تاجروں کی جو منصوبہ بندی ہمارے طریقہ جات کو بلند تر کرنا چاہتی ہے وہ اس صنعت کو بھی یقیناً تقویت پہونچائے گی۔

چوہے کا ارتقاء

بقیہ صفحہ ۵۰

طبیعت یا اہلِ ذوق ان کی بنیاد ڈال گئے ہیں۔

انسان نے جب سے گزند یا ضرر کو دفعتاً بنا کر اس کے اندر دستورِ فطرت کی تقلید میں قوتِ تولید جنسی یعنی سود کو جائز قرار دیا ہے وہ قرض کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس کے لئے کوئی چیز اتنی خوفناک نہیں ہے جتنی تقاضہ دار کی شکل۔ جس میں سے اشتعال کا تصور درحقیقت اپنی ہی کے تخیل ہیں۔ خوف کی قسمیں اور شکلیں مختلف ہیں۔ نام مختلف ہیں۔ لیکن بنیاد خوف اسی غیر فطری مولود کا تھام ہے جس کو انسان نے ابھی تک نہیں سمجھا ہے۔

۲

ریختی اور جان صاحب

شبیر احمد

جان صاحب نے اپنے زمانہ کی دگرگونی، سیاسی ابتری، انقلاب زمانہ اور گردشِ دوراں کا ذکر بھی بڑے درد انگیز اور موثر طریقہ پر کیا ہے۔ ان کی آنکھوں نے دیکھا کہ بڑے بڑے خاندانی رئیس نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے اور کم ذات اجلاف دولت سے مالا مال اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے اور اپنی کم ظرفی سے بڑوں کے منہ کو آئے تو ان کا حساس دل چیخ اٹھا۔ ان کی چیخ درد میں بھری ہوئی اور زہر میں بجھی ہوتی ہے:-

اندھی کا تیل جن کو میسر نہ ہو کبھی — روشن کریں وہ قوم کے کوری چراغ صبح
ہے خدا کی شان وہ افضل نسا خانم بجی — بیچتی پھرتی تھی گلیوں میں جو کمرنی فا

مغربی معاشرت کے اثرات نوابی زمانہ میں ہی لوگ قبول کرنے لگے تھے۔ ولایتی کپڑوں اور انگریزی لفظوں کا چلن ہو چلا تھا۔ بہت سے امیر کبیر ہندوستانی فرنگی عورتوں سے بیاہ شادی بھی کرنے لگے تھے لیکن جان صاحب مشرقیت پسند اور پکے وطن پرست تھے ان کو یہ مغربیا ہوا افسانہ بھاتی تھی۔ وہ نئے فیشن کو برا سمجھتے تھے اور اس پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے لیکن اپنی بےبسی پر افسوس کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ پاتے تھے۔

کلو نظر آنے لگے اب لاکھوں ہی گورے — در گور ہوا لکھنؤ کمپو سے زیادہ
مجکو تو ڈالا گھر میں، فرنگن کے ہو مرید — مسجد بنائی آپ نے گرجا کے سامنے

(طنز ملاحظہ ہو)

پہن کے کپڑے انگریزی میاں خوش ہو کے نکلتے ہیں — نئے موتی محل سے بن کے اب تو تو نکلتے ہیں

(اکبر الہ آبادی کا رنگ)

نیا رنگ اختیار کرنے سے انکار ؎

کپڑا انگریزی نہ پہنوں گی ہیں موتی خانم — لاکھ ہو تو تو ہو تو کیا بیٹی بھی تو تو ہو جائے

ایک بات سن کر شاید آپ کو تعجب ہو کہ وہی جان صاحب جس کو کج سنی سنائی کے بھروسے ایک فحش گو اور عریانی پسند شاعر سمجھتے ہیں وہ ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاقی شاعر تھا۔ اس کے کلام میں وہ تاثیر ہے جو بڑے بڑے واعظوں کی زبان میں نہیں۔ "قدرِ عافیت بعد زوال" کے مضمون کو کس اچھوتے انداز میں ادا کیا ہے ؎

کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت — سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں رہتا
مالِ موذی نصیبِ غازی ؎

جس نے دولت قدم رہ پہ لٹائے — مال وہ موذیوں کا مال ہوا

زمانہ سفلہ پرور ہے۔ صاحبانِ کمال کی قدر نہیں ہوتی ؎

جان صاحب رہا وہ تنگ سدا — جس کو حاصل کوئی کمال ہوا
عجب زمانہ میں اندھیر ہے بدر جہاں — کسی کمال کا کوئی نہ قدرداں دیکھا

کج خیال مخیر اور غلط فہم کے مذہبی عقائد پر چوٹ کس انداز سے کی ہے ؎

ہے منافع جو سینکڑے سے روا — سود کھانا بھی اب حلال ہوا
چپکے رہنے میں تھا حرام وہ کام — ایک دو بولوں سے حلال ہوا

مزارات کی فی زمانہ جو درگت بنی ہوئی ہے اور عرس وغیرہ کے موقعوں پر وہاں جو جو کچھ ہوتا ہے اس سے کون واقف نہیں۔ ان بدعملیوں کا جان صاحب نے یوں پردہ فاش کیا ہے ؎

یہ چھنیاں ہیں تماش بینیں نہیں یہ اس کام کو — یہی ہے مطلب کہ تاکیں درگاہ موذی کا گرا نظارا

پرانی روش کا مذاق ؎

ہوئی ضعیف میں رنڈیا نہ وہ شباب رہا — عجب ہی ہم دو لہن جان ہی خطاب رہا

رضا اور توکل کی تعلیم ؎

روٹی خدا کے ہاتھ ہے جہاں گر بیٹھ — کیوں باندھے باندھے پھرتا ہے توشہ دان کر

مروجہ تعلیم کے خراب اثرات کی وضاحت:-

پڑھائی کیوں زلیخا مولوی صاحب نے یوسف کو — کیا خانہ خراب اس کو دکھلایا کو پہلا لفافہ

بزرگوں کے ادب کی تعلیم و تلقین ؎

بد زبانی نہ کرو ان سے۔ بڑی بوڑھی ہیں — ساس سسر وہ تمہارے دولہن جانی ہی دیکار نہ

مردوں کی بے وفائی ہرجائی پن اور حسن پرستی کا پردہ کس طرح چاک کیا ہے ؎

یہ حسن کے ہیں گاہک مردوں کو خوب دیکھا — یوسف بنا ہے گا بی بی کا غلام کب تک

حسن و عشق چند روزہ ہوتے ہیں اور جوانی کے جوش کا ابال ؎

جوانی بیٹھے ہوئے عارضی ہیں پس دو دن — یہ حسن و عشق نہیں اعتبار کے قابل

عالی ظرفی، خود داری اور بلند حوصلگی ؎

اس کو قربان کروں اپنے گزی گاڑھے پر — میری جوتی سے میسر ہے اگر تاش نہیں

موت برحق ہے اور دنیوی عیش و آرام زوال پذیر اور فانی ہیں ؎

زنا خی سدا جو ہیں پھولوں پہ سوتے — انھیں ایک دن خاک پر دیکھتے ہیں

دنیا چند روزہ ہے ؎

پایا ہوا کے کاندھے پہ تھا جیسے تخت کا — وہ تاج چتر والے نہ مسند نشیں رہے
دنیا سرا ہے لوگ مسافر عدم کے ہیں — کوئی نہیں رہے گا زنا خی یقیں رہے

جان صاحب نے اپنے زمانہ کا حال بھی مفصل بیان کیا ہے۔ ان کا شہر آشوب سودا کے شہر آشوب سے کم نہیں بلکہ سودا کے ہاں شاعری ہے اور جان صاحب کے ہاں واقعیت۔ حکومت کو زوال ہو چلا تھا، ہر طرف بدنظمی کا دور دورہ تھا، رشوت کا بازار گرم تھا۔ عدالت میں بجائے انصاف

کے جھوٹ کی داد ملتی تھی، وکیل، موکل اور خود منصف جھوٹ بولتے اور بلواتے تھے، سچ کی ہر جگہ ہار تھی اور سچ بولنے والا بجائے اپنا حق پانے کے الٹا ماخوذ ہوتا تھا۔ چوری ہوئی تو بجائے چور کا سراغ لگانے کے پولیس الٹا گھر والے کو ستاتی تھی۔ روپیہ ہی کا سکہ چلتا تھا بے زر کو کوئی نہ پوچھتا تھا خواہ کتنا ہی ذی علم اور صاحب کمال ہو۔

عدالت کا حال ؎

کیا بغل میں داب کے ایمان بیٹھے جیبیا   بی دوگانا پاس خالق کا نہ ہے قرآن کا

ڈاڑھی منڈوں کے ہیں لیتے ڈاڑھیوں والے ہو   حق کو ناحق کرتے ہیں ناحق کو حق یہ برملا

نوج دکھلائے خدا ایسی عدالت آج کل

پولیس کی کیفیت :-

کوتوالی والوں نے باندھی کمر انصاف پر   انشا رامی نامہ دے کچھ اور خرچے آن کر

پھر جو ہو چوری تو دہشت سے ہو کوئی خبر   پہلے گھر والے بندھیں اس کے ہو چوری جس کے گھر

تھانہ داروں نے نکالی ہے یہ حکمت آج کل

رشوت کی گرم بازاری :-

لالچی بندے یہ لینا ہی سمجھتے ہیں ثواب   ڈر نہیں مرنے کا ہے کس کمیت کی بولی غلاف

صاف شکر ملا تو کر دیتے ہیں کار خراب   جو بہت دے اس کا کہنا ہو جو کم دے ہو خراب

ہر کچہری میں ہے کرتی کام رشوت آج کل

عام بدنظمی اور سلطنت کی دگرگونی :-

جب گنواروں کو ہو عامل کے نصیب چٹکیں   کس طرح پیسا چلے دستور ہے یہ بھی کہیں

سال میں بارہ بدلتے ہیں یہ عامل ہیں   بی اماں سال بھر کا کچھ اجارہ ہی نہیں

جو امیانہ دے وہی بس پہنے خلعت آج کل

بڑی ناانصافی اور حق ناشناسی ہوگی اگر جان صاحب کی علمی اور ادبی عظمت کا بھی اعتراف نہ کیا جائے۔ یہ آپ کا کمال ہے کہ آپ نے کسی شعر میں (بہ استثنا ایک قصیدے کے جس کا ذکر آگے آئے گا) نہ فارسی کی اضافت استعمال کی نہ فارسی کا حرف عطف۔ غریب اور نامانوس الفاظ سے بھی احتراز کیا ہے۔ سادگی اور سلاست آپ کے کلام کا خاص جوہر ہیں اور تشبیہات تو بہت ہی دلکش اور نئی نویلی ہیں۔ چند ایک سے آپ بھی لطف اندوز ہو جیئے :-

پان کھا کر جو ہنسی گوہر تو اس کے عکس سے   موتیوں کا ہو گیا باجی گلے میں ہار سرخ

پروانے اڑ کے آتے ہیں جیتی کہوں تو وا   ہے کھیلتی شیر کا گویا ستکار شمع

تیل نہیں مانگ میں رنا فی کے   یہ کھیا لھوڑا ہے گوگل میں

کانی چادر تو نہیں ہے یہ کے چمکی جو تاب   کود کے اودی گھٹا سے نکل آئی بجلی

جان صاحب کا ایک قصیدہ بھی دیکھنے میں آیا ہے جو ایک رنڈی حسین باندی کی شان میں ہے۔ بڑی دھوم دھام کا قصیدہ ہے۔ شان و شوکت پیدا کرنے کے لئے صنائع بدائع کا خوب استعمال کیا ہے۔ سراپائے ممدوحہ خاص طور پر جاذب نظر ہے۔

حسین باندی سے جان صاحب کا کیا تعلق اور رشتہ تھا اور وہ کون سا جذبہ تھا جو اس قصیدہ کا محرک ہوا یہ ایک دلچسپ داستان ہے جس کی لطافت بیچاری بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ آپ خود جان صاحب ہی کی زبان سے سن لیجئے ؎

کہتا نہ کیوں سراپا تیرا حسین باندی   شیدا کا ہوں میں تیرے شیدا حسین باندی

سراپا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

گردن تو ہے صراحی آنکھیں ہیں جام صہبا   ہے اس میں خط ساغر شہرہ حسین باندی

بازو ہیں ترے دو لوں یہ جو آگے ہیں تر   مضمون یہ ہاتھ کا ہے پایا حسین باندی

جو ہے ہلال گردوں اے آسمان شوکت   ترشا ہوا ہے ناخن تیرا حسین باندی

شفاف ایسا پایا پائے نگاہ پھسلے   عالم غضب شکم کا دیکھا حسین باندی

بلور کے ستوں ہیں رانوں سے ساق تک   تصویر نقش پا کا نقشہ حسین باندی

یہ خیال غلط ہے کہ ریختی محض شہوانی خیالات کے اظہار کا آلہ تھی بلکہ دیگر اصناف سخن کی طرح اس نے بھی ادب اور سماج کی خدمت انجام دی ہے اور جان صاحب میں تو ترقی پسندی اور جدت کے تمام عناصر موجود تھے۔ وہ اپنے ماحول کے غلام بن کر نہیں رہے بلکہ اپنے زمانہ کا ہر عیب اور ہر برائی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے بیہودہ باتوں کی طرف رغبت پیدا نہیں ہوتی بلکہ بیزاری ہوتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ان کا ہر شعر ایک طنز ہے اور ہر قہقہہ ایک زہرخند۔

ریختی میں جذبات، واردات، محسوسات اور خیالات سب زنانہ ہیں لیکن جدید ادب کی طرح اس میں جنسی بھوک کا شائبہ بھی نہیں بلکہ ریختی گویوں نے عورتوں کے صحیح خیالات اور معاملات کی ترجمانی کر کے ہمارے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ کہیں کہیں خیالات پست ضرور ہیں لیکن اس کی وجہ خود شاعر کی پست مذاقی یا دنایت نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ شاعر نے ہر درجہ، ہر طبقہ، ہر منصب اور ہر حیثیت کی عورت کے دل و دماغ کی ترجمانی کی ہے اس سے ریختی اور ریختی گو شاعر کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ اس صنف شعر کی ہمہ گیری کا ثبوت ملتا ہے اور ہم کو شاعر کی دقت نظر اور وسعت معلومات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ آج کل کے بعض شاعر اور افسانہ نگار ارزاں شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے لئے مختلف پہلوؤں سے عورت کو اپنا موضوع بناتے ہیں لیکن ان کی تحریرات سے ان کی جنسی بھوک اور دماغی ہیجان و خلفشار کا پتہ لگتا ہے جو عورت کی دوری کا نتیجہ ہے ان کے بیانات ذاتی مشاہدات اور تجربات پر مبنی نہیں بلکہ مستعار ہیں اور اسی لئے مبہم بھی۔ ان کے برخلاف ریختی گو شاعروں کے رشحات قلم عورت کے قرب کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے خود عورت کو دیکھا، برتا اور سمجھا۔ "عورت ان کے اعصاب پر سوار نہیں" بلکہ وہ خود عورت کی کائنات پر حاوی تھے۔

آسٹریلیا کے ڈیری فارم

جدید طریقوں سے پیداوار میں اضافہ

کرتار سنگھ

جب آسٹریلیا کے لوگ دوسری جنگ عظیم میں بھرتی ہو گئے تو آسٹریلیا میں کام کرنے والوں کی کمی محسوس ہونے لگی اور سائنٹفک مشینوں کا استعمال بڑھ گیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آج آسٹریلیا میں پیداوار کے نسبتاً کہیں زیادہ ذرائع موجود ہیں۔ اس سے ڈیری کی صنعت کو بھی بہت فائدہ پہنچا۔

آسٹریلیا میں مکھن کی سب سے زیادہ پیداوار یعنی ۲،۱۱،۹۸۰ ٹن ۱۹۳۹-۴۰ء میں ہوئی۔ اس کے بعد لڑائی کی وجہ سے آدمیوں کی کمی ہو گئی۔ یہ پیداوار لڑائی اور برے موسم کے سبب ۱۹۴۵-۴۶ء میں گھٹ کر تقریباً ۱،۴۸،۹۰۰ ٹن رہ گئی جو ۱۹۳۰-۳۱ء کے زمانے میں سب سے کم تھی۔ اس کے خلاف آسٹریلیا نے اپنے اتحادیوں کو خوراک کی بڑی مقدار دینے کا وعدہ کر لیا تھا جس میں دودھ کی پیداوار بھی شامل تھیں۔

گھریلو استعمال کے لئے مکھن کا ہفتہ وار راشن آٹھ اونس سے گھٹ کر چھ اونس فی کس رہ گیا تھا۔ اس مشکل پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش عمل میں آئی۔ اب آسٹریلیا میں پچھلے کئی سالوں سے دودھ کی پیداوار کے بہتر امکانات ہیں اور برآمد کے لئے مکھن کی مقدار بڑھتی جا رہی ہے۔ یکم جولائی ۱۹۵۸ء اور ۳۰ جون ۱۹۵۹ء کے درمیانی زمانے میں مکھن کے ۸۲۰،۷۶،۱۰۲ ڈبے باہر بھیجے گئے جن میں سے ہر ایک میں ۵۶ پونڈ مکھن تھا۔ اچھے انتظام اور سخت محنت سے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے، اس کی ایک مثال ہیری کلٹز رنگ، اس کی بیوی، دو بیٹوں اور تین نوکروں کا کام پیش کرتا ہے۔

مسٹر کلٹز رنگ نے ۱۹۴۵ء میں ۲۷۰ ایکڑ چراگاہ لی جہاں چالیس انچ سالانہ بارش ہوتی ہے۔ یہ جگہ ملبورن سے، جو صوبہ وکٹوریہ کا صدر مقام ہے، ۹۰ میل مشرق میں واقع ہے۔ اس کے پاس تھوڑا سا روپیہ، کچھ گائیں، کچھ مشینیں اور ڈیری کے کام کا کچھ تجربہ تھا۔

اس وقت تک ... کی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کے پاس آٹھ کمروں کا ایک لکڑی کا گھر، ایک پیانو، ریڈیو، ریفریجریٹر، گرم کرنے اور اس قسم کی آسائشیں تھیں۔ بجلی اسٹیٹ الیکٹریسٹی کمیشن سے حاصل کی جاتی تھی اور پانی ایک ہزار گیلن کے زمین دوز حوض سے جو چھت کے پانی سے بھرا جاتا تھا۔ فارم کے موجودہ کاموں اور متعلقات کا بیان حسب ذیل ہے۔

مسٹر کلٹز رنگ پانچ بجے صبح کو اٹھتا ہے۔ ساڑھے پانچ بجے دودھ دوہنا شروع کرتا ہے۔ احاطہ، سائبان، نالیاں اور ڈھلوان کے فرش کنکریٹ کے بنے ہوئے ہیں جہاں جانوروں کی ایک خندق سے نکاسی کی گئی ہے۔ چھ مشینیں جن کی موٹر ... ہارس پاور کی ہے ایک گھنٹے میں ساٹھ گایوں کو دوہ لیتی ہیں۔ دوہتے وقت گایوں کو نلی دار ... سے گوندھا ہوتا ہے۔ دودھ کریم کی ٹنکیوں کے ذریعہ ... کی ہوئی بڑی بڑی ناندوں میں جاتا ہے۔ اسی سلسلے کی دوسری امدادی چیزوں میں پچاس گیلن پانی گرم کرنے کی بجلی کی مشینیں، دودھ سے مکھن نکالنے کی مشین اور دودھ کا گودام جس میں تاروں کے جالی دار دروازے لگے ہوئے ہیں تاکہ مکھیاں داخل نہ ہو سکیں، شامل ہیں۔

فارم کو چار بجے دودھ دوہنا شروع ہوتا ہے۔ ہر مرتبہ دوہنے کے بعد نلی کے ذریعہ احاطہ اور سائبان کو صاف کیا جاتا ہے اور پانی نکال دیتے ہیں جو کھیتی کی آبپاشی کے کام آتا ہے۔

مسٹر کلٹز رنگ کے پاس جزیرہ جرسی کی اصل نسل کے چار سانڈ ہیں۔ وہ ہر بچھڑی کی شناخت اور نسل کی یادداشت رکھتا ہے۔ ہر مہینے دودھ دینے والے مویشیوں کا معائنہ ہوتا ہے اور جو ایک خاص معیار سے کم دودھ دیتے ہیں انہیں نکال باہر کیا جاتا ہے۔ ہر سال فارم میں پیدا ہونے والی تقریباً ۲۵ نئی دودھ دینے والی گائیں گلے میں شامل ہو جاتی ہیں۔ بچھڑیوں کو اس وقت تک ان خاص حالات میں رکھا جاتا ہے جن میں موسم سے بچنے کا انتظام ہو، جب تک کہ وہ دودھ سے خالی مویشیوں کے ساتھ فارم کے پچھلے حصے میں جانے کے قابل نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد وہ بھی دوسرے مویشیوں کی طرح تمام سال میدان میں رہتے ہیں۔ مسٹر کلٹز رنگ نے خوب بیج بو کر اور کھاد استعمال کر کے چراگاہیں تیار کی ہیں۔ ایک ایکڑ میں چار پونڈ سال بھر رہنے والی رئی، تین پونڈ دوب اور تین پونڈ ملی جلی چپتی گھاس ہوتا ہے۔ موسم خزاں میں ان کے علاوہ قوی فاسفیٹ بھی ڈالا جاتا ہے اور چراگاہ میں گھاس زیادہ ہو جاتی ہے تو اسے کاٹ کر خشک گھاس کے طور پر محفوظ کر لیتا ہے اور ڈیڑھ سو ٹن سبز گھاس پہاڑی کی ایک خندق میں دبا دیتا ہے۔ یہ چارہ سردیوں میں کام آتا ہے۔

میدان کے سامان میں ۲۵ ہارس پاور کا ایک امریکی ٹریکٹر اور ایک آسٹریلیا میں بنی ہوئی گھاس باندھنے کی مشین شامل ہیں۔

گرمیوں میں اس فارم میں تقریباً ... گیلن پانی کی ہر روز ضرورت پڑتی ہے۔ یہ پانی ایک بجلی کے پمپ کے ذریعہ ایک چشمے سے ... گز دور ... کنکریٹ کے حوض میں ڈالا جاتا ہے جو سب سے بلند سطح پر واقع ہے، اور ساری جائیداد میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ خاص ضروریات کے لئے پانی حاصل کرنے کے لئے ہوا کی چکی لگائی ہوئی ہے۔

(باقی صفحہ ۶۹ پر)

نقد و نظر

بدلیاں

اس کتاب کی مصنفہ دلی کے مشہور شاعر اور ادیب حضرت آغا شاعر مرحوم کی صاحبزادی ہیں جنھوں نے ادبی ذوق اپنے والد سے ورثہ میں پایا ہے۔ کتاب میں ایک مقدمہ اور سولہ چھوٹے بڑے ادب پارے شامل ہیں۔ ان سب کو افسانے کہنا مشکل ہے کیونکہ ان میں سے اکثر مخصوص لمحات کے ایسے تاثرات کا نتیجہ ہیں جو فنی معنوں میں پوری طرح افسانہ بننے سے پیشتر ہی نذر قرطاس ہو گئے۔

اس کے باوصف محترمہ صاحبہ کے اظہار بیان کی روانی اور بے ساختگی ان کی کم سنی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے یہاں تصویر پرستی اور جذباتیت ہی کی قندیلیں روشن نہیں ہیں بلکہ کبھی کبھی مستقل حیات سے زندگی کے شعلے بھی بلند ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہ صنف نازک کی زندگی پر بزرگوں کی تلون مزاجی اور ادعائیانہ اظہار عشق کے اثرات کو بھی محسوس کرنے لگی ہیں جس کی اچھی مثالیں "کس قدر رنگین ہے راہ محبت کا فریب" اور "ٹوٹا ہوا کھلونا" وغیرہ ہیں۔

اگر انھوں نے لکھنے کی مشق جاری رکھی اور لکھنے سے زیادہ پڑھنے پر توجہ دی تو ان کا ادبی مستقبل یقیناً نہایت شاندار ہوگا۔ افسانوی ادب اور خصوصاً صنف نازک کے ادب میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

ناشرین: ہندوستانی پبلشرز دلی۔ ملنے کا پتہ نگارستان ایجنسی، اردو بازار دلی۔ صفحات ۲۰۸۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

ایک کاروباری

اختر اورینوی کا یہ ناولٹ ایک ایسے شخص کی زندگی کا آئینہ ہے جو غریب کمہار کا بیٹا ہونے کی وجہ سے تعلیم تو برائے نام ہی حاصل کر سکا لیکن اپنی تاجرانہ صلاحیتوں اور انتھک کوششوں کی بدولت ایک اعلیٰ درجہ کا کاروباری ثابت ہوا۔

تاجرانہ کامیابیوں کے برعکس اس کی خانگی زندگی میں نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں اور وہ آخرکار خودکشی تک پر مجبور ہو جاتا ہے۔

درحقیقت یہ کردار کا ناولٹ ہے۔ اس میں کردار نگاری اور تحلیل نفسی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ کردار کے افعال و افکار کے رابطہ کو واضح کرنے کے لئے اس کے ہر ضروری پہلو کو روشنی میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی لئے اس کے کردار پلاٹ سے زیادہ اہم اور دلچسپ ہیں۔

آئندہ واقعات اور پلاٹ کے پیش نظر ابتدا میں چھیوڑا ناگیسر اور جیمز کے متعلقین کے حالات کسی قدر زیادہ تفصیلی محسوس ہوتے ہیں۔ ممکن ہے شروع کرتے وقت اختر صاحب کا ارادہ خاصہ بڑا ناول لکھنے کا ہو جو آئندہ کسی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا ہو۔

یہ خوبصورت مجلد ناولٹ ۲۷×۲۲/۱۶ کے ۱۰۳ صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت ۱۲ آنے۔

ناشرین: ہندوستانی پبلشرز دلی۔ ملنے کا پتہ: نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی۔

شاہکار کا بہار نمبر

شاہکار نے گزشتہ سال ترقی پسند ادب نمبر نکالا تھا جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس مرتبہ بہار نمبر شائع کیا ہے۔ اس خاص شمارے میں، جس کے شائع ہونے کی اپریل کے آخری ہفتہ میں امید کی جا رہی تھی مئی کے آخر میں شائع ہو سکا لیکن اندراجات نے اس طویل اور پریشان کن انتظار کی تلافی کر دی۔ بہار نمبر پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے قابل مدیروں کی مساعی جمیلہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حصہ نظم زیادہ تر بہار ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں جگر مراد آبادی، اختر شیرانی، جوش ملسیانی اور احمد ندیم قاسمی کی نظمیں خاص دلکشی اور رنگینی کی حامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی مشاہیر کی غزلیں اور نظمیں ہیں جو اپنے موضوعات اور انداز بیان کے لحاظ سے نہایت خوشگوار تنوع پیش کرتی ہیں۔

ادبی مقالات کم ہونے کے باوصف نہایت معلومات افزا اور مفید ہیں۔ میرزا ادیب کا افسانہ "شبنم" ایک ایسے سپاہی کی متضاد نفسیات پیش کرتا ہے جس کا تصور کبھی اس کے ذہن میں ماتم و غصہ کی سرخ آندھیاں چلاتا ہے تو کبھی اس کے دل کو محبت سے سیراب کر کے جنگ، خونریزی، اور فتح و شکست تک کے احساسات سے بلند کر دیتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کا ڈرامہ "چھپٹ" اور سلطان جاوید کا افسانہ "میا کو" بھی نہایت دلچسپ ہیں۔ ان سب چیزوں کے علاوہ بہ چر میں دو رنگین تصویریں بھی شامل ہیں۔ یہ خاص نمبر دو سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے اس لئے اس کی قیمت (۱؎) کسی طرح زیادہ نہیں۔

سالنامہ تمثیل (بمبئی)

کاغذ کی کمیابی آجکل بہت سے ماہناموں کو مجبور کر رہی ہے کہ اپنے دو دو مہینے کے متعدد شماروں کو خاص نمبر بنائیں۔ تمثیل کا زیر نظر سالنامہ جنوری سے اپریل تک کے چار شماروں کا واحد نمائندہ ہے۔

حالانکہ اس کے شروع میں "احوال" کے تحت تمثیل کے تین چوتھائی حصہ کو خالص ادبی بتایا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں فلمی پرچہ کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ ڈائرکٹروں اور فلموں کے متعلق مضامین، فلمی خبریں، فلمی ستاروں کی متعدد تصاویر اور فلموں پر تنقیدات اور اشتہارات غرض سبھی کچھ موجود ہے۔

اس سالنامہ کے ادبی حصہ کی بہترین چیز فراق کی نظم "قدیم آدم"

ر۔ ن۔ ش

معلوم ہوتی ہے جو غالباً موصوف کی اجازت سے ان کے مجموعے "دیپ" سے نقل کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک مقالہ "ہندی اردو جھگڑا اور ہم" بھی شامل ہے جس میں زبان کے مسئلہ کا حل فرقہ پرست اور خاص طبقہ کی شعبدہ بازی سے بچ کر دیہات کی زبان کو جس میں خسرو، رحیم، سورداس اور کبیر نے شعر کہے، اپنانا بتایا گیا ہے۔

سرورق کے علاوہ آرٹ پیپر کے چار صفحوں پر فلمی ستاروں کی خوبصورت تصاویر ہیں لیکن باقی پرچہ میں بادامی کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ابھی تشکیل کے ادبی حصہ کو اور بھی بہترین بنایا جا سکتا ہے۔ موجودہ حالات میں کم از کم فلمی پرچے پڑھنے والوں کو یہ ۱۴۰ صفحات کا سالنامہ ایک روپیہ میں ارزاں اور دلچسپ معلوم ہوگا۔

الکلام کا سالنامہ

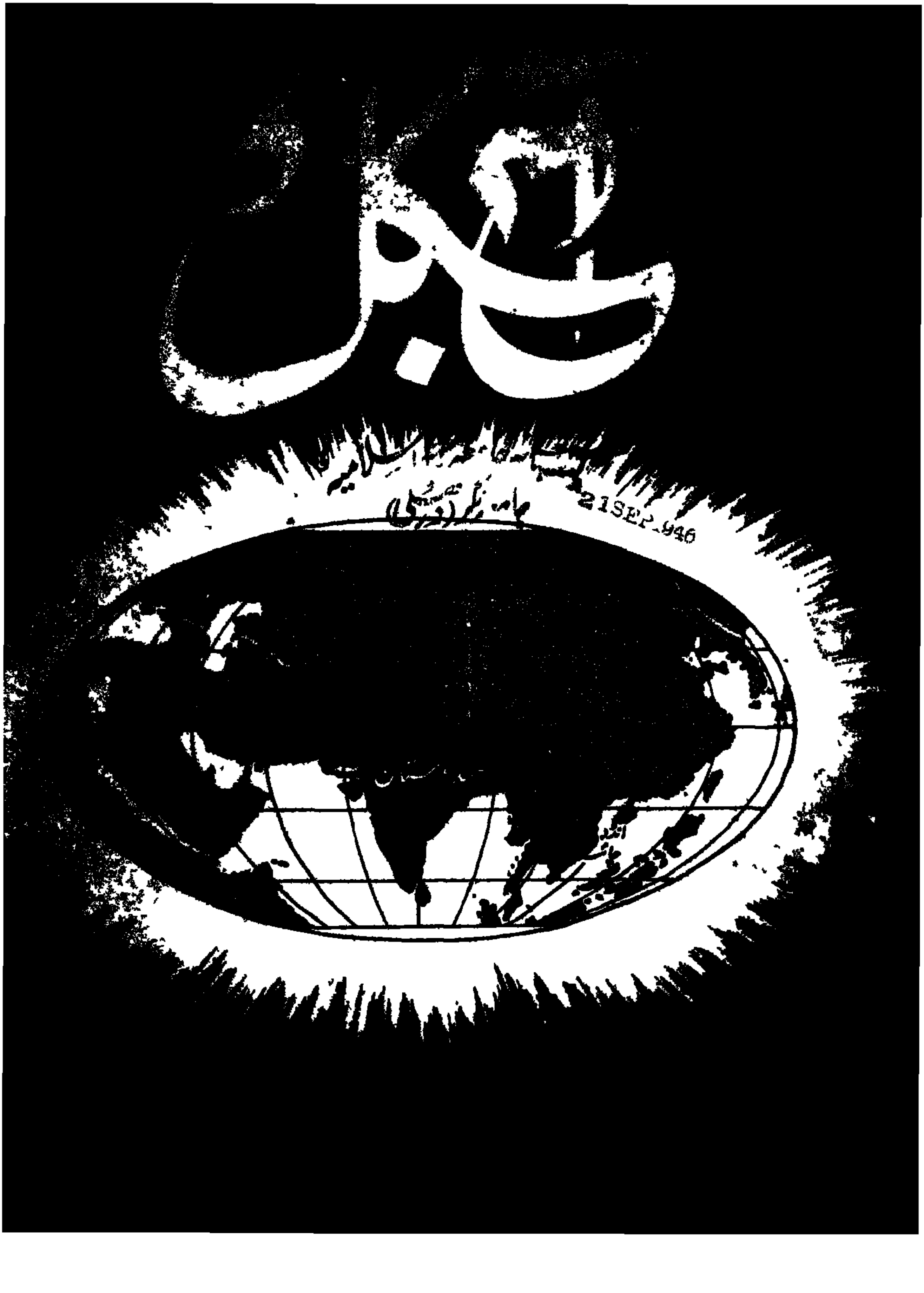
بنگلور کے روزانہ اخبار "الکلام" کا زیر نظر سالنامہ کئی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کی ترتیب کے وقت ہر قسم اور ہر مذاق کے پڑھنے والوں کی دلچسپی کا خیال رکھا گیا ہے۔ نظموں، غزلوں، افسانوں اور مقالات کے علاوہ اس میں مزاحیہ افسانے مثلاً "چچا چھکن نے عید کی نماز پڑھی"، عورتوں سے متعلق مضامین مثلاً "دکن کی بہادر خواتین" اور بچوں کی دلچسپی کی کہانیاں، مثلاً "ننھا کھلونا" وغیرہ شامل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے لکھنے والوں میں بھی عورتوں اور طالب علموں کی کافی تعداد موجود ہے۔ اس سالنامے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تقریب قریب سارے قلمی معاونین یا تو دکن ہی کے ہیں اور یا فی الحال دکن میں مقیم ہیں۔ اس سے سالنامے کے عام معیار پر تو اثر پڑنا ضروری تھا لیکن اس قسم کی کوششوں سے مخصوص خطوں کے شاعروں اور ادیبوں کی نمائندگی اور ہمت افزائی ضرور ہوتی ہے۔

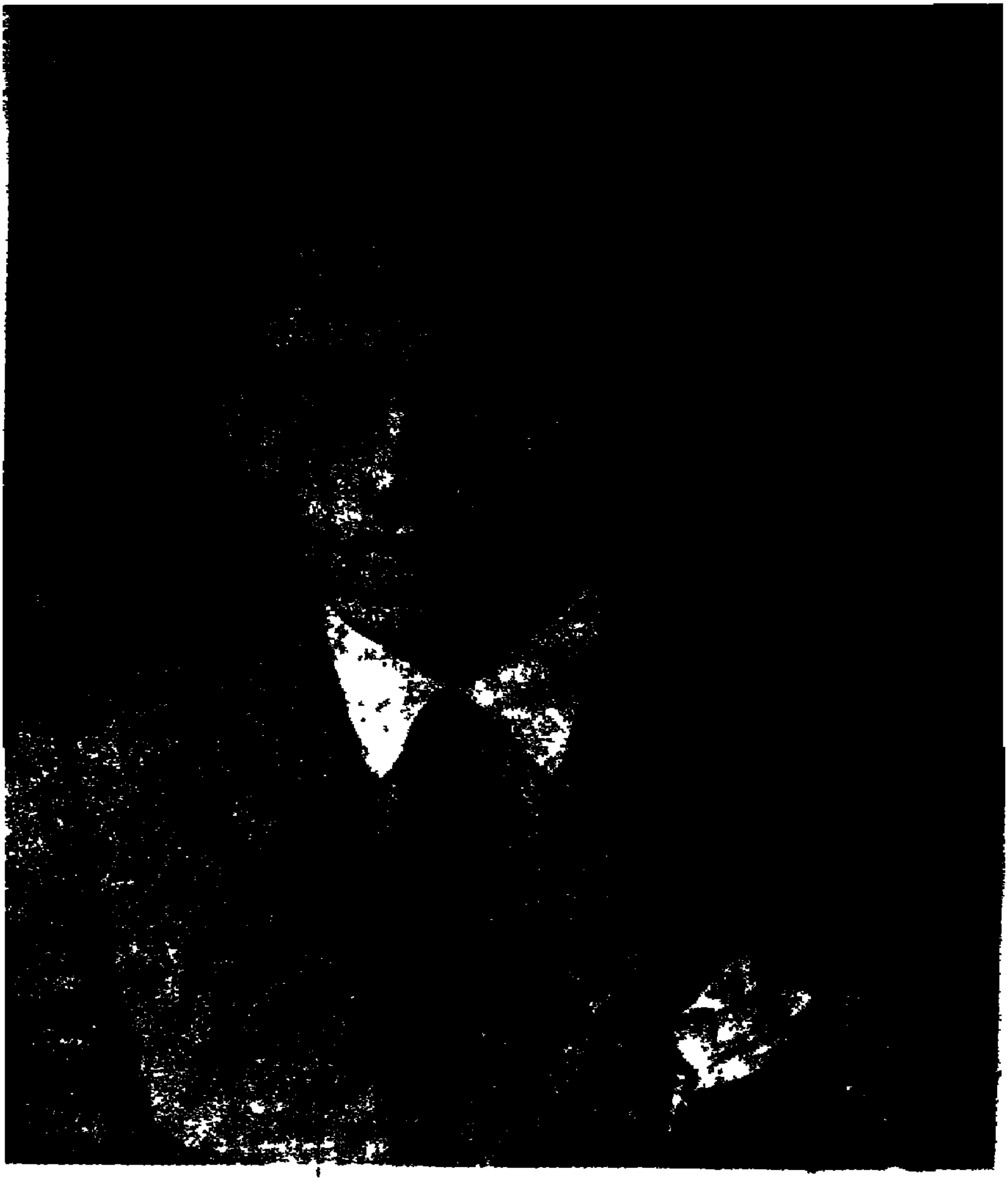
یہ سالنامہ سائز اور ضخامت کے لحاظ سے بھی اہم ہے اور کتابت اور طباعت بھی اچھی ہے لیکن نظموں اور سرخیوں کے ڈیزائن اس قدر مزین ہیں کہ کبھی کبھی ذوق جمالیات پر بوجھ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ایک اہم سالنامے میں حصہ لینے والے ادیبوں اور شاعروں کی اور دو صفحے نظموں کی تصویروں کیلئے مخصوص ہیں۔ مجموعی اعتبار سے یہ کافی دلچسپ ہے اور اس کی قیمت اگر چہ بہت کم [illegible]

آسٹریلیا کے ڈیری فارم: ——— بقیہ صفحہ [illegible]

اس گھر کی جو بھی ضروریات بڑی حد تک خود پوری کرتا ہے مسز کلشنگ نگرانی کرتی ہے۔ فارم کے سارے مرغے مرغیاں اور انڈے گھر کے استعمال میں آتے ہیں۔ دودھ اور مکھن ڈیری سے حاصل ہوتا ہے۔ ساری سبزیاں باورچی خانہ کے باغ میں اگائی جاتی ہیں یہ مسز کلشنگ کا خاص کام ہے۔ اس کے علاوہ فارم کی بھیڑوں سے گوشت حاصل ہوتا رہتا ہے۔

مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارۂ مطبوعات متحدہ نے [illegible] سے شائع کیا۔


21SEP-946



ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری - بی۔ اے - ساحبہ الفکر۔ ڈی لٹ - پیرس۔
اردو ہندی اور انگریزی کے بہترین انشاپرداز اور افسانہ نگار ہیں۔ انہیں ادب میں ترقی
پسند تحریک کا بانی تسلیم کیا گیا ہے - انکی ادبی خدمات پر جناب ظہور الحسن ڈار نے ایک
پر مغز مقالہ تحریر فرمایا ہے - اسکی پہلی قسط اسی شمارے کے صفحہ 8 سے ملاحظہ کیجئے -


KELSO
FOR TUBERCULOSIS
جب ماتا جی میری زندگی سے مایوس
ہو گئیں — اور — پتا جی کی آنکھوں سے بے وقت آنسو نکلنے لگے اور تمام رشتہ داروں نے ڈاکٹروں حکیموں اور
ویدوں کی رائے کے مطابق میرے مر جانے کا فیصلہ کر لیا تو ہمارے پتا جی کے ایک سچے اور مخلص دوست نے کیلسو کیمیکل ورکس کی
تیار کردہ دوا کیلسو کے استعمال کرانے کا فوری مشورہ دیا۔ پتا جی نے فوراً روپے بذریعہ تار روانہ کر کے کیلسو کا مکمل کورس منگوایا
اس کے کھاتے ہی میرے جسم میں نئی روح پڑ گئی ہر روز بخار، کھانسی، سینہ کا درد، خون تھوکنے، گلے کی خراش، بلغم اور
کمی ہونے لگی، بھوک کھل گئی، خون میں سرخی بڑھنے لگی اور چند دنوں میں چہرہ بارونق ہو گیا۔
جلن بالکل غائب ہو گئی گھبراہٹ کا نام و نشان نہ رہا اور اب کوئی شخص مجھے دیکھ کر ہرگز یہ نہیں
کہہ سکتا کہ یہ کبھی تپ دق کے پنجہ میں گرفتار ہوئی تھی
اس دوا کو کیلسو کیمیکل ورکس نے ریسرچ کی نئی تھیوری کے مطابق سونا
اور سچے موتیوں جیسی قیمتی چیزوں سے تیار کیا ہے … دق کے ماہر دہلی کے
مشہور طبیب پروفیسر حکیم محمد مظہر الدین صاحب … وائس پرنسپل جامعہ طبیہ،
صدر مجلس اطباء و ایڈیٹر رسالہ مسیح الملک تپ دق کے مریضوں کو کیلسو ہی کے
استعمال کا مشورہ دیتے ہیں
ACUTE PHTHISIS
CHRONIC PHTHISIS

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ تصویری رسالہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۸ | ۱۵ ستمبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

نائب مدیر
فضل حق قریشی
دہلوی

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس نمبر ۱۹۱ دہلی

رفتارِ زمانہ

لنکا میں ماہی گیری

لنکا کے چاروں طرف سمندر میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کس حصے میں مچھلیوں کا جمگھٹ زیادہ ہے دوربین لگے ہوئے ہوائی جہاز اڑائے جائیں گے۔ اس کے بعد ماہی گیروں کی کشتیاں فوراً ان مقامات پر پہنچکر اپنے جال ڈال دینگی یہ خاکہ لنکا کے محکمہ ماہی گیری نے بعد جنگ کے لائحہ عمل کے سلسلے میں مرتب کیا ہے۔ اس پندرہ سالہ اسکیم پر تقریباً بچھتر لاکھ روپئے خرچ ہوں گے۔ اس رقم میں دخانی کشتیوں، جالوں اور جہز تحلیل کی قسم کے ان آلات کی قیمت شامل ہے جو مچھلیاں پکڑنے کے سلسلے میں استعمال ہوں گے مچھلیوں کو خشک کرنے اور دوسرے ملکوں کے لئے انہیں ڈبوں میں بھرنے کے کارخانے قائم ہوں گے۔ جنگ سے پہلے لنکا میں تقریباً ایک کروڑ چونتیس لاکھ روپے سالانہ کی خشک مچھلیاں یا مچھلیوں سے بنی ہوئی چیزیں دوسرے ملکوں سے درآمد ہوتی رہی ہیں۔ اگر جزیرے کی کل آبادی کا لحاظ رکھتے ہوئے اوسط لگائی جائے تو فی کس چودہ پونڈ سالانہ کا حساب بیٹھتا ہے۔ حالانکہ جاپان میں تقریباً ساٹھ پونڈ فی کس کے حساب سے مچھلی کھائی جاتی ہے۔ قیاس ہے کہ آئندہ لنکا کے باشندے بھی زیادہ تر مچھلیوں پر گذارہ کرینگے اور وہ خود انہی کے ملک کی پیدا وار ہونگی۔

آسٹریلیا میں جنگلی کتے

آسٹریلیا میں بھیڑ بکریوں کی پرورش وہاں کے باشندوں کا سب سے بڑا اور اہم پیشہ ہے۔ لیکن قدرت نے ان جانوروں کے ساتھ ساتھ جنگلی کتے بھی پیدا کردئے ہیں جو ہر وقت تباہی اور نقصان پہنچانے کے در پے رہتے ہیں۔ جب بھی موقع ملتا ہے، ان کی ٹولیاں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ خصوصاً کوئینز لینڈ میں ان کتوں کی افراط وبال جان ہوگئی ہے۔ لڑائی سے قبل حکومت نے ایسے کتوں کو تلف کرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ جب کوئی شکاری کسی کتے کو مار کر اسکی کھوپڑی کاٹ لاتا، فوراً سرکاری خزانے سے اسے آٹھ روپے مل جاتے۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ پچھلے سال تقریباً ساڑھے بائیس ہزار کتے موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ پھر بھی انکی تعداد ہولناک ہے۔ چنانچہ اب فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان کو زہر کے ذریعہ بہت جلد فنا کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے زہریلی گولیاں انگلستان سے منگائی گئی ہیں۔ ہر گولی میں چاول کے برابر اسٹرکنائن شامل ہوگا کوئینز لینڈ میں پہنچتے ہی یہ گولیاں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں میں رکھکر ہوائی جہازوں کے ذریعہ لاکھوں کی تعداد میں ان حصوں پر پھینک دی جائینگی جو جنگلی کتوں کے مرکز ہیں اور جن میں سے اکثر جگہ انسان کی رسائی ممکن ہی نہیں ہوسکتی۔ انہیں کھاتے ہی کتے آن واحد میں فنا ہوجائیں گے اور غریب بھیڑ بکریوں کو آئندہ اطمینان کی زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکیگا۔

انگریزی فلم اردو زبان میں

کچھ عرصہ ہوا انگریزی تھیٹر کو اردو کا جامہ پہنایا۔ اب انگریزی فلم بغدادی چور جس میں سابو نے بھی کام کیا ہے، ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں دکھایا جاچکا ہے۔ اسکا مکالمہ انگریزی زبان ہی میں ہے۔ اب کمپنی کے مالکان نے بڑی کوشش کے ساتھ مکالمے کا ترجمہ اردو زبان میں اس طرح کر دیا ہے کہ عبارت کم یا زیادہ ہونے نہیں پائی بلکہ اجزائے کلام کی تعداد تک تقریباً برابر رہی۔ نتیجہ یہ کہ جب اردو جاننے والے اداکاروں نے نیا مکالمہ یاد کرکے پردے کے پیچھے سے فلم کے ساتھ ساتھ بولنا شروع کیا اور اسکی صدابندی ہوتی رہی تو وہ تصاویر کی نقل و حرکت کے ساتھ بالکل منطبق ہوگیا۔ چنانچہ حال ہی میں اس کی نمائش انگلستان میں جشن فتح کے موقع پر ہوئی تو لوگ یہ دیکھکر محو حیرت ہوگئے کہ اصل فلم کے امریکی اداکار بظاہر نہایت صاف اردو بولتے نظر آرہے ہیں اور اس خوبی کے ساتھ کہ کسی جگہ بھی تصنع اور ناواقفیت کی جھلک محسوس نہیں ہوتی۔ عنقریب اس فلم کی نمائش ہندوستان میں شروع ہوجائیگی۔ اگر یہ کامیاب تجربہ آئندہ بھی جاری رہا تو غیر ملکی کمپنیوں کے لئے فلمی کاروبار میں ایک نئے پہلو کا اضافہ ہوجائیگا۔ پھر وہ لوگ بھی جو انگریزی زبان سے ناواقف ہیں، ان اعلیٰ فلموں سے لطف اندوز ہوسکیں گے جو انگریزی اور امریکی کمپنیاں تیار کرتی رہتی ہیں۔

امریکہ میں غیر ملکی طلبا

اس لڑائی کے بعد سے مشرقی دنیا کے کئی ملکوں کو مغرب میں خاص اہمیت حاصل ہو چلی ہے۔ اس امر کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ حکومت امریکہ نے غیر ملکی طلبا کو اپنے ملک میں تعلیم پانے کی اجازت دیدی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ۴۲۹ طلبا سان فرانسسکو پہنچے ہیں کہ یہ ریاستہائے متحدہ کے مختلف کالجوں اور اداروں میں تعلیم حاصل کرینگے۔ ان میں سے تین سو بارہ ہندوستانی طلبا میں سے ایک سو تہتر کو حکومت ہند کی طرف سے سرکاری وظیفہ ملیگا۔ ایک سو بیس نجی ذرائع سے امداد حاصل کرینگے۔ دو ہندوستانی نرسیں جنہیں شجاعت و بہادری دکھلانے کے صلے میں تمغہ جات مل چکے ہیں، صرف سفر خرچ حاصل کرنے کے بعد باقی مصارف خود برداشت کرینگی نیز ایک اور طالب علم کو کسی کی طرف سے وظیفہ دیا جائیگا۔ حکومت ہند کا خیال ہے کہ آئندہ چند برس میں تقریباً دو ہزار طلبا امریکہ کے تعلیمی اداروں میں بھیجے جائیں۔ اس وقت وہاں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد برائے نام ہے۔ شروع شروع میں امریکہ کے ارباب حل و عقد کے پیش نظر یہ سوال زیر غور تھا کہ غیر ملکی طلبا لئے جائیں یا نہیں لیکن فیصلہ حق میں ہوا اور اس جوش و خروش کے ساتھ کہ ہر کالج زیادہ سے زیادہ طلبا مانگ رہا ہے اور اس کا مطالبہ پورا نہیں کیا جاسکتا۔

ہندوستان اور سونے کی کانیں

ملک ہندوستان معدنیات کے اعتبار سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ دوسری دھاتوں کے علاوہ سونے کی یافت قابل ذکر ہے۔ اس سلسلے میں ریاست میسور کی کولار والی کانیں سونے کا مخزن ہیں۔ دنیا بھر میں جتنا سونا برآمد ہوتا ہے، اسکا تقریباً دو فیصدی حصہ یہاں کی سرزمین اگلتی ہے۔ ہندوستان میں سونا کہیں اور نہیں ہوتا۔ یورپ کی چار کمپنیاں کان کنی کا کام انجام دیتی ہیں۔ یہاں کی کانیں دنیا بھر میں سب سے زیادہ گہری ہیں۔ ان کا عمق بالکل عمودی حالت میں نو ہزار فٹ سے زیادہ ہے۔ ان کانوں سے ریاست میسور کو مالیانہ کے طور پر دو کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں جب کام شروع ہوا تو صرف نو اونس سونا نکلا جس کی قیمت محض ۳۷ پونڈ ۱۲ شلنگ ۰ پنس ہوئی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں کل یافت ۵۵۷ اونس ہوئی جس میں سے ۲۷۲ کی قیمت ۲۳,۷۳,۱۱۰ پونڈ ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں ۳,۱۹۳,۲۵۲ اونس خالص سونا نکلا جس کی قیمت ۱,۰۷,۳۹,۰۰۰,۵ پونڈ ہوئی۔ شروع سے ۱۹۳۶ء کے آخر تک کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقریباً ۱۵,۹۱۰,۳,۶,۱۲ اونس سونا نکلا جس کی قیمت ۱,۲۷,۹۳,۵۵۵ پونڈ ہوئی۔ ان تمام کانوں کے سلسلے میں بیس ہزار سے زیادہ مزدور ملازم ہیں۔ اور ان کو اچھی اجرتیں دی جاتی ہیں۔ ان کے قیام و طعام کا انتظام بھی معقول طریقے پر کر رکھا ہے۔

نمکین چینی

چینی کا کال تقریباً ساری دنیا میں شدید دشواریاں پیدا کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں یورپ کے ملکوں کو سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ چینی یا اور دوسری شکر کی اشیاء کسی قیمت پر نہیں ملتی اور اگر چور بازار میں کبھی اسکی جھلک دکھائی بھی دی تو اتنی قیمت طلب کی گئی کہ خریدنے والوں کو سنتے ہی پسینہ آگیا تاہم پیرس کے ایک بازار میں ایسا عجیب و غریب واقعہ ظہور میں آیا کہ شاید اس جیسی مثال دنیا میں کہیں اور نہ مل سکے۔ پیرس کی رونت مارترے اسٹریٹ میں جو اپنی چور بازاری کے باعث آجکل بہت مشہور ہے، ایک شخص بڑا سا تھیلا لئے منظر عام پر آیا اور آواز لگانی شروع کی "عمدہ صاف چینی کوڑیوں کے مول خریدو خریدنے والو!" یہ سنتے ہی عورت و مرد چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ ایک ایک سیر چینی کا پیکٹ سوا چھ روپے میں ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ ہر شخص اپنی جگہ خوش تھا کہ آج مدتوں کے بعد کام و دہن کی تلخی کو شیرینی سے بدلنے کا موقع مل جائے گا لیکن گھر پہنچکر جب سب نے اپنے اپنے پیکٹ کھولے تو معلوم ہوا کہ چینی کی صرف ایک انچ موٹی تہ کے نیچے کھانے کے معمولی نمک کے سوا کچھ نہیں ہے۔ چینی کی تہ بھی اس طرح لگی ہوئی تھی کہ جب اسے الگ سے اٹھا لینے کی کوشش کی گئی تو نیچے کا نمک اس میں مل گیا اور چینی نمکین ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کام و دہن کی وہ لذت نصیب نہ ہوئی ہوگی جسکی انتظار مسرت کے ساتھ تمام لوگوں کے جی میں وہ دنگی تھی — اس لڑائی کے نتائج نے دردناک حادثات کے ساتھ بعض مضحکہ خیز صورتیں بھی پیدا کی ہیں۔

نوے منٹ میں ہوائی ڈاک

عنقریب برطانیہ اور امریکہ کے مابین ہوائی ڈاک کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ کم وزن کے خط اور دوسری ہلکی چیزیں خدنگ نما ہوائی جہازوں میں رکھکر ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف جہاز چلانے والوں کے بغیر پھینکی جائیں گی۔ یہ جہاز تقریباً دو ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے یا بالفاظ دیگر نوے منٹ میں ساری مسافت طے کر لیا کریں گے۔ ان کی رہنمائی ریڈیائی لہروں کے ذریعہ ہوگی۔ برطانیہ کی فضائی وزارت نے بیڈفورڈ میں جوہری لہروں کی تجربہ گاہ کے قریب کچھ جگہ لے کر نئی ہوائی ڈاک کا مرکز قائم کیا ہے۔ یہ صورت اگر ممکن ہو گئی اور ممکن نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آواز کی رفتار سے زیادہ تیز چلنے والے یہ جہاز رسل و رسائل کی شاہراہ پر نئے سنگ میل کی حیثیت اختیار کریں گے۔

تیل کے میدان اور کارخانے

مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں برطانوی ملکیت کے تیل کے میدانوں اور صاف کرنے کے کارخانوں کی مکرر تعمیر اور ان کو نئے

ساز و سامان سے لیس کرنے کے لئے ڈیڑھ کروڑ پونڈ سے زیادہ کے ٹھیکے دیئے گئے ہیں۔ یہ رقم ۱۹۴۵ء میں دیئے جانے والے ٹھیکوں سے بقدر دس لاکھ پونڈ زیادہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک عظیم الشان پائپ لائن کا ساز و سامان اور کلیں وغیرہ خرید نے کے سلسلے میں ایک کروڑ پونڈ کے ٹھیکے دیئے جائیں گے۔ یہ لائن ۱۹۴۸ء میں مکمل ہو کر شمالی ایران کے ان سلسلوں کو جو حیفہ اور طرابلس سے وابستہ ہیں سہ گنا زیادہ قوی بنا دے گی۔ یہ ماہرین کا خیال ہے کہ مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں خصوصاً جنگ زدہ علاقوں میں تعمیر کا کام دو سال میں ختم ہو سکیگا۔ برطانوی حکومت بھی اس کوشش میں ہے کہ وہ تیل کے اعتبار سے دنیا بھر کی منڈیوں پر چھا جائے۔ حکومت امریکہ بھی مشرق وسطیٰ اور وینزویلا میں بے قیاس رقم خرچ کر کے یہی مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس مقابلے کے باوجود یہ فیصلہ ہے کہ دونوں ملکوں کے مابین نرخ کی کمی بیشی سے کوئی جھگڑا پیدا نہیں ہوگا۔ ولندیزی جزائر شرق الہند اور برطانوی بورنیو میں تیل کے میدان اور کارخانے سب سے زیادہ ردہ حالت میں ہیں کیونکہ ۱۹۴۲ء میں وہ بری طرح تباہ ہو گئے تھے۔ جاپانیوں نے عارضی تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کی مرمت کرائی تھی لیکن پسپائی کے وقت انھوں نے دوبارہ ان کو نقصان پہنچا دیا۔

حکومت ہند کا دست تعاون

حکومت ہند کے بنیادی غلے کے مطابق حکومت ہند نے ڈیڑھ کروڑ ٹن چاول ان علاقوں میں بھیجے ہیں جہاں قحط کے اثرات سب سے زیادہ رونما تھے۔ اس میں سے چوہتر ہزار ٹن ریاست ٹراونکور، تیس ہزار ٹن ریاست کوچین، پونے پندرہ ہزار ٹن بمبئی اور دس ہزار ٹن مدراس بھیجے گئے۔ تقریباً نو ہزار ٹن مغربی ہندوستان کی ریاستوں کو دیئے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اکتوبر ۱۹۴۶ء ختم ہونے سے پہلے دس ہزار ٹن چاول کی فالتو مقدار ان علاقوں میں اور بھیجی جائے گی۔ چاول کے علاوہ پینتیس ہزار ٹن جنا بھی صوبہ سندھ ان علاقوں کو دے سکیگا۔ اس مقدار میں سے چھ ہزار ٹن پہلے ہی روانہ ہو چکے ہیں۔ باقی مقدار بھی حاصل کر کے ایک جگہ جمع کر لی گئی ہے اور حمل و نقل کے انتظام کی تیاری کی جا رہی ہے۔

مغربی ممالک میں گیہوں کی افراط

امریکہ کے محکمۂ زراعت نے اعلان کیا ہے کہ سال گذشتہ کے مقابلے میں اس سال یورپ میں گیہوں کی فصلیں بہت اچھی رہی ہیں۔ یہ اندازہ ان رپورٹوں کی روشنی میں لگایا گیا ہے جو وہاں کے بارہ ملکوں سے شائع کی گئی ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں چونسٹھ کروڑ ستر لاکھ بشل پیدا ہوا تھا۔ اس دفعہ کا تخمینہ تقریباً بیاسی کروڑ بشل کا ہے۔ اس سلسلے میں فرانس سب پر سبقت لے گیا ہے ... گیہوں کی فصل اتنی عمدہ ہوئی ہے کہ اس سے قبل فرانس کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی۔ فرانس کے وزیر اغذیہ حال ہی میں لندن جانے والے ہیں۔ وہ برطانیہ کے وزیر اغذیہ سے بات چیت کریں گے کہ فرانس سے کتنا گیہوں برطانیہ کے لئے بھیجا جائے۔ کینیڈا میں بھی گیہوں کی فصل عمدہ رہی ہے۔ وہاں سے تقریباً بیس لاکھ بشل اناج وساور کیا جا سکیگا۔ مغرب کے ان اعداد و شمار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ عالمگیر مسئلۂ خوراک کی صورت حالات عنقریب سدھر جائے گی۔

برطانوی پولیس اور ریڈیو

برطانیہ میں پولیس کا سب سے بڑا مرکز اسکاٹ لینڈ یارڈ کہلاتا ہے۔ پولیس کے تمام احکامات اسی جگہ سے نافذ ہوتے ہیں۔ تجویز یہ ہے کہ اب سارے برطانیہ کے مشرقی اضلاع والے پولیس مرکزوں سے ملانے کے لئے ریڈیو کا ایک جال قائم کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں تقریباً چودہ اسٹیشن قائم ہوں گے۔ لاگت کا اندازہ تقریباً دو ہزار پونڈ فی اسٹیشن ہے۔ چیف کانسٹیبل کے آئندہ اجلاس میں اس مسئلہ پر پوری طرح غور کیا جائے گا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی ریڈیو پولیس اب تک صرف لندن کے علاقوں سے متعلق ہے۔ اس کے بعد اس کی پہنچ دور دراز حصوں تک ہو سکیگی۔ اس صورت میں مختلف قسم کی واردات و حادثات کی تعداد کم ہو جانے کا امکان ہے۔ ظاہر ہے کہ اس توسیع سے عوام کو خاطر خواہ فائدہ پہنچے گا۔

— سانحۂ ارتحال —

نہایت افسوس کے ساتھ سنا گیا کہ دہلی کے مشہور نوجوان اخبار نویس جناب سید محمود مورخ بی اے کسی اچانک صدمے کے باعث راہیٔ ملک بقا ہو گئے۔ انا للہ الخ۔ آپ ہفتہ وار "گلفروش" اور روزنامہ "مسلمان" کے مالک اور ایڈیٹر تھے۔ اردو ادب میں بھی انکو ایک اچھا مرتبہ حاصل تھا۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ اپنے اخبار جاری کرنے سے قبل مرحوم "خیال" میں نائب مدیر تھے۔ خدا نے انکو ایک فطری صلاحیت یعنی سماعت سے محروم کر رکھا تھا لیکن یہ کمی انکے ادبی اور صحافی مشاغل میں حائل نہیں ہوتی تھی۔ ان کی بے وقت موت سے ادب و صحافت کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ دعا ہے کہ خدا ان کو غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

تبرکاتِ سائل دہلوی مرحوم

بے حجابی میں سوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو
اور انگشت نما ہوتے ہو کیا کرتے ہو

تم گلے مل کے جدا ہوتے ہو کیا کرتے ہو
ابھی کیا تھے ابھی کیا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

بے سبب ہم سے خفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو
دشمنِ اہلِ وفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اب وہ بچپن کا زمانہ نہیں دیکھو دیکھو
ناسمجھ اور سوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

آگ دینے کے لئے آئے تھے یا لینے کو
جب تم آتے ہو ہوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

غیر کے شکوۂ بیجا سے تو ہو شرمندہ
میری منت پہ خفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

پردہ داری میں قباحت ہو تو بتا دو کیا ہے
پردہ در روزِ جزا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

خوگرِ جور و ستم سے یہ عداوت کیوں ہے
تارکِ وضعِ جفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اور انجان بنے جاتے ہو ہو کر سیانے
کیا سے کیا نام خدا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

وقت پر کام نہ آئیں گے تمہارے اغیار
ضد سے تم اور سوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اس بناؤ سے بگڑ جائے گا بیمار کا حال
تم تو پیغامِ قضا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

کھولتا ہوں میں تمہیں وصل میں جتنا، اتنے
اور پابندِ حیا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

جانشینِ داغ سے شاعر کا یہی سائل ہے
اور تم اس پہ خفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اختر حسین رائے پوری

بحیثیت ادیب

(۱)

ظہور الحسن ڈار

ہر جدید کا اردو ادب بیسویں صدی کا پینتیس سال پہلے گزار چکا یہی وہ موقعہ تھا جب رسالہ اردو میں اس کی اشاعت ہوئی ہیں اختر حسین رائے پوری کا مشہور مقالہ "ادب اور زندگی" شائع ہوا اور اس دلدل میں سے اور صحت مند ادب کے بیج بو گیا۔ اس وقت اردو ادب کی حالت روسی ادب کے اس دور سے کچھ مختلف نہ تھی جب زار روس کا ساشنی نظام مغربی و ملکی سرمایہ داری کے بھنور میں پھنس کر پوچھ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ روسی کردار مایوسی اور قنوطیت کا پرچار کر رہے تھے، اور رجعت پسندی کا نعرہ زبان پر آ رہا تھا۔ اس کا ردعمل فرد کی موت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ ہندوستانی ادب بھی کم و بیش اسی راہ پر تھا۔ سب تھے ملکی سیاست کے رنگ ڈھنگ کا اظہار ادب پر یہ ہوا کہ اس میں قوم پرستی، آزادی، مزاح، اصلاح اور خود پسندی کے موضوعات قائم ہو گئے تھے۔ ان سے ہمارے رجحانات میں ظاہر ہے کہ ادب کی حیثیت ایک سماجی فریضے کی نہیں بن سکی تھی۔ اس لئے ان میں زندگی کی سچی قدروں کی تلاش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ماحول کے اندھیرے میں کہیں امید اور امنگ کی بجلی تڑپتی بھی تھی تو اسلئے کہ تاریکی کا نقش اور بھی گہرا ہو جائے۔ پرانے ادیب اگرچہ زمانے کے بدلتے ہوئے چلن سے دوچار ہو چکے تھے، پھر بھی وہ میدان چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ادھر نئے لکھنے والوں کے لئے یہ مصیبت تھی کہ ابھی تک وہ یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ کچھ من چلے جو جنگ عظیم کے بعد یورپ کی خاک چھان چکے تھے اور مغربی ادیبوں کے شاندار کارناموں سے واقف ہو گئے تھے، وہ اپنی اپنی جگہ ہندوستانی ادب کو کبھی اس ہار میں گوندھنے کی فکر میں تھے جس کے سدا بہار پھول چننے میں مغربی فن کاروں کو بڑی جانکاری سے واسطہ پڑا تھا۔ مختصراً اس وقت اردو ادب میں زندگی کی ایسی لہر دکھائی نہ دیتی تھی جو اسکے ارتقا کی خبر دیتی، بلکہ اگر کہیں زندگی کا نشان بھی ملتا تو ناظر کے حصے میں خاک دھول کے سوا کچھ نہ آتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کے لق و دق صحرا میں کہیں کہیں نئے پیڑ پودوں نے سر نکال لئے تھے مگر ان کی نشوونما اسی وقت ممکن ہو سکی جب ادبی افق پر ایک نئی کرن نے چمک کر "ادب اور زندگی" کا جھنڈا بلند کیا اور آناً فاناً صحت مند خیالات کی برکات نے ہر طرف زندگی کی لہر دوڑا دی۔

"ادب اور زندگی" دراصل اختر رائے پوری کے اس مضمون کا پیش رو تھا جو ساہتیہ اور پرگتی کے عنوان سے تین سال قبل ہندی کے مشہور ماہنامہ وشوامتر کلکتہ میں شائع ہو چکا تھا۔ جس طرح اس مضمون نے ہندی ادب کے سوتے بچا کر، بیج بدل کر ایک نئے دور کی بنیاد ڈالی، اسی طرح اردو ادب میں بھی اس کی ایسی حیثیت ہے۔ مولانا ... کا کلام بانئے دور کے تقاضوں کی پہلی للکار نے جہاں رجعت پسندی اور قدامت پرستی کے معبدوں میں رخنے ڈال رکھے، وہاں ادیبوں کے اس گروہ کو بھی راہ دکھائی جو ابھی سوچ رہا تھا کہ ہمیں کیا لکھنا چاہئے اور کیسے لکھنا چاہئے۔ ... ایک ہستی پریم چند کی ذات نظر آتی تھی جس کے کردار خیال کے محلوں سے نکل کر حقیقت کی سڑکوں پر چلنے پھرنے لگے تھے۔ گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد سے متاثر ہو کر اب ان کا کسان ستیہ گرہ کرنا بھی سیکھ گیا تھا اور طالسطائی کے کرداروں کی طرح جوگیان ہستی کا اندھا سورداس من کے سنسار میں نیکی کی جوت جگانے نکل آیا تھا۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اجتماعی طور پر اردو ادب کے دھارے کا رخ بدلنے اور ادیبوں کو ادب کا مفہوم اور اسکے مقاصد سمجھانے میں جو کام اختر رائے پوری کے "ادب اور زندگی" نے کر دکھایا، وہ منشی پریم چند کے محض افسانوں کے لئے ممکن نہ تھا۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ خود منشی پریم چند نے اختر کے خیالات کو بہت پسند کیا، بلکہ اختر کے ساتھ مل کر ہندوستانی ادیبوں کو جدید کے ادبی تقاضوں سے باخبر کرنے میں انہوں نے جو کام کیا وہ اس تحریک کے پھیلانے کے لئے بے حد کار آمد ثابت ہوا۔ "ادب اور زندگی" کی اشاعت کا فوری اثر یہ ہوا کہ اردو ادب میں ہرجائی معشوقوں کی کمی ہونے لگی۔ رقیب اور عاشق دونوں پھانسی لگا کر مرنے لگے، فراقِ یار کے نالے اور آہیں دھیمی پڑ گئیں اور اب اس میں ایسے کردار پیش ہونے لگے جو چلمن کے پیچھے بیٹھ کر جھلک دکھلانے کی بجائے اس دیس کی سڑکوں، گلیوں اور کھیتوں میں گھوم پھر کر اپنے دکھ درد کی کہانی سناتے تھے۔

"ادب اور زندگی" کی اشاعت کا بڑا مقصد بھی یہی تھا کہ ادب کو اپنے ماحول سے متعلق دکھایا جائے اور جتلایا جائے کہ ادب اور زندگی کے مقاصد ایک ہیں۔ اس مقالے کی تاثیر اور شہرت کے اسباب کی تلاش کچھ اتنی مشکل نہیں۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ نظر آئے گی کہ اس دور کے ہندوستانی ادیب، ادب کا کوئی واضح تصور نہ رکھنے کے باعث اپنے آپ سے مطمئن نہ تھے۔ دل میں جذبات کا ہجوم ہو اور اندھیرے میں راستہ نہ سوجھتا ہو ایسے میں کوئی مشعل جلا کر دوسروں کو راہ دکھا دے تو اس کی ہمت پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مشعل کی جوت ایسی شفاف اور سہانی تھی کہ نہ صرف ہندوستانی ادیبوں کو اپنی منزل کی جھلک نظر آنے لگی بلکہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر زندہ قوم کا ادبی قافلہ کس جانب رواں ہے۔ کہاں پیشہ ور ادیبوں کی خود پسندی اور "ادب برائے ادب" جیسا مہمل نقطۂ نگاہ اور کہاں اختر رائے پوری کی انسان دوستی اور "ادب برائے زندگی" کی مجاہدانہ صدا۔

"ادب اور زندگی" کی اشاعت کے بعد ہندوستانی ادب کے دھارے میں ایک عظیم تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے۔ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے تاریخی جلسے میں جب ہندوستانی ادیب ادب کے مقاصد کی توضیح کرنے کے لئے مل بیٹھے تو ظاہر ہو گیا کہ اب ہندوستانی ادب کے مڑتے ہوئے دھارے نے اپنے جوش کا مظاہرہ کرنے کے لئے نیا میدان تلاش کر لیا ہے۔ اس جلسے میں اختر رائے پوری نے "ادب اور زندگی" کے نعرۂ انقلاب کی تجدید کی اور کھلے الفاظ میں اعلان کیا —

"ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری زندگی کدھر جا رہی ہے، اور اسے کدھر جانا چاہئے۔ ادیب انسان بھی ہے اور اسے سماج کی ترقی کے لئے امداد کرنا ہی ہے جو ہر انسان کا فرض ہے

انسانیت کے نام پر ہم پوچھتے ہیں کہ آج جب ترقی و تنزل کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ ہو چکی ہے، ادب اپنے آپ کو کیونکر غیر جانبدار رکھ سکتا ہے؟ کیا حسن، آرٹ، شعر و نغمہ بن کر وہ کارزارِ حیات سے راہِ فرار اختیار کر سکتا ہے؟ کیا وہ واقعہ نگاری کی فصیل پر بیٹھ کر انقلاب و رجعت کی طاقتوں کی تصویر لے سکتا ہے؟ احساس ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے، تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حالِ زار ہمیں کیوں نہیں کچھ کہہ سکتا ہے؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ سمجھ کر سماج کے چہرے سے بیکاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے جائیں تو شاید کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہونا چاہئے کہ کن سے کہے اور کس طریقہ سے کہے۔ چنانچہ ہندوستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع واجب اور جائز ہے کہ وہ یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی کی مسلسل تغیر و تبدل کی کہانی ہے۔ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے، اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور جو بنی نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ ان سطور میں ادیب اور ادب دونوں کو انانیت اور خود بینی کے حجروں سے نکال کر زندگی کے بھرے میلے میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہیں سے ادب اجتماعی زندگی سے آشنا ہوتا ہے، انسانیت کے دکھ درد کو کہتا سنتا ہے، قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی کی یگانگی اور وحدت کا پیغام سناتا ہے اور ان تمام عناصر کے مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے، جو زندگی کو محدود اور تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کرنا چاہتے ہیں ـــ یہ وہی صدائے حق ہے جسے روس میں میکسیم گورکی اور پرلش کرو یا، فرانس میں رومان رولاں اور ہندوستان میں قاضی نذر الاسلام نے بلند کیا اور یہی وجہ ہے کہ ان فنکاروں کے آرٹ میں زندگی کی ایسی جوت جگمگا رہی ہے، جو غم زدہ انسانوں کے کتنے ایک دلوں کو جلا بخشتی ہے، اور محبت کے ساتھ ان کے دکھ درد کی دوا کرتا ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ اختر رائے پوری کا نظریۂ ادب کسی دل جلے کی پکار نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں روشنی کی وہ لکیر نظر آتی ہے جو ماضی کا رشتہ حال سے اور حال کا ناتا مستقبل سے جوڑتی ہے۔ اپنے وسیع سیاسی، معاشی اور ادبی مطالعے کی مدد سے جب ہمارا نقاد ہند قدیم اور ہند جدید کے ادب کا تجزیہ کرتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بے چین لہر ٹھہرے ہوئے پانی میں تلاطم برپا کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے، ایک عظیم قوت ادبی مزاج سے نبرد آزما ہونے کے لئے میدان میں آگئی ہے، جو اب کہ اس دیس کے ادب کی بے حسی اور بے راہ روی کو بہا لے جائیگی۔ چنانچہ حقائق کو ایک نظر دیکھ کر دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ یہ توقع غلط نہیں ثابت ہوئی۔ ہندوستانی ادب میں آج جو خوش آئند تبدیلیاں نظر آتی ہیں، وہ اختر کے ادب اور زندگی ہی کی مرہونِ منت ہیں، ہند جدید کے ادب کا معاشی تجزیہ دراصل اختر کے اس قول کی صحت کا ثبوت ہے کہ ادب درحقیقت اپنے ماحول کی نمائندگی کرتا ہے۔

پریم چند جب مزدوروں کو زندگی کی جد و جہد کا پیغام سنانے کی بجائے سرمایہ داروں کے من میں ہمدردی کی جوت جگمگانے کی توقع کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیگور کی طرح انہیں بھی اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ ایک طرح سے یہ ادیب کے عجز کا اظہار ہے کہ وہ اپنی منزل پر پہنچنے کی بجائے تھک ہار کر راستے ہی میں کہتا ہوا بیٹھ گیا۔ کیوں نہ سمجھ لوں کہ میں اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ من کے سنسار میں کیسے تبدیلی ہو سکتی ہے، ہزار کوشش کے باوجود پریم چند کی

سماج کا اصل ہے، پھر کسان اور مزدور، زمینداروں اور سیٹھوں کے دل کی تاریکی پگھلنے کی توقع میں کیوں بیٹھے رہیں، سوال یہ ہے کہ زمیندار و کارخانہ دار اور کسان و مزدور کی تمیز ہی کیوں باقی رہے، کیوں نہ پیداوار کے ذرائع پر پورے سماج کا قبضہ ہو، اور اس کی تقسیم مساوات کے اصول پر ہو۔ ادب جب زندگی کا ترجمان اور رہنما ٹھہرا، تو کیا وجہ ہے کہ وہ انسان کی صحیح رہنمائی کرنے کی بجائے اسے قسمت اور صبر کی افیون کھلاتا رہے ـــ

"ادب اور زندگی" کا مصنف ایسے ادب کا سخت مخالف ہے، جو حقیقت کا سامنا ہوتے ہی راہِ فرار ڈھونڈنے لگتا ہے۔ ادب دراصل حقیقت کا جویا ہے۔ پھول کے حسن اور خوشبو کی تعریف کرتے ہوئے وہ کانٹوں کی بیدردی جتلانا نہیں بھولتا۔ اسی طرح جب وہ بلبل کے نغمے کا ذکر کرتا ہے، تو اس کی دلربائی کے ساتھ سوز و درد کی داستان سنانے سے نہیں چوکتا۔ پھر یہ کیوں ہو کہ ادیب ظالم کو نیست و نابود کرنے کی بجائے مظلوم کو بہلانے میں اپنی قوت صرف کرے۔ ہندوستانی ادیبوں کی بے راہ روی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نہ تو وہ اپنے ماحول سے متعلق کوئی واضح تخیل اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور نہ انہیں اپنی شخصیت پر قابو تھا، ورنہ ممکن نہ تھا کہ خالص فرقہ وارانہ جذبات کے زیر اثر ناول لکھے جاتے اور شعر کہے جاتے، یا گھبرا کر ماضی سے لپٹنے کی بے سود تمنا میں آرٹسٹ کی قوت کا بیشتر حصہ برباد ہوتا۔ اختر کے نقطۂ نگاہ سے ایسا ماحول سچے ادب کی تخلیق کے لئے موزوں نہیں ـــ "سچے ادب کی تخلیق صرف اسی وقت ممکن ہے جب شخصیت ماحول کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر حق کے اذن پر لبیک کہے۔ ماحول کو بدلنے سے پہلے ہمیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا لیکن ہم ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ ہماری شخصیت نے ایثار کا سبق نہیں پڑھا۔ وہ ضبطِ نفس سے بیگانہ ہے۔ وہ خودی کی کیچلی میں دبی ہوئی ہے۔ اس پر تن آسانی نے چربی کی تہیں چڑھا رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو کچھ ہم لکھتے ہیں، اس میں حقیقت نہیں ہوتی، وہ کذب و افترا کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اور اگر ہماری طبیعت حق کی طرف جاتی ہے تو ماحول سے نامانوس ہو کر نامراد رہ جاتی ہے ـــ"

'ادب اور زندگی' کی اشاعت کے بعد اس موضوع پر اتنے مضمون لکھے گئے کہ ناظر کو "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" کا خیال آنے لگا۔ ہر ادبی حلقے میں اس مسئلے پر بحث اور نکتہ چینی کا سلسلہ چل نکلا، رجعت پسند طبقہ بگڑنے لگا، اور نئے ادیبوں نے مصنف کے خیالات کو مشعلِ راہ بنا کر اس طرحِ نو کی بنیاد ڈالی جو بعد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۹۳۵ء سے لیکر ۱۹۴۳ء تک اختر رائے پوری نے باقاعدگی سے ہندوستانی ادب کی راہنمائی کے لئے متعدد مضامین لکھے۔ ان میں وہ تبصرے اور تبصرے بھی شامل ہیں جو وہ ا خ ر کے نام سے انجمن ترقی اردو کے مشہور رسالہ اردو میں لکھتے رہے۔ ان میں سے کچھ مضامین "ادب اور انقلاب" کے نام سے مجموعے کی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ یہ مضامین اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ انہوں نے ادب میں زندگی کا تنقیدی احساس پیدا کیا، اور قدروں کو جانچنے کے لئے ادیب کو ایک سماجی معیار سے آشنا کیا۔ "ادب اور زندگی" کے بعد "ادبی ترقی پسندی کا صحیح مفہوم"، "اردو شاعری میں عورت کا تخیل"، "جنگ اور ادب" اور "اردو ادب کے جدید رجحانات" اسی سلسلے کی مضبوط کڑیاں ہیں۔ پچھلے دس سال میں ہندوستانی تنقید نگاری کی جو کایا پلٹ ہوئی وہ براہِ راست

انہی مضامین کی اشاعت کا نتیجہ ہے۔

اختر ایک آئیڈیلسٹ نقاد ہے۔ وہ اس تکلیف دہ احساس کے ساتھ مضمون لکھتا ہے کہ ہندوستان میں صحت مند ادب کی تخلیق کے امکانات نہیں تھے۔ یہ احساس اس کی تحریر میں بلا کا جوش اور دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔ اس حقیقت کو جتلا کر کہ ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے، وہ سچے ادب کی قدروں کا تعین کرتا ہے، ان قدروں کی جڑیں زندگی کے بنیادی جذبات میں پیوست ہیں۔

اس کسوٹی پر جب وہ ہندوستانی ادب کو پرکھتا ہے تو اسے اپنے آئیڈیل کی تصویر کہیں نہیں ملتی۔ اس کے ذوق و شوق اور بلند نظری کا یہ عالم ہے کہ وہ اس دیس کی دو عظیم ادبی شخصیتوں ٹیگور اور اقبال تک سے مطمئن نہیں۔ ان کے آرٹ کی عظمت کا وہ قائل ہے، مگر نئے دور کے نئے تقاضوں سے آنکھ چرا کر عہد گزشتہ کی کمیں گاہوں میں پناہ کی تلاش کو وہ مطعون قرار دیتا ہے۔ زندگی کے حقائق سے گریز کے اس رجحان کو نظر انداز کرنا اس کے مسلک کے خلاف ہے۔ یاد رہے کہ اس مرحلے پر ادبی حلقوں میں اختر کے خلاف بڑی شورش پیدا ہوئی مگر وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس طوفان کو سہہ گیا۔ اپنے خواب کی تعبیر اگر اسے کسی فنکار میں نظر آتی ہے تو وہ نذرالاسلام ہے جس کی شاعری اس کسوٹی پر پوری اترتی ہے جہاں ادب ظالم کے لئے تلوار اور مظلوم کے لئے صور بیداری کا کام دیتا ہے۔ اختر کے تنقیدی شعور میں گہرائی اور پختگی اور اس کی تنقید میں ضبط و توازن کی حیرت انگیز ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ مصنف کے مطالعے کی وسعت، تجربے کی گہرائی، خیالات کا ستھرا پن اور انداز بیان کا وہ نکھار ہے جو اس کی تحریر میں جابجا جھلکتا ہے۔ اس کا خلوص اور تجسس، جس کی کوئی انتہا نہیں، ان خوبیوں کو جلا دیتا ہے۔ ہر ادبی تحریک میں اس کی باریک بین آنکھ پس منظر کے مدھم سے مدھم نقش کو دیکھ لیتی ہے اور حقیقت نگار قلم، بے کمال خوبی سے اجاگر کرتا ہے۔ "ادب اور انقلاب" میں مکمل چھان بین کی یہی صفت ہر موقعے پر آشکار رہتی ہے اور اختر کو ہندوستان کے منفرد نقاد کے روپ میں پیش کرتی ہے۔

سوویٹ روس کے ادب پر اختر کا جامع مقالہ اردو تنقید کے شاندار مستقبل کی خبر دیتا ہے۔ یہاں اردو تنقید کی کم عمری اور کوتاہیوں کا شدید احساس اور یہاں اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ اب اس میں دنیا کی دوسری زبانوں پر بھی کامیاب تنقید کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے! موضوع کی وسعت کے مقابلے میں مصنف کا اختصار دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک پورے ملک کے ادبی ارتقا کی ایسی مکمل تصویر چھوٹے سے چوکھٹے میں کیونکر سما گئی۔

حق تو یوں ہے اختر کی تنقید کے سر قبول عام کا سہرا باندھا ہے، ان میں طرز بیان کا وہ حسن اور رسائی بھی شامل ہے جس نے اسے پُر بہار بنا دیا ہے، اس کی مثال ہمیں بنگال کا باطنی شاعر میں ملتی ہے۔ یہ مضمون گو نذرالاسلام کی شاعری سے متعلق لکھا گیا ہے، مگر مصنف کے جوش عقیدت اور خلوص نے نثر میں بھی شعر و نغمہ کے رنگارنگ پھول کھلا دیئے ہیں۔ پورے مضمون میں ایک آفاقیہ رنگین نظموں سی رعنائی پائی جاتی ہے۔ ہندوستانی تنقید میں ایسے دلربا مضمون کی مثال کہیں نہ ملے گی، جہاں نقاد فنکار کے اس قدر قریب آ گیا ہو کہ اس کے احساسات کی خفیف سے خفیف تھرتھری کا نظارہ بھی دکھانے میں کامیاب ہو جائے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں تنقیدی شعور کے ساتھ کی وسعت اور گہرائی میں بیکرانی پیدا ہوتی ہے اور تنقید اپنی معراج کو پہنچتی ہے۔

یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ صرف یہی ایک مضمون اختر کو ہندوستان کے نقاد کا درجہ دلانے کے لئے کافی ہے۔

دنیا کی ہر زندہ زبان میں ترجمے کو خاص درجہ حاصل ہے، اس اعتبار سے اسے بھی ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ بہت ہی مشکل کام ہے۔ فن کار کو ادب کی تخلیق میں یقیناً جگر خون کرنا پڑتا ہے، مگر مترجم کو اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فن کار سے بھی زیادہ پتّہ مارنا پڑتا ہے۔ اس کی مشکلات کی انتہا نہیں جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اس کے تار و پود سے باخبر ہونا اس کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اپنے دیس کی زبان سے۔ کوئی ترجمہ اسی وقت کامیاب کہلائے گا جب مترجم کا رباب فن کار کے گیت کا پوری طرح ہم نوا ہوگا۔ یاد رہے کہ جب تک وہ مصنف کی روح کی لرزش محسوس نہیں کرتا، اس کے جذبات و احساسات کے دھارے میں نہیں بہتا اور اس کی تحریر کے ہر انداز کو نہیں پہچانتا، اس کے ترجمے اور اصلی تحریر میں وہ مکمل ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی جو کامیاب ترجمے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اردو میں ترجموں کی ویسے ہی کمی ہے، اگر اس کسوٹی پر پرکھئے تو گنے چنے تراجم ہی معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ اس میدان میں ظفر علی خاں جیسے پُر تکلف بزرگوں کا سکہ چلتا تھا۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے تراجم کا یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا اور مولوی عنایت اللہ اور ڈاکٹر عابد حسین جیسے باکمالوں نے اردو ترجمے کا سنگھار نکھار شروع کیا۔ تراجم کے لئے صحیح کتابوں کی دیکھ بھال شروع ہوئی، زبان و بیان کی اونچ نیچ کو مد نظر رکھا جانے لگا اور کوشش کی گئی کہ مترجم کی بے راہروی سے مصنف کی تحریر کا خون نہ ہو۔ اس سلسلے کی تکمیل موجودہ دور میں اختر رائے پوری کے ان تراجم سے ہوئی جو انجمن ترقی اردو کی اسکیم کے مطابق وجود میں آئے اور انجمن نے ہی انہیں زیور طبع سے آراستہ کیا۔ اسے اتفاق نہیں بلکہ حسن اتفاق کہئے کہ ادب عالیہ کے تراجم کی جو اسکیم انجمن نے سوچی تھی اس کی تکمیل کیلئے اختر جیسے ادبی مجتہد کا تعاون حاصل ہوا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں کے اشتراک سے کس کو زیادہ فائدہ پہنچا، مگر اردو ترجمے کی خوش قسمتی میں کلام نہیں کہ اختر جیسا گوہر نایاب اس کے ہاتھ لگ گیا۔ اب تک جو ادبی شاہ پارے اختر کے ذریعے اردو میں منتقل ہو چکے ہیں، ان میں کالی داس کا مشہور ناٹک "شکنتلا"، نذرالاسلام کی نظموں کا مجموعہ "پیام شباب"، "گورکی کی آپ بیتی" اور پرل بک کا شہرت یافتہ ناول "پیاری زمین" (GOOD FAITH) شامل ہیں۔ ان تراجم کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اردو ترجمہ مدت سے جس انقلاب کی راہ دیکھ رہا تھا اس کا آغاز ہو گیا ہے، یہاں تعجب خیز ہے کہ ہندوستانی تنقید اور ادب کی طرح اردو ترجمے میں انقلاب کی بنیاد بھی اختر رائے پوری کے فراست شکن ہاتھوں سے رکھی گئی۔

ہمارے دیس میں اس آمر انقلابی کی شخصیت اس جوہر کی سی ہے جو ادب کی دیوی کے روپ کو نئی شان سے جگمگا رہا ہے۔

اختر کے تراجم کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں کے جو شاہکار اس نے اردو کے سینے میں اتارے ہیں، ان میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ ان فن پاروں میں کالی داس، بنکم گورکی، بہل بک اور نذرالاسلام جیسے بین الاقوامی شہرت کے ادیبوں نے اپنی صناعی کا پورا کمال دکھایا ہے۔ اس اعتبار سے مترجم کو جن مشکلات سے واسطہ پڑا ہوگا ان کا اندازہ ممکن نہیں، مگر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی قیامت خیز قوت کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ٹھہرتی، ایک سیلاب کی طرح وہ ہر بلند و پست پر چھا جاتا ہے۔ وہاں عظمت کے نقش کو اور بھی گہرا کر دیتا ہے۔

کالی داس کی شکنتلا کا ترجمہ براہ راست سنسکرت سے کیا گیا ہے۔ سنسکرت اور اردو کی فطرتوں میں وہی فرق ہے، جو بقول مرحوم کسی مالوا کے پنڈت اور لکھنؤ کے میرزا میں ہو سکتا ہے، اور سنسکرت بھی کالی داس کی، جو اس بھی ہندوستانی اور دیہی و علاقائی زبان کا سب سے بڑا صاحب طرز ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ آدھی کتاب اس صاحب طرز کی مدھر شاعری سے بھرپور ہے، سنسکرت جیسی وسیع زبان کو جس میں تانک سے تالک احساسات کو حسن و خوبی سے بیان کرنے کے لئے الفاظ کا بہترین ذخیرہ موجود ہے، اردو جیسی تہی دست زبان میں گھلانا، واقعی ایک حد درجہ کٹھن کام تھا لیکن مترجم نے اسے جس خوبی سے کر دکھایا ہے، وہ داد سے مستغنی ہے،

بنکم گورکی کی آپ بیتی کو ادب عالیہ میں جو مرتبہ حاصل ہے وہ بہت کم فن پاروں کے حصے میں آیا ہے۔ اس کتاب کے ہر لفظ میں آرٹسٹ کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ گورکی کو نہ صرف اچھا احساسات کے اظہار میں کمال حاصل ہے بلکہ وہ زبان و بیان کا بھی بہت بڑا استاد ہے۔ اس کی رام کہانی زندگی کے رنگا رنگ جدلیوں کی سچی تصویر ہے اور غالباً اس کے ادبی رنگ محل کی سب سے البیلی اور عمدہ صورت ہے۔ اختر نے جس نفاست سے روسی ادب کے اس شاہکار کو اردو کے قالب میں سمویا ہے، اس کی مثال کہیں نہ ملے گی۔ مترجم یوں بھی گورکی کا شیدا[؟] ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ترجمے میں مصنف کی روح کے اس جوہر کو دکھانے میں کامیاب ہوگیا جو اس کی اصلی تحریر میں ہر جگہ جھلکتا ہے۔ گورکی کی آپ بیتی کے ترجمے میں ایسی دلفریبی اور سچائی پائی جاتی ہے کہ اس پر ترجمے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کتاب اردو میں ہی لکھی گئی ہے اور اردو بھی کیسی جس کی رعنائی اور دلکشی ناظر کی سدھ بدھ بھلانے کے لئے کافی ہے

ترجمے کا سچا روپ دکھانے کے لئے ایک دو ٹکڑے پیش کئے جاتے ہیں۔

"کبھی کبھی غروب آفتاب کے وقت آسمان میں نور کی ندیاں بہنے لگتیں اور گمان ہوتا کہ ان میں آگ لگ گئی ہے، باغ کے مخملی سبزہ پر آتش بار مینہ کی بارش سی ہونے لگتی تھی اور رفتہ رفتہ ہر شے یک گونہ تاریک ہو کر وسیع تر ہو جاتی ہے۔ پھول سی جاتی، اس وقت جب کہ شام کی لالی گہری ہو جاتی تھی، دھوپ میں جھلس کر پتیاں مرجھا جاتی تھیں اور گھاس کے تنکے سر جھکا لیتے تھے، ہر چیز زیادہ نازک معلوم ہوتی، اور ایسی مہک پھیلانی، جو موسیقی کی ترنگیں کھیتیوں سے اٹھ کر آتیں جہاں لوگ رہ رہ کر کچھ بجانے لگتے تھے، رات آتی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دل کے پیالے کی سی شگفتگی اور حیات آفرینی پیدا ہونے لگتی، ستارے نے اپنے گرم و گداز ہاتھوں سے دل کو تھپکی دی، اور سارے گرد و غبار کو دھو کر وہ سب کچھ بھلا دیا جسے بھول جانا چاہیے، چت لیٹے ہوئے آسمان کی نامحدود گہرائی ——— ایسی گہرائی جو اپنی ہر بلندی میں ستاروں کی ایک نئی محفل سجاتی ہے۔ ستاروں کی چمک دمک کے نظارے میں کیسا مزا ملتا تھا اور اس موقع پر اگر زمین پر قدم رکھو تو گمان ہوتا ہے کہ یا تو دنیا سمٹ گئی ہے، یا تم بہت بڑے ہوگئے ہو، اور اپنے ماحول میں سمائے جا رہے ہو، لمحہ بہ لمحہ تاریکی اور خاموشی بڑھتی جاتی ہے، تاہم نہایت ہی دھیمی اور ناقابلِ احساس آوازوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور ہر آواز ——— خواہ وہ کسی بلبلِ خوابیدہ کا ترانۂ نیم شب ہو یا کسی خرگوش کا سراسیمہ خرام یا کسی انسان کی زیرِ لب گفتگو ——— دن کی آوازوں سے قطعاً مختلف ہے، ایک خاص نرالا پن اس کے حساس سکون کے پیچھے چھپا رہتا ہے"۔

چلتے چلاتے اردو میں بنگال کے باغی شاعر نذرالاسلام کے تعارف کا ذکر ضروری ہے، جو تراجم کے سلسلے میں اختر کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ "پیامِ شباب" کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے نرم و نازک جذبات کے ساتھ ساتھ انقلاب کے آتشیں ترانوں کو بھی پوری کامیابی سے اپنے فنی طلسم خانے میں سجا سکتا ہے، مثال کے طور پر ایک نظم کا مختصر سا ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے۔

میں دھرتی ماتا کی سرکش اولاد ہوں
اس قدر سعادت فروش اور وفا ناآشنا کہ میں اسے اسی کے آتش جہنم
میں جھونک دوں گا،
اس آگ کو میں تباہی کے پنکھے سے ہوا دوں گا، یہاں تک کہ زمین و آسمان
اس میں جل کر خاک سیاہ ہو جائیں گے،
میرے ہاتھوں میں مصائب و آلام کی مشعل روشن ہے۔
یک آواز تم سب کہو،
"تو سراپا بدمعاش ہے، تو شیطان ہے، تو مالکِ اجل ہے،
نہ تو کسی سے ڈرتا ہے، نہ تجھے کوئی مار سکتا ہے،
تو قیامت کا پیامبر ستارۂ تخریب ہے،
تو دیوانگی اور وحشت کی روشنی ہے،
تو دجال ہے، تو قہر و غضب کا دیوتا ہے،
بجا اور درست! ہاں ہاں۔ میں نقیب قیامت ہوں،
میں ستارۂ تخریب ہوں ———"

(باقی آئندہ)

یہ مضمون "ایشیاٹک ریویو" بابت اپریل ۱۹۴۴ء میں اور بعد میں اس کا فارسی ترجمہ جلہ "روزنگار نو" لندن میں شائع ہوا تھا۔

کچھ ایران کے بارے میں

ایچ - ڈی
(گریوز لا)

گذشتہ دو ایک سال میں انگلستان میں ایران سے متعلق بہت سے اہم اور معلوماتی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ مضامین پڑھے ہیں وہ ضرور اس نتیجہ پر پہنچے ہوں گے کہ ایران کے حالات تسلی بخش نہیں ہیں۔ ایران کئی سیاسی، مالی اور معاشی مشکلات کے باوجود، جو باہری افواج (اتحادی ہی کیوں نہ ہوں) کے طویل قیام کے سبب زیادہ سنگین ہو گئی ہیں جمہوری طرز حکومت قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے اور ایران کے عامۃ الناس، بلکہ ان کے بعض رہنما بھی شکست، تذبذب بلکہ قنوط کے احساسات میں گرفتار ہیں۔

یہ سب مسائل حقیقی اور یہ سب مشکلات اہم ہیں۔ لیکن ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے انھیں نظر انداز کر دیں اور ہو سکے تو اس بات پر غور کریں کہ اس وقت ایران اور ایرانیوں کے دل و دماغ پر کیا کچھ گذر رہا ہے اور ایران کے سیاسی، بین الاقوامی یا انتظامی وجود پر نہیں بلکہ اس کے روحانی وجود پر نظر ڈالیں۔ ایرانی جرائد پڑھنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایران جو تین ہزار سال آزاد رہا اور شاندار ماضی اور شاندار روایات کا حامل ہے، اگر مرا نہیں تو ایک مہلک مرض میں ضرور مبتلا ہے، اسکا روگ اور اس کی عسرت لاعلاج ہے اور تعلیم کی کمی، بھوک اور انتظامی کوتاہیاں اسقدر سنگین ہیں کہ بہتری کی امید نہیں رہی۔ ایران کے مشہور وطن پرست ادیب آقائے رہنما نے اپنے روزنامہ ایران مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۴۲ء میں "ہم ایرانیوں کے افکار" کے عنوان سے ایک افتتاحیہ سپرد قلم کیا جس میں اس نے لکھا کہ ایسے فارغ البال ایرانی بہت کم ہیں جو کچھ سوچ سکیں، بقیہ لوازم زیست کی فکر میں الجھے رہتے ہیں اور جو فارغ البال ہیں انھیں عیش و راحت کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

کیا ہم اس مایوس کن تشخیص کو جس کی تائید ایران کے قریب قریب سب جرائد کے مطالعے سے ہوتی ہے بلا چون و چرا صحیح تسلیم کر سکتے ہیں؟ نہیں، بلکہ ہمیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ تشخیص غلط ہے۔ روزنامہ اطلاعات کے مدیر آقائے مسعودی نے ۲۱ دسمبر ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں اپنی حکومت اور ملت سے یہ اپیل کی تھی کہ یاس اور قنوط کو ترک کر کے ایران کی حیات نئی بنیادوں پر تعمیر کی جائے۔ یہ اپیل قابل عمل ہے اور اس پر عمل ہو بھی رہا ہے۔

اگرچہ ایران کے مقابلہ میں بہت سے یورپی ممالک کے مصائب کہیں زیادہ سنگین ہیں تاہم اس میں کلام نہیں کہ ایران ایک تاب آزما دور میں سے گذر رہا ہے لیکن ایران کی طولانی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ یہ قوم زندہ رہنے پر تلی ہوئی ہے۔ قدرت نے اس قوم کو بڑی قوتیں عطا کی ہیں اور اب اس میں بیداری فکر اور تجسس کے بہت سے آثار پائے جاتے ہیں۔ ان باتوں کے پیش نظر یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی صلاحیت مر گئی ہے یا مر سکتی ہے۔

جہاں تک ایران کے دل و دماغ کے ارتقا کا تعلق ہے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایران کو دفعتاً بیسویں صدی میں چھلانگ مارنا پڑی۔ ہماری (اہل مغرب کی) یہ خوش قسمتی تھی کہ ہم نے نہ صرف تعلیم بلکہ ذہنی تفریح کے تمام مدارج دھیرے دھیرے طے کئے۔ سائنس پردازی، ناول نگاری، تھیٹر۔ یہ سب اٹھارویں اور بیسویں صدی میں آہستہ آہستہ پروان چڑھے۔ سنیما مغرب میں ایران کی طرح دفعتاً ظہور میں نہیں آیا۔ تھیٹر سے خاموش فلم، خاموش فلم سے متحرک فلم، یہ سب منزلیں سلیقہ اور متانت کے ساتھ طے پائیں۔ لیکن ایران میں معاملہ دگرگوں رہا ہے۔ تقریب تقریب دس سال کے اندر اندر ایران کو نہ صرف رنگین فلم بلکہ ریڈیو، فرنگی نغمہ و سرود، جدید عمارات، فرنیچر، لباس اور رسم و رواج سے دوچار ہونا پڑا۔ اسی اثنا میں اسے یکایک سب سے اہم اور دور رس انقلاب یعنی آزادیٔ نسواں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حالات میں اگر ایران بوکھلا جائے اور اپنی اقدار کا اندازہ نہ کر سکے تو چنداں تعجب کا مقام نہیں ہے۔ سخت گیر آمریت کے اچانک سقوط سے صورت حالات اور بھی بگڑ گئی۔ کہاں وہ جبر و تشدد، کہاں یہ آزادیٔ فکر و اظہار! ایرانی دماغ ڈگمگا گیا ——— وہ دن دور نہیں جبکہ اسے سکون اور توازن میسر ہو جائے گا لیکن سر دست ایران کا رد عمل کیا ہے؟ سب سے پہلے جرائد ہی کو لیجئے۔ ادھر بادشاہ اٹھا اور ادھر ہزاروں دبی ہوئی آوازیں ابھرنے لگیں۔ رات رات میں اخبارات کُکُرمُتّا کی طرح نمودار ہو گئے۔ گذشتہ دو سالوں میں طہران ہی سے ساٹھ ستر اخبارات شائع ہونے لگے۔ آج بھی چالیس سے تو زیادہ ہوں گے۔ یہ اخبارات کیا کہتے ہیں؟ بہت سے ایڈیٹر جانا ادیب ہیں لیکن جو ایرانی اخبارات انگلستان آ رہے ہیں ان کا واسطہ تو زیادہ تر سیاسیات، سماجی اور معاشی مسائل اور دنیا کی خبروں سے ہے جن نے

روزنامہ ایران (جسکا ایڈیٹر آقائے رہنما ہے) کے چار تازہ شمارے اجمل بھیجے ہیں۔ ان کے افتتاحیوں کے موضوع یہ ہیں:۔ افیون اور شراب کے خلاف جنگ، تکرہ یلیلیون کے مملہ کی شکایات، ایرانی کالجوں کی تعلیم، اگست سنہ ۱۹۴۱ء (جب اتحادی افواج ایران میں داخل ہوئیں اور رضا شاہ تخت سے دست بردار ہوا) کے باعث عبرت واقعات۔ یہ سب موضوع اہم اور مضامین فکر انگیز ہیں۔ لیکن اگر بڑے سے بڑے ایرانی اخبار کو چھان ماریں تو بھی اتا دکا مضمون ایسے ملیں گے جو کسی عام ثقافتی موضوع سے متعلق ہوں یا کہیں کتابوں پر تبصرے ہوں یا کوئی ادبی مباحثہ ہو یا مراسلات کے ذریعہ روزمرہ کی دلچسپی کے واقعات پر اظہار خیال کیا گیا ہو یا سینما کے کھیلوں یا ریڈیو کی خبروں کے بارے میں کوئی دلچسپ اور تیکھی تنقید ہو۔ ان اخبارات کی تعداد اشاعت کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پرچے خریدے کم جاتے ہیں اور لوگ عام طور پر ایک دوسرے سے لیکر پڑھتے ہیں۔ اس سے یہ خیال آتا ہے کہ اگر کم اخبارات چھپیں تو نہ صرف یہ کہ کاغذ کی زیادہ کھپت اور طباعت میں بھی زیادہ آسانی ہوگی بلکہ ادبی ذوق زیادہ مستقل قسم کی ادبیات کی تخلیق میں صرف ہو سکیگا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے:۔ کیا ایرانی اخبارات عام لوگوں کو پہنچتے ہیں۔ یا لوگوں کے دل و دماغ کا انعکاس ہیں یا ان کی رہنمائی کرتے ہیں یا ان کے تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں؟ کیا ایران میں عوامی اخبار ہیں؟ کیا کوئی عوامی ادب بھی ہے؟ کیا حجازی کے لطیف مزاحیہ مضامین یا مسعود فرزاد کی سنجیدہ تنقید یا برق آسا مزاح یا جمال زادہ اور ایسے ہی اوروں کے افسانے عوام تک پہنچتے ہیں یا محض خواص تک؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایران میں نہ عوامی اخبارات ہو سکتے ہیں نہ عوامی ادب، اس لئے کہ عوام ان پڑھ ہیں۔ ایران کی تمدنی زندگی میں داستان گو کو صدیوں سے ایک ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔ بچوں کے لئے طلسماتی یا دیگر قسم کی کہانیاں نہیں چھپتیں اور دان کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہر دایہ یا نانی یا دادی کو ایسی ہزاروں کہانیاں ازبر ہیں۔ لیکن داستان گو اور دایاں اب ناپید ہو رہی ہیں۔ اب ان کی جگہ کون لے؟ کیا یہ امید افزا علامت نہیں کہ بچوں کا رسالہ نونہالان جو حال ہی میں طہران سے شائع ہونے لگا ہے اسکی ہفتہ وار اشاعت بیس ہزار ہو گئی ہے؟ پہلی مرتبہ اب ایرانی لڑکے اور لڑکیاں رابرٹ آف ہنزود ایسی ہمت افزا کہانیاں ایرانی زبان میں پڑھنے لگی ہیں۔ وہ دن دور نہیں کہ ایرانی خود اپنے طبعزاد رومان لکھیں گے اور شاید کوئی ایرانی دہشتناک اور پُر اسرار جاسوسی کہانیاں بھی لکھنے لگے۔

ایران اپنی صدیوں پرانی ادبی ثقافت اور روایات کے باوصف کیوں اسقدر پسماندہ ہے؟ اسکا جواب آقائے جمال زادہ نے اپنے افسانوں کے مجموعہ "یکی بود یکی نبود" کے دیباچہ میں دیا ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ سالہا سال کی مستبدانہ طرز حکومت کے باعث معدودے چند فکر اور ثقافت کے ارتقاء سے مستفید ہو سکے جو نتیجے اس نے نکالے ہیں کم از کم ان کی صحت میں کلام نہیں۔ یعنی یہ کہ تعلیم عامہ نہ ہونے کے باعث، ایرانی ادیبوں کا روئے سخن خواص کی طرف رہا ہے نہ کہ عوام کی طرف۔ معدودے چند لوگ ادب سے مستفید ہو سکتے تھے اور ادب اور بول چال کے محاوروں میں وسیع فرق ہے۔ ان نتائج کی بنا پر وہ یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ تعلیم عامہ کے علاوہ ایران کی سب سے بڑی ضرورتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اظہار خیال ایسی زبان میں کیا جائے جسے عوام سمجھ سکیں اور ایسے محاورے استعمال کئے جائیں (مثلاً ناول میں) جن سے عوام لطف اندوز ہو سکیں۔ اس کی رائے میں ناول ایرانی ثقافت کا مضبوط ترین مظہر ہے۔ "یکی بود یکی نبود" میں اپنے نظریہ کو وقاویز اور مزاحیہ انداز میں عملی جامہ پہنایا ہے۔ صادق ہدایت ایک اور افسانہ نگار ہے جو ایرانی ادب میں اپنے لئے تیزی سے ایک مخصوص جگہ بنا رہا ہے اور جس کے بارے میں بحث ہو رہی ہے۔ ایک غیر ملکی کا ایرانی ادب میں اس افسانہ نگار کے موجودہ یا آئندہ مرتبہ کا اندازہ لگانا اس کی جسارت بلکہ حماقت پر محمول ہوگا۔ کیونکہ نہ صرف اس کے طرز نگارش بلکہ اس کے افسانوں کے متن کے بارے میں ارباب تنقید و نظر کی رایوں میں شدید اختلاف ہے۔ البتہ میں اتنا کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ ہدایت بہت لکھتا ہے، اور جو کچھ لکھتا ہے اس میں اپج اور جاذبیت ہے، تخیل اور دقت نظر ہے۔ اگرچہ وہ اکثر و بیشتر جن کرداروں اور جس ماحول کو پیش کرتا ہے وہ ایک غیر ملکی کے لئے اجنبی ہے تاہم ان کے غم و الم اور ان کے پیچھے گہری اور ناقابل فراموش حقیقتیں نظر آتی ہیں۔

ہدایت بہت بڑا ادیب ہے یا محض سیدھا سادہ ٹکنیک، یا وہ ایک خوشگوار حادثہ ہے۔ یہ چنداں اہم سوال نہیں ہے۔ اہم سوال تو یہ ہے۔ اور جسکا جواب ہمیں دل سے مطلوب ہے۔ کیا ہدایت ایک جداگانہ انوکھی ہستی ہے یا نہیں؟ کیا وہ ایران کے نئے مکتب افسانہ نگاری کا پیشرو ہے یا نہیں؟ یہ ایک صحت مند علامت ہے کہ ایرانی اس مسئلہ میں دلچسپی لے رہے ہیں اور بحث و تمحیص ہو رہی ہے۔ اس وقت ایران میں ہدایت ایسے افسانہ نگار بہت کم ہیں اور صرف اسی بنا پر اسے کسی لحاظ یا معیار سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں ماہنامہ "سخن" (طہران) جاری ہوا جسمیں ہدایت کے مضامین برابر شائع ہوتے ہیں۔ اس ماہنامہ میں نہ صرف تعلیمی، معاشی، تاریخی اور فلسفی مضامین بلکہ انگریزی، جاپانی، چینی اور امریکی نظموں کے ترجمے، موسیقی اور ادبی تنقید سے متعلق مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ اسکی ہر اشاعت میں حیات ایران کی تجدید کی خواہش پائی جاتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایران کے چوٹی کے ادیبوں فردوسی، حافظ، رومی، نظامی، سعدی۔ جو صدہا سال سے ایرانی قوم سے خراج عقیدت لیتے رہے ہیں، کی اب کیا حیثیت ہوگی؟ کیا ان کے شاہکار کسی عجائب خانے کی زینت بن کے رہیں گے یا اس دور میں بھی ان کا کوئی عمل دخل ہوگا؟ کیا انکے معیار طاق نسیاں میں ڈالدیئے جائیں گے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ برعکس اسکے یہ سرمایۂ ادب ایران کی حیات ملی کا جزو رہیگا۔ نہ صرف ادب عالیہ کے صحیح نسخے بڑی کاوش سے مرتب کئے جارہے ہیں بلکہ بہت سی فراموش شدہ تصنیفات کو منظر عام پر لانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ قدیم تصانیف کے بیشمار نسخے تدوین اور اشاعت کے منتظر ہیں۔ "سخن" کے ایڈیٹر آقائے خانلری نے کئی پرمغز مضامین سپرد قلم کئے ہیں جن میں اس نے قدیم اور جدید ادب کا موازنہ کیا ہے۔ اس نے آجکل کے بھونڈے ادبی مذاق اور فرنگی معیار اور ادب عالیہ سے ناواقفیت کی سخت مذمت کی ہے۔ لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ قدیم شاہکار ادب کے حرف آخر نہیں ہیں اور ان کے طرز فکر و بیان کی غلامانہ تقلید دور حاضر کے حقائق کے منافی ہے۔ اسکا یہ کہنا تو تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ عصر ماضی کے سب بڑے ادیب اپنے زمانے کے عوام کی زندگی اور افکار سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ کم از کم سعدی پر جو اب بھی ایرانی فکر و دانش کا زندہ مجسمہ ہے، یہ اعتراض عائد نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس حد تک تو آقائے خانلری سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ زمانے نے ادیب اور قاری کے باہمی تعلق میں گہری تبدیلی پیدا کردی ہے۔ اگرچہ ایران میں تعلیم عامہ کے دس سالہ منصوبہ کے اجرا کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن پڑھے لکھوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ اب ادیب اور قاری کے خیالات میں ہم آہنگی ضروری ہوگئی ہے۔ یہ سب صحیح، لیکن ان پڑھوں تک کیسے پہنچا جائے؟ ریڈیو اور سینما نے افکار، تفریح اور ثقافت کی تعلیم کی نئی راہیں نکالدی ہیں جو بڑا انقلاب ہے۔ جو لوگ ڈرامے یا افسانے نہیں پڑھ سکتے وہ ریڈیو پر سن سکتے ہیں۔ اس سے ان کا شوق بڑھتا جائے گا۔

طہران ریڈیو اپریل ۱۹۴۰ء میں کھلا اور اب روزانہ ساڑھے آٹھ گھنٹے کا موزوں پروگرام پیش کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایران میں ریڈیو سٹ بہت ہی کم ہیں لیکن ریڈیو سننے کا شوق اسقدر بڑھ رہا ہے کہ سٹ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوجائے گا۔ جن ان پڑھوں کو ریڈیو سننے کا موقعہ نہیں ملتا ان کے لئے سینما ہے۔ اسوقت ایران میں چالیس ایک سینما ہیں جن میں سے زیادہ جدید قسم کے طہران میں ہیں اور بقیہ دوسرے بڑے بڑے شہروں میں۔ کوئی نصف درجن گاڑیاں جن میں سینما دکھانے کا سامان ہوتا ہے سال بھر دیہاتوں میں گھومتی پھرتی اور سینما دکھاتی رہتی ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ آذربائیجان ہی میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمی ان سینماؤں سے مستفیض ہوتے ہیں اور کرمان کی آبادی کا تو ایک تہائی حصہ سینما دیکھنے کے لئے آجاتا ہے۔ رسے رنگے فلم "انگلستان کے باغات" کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ریڈیو سے زیادہ فلم تعلیم عامہ کے لئے مفید ہوسکتا ہے اور ایران کی برٹش کونسل اور ایرانی حکام اس سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

ایران میں انگریزی سیکھنے اور انگریزی کتب پڑھنے کا شوق عام ہوگیا ہے۔ طہران کے ایک کتب فروش سے معلوم ہوا کہ انگریزی رسائل بہت بکنے لگے ہیں۔ ان حالات سے پورا اور منظم طور پر استفادہ کرنا چاہئے۔ انگریزی ادب کے شاہکاروں کے فارسی ترجمے شائع کرنا چاہئیں۔ کچھ ایرانی ادیبوں نے ترجمے کو بھی دستے ہیں۔ اگر ایرانی ادیب اپنے تخلیقی ادب کو ترجیح دیں اور نقالی کو ناپسند کریں تو بھی بہترین خارجی مصنفوں اور ان کے فنی طریقوں کا جاننا ان کو بیحد مفید ہوگا۔ حجازی جو سرتاپا ایرانی ادیب ہے انگریزی ادیب چارلس لیمب کی یاد تازہ کردیتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایرانی عورتیں کیا کرتی ہیں۔ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ عورتوں کے لئے بہت سے میدان کھلے ہیں۔ "تحریک نسواں" جو علیا حضرت ملکہ فوزیہ کی سرپرستی میں شروع ہوئی ایک منظم تحریک ہے۔ بقول ڈاکٹر رضازادہ شفق عورتوں کو معاشی، اخلاقی اور سماجی میدانوں میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ادب اور فنون کے میدانوں میں بھی وہ بہت کچھ کرسکتی ہیں اور جدید ایران کی مشہور شاعرہ پروین اعتصامی کے نقش قدم پر چل سکتی ہیں۔ طہران ریڈیو میں عورتیں بھی معلن کے فرائض ادا کررہی ہیں اور عورتوں کے لئے ایک مخصوص رسالہ زیر غور ہے اور عنقریب جاری ہونے والا ہے۔ غرض، عورتوں کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایران کو بہت سی سخت پریشانیوں کا سامنا ہے۔ یہ پریشانیاں یکایک رونما ہوئی ہیں اور اسوقت جبکہ ایرانی لیڈر اور بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ جب وہ سیاسی، معاشی اور اصلاحی الجھنوں میں پھنسے ہوئے ہوں تو تخلیق ادب، نئے افکار اور نئے اسلوب اظہار کے مسائل کو طے کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ لیکن وقت، امن اور رواداری میسر آئے تو یہ سب مشکلیں آسان ہوسکتی ہیں۔ لیکن قرائن صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ یہ نئی تحریک بڑھنے لگی ہے اسکے زندہ رہنے اور پھیلنے کے لئے نہ صرف داخلی قوت بلکہ باہری امداد کی بھی ضرورت ہے۔ خاک ماضی تو بھولی نہیں جاسکتی لیکن اب تو حال اور مستقبل کا مقابلہ کرنا ہے اور قوت ایمان، جرأت اور خود اعتمادی کے ساتھ۔ پرہ کوش اپنے ناول "ساز عشق" میں کہتا ہے:- (باقی صفحہ ۱۷ پر)

ایک سوال

(افسانہ)

جی ایم درّانی

اس دن بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ طبیعت کی یہ بیزاری کسی کل بیٹھنے بھی دے گی یا نہیں۔ کتنے سال ہو گئے ازدواجی زندگی بھی گذارتے ہوئے لیکن وہ جو ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے نہ آج ختم ہوتی ہے نہ کل۔ کمی کیا ہے؟ کاش وہ یہی معلوم کر سکتی۔ بس جیسے ساری دنیا سے بیزار، تھکی تھکی بدمزہ سی ——— ہنستی بھی تو اس طرح جیسے کوئی روتے کو گدگدا کر ہنسا رہا ہو۔ بقول دیکھنے والوں کے، بڑے بڑے سیٹھوں جیسی زندگی۔ آزادی بھی خاصی نصیب۔ کونسی چیز تھی جو شادی کے بعد اسے نہ ملی ہو۔ لیکن جب کوئی اسکے سامنے اسکے شوہر کی تعریف کرتا تو نہ جانے کیوں اس کا جی چاہتا کہ کمبخت کا منہ نوچ ڈالے۔ اپنے شوہر میں چن چن کر عیب نکالے اور اسقدر ملامت کرے کہ تعریف کرنے والے کا منہ بند ہو جائے ——— لیکن وہ اپنے گھٹتے ہوئے جذبات روک کر رہ جاتی۔ کیا وہ یہ سب کہہ کر کسی کی نظروں میں عزت حاصل کر سکے گی؟ دنیا تو اسے ہی برا کہے گی اور دنیا کی نظروں میں برے ہو کر جینا بھی دل گردے کا کام ہے۔ وہ بجھے بجھے دل سے تعریف کرنے والوں کا ساتھ ہی دینا بہتر سمجھتی۔ اور اپنے بیقرار دل کو تسلی دینے کے لئے سوچ لیتی کہ انسان بہت سی باتیں اپنی مرضی کے خلاف کرنے پر بھی مجبور ہے۔ انہیں خلاف مرضی باتوں میں سے ایک شوہر کی تعریف ہے۔ سب کچھ سہی لیکن تنہائی میں تو اسے کمبخت نہ جانے کیا کیا ہونے لگتا۔ شادی سے پہلے کے تمام خیالات اسے گھیر لیتے۔ وہی خوبصورت خوبصورت تتلی کی ٹہنیوں کی طرح لچکیلے نازک نازک خیالات جن میں کمسن محبوبائیں انگڑائیاں لیتی ہیں۔ وہ خیالات جن میں زندگی کا حقیقی کھردرا پن مفقود ہوتا ہے مگر جب وہ ان سہانے خوابوں سے چونکتی تو سوچنے لگتی کہ آخر وہ اسقدر اچھوتی رنگینیاں کیوں چاہتی ہے جو اسے ازدواجی زندگی میں نہیں مل سکتیں۔ وہ بھی کیوں عام عورتوں کی طرح ہر حال میں خوش رہنا اور شوہر کی مرضی کے مطابق چلنا نہیں سیکھ لیتی۔ کمبخت یہ بھی کوئی عادت ہے کہ ہزار ہا مرتبہ بازار جانے پر بھی اس کا دل کچھ خریدنے کو نہ چاہتا۔ کوئی چیز اسے چاہے کتنی ہی پسند کیوں نہ آجائے لیکن وہ اسے خرید نہ سکتی۔ یونہی بس اسکا جی چاہتا کہ اس کی پسند اس کا شوہر خود کیوں نہیں سمجھتا ——— بیوقوف ہے، احمق ہے۔ وہ جیسے اندر ہی اندر بلک اٹھتی۔ ایک بار دو بار کیا ہزاروں بار یہی ہوتا۔ وہ دو دو دن کنگھی نہ کرتی صرف اس خیال سے کہ شاید اسے اجڑا اجڑا دیکھ کر اس کا شوہر اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ کر اپنی انگلیوں سے کنگھی کر کے اس سے پوچھے کہ کیوں گم صم تھی؟ پیار کر کے کھینچے اور بڑے ہی مشفقانہ انداز میں اسے بال سنوارنے پر مجبور کرے۔ لیکن اس کا شوہر تو بڑا ہی سیدھا سمجھا جاتا تھا۔ سب لوگ یہی کہتے۔ پھر اسے اپنی بیوی کے خیالات میں پڑی ہوئی گتھیاں کیسے نظر آتیں۔

شوہر کی عدم موجودگی میں وہ بیٹھ کر سختی سے اپنی بچپن کی رنگین خواہشوں کا احتساب کرتی۔ اپنے آپ پر جھنجھلاتی۔ لیکن جیسے ہی اسکا شوہر اپنی آمد کی اطلاع موٹر کے ہارن سے دیتا وہ پھر ایک دم چڑچڑا جاتی۔ اچھی خاصی بیٹھی بیٹھی کھٹ سے بستر پر گر کے تکئے میں منہ چھپا لیتی ——— پھر وہی خواہش کہ اس کا شوہر آکر اسے منائے، اسکے ناز و نخرے اٹھائے، مگر اسکے شوہر کو اتنی فرصت کہاں؟ وہ آتا اور اسے یوں پڑا دیکھ کر ایسے پوچھتا کہ آج بیگم صاحب نے ٹانک پی یا نہیں۔ اگر جواب نفی میں ملتا تو وہ نہایت بجھے ہوئے لہجے میں کہتا: "تمہیں دوا سے نفرت ہے اور صحت ہے کہ گرتی ہی جاتی ہے ہر وقت گری گری سی رہتی ہو۔ اچھا آج تم فلاں ڈاکٹر کو بلا کر دکھا دو۔"

وہ تلملا کر اٹھ بیٹھتی۔ طبیعت اور بھی چڑچڑا جاتی۔ مگر یہ سب سمجھنے کی اسکے شوہر کو فرصت کہاں تھی۔ وہ ایک بڑا عہدے دار تھا۔ وہ اسے اٹھتا دیکھ کر کہتا: "لیٹی رہو، خانساماں کھانا کھلا دے گا۔ مجھے جلدی ہی جانا ہے۔" وہ کھانا کھا کر پھر چلا جاتا اور وہ گویا اپنی بوٹیاں نوچتی رہتی۔ وہ سوچتی کہ بہت سے لوگ کہتے ہیں جہاں دولت ہوگی وہاں محبت مر جائیگی۔ کاش اس کی شادی کسی غریب آدمی سے ہوتی۔ اور ایک دن ——— شادی تو نہیں ہاں اسے ایک غریب سے آدمی سے محبت ہو گئی۔ وہ غریب آدمی ایک بدقسمت ادیب تھا عرفانی۔ وہ اسکے شوہر کا دوست تھا ——— اسے وہ دن بہت اچھی طرح یاد تھا جب کہ پہلی مرتبہ اسکے شوہر نے عرفانی سے اسے ملایا تھا۔

"آپ سے مل کر دلی مسرت ہوئی۔" اس نے رسماً کہا۔ "مگر محترمہ!" عرفانی نے جواب دیا۔ "میں یہ کہنے سے معذور ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر کسی قسم کی خوشی یا غم ہوا۔ ہو سکتا ہے آئندہ چل کر آپ میری مسرت یا غم کا باعث ثابت ہوں۔" وہ بڑی لاابالی سے مسکرا رہا تھا۔ اور وہ اس کی صاف گوئی پر کچھ پریشان سی ہو گئی تھی۔

"بیگم! چائے تو پلاؤ عرفانی کو، اپنے دوست ہیں۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔" اس کے شوہر نے کہا۔

وہ چائے بنا رہی تھی کچھ کھوئی کھوئی سی۔ کبھی کبھی نیچی نظروں سے

اسے دیکھ لیتی۔ معمولی شکل و صورت کا نوجوان۔ دیکھنے میں کوئی خاص بات بھی تو نہ تھی اس میں۔ لیکن پھر بھی وہ اس سے مرعوب تھی۔ شاید اس کی آنکھوں سے۔ تھیں بھی تو کچھ عجیب سی۔ کچھ کھوئی کھوئی سی مایوس آنکھیں ——— بالکل ویسی ہی جیسی اسے اپنی آنکھیں آئینے میں نظر آتی تھیں وہ بے خیالی میں پیالی میں شکر گھولے ہی جا رہی تھی۔

"چائے میں اسقدر شکر حل کر دینے سے زندگی کی تلخی تو نہیں کم ہو سکتی" عرفانی مسکرا کر کہا۔ اس کا اشارہ شاید اپنی ہی طرف تھا۔ لیکن سینہ ہی کیفیت اس کی بھی ہو رہی تھی وہ غیر محسوس طریقے پر اسکے بہت قریب ہو گئی۔ اسے یہ معلوم کر کے بڑا ہی سکون سا محسوس ہوا کہ عرفانی اسکے گھر پر کچھ دن رہیں گے، جب تک وہ اپنی ماں بہنوں کو نہ بلالیں۔

اس کا چڑچڑا پن کم ہوتا جا رہا تھا۔ بس یہی جی چاہتا کہ دن بہت طویل ہو جائیں۔ اسکا شوہر تو یوں ہی باہر رہے اور وہ عرفانی کے پاس بیٹھی رہے۔ وہ اس کا کسقدر ہم خیال تھا۔ جب وہ باتیں کرتا تو اسے محسوس ہوتا کہ عرفانی اسے بھی پڑھ رہا ہے۔ وہ کہتا! "بغیر محبت کے انسان کیسے جیتا ہے؟" تو اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے شوہر کی شکایتیں کرتے ہوئے اپنا چہرہ اسکے سینے میں چھپا کر چیخ اٹھے۔ "بالکل ٹھیک ہے" مگر وہ ڈرتی کہ عرفانی اسے بری عورت نہ سمجھ لے اور وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی۔

وہ کنگھی کرتی ہوتی تو عرفانی اس کے بالوں کے پیچ و خم کی تعریف بے جھجک کر جاتا۔ وہ کبھی اس کے ساتھ بازار جاتی تو نہ جانے کیسے عرفانی اس کی نظروں ہی سے پہچان جاتا کہ وہ کیا چیز پسند کر رہی ہے۔ اور نہ وہ ایک دم مکمل کر دیتے مرجھاتے تھی۔ عرفانی اس کا آئیڈیل ہے۔ لیکن وہ شوہر والی تھی۔

وہ جال میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ اٹھتی۔ طلب کی آگ بڑھ جاتی اور وہ اپنے جذبات کی آندھی کو دبانے کے لئے عرفانی کے آرام و آسائش پہنچانے میں اور بھی سرگرم ہو جاتی۔ اپنے آپ پر ملامت کرتی۔ اپنے آپ کو دنیا سے ڈراتی۔ لیکن دل کی آگ کم نہ ہوتی۔ عرفانی کو دیکھتے ہی اس کا جی چاہتا کہ وہ کہہ دے کہ تم میرے آئیڈیل ہو۔ اور اس دن وہ یہی کہنے والی تھی۔ ریڈیو پر وائلن بج رہا تھا اور وہ دونوں ڈرائنگ روم میں چند لمحوں سے خاموش بیٹھے تھے۔

"سنئے! آپ ———"

وہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ میرے آئیڈیل ہیں۔ لیکن وہ کہہ نہ سکی۔ عرفانی کی آنکھیں چند لمحوں کے لئے چمک اٹھیں۔

"جی!" اس کی آنکھیں میں بے چینی تھی۔

"آپ آپ ———" اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ "آپ شادی کر لیجئے"

اور وہ دونوں اس غیر متوقع بات سے حیران رہ گئے۔

"کس سے؟"

"کسی سے بھی، میں کرا دوں گی آپ کی شادی" اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ پھر نہ جانے کیسے عرفانی اس کے قریب آگیا۔ بہت قریب۔ اس نے اس کا کانپتا ہوا ہاتھ سہلاتے ہوئے اسے تسلی دی ——— وہ مہینے جو اس نے کشمکش میں گذار دئیے تھے ان کا تجزیہ کیا اور وعدہ کیا کہ وہ جس سے کہے گی اس سے وہ شادی کرے گا۔

قربانی کا نشہ بھی بڑا تیز ہوتا ہے ——— وہ اپنے آئیڈیل کو حاصل نہ کر سکی تو کیا ہوا۔ وہ اسے کامیاب زندگی بسر کرنے میں مدد دے گی۔ اس نشے کے تحت اس نے اپنی ایک پڑھی لکھی خوبصورت سہیلی کو

غزل

روش روش پہ جنوں کے آگے خرد کو قائم مقام کب تک
جھکی جھکی سی نظر کہاں تک، رکا رکا سا خرام کب تک

یہ احتیاطِ کرم کہاں تک، یہ زحمتِ گام گام کب تک
نفس نفس میں پیام کب تک، نظر نظر میں سلام کب تک

رکی رکی سی آہیں، جھکی نگاہیں، وہی حقیقت، وہی فسانہ
سکوت تیرا سکوت کب تک، کلام میرا کلام کب تک

یہ بندگی ہے تو بندگی کا فریب رسوائے عام کب تک
لبوں پہ صبحیں تو ہیں مسلّم، مگر سینوں میں شام کب تک

حدودِ دیر و حرم سے باہر بھی تیری نظروں کی ہے ضرورت
سجود میں سر جھکانے والے یہی ہے سودا تو خام کب تک

ترے کنارے نہ تیرے دھارے تری ہلاکت نہیں تو کیا ہے
ترے سفینوں سے ساحلوں پر یہ موج کا انتقام کب تک

یہی جمالِ گل و سخن ہے، تو آ چمن سے دھواں اٹھا دیں
روش روش پر بکھر رہے ہیں، یہ لالہ و گل کے دام کب تک

سرِ دشتِ طوفاں پہ آشیانہ، نہ بجلیوں پر کمند تیری
یہی چمن ہے، تو اس چمن میں اسیرِ نشیمن کا نام کب تک

سن او نگاہیں چرانے والے! زمانہ آواز دے رہا ہے؟
زمیں کی ظالم تری نگاہیں، طریقِ مینا و جام کب تک

نہ نور تیرا، نہ رنگ تیری، رباب ٹوٹے، شراب چھوٹی
یہ ذلتِ انجمن کہاں تک، یہ تہمتِ جام جام کب تک

اگر نہ برہم ہوں اہلِ محفل، تو اہلِ محفل سے شور پوچھوں
کوئی بتا دے کہ میرے ہونٹھوں پہ اس کا نغمہ حرام کب تک!

شورؔ (علیگ)

عرفانی کے لئے منتخب کیا اور کوشش کرکے ان دونوں کی شادی کرا دی۔

اب وہ خواہ مخواہ اپنی سہیلی سے جلنے لگی اندر ہی اندر —— اسے اپنی سہیلی سے حسد ہوتا۔ اس شادی کو وہ اپنی غلطی سمجھتی۔ اس کے باوجود کہ عرفانی اب بھی اپنا زیادہ وقت اسی کے ساتھ بسر کرتا تھا ——

وہ سوچتی کہ سماج کے بندھن ایسے کیوں ہیں کہ وہ اپنی پسند کی چیز نہیں حاصل کر سکتی ——

لیکن ایک دن اسکے دل کی یہ آگ اس طرح بجھ گئی جیسے چراغ کو کسی نے پھونک مار دی ہو۔

اس کی سہیلی بستر پر پڑی رو رہی تھی کہ وہ پہنچ گئی اور جیسے لڑکھڑا کر رہ گئی۔

اس کے آئیڈیل کی بیوی بھی کیا اسی طرح تکیوں میں منہ چھپا کر رو سکتی ہے؟

"فاطمہ!" اس نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پکارا۔ "کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو میری جان"

"نسرین!" وہ زور سے ہچکیاں لینے لگی۔

"آخر فاطمہ کچھ کہو گی بھی" وہ بیتابی سے پوچھنے لگی۔

"کیا کہوں میری تو قسمت پھوٹ گئی اس کنگال سے۔ اسے میرے جذبات کی ذرا بھی پروا نہیں۔ بس ہر وقت پیسہ کمانے کی فکر میں کہانیاں لکھا کرتا ہے۔ رات کے دو دو بجے تک میرے سر پر لائٹ رکھتا ہے اور میں بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی ہوں۔ آخر کوئی کب تک صبر کرے۔ اگر وہ مجھے آرام نہیں دے سکتا تو کیا محبت بھی نہیں دے سکتا؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فاطمہ رو رہی تھی۔ اسکے آئیڈیل کی بیوی۔ وہ بھی اس کی طرح پیاسی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا عورت کو صرف محبوبہ ہونا چاہیے تھا بیوی نہیں؟ —

*

کچھ ایران کے بارے میں: —— بقیہ صفحہ ۱۴

"آزادی ذریعہ نجات اسوقت ہوسکتی ہے جب اسکا رخ مستقبل کی طرف ہو نہ کہ ماضی کی طرف، عمل کی طرف نہ کہ یاد ماضی کی طرف، جوش اور انقلاب کی طرف نہ کہ احتیاط اور سلامتی کی طرف"

بیشک جوش اور انقلاب۔ انقلاب سے زیادہ جوش۔ ایران میں انقلاب تو ہو رہا ہے — ماضی نہ کہ ظاہری۔ اب ایران اڑان کے لئے تیار ہے۔

غزل

وفائیں جتا کر انہیں کیا بلائیں!
وہ مختار مطلق ہیں آئیں نہ آئیں!

نئی شان ہر آن ہی اللہ اللہ!
دو عالم بہ دامن ہیں انکی ادائیں

شب و روز پھیرا ہے جنکی گلی میں
جھلک ہی کہیں ان کی ہم دیکھ پائیں!

ادھر کیں ادھر پھیر لیں مست آنکھیں
بلاتے بلاتے مجھے۔ رک نہ جائیں

بھلائیں اور ان کی توجہ کا مرکز
بھری بزم میں شوق سے وہ ستائیں

یہ دل مجھکو منظور ہے ان کی خاطر
کریں جو بھی چاہیں وہ اپنی چلائیں

میسر ہے جب ہم کو ان کی حضوری
نہیں! کیوں خوشی کے ترانے نہ گائیں

ایمن حزیں

ضروری

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔

"نقد و نظر" کے سلسلے میں ہر کتاب کی دو جلدیں دفتر آجکل میں وصول ہونی چاہئیں ورنہ ان پر کسی قسم کا اظہار خیال نہیں کیا جائیگا۔

(ادارہ) ——



مرد برائے صحت جلد
ریکسونا
استعمال کرتے ہیں
Rexona
REXONA PROPRIETARY LIMITED

وسط ایشیا کے چند فنکار

ابرار ہدایت — ایک ازبک اداکار

(۳)

ابرار ایک ازبک ایکٹر ہے اور اسکی ڈراما کی صناعت کے اعتراف میں سوویٹ یونین کا خطاب "صناع عوام" ملا ہوا ہے۔ ایک تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ ابرار صحیح عوام کا بیٹا ہے۔ اور تاشقند کے حمزہ تھیٹر میں ابرار کا اوتھیلو اور ہیملٹ پیش کرنا ازبکستان کی ثقافتی زندگی کا ایک خاص اور اہم واقعہ تھا۔ ابرار کا صناعانہ جوہر ان ڈراموں کے پیش کرنے ہی سے منظرِ عام پر آیا۔

ابرار کا باپ تاشقند میں مزدوری کا کام کرتا تھا۔ وہ ایک زندہ دل اور خوش باش آدمی تھا۔ اسکا دستور تھا کہ اپنا کام ختم کر کے چائے خانے میں جا بیٹھتا اور وہاں "اسکیا" (ASKIA) یعنی ازبک پھبتی یا ضلع جگت کا کھیل ہی اس کی تفریح کا مشغلہ تھا۔ وہ اس فن میں استاد مانا جاتا تھا۔ داد بھی دل کھول کر ملتی تھی اور داد ملنے سے اسکی طبیعت اور بھی جولانی پر آتی تھی۔ چائے خانے میں بیٹھنے والے خورد و نوش سے اس کی تواضع کرتے اور وہ سب کا غم غلط کیا کرتا۔

نو سال کی عمر ہوئی تو ابرار نے باپ سے کہا کہ "میں پڑھنے جاؤں گا؟" مسخرہ باز باپ مسکرایا اور کہنے لگا۔

"کیوں نہیں بیٹا! مگر یہ کام جبھی ہو سکتا ہے کہ مجھے کوئی چھوٹا موٹا دفینہ ملے یا تمہارا استاد فیس طلب نہ کرے۔"

ظاہر ہے کہ دونوں باتیں انہونی تھیں۔ چنانچہ ابرار نے خود ہی راہ نکالی۔ اس نے ایک امیر تاجر خواجہ خاں کے ہاں جھاڑو دینے، اٹھانے دری اور مویشیوں کی گھاس کی نوکری کر لی۔ اسے دو روبل مہینہ ملتا تھا، وہی وہ اپنے استاد کو دے دیتا تھا۔ اس قسم کی نوکری کر کے ابرار پڑھنے کے لئے وقت بھی نکال لیتا تھا۔ یہ نوکری چھوٹ جانے کے بعد وہ ایسی ہی دوسری نوکریاں کرتا، استاد کا مہینہ دیتا اور پڑھتا رہا۔

۱۹۱۳ء میں پرانے تاشقند میں سب سے پہلا ازبک تھیٹر "توران" وجود میں آیا۔ ورنہ اس سے پہلے ازبک لوگ تھیٹر کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ اس ذیل میں بیت بازی، سوانگ بھرنا، مداری کے کھیل اور کٹھ پتلی کے تماشے کا رواج تھا۔

ایک دن ایک خاص واقعہ پیش آیا جس نے ابرار کے مستقبل پر مہر لگا دی۔ ابرار اس وقت ڈراما ایکٹنگ کی ایک کلاس میں شریک تھا جسے توران تھیٹر کے ایکٹر وغیرہ تعلیم دیتے تھے۔ تھیٹر کا منیجر ایک ڈراما "سفاک ماراں" پیش کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے تھیٹر کے منظر کے لئے کچھ آدمیوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے ان ایکٹروں سے کہا جو اس کلاس کو تعلیم دیتے تھے، اور انہوں نے چند لڑکے منتخب کئے جن میں ایک ابرار بھی تھا۔

اس طرح ابرار پہلی بار صحیح معنوں میں اسٹیج پر آیا۔ تھیٹر کی طرف سے اسے ایک چھ صفحے کا رسالہ دیا گیا۔ اس میں اسکا پارٹ درج تھا۔ یہ پارٹ ابرار نے کوئی غلطی کئے بغیر نہایت خوبی سے ادا کیا۔ تھیٹر کے منیجر الغور نے جسے اب ازبک جمہوریہ کی طرف سے "صناع عوام" کا خطاب بھی حاصل ہے۔ ابرار کا کام دیکھکر اس کو تھیٹر میں مستقل کر لیا۔

کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد ابرار کا تعلق ازبک اسٹیٹ ڈراما تھیٹر سے ہو گیا۔ ۱۹۱۹ء میں سول وار شروع ہو گئی۔ اس وقت ابرار ایک ایکٹر بھی تھا اور سرخ سپاہی بھی۔ ترکمان فوجی افسر اعلیٰ نے ابرار کو ایکٹروں کی ایک جماعت کے ساتھ فرغانہ کے محاذ پر بھیجا جہاں اس وقت گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ابرار اور اس کے ساتھی سرخ فوج اور چھاپہ مار دستوں کے لئے ڈرامے کھیلتے اور وقتاً فوقتاً انقلاب دشمن بسماچیوں سے بھڑ بھی لیتے تھے۔

ایک موقعے پر ابرار کی پارٹی ایک ڈراما کر رہی تھی اور یہ ڈراما جنگ کے ہی موضوع پر تھا۔ اس میں بندوقیں وغیرہ بھی چلتی تھیں اور نعرے وغیرہ بھی لگائے جاتے تھے۔ تماشہ ہو ہی رہا تھا کہ اچانک بندوقوں کی آوازیں بہت زیادہ چلنے لگیں اور ساتھ ہی "بسماچی!" کا نعرہ بھی سنائی دیا۔ تماشائی اور ایکٹر دوڑ پڑے اور وہ باز بسماچیوں سے جنگ میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت فریقین کے اتفاق سے عارضی طور پر جنگ ملتوی کر دی گئی تھی اور قلعے کی حفاظت کرنے کے لئے ایک مختصر دستہ مقرر کر دیا گیا تھا مگر مدامین بیگ کی سرکردگی میں قصبے پر اس وقت حملہ کر دیا گیا جب سرخ سپاہی ڈراما دیکھنے میں مشغول تھے۔

ابرار اس وقت ایک بے (زمیندار) کا پارٹ کر رہا تھا۔ اور اسی سلسلے کا لباس فاخرہ پہنے تھا۔ سر پر امیرانہ دستار اور جسم پر ریشمی عبا کے ساتھ منہ پر ایک ریش دراز بھی لگی ہوئی تھی۔ ابرار جب اسٹیج کے پیچھے پہنچا تو ایک بسماچی دو عورتوں کو دھمکا کر ان کا زیور اتروا رہا تھا۔ عورتوں نے ابرار کو دیکھا تو پناہ کی خاطر اسکی جانب لپکیں۔ وہ بسماچی ابرار کے لباس اور میک اپ کے دھوکے میں آگیا اور اسے اپنا حامی سمجھ

ل۔ احمد

کرکے پوچھنے لگا۔

"بادشاہ جان، سرخ سپاہی کدھر ہیں؟"

یہ ڈرامائی موقعہ ابرار کے لئے معنت کھو دینا دشوار تھا۔ اس نے ایکٹری انداز سے جھاکا گر بیان کھول دیا اور اندر سے سرخ سپاہی کی وردی دکھا کر دبنگ آواز میں بولا۔

"سکتے! ایک تر تر سے سامنے کھڑا ہے!"

بساش نے خوبصورت لیا مگر ابرار کی انگلیاں کھنچے کے گھوڑے پر پہلے حرکت میں آگئیں۔

سول وار ختم ہوگئی تو ابرار پھر اپنی تعلیم اور مطالعے میں منہمک ہوگیا اسکی بڑی خواہش تھی کہ وہ ماسکو کی تھیٹری صناعت کے ماہروں سے ملے اسکی یہ خواہش ۱۹۴۲ء میں پوری ہوئی اور وہ ماسکو کے ازبک ڈرامائی اسٹوڈیو میں داخل کر لیا گیا۔ وہاں اس نے تین سال تعلیم پائی اور روسی تھیٹری صناعت کے ماہر چیکار پروڈیوسر اسمبخراد اپلخراس ستارا دے کوفن ایکٹری کے راز بتاتے سکھاتے رہے۔ اور حق یہ ہے کہ ابرار نے اپنے استادوں کا نام روشن کیا۔

تعلیم مکمل کرکے جب وہ اپنے وطن تاشقند واپس پہنچا تو بہت سے ازبک اور غیر ملکی ڈراموں میں ہیرو کا پارٹ ادا کرتا رہا۔ جن کلاسیکی ڈراموں کی پیشکش میں ابرار نے نام پیدا کیا۔ ان میں گوگول کا "انسپکٹر جنرل" اور غازی کا "شہزادی توران داد" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حمزہ تھیٹر نے ۱۹۳۰ء میں تھیٹر کی پندرھویں سالگرہ پر شکسپیئر کا ڈراما ہیملیٹ پیش کرنے کا طے کیا تو ہیملٹ کا کردار ابرار کو دیا گیا۔ یہ واقعہ ابرار کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ وہ فطرتاً جوشمند واقع ہوا ہے۔ وہ اپنا پارٹ سمجھنے میں ہمہ تن منہمک ہوگیا گھر میں اور گھر سے باہر سونی سڑکوں اور راستوں پر اپنا پارٹ دھراتا اور اپنے کردار کی فطرت کی گہرائیوں میں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کی طبیعت کی نزاکتیں سمجھنے کی جستجو میں منہمک تھا اکثر ایسا ہوا کہ اسٹیج پر کوئی تاج کے کونے میں پڑھتے پڑھتے سو گیا ہے اور صبح کو لوگوں نے آکر اٹھایا ہے۔

ابرار کی اسٹیج کی زندگی میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس کی بیوی سارہ ایشان تورانی بھی ایکٹریس ہے اور اسی تھیٹر میں کام کرتی ہے۔ بالعموم یہ دونوں ساتھ کام کرتے ہیں اور ہیرو و ہیروئن کے کردار سمجھنے میں آپس میں بحث و تکرار بھی کر لیتے ہیں

اس کی دماغ سوزیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابرار ہیملیٹ اور اوتھیلو کو ایک نئی کرداری قوت دیکر اور ماہرانہ طور پر شخصیت بنا کر پیش کر سکا۔ اس کے فن ابرار کی صناعت کا سکہ جم گیا اور مان لیا گیا کہ اسکا صناعی مستقبل نہایت درخشاں ہے۔

تاشقند کے حمزہ تھیٹر کو ماسکو سے دعوت آئی اور ماسکو میں ابرار نے شکسپیئر کے مشہور عالم کرداروں کو جب اپنی تعبیر و تفہیم کے ساتھ پیش کیا تو ماسکو کے نقادان فن اس کے کمال کی داد دینے میں سرخ زبان تھے۔

اوتھیلو کے کردار کا ایکٹنگ ابرار کا بالکل نواں ہیرو ایکٹنگ تھا۔ اس کردار کو پیش کرنے میں خود ابرار کی سنور فطرت اور شفقتی طبیعت مدد گار تھے۔

اس پیشکش کی کامیابی میں ازبکستان کے محبوب ترین شاعر غفور غلام کا بھی ہاتھ تھا۔ ازبک زبان میں شکسپیئر کو منتقل کرنے میں غفور غلام نے بھی اپنا ادبی کمال دکھا دیا ہے۔

جس رات اوتھیلو پہلی مرتبہ پیش کیا جانے والا تھا۔ اس دن تاشقندی اخبار کے ایک نمائندے نے ابرار سے ملاقات کی تو ابرار نے اوتھیلو کے کردار کی تعبیر کے ذکر میں بتایا کہ:۔

"میرے خیال میں اوتھیلو کی فطرت کو سمجھنے کی کنجی خود اوتھیلو نے بتا دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میری بیوی حسین ہے، کھانا عمدہ کھلاتی ہے، صحبت احباب کی شائق ہے، گفتگو میں آزاد ہے، گاتی خوب ہے، کھیلتی خوب ہے اور رقص بھی خوب کرتی ہے، یہ باتیں سنکر میرے اندر رقابت کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ بلکہ یہی باتیں اس کی پاکیزگی کی ضامن بن سکتی ہیں۔"

دوسرے موقعے پر اوتھیلو کا یہ قول کہ شک کرنے سے پہلے میں دیکھنا چاہونگا اور شک ثبوت کے ساتھ کر دونگا اور جب ثابت ہو جائے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ محبت رہے گی نہ رشک و رقابت۔

"بھروسے میں دغا پانا اور بے آبرو ہو جانا، یہ دو ایسی باتیں ہیں جنکا ڈنک موت کی سوئی ہی نکال سکتی ہے۔"

"رچرڈ برنیج شکسپیئر کا دوست بھی تھا اور اس کے ڈراموں کا پہلا ہیرو ایکٹر بھی۔ اس نے اوتھیلو کو ایک خمدیدہ مور کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ میں نے بھی اسی نوعیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ ابرار ہدایت اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب ہوا۔

رات میں آسمان کے نیلے پس منظر پر دو پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ ایک کے جسم پر چست شلوکہ، پاؤں میں لانبے چرمی بوٹ اور سر پر ایک ہیٹ ہے جس میں ایک پر بھی لٹکا ہوا ہے یہ آئیگو ہے۔ دوسری پرچھائیں ڈھیلی ڈھالی عبا پہنے اور عمامہ باندھے ہے۔ یہ اوتھیلو ہے۔ یہ دونوں زینے پر سے آہستہ آہستہ اتر رہے ہیں۔ اوتھیلو کا انداز پر سکون اور اعتماد انگیز ہے، جیسے کوئی فتحمند فوجی کا ہوتا ہے۔ اس کے اسوقت کے انداز میں ایسی کوئی بات یا اشارہ نہیں ملتا جس سے پتا چلے کہ تھوڑی دیر میں غیظ و غضب کا ایک طوفان

اُبل پڑنے والا ہے۔ اس کی نظریں ڈیسڈیمونا کے مسکن پر قائم ہو جاتی ہیں، اور ان نظروں سے نرمی و ملاطفت اور احسان و محبت ٹپکی پڑ رہی ہے۔ وہ آئیگو سے باتیں کر رہا ہے مگر محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس کی مخاطب صحیح ڈیسڈیمونا ہے، حالانکہ وہ اسوقت اس کی آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔

اسی سین میں کاسیو اسکو بتاتا ہے کہ ڈیوک نے پے بہ پے بارہ پیامی بھیجے ہیں۔ یہ سنکر اوتھیلو کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آجاتی ہے۔ اس کے چہرے مہرے سے کسی قسم کی فکر یا پریشانی کا قطعی اظہار نہیں ہوتا۔ انداز سے وہ یہ سوچتا معلوم ہوتا ہے کہ:۔

"بریانیشو سے میرا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ وہ کیسی ہی کینہ وری سے کام لے، میں نے سگنوری کی جو خدمت کی ہے وہ اسکی بدگوئی کا مونہہ بند کر دے گی!"

ان موقعوں پر ابرار نے اپنے ایکٹنگ سے اوتھیلو کے کردار کی نئی تعبیر کی ہے۔ اس وقت جب ابرار کا اوتھیلو بریانیشو کے نوکروں اور اپنے ساتھیوں کی تکرار روک دیتا ہے تو اوتھیلو کی آواز میں ایک عجیب طاقت پوشیدہ محسوس ہوتی ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے:۔

"ہاں، اپنی تلواریں بلند رکھو تاکہ شبنم انہیں زنگ آلود کر دے۔" یہ موقعہ ہوتا ہے جب ابرار تماشائیوں کے دل میں اس مور کے کردار کی عظمت بٹھا دیتا ہے۔

پھر جب اوتھیلو سینیٹ کے سامنے تقریر کرتا ہے تو ابرار کی شخصیت کا جادو ہر تماشائی کو محسوس ہونے لگتا ہے اور ابرار کا اوتھیلو ڈیسڈیمونا سے اپنی محبت کی داستان سناتا ہے تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ محبت کی ان گھڑیوں کو پھر سے جی رہا ہے اور جب وہ ختم کرتا ہے تو اس کے آخری لفظوں میں ظفرمندی کی گونج ہوتی ہے۔ مردانہ وار عزم کی کھنک ہوتی ہے۔

اور پھر جب ڈیسڈیمونا اپنے دوگا۔ فرض کی طرف اشارہ کرکے حق شوہری کو مرجح بتاتی ہے تو ابرار کے اوتھیلو کا احساس فخر و ظفر اس کے سیاہ چہرے کو دمکا دیتا ہے۔ اس موقعے پر ابرار کا اظہار اسقدر حقیقی و فطری ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اس مور کی سادہ فطرتی اور خلوص کا معتقد ہو جاتا ہے۔ ابرار کا اوتھیلو محض محبت کرنے والا ہی نہیں بلکہ ایک بھروسا کرنے والا اور سادہ فطرت انسان بھی ہے۔ اوتھیلو کی آشتی پسند فطرت، ابرار کی تعبیر کے مطابق، دوسرے ایکٹ میں ظاہر ہوتی ہے۔

محل کے اندر سے خطرے کی گھنٹی بجتی ہے اور اوتھیلو اندر داخل ہوتا ہے تو کہتا ہے "کیا معاملہ ہے؟" اس کے یہ لفظ سکون آمیز سوال کے لفظ ہیں۔ لیکن ابرار کا اوتھیلو کمرے کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی برغضب ہو چکا ہے۔ اس کے اندر جو سکون و سنجیدگی تھی وہ گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی غائب ہو چکی ہے۔

چنانچہ وہ جب کمرے میں داخل ہوتا ہے تو اس کے قدم تیزی سے اٹھتے اور بھاری پڑتے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ سکون میں خلل ڈالنے والا ضرور سزا پائے گا۔

ابرار کی یہ تعبیر کہ اوتھیلو اچانک طور پر نہایت پرغضب ہو سکتا ہے اور کاسیو پر اس کے الطاف و عنایات دفعتاً بھلائے جا سکتے ہیں۔ اوتھیلو کے کردار کا نیا پہلو ہے۔

اسی ڈرامے کا تیسرا ایکٹ ایک ایکٹر کے لئے مشکل ترین ایکٹ ہے۔ اس ایکٹ میں شک و یقین کی معرکہ آرائی ہوتی ہے اور اوتھیلو فریب اتہام کی عیارانہ چال میں آ جاتا ہے۔ یہ مشکل ترین ایکٹ ہی ابرار کی کامیابی و شہرت کا سبب بنتا ہے۔

آئیگو بظاہر معصومانہ انداز میں ڈیسڈیمونا سے کاسیو کی محبت کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ابرار کا اوتھیلو بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن اوتھیلو کی صحیح فطرت غصے پر غالب آجاتی ہے اور وہ مزاحی انداز میں باتیں کرنے لگتا ہے۔ اگرچہ اس کے ہاتوں کا نچلا نہ رہنا اوتھیلو کے اندرونی ہیجان کی علامت ہے۔ وہ نہایت اعتماد آفریں لہجے میں سوال کرتا ہے۔

"تمہارا خیال ہے کہ میں رشک و رقابت کی زندگی اختیار کروں گا؟"

لیکن رفتہ رفتہ آئیگو اوتھیلو کے اندر اندھی قسم کے جذبۂ رقابت کو ابھار دیتا ہے اور ابرار کا اوتھیلو بغلوں میں ہات دبا کر آئیگو پر نظر جمائے ہوئے ٹہلنے لگتا ہے۔ ایک اُڑتی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چھا جاتی ہے۔ کیونکہ اس کو یقین نہیں آتا کہ اس کی بیوی بیوفائی کرے گی۔ لیکن عقل و دلیل کا یہ اظہار آخری اظہار ہوتا ہے۔ رشک کا احساس شدید تر ہوتا جاتا اور عقل کی گرفت ڈھیلی پڑتی جاتی ہے۔ یہانتک کہ اس کے اندر ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ اپنے ہاتوں کو دیکھکر کہتا ہے کہ "میں کالا ہوں" تو لہجے سے کمتری و فروتنی کا احساس ٹپکتا ہے۔ یہ گویا اعتراف گناہ تھا۔ وہ پھر سوچتا ہے کہ اس بے وفائی کا کوئی جواز سمجھ میں آجائے۔ وہ تماشائیوں کی طرف پیٹھ کرکے خود کلامی (آپ ہی آپ باتیں کرنا) کرنے لگتا ہے تو اس کے خیالات تلخ اور محسوسات عقوبت ناک ہوتے ہیں۔ جب اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے تو پہلے رنج و ملال کا اظہار ہوتا ہے اور پھر اچانک غیظ و غضب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور بالآخر یہ شدید قسم کی روحی اذیت اسے اپنی توہین کا علم و احساس کرا دیتی ہے:۔ یعنی وہ ایک عزم کر لیتا ہے۔ یہ عزم ایک ایسا بوجھ ہے کہ اسکا سر کوچ کے تکئے پر ٹک جاتا ہے۔

ملازمہ ایمیلیا سے گفتگو کرنے میں ابیاگو کے ادتھیلو کا ایک بنیادی وصف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی بیوی کی بیوفائی کا صدمہ اس کے مضبوط آدمی کو بالکل پامال دل شکستہ بنا دیتا ہے۔ بیوی سے سوال جواب کرنے میں معلوم ہوتا ہے کہ ادتھیلو اس حد تک جستجو میں ہے کہ بیوی الزام سے انکار کرے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی محسوس کر رہا ہے کہ اپنے سوا کوئی قوت سچی ڈیسڈیمونا کو دیوار سے ٹکرا کر پیس دینا بھی چاہتا ہے۔

ابیاگو کے الفاظ میں زہر ملا ڈنک تھا جس کے اثر سے ادتھیلو کے غیظ و غضب کو اس نقطہ پر پہنچا دیا ہے کہ ادتھیلو غافل یا بے حواس ہو جاتا ہے۔

پیشتر کشی کی پہلی رات کو جب ابرار اسی طرح غافل ہو کر گرا تو اس کا ہاتھ بے وجہ طور پر اس کے بدن کے نیچے دب گیا۔ یہ ایکٹنگ اس درجہ فطری و حقیقی تھا کہ تھیٹر دیکھا ڈاکٹر جو تماشائیوں میں بیٹھا تھا اس نے سمجھ لیا کہ ابرار دفور جذبات کی تاب نہ لا سکا اور اس کی موت واقع ہو گئی چنانچہ وہ بے تحاشا دوڑ کر اسٹیج پر پہنچ جاتا ہے۔

ابرار کا ادتھیلو اس ٹریجڈی کے آخری حصے میں آفتاب عالم شکستہ پر ہو جاتا ہے کہ آنکھوں میں چمک نہیں رہتی۔ آواز بھرا جاتی ہے، ہاتھ پاؤں کی حرکت سست اور ڈھیلی پڑ جاتی ہیں اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ اس کا آخری وقت ہے۔

تھیٹر سے نکلتا ہوا تماشائی ادتھیلو کی ٹریجڈی کی جو تصویر ازبکستانی صناع عوام ابرار کرنے کی ہے اسکے اندر کھویا ہوا ہوتا ہے۔

اُردو تنقید کا پس منظر

ابو اللیث صدیقی

آرٹ جب تک انسانوں کے اجتماعی فعل کا نام ہے خواہ اس کا اظہار نقش و نگار کی صورت میں ہو یا صوت و نغمہ کے پردہ میں، اس لئے آرٹسٹ یا فنکار اپنی فنی تکمیل کے لئے اپنی ذات کے علاوہ کسی حد تک دوسرے اپنے جیسے انسانوں کے وجود کا محتاج ہے جو اس کے فن کو دیکھیں اور سمجھیں، ان کی تعریف و تحسین سے اس کی ہمت بڑھتی ہے، کام کرنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ ہوتا ہے، اور فن کی معراج تک رسائی کا ولولہ باقی رہتا ہے۔ اگر اس کے تخلیق کئے ہوئے نمونوں میں کچھ خامی ہوتی ہے تو تنقید و تبصرہ اسے اپنی اصلاح اور آئندہ عادت پر مائل کرتا ہے۔ اس طرح ناقد کا وجود آرٹ کی ترقی کے لئے ہمیشہ ضروری ہے۔ قدیم تاریخ سے صرف اس قدر جان لینا کافی ہے کہ اگر فن کار یا آرٹسٹ کے کام میں دلچسپی لینے والے اور اسے اچھا سمجھنے والے موجود نہ ہوتے تو یقیناً وہ آرٹسٹ کو جماعت کا عضو معطل سمجھ کر زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیتے کیونکہ ترقی کے اس ابتدائی زمانہ میں کسی بیکار چیز کے رہنے کا کوئی جواز نہیں ملتا۔

اس وقت ہمیں آرٹ یا فن کے صرف ایک شعبہ یعنی شعر و ادب اور اس کی تنقید سے بحث ہے۔ ہر سوسائٹی کا ادب اس کے خاص رجحانات اور زندگی کے متعلق اس کے خاص تصورات کا آئینہ دار ہوتا ہے کیونکہ شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا اور مستقبل کو خود متاثر کرتا ہے۔ ناقد بھی اسی ماحول میں آنکھ کھولتا ہے۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں بھی اسی ماحول میں بیدار ہوتی ہیں۔ زندگی اور اس کے ساتھ شعر و ادب کی قدریں کچھ تو اسے ورثہ میں ملتی ہیں اور کچھ خارجی اور داخلی اثرات کے ماتحت خود قائم کرتا ہے لیکن ماحول کا نقش اس کے ہر تصور پر اپنی مہر لگا دیتا ہے اس لئے جس طرح کسی ادب کا مطالعہ بغیر اس عہد کے ذہنی اور سماجی پس منظر کے پیش نظر ناقص اور نامکمل رہتا ہے اسی طرح تنقید کے تصورات، خاص اقدار اور تنقید کی ارتقا کے مسائل بغیر اس پس منظر کے بیان نہیں کئے جا سکتے اس لئے اردو تنقید کا جائزہ لینے والے کے لئے اس عہد کی سماجی حالت، شخصی حکومت اور اس کا اثر، سیاسی انقلابات اور ان کے اثرات، خاص حالات میں خاص اصناف کی ترقی کے اسباب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

آئیے سب سے پہلے سماجی حالات کا جائزہ لیجئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تو ایران و افغانستان سے آنے والے امیروں اور لشکریوں نے اپنے سماجی تعلقات اسی ملک کے باشندوں سے استوار کر لئے۔ یہیں وہ اپنا وطن بنا کر آباد ہوئے اور شادی بیاہ کر کے ایک ایسی نسل تیار کی جو ہندلمانی (INDO-MUSLIM) تھی۔ یہ آمیزش و آویزش ان کی صورت، شکل، تراش خراش، وضع قطع، چال ڈھال غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اپنا رنگ دکھانے لگی لیکن ان تعلقات کی سب سے مبارک یادگار ہی اردو زبان ہے جو خاص ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تمدنی ربط و ارتباط اور آپس کی لین دین کے باعث ظہور میں آئی اور پہلے پہل ہندوی یا ہندی کہلائی، دکن پہنچ کر اس نے دکھنی نام پایا۔ پھر ریختہ کا خطاب ملا۔ دارالخلافہ کی زبان قرار پائی تو زبان اردوئے معلےٰ کا معزز لقب نصیب ہوا۔ زمانۂ قدیم سے ہندوستانی کے نام سے بھی پکاری گئی۔ یہ سلسلہ زمانہ بیس گردہا۔ اور یہ تمام نام اسی ملک میں مختلف علاقوں اور زمانوں میں اسے ملے غرض اس خالص ملکی زبان نے رفتہ رفتہ مستقل حیثیت اختیار کر لی اور اس میں شعر و ادب کے ابتدائی نمونے پیدا ہو گئے۔

اس مشترک ہندلمانی (INDO-MUSLIM) تمدن میں جس کی یادگار یہ زبان ہے ایرانی عناصر زیادہ نمایاں تھے۔ اگرچہ ایرانی اور ہندی دونوں آریا قوم تھے اور دونوں کی زبانیں اپنے ماخذ میں ایک ہی زبان کا پتہ دیتی ہیں لیکن جب دونوں نے تو مدت کی جدائی اور خاص ملکی حالات اور اثرات نے دونوں کا رنگ روپ بالکل بدل دیا تھا۔ پہلے کچھ دنوں اجنبیت قائم رہی لیکن جب دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا اور رشتہ استوار ہو گیا تو مغائرت کا پردہ درمیان سے اٹھ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا لیکن حاکم کا اثر محکوم پر زیادہ پڑتا ہے۔ اس لئے ایرانی عناصر نے زیادہ عمل دخل پایا۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور آداب معاشرت کے دوسرے شعبوں میں ایرانی تمدن زیادہ ترقی کر چکا تھا۔ اس لئے ہم وطنوں نے جو کچھ ہندوستان سے لیا اس کے بدلے میں اس سے زیادہ ادا کر دیا۔ فارسی شعر و ادب کی ترقی کا ایک خاص سبب اس ماحول میں یہ ہوا کہ ایران میں سیاسی انقلابات کے باعث شعرا اور ادیب ہندوستانی مغلوں کے دربار میں پناہ گزین ہوئے۔ ان کے شعر و سخن سے محفلیں گرم ہو گئیں۔ اس وقت دیسی زبانیں زیادہ سے زیادہ مقامی بولیوں کی حیثیت رکھتی تھیں اور شعر و ادب کے سرمایہ سے محروم تھیں۔ قدرتی طور پر عوام بھی اس نئی طرز کی شاعری اور ادب کی طرف مائل ہوئے۔ اسی ماحول میں ایسے شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے ایران کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی لیکن ان کا کلام ہر اعتبار سے اساتذہ ایران کے ہم پایہ ہے۔ ابتدائی دور میں اردو

شعروادب کے سرمایہ کی کمی کا اصل سبب ہے۔ پھر جو اردو شاعر اپنی زبان میں طبع آزمائی کرتے تھے اور انہیں حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی وہ یا تو فارسی سے ترجمہ کرتے تھے یا پھر اس طرز پر لکھتے تھے جو ترجمہ نہیں تو کم از کم ماخوذ ضرور ہیں۔ ان کا اندازہ دکھنی ادب کے پہلے دور کا جائزہ لینے سے ہو سکتا ہے۔ نثر میں سب سے پہلا کارنامہ جو ادبی حیثیت سے اہم ہے ملا وجہی کی "سب رس" ہے۔ اگرچہ ملا صاحب نے کتاب کے طبعزاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اسے اپنے دماغ کی پیداوار بتایا ہے لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یحییٰ ابن سیبک فتاحی نشاپوری کے فارسی "حسن و دل" سے نقل اڑائی ہے اور طرز بھی ویسا ہی مقفیٰ اور مرصع عبارت کا ہے جس کا اس زمانہ کی فارسی انشاپردازی پر خاص رواج تھا۔ ترجمہ کے سلسلہ میں دکن کا مشہور رزمیہ نگار شاعر کمال خاں رستمی ایک بڑے پتہ کی بات لکھ گیا ہے۔ وہ اپنی مثنوی خاور نامہ میں کہتا ہے کہ اپنی طبیعت سے نیا مضمون اگرچہ پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن میں فردوسی یا اس کے ہم پلہ شاعروں کی برابری کا دعویٰ کیا کر سکتا ہوں۔ اس لئے میرے لئے زیادہ مناسب ہے کہ میں کسی بلند پایہ فارسی تصنیف کا دکھنی میں ترجمہ کر ڈالوں چنانچہ ملکہ خدیجہ سلطان کی فرمائش پر اس نے ابن حسام کے فارسی منظوم قصہ کا ترجمہ کر ڈالا۔ یہ قصہ حضرت علی اور ان کی جنگوں سے متعلق ہے اور اس میں چوبیس ہزار اشعار ہیں اردو میں رزمیہ نظم کا اس سے طویل نمونہ اور نہیں ملتا۔ یہ تو ایک مثال تھی۔ دکن میں فارسی نظم و نثر سے جس قدر ترجمے ہوئے ان کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے

اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری ابتدائی دور میں فارسی کا پرتو نظر آنے لگی۔ اردو شعرا کی کوشش برابر یہی رہی کہ ان کا اردو کلام فارسی کے ہم پلہ ہو جائے بہت بعد میں یعنی مرزا غالب جب بڑی حد تک اردو نے اپنی مستقل حیثیت علیحدہ حاصل کر لی تھی یہی کہتے نظر آتے ہیں:۔

جو کوئی کہہ دے ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کر اسے سنا کہ یوں

چنانچہ اردو ناقدین بھی برابر اپنے فنکاروں کی تعریف میں اسی قسم کے جملے استعمال کرتے ہیں کہ انہوں نے اردو کو فارسی کا مرتبہ بخشا، مشہور اردو شعرا کو مشہور فارسی شعرا کا ہم رنگ اور ہم مشرب بنا کر ان کی انتہائی تعریف سمجھی جاتی ہے۔ ولی کو اردو شاعری کا رودکی بتایا گیا ہے۔ سودا اپنی مدح و قدح کے کمال سے انوری ہیں۔ ذوق کا طمطراق اور شکوہ ان کو خاقانی ہند بناتا ہے، میر و سودا اردو کے حافظ ہیں، ریاض اور جگر، حافظ اور خیام کے ہم مشرب ہیں۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری فردوسی اسلام کہلاتے ہیں۔

یہ تمام فقرے جو قدیم و جدید شاعروں کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا ذہنیت کی غماز ہیں۔ ظاہر ہے جو فنکار فارسی کے نمونوں کو سامنے رکھے اور اس کے شاہکاروں کو فن کی معراج قرار دے چکا ہو اسے اسی کے اصولوں اور انہیں اقدار پر پرکھنا چاہیئے جو فارسی والوں نے مقرر کر رکھی ہیں۔ اس میں نہ شرم کی کوئی بات ہے اور نہ اس سے اپنی زبان یا اس کی تنقید کی توہین ہوتی ہو ہر نئے راہرو کو رہبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اردو نے فارسی سے بس یہی کام کیا

اس سلسلہ میں دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ شخصی حکومت کے طرز نے شعر و ادب پر کیا اثر ڈالا اور اس طرح بالواسطہ تنقید نے کیا رجحانات قبول کئے۔ عرصہ تک ہماری زبان کے مورخ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ اردو شاہجہان کی درباری زبان کی حیثیت سے وجود میں آئی۔ بعض حضرات نے اسے اکبر کے دربار سے وابستہ کیا۔ غرض یہ معلوم ہونے لگا گویا یہ زبان مسلمان حکمرانوں نے اس ملک پر مسلط کی۔ جدید تحقیقات نے لاعلمی اور جہالت کے پردہ کو اٹھا کر اس غلط فہمی کی تردید کر دی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے صوفیائے سب سے پہلے اس کی سرپرستی کی اور انہیں کے مبارک اقوال اور ملفوظات اس زبان کی قدیم ترین تاریخی دستاویز ہیں۔ ان کے اثر سے متصوفانہ خیالات، بالخصوص پاکیزگی نفس، عشق حقیقی حسن مطلق، معرفت نفس، ضبط و تحمل، ایثار و استقلال کے مضامین اردو شاعری کے خمیر میں داخل ہو گئے۔ غزل اردو شاعری کی سب سے بدنام صنف ہے لیکن اس میں اعتدال انہیں مضامین سے پیدا ہوتا ہے اور انہیں خیالات نے عشق و عاشقی اور ہوسناکی میں حد فاصل قائم کر رکھی ہے جب کبھی اور جہاں کہیں ان سے انحراف کیا گیا ہے وہیں شاعروں کے قدم کو لغزش ہوئی ہے مثال میں لکھنؤ کے تمام شعرا پیش کئے جا سکتے ہیں۔

شخصی حکومت کا تقاضہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ شعرا مدح گوئی کی طرف زیادہ مائل ہوتے اور فنی حیثیت سے اردو میں قصیدہ کا بڑا درجہ ہوتا لیکن شاعری کی تمام تاریخ میں سوائے سودا اور ذوق کے صف اول میں اور کوئی نام نہیں ملتا۔ دوسری صف میں کھینچ تان کر غالب اور مومن کو لے آئیے لکھنوی شعرا میں امیر مینائی کا نام لے لیجئے۔ ان کے بعد فہرست ختم ہو جاتی ہے۔ یوں طبع آزمائی کے لئے یا مصلحت وقت کی خاطر اور شعرا نے بھی توجہ کی ہے لیکن میر اور میر حسن جیسے باکمال بھی اس میدان میں نہ چل سکے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ سلاطین یا امرا کی محفلوں میں شاعروں کی سرپرستی صرف قصیدہ خوانی کے صلہ میں نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ لوگ فضل و کمال کی سرپرستی کو شان ریاست اور وضعداری سمجھتے تھے۔ ایک دربار بگڑتا تو دوسرا دربار ان باکمالوں کی راہ میں آنکھیں بچھا دیتا۔ اس لئے ان کی سرپرستی نے شاعروں کے مذاق کی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔ البتہ جب ان کی حالت خود بگڑ گئی تو زوال آمادہ شخصی حکومت کی جگہ خرابیاں سلطنت میں راہ پا گئیں، امیروں کا مذاق بگڑ گیا اور اسی لکھنؤ میں جہاں خان آرزو

سودا، میر تقی میر، جعفر علی حسرت، حیدر علی حیران، مصحفی، انشا اور میر حسن جیسے باکمالوں نے محفلیں گرم کی تھیں۔ صاحبقران اشعر کیسی نوازا گیا۔ سبکی لکھنؤ کے بعد رامپور اور پھر حیدرآباد نے اس وضعداری کو آخر تک نباہ دیا۔ کبھی کبھی شخصی حکومت میں رئیس وقت کے خاص میلانات اور رجحانات نے خاص اوقات میں بعض اصناف کی ترقی میں بڑی مدد دی۔ مرثیہ نے فنی حیثیت سے لکھنؤ میں اثنا عشری عقیدہ رکھنے والے فرمانروایان اودھ کی سرپرستی میں پروان چڑھا۔ انیس و دبیر اور ان کے کارنامے اسی فضا کی پیداوار ہیں ورنہ اس سے پہلے بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا قوال مرثیہ خوان کہلاتا تھا۔ اسی طرح مرثیے نے لکھنؤ کے بگڑتے ہوئے مذاق کی جس طور پر اصلاح کی وہ بھی بالواسطہ نہیں کا رہین منت ہے۔ پھر بعض سلاطین کی خاص دلچسپیوں نے خاص طور پر زبان کی ترقی اور اس کی رفتار پر اثر ڈالا۔ اردو نظم کا پہلا کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ نے خود مرتب کیا۔ ہماری قدیم ادبی کتابوں میں یہ تصنیف نہایت اہم ہے۔ اس سے ایک طرف بادشاہ کی دلچسپی اور ملکی زبان سے اس کے لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کا قادر الکلام شاعر تھا اور اس کا کلام بیشک کلام الملوک ملوک الکلام کا مصداق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بارگاہ گولکنڈہ میں بکثرت شعراء نے دکھنی شاعری کی طرف رجوع کی اور بادشاہ کے مذاق کے مطابق غزلیں اور عاشقانہ مثنویاں نظم کیں۔ کمال خان رستمی علی عادل شاہ والی بیجاپور کا تذکرہ اس عقیدت سے کرتا ہے گویا وہ اس کا استاد ہے اور درحقیقت یہ تاجدار اپنے شعرا کے کلام کو بغور سنتا اور اس پر اصلاح دیتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے غالب کی شاعری کو آخر دور میں متاثر کیا اور اسے ایک نیا رنگ بخشا۔ واجد علی شاہ کا کلام کسی طرح اس کے درباری شعرا کے کلام سے کم نہیں ہے بلکہ فنی واقفیت کے اعتبار سے خود اس کا پایہ ہی بلند رہتا ہے۔

شخصی حکومت نے شاعری کے عام اسلوب پر بڑا اثر ڈالا۔ استعاروں اور کنایوں کا رواج اسی کا رہین منت ہے۔ شخصی حکومت میں انفرادی آزادی کسی نہ کسی حد تک سلب ہو جاتی ہے اور تحریر و تقریر میں دار و گیر کا خوف ہمیشہ دامنگیر رہتا تھا۔ تقریر کرنے والے اپنی گفتگو میں اور شعرا اور ادیب اپنی تحریروں میں اپنے آزاد خیالات ظاہر کرنے جھجک محسوس کرتے ہیں بالخصوص ایسے معاملات میں جہاں شعرا زمانہ کے ماحول، سیاسی بے چینی اور ذہنی انتشار کا ذکر کرنا چاہتے ہوں، چونکہ ان کی قوت حاسہ شدید ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ان حالات کا اثر عوام سے زیادہ ہی قبول کرتے ہیں اور اس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مجبوراً استعاروں اور کنایوں کا پردہ ڈال کر اپنے جذبات اور تاثرات سپرد قلم کرتے ہیں۔ ہمارے قدیم شعرا اور ادیبوں میں اس انداز کے عام رواج کا باعث یہی ہے۔ جو لوگ اردو غزل پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں شاعر صرف اپنے دل کی رام کہانی سناتا ہے اور عام ماحول سے بیگانہ نظر آتا ہے یعنی بالفاظ دیگر غزل میں صرف داخلیت پائی جاتی ہے۔ وہ اسی نکتہ سے عدم واقفیت کی بنا پر غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر غزل گو شعراء کے استعاروں اور کنایوں کو صرف استعارہ اور کنایہ سمجھ کر تحقیق کی جائے کہ دراصل شاعر کا مقصد کیا تھا تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ اس دور میں بھی شعرا نے اپنے خارجی ماحول کی ترجمانی اپنے کلام میں ہمیشہ مد نظر رکھی ہے۔ ایسے مطالعہ کے لئے شاعر کے عہد کی تاریخ۔ اس کی زندگی کا روزنامچہ یا کم از کم اہم واقعات کی تاریخیں ہمارے سامنے ہونے ضروری ہیں۔

اردو شعرا اور ناقدین نے عام طور پر شاعری کے لئے اور بالخصوص بعض اصناف کے لئے درد و سوز و گداز کو جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ اس ذہنیت کا سلسلہ بھی اس عہد کے سیاسی ماحول سے ملتا ہے۔ اردو کی نشو و نما کا زمانہ دراصل مغلیہ حکومت کے زوال کا دور ہے۔ ملک میں انتشار تھا۔ بیرونی حملہ آوروں کی آئے دن کی یورش نے کم از کم شمالی ہند کے باشندوں پر زندگی حرام کر دی تھی۔ دکن میں مرہٹوں کی بغاوت، ادھر سکھوں اور جاٹوں کی سرکشی، نظام حکومت کے کمزور ہو جانے کے باعث اور زیادہ بگڑ رہی تھی۔ درباری امرا اور اعیان لشکر خود غرض ہو گئے تھے اور اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنا رہے تھے۔ دربار میں ایسی ریشہ دوانیاں تھیں کہ کسی رئیس کا پایہ مستحکم نہ تھا۔ جو آج ہفت ہزاری نظر آیا۔ کل نان شبینہ کو محتاج تھا۔ جب درباروں کی یہ حالت تھی تو درباروں سے وابستہ رہنے والے شعرا اور ارباب فن و اہل کمال کس طرح سکون کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ ان کی قسمت میں در بدر کی ٹھوکریں، معاشی تنگ حالی، ذہنی پریشانی اور ذاتی آلام و مصائب ہی لکھے تھے۔ اگر ان حالات میں کائنات کا ایک بسا تصور ان کے ذہن میں آیا جہاں انسان مجبور اور بےکس۔ حقیر اور کمزور، موت اور اتفاقات کے رحم و کرم پر ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

قدرتی طور پر سوال ہوگا کہ اس ہند لسانی تمدن میں جس کی پیداوار یہ اردو زبان ہے، ایرانی عنصر کے مقابلہ میں ہندی عنصر کی کمی کا سبب کیا ہے۔ دکھنی دور میں دیسی بھاشاؤں کے الفاظ اور ملکی تشبیہات کثرت سے ملتی ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بہت جلد ان زبانوں کا جو مقامی بولیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں سرمایہ ختم ہو گیا اور سہپانی آریائی تمدن ایک زیادہ مہذب اور متمدن ایرانی آریائی ثقافت کے سامنے نہ ٹھیر سکا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی ہمارے زمانہ میں مغربی تمدن اور معاشرت کے سیلاب میں قدیم ہندستانی خس و خاشاک کی طرح بہی چلی جا رہی ہے اور جو خیالات پہلے ایرانی تمدن اور فارسی زبان و ادب کے ذریعہ آئے وہ اب انگریزوں کی تہذیب، معاشرت اور انکی زبان و ادب سے رفتہ رفتہ ہماری زبان کے مزاج میں دخل پا رہے ہیں۔

مصوّر

(افسانہ)

ظفر جاوید

آج شہنشاہ اعظم کی سترویں سالگرہ ہے۔ دربار خاص نہایت آب وتاب سے آراستہ ہے۔ بوڑھے شہنشاہ کے تخت کے پیچھے اس کی مہ جبین کنیز فرزانہ مورچھل کو پنکھا لئے کھڑی ہے۔ تخت کے نیچے ملک کا مشہور نوجوان مصور فرید ادب سے دست بستہ کھڑا ہے۔

"حاضرین دربار! آج میں آپکو اپنے ملک کے سب سے مشہور مصور کا شاہکار دکھاتا ہوں" شہنشاہ اعظم نے کہا۔

اور ایستادہ ہو گئے۔ شہنشاہ نے پاس رکھے ہوئے طلائی چوکھٹے کی نقاب کشائی کی۔

"سبحان اللہ، ماشاء اللہ!!" حاضرین دربار کی زبان سے بیاختہ نکل گیا۔

"بیشک یہ ایک نگار روزگار شے ہے۔ فرزانہ میرا کھلونا ہے۔ بچوں اور بوڑھوں دونوں کو کھلونوں کی ضرورت ہوتی ہے — میرے اس کھلونے کی تصویر فرید نے چھ ماہ کی لگاتار محنت کے بعد تیار کی ہے۔ تصویر کو غور سے دیکھو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے رخساروں پر فرید نے اپنے خون دل سے رنگ آمیزی کی ہے۔ ان سرخ جھلکیوں میں کیا کچھ نہ کھلائی نہیں دے رہا ہے۔ — اس تاج خاندانی کی قسم! میں فرید کو منہ مانگا انعام دوں گا۔ کہو فرید کیا انعام مانگتے ہو" شہنشاہ اعظم نے ستائش، قدردانی اور انتہائی خلوص کے جذبات میں سرشار ہو کر کہا۔

فرید جھجکا — فرزانہ کی نظروں نے جرأت دلائی لیکن اس کی پیشانی پر پسینہ کی بڑی بڑی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ہونٹوں پر کپکپاہٹ تھی۔ آنکھیں کھلی ہونے پر بھی بند تھیں۔ کچھ جرأت دکھانا چاہتا تھا لیکن قاصر تھا — دربار میں عجیب سا سناٹا تھا — فرید اور فرزانہ کی پھر آنکھیں چار ہوئیں۔ فرزانہ کی نظروں میں فرید کو امید اور جوش کی جھلک نظر آئی — حاضرین دربار گوش بر آواز تھے — چاروں طرف ایک قسم کا مقدس سکوت طاری تھا — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرید کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا ہے۔

کچھ دیر تک یہ کیفیت دیکھنے کے بعد خود شہنشاہ اعظم نے سکوت توڑا۔

"کیوں، کیا بات ہے؟ فرید! میرے وعدے پر شبہ نہ کرو۔ جو کچھ تمنا ہے دل صاف صاف بیان کر دو۔ درحقیقت میں تم کو منہ مانگا انعام دوں گا"

"حضور! جان بخشی ہو تو عرض کروں" بہت سے کام لے کر فرید نے رکتے رکتے کہا — فرزانہ کی آنکھیں جوش مسرت سے چمکنے لگیں۔ حاضرین دربار متوجہ ہو گئے۔

"ہاں! ہاں! کہو۔ اس فضول تاخیر سے کیا فائدہ" شہنشاہ اعظم نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر حضور! مجھ کو میری محنت کے صلے میں — میری بنائی ہوئی یہی تصویر عنایت کر دی جائے"

"ہیں — ہائیں یہ کیا کہہ رہے ہو تم!" شہنشاہ اعظم نے تعجب وحیرت سے دریافت کیا۔

"جی ہاں حضور! بالکل سچ عرض کر رہا ہوں" فرید نے جواب دیا۔

"میری خوشی تو اسی میں تھی کہ تم فرزانہ کو مجھ سے مانگتے — چھ مہینے کی مسلسل صحبت میں تم دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے ہو۔ میں نے اکثر تم دونوں کی آنکھوں میں محبت کا نشہ دیکھا ہے۔ میں تو فرزانہ کو پھول اور تم کو بھونرا سمجھنے لگا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ بھونرا شاد کام ہو" شہنشاہ اعظم نے کہا۔

"لیکن حضور میں ایسا پھول لے کر کیا کروں۔ جو چند ہی روز میں اپنا حسن کھو بیٹھے۔ مجھ کو تو "حسن پائیدار" کی ضرورت ہے جس کی تکمیل بگوشت پوست کی فرزانہ نہیں کر سکتی ہے!—!"

خدارا! میرے حضور۔ مجھکو یہ تصویر دے دیجئے۔ یہ ہمیشہ شگفتہ وحسین رہے گی — لائیے — لائیے" فرید بے چین ہو کر چیخنے لگا۔

"واہ فرید تیرا مرتبہ بہت بلند ہے تو بے شک مصوّر ہے۔

ع "برہمن تجھ سا نہیں حسن کے بت خانے میں"

رُباعیات

[illegible]

ضیاؔ

دل جھوم اُٹھا جو ابر پارے جھومے
آنکھوں میں محبت کے ستارے جھومے
نظارہ بہ نظارہ جید جام بہ جام
ہم گردن مینا کے سہارے جھومے

[illegible]

جعفری

نانکنگ

جاپانیوں نے ۱۹۳۷ء میں نانکنگ کو تباہ کردیا تھا' لیکن یکم مئی سے وہ دوبارہ چین کا صدر مقام ہوگیا ہے۔ بہت سے سرکاری دفتر تو پہلے ہی آگئے تھے لیکن جنرلسیمو چیانگ کائی شیک اور انکے وزراء کی آمد کے بعد پوری چہل پہل شروع ہوگئی۔ جنرل مارشل نے بھی چنکنگ سے واپس آنے کے بعد جرمنی کے سابقہ سفارت خانے میں اپنا صدر دفتر کھول لیا۔ ۱۹۳۷ء میں اعلان جنگ کئے بغیر جاپان نے حملہ کیا اور مارچ ۱۹۴۴ء تک چین کے دس صوبوں پر قبضہ جما لیا۔ ۱۹۴۰ء میں نانکنگ کے مقام پر انہوں نے 'جمہوریت چین کی قومی حکومت' قائم کی۔ جولائی ۱۹۴۱ء میں جرمنی اٹلی بلغاریہ رومانیہ سلوویکیہ ہسپانیہ اور ہنگری نے اس نام نہاد حکومت کو تسلیم کر لیا۔ گویا اسطرح اسکے تعلقات یورپی ممالک سے استوار ہوگئے۔ لیکن زمانے کی کروٹ بدلنے کے ساتھ نہ ان ملکوں کی آن بان باقی ہے اور نہ جاپان کا پچھلا اقتدار۔

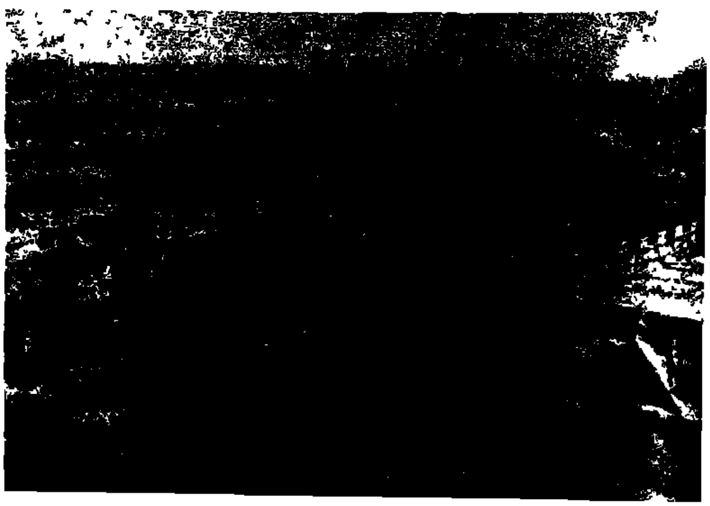


نانکنگ کے جند بازاروں کا ایک دلکش منظر وسط میں ڈاکٹر سن یات سین کا مجسمہ نصب ہے۔



• مئی کو ڈاکٹر سن یات سین کے مقبرے کی زیارت کے بعد جنرلسیمو اور میڈم چیانگ کائی شیک واپس جا رہے ہیں۔

✡



قومی حکومت کے دوبارہ قائم ہونے کی یادگار منانے وقت نانکنگ کے عام باشندے اور سپاہی جمع ہوکر اصل رسم ادا کررہے ہیں۔

هاتھی ۔ کڈھا ۔

جنوبی ہندوستان میں ریاست میسور بڑے جانوروں کے شکار کیلئے خاص جاذبیت رکھتی ہے شیروں اور جنگلی ہاتھیوں کی تلاش میں گھنے جنگلوں کی خاک چھاننے والے وہاں جاتے اور اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔ وہ ہاتھیوں کو گھیر گھار کر لکڑی کے ایک جنگلے میں قید کردیتے ہیں جسے اپنی زبان میں «کڈھا» کہتے ہیں۔ یہ مستطیل شکل کا جنگل کی مضبوط لکڑیوں کا بنا ہوا جنگلہ ہوتا ہے جس میں کئی حصے ہوتے ہیں۔ اسکا دروازہ اتنا وسیع رکھا جاتا ہے کہ ہاتھی آسانی سے گذر سکیں۔ اسے بنانے بھی ایسے راستے پر ہیں جہاں سے ہاتھی عموماً گذرتے ہوں۔ ہاتھیوں کو دیکھتے ہی شکاری ڈھول بجاتے چیختے چلاتے اور خوب غل مچاتے ہیں۔ اور انہیں ہنکا کر کڈھے کے قریب لے آتے ہیں۔ جب ہاتھیوں کو کوئی راہ فرار نظر نہیں آتی تو وہ اس جنگلے میں چلے جاتے ہیں۔ پھر مہارت سدھائے ہوئے ہاتھیوں کے ساتھ کڈھے میں جاتا اور ہاتھیوں کو ایک ایک کرکے الگ الگ حصوں میں داخل کردیتا ہے۔ کئی دن تک تنہا رہنے کے بعد ہاتھی اس ماحول سے مانوس ہو جاتے اور اپنے جنگلی پن کو چھوڑ دیتے ہیں۔



ایک تجربہ کار مہاوت جو سابو نامی فلمی اداکار کا چچا ہے کڈھے میں کھڑے ہوئے ایک جنگلی ہاتھی کو رسی سے جکڑ رہا ہے۔



جنگلی ہاتھی ایک ندی میں نہا کر خوش ہو رہے ہیں۔



ایک پالتو ہاتھی جنگلے میں داخل ہو رہا ہے۔

ہندوستانی بت تراشی کے نمونے

(جنوب مشرقی ایشیا میں)



شاندار کمبودی آرٹ کا ایک اعلی نمونہ۔ مہارا یعنی سمندر کی ایک عجیب الخلقت ہستی ہے جس کا دھڑ ماہی سے مشابہ ہے دو عورتوں کو اپنے جبڑوں میں دبا رکھا ہے۔



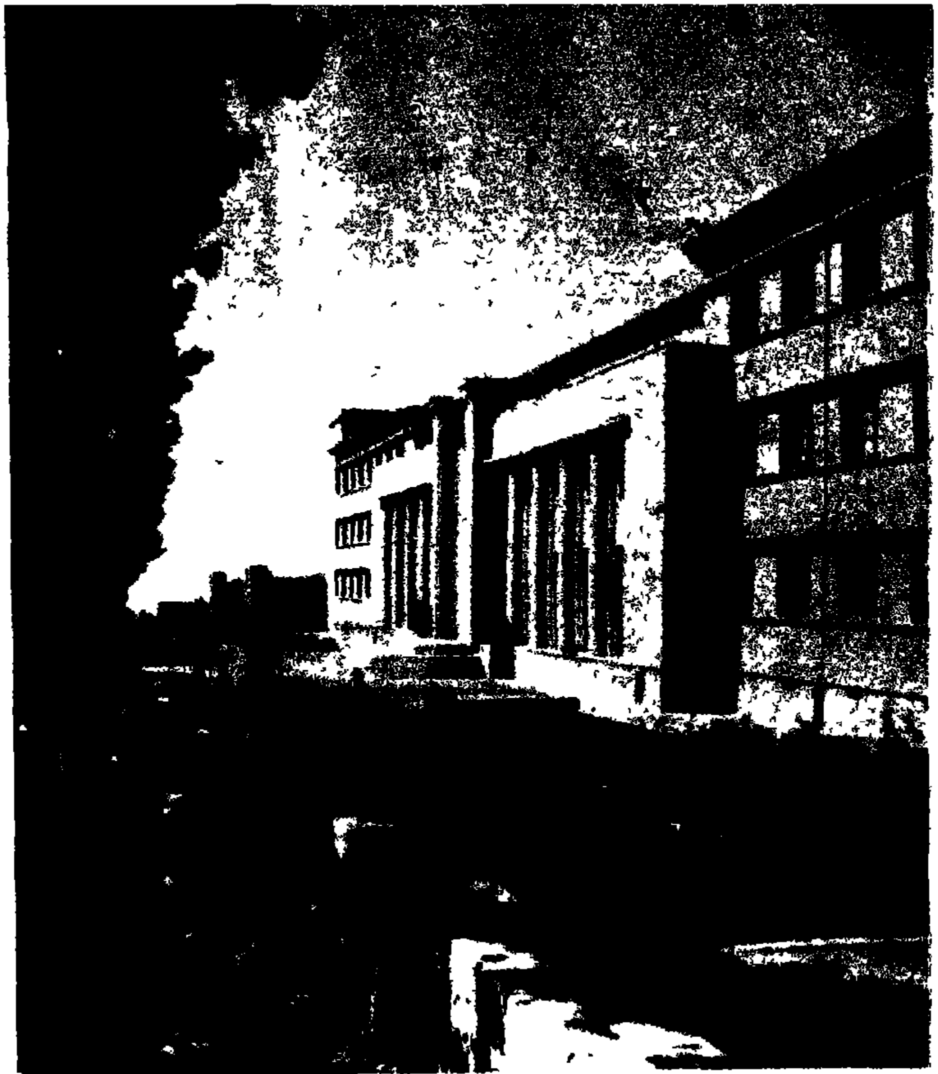
وشنو دیوتا کی ایک صحیح سالم مورت جو نویں صدی کی ہے انککور کے قریب برآمد ہوئی۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق وشنو دیوتا نے نظام شمسی کو سنبھال رکھا ہے۔



کانسی کا بنا ہوا خمر آرٹ کا ایک اعلی نمونہ جو بارھویں صدی کا ہے۔ ناگ دیوتا جس پر زنگاری رنگ چڑھا ہوا ہے پھن مارنے کے انداز میں کھڑا ہے۔ ←

جامعه طهران

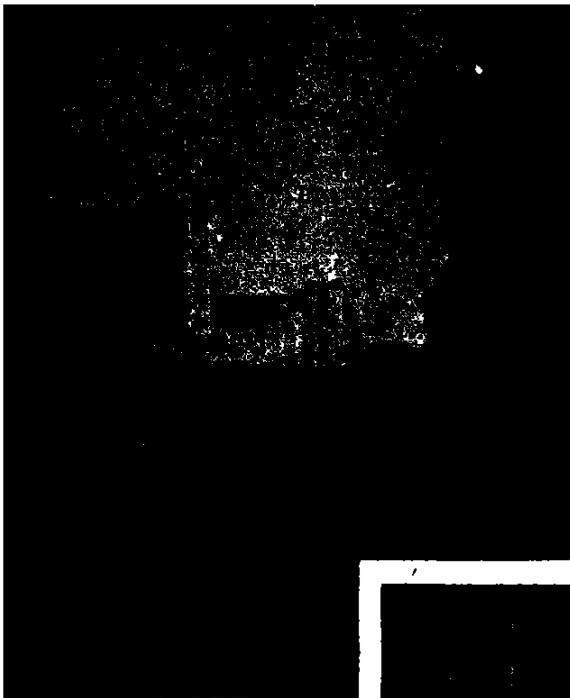
جامعہ طہران ایران کی واحد یونیورسٹی ہے۔ اسکا شمار دنیا کی بہترین درسگاہوں میں کیا جاتا ہے۔ دوسرے مضامین کے علاوہ اس میں طب' قانون اور علمی فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جیسا کہ اس صفحہ کی تصاویر سے ظاہر ہے جامعہ طہران کی سب عمارتیں نئی طرز پر بنی ہوئی ہیں اس میں طلبا کے کھیلوں کے لئے کلب اور ایک ریستوراں بھی ہے۔ انکی جسمانی ترقی کیلئے کھیل کے میدانوں کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہر کالج نے اپنی لائبریری الگ بنا رکھی ہے جس میں یورپ کی تقریباً ہرزبان کی کتابیں جمع ہیں۔ انکی مجموعی تعداد دس ہزار کے قریب ہے۔ ابتدائی آٹھ سال تک جامعہ کا نظم و نسق سرکاری حکام کے ہاتھوں میں رہا۔ اس کے بعد ایران کی پارلیمنٹ نے ایک قانون بنا کر اسے آزاد کر دیا اور اسکی ایک مجلس انتظامیہ بنادی۔ تاسیس جامعہ کی یادگار میں ہر سال سارے ایران میں ایک اچھا جشن منایا جاتا ہے۔



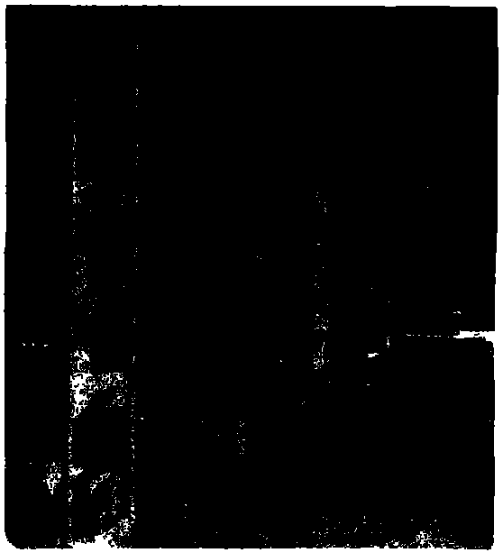
فنون کی درسگاہ کا ایک نظارہ۔



اقامت گاہ کا خوبصورت باغیچہ۔







قانون کے کالج کے سامنے
دلکش منظر۔

—— :o: ——

طلبا کی کلب کا بڑا ها
ریستوران۔

جامعہ کا ٹکنیکل کالج

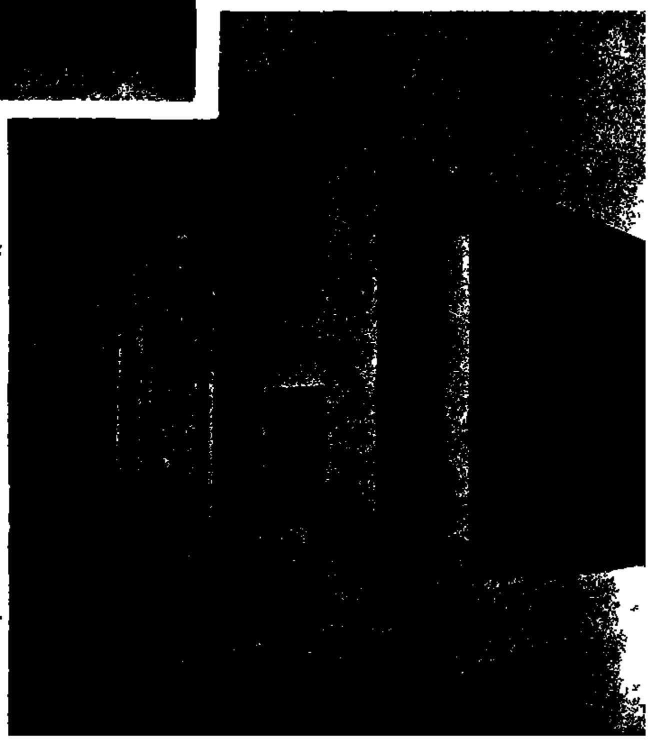
—— o ——

امعہ کی لائبریری کا ایک حصہ۔

—— :o ——

قانون کے کالج کا دروازہ







دربار صاحب' امرتسر' کا ایک دلکش نظارہ۔ یہ سکھوں کی ایک مقدس زیارت گاہ ہے۔

امرتسر

'سکھوں کا مقدس شہر'

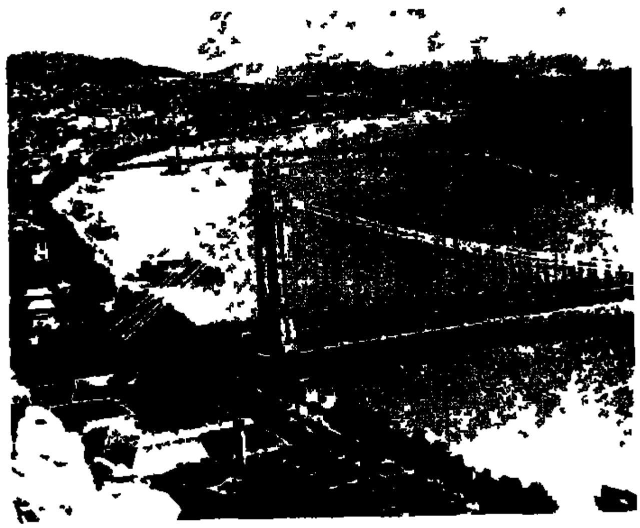
۱۵۷۷ میلادی میں اکبر بادشاہ نے ایک قطعۂ زمین گرو رام داس جی کو جو سکھوں کے روحانی پیشوا تھے عطا کیا اور اسکے ساتھ ایک بہت بڑا حوض بھی ملا دیا۔ گرو جی نے اسکا نام 'امرتسر' یعنی 'آب حیات کا حوض' رکھا۔ انہوں نے حوض کے بیچ میں ایک گردوارہ تعمیر کرایا اور اسکا نام 'ہری مندر' رکھا۔ شہر اور عبادت گاہ انہی ناموں سے ابتک مشہور ہیں۔



دربار صاحب' امرتسر' کے صدر دروازہ کا ایک حصہ۔ پتھر پر اعلیٰ نقاشی کا کام حد درجہ دیدہ زیب ہے۔

هنگری

یورپ کے مظلوم ترین ملک هنگری سے متعلق ایک مضمون «کشمکش حیات» کے عنوان سے اسی شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ان تصاویر کو دیکھکر اس کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔



سنٹ گیلرٹ ماؤنٹ سے ایک دلکش نظارہ۔



گریٹ ووٹو چرچ میں جانے کا صدر دروازہ۔



بڈاپسٹ کا مشہور شاہی محل جو میریا تھریسا نے ۱۷۴۹-۷۱ء میں بنوایا تھا۔ یہ تصویر لڑائی سے پہلے لی گئی تھی۔



اسی محل کا دوسرا منظر جبکہ سات ہفتے کی مسلسل بمباری نے اسکے سقف و بام منہدم کرکے رکھدیے ہیں



نورجہاں —— ایک فلمی ستارہ۔

دُھواں

افسانہ

شمس عظیم آبادی

وہی کثیف دھواں۔ وہی بکدر فضا وہی بے حسی اداسی بس کا جی الجھنے لگا اس نے ایک بار کھڑکی سے باہر سر نکالا اور پھر زور سے شٹر گرا دیا۔ دُھواں دُھواں! کثیف دھواں! جہاں دیکھو دھواں اٹھ رہا ہے شہر بھر کوئلہ اور لوہے کا کارخانہ ہو گیا ہر وقت دھواں! جب دیکھو دھواں!۔ اور سامنے کے مکانوں کی چمنیوں سے دھواں نکلتے دیکھ کر اس کا جی ہوا کہ سارے شہر کی چمنیوں پر ایک دبیز بھاری پتھر رکھ دے تاکہ دھوئیں باہر نہ نکل سکیں اور اس گھر کے رہنے والے دھوئیں کی شدت سے گھٹ کر نہ مر جائیں ——

دھواں!!! آہ! اسے دھوئیں سے نفرت ہے وہ دھوئیں کی کثافت برداشت نہیں کر سکتا —— یکایک اس کی نظر آتشدان پر پڑی جہاں دھیمی دھیمی آنچ سے کوئلہ دہک رہا تھا اور کوئلہ کا دھواں اس کے بڑے سوراخ سے ہوتا ہوا اوپر چمنی کے باہر جا رہا تھا۔ اس کے کمرے بھی اس کے کمرہ سے بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ جھنجھلا گیا! دھواں! دھواں! دھواں! اس کے اپنے کمرے میں دھواں۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی پانی کی بوتل کو آتش دان میں کوٹ دیا۔ نہ آگ جلے گی نہ دھواں اٹھے گا۔ پانی تھوڑا تھا آگ پوری نہ بجھ سکی۔ کوئلہ بھیگ گیا اور بجھے ہوئے کوئلے کے ٹکڑوں نے انگاروں سے مل کر اور دھواں پیدا کر دیا اور پھر سارے کمرے میں دھواں پھیل گیا۔ دھوئیں سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس نے جھنجھلا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا —— وہ کمرے سے باہر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر کمرے کے باہر بھی تو دھواں تھا۔ وہ دھوئیں سے بیزار تھا وہ ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں نے دھواں نہ اٹھتا ہو! ——

اس نے آتشدان پر ایک کاغذ ڈھانک دیا۔ دھواں بہت تیزی سے آتشدان کے بڑے سوراخ سے ہوتا ہوا اوپر چمنی سے باہر نکلنے لگا —— اس نے شٹر کھول کر اوپر اٹھا دی۔ دھوئیں کی تہہ آسمان پر اور موٹی ہو گئی تھی۔ مختلف چمنیوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے چھوٹے بڑے گول دائرے۔ اور اس کا جی ہوا کہ یہ دائرے پھانسی کے پھندے بن جائیں اور ان پھندوں میں وہ ان لوگوں کی گردنیں ڈال دے جن کے گھروں سے یہ دھواں اٹھ رہا تھا —— ہوا کے ایک جھونکے سے بہت سا دھواں اس کی ناک کو چھوتا ہوا اس کے کمرہ میں چھا گیا۔ اس نے چڑ کر کھڑکی سے سر ہٹا لیا —— کثیف دھواں ابھرا۔ اپنی کھڑکی کے نیچے دو سائے نظر آئے۔ جلدی اپنا پورا سر کھڑکی سے باہر کر دیا۔ دو مخلوط سائے۔ جنہیں دھوئیں نے گھیر لیا تھا اس نے زیادہ نمایاں طور پر دیکھنے کی کوشش کی اور جوں جوں اس نے زیادہ دیکھنے کی کوشش کی اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ دھوئیں کی ایک بڑی کثرت منہ اور ناک گھونٹ رہا ہے۔ وہ مخلوط سائے۔ دو پیوست نقوش۔ کثیف دھواں۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے تمام جسم سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اس نے زور سے شٹر گرا دیا۔ اس کا جسم دہک رہا تھا آتشدان میں آگ بہت تیزی سے جل رہی تھی۔ دھواں بہت کم نکل رہا تھا —— اس کا دل جل رہا تھا۔ انگاروں کی طرح تپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے دھواں نکل رہا تھا۔ دھواں! کثیف دھواں! وہ چیخ اٹھا۔ دھواں!!!!

بیت رہی برسات

رین اندھیری ساون کی رت
بادل گونجے بجلی چمکے
کیسے بتاؤں من کی بات
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے
کوئل کی دردیلی صدائیں
کیسے بتاؤں من کی بات
سنا ہے سجن یہ ساون جھولا
گیت سکھی میں کیسے گاؤں

چھائی گھٹا گھنگھور
دھک دھک ہو من مور
بیت رہی برسات
من مورا بھر آئے
ہوک سی جیہ جیہ جائے
بیت رہی برسات
من مورا تھرائے
ہائے جیا کلپائے

کیسے بتاؤں من کی بات
رو رو تڑپوں رین بتاؤں
ساجن اب تک گھر نا آئے
کیسے بتاؤں من کی بات
رہتے تھے جب پاس پیا
دیکھ لیا یاں جو کچھ دیکھا
کیسے بتاؤں ان کی بات
بھول گئے پردیس بسے
ساجن کیا سچ روٹھ گئے
کیسے بتاؤں من کی بات

بیت رہی برسات
ہائے جیا گھبرائے
رہ رہ یاد ستائے
بیت رہی برسات
جگ میں سب کچھ اپنا تھا
کتنا سندر سپنا تھا
بیت رہی برسات
پریت روگ لگانا تھا
دو دن مجھ کو ہنسانا تھا
بیت رہی برسات

عائشہ پروین

ہندوستانی ثقافت و فنون پر مصر کے اثرات

کے حسین

دآرا نے ۳۲۱ قبل مسیح میں اس کے الگ بھگ زمانے میں گندھارا فتح کیا تھا۔ گو وہ بےستون سے برآمد ہونے والی تختیوں پر اس کے مفتوحہ ممالک کی تفصیل درج تھی۔

ہندوستان کی طرف سے دآرا کو ہر سال ۳۶۰ ٹیلنٹ سونا خراج کے طور پر دیا جاتا تھا ایک ٹیلنٹ کا وزن ۳۵ سیر ہوتا تھا۔ اس حساب سے خراج کی رقم بہت زیادہ تھی۔ ایسے حوالے بھی ملتے ہیں کہ بلوچستان ایک غریب ملک ہونے کے باعث دآرا سب سے کم خراج دیتا تھا۔ یعنی ۱۷۰ ٹیلنٹ چاندی۔ لیکن یہ بات زیادہ تعجب خیز ہے کہ دریائے سندھ کے دو نام ہوتے تھے۔ فارسی زبان کے ایک مسودے میں (شاہجہان نامہ مصنفہ معتمد خاں صفحہ ۲۵۶ سطر ۲) دریائے سندھ کو دریائے نیلاب لکھا گیا ہے۔

کیا اس کے معنے یہ ہوئے کہ ان آریاؤں کو جو بعد میں آکر دریائے سندھ کے کنارے بسنے والے پہلے مہاجرین کے ساتھ مل گئے تھے مصر کا دریائے نیل یاد تھا اور اسے اس ملک کی یادگار رہیں جسے چھوڑ آئے تھے، سندھ کا یہ نام رکھ دیا؟

ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، فراعنہ مصر نے جب ہائکسوس قوم پر غلبہ حاصل کر لیا تو کسی بحث و تمحیص میں حصہ لینا ان کے لئے دشوار تھا۔ پھر بھی صلح کی گفت و شنید کر لینے کے بعد انہوں نے بیس لاکھ ہائکسوں کو ۱۵۹۰ قبل مسیح کے لگ بھگ اجازت دیدی کہ وہ بےخوف و خطر مصر چھوڑ کر چلے جائیں۔ یہ تو معلوم ہے کہ ہائکسوس یروشلم اور عرب کو پار کر گئے لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ یہودیوں، شامیوں یا عربوں کے حوالاجات سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کس جگہ قیام پذیر ہوئی اور نہ قبائلی روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ بدویوں کے ساتھ شیر و شکر ہو کر انہی میں مدغم ہو گئے۔ حکومت مصر کی قدرتی سرحد دریائے فرات کے کنارے تک قائم تھی۔ اسلئے ظاہر ہے کہ ہائکسوس کو اس حد کے اندر رہنے کی اجازت نہیں ملی ہوگی ورنہ ہر وقت ان کی طرف سے اندیشہ لگا رہتا۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے دریائے فرات کو عبور کیا اور بابل و سیمارا میں عارضی طور پر قیام کرنے کے بعد وہ آگے بڑھے اور درۂ بولان یا درۂ خیبر کی راہ دریائے سندھ کی وادی تک چلے آئے۔ جہاں گنڈوانوں کی حیثیت سے پہلے مہاجرین آئے تھے اور یہ لوگ انہی میں مل جل کر رہ گئے۔

غالباً یہی سب سے بڑے سبب کی بنا پر مصر کے فرعون رمسیس نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اثرات کا دوسرا ثبوت ان عقائد ملتا ہے کہ چھوٹے پیالے کے ظروف میں جو مصر، تالمیہ اور موہنجوداڑو سے برآمد کئے گئے، زبردست مشابہت پائی جاتی ہے حتیٰ کہ ان میں سے بعض کی وضع قطع بھی یکساں ہے۔ ایک دلچسپ مشابہت اس نمونے میں پائی جاتی ہے جو تاریخ مصر مصنفہ بریسٹڈ کے صفحہ ۳ پر دیا گیا ہے۔ اس ہنڈیا پر کھدائی کا کام بہت بڑی حد تک اس اقتاطی سے ملتا جلتا ہے جو پنجاب کے بنے ہوئے مٹی کے حقّوں پر اب بھی عام ہے۔ مٹی کو پاؤں سے گوندھ کر گارا بنایا جاتا اور پھر اس گارے کو چکنی پر رکھ کر زور سے گھمایا جاتا تھا۔ مصر میں قاعدہ تھا کہ برتن کی خاص وضع قطع ڈھالنے کے لئے انگلیوں کی مدد لی جاتی تھی اور یہی دستور ہندوستان میں رائج تھا۔

مصری لباس جن کے کنارے نیلے رنگ کے تھے فراعنہ کے مقبروں سے برآمد ہوئے ہیں۔ اینکا کیمیاوی معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ انہیں نیل میں رنگا گیا تھا۔ اور سب جانتے ہیں کہ نیل وادی سندھ کے شہر بربریکون سے مصر بھیجا جاتا تھا۔ جن کپڑوں کا معائنہ کیا گیا وہ بہت قدیم ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ پرانے زمانے سے ان کی برآمدگی عام تھی۔

مصر کے کھیتوں میں بیلوں کے ذریعہ ہل چلایا جاتا تھا۔ ہل کی بناوٹ بھی وہی تھی جو ہندوستان کے دیہاتوں میں استعمال ہونے والے ہلوں سے مشابہ تھی اسی طرح کتائی وغیرہ کے اوزاروں میں بھی یکسانیت کا پتہ چلتا ہے۔

دوسرا دلچسپ سوال اگنی پوجا سے متعلق ہے۔ اس کی رسم کتنی پرانی ہے؟ اس کا طریقہ کہاں سے اختیار کیا گیا؟ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم بہت ہی پرانے زمانے سے ایرانیوں میں رائج تھی۔ آگ کا احترام لوگوں کے دلوں میں اسوقت پیدا ہوا جب ایک بار موسم سرما میں باکو کے قریب خود بخود شعلے اٹھتے دکھائی دئے حالانکہ زمین کی سطح برف سے

ڈھکی ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسا مظہرِ قدرت تھا جسے اگلے وقتوں کے لوگ سمجھنے سے قاصر تھے۔ سر پرسی سائکس نے اپنی کتاب "تاریخِ ایران" مجلد اول کے صفحہ ۱۱۰ پر اس حادثۂ طبعی کا حال لکھا ہے۔ ایران سے آگ کی پوجا کی رسم بابل اور سیمارا میں اور وہاں سے ہندوستان میں منتقل ہوئی۔

اس مظہرِ قدرت کی توجیہ اب آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ باکو تیل والی زمینوں کے قریب ہے اور جو شعلہ اس وقت نظر آیا وہ ضرور پیٹرول کے ابخرات کے بھڑک جانے کا نتیجہ تھا۔ یہ بات اس لحاظ سے ہمارے لئے بہت دلچسپ ہے کہ اس سے ایک رسم کے نقل مکانی کی سمت کا پتہ چلتا ہے۔ کہ مشرقی اثرات کی بنا پر اس کی تقدیس و پرستش روما اور اثینیہ میں عام تھی۔ لیکن وہ عضوِ تناسل کی پوجا سے بالکل مختلف تھی (ہندوستان میں اس پوجا کو "لنگ پوجا" یا "شیو لنگ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) پوجا کا یہ طریقہ مصر والوں کو بہت ہی پرانے زمانے میں معلوم تھا۔ اور قبط جو دریائے نیل کے اس موڑ پر واقع تھا، جو بحیرۂ احمر کے بالکل نزدیک ہے، اسی طریقۂ عبادت کے لئے مشہور تھا۔ مسودات سے پتہ چلتا ہے کہ باہمی تعلقات پیدا ہو جانے کے بعد اس رسم کو یونان والوں نے بھی اختیار کیا تھا۔ یہ عام عقیدہ تھا کہ اس کی پوجا کرنے والوں کو زرخیزی نصیب ہو جاتی تھی۔ چونکہ بحیرۂ احمر کی بندرگاہوں کے ذریعہ ہندوستان کے آریاؤں کے ساتھ تجارت اور بیوپار ہوتا تھا اسلئے سندھ کی وادی میں رہنے والے آریاؤں نے اسے اختیار کر لیا اور اب بھی اس پوجا پر کاربند ہیں۔ عضوِ تناسل کے دیوتا کو "چم" کہا جانے لگے۔ یونانی اسے "پین دیوتا" کہا کرتے تھے۔

اب ہمیں ثقافت کے ایک دوسرے پہلو پر نظر ڈالنی چاہئے جس سے ہمیں اندازہ ہو سکیگا کہ قدیم زمانے کے لوگوں نے تہذیب و تمدن کا کتنا بلند درجہ حاصل کر لیا تھا مثلاً موسیقی کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ قبل تاریخ کے وہ لوگ جو غاروں میں رہتے تھے، ناچ گانے کے شائق تھے کیونکہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسرت و شادمانی، رنج و غم اور امید و یاس کے جذبات ظاہر کرنے کا سب سے بڑا قدرتی طریقہ یہی ہو سکتا ہے۔ ہسپانیہ کے کھریا کے غاروں میں جو نقش و نگار ہیں وہ اسی چیز کو ظاہر کرتے ہیں یعنی یہ کہ غاروں کے رہنے والے شکاریوں کے گرد ناچ رہے ہیں۔ تاریخ سے پہلے کے ان لوگوں نے صرف ہڈی کے ٹکڑے ناچ کا ٹھمکا یا گیت کی تال ظاہر کرنے کیلئے استعمال کئے ہونگے۔ یہی ٹکڑے ترقی پاکر کھڑتال بن گئے جن کا استعمال آج تک رائج ہے۔ جہاں تک معلومات کا تعلق ہے مصریوں نے سب سے پہلے موسیقی کے ساز ایجاد کئے۔ اگرچہ مصری کاہنوں کیلئے بہت سی چیزیں ممنوع تھیں تاہم ناچ گانے کی انہیں بھی اجازت تھی۔ قدیم ترین فراعنۂ مصر کے مقبروں میں دیواروں کی پچیکاری دیکھنے سے اس امر کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اس کے بہترین نمونے سر گارڈنر ولکنسن نے اپنی کتاب "قدیم مصری" میں صفحہ ۹۸ تا ۱۴۳ پر دکھائے ہیں۔ موسیقی کے یہ چند ساز پہلے پہل مصریوں نے استعمال کئے تھے۔ کانسی یا پیتل کے بنے ہوئے مجیرے۔ آج بھی ہندوستان میں اسی وضع کے مجیرے استعمال ہوتے ہیں۔ کئی قسم کے کھڑتال جن کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ اور بربط۔ خصوصاً بربط کا وہ جوڑا جو تھیبس کے مقبرے کی دیواروں پر بنا ہوا ہے، خوبصورتی اور فنی اعتبار سے بے مثل ہے۔

بربط یہودیوں نے اپنایا اور پھر اس کا رواج سارے یورپ میں ہو گیا۔ دراصل اس زمانے کے پیانوں کو اسی کا نقشِ اول کہا جا سکتا ہے۔ دوسرا تار والا ساز جو ستار سے ملتا جلتا ہے اور غالباً اسی قسم کے سازوں میں وضع قطع بدل کر رباب، وینا اور ستار بن گئے۔ مصری زمانہ قدیم

موسمِ گل

موسمِ گل ہے عجب شور ہے میخواروں میں
جان سی پڑ گئی فطرت کے پرستاروں میں

کس غضب کی ہے کشش عشق کے درباروں میں
خود بخود حسن کھنچا آتا ہے کہساروں میں

حوصلے بڑھ گئے پوشیدہ گنہگاروں میں
اب تو واعظ بھی نظر آتے ہیں میخواروں میں

اک فقط میں ہی نہیں حسن کے بیماروں میں
زخم ہی زخم نظر آتے ہیں گلزاروں میں

شہر ویران ہوئے دیہات نے رونق پالی
زندگی ناچتی پھرتی ہے چمن زاروں میں

سبزہ و گل کی روش پر نظر اے سروِ خرام
دلِ شاعر بھی ہے ان حاشیہ برداروں میں

کیا غضب ہے کہ غضبناک بنے رہتے ہوا
آگ لگ جائے دہکتے ہوئے انگاروں میں

کس طرح ناوکِ نازک کے لگائیں بھالے
چارہ گر خود ہی نظر آتے ہیں بیماروں میں

آنکھ سے آنکھ ملی ٹوٹ پڑی برقِ نظر
دل کا شیرازہ کھلا مل گیا سیاروں میں

سینہ خالی بھی نہیں، دل بھی نہیں، دل کی جگہ
اک وضعدار، مگر لاکھ وضعداروں میں

گردشِ نقشِ قدم منزلِ دل بن کے رہی
اک سفینہ کو قرار آ گیا منجدھاروں میں

پھونکتا رہتا ہوں دل سوزِ محبت سے عمرؔ
خاک کو پاک کیا جاتا ہے انگاروں میں

عمران انصاری

سے بانسری بجاتے رہے ہیں۔ ان کے پاس بانسری ہوتی بھی تھی۔ نفیری کی ایک قسم جو آج بھی یورپ میں بادشاہوں کی تشریف آوری کے موقعوں پر بجائی جاتی ہے، قدیم مصریوں میں رائج تھی۔ یہ لوگ ایک چوکور وضع کا طنبورہ بجاتے تھے جو عرب میں پہنچ کر مدور ہو گیا اور اہلِ عرب اسے دف کہنے لگے۔ اس میں مجیرے جیسی چھوٹی چھوٹی پیتل کی ٹکڑیاں ہوتی تھیں۔ عرب سے وہ سپانیہ پہنچا جہاں اب بھی وہ بہت زیادہ مقبول ہے۔ ہندوستان میں اس کو فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ تاہم اس وقت کا شہرۂ آفاق ڈھول افریقہ تک پھیلا اور ہندوستان میں پہنچ کر اپنا سکہ جما بیٹھا۔ مصریوں نے کسی قدر طویل قسم کا ڈھول بھی اختراع کیا جسے غالباً پکھاوج کا جدِ امجد کہا جا سکتا ہے۔

گیتوں کی سنگت میں کسی تار والے ساز کا بجایا جانا ہمیشہ خوش مذاقی کا ثبوت دیتا ہے۔ نئے لوگوں کو تربیت دیتے وقت ہمیشہ اسے زیرِ مشق کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ توجہ اس امر پر مبذول رہتی تھی کہ صرف وہی گیت اور گانے سکھائے جائیں جو صحیح قسم کے ہوں۔ کوئی محفل اچھے مذاق کی حامل نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک کہ اعلیٰ موسیقی کا بھی انتظام نہ کیا گیا ہو۔ گویّے گاتے بجاتے لوگوں کو خوش کرتے اور اس طرح اپنی روزی کماتے پھرتے تھے۔ اس وقت بھی ہندوستان میں ہم کو سادھوؤں کی قسم کے ایسے گائک نظر آتے ہیں جو تفریحِ طبع کے لئے دیہاتیوں کے مجمع کے سامنے اشلوک گاتے پھرتے ہیں۔

لیکن مغرب کو اس لحاظ سے مشرق پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے کہ وہاں موسیقی کی تانیں پوری احتیاط کے ساتھ دائرہ تحریر میں آسکتی ہیں چنانچہ ماہرینِ موسیقی کے مختلف دلکش نغمے اب تک بجنسہ محفوظ ہیں لیکن ہندوستان میں ہر شاگرد مجبور رہا ہے کہ وہ صرف کانوں کا سہارا لے کر مختلف استادوں سے یہ فنِ لطیف سیکھے۔ اس نظام کے باعث ہندوستان بڑے گھاٹے میں رہا کیونکہ بہت سے اچھے نغمے اور پیاری دھنیں چند گھرانوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئیں اور ان سے عام غریب طالب علم محروم رہ گئے۔ مغرب کے دوش بدوش مشرق میں بھی اچھے کلاکار پیدا ہوئے ہیں مثلاً حضرت داؤد جو یہودیوں کے بادشاہ تھے۔ اسحاق موصلی، ابن جامی، دمشق میں دربارِ خلافت کا موسیقی اور سپانیہ میں الحکم کے دربار کا ضراب۔ غالباً اسی یا اس کے لگ بھگ زمانے میں سرزمینِ ہند کے دو فنکار گوپال نائک اور حضرت امیر خسرو گذرے ہیں جو خلجی حکمرانوں کے عہدِ حکومت میں تھے۔ ان کے بعد تان سین اور بیجو باؤلے کا رنگ جما۔ لیکن ان کی فنی مہارتوں کا کوئی نمونہ جو ہم تک باقی رہ گیا سوائے اس کے جو سینہ بسینہ محض کانوں کے اعتبار کے ساتھ ہم تک پہنچ سکا ہے اور جو بہت ہی قلیل ہے۔

(ڈان کے شکریہ کے ساتھ)

سیدہ اختر و اقبال

علامہ اقبال کی غزل پر

محبت کے رنگیں نشاں اور بھی ہیں!　　ترے منتظر کارواں اور بھی ہیں!
مکاں اور بھی لامکاں اور بھی ہیں!　　ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

تری جستجو کی نہیں انتہا میں؛　　مگر پائے ذوقِ طلب کو بڑھائیں!
اٹھو پردۂ آرزو کو ہٹائیں؛　　تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں؛
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

ہر اک ذرہ درد تمنا سے مضطر؛　　ہر اک گام تازہ بہ تازہ ہے محشر؛
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر؛　　نگاہوں سے پوشیدہ لاکھوں ہیں منظر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر چاک ہے گل کا دامن تو کیا غم!　　خزاں ساز ہے تیرا گلشن تو کیا غم؟
اگر چھن گیا تیرا مامن تو کیا غم؟　　اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم؟
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

ہر اک سانس ہے اک الہام تیرا؛　　ستاروں سے آگے ہے پیغام تیرا؛
ہر آغاز معروفِ انجام تیرا!　　تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا!
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

کبھی تو بھی دیکھ آپ اپنا تماشا؛　　نہ کر اپنی محدود و بے کیف دنیا!
ازل سے ابد تک ہے تیری تمنا؛　　اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا!
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

بہارِ سخن آئی ہے پھر چمن میں؛　　یہی ذکر ہوتا ہے اہلِ سخن میں!
ہے اختر بھی نغمہ سرا اب وطن میں؛　　گئے دن کہ اقبالؔ تنہا انجمن میں[1]
حقیقت کے اب رازداں اور بھی ہیں

[1] بہ ترمیمِ خفیف۔

سیدہ اختر

علامہ اقبال کی فکری وحدت یا تضاد

(۱)

میرا مضمون "علامہ اقبال کے متضاد نظریئے" آجکل کے یکم اور ۱۵ فروری ۱۹۶۷ء کے نمبروں میں شائع ہوا تھا۔ اس کا جواب یکم اپریل کے آجکل میں ہندوستان کے مشہور ادیب ڈاکٹر تاثیر صاحب اور ۱۵ مئی و ۱۵ جون کے آجکل میں غلام محمد صاحب بٹ کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ میں ان تمام حضرات کا دل سے ممنون ہوں جنہوں نے میرے شبہات کے ازالے کی کوشش کی۔ میں سچائی سے علامہ اقبالؒ کے کمال کا معترف ہوں اور اپنے آپ کو ایک طالب علم سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ اگر علامہ کی حیات میں مجھے اس طرف توجہ ہوئی ہوتی تو میں اپنے شکوک صرف ان کی ہی خدمت میں پیش کرتا۔ اس لئے مجھے بجا طور پر ان اصحاب سے شکایت ہونی چاہیئے جنہوں نے مجھے علامہ مرحوم کا مخالف یا معترض سمجھا۔ علامہ کی شخصیت نے ہماری عقلوں کے علاوہ ہمارے دلوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس لئے محل تعجب نہیں اگر جواب دینے والے حضرات کے دلی تاثرات بھی اس خالص علمی بحث میں شامل ہو جائیں۔ بہر حال الزامات کی صفائی اور اصل مضمون کے متعلق مجھے عرض کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔

ڈاکٹر تاثیر صاحب نے کم اور بٹ صاحب نے زیادہ یہ کوشش کی ہے کہ علامہ کی عبارتیں نقل فرما دیں جن کا تعلق موضوع سے ہونا ضروری نہیں۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ناظرین کی توجہ اصل بحث سے ہٹ جائے۔ بعض عبارتیں موضوع سے متعلق ہیں بھی تو ایک رخی ہیں یعنی ان کے خلاف علامہ کے دوسرے ارشادات موجود ہیں جن سے تضاد ثابت ہوتا ہے۔ ان کا نہ ذکر کیا گیا نہ تطابق کی کوشش کی گئی اور سوائے تاویلات کے نہ کسی نظریئے کے متعلق یہ کہا گیا کہ علامہ نے اس قول سے رجوع فرما لیا تھا۔ بعض سوالات کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی۔

میں نے اپنے مضمون میں علامہ کا کوئی مسلک متعین نہیں کیا اور متضاد اقوال کی موجودگی میں ایسا کر بھی کیسے سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کا قصور وار ٹھہرایا گیا ہوں کہ میں نے "غالباً یہ فرض کر لیا ہے کہ اقبال کسی خاص گروہ یا مسلک کے پابند ہونگے" مقصد غالباً یہ ہے کہ جو شخص کسی خاص فرقے کا پابند نہ ہو اسے متضاد باتیں کہنے کی اجازت ہے۔

ڈاکٹر تاثیر صاحب فرماتے ہیں کہ میکش نے لکھا ہے کہ اقبال کا یہ تضاد نامحمود ہے۔ حالانکہ میں نے اپنی خلش کو نامحمود عرض کیا تھا معلوم نہیں یکتائی کی تعلیم ہے یا تنبیہ۔ ڈاکٹر صاحب نے تسلیم فرمایا ہے کہ

"تضاد اگر ہے تو کارگاہ عالم میں ہے — انسانی زندگی کے عام مظاہر میں، خدا کی صفات میں ہے — قرآن میں ہے — میکش کے اقوال میں — اس لئے اقبال کے تضاد پر اعتراض نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ تضاد حقیقت ہے اور علامہ اقبال ترجمانِ حقیقت تھے — ایک ہی چیز کا انکار اور اقرار بذاتِ خود ناروا نہیں۔"

ان بیانات سے میرے شبہات کا جواب مل جاتا ہے پھر بھی ڈاکٹر تاثیر صاحب نے ازراہ معارف نوازی ہر عنوان کے متعلق راہ نمائی فرمائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مضمون مرتب ہے، سنجیدہ ہے اور طنز سے پاک ہے۔

بٹ صاحب نے اپنی تمہید چند دعووں اور وحدۃ الوجود کی بحث پر مخلوط فرما دی ہے۔ بٹ صاحب کے ارشادات ہیں:

"جذبات کسی مفکر کے ہوں یا عامی کے غیر مستقل و غیر مستقیم ہوتے ہیں"

"اقبال چونکہ شاعر بھی تھے اس لئے ان کے مطالعے میں بھی یہی اصول کارفرما ہونا چاہیئے" — "ہمیں اقبال کو سمجھنے کے لئے اقبال ہی سے استمداد و استنتاج کرنا چاہیئے۔"

بات وہی ہے جو ڈاکٹر تاثیر صاحب نے فرمائی ہے۔ انداز بیان ذرا مختلف ہے یعنی اقبال کے جذبات غیر مستقل و غیر مستقیم تھے اس لئے وہ کبھی کچھ فرماتے تھے اور کبھی کچھ۔ چونکہ وہ شاعر بھی تھے اس لئے یہ بات ان کے لئے اصولی طور پر جائز تھی۔ علاوہ ازیں اقبال کے سمجھنے کے لئے کسی منطقی اصول کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اقبال ہی سے امداد حاصل کرنی چاہیئے۔ اس کے ساتھ بٹ صاحب نے ایک دعوے یہ بھی فرمایا ہے کہ "اقبال کا کلام سریع التاثیر اور عسیر الفہم ہے"۔ سوال یہ ہے کہ یہ تعریف اقبال کے کلام کی ہے یا سمجھنے والوں کی جن پر سمجھنے سے پہلے یا بغیر سمجھے ہوئے تاثیر ہو جاتی ہے۔

میکش قصور وار ہے کہ اس نے "وحدۃ الوجود کا تذکرہ چھیڑا جو بہت فرسودہ ہو چکا ہے"۔ لیکن میکش معذور ہے اگر علامہ اقبال نے یہ فرسودہ تذکرہ نہ چھیڑا ہوتا اور میکش نے اس میں تضاد محسوس نہ کیا ہوتا تو یہ تذکرہ نہ چھیڑا جاتا۔ اس کے بعد بٹ صاحب خود بھی اس فرسودہ تذکرے کے چھیڑنے کا جواز اس طرح ظاہر فرماتے ہیں:

"جس کی (وحدۃ الوجود کی) چند در چند تاویلیں بھی ہو چکی ہیں ہمہ اوست ہمہ از دست ہمہ با اوست جبر و قدر وحدۃ الوجود وحدۃ الشہود وغیرہ ایک ہی گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ پھر اقبال کی توضیح و تشریح کیوں ناتمام ہے۔"

میکش اکبرآبادی

(آگے چل کر فرماتے ہیں) زرتشت کی ثنویت بھی درحقیقت
وحدۃ الوجود کی ایک توضیح تھی ۔"

بٹ صاحب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے دعوے کو مدلل و مشرح فرمائیں کیونکہ اب تک تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہمہ اوست اور وحدۃ الوجود ایک ہی ہے اور ہمہ از وست یا وحدۃ الشہود اس کے متضاد دوسرا نظریہ ہے جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات سے ظاہر ہے۔ ثنویت اور وحدت میں صریحی تضاد ہے۔ ہمہ اوست میرے علم میں تو مہمل ہے البتہ اگر بٹ صاحب تشریح فرمائیں گے تو ممنون ہوں گا۔ اسی طرح جبر و قدر اور وحدۃ الوجود سے علاقہ سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ جبر و قدر کا تعلق انسان کے اختیار و عدم اختیار سے ہے نہ اس سے کہ وجود واحد ہے یا کثیر۔ بٹ صاحب ارشاد فرماتے ہیں :-

"اقبال کا فلسفہ خودی کا فلسفہ تھا" وہ حرکت و عمل کو زندگی
سمجھتے تھے اور حیات مطلق کو خدا، کیا یہ وحدۃ الوجود نہیں
کیا یہ ایسا تصوف نہیں جو عین قرآن ہو۔ اسی حرکت و عمل اور
اثبات خودی کی وجہ سے وہ شیطان کو مجبور نہیں اولوالعزم کردار
کے پیش کرتے ہیں ۔"

یہ مسلم ہے کہ اقبال کا فلسفہ خودی کا فلسفہ تھا مگر یہ محتاج تشریح و ثبوت ہے کہ یہی فلسفہ وحدۃ الوجود ہے یا عین قرآن ہے۔ علامہ اقبال حرکت و عمل کو زندگی سمجھتے تھے اور زندگی کو خدا یعنی حرکت و عمل کو خدا سمجھتے تھے اور حرکت و عمل ہی کی وجہ سے شیطان کو اولوالعزم سمجھتے تھے۔ بہر حال میرے شبہات کا اس منطق سے کوئی تعلق نہیں۔ شیطان کے متعلق میں نے صرف ایک شبہ پیش کیا تھا کہ علامہ خودی کو خدا کے سامنے نہ چھوڑنے کی تعلیم دیتے ہیں، فراق و جدائی کی تبلیغ فرماتے ہیں اور بالکل یہی تعلیم ابلیس کی زبان سے دیتے ہیں۔

(حوالے کے لئے ملاحظہ ہو آجکل ۱۵ فروری ۴۶ء)

اس صورت میں ابلیس کے اور علامہ کے فلسفے میں کیا فرق ہے۔ اس کا جواب ڈاکٹر تاثیر صاحب نے دینا ضروری نہ سمجھا اور بٹ صاحب نے صرف شیطان کا تذکرہ ہی کافی خیال فرمایا۔

بٹ صاحب کی رائے میں آریائی وحدۃ الوجود اور قرآنی وحدۃ الوجود بظاہر ایک اور درحقیقت دو متضاد نظریئے ہیں۔ ایک کا ملجا و ماوا بے عملی اور نفی خودی دوسرا سراپا عمل ہے۔ نفی خودی کی وجہ یہ قرار دی جا سکتی ہے کہ وحدۃ الوجود خواہ آریائی ہو یا قرآنی ایک وجود کے سوا سب کی نفی کرتا ہے اس لئے خدا سے آنکھیں لڑانے والی خودی کی بھی نفی ہو جاتی ہے جو غیر اللہ ہے علامہ بھی "دل زغیر اللہ بپرداز اے جوان" فرماتے ہیں۔ البتہ عمل اور بے عملی کا تعلق اصل مسئلے سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ نہ بٹ صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ میری رائے میں علامہ اقبال نے بھی ان شعروں میں یہی بات فرمائی ہے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں :-

۵

خودگیری و خودداری و گلبانگ انا الحق | آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اسکے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست | خود مردہ و خود مرقد و خود مرگ مفاجات

ڈاکٹر تاثیر صاحب فرماتے ہیں کہ "وہی شعر جس سے تضاد نکالا گیا ہے تضاد کے وہم کو دور کرتا ہے۔" بٹ صاحب نے خود سوچنے کی زحمت نہیں فرمائی۔ میں نے ان شعروں میں تضاد کب ظاہر کیا تھا۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ دو متضاد نظریوں کے علاوہ علامہ اقبال کے یہاں ایک تیسرا خیال بھی ملتا ہے، اور وہ یہ کہ وحدۃ الوجود سے قوموں کی ترقی و تنزل کا کوئی تعلق نہیں جن عبارتوں سے تعلق ثابت ہوتا ہے ان کے متعلق بٹ صاحب نے خاموشی اختیار کر لی۔ تاثیر صاحب نے اتنی جرأت فرمائی کہ معناً تسلیم تو کر لیا مگر فرمایا کہ "مجھے نثر و نظم کا یہ مقابلہ ناپسند ہے۔ ایک شعر بھی تو مخالفت میں نہیں نکلتا۔" میں عذر خواہ ہوں کہ تاثیر صاحب کی پسند کا لحاظ نہ کر سکا۔ اگر نثر سے وحدۃ الوجود کی مخالفت نکلتی ہے تو نثر ہی سے موافقت ثابت ہوتی ہے۔ نظم کو نظر انداز فرما دیجیے۔

ڈاکٹر تاثیر صاحب کو ملفوظات کا پیش کردہ یہ قول تسلیم ہے کہ "وحدۃ الوجود کا مسئلہ مذہبی مسئلہ نہیں۔ اس پر بحث اسلامیت کے لئے ضروری نہیں" لیکن تضاد تسلیم نہیں فرماتے ہیں۔ "میں نے اقبال کے اقوال کو خلاصۃً یکجا کر دیا ہے ان میں تضاد کا شائبہ تک نہیں۔ مکیش صاحب نے وحدۃ الوجود کی فلسفیانہ صداقت اور وحدۃ الوجود کی مذموم تفسیر دو مختلف شقوں کو ایک سمجھ کر مغالطہ کھایا۔"

میں تاثیر صاحب کے اس شائستہ انداز تحریر کا ممنون ہوں مجھے واقعی مغالطہ ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن بٹ صاحب کو مجھ سے شکایت ہے کہ میری طرف سے مغالطہ دیا جاتا ہے۔ اور مغالطہ دینے کے لئے علامہ اقبال کی عبارتیں حذف کر دی جاتی ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اس موقع پر جو میں نے تضاد ظاہر کیا تھا اسکا وحدۃ الوجود کی محمود اور مذموم تفسیر سے کوئی علاقہ معلوم نہیں ہوتا۔ پھر ملاحظہ فرمائیے کیا ان دو جملوں میں تضاد نہیں؟

"ہمہ اوست مذہبی مسئلہ نہیں" .... مذہب اسلام
کی رو سے خدا اور کائنات .... ایک ہی کل کے مختلف
اجزا ہیں ۔"

ڈاکٹر تاثیر کی یہ شکایت میرے سر آنکھوں پر کہ "مکیش نے اس بحث میں اقبال کو وحدۃ الوجود کا منکر قرار دیتے ہوئے کسی شعر کا حوالہ نہیں دیا۔ میرے خیال میں از روئے استدلال نثر بہ نسبت نظم کے زیادہ واضح

ہوتی ہے۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب نے اس بحث میں اختصار و ایجاز سے کام لیا ہے اور جو کچھ فرمایا ہے اس سے ان کا مخاطب واضح طور پر سمجھ سکتا ہے۔ مگر بٹ صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ مجھے معاف فرمائیں اسے ہم دعظ تو کہہ سکتے ہیں مگر ایک طالب علم کے لئے اس میں کوئی مواد نہیں ہے اس کے علاوہ بٹ صاحب نے وحدۃ الوجود کی جو تعریف فرمائی ہے وہ نہ مستند ہے نہ صحیح۔ اسی طرح علامہ اقبال کا نظریۂ توحید بھی اقبال کے الفاظ میں اور انہی کے حوالے سے پیش کرنا چاہیئے تھا۔ دوسروں کے مذاہب و نظریات پیش کرتے وقت اہل علم اس کا ضرور لحاظ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں بٹ صاحب نے بہت سی غیر متعلق بحثیں پیدا کر دی ہیں جن کے متعلق سردست کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ ایک نیا عنوان مجھے بٹ صاحب کے مضمون سے ہاتھ آیا۔ امید کہ کوئی صاحب اس پر بھی روشنی ڈالیں گے۔ بٹ صاحب علامہ اقبال کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں:۔

"اسلام کی مذہبی زندگی میں اس تجربہ کی کاملیت منصور حلاج کے مشہور الفاظ "انا الحق" کی صورت میں اپنے معراج کو پہونچی حلاج کے معاصرین اور متاخرین نے اس کی تفسیر وحدۃ الوجود کے رنگ میں کی لیکن ایم میگنشن کی مدونہ اور شائع کردہ "جزئیات حلاج" نے کوئی شک و شبہ نہیں چھوڑا کہ صوفی شہید کا مفہوم خدا کی لامحدودیت اور مطلقیت سے انکار کرنا نہیں تھا اس کے تجربے کی سچی ترجمانی سمندر میں قطرے کا مل جانا نہیں بلکہ ایک بے پایاں ترشخصیت میں انسانی خودی کے استقلال و واقعیت کا ایک غیر فانی جملے میں دلیرانہ تصدیق و احساس کا اظہار تھا۔"

اس عبارت کے ساتھ علامہ اقبال ؒ کے اس مکتوب کی چند سطریں ملاحظہ ہوں جو رسالہ جوہر اقبال نمبر ۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔

"منصور حلاج کا رسالہ کتاب الطواسین جس کا ذکر ابن ندیم کی فہرست میں ہے فرانس میں شائع ہوگیا ہے۔ مولف نے فرنچ زبان میں نہایت مفید حواشی اس پر لکھے ہیں آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ حسینؒ کے اصلی معتقدات پر اس رسالے سے بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان منصور کو سزا دینے میں بالکل حق بجانب تھے اس کے علاوہ ابن حزم نے کتاب الملل میں جو کچھ منصور کے متعلق لکھا ہے اس کی اس رسالے سے پوری تائید ہوتی ہے۔ لطف یہ کہ متقدمین صوفیہ قریباً سب کے سب منصور سے بیزار تھے معلوم نہیں متاخرین اس کے اس قدر دلدادہ کیوں ہو گئے؟"

معلوم نہیں منصور کی یہ توصیف و تنقیص وحدۃ الوجود کی مذموم تفسیر کے اعتبار سے ہے یا محمود تفسیر کے اعتبار سے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک بار اس کی مذموم تفسیر کی جائے اور دوسری مرتبہ محمود۔

بٹ صاحب فرماتے ہیں:۔ "اقبال اور رومی کا تصوف انسان کو مجبور محض نہیں مانتا اور نفی خودی کی تلقین نہیں کرتا" نفی خودی کے ثبوت میں علامہ اقبال کے جو شعر میں نے پیش کئے تھے اس کا جواب ڈاکٹر تاثیر صاحب نے دیا نہ بٹ صاحب نے لیکن مزید بر آں بٹ صاحب نے یہ دعویٰ اور کر دیا کہ رومی کا تصوف بھی نفی خودی کی تلقین نہیں کرتا۔ معلوم نہیں رومی سے یہ سلسلہ ملانے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ مغربی فلسفے سے اس کی سند بہ آسانی مل سکتی تھی۔ رومیؒ شدت سے نفی خودی کی تلقین کرتے ہیں اور یہی مسلک تمام اسلامی صوفیہ کا ہے۔ خواہ وہ بقول علامہ اقبال حرکی یعنی نقشبندی ہوں یا دوسرے حضرات۔ رومی کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

چیست توحید خدا آموختن   خویشتن را پیش واحد سوختن
گر ہمی خواہی کہ بفروزی چو روز   ہستی ہمچو شب خود را بسوز
ہستیت در ہست آں ہستی نواز   ہمچو مس در کیمیا اندر گداز
رو مکن دیوار کن تنہا نشیں   وز وجود خویش ہم خلوت گزیں
عاشقاں را کار نبود با وجود   عاشقاں را ہست بے سرمایہ سود
ہیچکس را تا نہ گردد او فنا   نیست رہ در بارگاہ کبریا
آئینہ ہستی چہ باشد نیستی   نیستی بگزیں گر ابلہ نیستی

بٹ صاحب دیباچہ اسرار خودی کا بیشتر حصہ نقل کرنے کے باوجود یہ ثابت نہ فرما سکے کہ میکش نے یہ اقتباس مغالطہ دینے کیلئے پیش کیا تھا اور استشہاداً یہ سعی کی تھی کہ علامہ کو تصوف کا مخالف ثابت کرے اگر میں ایسا محسوس کرتا تو صراحت سے عرض کرتا۔ استشہاد کی کیا ضرورت تھی۔ بٹ صاحب اقبال کی عظمت پرانی اصطلاحات کی تبدیلی میں سمجھتے ہیں حالانکہ اصطلاح کی تبدیلی بجائے خود کچھ بھی اہم نہیں۔ پھر اصطلاح کی تبدیلی کا تضاد سے کوئی علاقہ نہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص اپنی اصطلاحات پر قابو یافتہ نہ ہو اور کبھی ایک لفظ کو اپنے مصطلحہ معنوں میں اور کبھی دوسروں کے مصطلحہ معنوں میں استعمال کرے اور کوئی قرینہ تبدیل معنی پر نہ ہو تو ضرور تضاد کی غیر حقیقی یا حقیقی رونمائی ہو سکتی ہے۔ بٹ صاحب کی رائے علامہ اقبال کے متعلق غالباً یہ تو نہ ہوگی ۔ (باقی آیندہ)

خالہ جمالو

محمد یٰسین ثانی

لہ (کسی چیز کے گر کر ٹوٹنے کی جھنکار کی آواز)

شکیل:- دیکھ رہی ہیں خالہ جمالو آپ اتنا غصہ

نوشابہ:- وہ کیا دیکھیں گی ہینڈل سے تیل سے
سنی چیخ رہی تھی اور کھلے بال لئے ہوئے
پھر رہی ہوں آج دام دے تو یہ موا جگ اور گلاس آ گیا آگ لگے اس
کمبخت میں جانے اس کی کونسی ناک پڑ رہی تھی۔

خالہ جمالو:- اے تو اب بیٹی تم ہی چپ رہو۔

شکیل:- وہ یوں تھوڑی چپ ہوں گی جب تک میرا خون پانی ایک نہ کر دیں گی۔
اسوقت تک نہ زبان تالو سے لگے گی نہ چین آئے گا۔ مزاج تو دیکھئے غرض تھی
یہیں گلاس مجھ پر پھینکا گیا ہے۔ خدا کی مار مجھ پر گرمستی کے خیال سے لے آیا تھا۔
(جگ اٹھا کر پھینک دیتا ہے اور وہ بھی چکنا چور ہو جاتا ہے)

خالہ جمالو:- لو چلو چھٹی ہوئی۔ نہ موا تیل آیا نہ جگ اور گلاس رہا۔

نوشابہ:- اے تیل آئے یا چولھے میں جائے میں ہی موئے جھنجھٹ سے پھر دگی بیل کیا ہے۔

شکیل:- جو نخرے نے پھر دیا مگر اب میرے منہ نہ لگو میں نے کہہ دیا ہے۔

خالہ جمالو:- اچھا اب تم ہی غم کھاؤ بیٹا۔

نوشابہ:- نہیں میں تو یہ پوچھتی ہوں کہ آخر ان کا ارادہ کیا ہے۔

خالہ جمالو:- تو یہ ہے بیٹا مرد کی بات کا جواب نہیں دیتے ہیں میری جان تو۔

شکیل:- جواب ؟ جواب تو جب تک میری سات پشت کو وہ نہ سنا لیں گی
اسوقت تک ان کو چین آ ہی نہیں سکتا گو میں بھی اب چپ رہنے والا نہیں
ہوں سکان کھول کر سن لو۔

خالہ جمالو:- بیٹا بری بات ہے غصہ حرام ہوتا ہے۔

نوشابہ:- نہیں خالہ آج انکو دل کی بھڑاس نکال لینے دیجئے۔

خالہ جمالو:- اچھا بھئو تو یہی یہاں سے چلو تم ادھر باورچی خانہ میں۔

شکیل:- دل کی بھڑاس نکالوں تو بیگم صاحب تمہاری دنیا سیاہ
ہو کر رہ جائے تم ہو کس ہوا میں۔

خالہ جمالو:- اچھا خیر بیٹا تم ہی مان جاؤ۔ چلو تم ادھر اپنے کمرے میں۔ میرا بھی
کوئی حق ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔

شکیل:- مگر آپ دیکھ رہی ہیں ان کا تنتنا۔ ذرا کہ پکتی ہی نہیں بیٹھنے دیتیں۔

نوشابہ:- اے میں کیا اور میرا تنتنا کیا کوئی ہوتی تنتنے والی تو پتہ چل جاتا۔

خالہ جمالو:- آؤ بیٹا شکیل۔ میں کہہ رہی ہوں کہ اپنے کمرہ میں چلو۔ بہو بیاں سے
اور اب تم بھی چپ رہو نوشابہ۔ سمجھیں کہ نہیں۔ (خالہ جمالو شکیل کو
لے کر باقی میں کمرہ میں پہنچیں)

شکیل:- جب نام ہے میرا غصہ کہ صاحب بارود
کے بنے ہوئے ہیں۔ آگ بگولہ ہیں۔
اور یہی وہ ہیں۔

خالہ جمالو:- ذرا آہستہ سے تو سب ہے بیٹا عورت کا
ایسا غصہ بھی کس کام کا کہ مرد غم کھا جائے
اور وہ سنانے تم کو تو بیٹا میں لے بھی آتی۔ مگر وہ میرے قابو میں نہ آئی۔

شکیل:- جی ہاں یہ ان لوگوں سے کہئے جو ان کو بے زبان اور مجھکو آتشبازی
کا قلعہ اور توپ کا گولہ کہتے ہیں۔

خالہ جمالو:- منہ دیکھی نہیں کہتی ہوں بیٹا۔ میں نے تو تم کو کبھی غصہ کرتے ہی نہیں
دیکھا۔ غصہ کرتے تو اسی وقت آفت آ جاتی۔

شکیل:- خالہ آپ سے سچ کہتا ہوں کہ دن رات کی یہی کل کل ہے۔ گھر کی
برکت اٹھی۔ ادھار نے گھیر رکھا ہے مگر یہ نحوست کسی طرح جاتی ہی نہیں
میں بھی آخر آدمی ہوں کہاں تک غم کھاؤں۔

خالہ جمالو:- بیٹا میرے لئے جیسے تم ویسی وہ۔ سب سے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔
تم جیسی برداشت سے کام لیتے ہو دوسرا مرد ایسا کر ہی نہیں سکتا۔
سچ سچ (آہستہ سے) اس کا مزاج ہے بہت چڑچڑا۔

شکیل:- اب بتلائیے بھلا اس میں غصہ کی کونسی بات تھی تیل کے لئے
جیب میں دام پڑے تھے کہ راستہ میں نیلام ہوتا ہوا ملا۔ یہ جگ
اور گلاس کا سٹ کسی طرح بھی ڈھائی تین روپیہ سے کم کی چیز نہیں تھی۔ میں نے
ایک روپیہ کی بولی بول دی اور میرے نام چھوٹ گئی۔

خالہ جمالو:- بیٹا بتاؤ مفت کا مجھو۔ تیل بھگو لیا سے کیا ہے مگر یہ تو گت کی
ایک چیز گھر میں آ گئی تھی۔

شکیل:- گت کی چیزوں کا حال تو یہ ہے کہ ہر مہینے ایک چائے کا سٹ
لاتا ہوں اور آٹھویں دن قسم کھانے کے لئے بھی کسی پیالی میں کنڈا
دکھا دیجئے تو جو چور کی وہ میری سزا۔

خالہ جمالو:- اے تو میں دیکھتی ہی ہوں۔ موئے چائے کے برتن ٹھیکریوں
کی شکل سے میں نے تو ہمیشہ دیکھے اور ہمیشہ نئے سٹ آتے ہوئے ہی
دیکھے۔

شکیل:- خالہ کیا مجال جو وقت پر ایک چیز بھی گت کی اس گھر سے نکل آئے۔

خالہ جمالو:- بیٹا یہ باتیں ہیں ڈھنگ کی اور ڈھنگ ان میں نام کو نہیں ہے۔
گھرداری جسے کہتے ہیں وہ تو جانتی ہی نہیں۔

شکیل:- یہی بات اگر میں کہہ دوں تو ابھی لینے کے دینے پڑ جائیں پھر یہ دق
سے جان لے لیں گی۔

لہ بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی

خالہ جالو:- ہائے کمبخت۔ اور جو تمہارے منہ سے بھی کچھ نکل جائے۔ بھائی بندہ بشر ہے کسی وقت منہ سے نکل جائے کہ جاؤ اب کبھی صورت نہ دکھانا تو پھر کیا ہو۔

شکیل:- ہو گیا۔ جو کچھ بھی ہو جان کی بلا سے۔ وہ تو خدا سے چاہتی ہیں کہ وہ میکے میں رہیں اور دنیا مجھ پر تھوکے۔

(نوشابہ آواز دیتی ہے)

نوشابہ:- خالہ ——— اے خالہ ——— ذرا ادھر آؤ۔

خالہ جالو:- (آواز دے کر) آ رہی ہوں بیٹی (شکیل سے آہستہ سے) اچھا بیٹا اب اس وقت تم ہی چپ ہو رہو (جاتی ہیں)

نوشابہ:- ابھی تک وہ میرا دکھڑا آپ سے رو نہیں چکے۔

خالہ جالو:- کیا بتاؤں بیٹا میرے لئے تو جیسی تم ویسے وہ۔ مگر کیا ہے کہ ایسے مرد بھی ہوتے ہوں گے کہ گھر والوں کا دم ہی نکال لیں۔

نوشابہ:- آخر کیا کہہ رہے تھے۔

خالہ جالو:- اے بہن ختم کرو۔ جو کچھ انھوں نے کہا میں نے جواب دے دیا۔ اب جو کچھ تم کہو وہ بھی سن لوں گی۔ مگر میں نے تو ایسا آگ کا بنا ہوا مزاج دیکھا ہی نہیں۔

نوشابہ:- اے خالہ آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ آپ کی وجہ سے تو اس وقت کچھ بولے ہی نہیں وہ تو کہیے کہ میں خود چپ ہو گئی نہیں تو میکے بھیجنے کے لئے ابھی ڈولی لا کے کھڑی کر دیتے

خالہ جالو:- ہائے میرے اللہ۔ اور مجھ سے کہہ رہے تھے کہ جب دیکھو میکے جانے کی دھمکی جب دیکھو میکے جانے کی دھمکی۔

نوشابہ:- کیا کہا میں دھمکی دیتی ہوں میکے جانے کی یا اٹھتے بیٹھتے مجھ ہی کو میکے کے طعنے ملتے رہیں۔

خالہ جالو:- اے بیٹا چپ بھی رہو کیا میرے اس ملے چونڈے میں بیاہی لگواؤ گی اس نے تو جانے کیا کیا کہا۔ مگر میں تو کہتی ہوں کہ بیٹی اب جانے ہی دو۔

نوشابہ:- نہیں بتلایئے تو آخر اور کیا کیا کہا۔ میں بھی سنوں۔

خالہ جالو:- نہ بی بی۔ بندی ان باتوں سے بہت دور بھاگتی ہے کہ ادھر کی ادھر لگاؤں ادھر کی ادھر کرتی پھروں۔ لگائی بجھائی کرنے پر آؤں تو اس نے تمہارے پھوہڑپن، تمہاری بدمزاجی، تمہارے بے ڈھنگے پن کی جتنی باتیں کہی ہیں سب ہی کہہ دوں اور بیکار بات میں بات بڑھ جائے میں تو جانے کے سٹوں کا بھی ذکر کرنا نہیں چاہتی کوں بیوی میاں کے قصہ میں اپنی گردن پھنسائے۔

نوشابہ:- نہیں خالہ تو کیا میں ان سے کہنے جا رہی ہوں مگر مجھے بھی تو معلوم ہو جائے کہ میری طرف سے ان کے دل میں کیا کیا غبار ہیں۔

خالہ جالو:- آج کو لڑائی ہے میاں بیوی کی لڑائی ہی کیا بات پیچھے لڑائی اور بات پیچھے میل۔ بعد میں گردن ماری جائے خالہ نگوڑی کی۔ تو بیوی مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ تم جانو تمہارا کام مگر یہ تمہارا ہی دل گردہ ہے جو سب کچھ ٹھنڈے دل سے سنتی ہو۔

نوشابہ:- (اطمینان سے) نہیں خالہ تمہاری قسم میں ان سے نہ کہوں گی مگر مجھے بتایئے تو سہی آپ کو میری جان کی قسم۔

خالہ جالو:- یہ تم میں نوشابہ بڑی بری عادت ہے کہ ذرا سی بات میں جان کی قسم دے دی۔ اے کہہ کیا رہا تھا۔ یہی کہہ رہا تھا کہ ایسی منحوس ہیں کہ اس گھر کی برکت اڑا دی ہے۔ ڈھنگ ایسے ہیں کہ مہینے پیچھے نیا چائے کا سٹ لاتا ہوں اور چار دن میں پیالیوں کے کنڈے تک غائب ہو جاتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ اسے شبہ یہ ہے کہ نئے سٹ تم میکے بھجوا دیتی ہو اور گھر میں پرانے کے پرانے رہ جاتے ہیں۔

نوشابہ:- خدا غارت کر دے مجھے جو میں ایسی چھچھوری باتیں کروں اور چیز میکے والے ایسے۔ آن کا بس چلے تو وہ فوراً اتنا گھر بھر دیں ابھی ابا جان نے میز کرسیاں ان کو منگا کر دی ہیں کہ اپنا دفتر باہر کے کمرے میں سجاؤ بائیسکل ٹوٹ گئی تھی تو نئی بائیسکل لے کر دی اور صاحب پھل اسکا یہ مل رہا ہے کہ میں اپنے یہاں کے برتن چرا چرا کر اپنا میکہ بھر رہی ہوں۔

خالہ جالو:- اے چپکے چپکے بولو۔ کیا بیچ بیچ میرے منہ میں کالک لگواؤ گی۔ کہ اچھی خالہ آئی تھیں جو آگ لگا کر چلی گئیں۔ میں نے ان سے بھی کہہ دیا ہے اور تم سے بھی کہتی ہوں کہ خدا کے لئے میری ٹانگ بیچ میں نہ کھینچو کوئی سنے تو کہے کہ عجب لتری موئی عورت ہے۔

نوشابہ:- قسم کھا کے کہتی ہوں خالہ کہ میرے میکے والے ان کے اتنی سی چیز کے خرمندہ نہیں ہیں۔

خالہ جالو:- اے میں نہ جانتی ہوں تو مجھ سے کہو کبھی وہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں آتا۔ ساس الگ داماد پر جان چھڑکتی ہیں اور سسر تو جیسے داماد کے نام پر مٹے ہی جاتے ہیں مگر وہ تو کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔

نوشابہ:- اے بس یہ خاطر میں لاتے ہیں کہ میں چائے کے نئے سٹ ہر مہینہ لا کر بھجوایا کرتی ہوں اور یہ بیچارے ایسے چپ رہنے والے کہ چپ ہو رہتے ہیں۔

(شکیل آواز دیتا ہے)

شکیل:- (بلند آواز سے) خالہ خدا میری بات سن جایئے۔

خالہ جالو:- آئی بیٹا تو شابہ سے، بیٹی میری لاج تیرے ہاتھ ہے کہیں تو اس سے سب باتیں بتا دے۔

زرشابہ:- آپ کی بھی کیا باتیں ہیں خالہ (خالہ جاتی ہیں)

شکیل:- اب تک وہی کھچڑی پکتی ہوگی۔ اب مجھے کہ دو تین دن کے لئے گویا چھٹی ہوئی

خالہ جالو:- کیا بتاؤں بھیا۔ یہ عمر ہونے کو آئی مگر میں نے تو اس گھر کا سا کارخانہ کہیں دیکھا نہیں۔ اے کون سے سسرال والے داماد کے ساتھ سلوک نہیں کرتے مگر وہ سلوک گنواتے نہیں جاتے توبہ ہے اللہ توبہ ہے۔

شکیل:- سلوک! یعنی میرے ساتھ کوئی سلوک بھی کیا ہے ان کے میکے والوں نے۔

خالہ جالو:- اے ہے بھیا کیا مجھ کو گردن میں ہاتھ دے کر نکلواؤ گے اس گھر سے۔ لو اور سنو وہ سمجھے کہ میں نے آکر یہاں لگائی بجھائی کی ہوگی۔ میں کچھ نہیں جانتی بھیا تم جانو اور تمہارا کام مگر شاباش ہے ایسی بیوی کو جو میاں کے لئے ایسی بات کہے۔

شکیل:- بتائیے نا آخر کیا فرمایا انھوں نے اور کیا سلوک ہوا ہے ان کے میکے والوں کی طرف سے۔

خالہ جالو:- کچھ نہیں بھیا کچھ نہیں میں تمہاری ان سے اور ان کی تم سے اگر جا کر لگاؤں تو مفت خدا اس بات کا جھگڑا بنے گا اور بیچ میں ماری جاؤں گی میں۔

شکیل:- نہیں خالہ میں ان سے کہنے تھوڑی جا رہا ہوں۔ آپ بتائیے نا کہ یہ معمہ کیا ہے مجھے تو کوئی سلوک یاد نہیں پڑتا۔ آخر میں بھی تو سنوں کہ وہ کیا کیا نوازشیں اور مہربانیاں ہیں آپ کو خدا کی قسم بتائیے۔

خالہ جالو:- اے میں کہتی ہوں تم ایک بات کے پیچھے پڑ گئے ہو مگر بھیا جب تم جانتے ہو تو پھر کیوں ہر چیز سر جھکا کر لے لیتے ہو موئی دمڑی کی چیز اور سوا لاکھ کا احسان۔

شکیل:- خدا کے واسطے بتلائیے کہ میں نے کون سا احسان لیا ہے۔ میں ان سے یا کسی سے کچھ نہ کہوں گا میں وعدہ کرتا ہوں مگر مجھ کمبخت کو معلوم تو ہو جائے۔

خالہ جالو:- اے کمبخت ہوں تمہارے دشمن۔ کیا اچھی زبان ہے۔ موئی دو ٹکے کی پیر گاڑی کیا دے دی کہ جیسے میرے بچے کو خرید لیا۔

شکیل:- بائیسکل کا ذکر ہے۔ اب دیکھئے یہ کم ظرفی اور اوچھا پن ہیں اسی لئے انکار کرتا تھا تو ان کے والد صاحب بھی برہم تھے اور خود بدولت بھی ناراض تھیں۔ قصہ یہ ہوا خالہ کہ وہ جو ان کے بھائی صاحب ہیں نا سلیم [illegible] ایک دن بائیسکل اٹھا لے گئے اور اس کو کسی موٹر سے ٹکرا کر چُر خُر بنا لائے۔ میں چپ ہو رہا۔ خسر صاحب کو جو خبر ہوئی تو وہ نئی بائیسکل لے کر تشریف لائے۔ میں نے لاکھ لاکھ کہا کہ مجھ کو ضرورت نہیں ہے میں اسی کو ٹھیک کرا لوں گا۔ مگر وہ کسی طرح نہ مانے اور اس کو میرے سر منڈھ گئے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں پھر کیا کرتا۔

خالہ جالو:- اے بیٹا سسرال والے دیتے ہی ہیں مگر احسان گنواتے نہیں۔

شکیل:- تو احسان کس نامعقول پر کیا۔

خالہ جالو:- اور ہاں یہ احسان ہی نہیں مگر یہاں تو سیکڑوں احسان ہیں میز کرسی تک کا۔ مگر بھیا میں کچھ نہیں کہتی۔

شکیل:- میز کرسی۔ خدا کی قسم جی چاہتا ہے کہ اپنا سر پیٹ لوں اور یہ میز کرسی سب ان کے منہ پر مار آؤں۔

خالہ جالو:- چپکے چپکے بیٹا چپکے چپکے۔ کیوں میری جان عذاب میں ڈالو گے۔ میں خود ان جھگڑوں سے الگ رہتی ہوں۔ اپنے ایک کونے میں پڑی رہتی ہوں۔ نہ کسی کے اچھے میں نہ برے میں۔

شکیل:- خالہ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ میز کرسیاں میرے لئے وبال بن کر رہ گئی ہیں۔ ان کا قصہ بھی سن لیجئے۔ خسر صاحب محترم و معظم کیا کہوں ان بزرگ کو۔

خالہ جالو:- ہاں بیٹا خسر بجائے باپ کے اور وہ تو ویسے بھی ماموں ہیں تیرے۔

شکیل:- اجی ایسے ماموں بہت ہوتے ہیں۔ مجھے تو شرم آتی ہے ان کا بھانجا یا داماد کہلاتے ہوئے۔ تو خالہ ان حضرت نے کسی کا سامان قرق کرایا۔ اس سامان کی تمام کار آمد چیزیں تو اپنے یہاں رکھ لیں اور جو کوڑا کرکٹ تھا وہ میرے سر پر ڈھیر کر گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باہر کا کمرہ میرے بیٹھنے تک کام کا نہ چھوڑا۔ حال یہ ہے کہ کسی میز کا پایہ نادارد ہے تو کسی کرسی کا بید غائب۔ کسی کا ہتھہ نہیں ہے تو کسی میں سب کچھ ہے مگر سب الگ الگ۔ نہ جانے کیا آفت ہے۔

خالہ جالو:- اور اس موئے کباڑ خانے کا احسان اتنا بڑا۔ واہ واہ واہ۔

شکیل:- آج تک خدا کے فضل اور آپ کی دعا سے ایک پیسہ کا ان سسرال والوں سے شرمندہ نہیں ہوں۔ تو یہ بیگم صاحب آپ سے بھی کہہ گئیں کہ میرے گھر والوں نے بائیسکل کی خیرات دی اور ان میز کرسیوں سے مجھ کو نوازا۔

خالہ جالو:- خیر ہوگا بیٹا۔ تمہارا دیکھنے والا خدا ہے کہ تم نے اپنی سسرال والوں کے ساتھ کیا کیا اور اس کا بدلہ تم کو کیا ملا۔ کیا میں جانتی نہیں ہوں کہ تم خود سالیوں کے ساتھ اپنی حیثیت سے بڑھ کر سلوک کرتے رہتے ہو۔ یہ تو جو ہوا سے بتاؤ۔

شکیل:- خدا گواہ ہے خالہ کہ آج تک یہ ذکر زبان پر نہیں لایا تھا مگر اب کہا گیا ہے تو کہتا ہوں کہ خسر صاحب نے چاہا کہ میاں سلیم یعنی ان کے بھائی صاحب کی تعلیم کا بوجھ مجھ پر ڈالنا چاہی تھی کہ میں اب خرچ نہیں برداشت کر

میں نے کہا کہ لاؤ میں اس کی تعلیم کا ذمہ لے لوں۔ آج تک کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور میں برابر کالج کی فیس کتابوں کا خرچ، ماسٹر کی تنخواہ سب اپنے ذمے لئے ہوں مگر اس کا بدلہ یہ مل رہا ہے۔

خالہ جالو:۔ بیٹا یہ تمہارا ہی جگرا ہے کہ اس تھوڑی سی پونجی میں ایسے ایسے ہاتھی باندھے ہوئے ہو اور پھر باتیں بھی سنتے ہو۔

شکیل:۔ اور اسی پر کیا ہے ابھی بیگم صاحبہ کی بہن صاحبہ کی شادی میں تنخواہ کٹوا کر قرض لیا اور جوڑے کے ساتھ زیور تک دے کہ بھائی بیوی کا دل نہ میلا ہو مگر اس کا پھل یہ مل رہا ہے۔

خالہ جالو:۔ ہاں ہاں بیٹا عالی حوصلہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہی تو میں نے اس سے بھی کہا کہ وہ بھلا یا شکیل اور ان بیزکریوں کا احسان کیا لے گا۔ جو اس باپ کا بیٹا ہے جس نے آج تک کسی کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔

(نوشابہ آواز دیتی ہے)

نوشابہ:۔ خالہ ذرا ادھر آئیے۔

خالہ جالو:۔ آئی ہوں بیوی (شکیل سے آہستہ سے) اچھا بیٹا اب تم جاؤ اور چھوڑو اس ذکر کو (جاتی ہیں)

نوشابہ:۔ یہ سلیم کا کس بات پر ذکر چلا تھا خالہ۔

خالہ جالو:۔ چلا ہوگا مو اکسی بات پر ذکر، ایک سلیم کا کیا تمہاری چھوٹی بہن تک کی شادی کا ذکر تھا مگر میں اب سب تم سے لگا کر قیامت برپا کراؤں اس گھر میں۔

نوشابہ:۔ نہیں خالہ بتائیے تو سہی کہ آخر بات کیا تھی میں بھی تو سنوں۔ انھوں نے اگر آپ سے کچھ کہا ہے تو میں بھی تو بتاؤں کہ بات ہے کیا۔

خالہ جالو:۔ یہ تو بتاؤ کہ میں جو دو دن کے لئے آگئی ہوں تو کیا مجھے کالا منہ کرکے اس گھر سے نکلواؤ گی؟ آخر مطلب کیا ہے تمہارا۔ ہمیں تو تم سے بھی سنتی ہوں اور ان سے بھی مگر ایک کی بات دوسرے سے کہنا یہ کام شیطان کا۔ میں اچھے دل برے کرنے نہیں آئی ہوں۔

نوشابہ:۔ مگر میں تو خود سن رہی تھی کہ کچھ سلیم کی تعلیم کا ذکر تھا۔

خالہ جالو:۔ اے جب تم سن ہی چکی ہو تو مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ یہی کہہ رہا تھا کہ سلیم کی تعلیم کا خرچ الگ میرے سر ڈال دیا ہے اور ان کے گھر کی ایک ایک شادی اور بیاہ کی تقریب میں قرض لے کر بوٹی بوٹی بند ہوا جاتا ہوں۔ اور میں نے تو کہہ دیا کہ بیٹا اگر تم نے کوئی سلوک کیا ہے تو تم کو زبان سے کہنا تو نہیں چاہیے۔

نوشابہ:۔ تو یہ بچارے دلوا رہے ہیں سلیم کو تعلیم؟ کیوں نہیں۔ خالہ میں اب آپ سے کیا کہوں ابا جان کی عادت اور سیدھے پن کو کہ انھوں نے ایک دفعہ سلیم کی فیس اور کتابوں کے دام جوڑے تو ان بچارے نے اسی خیال سے کہ یہ برا مان جائیں

انکار نہیں کیا۔

خالہ جالو:۔ اے ہے تو تم مجھ سے کیا کہہ رہی ہو کیا مجھے پتہ نہیں کہ اللہ رکھے خود جانے کتنے طالب علموں کو وظیفہ دے کر پڑھا رہے ہیں وہ بھلا کسی کا احسان کیوں لینے لگے۔

نوشابہ:۔ سنئے تو سہی خالہ کہ انھوں نے جو تم کی گود یلات ماری تھی اس کی بھی تو کوئی وجہ تھی۔ آپا جان نے کہیں ان سے یہ کہہ دیا تھا کہ میں اس فکر میں ہوں کہ کوئی صورت نکل آئے تو تم کو سال دو سال کے لئے ولایت بھیج دوں۔ بس انھوں نے سوچا کہ بڑے میاں کو خوش کرنے کا اس سے اچھا موقع نہیں ہے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا کہ دوسرے ہی مہینے سے چپ ہو کر بیٹھ رہے۔

خالہ جالو:۔ اے ہے۔ تمہیں میری قسم۔ تو کیا پھر سلیم کی فیس دیس بھی نہیں دی۔

نوشابہ:۔ کیا باتیں ہیں خالہ آپ کی بھی کیسی فیس اور کیسا کچھ۔ جب یہ سنا کہ ابا جان مقدمہ ہار گئے تو پھر سلیم کے کالج تک کا نام اس شخص نے نہیں لیا۔

خالہ جالو:۔ بس حد کر دی بیٹا۔ مگر خیر تمہاری بہن کو تو جہیز میں سونے کے زیوروں سے لاد دیا۔

نوشابہ:۔ اب خالہ مجھ سے کچھ کہلوائیے نہیں میمونہ کی شادی میں ایک موئی بنارسی ساڑھی پر رکھ کر انگریزی سونے کے بندے دیئے تھے۔ یہ اسی کا طومار باندھا گیا ہے۔ مگر سلیم کی شادی میں آپا جان نے خود جوڑے کے ساتھ سونے کی گھڑی انگوا اور جوڑے کے ساتھ کرن پھول مجھ کو دے پھر دسویں دولہے سہرہ بندھائی کے دیئے وہ کسی گنتی ہی میں نہیں ہیں۔

خالہ جالو:۔ اے تو بیٹا مجھے یہ سب کیا پتہ۔ مجھ سے اس نے کہا کہ میں نے یوں سالے کو تعلیم دلوائی اور یوں سالی کو جہیز دیا۔ میں بھی کہوں سچ ہی کہتا ہے۔ اب تم نے مجھ کو سمجھا دیا۔ مگر وہ تو زمانہ بھر سے یہی کہتا ہوگا تم کس کس کو سمجھاتی اور بتاتی پھرو گی۔ مگر خیر اب جانے بھی دو ان باتوں کو۔

نوشابہ:۔ خالہ باز تھوڑی آؤں گی۔ میں بھی اگر مجھ پر بن پڑا تو آئی تو ایک ایک چیز گنواؤں گی۔ اس موئے باپ دادا کے مکان پر قرض لے کر بیٹھ رہے تھے۔ ابا جان کو جب خبر ہوئی انھوں نے پائی پائی ادا کی اور ان سے ایک لفظ تک نہیں کہا۔

خالہ جالو:۔ اوئی بیوی۔ آخر یہ مکان پر قرض لینے کی ضرورت کیا پڑ گئی تھی۔

نوشابہ:۔ وہی موا گھوڑدوڑ کا شوق جس نے اس لاکھ کے گھر کو خاک کر دکھایا۔

خالہ جالو:۔ تم تو ہو پھر لونڈیا۔ شادی بیاہ ہو گیا تو کیا ہوا مگر دنیا ابھی نہیں دیکھی ہے۔ یہ نہ گھوڑدوڑوں کا شوق ہے نہ کچھ۔ سب مجھے تو کچھ اور ہی دال میں کالا نظر آتا ہے۔ مگر خیر ہٹاؤ اس ذکر کو۔

نوشابہ:۔ (تسلی سے) خیر یہ تو میں ان کی غیبت میں بھی کہوں گی کہ کسی اور بات میں نہیں ہیں نہ کوئی ایسا ویسا شوق ہے البتہ یہ ہے کہ کمانے سے زیادہ ہمیشہ اٹھایا اور گھر کی یہ حالت کر دی۔

خالہ جالو:۔ بیٹیا تم کرو ان مردوں کا اعتبار۔ میں نے بھی زمانہ دیکھا ہے بھلا غضب خدا کا کہ مکان پر قرض لیا اور تم چپ رہیں۔

نوشابہ:۔ اے میری کیا مجال تھی جو میں بولتی۔ ابا جان تک بیچارے نے ایک لفظ نہیں کہا چپکے سے قرضہ چکا کر ان سے بس اتنا کہلوا دیا تھا کہ تم کو ضرورت تھی تو مجھ سے کہتے۔

خالہ جالو:۔ واہ ری شرافت اور واہ رے دل۔ پہلے کوئی اتنا بڑا دل تو لائے۔

(شکیل آواز دیتا ہے)

شکیل:۔ خالہ ذرا ایک بات سن جائیے۔

خالہ جالو:۔ (بلند آواز سے) آ رہی ہوں۔ (نوشابہ سے چپکے سے) اچھا خیر اب تم ہی غم کھاؤ۔ (جاتی ہیں)

شکیل:۔ کچھ مکان اور قرض کے متعلق بات چیت تھی ابھی۔

خالہ جالو:۔ اے بیٹیا تم ان باتوں پر کان ہی نہ دھرو۔ ہو گی کچھ بات چیت۔ وہ مجھ سے جو کہہ رہی تھیں میں اس کا ویسا ہی جواب دے رہی تھی۔

شکیل:۔ مگر میں تو ان کی اعلیٰ ظرفی دیکھ رہا ہوں۔ کوئی پوچھے کہ مکان پر قرض لیا تو کسی کا کیا اجارہ؟ اپنا مکان اپنی ضرورت قرض لیا خوب کیا۔

خالہ جالو:۔ وہی تو میں نے بھی کہا کہ آخر تم کون ہوتی ہو کہنے والی اس کے باپ دادا کی جائداد ہے وہ۔ ضرورت کے وقت کوئی کام لیتا ہے تو اس میں کسی کا کیا ساجھا۔

شکیل:۔ خالہ ضرورت بھی ایسی کہ جس کی بدولت آج پیٹ کو روٹی مل رہی ہے۔ نوکری کے لئے ضمانت داخل کرنے کی شرط تھی۔ آخر میں کہاں سے پانچ ہزار کی تیار رقم پاتا۔ میں نے مکان پر لے لی یہ رقم۔

خالہ جالو:۔ خیر مکان پر تو تم نے لی تھی رقم۔ اچھا کیا تھا۔ مگر ان کے باپ سے کیوں ادا کروائی۔ ان کو تو بس اسی کا رونا ہے کہ کہاں تک میرے باپ پورا کئے جائیں۔

شکیل:۔ کس نامعقول نے ان کی رقم دبالی ہے خالہ۔ میں نے تو ان سے ذکر تک نہیں کیا تھا جب ان کو خود خبر ہوئی اور انھوں نے روپیہ دیا تو میں نے یہ سمجھ کے لیا کہ کسی اور کا نہ سہی ان ہی کا قرض سہی اگر میں ادا نہ کرتا جب کہتیں۔

خالہ جالو:۔ تو یہ کہو کہ قرض لیا ہے۔ وہ تو کہتی ہے کہ ابا نے مکان چھڑوا دیا اور اپنی گرہ سے رقم دی۔ خیر ہوگا بھی۔ دنیا اندھی نہیں ہے بیٹیا۔

شکیل:۔ دنیا تو اندھی نہیں ہے خالہ مگر یہ آنکھوں میں دھول جھونکنا کیا؟

خالہ جالو:۔ تم بھی تو بیٹیا نا سمجھی سے کام لیتے ہو۔ آخر جب انھوں نے سونے کی گھڑی دی اور سلیم کی سہرا بندھوائی کے دو سو روپے اور جوڑے دئے تو تم کیوں چپ ہو رہے؟

شکیل:۔ بس انہی باتوں پر جی چاہتا ہے کہ اپنا سر پیٹ لوں یا کپڑے پھاڑ کر کسی طرف کو نکل جاؤں۔ خالہ یہ بالکل جھوٹ بکتی ہیں میں نے خود ان دو سو میں پچاس اپنے پاس سے ملا کر سلیم کی دلہن کو منہ دکھائی میں دئے۔ اب آخر اور میں کیا کرتا۔

(نوشابہ آتی ہے)

نوشابہ:۔ دیکھئے خالہ اب میں کچھ کہوں گی تو ان کو لگے گا برا۔ سلیم کی دلہن کو منہ دکھائی جو دی وہ بھی میرے یہاں رکھی نہیں گئی مجھکو ابا جان نے خود تین سو روپیہ نیگ میں دیا۔

شکیل:۔ اجی وہ آپ کو ہزاروں دیدیں مجھ سے کیا؟ آپ ان کی بیٹی وہ آپکے باپ۔ مگر میں کسی کا شرمندہ نہیں ہوں۔ میں نے کس دن مکان کیلئے ان سے بھیک مانگی تھی؟۔

خالہ جالو:۔ ہوگا بھی بیٹیا۔

نوشابہ:۔ نہیں آپ نے نہیں بھیک تو انھوں نے مانگی تھی کہ اللہ کے نام پر میرے لڑکے کو تعلیم دلوا دو۔

خالہ جالو:۔ اے ہے بیٹی اب تم ہی چپ رہو۔

شکیل:۔ میں بیچارا تعلیم کیا دلواتا جس کی پرورش سہرا بندھوائی کے دو سو روپیہ پر ہوتی ہے

خالہ جالو:۔ جانے بھی دو بیٹیا ان باتوں کو میرا دم الجھتا ہے ان باتوں سے۔

نوشابہ:۔ آپ کی پرورش وہ بیچارے کیا کریں گے آپ ہی ان کی لڑکیوں کے جہیز میں سونے کے زیور دے دے کر ان کی پرورش کر رہے ہیں۔

خالہ جالو: بھئی اللہ بڑی ضدی ہو نوشابہ تم بھی اب چپ کیوں نہیں رہتیں۔

شکیل:۔ اجی میں زیور کیا دونگا میں خود آپ کے یہاں کی ٹوٹی پھوٹی میز کرسیوں کا محتاج رہتا ہوں۔

خالہ جالو:۔ اچھا بیٹیا تم مجھے تو ڈولی منگا دو پھر تم دونوں جانو اور تمہارا کام۔

نوشابہ:۔ میری بہنوں کی شادی تک نہیں ہو سکتی جب تک آپ جہیز نہ دیں۔ میرے بھائی پڑھ نہیں سکتے جب تک آپ تعلیم نہ دلوائیں اور ان کا خرچ نہ اٹھائیں۔

خالہ جالو:۔ اچھا بیٹیا نہ مانو تم۔ بڑے بوڑھوں کی بات تو مان لیا کرو۔

شکیل:۔ جی نہیں یہ حال تو میرا ہے کہ آپ کے یہاں کی بائیسکل تک کا محتاج ہوں۔

خالہ جالو:۔ میرا لال بس ہو گیا۔ یہ موئی لین دین کی کونسی ایسی بات ہے میرا دماغ تو تم دونوں نے چکرا دیا۔

شکیل:۔ خالہ آپ نہیں جانتیں جس طرح آج انھوں نے آپ کے سامنے

مجھے بدنام کیا ہے اسی طرح یہ تمام دنیا میں دوستاں صورت رہتی ہیں۔

نوشابہ:۔ اور آپ نے تو جیسے مجھکو اور میرے گھر والوں کو خالہ کے سامنے کچھ کم ہی کہا ہے۔

خالہ جانی:۔ اے تو کچھ کہا بھی ہو کسی نے مجھ خالہ کمبخت کے سامنے یا آپ ہی آپ میاں بیوی میں ہو رہی ہیں۔ ستم میرے لئے غیر ہو گیا۔ تم غیر ہو گئی۔ گودوں میں پال کر اتنا بڑا کیا ہے اور اب مجھ ہی سے غیریت آتی ہے۔

شکیل:۔ مگر ان کو آپ ہی سے یہ سچ بتلائیے کہ یہ باتیں کہنا چاہئیں تھیں۔

خالہ جانی:۔ کیسی باتیں اور کیا کچھ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

نوشابہ:۔ کہا کیسے نہیں میں نے کہا ہے مگر جیسا سُنا دیا کہا۔ میرے اور میرے ماں باپ کے لئے کہا جائیگا تو میں بھی ضرور کہوں گی۔

شکیل:۔ تو پھر میرے متعلق جھوٹ سچ لگایا جائیگا تو میں بھی چپ رہنے والا نہیں ہوں۔

نوشابہ:۔ یہ آخر خالہ کدھر چلیں۔

شکیل:۔ اور کچھ ان سے کہنے کو باقی رہ گیا ہو تو بلا لیجئے نا۔ میز کرسیوں کا احسان گنوا دیا۔ مکان کے قرض والی پرورش گنوا دی۔ سہرا بند ہوائی کی رقم اور سونے کی گھڑی تک کا ذکر ہو چکا اب آخر رہ کیا گیا ہے۔

نوشابہ:۔ ہاں تو جب بات کہوائی جائے گی تو ضرور کہی جائے گی۔ میرے بھائی کو آپ نے کونسی تعلیم دلوائی۔ میری بہن کو کون جہیز سے لاکے لادیا۔

شکیل:۔ یہ آخران باتوں کا ذکر کرنے کی خالہ کو کیا ضرورت تھی۔

نوشابہ:۔ اور میری باتیں لگانے کی آخر کیا ضرورت تھی۔

شکیل:۔ اتنی باتیں آخر بیا کیونکر ہوتیں میں نے تو جب آپ کی طرف سے ملنے سنے اس وقت خود بھی کچھ کہا۔

نوشابہ:۔ آپ نے جب میرے میکے والوں کے ساتھ اپنے سلوک گنوائے تو میری زبان سے بھی کچھ نکلا۔

شکیل:۔ اور تو خیر کچھ نہیں مگر خالہ کے سامنے گرِنٹ صرف الکھٹ خوب۔

نوشابہ:۔ یہ سب خالہ کے ایک ایک کی بیس بیس لگا کر آفت مچائی۔

شکیل:۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے مگر ایک ایک کی بیس بیس لگانے کا آخران کو موقع ہی کیوں دیا گیا۔

نوشابہ:۔ موقع میں نے دیا کہ آپ نے؟ احسان میں گنوانے بیٹھی تھی کہ آپ؟

شکیل:۔ احسان میں نے گنوائے تھے گویا۔

نوشابہ:۔ اور نہیں تو کیا میں نے گنوائے تھے؟

شکیل:۔ بے شک آپ نے گنوائے تھے۔ میز کرسیوں کا ذکر آپ نے کیا۔ بائیسکل کا ذکر آپ نے کیا۔

نوشابہ:۔ یہ کیوں کیا اس پر یہ ذکر کیا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ میں نے جا کے

غزل

مسکراتے ہوئے حالوں نے تجھے یاد کیا
حسن فطرت کے نظاروں نے تجھے یاد کیا

اے بہت تیری جوانی کے ترانے گا کے
جھومتے میکدہ زاروں نے تجھے یاد کیا

نقش تیرے لئے تیرے سوا کوئی بھول سکا
غنچے چٹکے تو بہاروں نے تجھے یاد کیا

یاسمیں گیسوؤں کی آنکھوں کو رہی تیری تلاش
رات بھر چاند ستاروں نے تجھے یاد کیا

آنکھوں آنکھوں میں جو چپ چاپ کہا کرتے تھے
ان محبت کے اشاروں نے تجھے یاد کیا

کسی صورت نہ بجھی آگ تری الفت کی
دل سے اٹھتے ہی شراروں نے تجھے یاد کیا

جن کے سینے میں ترے نقش کف پا کے مزار
ان تیری رہگزاروں نے تجھے یاد کیا

کوئی فارغ سا وفادار نہ پایا ہوگا
یاد کرنے کو ہزاروں نے تجھے یاد کیا

فارغ بخاری

سیٹ اپنے میکے بھجوا دیتی ہوں اور یہاں ٹوٹی ہوئی پیالیاں رہ جاتی ہیں۔

شکیل:۔ میں نے یہ کہا۔ اگر میں نے کہا ہو تو خدا مجھ کو غارت کرے۔

نوشابہ:۔ کدھر گئیں خالہ میں ابھی بجھواتی ہوں میرا کیا سر پھر گیا تھا کہ میں بات کی بات پیدا کر دیتی۔

شکیل:۔ ہاں ہاں بلائے نا خالہ کو (آواز دیتا ہے) شکور۔ ارے شکور۔ ذرا خالہ کو تو ادھر بھیجنا۔

نوشابہ:۔ میرے تو اسی بات سے آگ لگی کہ اب میں ایسی بھیچوری اور میرے گھر والے ایسے گئے گذرے ہو گئے۔

شکیل:۔ سارے شکور سنا نہیں تو نے ذرا خالہ کو بھیجنا۔

شکور:۔ (آکر) سرکار وہ تو ابھی تانگہ منگوا کر کہیں گئی ہیں۔

نوشابہ:۔ دیکھ لیا آپ نے؟

شکیل:۔ میں کیا دیکھوں تم ہی دیکھو۔

نوشابہ:۔ قبر میں پیر لٹک گئے مگر یہ لگائی بجھائی کی عادت نہیں گئی۔

شکیل:۔ اور نہ جائے گی عادت۔ خالہ کس کی ہیں آپ ہی کی نا۔

نوشابہ:۔ اور آپ کی تو جیسے خالہ ہی نہیں۔ سیا تو آپ کے خاندان کا ہے۔

شکیل:۔ میرے خاندان کی ہو تیں تو ٹھہرتی نا۔

نوشابہ:۔ (ہنستے ہوئے) نام بھی تو جالا ہے۔

شکیل:۔ یہ تم نے ٹھیک کہا جس میں پھنسی ٹال جالوں الگ کر دی۔

نوشابہ:۔ نہیں جس میں چھپکلی ڈال جالو تانگہ چڑھی۔ (دونوں ہنستے ہیں)

ہانگ کانگ

ہنری بو

کئی برس تک اسکولوں میں جغرافیہ کے نقشے بیکار پڑے رہے۔ ہانگ کانگ کے بندرگاہ سے سمندر میں جو متعدد نقطہ دار لکیریں کھنچی ہوئی تھیں ــــ ۶ شنگھائی ۵۰۰ میل ــــ سنگاپور ۱۴۴۰ میل ــــ ناگاساکی ۱۰۷۰ میل ــ انھیں کچھ معنی باقی نہیں رہے تھے۔ ان لکیروں پر میلوں کے یہ ہندسے بے معنی معلوم ہوتے تھے۔ اس لئے کہ جاپانیوں کے قبضہ میں آنے کے بعد سے ہانگ کانگ بالکل ویران تھا اور مشرق بعید میں اس کی پہلی سی مرکزی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔

لیکن یونین جیک کے جھنڈے کے نیچے ہانگ کانگ میں بڑی تیزی سے اور بڑے حیرت انگیز انداز میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ایک مرتبہ پھر ان نقطہ دار لکیروں میں معنی پیدا ہوگئے ہیں۔ ہانگ کانگ کا ایک مستقبل ہے۔ جہاز اور ان کے بجتے ہوئے بھونپو ہانگ کانگ کے روشن مستقبل کا پیام سنا رہے ہیں جس میں اسے شاید وہی حیثیت حاصل ہوسکے جو مشرق بعید میں شنگھائی کو حاصل تھی۔ ایٹم کا نشانہ بنا ہوا ناگاساکی اب بالکل ختم ہوچکا ہے اور اصل میں ہانگ کانگ ہی اب طلوع ہوتا ہوا آفتاب ہے۔

یہ تبدیلی بے حد عجیب و غریب ہے۔ جو سڑکیں سنسان تھیں اب ان میں پھر رونق پیدا ہوگئی ہے۔ لوگ اب ہانگ کانگ کی گہما گہمی کا تذکرہ کرنے لگے ہیں۔ اس کی بڑھتی ہوئی تجارت اور تعمیر کے بے پایاں اور تعمیر منصوبوں کے باوجود اس کی حیثیت گو کسی مثالی شہر کی سی نہیں ہے لیکن جیسا کہ ایک انگریز افسر نے کہا ہے ہانگ کانگ ایک ایسا شہر ہے جس کی زندگی مشرق بعید میں سب سے زیادہ معمول کے مطابق ہے۔

تباہی کے سال

پہلے ہانگ کانگ کو جاپانیوں نے لوٹا کھسوٹا اور پھر دو سال تک اتحادیوں نے اس پر بم باری کی ــــ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب بھی وہاں بعض ایسی مشکلیں باقی ہیں جنھیں حل کرنا ہے ــــ مکانوں کی کمی، چور بازار، شہری زندگی کا انتشار اور اس کے لئے مستقبل کے آئین کا مسئلہ۔

اس شہر کو کئی سال تک جن تباہیوں کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ اس کی برابر گھٹتی بڑھتی آبادی سے کیا جاسکتا ہے۔ اتحادیوں کے قبضہ کے وقت اس کی آبادی پندرہ لاکھ سے گھٹ کر تین لاکھ رہ گئی تھی۔ اور آج کل صرف یہاں کے چینی باشندوں ہی کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے اور لوگوں کی پیشین گوئی ہے کہ سال کے ختم ہوتے ہوتے اسکی آبادی لڑائی سے پہلے کی آبادی کے برابر ہوجائیگی۔

یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سال کے ختم ہونے تک صرف ۴۰ فیصدی یورپین باشندوں کے رہنے کے لئے جگہ بنائی جاسکے گی۔ یہاں ۱۶۰،۰۰۰ چینی اب بھی ایسے ہیں جن کے رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ جاپانیوں کی تباہ کاریوں اور اتحادیوں کی بمباری سے ۱۹ ہزار سے زیادہ مکان تباہ و برباد ہوگئے اور بہت سے مکانوں کو پناہ ڈھونڈنے والے چینیوں نے لوٹ کھسوٹ لیا۔

اور اس طرح اتحادیوں کے انتظامی افسروں کے سامنے تعمیر کا ایک زبردست کام تھا۔ سب سے اہم مسئلہ خوراک کا تھا۔ تین لاکھ بھوکے چینیوں کی خوراک مہیا کرنے کے لئے چاول کی بہت بڑی تعداد باہر سے یہاں لائی گئی اور اسے راشن کر کے تقسیم کیا گیا۔ لیکن بے ایمان تاجروں اور رسد پہنچانے والوں نے چاولوں میں ریت ملا کر بھاری بھاری نفعے کمائے اور حکومت نے انھیں سخت سزائیں دیں۔ تعمیر کے ابتدائی کاموں میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں دو آدمیوں کے نام خاص طور پر قابل ذکر اور اہم ہیں۔ یہ دونوں آدمی جنگ سے پہلے ہانگ کانگ میں ملازم تھے اور پچھلے اگست میں اتحادی عملہ کے ساتھ پھر ہانگ کانگ واپس آئے ہیں۔ ان دونوں کے نام تھے ڈیوڈ مکڈوگل اور والٹر تھامسن، اور ہانگ کانگ کے لوگ انھیں محبت میں "اسکاٹ لینڈ کی ٹیم" کہتے تھے۔

ان دونوں کو مقامی انتظام اور مقامی حالات کا جو تجربہ اور علم تھا اس کی مدد سے انھوں نے مقامی لوگوں سے وہ برادرانہ اتحاد قائم کرلیا، جو تعمیر کی دشوار ابتدائی منزلوں میں ضروری ہوتا ہے۔ ان دونوں نے انتظامی عملہ اور شہریوں کے درمیان ایک گہرا اور مضبوط رابطہ قائم کیا۔

پستہ قد، پھرتیلے ۴۱ سال کے مکڈوگل ــــ جو آج کل نوآبادی کے قائم مقام سکرٹری ہیں ــــ پہلے ہانگ کانگ کی سول سروس میں تھے۔ ہانگ کانگ کے خاتمہ کے بعد جو لوگ یہاں سے بچ کر لندن پہنچے، مکڈوگل ان میں پہلے آدمی تھے۔ جب وہ لندن پہنچے ہیں تو جاپانی گولیاں اس وقت تک ان کی پیٹھ میں موجود تھیں۔ اور یہ گولیاں لندن کے اسپتال میں ان کی پیٹھ میں سے نکالی گئیں۔

لیکن اتنے دن تک اس حالت میں رہ کر بھی ان کا زندہ بچ رہنا محض ایک عجیب و غریب اتفاق کی وجہ سے ممکن ہوا۔ ان کی گردن اور کمر میں سخت زخم آئے تھے اور اس لئے وہ برابر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے الگ رہنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ایک دن وہ ایک چینی کی دوکان میں چھپے ہوئے

سے کہ اُن کی نظر گندمک کی گولیوں کی ایک شیشی پر پڑی۔ جس کے بعد سے اسپتال پہنچنے تک انھیں آٹھ دن لگے اور آٹھ دن تک وہ برابر دو گولیاں روز کھاتے رہے اور ان دو گولیوں نے انھیں کے لفظوں میں "زخموں کو شیشے کی طرح صاف ستھرا کر دیا۔"

اچھا ہو جانے کے بعد پچھلے اگست میں وہ وائس اڈمرل سر سسل ہارکورٹ کے انتظامی عملے کے ساتھ آزاد ہانگ کانگ واپس آئے۔ جب مئی کے مہینہ میں ہانگ کانگ کا شہری انتظام سر مارک ینگ کے سپرد ہوا جو ہانگ کانگ کے خاتمہ کے وقت یہاں کے گورنر تھے تو یہاں کے حالات نے اچھی خاصی معمولی صورت اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔

اس کے بعد سے بہت سے کارنامے ہوئے اور بڑے بڑے کارنامے ہوئے۔ ان میں سب سے بڑا یہ کہ مشرق بعید کے اس علاقہ میں برطانیہ کا وقار دوبارہ قائم ہو گیا ہے۔ برطانوی انتظام میں لوگوں کو ہانگ کانگ کے مستقبل کی طرف سے بڑا بھروسہ ہے۔

جب اتحادیوں نے ہانگ کانگ کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اور چاولوں کی درآمد کر کے یہاں راشننگ کی پالیسی پر عمل شروع کیا تو ہانگ کانگ کی بکھری ہوئی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی۔ اس نئے انتظام نے جنوبی چین کے بہت زیادہ لوگوں کو ہانگ کانگ کی طرف کھینچا جن کی تعمیری کاموں کے سلسلہ میں بے حد ضرورت تھی۔ مئی کے مہینہ تک اس طرح کے چھ لاکھ آدمی ہانگ کانگ آ چکے تھے۔

ہانگ کانگ کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت مکانوں کا مسئلہ ہے یہاں تک کہ کسی نئے آنے والے آدمی کو دو کمروں کا مکان اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک وہ ایک بہت بڑی رقم — یعنی تقریباً تین سو پونڈ پیشگی ادا نہ کر دے۔ ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں کرائے تین گنے ہو گئے ہیں حالانکہ سرکاری حکم کے مطابق کرایوں کی تعداد اتنی کر دی گئی ہے جتنی پہلی بار ہریکی بمباری سے پہلے تھی۔ لیکن لڑائی کے بعد کے ہانگ کانگ کا سب سے بُرا پہلو وہاں کی ڈکیتیاں ہیں جو دن دہاڑے ہوتی ہیں، اس لئے کہ جاپانیوں کے ہتھیار ڈال دینے اور لڑائی کے زمانہ کی بدنظمی کی وجہ سے ہتھیار لوگوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے۔ شمالی چین کی طرف جانے والی چینی فوجیں ایک طرح سے انگریزوں کی مہمان ہوتی ہیں۔ لیکن پچھلے نو مہینوں میں ان فوجوں کے سپاہی بہت سی نامناسب حرکتیں کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے نوکروں کو مارا پیٹا، بسوں کے کرائے ادا کرنے سے انکار کر دیا، سنیماؤں میں بغیر ٹکٹ جانے کی کوشش کی یہاں تک کہ کینٹن میں جب چینی سپاہیوں کو بغیر ٹکٹ اندر جانے سے روکا گیا تو انھوں نے ٹکٹ گھر کے بابو کو گولی سے مار دیا، اور چینی شہریوں سے زبردستی اپنی بات منوانی چاہی۔ ان سپاہیوں میں سے بہت سے برما کے محاذ سے لوٹے ہوئے ہیں اور وہاں سے اپنی فوجی بہادری کی برتری کا احساس اپنے ساتھ لائے ہیں۔ انھوں نے برطانوی مہمان نوازی سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ہانگ کانگ کو اپنی ملکیت سمجھنے لگے۔ پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے وقتاً فوقتاً لوگوں کو برطانیہ کے خلاف بھڑکانے کی بھی کوششیں کیں اور اس طرح ملی جلی آبادی میں تفرقے اور اختلاف پیدا کر دئے۔

درآمد میں اضافہ

ہانگ کانگ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی اس مختصر مدت کی سب سے حیرت انگیز بات اس سال کے پہلے تین مہینوں کی درآمد کی مقدار ہے۔ ۱۹۳۹ء میں انھیں مہینوں میں درآمد کی چیزوں کی قیمت ۷،۸۴۵،۰۰۰ پاؤنڈ تھی۔ اس کے برخلاف ان تین مہینوں میں درآمد ۸،۴۸۷،۰۰۰ پاؤنڈ تھی۔ برطانوی ملایا سے آنے والی چیزوں کی تعداد تقریباً چوگنی ہو گئی ہے اور چین سے آنے والی چیزوں کی تقریباً دوگنی — ان مختلف آنے والی چیزوں میں برطانوی موٹر کاریں جو ڈاکٹروں اور ضروری کام کرنے والوں کے لئے آئی تھیں گھڑیاں اور فاؤنٹین پن (زیادہ تر چینی امیروں کے لئے) اور دس پاؤنڈ فی جوڑے کے (NYLON) ان کی عورتوں کے لئے۔

اسی عرصہ کی باہر جانے والی چیزوں کی قیمت ۵۶،۷۴۲،۱۰۰۰ پاؤنڈ تھی اور اس کے مقابلہ میں ۱۹۳۹ء میں ۵۳۳،۰۰۰ پاؤنڈ۔

آج کل کی زندگی دسمبر ۱۹۴۱ء کی زندگی سے بہت مختلف ہے جو لوگ ہانگ کانگ چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ اب اپنے گھروں کو واپس آئیں تو انھیں اپنی چیزیں اپنے گھروں کے بجائے چور بازار میں جا کر ملیں گی۔ لیکن نسلی امتیاز اور فرق اب انھیں گذرے ہوئے زمانہ کی ایک چیز معلوم ہوگی۔ فوجیوں کے ساتھ بھی اب ان کا برتاؤ زیادہ دوستانہ ہے۔ گو لوگوں کو کھانے کے لئے اب پیٹ بھر کر غذا ملتی ہے لیکن زندگی کی ضروری چیزیں کثرت سے نہیں ملتیں اور چاول کا راشن صرف اسی قدر ہے جتنا عام صحت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

تمام ضروری چیزوں کی قیمتوں پر کنٹرول ہے۔ اور اب یہ توقع کی جاتی ہے کہ کپڑے کی قیمت پر (جو لڑائی سے پہلے کی قیمتوں سے دس گنی ہیں) اور دوسری ضروری چیزوں کی قیمتوں پر بھی کنٹرول ہو جائے گا۔ فوجی کینٹینوں کو امریکی جہازوں سے مال آ کر چور بازار میں پہنچتا رہتا ہے (اور آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے) اس زمانہ کی ایک بہت اچھی بات یہ ہے کہ حکومت نے افیم کھانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ اس سے پہلے افیم کے استعمال کی ترغیب خود

حکومت کی طرف سے ہوتی تھی، اس لئے کرائم کی فروخت اور افیون خانوں کے لائسنس کی اجارہ داری حکومت کے ہاتھ میں تھی۔

حکومت کا انتظام سول افسروں کے ہاتھ میں آنے کے بعد سے اب یہ احساس شروع ہوگیا ہے کہ مکمل اصلاح کے طویل طویل اور ناہموار سفر کو جلدی طے کیا جاسکے گا لیکن شاید اس کے لئے ضروری ہو کہ جس رعایا پر ابتک ٹیکس بہت کم لگائے جاتے تھے اسے اب زیادہ ٹیکس دینے پڑیں۔

حکومت نے ہانگ کانگ کے آئینی مستقبل کے بارے میں یہاں کے لوگوں سے مشورے طلب کئے تھے لیکن لوگوں نے ملکی سیاست کے اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ شاید حالات کا پورا تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلے کہ سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ موجودہ اکزیکٹیو اور آئین ساز کونسلیں گورنر کو اس کے کام میں مدد دیتی رہیں، ان کونسلوں کے غیر سرکاری ممبروں کے چناؤ میں عوام کی زیادہ آواز ہو، اور حکومت کا کام ایسے افسروں کے ہاتھ میں ہو جو ہانگ کانگ گورنمنٹ کے کام کو محض آسائش اور نمائش کا ذریعہ نہ سمجھتے ہوں۔

ہانگ کانگ کو چینیوں کے سپرد کر دینے کے علاوہ وہاں خواہ کسی طرح کی آئینی تبدیلیاں ہوں، اس میں شبہ نہیں کہ اس کا مستقبل بے حد شاندار ہے۔ پھر بھی حاکموں اور تاجروں کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جنگ سے پہلے کے ہانگ کانگ کے دن اب پھر واپس نہیں آسکتے۔

رفتہ رفتہ ہانگ کانگ کو تجارتی مرکز کی حیثیت سے وہی جگہ حاصل ہوگی جو کبھی شنگھائی کو تھی۔ اس کی علامتیں کچھ کچھ ابھی سے نظر آنے لگی ہیں۔ بڑے بڑے چینی کاروبار اب شنگھائی سے اٹھ کر ہانگ کانگ آرہے ہیں۔ بعض حلقوں میں یہ بات بھی یقین کے ساتھ کہی جارہی ہے کہ ہانگ کانگ برطانوی تجارت کا مرکز بن جائے گا اور اکثر امریکی تاجر فلپائن میں اپنا ہیڈکوارٹر بنائیں گے۔

جو لوگ برطانیہ کی نوآبادیات کی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو ہینے کی ہانگ کانگ کی ترقی ان کی نکتہ چینی کا بہترین جواب ہے۔ اس نو مہینے کے حالات نے نوآبادیوں میں برطانیہ کی لوٹ کھسوٹ کے افسانے کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے اور دنیا پر یہ بات پوری طرح ظاہر ہوگئی ہے کہ برطانیہ کے ان ابتدائی حکمرانوں اور آباد کاروں کی دانشمندی اور ان کا وہ رسوخ اب بھی قائم ہے جس نے ویران سنسان اور لٹی کووں اور لٹیروں سے بسے ہوئے چٹانوں کو ایک جدید قسم کا بندرگاہ بنایا تھا۔

گردش

عبادت بریلوی

شام کے ہنگام پر ہنگامہ ہائے ہاؤ ہو!
راہ پر چلتے ہوئے مدقوق انسانوں کے غول ــــ
قہقہوں کی دھند میں لپٹے ہوئے
آنسوؤں کے کارواں
پیہم رواں، پیہم دواں!
سامنے جن کے کوئی منزل نہیں!
ہو چکا اب ختم وقت شام بھی
رات آدھی آچکی،
نیلگوں آکاش کی پھیلی ہوئی آغوش میں
مسکرانے سے ستاروں کا فسوں پر ودجال
تیرگی کی روح پر چھانے لگا؟
اس سماں میں رُک گیا یہ کارواں،
جذب ہو کر رہ گئے دیوار و در میں قہقہے،
آنسوؤں کا سیگوں سیلاب دامن میں لئے!
رات رخصت ہو گئی،
صبح کی روشن کرن لینے لگی انگڑائیاں!
کارواں چلنے لگا،
قہقہے پھر جاگ اٹھے
آنسوؤں کا سیگوں سیلاب دامن میں لئے!
شاہراہوں پر نظر آنے لگا
دور ــــ کوسوں دور تک
پھر ایک بحر بیکراں
جس کی دنیا میں کوئی ساحل نہیں!

رباعیات

یا آئینہ جب جلوۂ جانانہ بنے
یا جلوۂ حسن کا دیوانہ بنے
فطرت نے صلاحیت عطا کی کہ بنے
جب شمع زمیں سے پروانہ بنے

چپ چاپ زمیں سے جو بلند و رانی ہے
سینے سے مرادِ زندگی لے کے اٹھی
مقبول نے دعا و فضا رکھا ہے وصول
عزت دی اُسے نور ... لے کے

(رضا اکبرآبادی)

نئی کتابیں

معاشیات قومی | از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ
کتاب کا نفس مضمون نام سے ظاہر ہے۔ دنیا کی قوموں کے اکتسابِ مکس کے مدوجزر اور ان کی ترقی و تنزل کی تاریخ نہایت شستہ زبان میں ڈاکٹر صاحب جیسے عالم کے قلم سے آج ہی طلب فرما کر ملاحظہ فرمائیں۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۲۵۰ صفحات۔ جلد مضبوط کپڑے کی گرد پوش خوبصورت
قیمت آٹھ روپے۔

ہمارا قائد | از رئیڈ اے سلیری۔ مائی لیڈر جیسی مشہور و معروف کتاب کا
اردو زبان میں ترجمہ قائد اعظم محمد علی جناح کو ہم اپنا قائد کیوں مانتے ہیں۔ یہ کتاب آپکو مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے مدوجزر سے واقف بنائے گی۔ کتاب ظاہری خوبیوں کے لحاظ سے بھی نظر فریب ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

ماڈرن اردو ڈکشنری | مولفہ ابو نعیم عبد الحکیم نشتر۔ جالندھری
اردو کے شائقینوں طالب علموں کیلئے
نشتر صاحب نے نہایت عرق ریزی سے یہ کتاب ترتیب دی ہے سائز ۲۲×۲۹/۱۶
۷۰۰ صفحات بہ کمالی۔ دیدہ زیب کتابت۔ مجلد۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

کمال اتاترک | غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی بہترین سوانح عمری۔ مرحوم کے
گہرے دوست ادیب جلیل استاد محمد توفیق پاشا کے
جادو نگار قلم سے یہ مسلمہ حقیقت آفتاب عالمتاب کی طرح روشن ہو کہ مجاہد اعظم بطل حریت کمال اتاترک عہد حاضر کے سب سے بڑے جرنیل اور سب سے بڑے ڈکٹیٹر تھے اسطرح یہ بھی جریدۂ عالم پر زریں حروف میں ثبت ہو کر آجتک دنیا بھر میں جس قدر سوانح عمریاں غازی مغفور کی لکھی گئی ہیں، ان میں سے کوئی بھی کمال اتاترک کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چوتھا ایڈیشن چھپکر تیار ہے مجلد مع خوبصورت گرد پوش قریباً ۔۴۰ صفحات قیمت تین روپے آٹھ آنے

جدید اردو شاعری | از پروفیسر عبد القادر سروری۔ سروری صاحب
(اکو ترمیم) کا قلم تعارف کا محتاج نہیں۔ ملک کے تنقید نگاروں میں ان کا درجہ بلند ہے۔ اس میں انھوں نے جدید شاعری کے اسباب و محرکات اور اس کے بانیوں اور حامیوں کے کلام پر بہت خوبی کی تبصرہ کیا ہے۔ شعرائے حال کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تنقید ہر ایک کے درجہ اور حیثیت کے مطابق ہے۔ حال کا تیسرا ایڈیشن بعد ترمیم و تصحیح شائع کیا گیا ہے جسکو آپ آج ہی طلب فرما کر ملاحظہ فرمائیے۔ سائز ۲۰/۱۶ قیمت تین روپے،

کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

تھیکر کا

بچوں کا بُک کلب

آؤ تصویر بنائیں، مقابلہ نمبر ا کے نتیجے

تھیکر نے بچوں کے بک کلب کے ممبروں کیلئے "آؤ تصویر بنائیں" کا جو مقابلہ کیا تھا اس کے نتیجے کا اعلان مسرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل بچوں کو انعام ملے۔

پہلا گروپ۔ ۱۰-۱۴ سال

پہلا انعام پچیس روپے۔ دیونند لال پوری معرفت جناب چرنداس پوری سیالکوٹ۔ دوسرا انعام پندرہ روپے۔ زیڈ سے جکپاڈیا ۱۸ پیڈر کولابا ربمبئی۔

تسلی کے انعامات دس دس روپے کے | (۱) اسمٰعیل محمد معرفت محمد جان محمد بانو والے ۲۵ پا مدھولی بمبئی ۳۔ (۲) مس ایم پولس کے ۱۸ علی مارین دلی (۳) مس شکیلہ خاتون معرفت امین برادرس۔ بیلنگ کی منڈی۔ آگرہ۔

دوسرا گروپ۔ دس سال سے کم

پہلا انعام پچیس روپے۔ علی گوہر معرفت واحد بخش۔ نیو ملسوار ڈی کرلا بمبئی۔ دوسرا انعام۔ پندرہ روپے مس بلقیس جہاں بیگم۔ بچو موٹرس سکوئنس روڈ بمبئی

———*———

تھیکر انعام جیتنے والوں کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ان بچوں کو چاہیئے کہ وہ لکھیں کہ انعام نقد چاہیئے یا کتابوں کی صورت میں۔ کچھ داخلے بہت اچھے تھے۔ جن لوگوں کو انعام نہیں ملا انھیں تھیکر کا مشورہ یہ ہے کہ "پھر کوشش کرو"

تھیکر کا بچوں کا بک کلب بڑی تیزی سے ہندوستان بھر میں ہر دل عزیز ہوتا جا رہا ہے اور ہر قوم کے بچے روز بروز اس کے ممبر ہوتے جا رہے ہیں۔

بچوں کے بک کلب کے ممبروں کے لئے دوسرے مقابلے کا انتظار کیجئے۔ زیادہ اور بڑے انعامات آپکے منتظر ہیں

آپ ممبر ہیں یا نہیں؟ آج ہی ممبر ہو جائیے۔ سولہ سال سے کم عمر کا ہر بچہ ممبر ہو سکتا ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے

بچوں کا بک کلب، تھیکر ز پبلشرز، بمبئی

کشمکش حیات

(ہنگری میں اقتصادی صورت حالات اتنی خراب ہے کہ شاید اس سے زیادہ خراب کبھی نہ ہوسکے۔ "بوڈاپسٹ یورپ کے نقشے کا مرکز بنا ہوا ہے اور ہر چیز نایاب ہے" ان الفاظ میں برطانوی پارلیمان کے ایک رکن جان ہیر نے وہاں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور اگرچہ ان کے قول کے مطابق وہاں کے لوگ زندہ دل ہیں تاہم انہیں ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ——— مترجم)

ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا۔ ہنگری سب سے زیادہ خوفناک قسم کی جنگ کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ اس سرزمین کا ایک ایک قطعہ لڑائی کا میدان تھا۔ اس کا خوبصورت صدر مقام بوڈاپسٹ اکیاون دن کے محاصرے کے باعث تباہ و برباد ہوکر رہ گیا۔

حتیٰ کہ آج بھی ملک بھر کی پیشانی پر ہولناک جنگ کے داغ نمایاں طور پر نظر آرہے ہیں۔ منہدم شہروں، برباد شدہ پلوں، ناقابل گذر راستوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ فولادی ٹینک جو لڑائی میں شکستہ اور چور ہوکر بیکار ہوچکے ہیں، ادھر ادھر سڑکوں کے کنارے پڑے ہیں۔ ایک لڑاکا ہوائی جہاز کو جو بہت عرصے پہلے ایک بڑی عمارت کی بالائی منزل پر ٹوٹ کر گر پڑا تھا، حال ہی میں اٹھایا گیا ہے۔

بوڈاپسٹ کا نظارہ بڑا روح فرسا ہے۔ کبھی اسے دریائے ڈینیوب کی ملکہ کہا جاتا تھا۔ آج اس کا مشکل سے چوتھائی حصہ صحیح و سلامت ہے۔ برسٹل ہوٹل کے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے جب میں نے نظر ڈالی اور ڈینیوب کے پار اس حصے کو دیکھا جو یورپ میں سب سے زیادہ خوش منظر سمجھا جاتا تھا تو میں حیران رہ گیا۔ شاہی محل بالکل ڈھانچ بن چکا تھا۔ اس کا بڑا گنبد مڑے تڑے فولادی تیروں کا پنجرا معلوم ہوتا تھا۔ اور خوبصورت پل بھی بالکل فنا ہوکر دریا کی تہ میں منہ چھپائے ہوئے تھا۔ باقی سات پلوں کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔

اب بوڈا اور پسٹ کے درمیان زمرگی کے ہنگامے ایک نیم مستحکم پل کے قریب مرکوز ہیں جسے اسی سال جنوری میں مکمل کیا گیا ہے۔ وہ ہلکے پھلکے سے بانسے جیسے دو عارضی پل جو خزاں اور بہار کے دنوں میں دریا کے اوپر سے آنے جانے کے کام آتے تھے، موسم سرما کی شدید برفباری سے چکنا چور ہوگئے۔ وہ شاداب پہاڑی جو دریا کے پار اپنے دلکش مناظر پیش کرتی تھی، ایک عریاں لاش کی طرح بالکل اجاڑ اور سوگوار پڑی ہے۔ اس کے درخت ختم ہوگئے۔ جاڑے کے موسم میں ایندھن کی خاطر انہیں کاٹ ڈالا گیا۔ اور اس خوبصورت کے درخت بھی جو دریا کے بیچوں بیچ جنت کی بہاریں دکھاتا تھا، اسی مقصد کے ماتحت غارت ہوگئے۔

اس کے باوجود صدر مقام میں زندگی اب بھی دھڑکتے ہوئے دل کی طرح مچلتی اور بل کھاتی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہنگری کے لوگ غم ماضی کو بھلا دینا چاہتے ہیں۔ وہ مستقبل کی تعمیر نو کے لئے تیار ہوگئے ہیں۔ شہر کے میئر نے مجھے بتایا کہ شہر کے دوبارہ تعمیر ہونے میں دس سال لگیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ دس کی بجائے بیس سال لگ جائیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ پہلی سی شان پیدا نہیں ہوسکتی۔

بوڈا کے مقابلے میں پسٹ کم تباہ ہوا ہے۔ اس کے بازاروں میں بڑا حیرت انگیز تضاد نظر آتا ہے۔ آپس میں چہلیں کرتی کچھ ایسی عورتیں دکھائی دینگی جو یورپ میں سب سے زیادہ زرق برق لباس پہننے والیوں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ اور دوسری طرف ایسی مزدورنیاں اور دیہاتنیں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں جن کے میلے کچیلے لباس اور فاقے سے مرجھائے ہوئے چہرے دلوں میں سوز پیدا کردیتے ہیں۔ جنگ سے قبل یورپ میں خرید و فروخت کا سب سے زیادہ مشہور مرکز ویسی اکا تھا۔ دوکانوں میں نہایت قیمتی نسری کپڑے اور پوشاکیں بکتی تھیں جنکی قیمتیں اشرفیوں کی صورت میں وصول کی جاتی تھیں۔ اسی بازار کی ان دوکانوں میں اب چری ہوئی لکڑیاں اور کوئلوں کے انبار بکتے نظر آتے ہیں۔ بوڈاپسٹ میں آجکل ایندھن بھی بہت کمیاب ہے۔ اور پچھلے موسم سرما میں جو غیرمعمولی طور پر زیادہ سرد تھا وہ بالکل ہوش اڑا دینے والے نرخ پر فروخت ہوا۔

بوڈاپسٹ کبھی قہوہ خانوں اور ناچ گھروں کا شہر کہلاتا تھا۔ جنکی تعداد کئی سو ہوگی۔ ہر ایک میں ذاتی جیئز بجانے والے موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے مشہور اور مقبول عام مقامات کا وجود گولوں کی زد میں آکر صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے سینما دیکا کوئی قہوہ خانہ باقی ہے جو عام طور پر کسی عارضی عمارت میں قائم کرلیا گیا ہے۔ کسی قسم کا کھانا اب بھی وہاں مل سکتا ہے۔ عام طور پر دو یا تین قسم کی شوربے والی خوراک میسر آجاتی ہے۔ ایک وقت کے کھانے کے عوض اتنی رقم ادا کرنی پڑتی ہے کہ لڑائی سے پہلے اسے ایک زرکثیر سمجھا جاسکتا تھا۔ گزشتہ ماہ اکتوبر سے گوشت بالکل ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اسکی وجہ جانوروں کی کمیابی ہے۔ لڑائی کے دوران میں صرف ہنگری کے تیس لاکھ مویشی مرگئے۔ اب تقریباً چار لاکھ باقی ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کو افزائش نسل کے لئے محفوظ کرلیا گیا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اب یہ طعام خانے بالکل ویران معلوم ہوتے ہیں۔

لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ

جے پرکاش نرائن

بوڈاپسٹ کے لوگ کیونکر گزارا کرتے ہیں۔ آٹھ لاکھ باشندوں میں سے زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ وہ قحط، بیماری اور سردی کا بڑی مشکل سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس وقت بوڈاپسٹ یورپ کے قحط کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اموات کے اعداد و شمار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے خصوصاً بچے کوئی پچاس فیصدی کے حساب سے ضائع ہو رہے ہیں۔ گذشتہ دسمبر کے مہینے میں ۲۱۸۸ اموات ہوئیں جبکہ پیدائش کی تعداد ۲۲۰ سے نہ بڑھ سکی۔ تقریباً ہر شخص کی حالت یہ ہے کہ کمیِ خوراک کے باعث آنکھیں دھنس گئی اور گال پچک گئے ہیں۔ مجھ سے ملنے والے ہر شخص نے کہا کہ ہم پوری خوراک نہ ملنے کے باعث اسقدر کمزور ہو گئے ہیں کہ روزانہ چند گھنٹے بھی آسانی سے کام نہیں کر سکتے لیکن ہر شخص کے لئے کام کرنا لازمی ہے کیونکہ کام کئے بغیر روٹی بالکل نہیں مل سکتی۔ چنانچہ ان کا نعرہ یہی ہے۔

"کام نہیں تو خوراک نہیں"

حد یہ کہ گیہوں اسقدر کمیاب ہے کہ ہفتہ میں تین دن مکئی کے لئے مخصوص ہیں۔ کارخانوں کے مزدور، حکومت کے وزیر، درسگاہوں کے معلم غرض سبھی قحط اناج سے پیدا ہونے والی مشکلات کا شکار ہو رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو کارخانوں کے مزدوروں کی حالت قدرے بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تمام نہیں تو تنخواہ کا کچھ حصہ انھیں خوراک کی صورت میں مل جاتا ہے جس کا انتظام کارخانے کے منتظمین کی طرف سے ہوتا ہے۔ بہت سے کارخانوں کے زیر اہتمام خوراک جمع کرنے کے گروہ بنائے جاتے ہیں جو دیہاتوں میں جا کر کھانے کی چیزیں تلاش کرتے ہیں۔ اسطرح جمع کی ہوئی مقدار جسمانی اور دماغی کام کرنے والوں میں اس طرح تقسیم کر دی جاتی ہے کہ ہر ہفتے ان کو ۱۷۲۰ درجہ اور ہر خاندان کے ہر رکن کو ۸۵۶ مزید درجہ حرارت غریزی پیدا کرنے والی خوراک مل جائے۔ مزدوری کی باقی رقم ان کو نقد دیدی جاتی ہے۔ حالانکہ نقدی کی کوئی قیمت باقی نہیں رہی ہے۔

اسوقت ہنگری میں تو تفریط زر کی کیفیت بھی ہوشربا حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ جب میں اکتوبر کے مہینے میں ہنگری گیا تو معلوم ہوا کہ پنگو کی قیمت جو کبھی بارہ آنے کے قریب ہوتی تھی اتنی گر گئی ہے کہ صرافہ میں ایسے دس ہزار نوٹوں کے عوض بمشکل ۲۵۰ روپے مل سکتے ہیں۔ اب اسی ہی رقم کے لئے تقریباً پچاس لاکھ پنگو دینے پڑتے ہیں اس سال جنوری کے مہینے سے قیمتیں کوئی تیس گنی حد تک بڑھ گئی ہیں مجھے انہی دنوں کا ایک عجیب واقعہ یاد ہے جبکہ میں ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا کھانا ختم کرتے کرتے پوری خوراک پر دس آنے اس رقم کے مقابلے میں بڑھ گئے جو کھانا شروع ہونے کے وقت مقرر تھی۔

اسوقت ہنگری سے جو خطوط میرے پاس آتے ہیں وہ ٹکٹوں سے بُری طرح پٹے ہوئے ہیں۔ انھیں دیکھ کر بھی یہ اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ وہاں تفریط زر کی کیفیت کسقدر بڑھی ہوئی ہے۔ مثلاً ایک خط کے چند ہی دن بعد جب دوسرا خط ڈالا جاتا ہے تو اسپر بہت سے فالتو ٹکٹ نظر آتے ہیں۔ اجرتوں کے مقابلے میں قیمتیں بھی بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ ہنگری میں ہر وزیر یا جنیئر کی موجودہ تنخواہ کم و بیش ڈھائی تین روپے ماہانہ کے برابر ہے۔ صدر کو مشکل سے چالیس روپے سالانہ کے لگ بھگ رقم وصول ہوتی ہے۔

کچھ بھی ہو ذریعہ مبادلہ کی حیثیت سے ہنگری میں نوٹوں کی قیمت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ لڑائی سے پہلے دس روپے کے نوٹ سے سادی جوتے وہاں ملتے تھے، اب ان کو کاغذ کے چند ٹکڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اب اتنی رقم ایک معمولی اخبار خریدنے، بھری ہوئی گاڑیوں پر اور زیادہ لگکر کرایہ ادا کرنے یا ایک بار ٹیلیفون کرنے کی اجرت دینے کے کام آ سکتی ہے۔ برائے نام چند چیزیں جو بازار میں بکنے آتی ہیں اتنی گراں ہیں کہ ان کی قیمت ڈالر میں لکھی جاتی ہے۔ شہر ہو یا دیہات بہت سی چیزیں بکنے کی بجائے ایک دوسرے سے بدل لی جاتی ہیں مثلاً جوتوں کا ایک جوڑا دیا اور ٹوکری بھر کوئلے لئے یا ڈاکٹر کی فیس ادا کرنے کی بجائے اسے ایک درجن انڈے تھما دیئے۔

مجھے بوڈاپسٹ میں ایک نوجوان عورت سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ پورے خاندان میں سے وہی ایک رکن زندہ بچ رہی تھی اس نے بتایا کہ میں نے بوڈاپسٹ والے اپنے شکستہ مکان سے اٹھارہ عدد برقی انشاں (ریڈی ایٹر) نکال کر لطیف کی دس پونڈ چربی کے عوض بیچ دئے۔ وہ شہری ملازمت میں تھی سامنے جسم پر جو کپڑے نظر آ رہے تھے بس وہی اسکی کل کائنات تھی۔ باقی سب سامان اشیائے خوراک کے عوض دیا جا چکا تھا۔

شہر کے رہنے والے بہت سے لوگوں کا لباس میلا کچیلا اور پھٹا پرانا ہوتا ہے۔ وہ بھی زیادہ تر ٹھنڈا موسم گرما کا۔ کیونکہ محاصرہ کے دنوں میں اور اس کے بعد والے زمانے میں بہت سے لوگوں کے لباس لوٹ لئے گئے تھے۔ بچے سب سے زیادہ مصیبت میں گرفتار تھے۔ حال ہی میں گاڑی کے اندر ایسے بچوں کو دیکھا جو صدر مقام چھوڑ کر کسی دوسرے ضلعے میں اسلئے جا رہے تھے کہ شاید وہاں کچھ زیادہ کھانے کو مل جائے۔ ان میں سے مشکل ہی سے ایک دو بچوں کے پاس اوور کوٹ اور جوتے تھے، اور بہت سے ننگے پاؤں تھے۔

کچھ سردی کی بنا پر اور کچھ اسلئے کہ عمارتیں سلامت نہیں تھیں، موسم سرما کے مہینوں میں تمام مدرسے بند کر دئے گئے تھے۔ ان میں سے بعض مارچ کے آخر میں کھل گئے۔ گذشتہ چند سال میں ہنگری میں تعلیمی نظام کو بھی سخت صدمہ پہنچا ہے پچھلے سال تمام مدرسے لڑائی کی وجہ سے بند کر دئے گئے تھے خصوصاً اس لئے کہ تمام استادوں کو لام پر بھیج دیا گیا تھا۔ اس سے ایک سال پہلے وہ

بحث دیوں کی بمباری کے باعث منہدم رہے۔ بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ ہنگری کے بچوں نے گزشتہ تین سال میں بمشکل چھ مہینے تعلیم حاصل کی۔

نئی پود کو لازمی طور پر بقائے حیات کے لئے زبردست کشمکش کرنی پڑ رہی ہے۔ یونیورسٹی کے طلباء کے لئے صورت حالات بالکل ناقابل برداشت ہے۔ عام دنوں میں بھی ہنگری کے طلباء عموماً غریب ہوتے تھے۔ پھر بھی چھ ہزار کے قریب طلباء بوڈاپسٹ کی یونیورسٹی میں واپس آ گئے ہیں اور تقریباً دو ہزار باقی دو تین یونیورسٹیوں میں ہیں۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح طلبا بھی زمین میں گڑھے کھود کر ان میں رہتے ہیں، کیونکہ ان کی رہائش کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر کے جوتوں کے تلے بالکل چھلنی ہو گئے ہیں۔ مکھن چینی اور گوشت ایسی چیزیں ہیں جو اب بھول کر بھی ان کے خواب میں نظر نہیں آتیں۔ حد یہ ہے کہ کتابیں بھی ان کے لئے کمیاب ہیں۔

مجھے نئی کتابوں کی ایک لائبریری کی بابت بتایا گیا جسے ایک چھوٹے سے گاؤں میں چھپا دیا گیا تھا۔ کہ جب نازی فوج کے سپاہیوں کو اسکا پتہ لگ گیا تو انھوں نے کتابیں نکال کر دلدلی سڑکوں کو پاٹ دیا۔ اب جو کتابیں بچ رہی ہیں، مجروح کے لائق نہیں رہیں، اس لئے ان کو الگ کر دیا گیا ہے۔

خوراک اور لباس کی کمیابی بدستور اور مکانات کی کمیابی ہے۔ جس کے باعث اس مصیبت زدہ ملک میں زندگی بسر کرنی دشوار ہو گئی ہے۔ بمباری سے تباہ شدہ شہروں اور قصبوں میں ہزاروں لوگ کھلیانوں اور ذخیرے کے گوداموں میں رہنے کے لئے مجبور ہیں۔ لڑائی کے دوران میں ہنگری کے آدھے سے زیادہ مکانات بالکل تباہ و برباد ہو گئے۔ بوڈاپسٹ کے ہزاروں مکانوں کی کھڑکیاں فنا ہو چکی ہیں اور انھیں بند رکھنے کے لئے نہ شیشے کے ٹکڑے ہیں نہ لکڑی کے تختے۔ میں نے شہر کے ایسے مکانوں کو جاکر دیکھا جن میں مزدور یا درمیانی درجہ کے بیوپاری رہتے تھے۔ ان میں سے ایک کی کھڑکی بھی سلامت نہیں تھی۔ ایسی صورت میں گزشتہ موسم سرما کی سردی کتنی تکلیف دہ رہی ہوگی، اسکا تصور ہی ہوش اڑا دیتا ہے۔

ان مصائب و آلام کے ہوتے ہوئے یہ معلوم کرکے تعجب نہیں ہوتا کہ ہوتا کہ وہ ہسپتال جو بچ رہے ہیں، مریضوں سے بری طرح بھرے ہوئے ہیں۔ معدودے چند ڈاکٹر موجود ہیں اور ڈاکٹری سامان ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ملک بھر میں نہ تو بیہوشی سنگھانے یا انجکشن دینے کا سامان ہے اور نہ ایکس رے کی تصاویر کھینچنے کے لئے کوئی فلم۔ بہت سے باقیماندہ ہسپتال بھی بعض مسائل بند ہو گئے کہ وہاں نہ دوائیاں تھیں نہ کپڑے کی پٹیاں اور نہ ایندھن۔ انھوں نے مریضوں کو قسمت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔

حمل و نقل کی دشواریاں بھی علیحدہ مصیبت بنی ہوئی ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں ہنگری کے سرکاری محکمۂ ریل کے پاس باربرداری کے پانچ ہزار ڈبے موجود تھے اب ان میں سے دو ہزار نو سو باقی ہیں۔ دو ہزار چار سو اسی انجنوں میں سے کل چار سو اسی رہ گئے ہیں۔ جرمن سپاہی تقریباً اسی ہزار موٹر گاڑیاں اور دریائے ڈینیوب کا سارا آبی بیڑا لے بھاگے۔

نتیجہ یہ کہ ریل کا سفر اب دشوار ہو گیا ہے۔ حال ہی میں حکومت امریکہ نے گفت و شنید کے بعد ایک کروڑ ڈالر دینے کا وعدہ کیا ہے تاکہ ہنگری اس رقم سے امریکی فوج کی گاڑیاں خریدے۔ اس طرح سے کافی مدد مل جائے گی۔

آزادی کے بعد نئی حکومت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ گزشتہ اگست کے مہینے میں تقریباً چالیس لاکھ ایکڑ زمین ساڑھے سات لاکھ کسانوں میں تقسیم کر دی لیکن نتیجہ کچھ نہ رہا۔ بدقسمتی سے اوزار، بیج اور باربرداری کی سہولتیں میسر نہ ہونے کے باعث اس امداد سے برآمد ہونے والے نتائج کسی عنوان اپنا ظہور نہ دکھا سکے۔

مختصر یہ ہے کہ ہنگری اس وقت عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ ہر چیز کمیاب ہے اور پھر بھی ہنگری کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہاری ہوئی لڑائی کا بھگتان بھگتتی رہے۔ زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ان حالات کے ہوتے ہوئے لوگوں میں خوش مزاجی کی پرورش ہوئی ہے اور حکومت حد درجہ آرزو مند ہے کہ بہت جلد اپنے ملک میں ایک خوشگوار نئی دنیا کی فضا قائم کرے ۔

(لندن کالنگ سے ماخوذ)

غزل

جلیل شیرکوٹی

بڑھ گئی حد سے کیوں خلش دل کی
آمد آمد ہے میرے قاتل کی؟

یہ ہی معراج ماتم دل ہے
ڈبڈبا آئی آنکھ قاتل کی

تک رہے ہیں جدھر جدھر دیکھو!
اُف خدا خیر ہو مرے دل کی

کاش! منزل کی جستجو ہو مری
راہ تکتا ہوں تھک کے منزل کی

چوٹ دل پر ضرور کھائی ہے
چشم پرنم ہے آج قاتل کی

بیربی نا! ایک نغمے لطیف و گداز
ہو گی تعریف اور کیا دل کی؟

ان کے طعنوں کا کچھ اثر نہ ہوا
داد دے کوئی تشنگی دل کی

خود وہ کھنچتے ہوئے چلے آئے
وسعتیں دیکھ جذب کامل کی

نقد و نظر

مطبوعات ادارۂ نشریات اردو حیدرآباد دکن

اس سے قبل ادارۂ اشاعت اسلامیات کی بابت اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ یہ ادارہ اسی ادارے کی تجارتی اور ادبی شاخ ہے۔ لہٰذا مقاصد اور حسن انتظام یکساں ہیں جس کے مکرر اظہار کی ضرورت نہیں۔ اسوقت اس ادارے کی تین کتابیں پیش نظر ہیں:۔

جنگ مشرق و خاتمۂ جاپان

مصنفین مولوی محمد یحییٰ صاحب۔ محترمہ رسیدہ تبسم۔ $\frac{20\times 30}{16}$ کے ۲۱۰ صفحات مجلد قیمت دو روپے۔ یہ جاپان کے عروج و زوال کی ایک پُراز معلومات داستان ہے جو نہ صرف سیاسی بلکہ تاریخی جغرافیائی اور اقتصادی اعتبار سے بڑے سلیقے کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے۔ اموأ چین اور بحرالکاہل میں پھیلے ہوئے مشرق بعید کے تمام جزیروں کا حال بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ کیونکہ یہ جانے بغیر اصل موضوع کو پوری طرح سمجھ لینا مشکل ہے۔ کتاب ہر لحاظ سے تازہ ہے۔ حتیٰ کہ آخری باب میں ایٹم بم کی ایجاد اور اسکی ساخت پر روشنی ڈالی ہے۔ تقریباً چودہ پندرہ صفحات میں مختصر طور پر جنگ مشرق کا روزنامچہ پرل ہاربر کے حملے سے سپراندازی تک لکھا ہے جو یادداشت کے لئے یقیناً مفید ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب کا مطالعہ کرکے ان تمام واقعات کو جو ابھی تازہ ہیں، حافظے کی لوح پر ہمیشہ کے لئے مرتسم کیا جاسکتا ہے۔

رموز اقبال

مصنف:۔ ڈاکٹر میر ولی الدین۔ ایم۔اے، پی۔ایچ ڈی $\frac{20\times 30}{16}$ کے ۱۸۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سوادو روپے

اس کتاب کے پانچ باب ہیں جو فلسفۂ خودی، نظریۂ عقل و عشق، حریت جبر و قدر، عہد حاضر کا انسان اور مسلمان کی زندگی سے متعلق ہیں۔ ہرچند ان موضوعات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن قابل مصنف نے جو جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ فلسفہ کے صدر ہیں، بڑی گہری نگاہ ڈال کر ایسے نکتے پیدا کئے ہیں جو ان سے قبل قلم اٹھانے والوں کی نظر انتقاد سے پوشیدہ رہ گئے تھے۔ اور بس اسی اعتبار سے اس کتاب کو مفید اور قابل قدر کہا جاسکتا ہے۔ اقبال کی تعلیمات اسلامی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں چنانچہ اس کے ثبوت میں متعدد بار آیات قرآنی سے ہم آہنگی پیدا کرکے دکھائی ہے۔ مشرق و مغرب کے دوسرے مفکرین کے اقوال بھی بطور حوالہ درج ہیں۔

روح حیات

مصنف:۔ جناب اختر قریشی $\frac{20\times 30}{16}$ کے ۱۱۲ صفحات جلد معمولی۔ قیمت ایک روپیہ۔ یہ ایسے خطوط کا مجموعہ ہے جو مختلف حضرات کو لکھے گئے ہیں۔ مکتوبات نیاز کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن نہ فکر و خیال کی اتنی گہرائی ہے نہ انداز بیان کی بے ساختگی کہیں کہیں طنز و مزاح کے لطیف پہلو کچھ مزا دے جاتے ہیں۔ ورنہ بحیثیت مجموعی ان میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ اکثر جگہ زبان کی غلطیاں ہیں جو معمولی کوشش سے دور ہوسکتی تھیں۔ امید ہے کہ آئندہ اشاعت کے وقت ان کا لحاظ رکھا جائیگا۔ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ خطوط اصلی ہیں حالانکہ درحقیقت بالارادہ لکھے گئے ہیں۔ اسی لئے تصنع اور بناوٹ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

شفق

مصنف:۔ جناب شفیق جونپوری۔ ملنے کا پتہ:۔ جناب عزیز ربانی سیکرٹری نظام ادب۔ جونپور

$\frac{20\times 30}{16}$ کے ۱۲۸ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ یہ حضرت شفیق جونپوری کا چوتھا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے قبل صبح کعبہ، اخلاص مشرق، اور طوبیٰ شائع ہوچکے ہیں۔ موصوف نے قدیم طبقے کی ہمنوائی اس لئے نہیں کی کہ "وہ ابھی تک اپنی کہنگی و پامالی ہی پر قانع ہے۔ اس میں کسی تازگی کی گنجائش نہیں۔" نیا رنگ اسلئے اختیار نہیں کیا کہ "اعتماد کے قابل مستند ادیب شاعر نئے دور نے ایک بھی نہیں پیدا کیا!" اس کے ساتھ ہی اس کا اعتراف ہے کہ "بعض کسی فرمائش یا مخصوص جذبات کے ماتحت ہیں تاکہ عصر حاضر کے تقاضوں سے بھی کلام تہی دامن نہ ہو" وہ پہلے حسرت موہانی کے معتقد تھے۔ ۱۹۴۳ء سے علامہ اقبال کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ ان کے اظہار و بیان کے متضاد پہلوؤں کا لحاظ رکھنے کے بعد جب کلام پر نظر ڈالی جائے تو کہنگی اور پامالی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ بعض اشعار متقدمین کے کلام کا بالکل چربہ بلکہ ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ایسے شعروں کو جو زبان زد خلائق ہوچکے ہوں نئے الفاظ میں پیش کیا جائے تو اسے توارد بھی نہیں کہا جاسکتا۔

فسح

سیر کشمیر

مصنف:۔ مولوی محمد عبدالمجید صاحب بی اے گورکھپوری ملنے کا پتہ:۔ جناب قاضی محمد مسعود علی، قاضی پورہ خورد۔ گورکھپور۔ $\frac{20\times 26}{8}$ کے ۱۳۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ اس کتاب کا مطالعہ تاریخی، جغرافیائی اور تفریحی اعتبار سے مفید ہوسکتا ہے۔ مصنف نے بذات خود کشمیر کی سیر کرکے جملہ واقعات قلمبند کئے ہیں۔ معمولی سے معمولی چیزیں انکی نظر سے بچنے نہیں پائی۔ انہوں نے خوب سیر کی اور بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ زبان شگفتہ اور انداز بیان دلپذیر ہے۔ کہیں کہیں اشعار کا استعمال زیادہ لطف پیدا کردیتا ہے۔ بہرحال یہ کتاب "رہنمائے کشمیر" ہونے کے علاوہ ادبی اعتبار سے بھی داد تحسین کی مستحق ہے۔ مطالعہ کرتے وقت ناظرین اپنے آپ کو کشمیر کی پہاڑیوں اور وادیوں میں کھویا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اس خطۂ جنت نظیر کی سیر کرنے والے موسم سفر سے قبل اسکا مطالعہ کرلیں تو انہیں بہت کام کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔

دنیا ہماری مصنف:- جناب پردیسی۔ ملنے کا پتہ:- راج کمل پبلشرز جموں کشمیر۔ ۱۴۴ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈھائی روپے۔ پردیسی صاحب کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بڑے دلگداز انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ ہر افسانہ زندگی کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں صداقت اور واقعیت کی جھلک سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے دوسرے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح وہ مظلوموں کی حیات المیہ سے کھیلتے نہیں بلکہ دکھے ہوئے دلوں کی ضربات کو خود محسوس کرنے کے بعد دوسروں کو محسوس کرایا ہے کہ وہ بھی ان کا مطالعہ اس طرح کریں اور سماج کے چہرے پر سے ہوئے بدنما داغوں کو مٹانے کی کوشش کریں۔ انداز بیان میں بھی صحیح جذبات کی ترجمانی موجود ہے۔ البتہ افسانوں میں پلاٹ برائے نام ہے۔ ایسی ندرت پیدا کرنے کی زیادہ کوشش نہیں کی۔ اس کے باوجود ہر افسانہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ "میرا حق" "کاریگر" "دنیا ہماری" اور "تنہائیں" خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ تنہائیوں میں جنسی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مگر عریانی سے پاک ہے۔

> "نقد و نظر" کے سلسلے میں ہر کتاب کی دو جلدیں دفتر آجکل میں آنی ضروری ہیں ورنہ ان پر کسی قسم کا اظہار خیال نہیں کیا جائیگا۔ — ادارہ

برطانیہ کی ٹریڈ یونینیں

ان کی ابتدا اور ارتقا

والٹر اسٹرین

(برطانیہ میں ٹریڈ یونینوں کی تحریک کا [illegible] بہت لمبی ہے لیکن باقاعدگی کے ساتھ یوں لگتا ہے کہ اس تحریک کا ابتدائی نشان سترہویں صدی کے وسط میں ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ لیکن اس کی حقیقی ابتدا اصل میں اٹھارویں صدی کے شروع سے ہوئی۔ وقتاً فوقتاً جو مختلف قانون نافذ ہوئے سو انہوں نے اس تحریک کو قومی زندگی کے تار و پود میں شامل کر لیا اور اس کے بعد سے برطانوی زندگی میں اس کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ اس مضمون کا مصنف ۱۹۲۶ء سے برابر برطانیہ کی ٹریڈ یونین کانگریس کا جنرل سکریٹری رہا ہے۔)

برطانیہ کے جن قومی اداروں میں اہل برطانیہ کے کردار کی صاف جھلک دکھائی دیتی ہے، ان میں ٹریڈ یونینوں کی بے حد نمایاں جگہ ہے۔ ان ٹریڈ یونینوں سے ان کے کردار اور سیرت کے خاص خاص پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے — مثلاً زندگی کے جمہوری طریقوں کے ساتھ اٹل لگاؤ، آزادی کا شدید احساس، ضبط نفس کی صلاحیت، اور اپنے معاملات کو پوری عملی سوجھ بوجھ اور استقلال کے ساتھ طے کرنے کی حیرت انگیز قدرت۔

برطانیہ کے لوگوں میں امداد باہمی اور اشتراک عمل کا جو شدید جذبہ ہے، برطانوی ٹریڈ یونینوں کی تخلیق اس کے تحت بھی ہوئی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ جذبہ پیشہ ور دستکاروں کے نظام، اور بلا اجرت کے معاہدوں کے زمانے سے کافی پہلے سے کام کر رہا ہے۔ البتہ وسطی دور کی گلڈز کو صحیح معنوں میں ٹریڈ یونینوں کی ابتدائی شکل نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ یہ گلڈ جدید ٹریڈ یونینوں کے بعض خاص مقصدوں کو پورا کرتے تھے اور ایک ایسے زمانہ میں کرتے تھے جب جماعتی لین دین کے موجودہ طریقوں پر عمل کرنا تو تقریباً ناممکن تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے قانون اور گلڈوں کے بنائے ہوئے قاعدے اور ضابطے جہاں ایک طرف امید واروں اور مزدور پیشہ کاریگروں کی ذمہ داریوں اور کام کی شرطوں کا تعین کرتے تھے وہاں دوسری طرف کارخانہ داروں، جن کی حیثیت آج کل کے آجر کی سی تھی، کی ذمہ داریوں کو بھی واضح کر دیتے تھے۔

در حقیقت میں جب ٹریڈ یونینوں کا رواج شروع ہوا ہے تو گلڈوں کا نظام بھی بال برابر قائم تھا۔ اور مزدوری اور کام کے متعلق حکومت نے جو قانون اور ضابطے بنا رکھے تھے انہیں بھی آجروں کا نیا طبقہ اور سرمایہ داروں کا وہ گروہ، جسے صنعتی انقلاب نے پیدا کیا تھا، مٹا نہیں سکا تھا۔

موجودہ برطانوی ٹریڈ یونینوں سے ملتی جلتی ایک چیز جس میں کام کرنے والے متحد ہو کر سامنے آئے، اصل میں اٹھارویں صدی کے ابتدائی دنوں میں شروع ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پانی کی قوت کے استعمال سے گاؤں اور چھوٹے چھوٹے شہروں کی گھریلو صنعتوں میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب زمین کی مشترکہ ملکیت کے خلاف بعض قانون جاری ہوئے تھے اور زراعت پیشہ لوگوں کی ایک خاصی بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں کارخانہ والے شہروں، کانوں والے علاقوں اور ان حصوں کی طرف آ رہی تھی جہاں لوہے کی صنعت بڑھ رہی تھی۔ صنعتی انقلاب نے کام کرنے والوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا تھا جو بڑی بڑی مزدوریاں کماتا تھا، اور کام لینے والوں میں بھی ایک نیا سرمایہ دار طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ کام کرنے والوں یا مزدوروں کے لئے اجرت اور مزدوری کے سرکاری قانون ایک قسم کے تحفظ کا کام دیتے تھے لیکن کام لینے والوں (آجروں) اور سرمایہ داروں کے لئے یہ قانون ایک طرح کی رکاوٹ تھے۔ اور اسلئے انہوں نے ایسے قانونوں کے خلاف ایک مہم شروع کر دی۔ اور ان دنوں بہت سی عارضی یونینیں قائم ہو گئیں۔ ان کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ وہ پارلیمنٹ پر زور ڈال کر مزدوروں کے قانون نافذ کرا دیں۔

ادھر بعض نئے قانونوں کے نفاذ کی وجہ سے مزدوروں کے لئے یہ آسانی پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے آپ کو منظم کر سکیں۔ ۱۸۲۴ء کے قانون کی رو سے یہ طے ہو گیا کہ اگر کوئی شخص کام دھندے کے حالات کو بہتر بنانے کی غرض سے کسی جماعت یا تنظیم میں شریک ہو تو وہ کسی طرح کی سازش کا مجرم نہیں ٹھیرایا جا سکتا اور نہ اس پر کسی قسم کی قانونی سختی یا سزا کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس قانون کے بعد سے یونینوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ لیکن ان یونینوں کی حیثیت محض کاریگروں اور دستکاروں کی مقامی انجمنوں کی سی تھی۔ انیسویں صدی کے وسط میں ان کو ایک قومی پیمانہ پر متحد کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ اور انجینیری مشینری کے کام، جہاز سازی کی صنعت، چھاپہ خانوں، کپڑے اور جوتے کا کام کرنے والوں کے علاوہ دوسرے دستکاروں کی مستحکم اور عملی انداز میں چلنے والی یونینوں کے قیام نے اس تحریک کو نئی راہ دکھائی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ٹریڈ یونینوں سے تعلق رکھنے والے قانونوں میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۶ء کے درمیان جو متعدد قانون جاری ہوئے انہوں نے واضح طور پر یہ بات صاف کر دی کہ ٹریڈ یونینوں کی قانونی حیثیت کیا ہے۔ ان قانونوں سے یونینوں کو ایک طرح کا قانونی تحفظ مل گیا اور ان کو بھی ایک آزاد اور

قانونی حیثیت تسلیم کر لی گئی۔ پارلیامنٹ کے ان قانونوں کی بنا پر یونینوں کو اس بات کا حق حاصل ہو گیا کہ وہ بغیر کسی قسم کی دخل اندازی کے اپنے متعین مقاصد پر چل سکیں۔ ۱۸۷۱ء کے بعد ۲۰ سال سے بھی زیادہ عرصے تک ان کی قانونی حیثیت ان کے حقوق، ان کی ذمہ داریوں اور ان کی رعایتوں کے متعلق کسی قسم کی پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔

تقریباً ۲۰ سال کی مدت میں ٹریڈ یونینوں کی تحریک دستکاروں کی محدود جماعت سے بڑھ کر مزدوروں کی نسبتاً بہت بڑی جماعت میں پہنچ گئی۔ اور رفتہ رفتہ کانوں میں کام کرنے والوں، ریلوں کے ملازموں، اور ٹرانسپورٹ کے محکمہ والوں میں اس کا اثر بہت تیزی سے بڑھا۔ اور پھر ہر طرح کے مزدوروں، مثلاً بندرگاہوں، میونسپل گیس ورکس، برتنوں کے کارخانوں، اور چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں کم مزدوری پر کام کرنے والی عورتوں تک میں یہ تحریک پھیل گئی۔ ۱۸۸۹ء میں لنڈن کے بندرگاہ میں ایک بہت بڑی ہڑتال ہوئی۔ اور یہ ہڑتال بہت جلد دوسرے بندرگاہوں میں بھی پھیل گئی۔ اس ہڑتال میں ایک نئی بنی ہوئی یونین نے بندرگاہوں، گھاٹوں اور دریا کے کنارے کام کرنے والے مزدوروں کے لئے ۶ پنیس فی گھنٹہ کی مزدوری کا مطالبہ کیا۔ اس ہڑتال سے ٹریڈ یونین کی تحریک کو زبردست قوت ملی اور مقامی ٹریڈ کونسلوں کے قیام اور ٹریڈ یونین کانگریس ۱۸۶۸ء میں بنائی گئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اس سے تعلق رکھنے والی مختلف یونینوں کے نمائندے ایک جگہ جمع ہو کر اپنے معاملات پر بحث مباحثہ کر سکیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ابتدائی مقصد میں اور بہت سے مقصد بھی شامل ہوتے گئے۔ حالانکہ اب بھی اس کی حیثیت ایک ایسی جماعت کی ہے جہاں معاملات پر سوچ بچار اور بحث تمحیص ہوتی ہے۔ کسی یونین پر اس کی رکنیت لازمی نہیں۔ جو یونینیں اس کی رکنیت قبول کرتی ہیں وہ اپنی خوشی سے اس کے قواعد کی پابندی کو بھی اپنے لئے لازم سمجھتی ہیں۔ لیکن اس رکنیت کے بعد ان کی آزادی اور انفرادی حیثیت جوں کی توں رہتی ہے۔ اور وہ اپنے معاملات میں خود مختار ہوتی ہیں۔ کانگریس نے اپنے لئے بھی ایک مرکزی نظام وضع کیا ہے جس کی مدد سے وہ پوری تحریک کو چلا سکے، یونینوں کی عام بھلائی اور بہبودی کے سلسلہ میں اپنی کوشش جاری رکھ سکے اور اپنا ایک عام پروگرام اور پالیسی بنا سکے۔ اس پروگرام اور پالیسی میں کانگریس صنعت و حرفت اور سماجی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق تبدیلیاں کرتی رہتی ہے۔

تعداد اور دائرہ عمل میں ان یونینوں نے کس حد تک ترقی کی ہے، اس کا اندازہ کانگریس کے کاغذات دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا پہلا اجلاس ۱۸۶۸ء میں مانچسٹر میں ہوا تھا جس میں تھوڑی سی سوسائٹیوں کے ۳۴ نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اس وقت ان سوسائٹیوں کے ممبروں کی تعداد ۱۱۸,۰۰۰ تھی۔ انیسویں صدی کے آخری دس سالوں میں ممبروں کی تعداد پندرہ لاکھ ہو گئی، اور پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر ان ممبروں کی تعداد ۶۵ لاکھ تھی۔

برطانوی ٹریڈ یونینوں کی تعداد برابر گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔ لیکن بحران کے بدترین دنوں میں (بیسویں صدی میں) اس کی بنیادیں بے حد مضبوط ہی رہی ہیں اور اس کے لاکھوں ممبروں میں پوری تنظیم رہی ہے۔ دونوں جنگوں کے درمیانی زمانہ میں، ۱۹۳۲-۱۹۳۳ء میں ممبروں کی تعداد ۶۵ لاکھ سے گھٹ کر [illegible] تینتیس لاکھ رہ گئی۔ لیکن جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو کانگریس میں ۲۰۷ یونینیں شامل تھیں اور ممبروں کی تعداد بڑھ کر ۴۵ لاکھ ہو گئی تھی۔ لڑائی کے زمانہ میں ممبروں کی تعداد میں ۲۰ لاکھ کا اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۴ء میں جو یونینیں کانگریس کے ساتھ ملحق تھیں ان کے ممبروں کی تعداد [illegible] تھی — اور ان میں سے ۱۳,۰۰,۸۰۰ عورتیں تھیں۔

اب برطانوی ٹریڈ یونین کانگریس کے ساتھ ۲۰۰ یونینیں ملحق ہیں۔

پیتم

کیا رکھا ہے اس جیون میں تو ہی نہیں جب پاس؟
تیرے بنا اس دکھیا من کی کون بندھائے آس؟
نیر بہائیں نین
پیتم
کاٹے کٹتے نہ رین

امنڈ گھمنڈ کے بادل برسیں جھوم رہی برسات
رہ رہ کر ڈستی ہے من کو ناگن کالی رات
تڑپت ہوں دن رین
پیتم
کاٹے کٹتے نہ رین

سلگ رہی ہے من میں اگنی آ کر اسے بجھا جا
نینن میں درشن کے پیاسے سندر روپ دکھلا جا
ہردے ہے بے چین
پیتم
کاٹے کٹتے نہ رین

کشور شمیم

... ان کی تعداد ... ان یونینوں میں ہر طرح کے کاروباری اداروں کے ملازم شامل ہیں۔ اب ... کی یونینوں کے علاوہ، تنخواہ دار ملازموں، کلرکوں، ماہروں، نگرانوں اور انتظامی افسروں کی بھی اپنی یونینیں ہیں۔ اس کے علاوہ ہر پیشے کے لوگوں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ اپنے مشترک مفاد کی حفاظت اور اپنے مقاصد کی تبلیغ کیلئے منظم ہونا ضروری ہے۔ اور بہت سے پیشہ وروں کی یونینیں ٹریڈ یونین کانگریس سے ملحق ہو گئی ہیں۔ پبلک مفاد کے کام کرنے والوں (تاجروں، ہسپتالوں، بینکوں، انشورنس کے ملازموں، آرٹسٹوں اور تھیٹر کے کام کرنے والوں، نرسوں، سائنٹفک کام کرنے والوں اور ڈاکٹروں کی بھی الگ الگ یونینیں ہیں۔ ان پیشوں کی منظم جماعتوں میں بھی اسی طرح الحاق ہوتا ہے جیسے چھاپہ خانوں اور دھات کا کام اور لکڑی کا کام کرنے والوں کی یونینوں میں مثلاً انجنیرنگ اور جہاز سازی کے نقشہ نویسوں کی یونینیں، یونینوں کے اس گروہ کے ساتھ ملحق ہوں گی جس میں انجنیری، ڈھلائی اور گاڑیاں وغیرہ بنانے کے کام کرنے والوں کی یونینیں شامل ہیں۔ ٹریڈ یونین کانگریس سے ریلوے کلرکوں کی یونین کا الحاق ریلوے کے انجنیروں، فائرمینوں اور دیگر مستریوں کی یونینوں کے ساتھ ہوگا۔ (یا جہاز رانوں کی یونین)، ریڈیو کے افسروں کی یونین اور ہوائی جہاز چلانے والوں کی یونین ٹریڈ یونین کانگریس کے اس گروہ میں شامل ہوں گی جس میں ٹرانسپورٹ کی دوسری یونینیں (ریلوے کے علاوہ) شامل ہیں۔ اور اسی طرح کانوں والے گروہ میں کان کے کام کرنے والوں کی بڑی نیشنل یونین کے علاوہ کوئلے کی کانوں کے افسروں ماتحتوں اور نگرانوں کی یونینیں بھی شامل ہوں گی، بالکل اسی طرح جیسا انجنیرنگ کے گروہ میں نگران اسٹاف اور انجنیرنگ کا کام کرنے والے آدمیوں کی یونینیں شامل ہیں اور لوہے اور دوسری دھاتوں کا کام کرنے والوں کی یونینوں میں بھی دھات کا کام کرنے والے کاریگروں کی یونین، عمارتوں کا کام کرنے والوں، لکڑی کا کام کرنے والوں و سجاوٹ کا کام کرنے والوں کی یونینیں شامل ہیں۔

ٹریڈ یونین کانگریس کا خیال ہے کہ عملی اور نظری دونوں حیثیتوں سے ہر وہ شخص جسے اجرت اور مزدوری سے تعلق ہے، ٹریڈ یونین کے نقطۂ نظر سے منظم کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں، ٹریڈ یونین کی تحریک انگلستان میں اب ان لوگوں میں بھی عام ہو گئی ہے، جو کسی دوسرے کے نوکر نہیں بلکہ خود اپنا کام کرتے ہیں۔ نظری حیثیت سے انہیں بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں کہ ہاتھ کا کام کرنے والوں کی یونینوں کا الحاق انتظامی کام کرنے والوں کی یونینوں سے کر دیا جائے اس لئے کہ ٹریڈ یونین کی تحریک کی بنیاد تو بس یہی انسانی فطرت کا یہ جذبہ ہے کہ وہ باہمی طور پر مل جل کر ساتھ ساتھ رہیں۔ قدرتی خواہش جو مشترک مقاصد اور مفاد کی ترقی کیلئے انسان کو متحد و منظم ہونے کی طرف مائل کرتی ہے۔ اس جذبہ اور خواہش نے برطانیہ کی زندگی کے طریقہ اور نظام پر نمایاں اثر ڈالا ہے۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ تبرکاتِ آغا فقیر قزلباش ...... (مرسلہ) آغا آفتاب علی قزلباش

۲۔ اختر حسین رائے پوری (۲) بحیثیت افسانہ نگار ...... جناب ظہور الحسن ڈار

۳۔ موت (افسانہ) ...... جناب احمد ندیم قاسمی

۴۔ فلسطین کے بدوی قبائل کی زندگی ...... جناب مائل تقوی

۵۔ ہندوستان اور کینیڈا کے مابین تجارت ...... انڈین ٹریڈ کمشنر سے ماخوذ

۶۔ ایثار (روسی افسانہ) ...... جناب بشیر حسن

۷۔ چانکیہ کا نظریۂ سیاسی ...... جناب عبد الحمید لقمانی

۸۔ لنکا ...... جناب موہن چند گگرنا

۹۔ اقبال کی فکری وحدت یا تضاد (۲) ...... حضرت میکش اکبرآبادی

۱۰۔ ناگور ...... مسٹر لئل۔ بی۔ ایں۔ تحیل

۱۱۔ سپل (افسانہ) ...... محترمہ سعیدہ بشیر

۱۲۔ ترکی کی مشکلات ...... جناب بی۔ ایل۔ آہوجہ

مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ فوٹو پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۳۲ سے شائع کیا

جونکہ ... فوجی جونٹے کے کمانڈر نے ایک بار فرمایا کہ جنوبی امریکہ کا ایک خاص چیونٹا اپنی ایک عادت کے مطابق جاپانی سپاہی سے مشابہت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ راستہ چلتے وقت جب بھی اسے کوئی چیز پڑی ہوئی نظر آئی فوراً عاقبت اندیشی کے خیال سے اٹھا کر اپنے پاس محفوظ کرلی۔ لیکن ایک لحاظ سے ان دونوں میں بین فرق موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ امریکی چیونٹا سر جھکا کر اپنی ہار کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ وہ لڑتے لڑتے خود فنا ہو جاتا یا اپنے دشمن کو فنا کردیتا ہے اس چیونٹے کا اصطلاحی نام «ایسی ٹن» ہے۔ وہ حد درجہ عقلمند اور محنتی لیکن اسکے ساتھ ہی ساتھ چنگیزی عہد کے مغل بادشاہوں یا ہنوں کی طرح ظالم اور خونریز بھی ہوتا ہے۔ کھانے کی تلاش میں اس قسم کے بے شمار چیونٹے صفیں بنا کر چلتے ہیں۔



افریقہ کا «دوری لینس» نامی چیونٹا جو سپاہی کی طرح لڑتا اور مرنے سے نہیں ڈرتا ہے۔

——o——

وہ راستے کی ہر چیز کو تہس نہس کردیتے ہیں۔ ایک اور قسم کا جنگجو چیونٹا «دوری لینس» کہلاتا ہے جو افریقہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ بھی عقلمندی جفاکشی اور دور اندیشی کے اعتبار سے امریکی چیونٹے سے کسی طرح کم نہیں ہوتا یہ کوشش کرتا ہے کہ دشمن کی ملکہ کو مار ڈالے اور اسکی فوج میں ابتری پھیلا کر اسکے سپاہیوں کو اپنا غلام بنالے۔ ایسے موقعوں پر اسکی بہادری کے کارنامے ہاتھیوں کی جرات سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ ان دونوں قسموں کے چیونٹے حشرات الارض کی جانچ پڑتال کرنے والے ماہرین علم کیلئے ہمیشہ جاذب نظر رہے ہیں۔ ایچ ڈبلیو بیٹس پہلے شخص ہیں جنکی توجہ اول الذکر کی طرف مبذول ہوئی۔ وہ مسلسل دس سال تک وادی امیزان میں اسکی عادات و اطوار کا جائزہ لیتے رہے اور اپنی تحقیق کے مطابق اس نتیجے پر پہنچے کہ سپہ گری کی صلاحیت اسمیں فطرتاً موجود ہے۔ ابھی حال ہی میں پروفیسر مارٹن وہیلر نے ان چیونٹوں کی ایک فوج دیکھی جو اپنے انڈوں اور نوزائیدہ بچوں کو اٹھائے مستعدی سے چلی جا رہی تھی۔ انہوں نے بھی اندازہ لگایا کہ وہ ایک منظم فوج کی طرح چل رہی ہے۔



جنوبی امریکہ کا ایک سپاہی چیونٹا جو سفاکی میں اپنی نظیر آپ ہے۔



امریکہ کے یہ سپاہی چیونٹے دیکھنے میں بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ یہ فوجیوں کی طرح قطار باندھ کر قاعدے کے مطابق اپنے دشمن پر حملہ کرتے ہیں۔

——:o:——

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			چندہ سالانہ	فی کاپی
الثقیر	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیپور	(فارسی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آہنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماہی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
العرب	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ہندی)	(ماہوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ھی ڈے	(انگریزی)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماہوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اون ورلڈ	(انگریزی)	(ماہوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی - چینی)	(سہ ماہی)	تین روپیہ	چار آنہ
پراسپیکٹس	(انگریزی)	(سہ ماہی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی - فارسی) (اردو - ہندی) (پشتو - روسی) (برمی - رومن اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)	–	ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا فرنٹ بلیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

الڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں – ایک سو اسی صفحات – دو نقشے – کپڑے کی جلد – (بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں) –

" میزان نیوز لیٹر " (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (خصوصی رعایت) عربی - انگریزی جلسے ، نوے صفحات – گتے کی جلد – دو روپیہ کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ –

انگریزی جلسے ، کپڑے کی جلد – قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دو [illegible] معاف) –

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ – پوسٹ بکس نمبر ۱۹۶ – دہلی

برطانیہ میں ہندوستانی طلبا

علمی تحقیقات کے سلسلے میں لندن گئے ... ہندوستانی طلبا کی زندگی کا نقشہ ... شوریاں ... تنگ کر رہی ہیں ...



اردو کا دروازہ

چندہ سالانہ ۔ نور و پیہ ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۱ | فہرست | یکم نومبر [illegible] | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم ایم - اے
نائب مدیر
فضل حق قریشی ایم - اے دہلوی

ادارۂ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۲۹ دہلی

[illegible] ہندوستان اور [illegible]

[illegible] کو دیا، اور اپنی ہی اناج پیداوار [illegible] تو میرا کام ہو جائے۔ [illegible] پاس بہت سے بھوکے [illegible] لوگوں کے [illegible] ہیں۔ اگر وہ اصلی [illegible] تلنے والے [illegible] ، تو میں بھوکوں [illegible] دینے والی سبزیاں اور [illegible] وغیرہ بس ہوں گے۔"

سمندر پار ملکوں سے

[illegible] اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد سمندر پار ملکوں کے پاس جو کچھ اناج بچ رہتا ہے، انہیں سے وہ ہندوستان کی مدد برابر کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس امداد و تعاون کی نوعیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اقسام اناج	۲۲ ستمبر کو ختم ہونے والے ہفتے میں	یکم جنوری ۴۶ء سے ۲۲ ستمبر تک کل مقدار
گیہوں	۴۲,۰۰۰ ٹن	۸,۹۰,۰۰۰ ٹن
چاول	۲۳,۵۰۰ ٹن	۱,۹۷,۰۰۰ ٹن
مکئی	۱۹,۵۰۰ ٹن	۱,۴۲,۸۰۰ ٹن
جوار باجرہ وغیرہ	۵,۶۰۰ ٹن	۳۲,۰۰۰ ٹن

پیرس کانفرنس کے مصارف

یورپ بھر میں امن و عافیت قائم کرنے کے سلسلے میں جو کانفرنس پیرس میں ہو رہی تھی، وہ بارہ ہفتے قائم رہنے کے بعد بخیر و خوبی ۱۵ اکتوبر کی شام کو ختم ہو گئی۔ اس میں ان چار بڑے اتحادی ملکوں کے نمائندے شامل ہوئے تھے۔ امریکہ، برطانیہ، روس اور فرانس۔ اس کانفرنس کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت فرانس کو اس سلسلے میں زبردست مصارف برداشت کرنے پڑے۔ کل رقم کا اندازہ ۲,۸۲,۸۵۰ پونڈ کے قریب ہے۔ گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اشیائے خوراک، قوت برقی اور پٹرول وغیرہ پر ۱,۴۴,۲۵۰ پونڈ صرف ہوئے۔ اس کانفرنس کے دفتری نظام کے سلسلے میں جو عملہ رکھا گیا تھا، اس میں ۲۰۰۱ اشخاص ملازم تھے۔ ان کی تنخواہیں ۹۹,۰۰۰ پونڈ کے قریب ہوئیں۔ ۲۰۶ سرکاری موٹروں کے لئے ۱,۴۴,۴۶۴ گیلن پٹرول خریدا گیا۔ کاغذ کے ایک کروڑ بڑے تاؤ، جن کا

[illegible] ہوں، میں کہتی [illegible] کہ اناج کی قیمتوں میں کوئی اضافہ ہونے نہیں دوں گا اور ان لوگوں کو جو زیادہ داموں پر بیچنے کے خیال سے اناج جمع کر رکھتے ہیں، زبردست مایوسی ہوگی۔" نیز مسئلہ خوراک حل کرنے کے سلسلے میں ہر شخص سے اپیل کرتے ہوئے انھوں نے چار باتوں پر خاص طور سے زور دیا۔ (۱) اناجوں کی پیداوار میں اضافہ ہو، (۲) سرکاری تحصیلات کو کامیاب بنایا جائے (۳) چور بازار کو لازمی طور پر ختم کر دیا جائے۔ اور (۴) ... جتنا کچھ بھی اناج دستیاب ہو، مساوی طور پر تقسیم کر دیا جائے۔ انھوں نے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ سرکاری تحصیلات کے سلسلے میں صوبہ بہار نے کوئی اچھی مثال پیش نہیں کی یعنی حکومت کو صرف ۳½ لاکھ من چاول اور دھان مل سکے۔

گاندھی جی کے مشورے

ہندوستان کے مسئلۂ خوراک پر اظہار رائے کرتے ہوئے گاندھی جی نے "ہریجن" اخبار میں لکھا ہے: "ہندوستانیوں کو سمجھنا چاہیے کہ ابھی تک باہر سے تو نام کی ہی خوراک ہندوستان میں آئی ہے۔ کئی دوسرے ملک مدد کرنا چاہتے ہیں، پر بہت کر کے وہ خود مصیبت میں ہیں، یا ان کے پاس اتنی مانگیں ہیں کہ وہ انہیں پورا نہیں کر سکتے ..... اس لئے ہوشیاری (اچھی عقلمندی) یہی ہے کہ ہم کرکس لیں اور ایک آواز سے اپنا ارادہ ظاہر کریں کہ ہم اپنی خوراک خود پیدا کریں گے اور ضرورت پڑی تو اس کوشش میں بہادری سے مر مٹیں گے۔ یہی ایک راستہ ہے، دوسرا نہیں۔" اسی سلسلے میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "اس وقت تو ہندوستان کے سب ذمہ دار آدمی اگر اپنے اپنے صوبوں کو، ضلعوں کو اور ریاستوں کو صاف صاف کہہ دیں کہ خوراک کے لئے وہ دوسرے ملکوں کی طرف نہ دیکھیں۔ جتنا

مجموعی وزن تقریباً ایک ہزار چار سو من تھا۔ اس سلسلے میں کام آیا۔ کاغذ کی زیادہ مقدار روزانہ کی کارروائیوں کی نقلیں چھاپنے میں خرچ ہوئی۔ کارروائیوں میں تمام تقریروں کی اصل تقریریں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ "ذاتی اخراجات" کے ضمن میں ان ملازموں، خدمتگاروں اور باورچیوں کی تنخواہیں درج ہیں جو قصر کریبرگ کے شراب خانوں اور قہوہ خانوں میں کام کرتے تھے۔ ۲۴۳ موٹر ڈرائیور، ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کے ۵۰۰ اہلکار، ۹۰ اسیکیورٹی ایجنٹ اور بے شمار مترجم و ناشران کے علاوہ ہیں۔

صدر جمہوریہ چین

کومنتانگ کی مرکزی مجلس انتظامیہ کے ۱۰ اکتوبر والے اجلاس میں صدر جمہوریہ چین کا انتخاب عمل میں آیا۔ جنرلیسمو چیانگ کائی شیک کی شخصیت انکی سیاسی سرگرمیوں اور پُرخلوص ہمدردیوں کے باعث اتنی اہم اور ہر دلعزیز ہوگئی ہے کہ ان کے سوا کسی اور کو منتخب نہ کیا جاسکا۔ ان کا عہدہ تین سال کے لئے تھا جسکی میعاد ۱۰ اکتوبر کو ختم ہوگئی۔ آئندہ کے لئے کوئی خاص مدت مقرر نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ فیصلہ ہوا ہے کہ یہ سلسلہ اسوقت تک قائم رکھا جائے جب تک کہ مجلس ملی نئے دستور کے مطابق نئے صدر کا انتخاب نہ کرے۔ مجلس ملی حال ہی میں ایک نیا دستور اپنے ملک کے لئے وضع کرنے والی ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ اس کے ماتحت عمل میں آنے والے انتخابات میں بھی چیانگ کائی شیک کا مدمقابل کوئی نہ ہو اور ایکبار پھر انہی کو جمہوریہ چین کا صدر مقرر کیا جائے۔

چینی تہواروں کی تجدید

چین کے بہت بڑے مشرقی حصہ پر جاپانی تسلط ہو جانے کے باعث وہاں کی سماجی زندگی کا شیرازہ بالکل بکھر گیا تھا۔ خصوصاً تہواروں کی چہل پہل بالکل مفقود ہوگئی تھیں۔ تاہم جاپان کی سپر اندازی کے بعد اب پہلی بار نئے جوش و خروش کے ساتھ انکی تجدید کی جا رہی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ساتویں مہینہ کی ساتویں تاریخ کو منعقد ہونے والا تہوار منایا جائیگا۔ اس تہوار کو آسمان پر رہنے والی جلاہے کی لڑکی، ویگا سے قریبی تعلق ہے۔ یہ دریائے فلک یعنی کہکشاں کے ایک طرف بیٹھی چرخہ کاتتی رہتی ہے اور صرف ساتویں مہینے کی ساتویں تاریخ کو اپنے محبوب سے ملنے کے لئے دریا کے پل کو عبور کرتی ہے جسے بہت سے راج ہنس ملکر اپنے بازوؤں سے تیار کرتے ہیں۔ عام عقیدہ ہے کہ یہ دیوی نسوانی ہنروں کی سرپرستی کرتی ہے۔ چنانچہ نوجوان لڑکیاں اس کی پوجا کرتی اور اسپر بھینٹ چڑھاتی ہیں۔ دوسرا تہوار سات دن بعد منایا جاتا ہے۔ اسے مسلمانوں کے تہوار "شب برات" سے ایک حد تک مشابہ کیا جاسکتا ہے۔ چینیوں کا عقیدہ ہے کہ اس تاریخ کو رات کے وقت مرے ہوئے بزرگوں کی روحیں "دوزخ" سے نکل کر اپنے عزیزوں سے ملنے کے لئے دنیا میں آتی ہیں۔ چنانچہ ان روحوں کے لئے بہت سی مٹھائیاں وغیرہ تیار کی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں شب برات کے موقع پر آتشبازی چھوڑی جاتی ہے۔ چین کے لوگ اس رات وہاں شمعیں جلاتے اور سڑکوں پر پیسے برساتے ہیں۔ ان دونوں باتوں کو اچھا شگون سمجھا جاتا ہے۔ ان تہواروں کی تجدید سے ثابت ہوتا ہے کہ چینی اپنی پرامن روایتی زندگی دوبارہ حاصل کر رہے ہیں۔

برطانیہ میں ہندوستانی طلبا

"لندن مجلس" کے صدر مسٹر ذکریا نے جو بمبئی یونیورسٹی کی طرف سے علمی تحقیقات کے سلسلے میں لندن گئے ہوئے ہیں، برطانیہ میں رہنے والے ہندوستانی طلبا کی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرمایا کہ آجکل قیام و طعام کی دشواریاں انہیں بُری طرح تنگ کر رہی ہیں۔ لندن میں انکی کل تعداد تقریباً پانچسو ہے۔ چار یا پانچ ہوسٹل صرف ان کے لئے مخصوص ہیں لیکن وہاں ڈیڑھ سو سے زیادہ طلباء کے رہنے سہنے کا انتظام نہیں ہوسکتا۔ پھر ان ہوٹلوں کی حالت بھی اسدرجہ خراب ہے کہ ان میں قیام کرنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ باقی طلبا ادھر ادھر کوششیں کرتے ہیں اور کوئی معقول قابل اطمینان جگہ نہیں ملتی۔ مسئلہ خوراک بھی بہت تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے، کیونکہ کم مقدار میں مختلف قسم کی غذائیں ہندوستانی مزاج کے لئے موافق نہیں آتیں۔ علاوہ ازیں اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ ہندوستان میں ایک طالب علم سو روپے خرچ کر کے خوب عیش کر سکتا ہے اور لندن میں چار سو میں بھی پوری نہیں پڑتی۔ چونکہ لندن میں کوئی اقامتی یونیورسٹی موجود نہیں ہے۔ اس لئے طلبا کو سماجی دلچسپیوں میں حصہ لینے کا کم موقعہ ملتا ہے۔ وہ نہ تو شہر کے ہندوستانی طلبا کے ساتھ ربط ضبط بڑھا سکتے ہیں۔ کیونکہ برطانیہ کے لوگ عموماً ان سے کوئی تعلق پیدا کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس لئے ہر ہندوستانی طالب علم اپنی آمد سے روانگی تک ایک ایسے ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے جہاں اسکی شخصیت کو پوری طرح نشوونما پانے کا موقع نہیں ملتا۔ مسٹر ذکریا نے یہ بھی بیان کیا کہ ہندوستانی طلبا کے برعکس دوسرے ملکوں کے طالب علم خصوصاً چینی، امریکی اور مصری بڑے اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ ان کے لئے ایسی کلبیں بنی ہوئی ہیں جن کے مصارف ان کی حکومتوں کے سر ہیں۔ ان کلبوں میں دوسری قوموں کے لوگ آتے جاتے ہیں اور اسطرح دلچسپیاں حاصل ہونے کے علاوہ انکی معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مسٹر ذکریا نے آخر میں کہا کہ عبوری حکومت کے لئے اس سلسلے میں فوراً قدم اٹھانا ضروری ہے۔

سندھ کیلئے برقی آبی

حکومت سندھ نے سکھر کے قریب نہر روہڑی کے دہانہ میں برقی آبی کا ایک بہت بڑا اسٹیشن قائم کرنے کے لئے ایک نئی اسکیم مرتب کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک کروڑ چھتیس لاکھ روپے منظور کئے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے نہر مذکور کو

سے درست کیا جائیگا تاکہ پانی زیادہ سے زیادہ مقدار اور تیزی کے ساتھ موقعہ پر پہنچ سکا کرے۔ اس کام کے لئے ایک کروڑ چھیالیس لاکھ روپے کی رقم علیحدہ منظور کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے مطابق دس ہزار کلو واٹ کا بجلی گھر تیار ہوگا جہاں سے سکھر، جیکب آباد اور لاڑکانہ نامی ضلعوں کے پچیس بڑے بڑے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں بجلی کا انتظام کیا جائیگا۔ ان کے علاوہ آس پاس کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں حسب ضرورت بجلی پہنچائی جائے گی۔ بجلی گھر کے قریب ہی تیل سے چلنے والا ایک انجن بھی لگایا جائے گا تاکہ اگر نہر میں پانی کی کمی ہوجائے یا کوئی اور خرابی پیدا ہو جائے تو وقت ضرورت اس سے کام چلا لیا جائے۔ نہر کی نئی تشکیل کا کام فوراً شروع ہو جائیگا۔ لیکن بجلی گھر کا انتظام اس کے بعد یعنی تقریباً ۱۹۴۳ء میں شروع ہوگا۔

نئے سکوں کی چند خصوصیات

اس سال ۲ مئی کو حکومت ہند نے ریزرو بنک کے مشلین کو اختیار دیا تھا کہ وہ خالص نکل کی چونیاں اور اٹھنیاں ڈھالیں۔ چنانچہ یہ نئے سکے [redacted] عرصے سے ملک کے طول و عرض میں چلنے شروع ہوگئے ہیں۔ ان سکوں کے [redacted] ہندوستان کی تاریخ سکہ سازی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا [redacted] یہ سکے بڑے بڑے شہروں میں چل رہے ہیں لیکن بہت جلد چھوٹے [redacted] تک پہنچ جائیں گے۔ دنیا میں سب سے پہلے ۱۸۸۱ء میں خالص نکل [redacted] میں جاری ہوئے تھے۔ پھر فرانس، بلجیم، اٹلی، کینیڈا اور آسٹریا [redacted] ہوگیا۔ چنانچہ آج ہندوستان سمیت دنیا کے انیس ملکوں [redacted] نکل کے سکوں کی چند خصوصیات قابل ذکر ہیں۔ وہ [redacted] سکتے کیونکہ نکل ایک ایسی دھات ہے جسے گلانے [redacted] سنٹی گریڈ درجۂ حرارت کی ضرورت ہے۔ نکل میں [redacted] کی صلاحیت بھی موجود ہے اسی لئے اس کے [redacted] آسانی سے پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر انہیں کسی دوسری [redacted] تو یہ خصوصیت زائل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ نئی قسم کی اکنی اور [redacted] میں نکل کے ساتھ کچھ تانبا بھی ملا ہوا ہے، اس طرح [redacted] کی چمک دمک عرصۂ دراز تک قائم رہ سکتی [redacted] زیادہ سخت ہونے کے باعث نکل کے [redacted] سکتے۔ ان خصوصیات کے ہوتے ہوئے [redacted] ان سکوں کی تو از بھی نہیں ہوتی، اس [redacted] کی بجائے [redacted] مقناطیس کے ذریعہ جانچا جا سکتا ہے۔ ان سکوں کے کناروں [redacted] نہیں ہیں کیونکہ جعلسازی کا امکان نہ ہونے کے باعث [redacted] نہیں کی گئی ہے۔ ان پر ایک طرف بادشاہ کی اور دوسری [redacted]

نقش ہیں۔ شیر یا کسی دوسرے جانور کی تصویر آج تک کسی ہندوستانی سکے پر نہیں بنائی گئی تھی۔ یہ بھی ہمارے ملک کی تاریخ سکہ سازی میں پہلی اور اہم مثال ہے۔

ساحلی علاقوں کی غرقابی

سمندری موجوں کے تیز تھپیڑوں اور کھاری پانی کے اثرات سے ہر جگہ کے ساحلی علاقے کٹ کٹ کر سمندر کی تہ میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ کہیں اس غرقابی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی ہے اور کہیں کم۔ کہا جاتا ہے کہ جبل الطارق کا ساحلی علاقہ بڑی تیزی کے ساتھ کٹتا ہے کیونکہ زمین کسیقدر نرم ہے اور موجیں اس کے برعکس بہت شدید طوفان برپا کئے رکھتی ہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ سرزمین برطانیہ کا کچھ نہ کچھ ساحلی علاقہ بھی اسی سرعت اور تیزی کے ساتھ ہر سال زیر آب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تمام ملک کے متعلق حکام نے پرزور الفاظ میں حکومت سے درخواست کی ہے کہ قومی مفاد کی [redacted] سمندر سے بچاؤ کی مناسب تدابیر فوراً عمل میں لائی جائیں [redacted] نے ذاتی طور پر ایک ایک علاقے کا معائنہ کیا جہاں [redacted] سڑکوں اور مکانوں کو سخت نقصان پہنچایا تھا [redacted] گئی ہے تاکہ دیوار چین جیسی ایک طویل دیوار [redacted] طرح تعمیر کر دی جائے کہ وہ پشتے کا [redacted] محفوظ ہے۔ طوفان خیز موجوں کا سب [redacted] کے اطراف میں ہوتا رہا ہے جہاں گزشتہ [redacted] کے تقریباً پندرہ قصبات سمندر کی [redacted] ہے۔

[redacted]انحۂ ارتحال

[redacted] جناب عرش تیموری نے یہ افسوسناک خبر بھیجی ہے کہ ۲۰ ستمبر کی شام [redacted] کے والد بزرگوار میرزا نظام شاہ، لبیب گورگانوی کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ [redacted] مرحوم دلّی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی اولاد میں سے تھے۔ ایک ممتاز شاعر ہونے کے علاوہ [redacted] کی چند باقیماندہ معزز ہستیوں میں انکا شمار ہوتا تھا۔ [redacted] تقریباً ستر سال تھی۔ وہ سلطان جیسے [redacted] کے بعد اس دار فانی سے کوچ [redacted] نے ان کی آخری آرام گاہ بنائی گئی ہے۔ [redacted] اردو شاعری کو ایک صدمۂ عظیم پہنچا ہے۔ دعا ہے [redacted] کو غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

کرسکتا اور اپنے خلوص پر تمام دقت رنج کو قربان کر دیتے وہ لاعلمی میں ان جیسا کوئی اور تھا کسی کو بہ طرف وزارت و خطابات کا درمیان سستا تو دیکھتا کہ اس دائرے میں بھی عالم ذاکر صاحب ہی ہیں۔ کلرک یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ کلرکی کرتے ہیں۔ چپراسی یہ پاتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ دوڑ دھوپ اٹھاتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ بچہ یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب جیسا بچہ کوئی نہیں ہے۔ جوان یہ محسوس کرتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ جوان تھا اور بوڑھا یہ جانتا کہ جب بچہ یا ذاکر صاحب کے قریب جانے سے ڈرتا تھا تو پھر وہ بڑھاپے کو کیوں خاطر میں لائے!

ان کے علاوہ ہر شخص کا عقیدہ تھا کہ ذاکر صاحب دوسروں کے فائدہ کے لئے جان کھپاتے ہیں، اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد اور اس کی عزت و ذلت کو اپنی عزت و ذلت سمجھتے ہیں تو پھر کون ایسا ہو سکتا تھا جو ذاکر صاحب کو چھوڑ کر اپنے ضمیر کی سرزنش گوارا کرتا۔

ذاکر صاحب سے میرے تعلقات بڑے گہرے اور بڑے پرانے ہیں لیکن دنیاوی زندگی میں میرا ان کا کبھی ساتھ نہ ہوا۔ وہ قلندر ہیں دنیا دار۔ انھوں نے زندگی کے جو مصائب اٹھائے ہیں ان کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ زندگی کے جن آستانوں پر میں نے سر جھکایا، ان آستانوں نے ذاکر صاحب کے سامنے سیم سہمے گئے اور شکر ادا کرتے گئے۔ ذاکر صاحب مجھ سے تھوڑی سی بھی قربانی کرنے کو کہیں تو شاید میں نذر سکوں۔ شکر ہے یہی سبب ہو کہ انھوں نے مجھ سے اس قسم کی فرمائش کبھی نہ کی۔ پس میں نے ان سے بڑی سے بڑی فرمائش کی اور انھوں نے ذرہ برابر ہچکچائے بغیر اسے پورا کر دیا۔ ایک واقعہ سنئے ۔۔۔ سال ہوئے ہوں گے۔ ایک دن صبح کو میں اور ذاکر صاحب ناشتہ کر کے کمرہ سے نکلے کہ میرے دل میں اچانک خیال آیا، میں نے کہا ذاکر صاحب آپ فلاں صاحب سے صلح کیوں نہیں کر لیتے؟ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ ذاکر صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا۔ سبحان اللہ کیا مصرعہ موزوں فرمایا ہے۔ آخر آپ کو سوجھی کیا؟ میں نے کہا اس کو کیا کیجئے، مجھے تو ایسی ہی سوجھی ہے۔ کہنے لگے تو یہ کونسی بڑی بات ہے آپ کہتے ہیں تو ہو جائیگا۔ میں نے کہا ابھی چلئے۔ مرشد تیار ہو گئے اور ہم دونوں وہاں پہنچے تو معلوم ہوا وہ صاحب موجود نہیں ہیں بات آئی گئی ہوئی اور خیال یک خیال رہ گئی۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا جن صاحب سے میں صلح کرانے گیا تھا وہ ذاکر صاحب کے جب بھی سب سے بڑے دشمن تھے اور اب بھی ہیں!

جب کبھی اس واقعہ کی یاد آتی ہے تو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے لیکن ذاکر صاحب کی شرافت، وسعت قلب اور دوست نوازی پر نظر کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ذاکر صاحب کی بلند نظری، دردمندی اور وسعت قلب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے مخالف بھی جب کبھی ان کی مدد کے خواستگار ہوئے تو انھوں نے نہ صرف بغیر پس و پیش کے بلکہ بڑے لطف اور خلوص سے انکی مدد کی۔ بنیادی تعلیمی کمیٹی رپورٹ کے سلسلے میں ان کو جس سفاہت اور سخاکی سے رسوا کیا گیا وہ کوئی راز نہیں ہے اور کوئی قابل فخر کارنامہ بھی نہیں۔ اس رپورٹ کے بعد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی کی طرح ڈالی۔ جس کا کام اب تک ختم نہیں ہوا ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ جس زمانہ میں اس کمیٹی پر ایک نازک دور گزر رہا تھا۔ نواب کمال یار جنگ مرحوم جب کبھی دہلی آتے تو ذاکر صاحب سے ملتے اور کمیٹی کے کام کو حسن خاتمہ پر پہنچانے کی سبیل ذاکر صاحب سے دریافت کرتے اور اعانت کے طلبگار ہوتے تھے۔ یہ رپورٹ جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف منازل سے گزر کر صوبہ متحدہ کی حکومت میں پہنچی تو کانفرنس کی حمایت میں اور کانفرنس کے ہی نقطۂ نظر کو ذاکر صاحب نے وہاں کے ماہرین فن کے سامنے واضح کیا اور منوایا! میں نے کہا مرشد یہ کیا بات ہوئی تو فرمایا، بھئی کیا اغیار میں اپنوں کی رسوائی دیکھی نہیں جاتی۔

واردھا رپورٹ سب سے پہلے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پٹنہ کے اجلاس میں پیش ہوئی۔ ذاکر صاحب آنکھوں کی سخت اذیت میں مبتلا ہو کر بمبئی گئے ہوئے تھے، جہاں ان کی آنکھوں پر آپریشن کیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں کی سخت ممانعت کے باوجود انھوں نے ایک صاحب کو خفیہ طور پر بلا کر اسی حالت میں کہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور طبیعت نڈھال تھی، ایک خط نواب صدر یار جنگ بہادر، سیکرٹری کانفرنس کو لکھوایا جس میں انھوں نے کمیٹی کی بنیادی سفارشات کی اہمیت بڑی قابلیت اور بڑے ہی دردسے جتائی تھی۔ یہ خط ذاکر صاحب کے خلوص، قابلیت، دلسوزی اور زور انشا پردازی کا بڑا نادر نمونہ ہے یہ خط عام نظروں کے سامنے آیا یا نہیں مجھے نہیں معلوم، لیکن میں نے اسے دیکھا ہے غور سے اور پڑھا ہے اسکا آخری شعر یہ ہے ؎

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری ✦ مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

موقع کی اہمیت اور خود لکھنے والے کی حالت کا اندازہ کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے بھی کچھ ایسے ہی عالم میں پہنچ کر یہ شعر کہا ہوگا شاعری اور انشا پردازی میں بھی ایک مرحلہ آتا ہے۔ جب شاعر

ریحاں ودد از مینا، رامش چکواز قلقل!
[illegible] کے بس کی نہیں ہے یہ تو اسی وقت آتی ہے جب نظر
[illegible] فکر میں گہرائی، دل میں سچائی اور اخلاق میں پاکی ہو!

[illegible] تعلیمی اسکیم کی رپورٹ ذاکر صاحب نے علی گڑھ میں میرے ہی کمرے پر
[illegible] ایک ہفتہ کے اندر مرتب کر ڈالی، کمرہ بھی ایسا جو بیک
[illegible] کھانے، لکھنے پڑھنے اور ذرہ بہلانے کا کام دیتا تھا ہر طرح کے
[illegible] ہیں۔ کچھ دیر تک تعلیمی مسائل پر بحث رہی، اسی سلسلے میں کچھ
[illegible] تو ان سے خوش گپی ہونے لگی، کتابوں، رپورٹوں، فائل وغیرہ کا
[illegible] ات پھیلے ہوئے ہیں ٹرننگ کالج کے لوگ آگئے تو ان سے
[illegible] بحث چھڑ گئی۔ کوئی خوانچہ والا آگیا تو جو کچھ اس کے پاس رہا ہی
[illegible] کر دیا گیا۔ ڈاکٹر آگئے تو امراض و علاج کے لطائف چھڑ گئے، شعرو
[illegible] آگیا تو شعرخوانی کی مجلس گرم ہوگئی۔ کوئی اچھا طالب علم آنکلا تو
[illegible] باتیں ہونے لگیں، غرض جو آیا اسی کے مذاق کے مطابق گپ
[illegible] علم کے مباحثہ میں ذاکر صاحب اس خلوص و خوبی سے حصہ
[illegible] اسی شغل میں زندگی بسر ہوئی ہے۔ جو آتا بہت کچھ سیکھ جاتا
[illegible] جیسے اس نے اس دن کوئی بڑا کام کیا تھا۔ ذرا مہلت ملتی تو پھر
[illegible] شروع ہو جاتی۔ وہ ہر شخص کے سامنے اپنے خیالات اور
[illegible] کا مشورہ طلب کرتے۔ اپنی سمجھاتے اس کی سنتے اور پھر
[illegible] کم کرتے۔

[illegible] کمرے نے تنگ آکر کہا مرشد یہ کہاں کا کھڑاگ پھیلایا، جب
[illegible] بچوں کے مشاغل، مٹی ڈنڈے اور سوت کپاس کی [illegible]
[illegible] ہے۔ تمام دن خدائی خواروں ہاتھ بجواتے ہوئے [illegible]
[illegible] سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہے۔ آج اتفاق [illegible]
[illegible] اس ہوا تو وہ ورنہ لقیہ اصل [illegible]
[illegible] کر مجھے چند [illegible]
[illegible] مکمل ہو جائے گی۔

[illegible] دن میں نے اپنے پرانے مکان [illegible] ذاکر صاحب
[illegible] منتقل اس سے نہیں کہ کوئی ملاقاتی پہنچ نہ پائے بلکہ اس کا خطرہ
تھا کہ خود مرشد نکل جائیں۔ ہوا وہی جس کا خطرہ تھا۔ صبح بالاخانہ پر منتقل
ہوئے ہوں گے کہ دوسرے ہی دن ایک صاحب ملنے آئے۔ نوکر نے
کہا ذاکر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے لعن و جرح شروع کی۔

[illegible]

ہوئے اترے ہیں یہاں منتقل ہوں گے جی رشید صاحب کے پاس ہے لیکن کوئی
مضائقہ نہیں۔ آپ اسباب کا پتہ لگا لائے۔" انھوں نے کہا میاں رپورٹ
نقل کروایا ہوں۔ فرمایا سنائے، انھوں نے سنانا شروع کیا میں یونیورسٹی
سے آیا تو رومیو جولیٹ کا یہ ڈراما نظر آیا۔ میں نے کہا مرشد یہ کیا ہے، فرمایا
ذرا ٹھہرئے گا۔ بس ایک منٹ۔ افسانہ ختم ہوگیا۔ میں نے بالاخانہ پر پہنچ کر
قفل کھولا۔ تو مرشد سارا کام ختم کئے ہوئے چارپائی پر شال نچت کچھ گنگنا رہے
تھے۔ مجھے دیکھا تو لیٹے ہی لیٹے ایک زقند بھری اور سرو قد کھڑے ہوگئے۔
فرمایا ذرا پانی پلوایئے۔ سب کام ختم ہوگیا۔ میں نے کہا یہ آپ کیا گن رہے تھے۔
کہنے لگے فلاں رپورٹ کا حوالہ دینا تھا۔ ایک جگہ شبہ ہوتا تھا اس لئے
ان صاحب سے کہا تھا کہ اصل رپورٹ دیکھ آئیں۔ انھوں نے جو سنایا تو
اطمینان ہوگیا کہ جو یاد تھا وہ ٹھیک تھا۔ میں نے کہا اب تو جب تک آپکا
قیام ہے کوئی زق زق نہ ہوگی، فرمایا ہرگز نہیں۔ میں نے کہا الله کا شکر ہے۔
آج ڈاکٹر اصغر کے ہاں چائے پی جائے تو کیسی رہے گی؟ [illegible]
ان سے بلی کا بچہ بھی لینا ہے۔ میں نے کہا بلی نے تو [illegible]
کتنے وابستہ دیا ہے۔ کہنے لگے اسی کا بچہ [illegible]
کے لئے کچھ نہ کچھ لے جانا ضروری ہے [illegible]
ہیں۔ بیوی کہتی ہے کیا کھو یا [illegible]

ذاکر صا[illegible] خاص چیز تی ہے جو
کہیں [illegible] خیال کا کرد فتنی کی رفتار
[illegible] ت یہ ہے کہ اس کی رفتار بہت مستقیم
[illegible] ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی تحریر و تقریر
[illegible] ی ہے۔ وہ مروجہ طریقوں سے کام نہیں لیتے بلکہ شروع
[illegible] سامع یا قاری کی توجہ کو اپنے الفاظ اور خیالات کی تازگی و
[illegible] تانی سے تب و تاب دیتے رہتے ہیں اور اس کے تصورات کو وسعت
دیتے ہیں وہ دم بنے دیتے ہیں۔ الفاظ و عبارت میں صفائی، خیالات میں ندرت
اور جذبات میں سچائی ہوتی ہے۔ کم لوگوں کی تحریر و تقریر حشو و زوائد سے
کے الفاظ و عبارت سے اتنی پاک ہوتی ہے جتنی ذاکر صاحب کی۔ ان کی
تقریر میں نہ خطابت ہوتی ہے نہ موعظت لیکن خطابت کا زور اور گرمی
اور موعظت کی رقت و شائستگی بدرجۂ اتم ملتی ہے۔ ذاکر صاحب تقریر
کرتے ہیں تو مجھے پہاڑ کی فضا یاد آ جاتی ہے۔ پہاڑ [illegible] اوج، وقار و
وقار۔ ان کی تقریر اس چشمہ کی مانند ہوتی ہے جو اپنی [illegible] سفر کی ہر
منزل [illegible] رشفاف، شادمان [illegible]

[illegible]

ذاکر صاحب نے ملک پر چھائی ہوئی تاریک کہر اور ساتھیوں کے تذبذب یا تھکن کی طرف اشارہ کیا ہے، جہاں ان کا لہجہ دھیما اور حزیں ہو گیا ہے۔ الفاظ میں ہم ہے لیکن پیغام میں وہی گرمی اور جگر تابی ہے جو ذاکر صاحب کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

ذاکر صاحب کی تقریر کا لطف اس وقت دو بالا ہو جاتا ہے جب حاضرین میں سے کوئی بڑا اور بر خود غلط آدمی بے سمجھے بوجھے محض اپنی اہمیت جتانے کے لئے اعتراض کر دے۔ طالبعلمی کے زمانہ میں یونین میں ذاکر صاحب کی جوابی تقریر سننے کے لئے ہم سب خاص طور پر جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک سال وائس پریسیڈنٹ کے عہدے کے لئے ذاکر صاحب بھی امیدوار تھے۔ سارے طلبا خواص و عوام کے نام سے دو گروہ میں منقسم ہو گئے تھے۔ ذاکر صاحب عوام کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے۔ ہر فریق کے امیدوار کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی قابلیت و اہلیت جتانے کے لئے یونین میں تقریر کرے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کو بھی بحث کے لئے عنوان دینا پڑا۔ مخالف جماعت نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ ذاکر صاحب کے تقریر فلاں پروفیسر نے تقریر لکھ دی ہے اور وہ اس کے رٹنے میں مصروف ہیں۔ مباحثہ کا وقت آیا۔ یونین میں تل رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ ذاکر صاحب کا نام لیا گیا اور ہال تالیوں اور سیٹیوں سے اس طور پر گونج اٹھا جیسے ہٹتے غدار در و دیوار لرز دیں گے! ذاکر صاحب داہنی طرف کے اسٹینڈ پر آئے اور بولے، میں نہایت ادب کے ساتھ لیکن ضابطے سے اپنے موضوع بحث کو اس مجلس کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس بارہ میں جو کچھ عرض کرنا ہے وہ میں اپنی جوابی تقریر میں عرض کرونگا۔ فی الحال اتنا ہی عرض کرنا ہے۔ یہ کہکر اپنی جگہ پر لوٹ آئے، لیکن فوراً ہی ایک اودھم مچ گیا۔ فریق مخالف نے خوب خوب پھبتیاں کسیں اور شور مچایا۔ یہ معلوم ہوا جیسے الکشن کے نتیجہ کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ذاکر صاحب کے حامیوں کا یہ حال کہ کوئی غصہ میں کوئی مایوس ہو کر کوئی اپنے آپ پر نفریں کرتا ہوا اور کوئی ذاکر صاحب کو آنکھوں آنکھوں میں تناول کرتا۔ مجمع سے جانے لگا۔ کچھ اس طور پر سہم کے بیٹھ گئے کہ یا تو مار ڈالیں گے یا مر کے اٹھیں گے۔ مخالفین کی بن آئی تھی۔ صدر صرف مخالفین نے تقریریں کیں اور جیسے دلیلیں جو آیا اس نے ذاکر صاحب اور ان کے حامیوں کو سنا ڈالا۔

جواب کا وقت آیا تو ذاکر صاحب پھر اسٹینڈ پر آئے ان کے موافقین بھی جو یونین کے باہر آس پاس چہ میگوئیوں میں مصروف اور کچھ بپھرے ہوئے دروازہ سے لگے کھڑے تھے۔ رفتہ رفتہ آ گئے۔ ذاکر صاحب پر عالم کچھ ایسا طاری تھا کہ کسی نے تالی تک نہ بجائی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ موضوع بحث پر اب بھی میں کوئی تقریر نہ کروں گا، صرف مخالف تقریروں کا جواب دونگا! اسکے بعد انھوں نے ہر مخالف کے دلائل کے جواب دینے شروع کئے اور جہاں جہاں

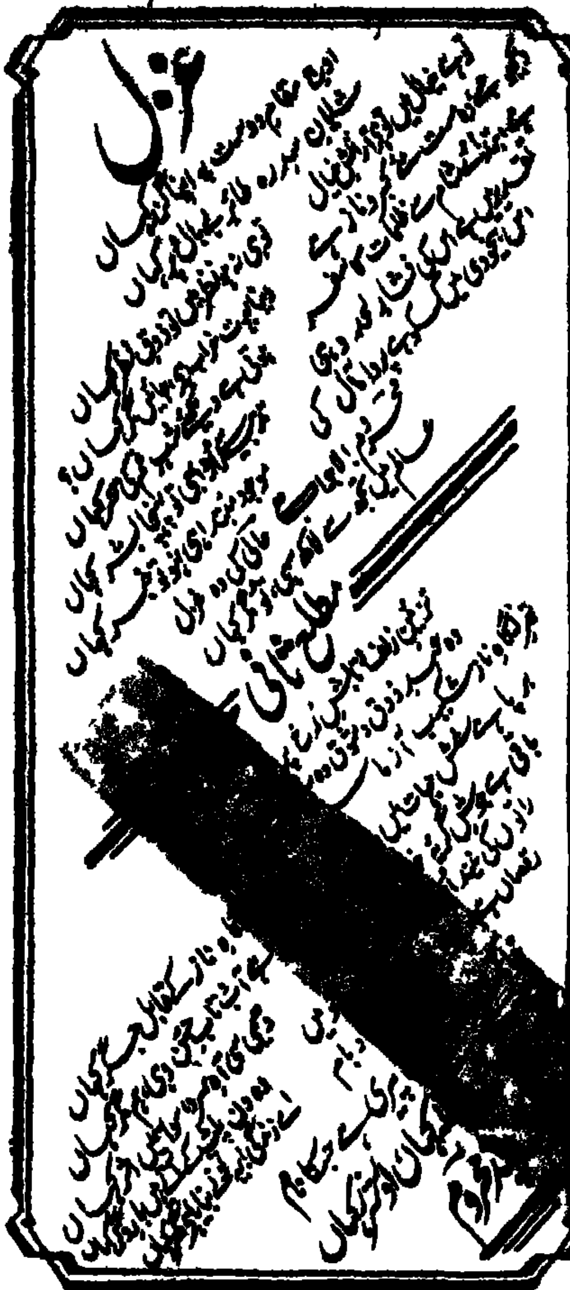
ان کے آداب محفل انداز و لہجہ پر فقرے بھی چست کرتے گئے۔ مجمع سے صدائے تحسین بلند ہونی شروع ہوئی۔ تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑا شاعر اپنی بہترین نظم سنا رہا ہے جسکے ایک ایک شعر پر مجمع تلے اوپر ہو رہا ہے۔ تقریر ختم ہوئی رائے لی گئی تو سارا ہال موافقت میں کھڑا ہو گیا۔ صدر نے نتیجہ کا اعلان کیا۔ اب ذاکر صاحب کے موافقین کی بن آئی تھی۔ انہوں نے مخالفین کا پیچھا گھر تک نہ چھوڑا۔ پانی پت کی آخری لڑائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ جنوبی ہند میں کوئی مرہٹہ خاندان ایسا نہ تھا جس کے ہاں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ یہی حال ذاکر صاحب کی تقریر اور ان کے چبھتے ہوئے برجستہ فقروں نے مخالفین کا کیا۔

مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ایک جلسہ میں سر سلیمان مرحوم صدر تھے۔ اراکین میں سے ایک صاحب اپنے آپ کو بڑا طباع اور یگانۂ روزگار سمجھتے تھے اور ہر لحظہ اپنی نشست سے بیٹھے بیٹھے لوگوں پر فقرے چست کیا کرتے تھے اور کوشش یہ کرتے تھے کہ ان کی موجودگی میں کسی کی پیش نہ جائے۔ ذاکر صاحب نے ایک مسئلہ پر تقریر کی جس کو ہر شخص نے غور و احترام کے ساتھ سنا۔ بڑے سے بڑے مخالف مجمعوں میں بھی ذاکر صاحب کی تقریر بہت خاموشی اور احترام سے سنی گئی یہ امتیاز میں نے کم لوگوں میں پایا۔ تقریر کے ختم ہوتے ہی، وہ صاحب تلملا اٹھے اور فوراً اپنی نشست پر سے ایک پوائنٹ آف آرڈر پیش کیا جس میں تفاخر اور خود نمائی کی شان پورے طور پر جلوہ گر تھی، بولے جناب والا نہایت ادب کو عرض کرتا ہوں کہ ذاکر صاحب نے ابھی جو تقریر کی ہے وہ بالکل میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کچھ اور ارشاد فرمانے والے ہی تھے کہ ذاکر صاحب نے اٹھکر فرمایا، جناب والا میں نے اپنی تقریر میں کہیں اسکا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ میری تقریر محترم ممبر کی سمجھ میں آئے گی۔ اس پر ایسا بے محابا قہقہہ پڑا کہ سر سلیمان مرحوم جیسے ثقہ کم گو ایسے موقع پر اپنی طرف سے کبھی بے تکلف نہیں ہوتے تھے بے اختیار ہنس پڑے اور معترض صاحب کچھ ایسے ست پٹائے کہ دوران جلسہ میں حرف سکوت رہے۔

کورٹ ہی کا ایک اور جلسہ بھی مجھے کبھی نہ بھولے گا جس میں جو مسئلہ زیر بحث تھا وہ اس درجہ اہم اور متنازعہ فیہ تھا کہ کورٹ کے با اقتدار اراکین ہر گوشہ سے شریک ہوئے تھے اور جو کچھ فیصلہ ہونے والا تھا اس میں کہیں شک و شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ فضا ایسی دگرگوں تھی کہ بڑے سے بڑے شخص کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ مخالفت میں تقریر کرنا تو درکنار مخالفت میں چپکے سے ہاتھ اٹھا سکنے کی بھی ہمت کر سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر طرف سرنگیں بچھی ہوئی ہیں جس نے قدم اٹھایا وہ جان سے گیا۔ معمولی ابتدائی کارروائی شروع ہو کر ختم ہوئی۔ تحریک پیش کرنے والوں میں

لیے اکابر تھے جو قانونی قابلیت، قومی خدمات، ذاتی جاہ و حشمت ہر اعتبار سے قوم اور ملک میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ پھر مرحلہ بھی ختم ہوا اور وہ لمحہ آیا جب اس کی مخالفت میں کوئی کھڑا ہو۔ چند لمحے ایسا سناٹا رہا کہ ہر شخص اپنے قلب کی حرکت سن سکتا تھا۔ معرکہ میں پہلا قدم اٹھانے والا اور پھر پیچھے مڑ کر دیکھنے والا ہی خر کہلاتا ہے۔ ذاکر صاحب سب سے پیچھے کی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے، اٹھے اور محض ایک جملہ کہکر بیٹھ گئے "یہ تحریک قانوناً پیش نہیں کی جاسکتی"! سارا مجمع مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ قانون میں جن صاحب کا پایہ ہائی کورٹ تک مسلم تھا اور جو اس تحریک کے قانونی پشتیبان تھے، کڑک کر بولے "قانونی سقم کوئی نہیں ہے میں چیلنج کرتا ہوں!" جلسہ میں جو لوگ بحث کرنے یا سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ ہاتھ اٹھانے یا اودھم مچانے کے لئے آتے ہیں یا بلائے جاتے ہیں ان کی بن آئی۔ ذاکر صاحب نے ایک نقطہ کہا، بڑی مشکلوں کے بعد جب مجمع کو کسیقدر خاموش کیا گیا اور فاضل معترض نے اپنا چیلنج دہرایا تو ڈاکر صاحب نے انکو ایک ایسے موقع کی یاد دلائی جب انھوں نے پہلے ہی ایک مسئلہ میں ذاکر صاحب کو چیلنج دیا تھا اور بعد میں اپنی غلطی تسلیم کی اور فرمایا ایسے موقع پر چیلنج نہیں دیتے سوچتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے اب ایک مختصر سی تقریر کی اور اپنے اعتراض کی بڑی سنجیدگی لیکن وثوق اور دبدبہ کے ساتھ وضاحت کی۔ جلسہ کے ممبروں نے غور کیا تو ذاکر صاحب کا اعتراض صحیح نکلا۔ معترض نے اپنی غلطی تسلیم کرلی۔ ہال کے اندر بڑی دیر تک دو دو چار چار اور خفیہ سرگوشیاں ہوتی رہیں بالآخر ذاکر صاحب ہی کی مشورت سے معاملہ کی نوعیت بدل گئی۔ اور کارروائی شروع ہوئی۔

ذاکر صاحب کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے کہ ان کی اردو کی تقریر و تحریر بہتر ہوتی ہے یا انگریزی کی۔ طالب علمی کے زمانہ میں کالج میگزین میں رب کے نام سے وہ کالج کی زندگی پر بڑے دلکش مضامین لکھا کرتے تھے جنکا لوگ بڑے شوق سے انتظار کیا کرتے تھے۔ انگریزی کے بارہ میں ایک مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر مسٹر ریز ہاتھم نے کہا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر [illegible] انگریزی تحریر و تقریر بالخصوص انکی حاضر جوابی کا مقابلہ برطا[illegible] بہترین اراکین سے کیا جاسکتا ہے۔ میں نے ان کی اردو [illegible] انگریزی ہی کی اچھی تقریریں سنی ہیں، لیکن ہر طرح کے تکلفات سے بچی تلی ہوئی نشستیں، بہکا بے تکلف۔ انگریزی تقریروں سے ذاکر صاحب [illegible] انکی تقریر کا ایک جملہ بھی زائد از ضرورت نہیں ہوتا اور شروع سے آخر تک استوار، شگفتہ اور ہر فقرہ میں کوئی نہ کوئی بات مزہ کی ہوتی ہے۔ آپ ان کے کسی فقرہ کے ابتدائی الفاظ سن کر یہ نہیں بتا سکیں گے کہ اس فقرہ کی یہ پرداخت ہوگی یا یوں ختم ہوگا ہمیشہ وہ اسکو اس طرح ختم کریں گے کہ آپ متحیر بھی ہوں گے اور خوش بھی۔ عام تقریر کرنے والوں کی مانند وہ جسم کے کسی حصہ کو خاص طور پر



جنبش یا جھٹکے نہ دیں گے لیکن بحیثیت مجموعی آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں بس یہاں ان کے سارے جسم و جان کی کارفرمائی ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ اپنی تقریر سے اپنے گرد ویسی ہی فضا پیدا کر لیتے ہیں یا وہ خود ایک فضا ہیں جس کو ویسی ہی تقریر پسند ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کہنے کو تو کہہ جاتے ہیں لیکن اکثر ذہن منتخب کر کے اس مو کو بیزار فرق قتل کرتے ہیں ع

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے!

رُوپ

فراق گورکھپوری

(۱) [illegible]

(۲) [illegible]

(۳) [illegible]

(۴) [illegible]

(۵) [illegible]

(۶) [illegible]

(۷) [illegible]

(۸) [illegible]

(۹) [illegible]

(۱۰) [illegible]

(۱۱) [illegible]

(۱۲) [illegible]

(۱۳) [illegible]

(۱۴) [illegible]

(۱۵) [illegible]

(۱۶) [illegible]

(۱۷) [illegible]	(۱۸) [illegible]	(۱۹) [illegible]	(۲۰) [illegible]
(۲۱) [illegible]	(۲۲) [illegible]	(۲۳) [illegible]	(۲۴) [illegible]
(۲۵) [illegible]	(۲۶) [illegible]	(۲۷) [illegible]	(۲۸) [illegible]
(۲۹) [illegible]	(۳۰) [illegible]	(۳۱) [illegible]	(۳۲) [illegible]

افسانہ

ایک خواب

مصنفہ
جبران خلیل جبران

مترجمہ
حبیب اشعر دہلوی

"وائی کاؤنٹس (س۔ل) کے نام، اس کرمت نامہ کے جواب میں جس سے انھوں نے مجھے سرفراز فرمایا"

جوانی میرے سامنے سے گذری اور میں اس کے پیچھے پیچھے ہولیا ——— دور ایک کھیت میں پہنچکر وہ کھڑی ہوگئی اور بادلوں اور درختوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی ——— ان بادلوں کو جو خط شفق پر اس طرح رواں تھے گویا سفید بھیڑوں کا ایک ریوڑ ہے اور ان درختوں کو، جو اپنی ننگی، بوجھی شاخوں سے طبیعی کی طرف اس طرح اشارہ کر رہے تھے گویا آسمان سے سب سرسبز پتوں کو واپس مانگ رہے ہیں۔

آخر میں نے پوچھا ـ "جوانی! اسوقت ہم کہاں ہیں؟"

اس نے جواب دیا "ہوشیار! کہ ہم حیرت کے سبزہ زاروں میں ہیں۔"

میں نے کہا ـ "چلو! واپس چلیں!! یہاں کی تنہائی مجھے ڈرا رہی ہے اور ان بادلوں اور درختوں کا نظارہ میرے دل کو تکلیف پہنچا رہا ہے۔"

جواب ملا: "صبر کرو! کہ حیرت، معرفت کا سرچشمہ ہے!!"

میں نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ ایک حور، سائے کی طرح، ہماری طرف آرہی ہے۔ میں متحیر ہو کر چلایا: "یہ کون ہے؟"

جوانی نے جواب دیا: "ملپومین! جو جیوپٹر کی بیٹی اور غمگین کہانیوں کی دیوی[1] ہے!!"

میں نے کہا: "غم و الم کو مجھ سے کیا واسطہ؟ جبکہ اے نشاط فزا جوانی! تو میرے پہلو میں ہے!"

جوانی نے جواباً کہا: "وہ تمہیں دنیا اور اس کے آلام و مصائب دکھانے آئی ہے اور جو شخص مصیبت و الم کو نہیں دیکھتا، وہ فرحت و سرور سے ناآشنائے محض رہتا ہے!"

حور نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھدیا اور جب ہٹایا، تو میں نے اپنے تئیں جوانی سے الگ اور مادی لباس سے عاری پایا۔ میں نے اس کو پوچھا: "اے دیوی کی لخت جگر! جوانی کہاں ہے؟"

اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اپنے بازوؤں میں لپیٹ کر ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر اڑا لے گئی۔ وہاں پہنچکر میں نے دیکھا کہ دنیا اور اس کی ہر چیز میرے سامنے صفحہ کی طرح کھلی رکھی ہے اور اس میں رہنے بسنے والوں کے راز تحریروں کی طرح میری نگاہ کے سامنے نمایاں ہیں۔ میں سہم کر اس حور کے پہلو میں کھڑا ہوگیا اور انسان کے بھیدوں پر غور و فکر اور زندگی کے اسرار و رموز کی تلاش و جستجو کرنے لگا۔ اسوقت جو کچھ میں نے دیکھا، کاش نہ دیکھتا!

——— میں نے دیکھا: محبت اور نفرت انسان کے دل سے کھیل رہی ہیں۔ محبت اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کر رہی ہے اور اسے تسلیم و رضا کی شرارت سے مدہوش کر کے اسکی زبان کو مدح و ستائش کے لئے کھول رہی ہے اور نفرت اسکی دشمنی کے جذبات کو بھڑکا رہی ہے اور اسے حقیقت کی طرف سے اندھا کر کے اس کے کانوں کو صحیح بات سننے سے روک رہی ہے:

——— میں نے دیکھا:- آبادی ایک مفلس عورت کی طرح، انسان کے دامن سے چمٹی بیٹھی ہے اور حسین و خوشگوار ویرانی دور کھڑی اسکی قسمت پر آنسو رو رہی ہے۔

میں نے دیکھا:- پادری لومڑیوں کی طرح مکر و فریب کے جال بچھا کر لوگوں کو پھانس رہے ہیں اور جھوٹے واعظ اپنی حیلہ کاریوں سے ان کے روحانی میلانات پر چھاپے مار رہے ہیں اور انسان چیخ چیخ کر عقل و حکمت سے مدد مانگ رہا ہے، لیکن عقل و حکمت اس کی ایک نہیں سنتی بلکہ نفرت و غضب کے ساتھ اسے ٹھکرا رہی ہے۔ اس بنا پر جب اس نے کھلے بندوں، ہر بازار، ہر گلی اور ہر کوچہ میں ان کو پکارا، تو کسی نے اسکی آواز کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

میں نے دیکھا:- مذہبی اجارہ دار بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں لیکن ان کے دل حرص و طمع کی قبروں میں مدفون ہیں ———

---

[1] :- قدیم یونانیوں کے نزدیک فنون کی نو دیویاں (میوز) تھیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے ارادتمند کو اسکی محبت اور اہلیت کے مطابق اپنے علوم سے نوازتی تھی ان دیویوں کی تفصیل یہ ہے: (۱) ملپومین:- غمگین کہانیوں کی دیوی ——— (۲) یوٹرپا:- شعر و غنا کی دیوی ——— (۳) تھالیا:- ہزلیات کی دیوی ——— (۴) کالیوپ: فصاحت اور رجزیہ شاعری کی دیوی ——— (۵) ارا تو:- غزل اور عاشقانہ شاعری کی دیوی ——— (۶) ترپسکوری:- رقص کی دیوی ——— (۷) اورانیا:- علم الفلک کی دیوی ——— (۸) کلیو:- تاریخ کی دیوی ——— (۹) اوترپی:- موسیقی کی دیوی۔

میں نے دیکھا :- نوجوان زبانوں سے محبت کے دعوے کر رہے ہیں اور اپنے بے قابو جذبات سے چمٹے ہوئے ہیں لیکن ان کی "الوہیت" ان سے کوسوں دور ہے اور ان کے جذبات، مجو خواب —— میں نے دیکھا - خدا دندانِ قانون مکر و فریب کے بازار میں اپنی چرب زبانی سے باقاعدہ تجارت کر رہے ہیں اور طبیب دہ لوح معتقدین کی روحوں سے کھیل رہے ہیں —— میں نے دیکھا - جاہل عقلمند کی جگہ میں بیٹھا ہے اور اپنے ماضی کو عظمت وا قتدار کی بلندیوں پر پہنچا رہا ہے اپنے حال کو بے فکری و فراغ دستی کی مسند کا تکیہ بنا رہا ہے اور اپنے مستقبل کے لئے شان و شوکت کا فرش بچھا رہا ہے —— میں نے دیکھا :- مفلس و فاقہ کش بوڑھے ہیں اور طاقتور دولت مند انکی محنتوں سے مزے اڑا رہے ہیں اور اس ظلم کا نام لوگوں نے قانون رکھا ہے —— میں نے دیکھا : تاریکی میں چوری کرنے والے عقل کے خزانوں کو لوٹ رہے ہیں اور روشنی کے چوکی دار سستی اور کاہلی کی چادر میں لپٹے پڑے سو رہے ہیں —— میں نے دیکھا :- عورت ایک رباب کی طرح اس مرد کے ہاتھ میں ہے، جو نہیں جانتا کہ تار پر مضراب کس طرح رکھی جاتی ہے، اسلئے جو نغمے اس سے نکلتے ہیں، ناپسندیدہ اور ناگوار ہوتے ہیں —— میں نے دیکھا :- نام نہاد شریفوں کی فوج نے موروثی شرافت کے شہر کا محاصرہ کر رکھا ہے اور اہل نسل شریف زادہ اپنی اقلیت و نا اتفاقی کی بنا پر ان کے مقابلے میں پسپا ہو رہا ہے —— میں نے دیکھا - حقیقی آزادی تنہا بازاروں میں ماری ماری پھر رہی ہے وہ ہر دروازہ پر جاکر سر چھپانے کی جگہ چاہتی ہے لیکن لوگ اسے دھتکار دیتے ہیں اسکے برخلاف رذالت ہمیشہ ایک عظیم الشان جلوس کی شکل میں رواں [illegible] اور لوگ اسے "آزادی" کہہ رہے ہیں —— میں نے دیکھا :- مذہب [illegible] تہوں میں دفن ہے اور وہم نے اس کی جگہ لے رکھی ہے —— [illegible] دیکھا :- انسان نے بزدلی کو صبر کا لباس پہنا رکھا ہے، سلطی کو [illegible] سے موسوم کر رکھا [illegible] اور خوف کو مہربانی کے نام سے موسوم کر رکھا [illegible] نے دیکھا :- تہذیب و شائستگی کے دسترخوان پر طفیلیے قبضہ کئے [illegible] بیٹھے ہیں اور مہمان خاموش ہیں —— میں نے دیکھا :- اسراف و عیاش کے ہاتھ میں [illegible] ہے، سخی کی مٹھی اسیری کا جال ہے اور بخیل و کنجوس کے ہاتھ میں لوگوں کی بدبختی کا [illegible]، لیکن عقلمند کا ہاتھ مال و دولت سے بالکل خالی ہے۔

جب یہ سب کچھ میں نے دیکھ لیا، تو اس منظر کی تاب نہ لاکر شدتِ الم سے چلا اٹھا! اے دیوی کی نورِ نظر! کیا یہی دنیا ہے؟ کیا یہی انسان ہے؟"

ایک جاحت کار خاموشی کے ساتھ اس نے جواب دیا :- "یہ کانٹوں اور کیڑوں سے اٹی ہوئی روح کی راہ ہے! یہ انسان کا سایہ ہے!! یہ رات ہے جس کی صبح ہونے والی ہے!!!"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھا اور جب ہٹایا تو میں نے دیکھا کہ میں اور شباب آہستہ آہستہ جا رہے ہیں اور امیدیں ہمارے سامنے ناچ رہی ہیں ✦

جیون اُلجھن —— عبدالمجید بھٹی

چھن چھن —— چھن چھن
چھن چھن —— چھن چھن
بن گئی اپنے جیون کی دُھن
پریت کی رانی آئی
من کی اک اک آشا جاگی لے کر انگڑائی
پریت کی رانی آئی
آشاؤں کے دیپ جلاکر
اپنی پیاری چھب دکھلاکر
اک نگاہی میں پھول سجاکر
اوٹ میں جا مُسکائی
پریت کی رانی آئی
اتنے میں اک من کا راجا آیا مکٹ [illegible]
من مندر کے دیپ جلا [illegible]
پریت کی رانی بولی [illegible]
ان پھولوں [illegible]
[illegible]
[illegible] میں بھول
[illegible] جانے کچھ ہوگئی بھول
[illegible] کی رانی ——
[illegible] کے راجا ——
ٹوٹ کے پھر نہیں آئے۔
اس جیون میں کون اب آکر من کے دیپ جلائے
جیون، اُلجھن!
اب ہے یہی دُھن
چھن چھن —— چھن چھن
چھن چھن —— چھن چھن

جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی سے کوئی سات میل جنوب مشرق کی طرف سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیؒ کے مزار سے تین میل آگے جمنا کے کنارے اوکھلا ایک چھوٹی سی بستی ہے — کچے کچے بے حیثیت گھروں اور پرانی دھرانی جھونپڑیوں کی ایک بستی۔ اسی بستی کے سامنے سے سرکار نے ایک نہر نکالی ہے۔ نہر اور جمنا کے آس پاس کچھ سایہ دار درخت لگا کر اور لال بجری بچھا کر کسی خوش مذاق انجینیر نے اس دور افتادہ جگہ کو خاصا خوش منظر بنا دیا ہے۔ اور شہری آبادی سے سات میل دور یہ ویران اور سنسان سی جگہ اب شہر والوں کی سیرگاہ ہے۔ صبح سے شام تک یہاں ہر طرح کے سیلانیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے — امیر، غریب، بڈھے، جوان، ہندی، انگریز، امریکی، غرض ہر وہ شخص جو شہری ہنگاموں سے تھک ہار کر فطرت کی گود میں سکون کے کچھ لمحے گزارنا چاہتا ہے، یہاں آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ ان آنے والوں کو لانے والی موٹریں، بسیں، سائیکلیں، گاڑیاں اور طرح طرح کی سواریاں اوکھلے کی اس سیرگاہ تک پہنچنے سے کوئی چار فرلانگ پہلے ایک ایسے حصے سے گزرتی ہیں جہاں ایک طرف دو بڑی بڑی شاندار عمارتیں ہیں، سفید گنبد والی باوقار، باعظمت عمارتیں، جو ہر آنے جانے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور ہر گزرنے ہوئے سیلانی کے دل میں کسی عظمت کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ دوسری طرف، اونچی نیچی، ناہموار پتھریلی زمینوں پر کچھ چھوٹے، کچھ بڑے دور دور بکھرے ہوئے، نئی وضع کے تھوڑے سے مکان ہیں — ایسے مکان، جن کی سادگی میں بھی ایک رنگینی و سحرکاری ہے۔ زندگی سے دوری کے باوجود زندگی کا سارا استقلال اور ساری توانائی — یہ اونچی اونچی باعظمت، باوقار سفید گنبد والی شاندار عمارتیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ہیں اور اس کے دوسری طرف جامعہ کے استادوں کے مکان۔ جامعہ کی عمارتوں کو دیکھکر اس بلند مقصد کی تصویر سامنے آتی ہے جو جامعہ کے سامنے ہے، اور استادوں کے مکان دیکھکر اس سادگی اور سچائی کی جو جس کے بغیر کوئی مقصد، بلند نہیں بنتا، کسی آدرش میں جان نہیں پڑتی۔

جامعہ کی یہ شاہانہ عمارت ہمیشہ سے ایسی نہیں۔ ایسا بننے کے لئے اسے بڑے سخت اور کڑی آزمائشوں کے ۲۵ سالوں میں سے گزرنا پڑا ہے۔ جامعہ والوں نے ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں، ہر طرح کے دکھ جھیلے ہیں، جسمانی ذہنی اور روحانی اذیتیں اٹھائی ہیں۔ کڑی نظروں کے تیروں کا نشانہ بنے ہیں، بری باتیں سنی ہیں، ملامتیں برداشت کی ہیں — اور ان ساری باتوں کے باوجود نظر کو بلندی کی طرف رکھا ہے، قدموں میں جھجک نہیں آنے دی۔ دل میں نیکی، دھیان کام کی طرف اور قدم آگے کو بڑھتے ہوئے۔ سب کچھ کر کے جامعہ کو جامعہ بنایا ہے — اور ایسا بنایا ہے کہ اب اس کی گنتی ہندوستان کے، بلکہ دنیا کے اچھے تعلیمی اداروں میں ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں پڑی تھی۔ گنتی کے چند آدمی اس کے ساتھ تھے۔ اور ان تھوڑے سے پڑھنے پڑھانے والوں کے پاس اپنا کام چلانے کے لئے کوئی عمارت نہ تھی۔ اسلئے چھوٹے چھوٹے خیمے ڈیرے ہی ان کے گھر تھے، وہی ان کا دارالاقامہ، وہی ان کا مدرسہ۔ اسی سادگی سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد اور طالب علم اپنی اس ابتدائی منزل میں، قومی تعلیم کا کام خلوص اور سچائی سے انجام دیتے رہے۔ لیکن غلط فہمیوں نے علی گڑھ کی فضا کو کبھی جامعہ کے مقصد کے لئے سازگار نہ ہونے دیا، اور اس لئے ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خان اسکو دہلی لے آئے۔ دہلی میں قرول باغ کی کچھ عمارتیں کرائے پر لی گئیں اور جامعہ کا کام اسی خلوص، اور نیک نیتی سے چلنے لگا، جس سے وہ شروع ہوا تھا۔ جامعہ کو اس منزل میں قدم قدم پر کسی رہبر کامل کی ضرورت تھی۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کو اس سے بڑے بڑے اور بہت سے کام بھی تھے، اسلئے انتہائی ایثار اور خلوص کے باوجود وہ اپنا سارا وقت جامعہ کو نہیں دے سکتے تھے۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں یورپ سے واپس آئے اور جامعہ کا کام ان کے ہاتھوں میں آگیا، اور اسطرح جامعہ کو وہ رہبر کامل مل گیا جسکی اسے ضرورت تھی۔ جامعہ نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے آنے کے بعد کس کس طرح ترقی کی طرف قدم بڑھائے، اس کے راستے میں کیسے روڑے اٹکے۔ کیا کیا رکاوٹیں پیدا ہوئیں، شک، شبہے، بدگمانیاں، بڑے سے بڑے الزام اور بڑی سے بڑی باتیں، لیکن ان سب کی کہانی بڑی لمبی ہے، اور کچھ ایسی خوشگوار بھی نہیں — جو بری باتیں خود اندھیرے میں جا چکی ہیں انھیں اجالے میں لا کر دوسروں کو دکھانے میں فائدہ کسی کا بھی نہیں، نقصان بہت سوں کا ہے۔ اسلئے گزری ہوئی باتوں کو چھوڑ کر صرف یہ دیکھیے کہ جامعہ اب کیا ہے۔ اس پچیس سال کے تجربہ کے بعد اس نے ملک اور قوم کو کیا دیا ہے — اور جو کچھ دیا ہے اس میں کیا اچھا ہے، کتنا کام کا ہے۔

وقار عظیم

جامعہ ملیہ اسلامیہ ہر عمر کے ہندوستانی کے لئے تعلیم دینے کا ایک تجربہ ہے۔ یہاں چار برس کے تتلاتے ہوئے بچے سے لے کر اس بڈھے تک کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے، جس کے پوپلے منہ میں

زبان کے سوا کچھ بھی نہیں بالکل چھوٹی عمر کے بچوں کے لئے جامعہ کی طرف سے دو ابتدائی مدرسے ہیں۔ ایک قرول باغ میں اور دوسرا جامعہ نگر میں (اوکھلے کا وہ حصہ جہاں جامعہ کی بستی ہے، جامعہ نگر کہلاتا ہے) قرول باغ میں شہر کے ہر حصے کے بچے ― لڑکے اور لڑکیاں دونوں ― پڑھنے آتے ہیں۔ جو قریب ہیں وہ پیدل اور جو دور ہیں وہ جامعہ کی لاری پر۔ یہ ابتدائی مدرسہ ساتویں جماعت تک ہے۔ اسی طرح کا دوسرا مدرسہ جامعہ نگر میں ہے لیکن وہ اقامتی ہے۔ وہاں پڑھنے والے بچے رہتے بھی وہیں ہیں۔ پڑھائی دونوں مدرسوں میں ایک ہی طریقے کے مطابق ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جامعہ نگر میں پڑھنے والے بچے چونکہ دن رات وہیں رہتے ہیں اس لئے ان کا پروگرام شہر والے بچوں کے مقابلہ میں زیادہ مکمل ہے۔ اگر آپ کبھی جامعہ نگر کے ابتدائی مدرسے میں جاکر رہیں تو آپ کو وہاں کا پروگرام کچھ اس طرح کا دکھائی دے گا۔ سورج نکلنے سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے چھوٹے چھوٹے بچے ایک ایک کرکے اٹھیں گے۔ اللہ رسول کا نام لے کر اپنے بستروں کو صاف کریں گے۔ پھر ضروریات سے فارغ ہوکر وضو اور نماز۔ نماز کے بعد، اگر سردی ہے تو میدان میں کسرت اور گرمی ہے تو دریا میں تیراکی۔ اس کے بعد یہ بچے بورڈنگ واپس آتے ہیں، ناشتہ کا وقت آیا۔ ناشتہ کیا۔ اپنی جگہ پر تمام کتابیں درست کیں اور مدرسہ کی طرف چلے گئے۔ جانے سے پہلے انہیں کے چنے ہوئے مانیٹروں نے ان کا معائنہ کیا اور ان سے باز پرس کی ― دانت کیوں میلے ہیں؟ بالوں میں تیل کیوں نہیں ڈالا؟ بٹن کیوں کھلا ہوا ہے؟ ٹوپی کہاں ہے؟ باز پرس کے بعد اصلاح اور اس کے بعد اسکول۔ پڑھائی شروع ہونے سے پہلے سب بچے میدان میں اکٹھے ہوئے، سب نے مل کر ترانہ پڑھا ― لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری، خبریں سنیں اور اپنی اپنی جماعتوں میں چلے گئے۔

ان بچوں کی جماعتوں کا کام بھی دوسرے مدرسوں سے ذرا مختلف [illegible] یہاں بھی دوسرے مدرسوں کی طرح زبان پڑھائی جاتی ہے [illegible] جاتا ہے، حرفہ اور جنرل سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے [illegible] ہر چیز کی بنیاد کسی پروجکٹ پر ہے ― مثلاً بچوں کا بینک [illegible] کی دوکان دو مستقل چیزیں ہیں۔ بچے بینک کا سارا کام خود کرتے ہیں [illegible] خط و کتابت، حساب کتاب، رجسٹر، کھاتے، چک بکیں۔ اس ننھے منے بینک میں سب کچھ وہی ہے جو ہمارے آپ کے بینک میں۔ اور اسی ننھے منے بینک کے کام سے بچہ سب کچھ سیکھتا ہے۔ زبان بھی، حساب بھی، حرفہ بھی۔ یہی حال دوکان کا ہے۔ پھر اس کے علاوہ بعض عارضی پروجکٹ بھی ہوسکتے ہیں اور انہیں بچے، اپنا کام سمجھ کر کرتے ہیں اور اپنے اس کام کو کرکے وہ سب کچھ سیکھتے ہیں جو تعلیم سکھانا چاہتی ہے۔ جامعہ کی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم نہیں۔ صرف ذہن کی تربیت نہیں ― وہ انسان کو انسان بننا سکھاتی ہے۔ انسان کو دنیا میں رہنا ہے۔ دنیا والوں کے ساتھ رہنا ہے اور اپنی آزادی اور دوسرے کے حق کی پاسداری کرکے رہنا ہے۔ انسان کی انفرادی زندگی، اجتماعی زندگی کا ایک حصہ ہے اور اس لئے ہر فرد کی اپنی ذمہ داری ہے، اپنا کام ہے۔ اس میں کوتاہی کا نتیجہ اجتماعی زندگی پر پڑتا ہے۔ جامعہ کے بچے اپنی جماعتوں سے نکل کر اس طرح کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہاسٹل کی زندگی میں وہ اپنے سارے کام خود کرتے ہیں خود اپنے لیے دستور بناتے ہیں اور ان کے کہے پر چلتے ہیں۔ اپنا کام خود کرتے ہیں دوسرے کو اس کے کام میں مدد دیتے ہیں۔ کھانے کے وقت بزم ادب کے جلسوں میں، کتب خانوں کے انتظام میں، اپنے روزانہ اخبار کی ترتیب میں، اپنی پنچایت میں جامعہ کے یہ چھوٹے چھوٹے بچے، جس سلیقہ جس سوجھ بوجھ اور جس ذمہ داری اور انہماک سے کام لیتے ہیں، اسے دیکھ کر ایک بے حد حسین اور جمیل مستقبل کی تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے ― خدا نظر بد سے بچائے۔

جامعہ کے یہ چھوٹے بچے سال بھر ایک خاص طرح [illegible] بسر کرتے ہیں اور اس زندگی میں انہیں جو مختلف طرح کے کام [illegible] میں لگے [illegible] سے ایک ابدی سرور اور مسرت ہے [illegible] انہیں زندگی سے دور رہنا نہیں [illegible] بھی جواب ہے۔ انہوں [illegible] ہلچل سے دور نہیں ہونے [illegible] ہوتا کہ وہ دوسروں سے الگ [illegible] مقابلے ہوتے ہیں۔ کھیل، کود [illegible] لطیفہ گوئی، ہنسی مذاق، ہر چیز کا مقابلہ [illegible] مدرسوں کے سیکڑوں بچے ہر سال جامعہ آتے ہیں [illegible] رہتے ہیں۔ ہر طرح کے مقابلوں میں شریک ہوتے ہیں، ہارتے ہیں جیتتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور جامعہ کے بچوں کے دل میں یہ احساس چھوڑ جاتے ہیں کہ زندگی ان کی اپنی زندگی سے باہر بھی دور تک پھیلی ہوئی ہے اور اس میں ہار جیت بھی ہے، خدمت گذاری بھی ہے، ایثار اور قربانی بھی اور فرض شناسی بھی۔

پھر جامعہ میں ہر سال بچوں کا میلہ ہوتا ہے۔ اس میلے کی بچے بہت دن پہلے سے تیاری کرتے ہیں۔ دکانیں لگاتے ہیں، اپنی بنائی ہوئی چیزوں کی نمائش کرتے ہیں، ڈرامہ کرتے ہیں اور یہ سب کچھ دیکھنے کے لئے ان کے بڑے بوڑھے دور دور سے آتے ہیں اور اس طرح جامعہ کی تعلیم میں یہ احساس جاری و ساری رہتا ہے کہ مدرسہ، سوسائٹی سے الگ کوئی چیز

نہیں — وہ اس سے الگ ہو کر کچھ بن ہی نہیں سکتا۔

اس خیال کو جامعہ نے کئی اور مختلف طریقوں سے بھی عملی جامہ پہنایا ہے اور اس سلسلے میں بے حد مفید کام کئے ہیں — مثلاً جامعہ کے قرول باغ والے بچوں کے مدرسے میں ایک حلقہ قائم ہوا ہے شام کو قرول باغ کی بستی کے ہندو، مسلمان، سکھ — وہ سارے لوگ جو دن بھر کا کام کرنے کے بعد بھی اپنے آپ کو زندگی سے ہم آہنگ رکھنا چاہتے ہیں، یہاں آ کر جمع ہوتے ہیں باتیں کرتے ہیں، اخبار پڑھتے ہیں، شعر و ادب پر، سیاست و معاشرت پر دوستانہ بحثیں کرتے ہیں۔ کھیل کود اور علم کے ہلکے پھلکے مشغلوں کے مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح زندگی کو محض کاروباری یا کھوکھلا سمجھنے کے بجائے وہ اس میں لذت محسوس کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں، اس کے تنوع میں انہیں رنگینی اور معنویت دکھائی دیتی ہے۔

جامعہ کی تعلیم کا دوسرا حصہ مدرسہ ثانوی ہے۔ یہاں بھی تعلیم کے بنیادی اصول وہی ہیں جو مدرسہ ابتدائی میں۔ ابتدائی مدرسہ میں شہریت اور قومیت اور ان دونوں کی ذمہ داریوں کا جو احساس ایک ہلکے پھلکے انداز میں غیر محسوس طریقہ پر پیدا ہوتا ہے، اسکا انداز مدرسہ ثانوی میں آکر زیادہ واضح اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ مدرسے کے مضامین کی تعلیم کے سلسلے میں یہاں بھی دکان، بزم ادب، اسکا رسالہ، اخبار یہ ساری چیزیں اور ان سے پیدا ہونے والے مختلف پروجکٹ درسی مضامین کی تعلیم کی بنیاد بنتے ہیں اور اپنی درسی تعلیم میں بھی طالب علم زندگی کے عملی پہلو کی طرف مائل اور اس کے احساس اور شعور سے پر نظر آتے ہیں — مثلاً جب وہ سائنس کی کلاس میں جاتے ہیں تو اپنے کتابی سبق کے علاوہ روزانہ کی ضرورتوں کی بہت سی اچھی اچھی چیزیں بناتے ہیں — مثلاً مرہم، تیل، کریم، منجن روشنائی، جام، جیلی اور مربے مربے کی چٹنیاں۔ اپنی اقامتی زندگی میں اور اس کے باہر جامعہ کی عام زندگی میں ہندوستان کے یہ آئندہ ہونے والے شہری عملی حیثیت سے اپنے آپ میں شہریت کا احساس پیدا کرتے ہیں اور شہری زندگی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے سروں پر اٹھاتے ہیں — جامعہ کے انہیں بچوں نے اس پاس کی پتھریلی کنکریلی زمین کو کھود کر اسے ہموار کیا، اور جہاں سے جو پایوں کا گذرنا بھی آسان نہ تھا، وہاں سے اب موٹریں گذر سکتی ہیں یہی بچے باری باری رات کو جامعہ کی آبادی کے گرد گشت کرتے اور پہرہ دیتے ہیں، اور یہی بچے ہر سال اوکھلے کی سیر گاہ میں جمنا میں ڈوبتے ہوئے سیلانیوں کو موت کے منہ سے نکال کر لاتے ہیں اور اس طرح زندگی کی کشمکش میں داخل ہونے سے پہلے زندگی کا وہ بلند منصب ان کے ذہنوں میں نقش ہو جاتا ہے

جس میں انسان دوسروں کی خدمت کو اپنا سب سے بڑا کام سمجھتا ہے — اپنے فرض کا احساس، دوسرے کے حق کی نگہبانی اور خدمت سے انسان کی زندگی کو بہتر بنانے کا کبھی نہ تھکنے والا جذبہ

جامعہ میں اس ثانوی مدرسہ کے بعد کالج ہے — یونیورسٹیوں کے عام کالجوں سے بالکل مختلف۔ یہاں طالب علموں کو انگریزی، اردو، تاریخ، سیاسیات اور معاشیات سب کچھ پڑھنی پڑتی ہے اور ان کے ذہنوں میں پختگی ان کی فکر میں صفائی اور توانائی، اور ان کی زبان اور قلم میں اظہار کا جوش اور تاثیر اور پیدا ہوتا ہے اور یہاں پڑھنے والے زندگی کو مصیبت نہیں، رحمت سمجھ کر نکلتے ہیں۔ زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرنا، اور اسے قدم قدم پر زیر کرنا ان کی سیرت میں داخل ہے۔

جامعہ کی ابتدائی تعلیم کا نہج بنیادی تعلیم کے اصول پر ہے۔ اسی اصول کے ماتحت اوکھلے کے گاؤں میں بچوں کا ایک مدرسہ کھولا گیا ہے اور اس سے ذرا فاصلے پر ٹریننگ اسکول ہے، جہاں بنیادی مدرسوں میں پڑھانے والے استادوں کو عملی اور نظری تعلیم دی جاتی ہے۔

جامعہ نے اپنا کام چار برس کی عمر کے بچوں سے شروع کیا، اور انسانی زندگی کی ہر منزل کو نظر میں رکھ کر ہر عمر کے لوگوں کی تربیت اور اصلاح کو اپنا مقصد بنایا۔ قرول باغ میں جامعہ نے تعلیم بالغان کا ستہ قائم رکھا ہے تعلیم بالغان کے شعبہ نے اپنے کام کے دو حلقے کئے ہیں۔ ان میں سے ایک سے ایک مخصوص علاقہ کے باشندوں کو فائدہ ہوتا ہے اور دوسرے کا اثر اس علاقے سے باہر بھی دور دور پڑتا ہے۔ تعلیم بالغان والے ایک خاص علاقہ میں اپنا کام اس طرح شروع کرتے ہیں کہ پہلے اس علاقہ کی پوری مردم شماری کی۔ اور یہ دیکھا کہ ہر گھر میں کتنے مرد، کتنی عورتیں ہیں، ان کی تعلیمی حالت کیا ہے۔ اس جانچ کے بعد اپنا کام شروع کیا۔ علاقہ میں ایک مرکز قائم کیا۔ اس مرکز میں ایک ریڈیو ہے کچھ اخبار آتے ہیں۔ جو لوگ اخبار نہیں پڑھ سکتے ان کے لئے سرخیوں اور تصویروں سے ملا جلا کر ایک "وال پیپر" تیار کیا جاتا ہے۔ خبروں کا مطلب سمجھایا جاتا ہے، نقشے دکھائے جاتے ہیں۔ پھر ان آنے والوں میں سے جسکا جی چاہے اسے پڑھایا جاتا ہے۔ عورتوں کو گھروں پر کتابیں پہنچائی جاتی ہیں — اور اس طرح اس علاقہ کی عام فضا میں علم کا شوق، زندگی کو جاننے اور اس سے قریب آنے کی خواہش فطری بن جاتی ہے۔ اس خواہش اور شوق کو پورا کرنے کے لئے جامعہ نے تین سو چھوٹے چھوٹے رسالے تیار کرنے کی

ہیکیم نا کی ہے — ان رسالوں میں قصے کہانیاں، اچھی اچھی کتابوں کے خلاصے دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں ہر طرح کے اخلاقی، اصلاحی، مذہبی معاشرتی، تاریخی، سیاسی مسائل، زندگی کی بہت سی اور چھوٹی بڑی باتیں — غرض وہ سب کچھ ہے جس سے علم کی بھوک تیز ہوتی ہے اور پھر اس بھوک کی تسکین کی خواہش، پھر بھوک، اور پھر اس کی تسکین کی خواہش کا شدید جذبہ — یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ شروع کے سو سے زیادہ رسالے جامعہ نے تیار بھی کئے ہیں۔ اگر ہندوستان کا ہر چھوٹا بڑا ان رسالوں کو پڑھ سکے تو اسکی ذہنی تربیت کے لئے ہماری سیاست کو پھر کسی کاوش کی ضرورت نہیں۔

اس سے اگلی منزل وہ ہے جب انسان صرف اچھے علم کا شیدائی بن جاتا ہے۔ اچھے اچھے مصنفوں کی، اچھی اچھی کتابیں پڑھنا چاہتا ہے۔ اس کام کے لئے جامعہ میں 'مکتبہ جامعہ' ہے — ایک ایسا ادارہ جس نے اردو کے ناشروں کو پبلشنگ کی وہ ساری روایات دیں، جن پر چل کر اب یہ ناشر اردو ادب کو حسن و جمال کا مرقع بنا رہے ہیں۔

جامعہ نے یہ سارا کام پچیس سال میں کیا ہے — بڑی بڑی مصیبتیں جھیل کر، دوسروں کی پابندیوں سے بچ کر کہ اس طرح کہیں اس کے بلند مقصد میں فرق نہ آجائے — وہ بلند مقصد اب بھی جامعہ کے سامنے ہے۔ اب بھی اسکا قدم آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے سامنے بعض ایسی سکیمیں ہیں جن پر جلدی عمل شروع ہونے والا ہے — لڑکیوں کا ایک مدرسہ، ایک پالی ٹکنیک، ایک بچوں کا اسپتال۔ جامعہ نے ہمیشہ نئی راہوں کی جستجو کی ہے، ایسی راہیں جن پر چل کر زندگی پہلے سے بہتر بن سکے۔ انسان کو ایک ابدی سکون اور مسرت مل سکے — وہ علم اور خدمت کو اپنے لئے سب کچھ [illegible] جامعہ نے ۲۵ سال کی مختصر مدت میں ہندوستانی آبادی کے ایک [illegible] روشنی دی ہے، اسے بیدار کیا ہے اور اب بھی اس کے ہر گوشے [illegible] آرہی ہے — "جاگو اور جگاؤ" جامعہ نے خود جاگ [illegible] کے جس جذبہ کی مشعل جلائی ہے، یہی چاہتا ہے کہ وہ ہندوستان [illegible] علم ہو جائے۔

اُردو۔ ایک ترقی پسند زبان

مسعود حسین

ترقی پسندی کی اصطلاح ادب کے ساتھ کچھ اس طرح نتھی کر دی گئی ہے کہ اسے علم کے کسی دوسرے شعبہ میں استعمال کرتے وقت تامل ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسندی کی اصطلاح کا جتنا صحیح اطلاق زبان کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے دھارے پر ہو سکتا ہے ادب پر نہیں ہوتا۔ ادب پھر بھی فن ہے۔ وہ اجتماعی زندگی کی اتنی بڑی لہر نہیں جتنی کہ زبان!

زبان سماجی پیداوار ہونے کی حیثیت سے آگے بڑھتی اور پیچھے ہٹتی رہتی ہے۔ لیکن مجموعی لحاظ سے تاریخ انسان اور تاریخ زبان دونوں کا ڈھنگ ایک ہے۔ زبان کی ترقی پسندی میں وہ تمام فنی حرکات شامل ہیں جن سے زندگی کا آہنگ تیار ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک بڑھتی ہوئی لہر ہے جو منطقی آگے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ہندوستان کی آریائی زبان کی تاریخ میں "دریا ہی کا سا پھیر" ہے۔ اس دریا کے بہاؤ پر بند بھی باندھے گئے، اس کے رخ پھیرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن تاریخ اور زبان کا بہاؤ کسی کے بس کا نہیں ہوتا۔ یہ ارتقا کے چند کڑے اصولوں کے ماتحت ہوتا ہے جس میں ادب کے برعکس انفرادیت کا بالکل دخل نہیں۔

موجودہ زمانے میں ہند آریائی زبان کی سب سے نکھری ہوئی شکل اردو ہے، جس کی ابتدا کے متعلق اب تک کئی دلچسپ نظریئے پیش کئے جا چکے ہیں۔ یہ نظریئے دلچسپ زیادہ ہیں اور نظریئے کم۔ اردو کو کبھی تو شاہ جہاں کے اقبال سے منسوب کیا گیا ہے (سرسید) اور کبھی اکبر کے عہد سے (میرامن)۔ پروفیسر شیرانی نے اس بنا پر کہ فتح دہلی سے قبل مسلمان ڈیڑھ دو سو برس تک پنجاب میں قیام کر چکے تھے اسی سرزمین کو اردو کی جنم بھومی بتایا ہے۔ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی اسے کھینچ کر محمد بن قاسم کی فتح سندھ تک لے جاتے ہیں۔ لیکن ہند آریائی زبان کی تاریخ جاننے والا اس زبان کے تسلسل کی نشان دہی آریوں کے داخلۂ ہند (۱۵۰۰ ق۔م) سے کرے گا۔ یہ زبان اس وقت بھی ہندوستان میں موجود تھی۔ البتہ نام اور روپ رنگ مختلف تھے۔ اسلئے اردو زبان کا جنم مسلمانوں کے ہاتھوں نہیں ہوا بلکہ یہ کسی نہ کسی شکل میں قدیم زمانے سے جمنا کی وادی میں رائج تھی جمنا کے چلتے دھارے کی طرح ہماری زبان کا دھارا بھی قدیم زمانے سے اس سرزمین میں بہہ رہا ہے جس کی ہر عہد اور زمانے میں سب سے بڑی خصوصیت یہی رہی ہے کہ اس نے ہر قسم کے ترقی پسند اثرات کو قبول کیا ہے۔ اسکو بارہا ادبی شکل میں روکنے اور رہا کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن ہمیشہ ناکامی ہوئی۔ انہیں ناکام کوششوں کو ہم منفی لسانی تحریکوں کا نام دے سکتے ہیں۔

اس قسم کی پہلی تحریک ۶۰۰ ق۔م کے لگ بھگ ہوئی جب کہ اس کی ارتقائی شکل کو سنسکرت کی صورت میں مسخ کیا گیا۔ ایک ہزار برس کے (۱۵۰۰ ق۔م تا ۵۰۰ ق م) عرصے میں آریہ پشاور سے لیکر بنگال اور دکن تک پھیل چکے تھے اور غیر آریوں کے میل جول کی بنا پر عوام میں نئی نئی زبانیں پراکرتوں کی شکل میں پھوٹ نکلی تھیں۔ انہیں پراکرتوں کے چلن اور رواج سے خائف ہو کر پنڈتوں اور برہمنوں نے آریائی زبان کی روح کو زندہ رکھنے کے لئے زبان کو سنسکرت (صاف) کیا اور بعد کو یہی زبان کا نام قرار پایا۔ یہ حقیقت ہے کہ باوجودیکہ سنسکرت زبان کو "بھاشا" (بولی جانے والی زبان) کہا گیا ہے یہ کبھی بھی بول چال کی زبان نہیں رہی ہے۔ بدھ اور جین مت کے بانیوں نے اسی لئے عوام کی پراکرتوں کو اپنا کر انہیں ادبی مرتبہ بخشا علمی اور ادبی حیثیت سے گو سنسکرت مسلمانوں کے عہد تک استعمال میں لائی جاتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہند آریائی زبان کا ایک مردہ بچہ تھا جو اس کے بطن سے پیدا ہوا۔

مسلمانوں کے داخلۂ ہند کے وقت ہماری زبان زندگی کے پچیس سو زینے چڑھ چکی تھی۔ اس ڈھائی ہزار برس میں اسے ہر قسم کی منفی تحریکوں کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن وہ تمام رکاوٹوں کو ہموار کرتی ہوئی اپنے فطری میلانات کے مطابق ترقی کرتی رہی۔ حتیٰ کہ گیارہویں صدی میں مسلمان ایک نئی زبان اور نئے تمدن کو لئے سیلاب کی شکل میں ہندوستان کے اندر داخل ہوئے۔ اس بڑے الٹ پھیر سے زندگی اور زبان کا ایک نیا آہنگ تیار ہوا جس نے سلاطین مغلیہ کے عہد میں ایک مفید شکل بھی اختیار کر لی۔ دہلی کے آس پاس کی سانولی سلونی ایک نئے رنگ روپ میں سامنے آئی اور تھوڑے ہی عرصے میں راجدھانی کر سارے ہندوستان پر راج کرنے لگی۔ اس کے بنتے ہی تمام رجعت پسندانہ لسانی رجحانات کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمان چونکہ سنسکرت سے ناواقف تھے اسلئے اس کا طلسم ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ مختلف صوبائی بولیاں

ہوئی بلکہ جب انہیں جنکی سرپرستی وہاں کے مسلمان حاکموں نے قبول کی۔ شمالی زبان کا ارتقا مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی میں ہوا۔ سیاسی مرکز سے تعلق رکھنے کی وجہ سے خسروکی زبان دہلوی نے گجرات، دکن اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ادبی حیثیت حاصل کی تھی۔ البتہ خود دہلی میں فارسیت کے غلبہ کی وجہ سے ادبی حیثیت اختیار کرنے اور فارسی کی جگہ لینے میں چند سو سال کی دیر لگی۔ فارسی کا یہ چرچا جو سلاطین دہلی کے زیر سرپرستی شمالی ہند میں ہوا دوسری منفی لسانی تحریک تھی جس نے اردو کے ارتقا کو نقصان پہونچایا۔

دکن اور گجرات کے اجنبی ماحول میں اس کے برعکس یہ زبان خوب پھلی پھولی۔ دکنی زبان کی شکل میں شاید اس نے ترقی پسندی کا سب سے اونچا زینہ چھو لیا تھا۔ اگر قدیم دکنی کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں حسب ذیل ترقی پسند رجحانات ملیں گے جو شمالی ہند میں آکر رفتہ رفتہ زائل ہو جاتے ہیں۔

(۱) ہندوستان کی بنیادی زبان (دہلی کے آس پاس کی بولی) کے الفاظ کی کثرت (موجودہ اردو سے تقریباً بیس فی صدی زیادہ)

(۲) عربی فارسی الفاظ کو اپنی صوتیات پر ڈھال لینا (مثلاً نفع کی بجائے نفا وغیرہ)

(۳) اردو کی قواعد کو فارسی عربی کی قواعد پر ترجیح دیتے ہوئے ان زبانوں کے الفاظ اس پر ڈھالنا۔ اس میں اسماء اور افعال دونوں بکثرت مل جاتے ہیں۔

لیکن زبان کا یہ ڈول اور کینڈا عرصے تک نہ رہ پایا۔ دہلی والوں نے دکنی اور اس کے ادب کو "ایک بحرسی بات" سمجھا۔ چنانچہ ولی کے فوراً بعد ہی دہلی میں دکنی زبان کے خلاف سخت قسم کا ردعمل ہوتا ہے۔ اسے پہلی تحریک اصلاح زبان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاں تک متروکات کا تعلق ہے یہ ضرور ایک "مثبت لسانی تحریک" کی حیثیت رکھتی تھی۔ دکنی ز[illegible] جنوبی ہند کی زبانوں کے اجنبی ماحول میں جاکر کسی حد تک [illegible] اس کے برعکس فارسی اور برج بھاشا کے باوجود دہلی [illegible] یہ تیزی سے ترقی کے مدارج طے کر رہی تھی۔ یہاں [illegible] پاس کی بولی سے گہرا رشتہ ہونے کی وجہ سے اردو زبان کو ہر لحظہ نیا خون بھی ہو[illegible] رہتا تھا۔ لیکن اس تحریک اصلاح زبان نے اردو کو کسی حد تک نق[illegible] بھی پہونچایا۔ ترک و اختیار دونوں میں غلو برتا گیا اور ایک طرف فارسی کو بے جا طور پر جگہ دی گئی تو دوسری طرف ہندی کے اکثر[illegible] کو بلا وجہ نکال باہر کیا گیا۔ اس تحریک کا ایک پہلو یقیناً اردو کی ترقی [illegible] ممد ثابت ہوا سنسکرت کے اکثر تت سم (خالص) الفاظ جو خاص[illegible]

کی شکل قدیم زمانے میں دکن چلے گئے اور وہاں رائج تھے خارج ہو گئے اس میں سے بیشتر وہ تھے جن کی ارتقائی شکل شمالی ہند میں بدل چکی تھی۔

اردو کے ترقی پسند میلانات کو سب سے بڑی ٹھیس لکھنؤ اور وہاں کی تحریک اصلاح زبان نے پہونچائی جسطرح دکن والوں کی صدیا سال کی کوششوں کو دہلی والوں نے تباہ کر دیا تھا، دہلوی زبان کے رنگ روپ کو لکھنوی لسانی اثرات نے کسی حد تک مسخ کر دیا۔ تاسخ کی تحریک اصلاح زبان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل عناصر نظر آئیں گے۔

(۱) دہلوی زبان کے "ٹھیٹھ" روپ سے انحراف۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ لکھنؤ اودھی (اپوربی) زبان کے علاقے میں ہے۔ دہلی کے آس پاس کی بولی لکھنؤ کی اس اودھی بولی سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اودھی نے جس پراکرت کے بطن سے جنم لیا ہے وہ دہلی اور مغربی یوپی کی شورسینی پراکرت سے مختلف تھی۔ زبان کا صحیح خمیر اٹھانے میں لکھنؤ والوں کو کسی حد تک انہیں دقتوں کا سامنا تھا جو ملا وجہی اور قلی قطب شاہ کو دکن میں درپیش تھیں یہی وجہ ہے کہ شہر لکھنؤ کی زبان مضافات لکھنؤ کی زبان پر پوری طرح کبھی بھی حاوی نہ ہو سکی، اور نہ اودھی زبان اس کی رگوں م[illegible] خون پہونچا سکی۔ لکھنؤ کا روزمرہ اور محاورہ اسی لیے [illegible] دہلی کی سیڑھیوں کا منہ تکتا رہا۔ تاسخ [illegible] اہل لکھنؤ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور [illegible] الفاظ کو متروک قرار دیا۔ ان متروک الفاظ کی فہر[illegible] معلوم ہو جائیگا کہ دہلی والے عوام [illegible]

[illegible] کا ناقابل معافی جرم یہ تھا کہ انہوں نے قصداً [illegible] تمام پیارے دو کو فارسی الفاظ اور تراکیب سے گراں بار کیا [illegible] ترقی پسند لسانی رجحانات نے غالب کا گلا گھونٹ دیا اور انہیں [illegible] روش ترک کرنا پڑی۔ لیکن لکھنؤ نے زبان پر اپنا ٹھپہ اس طرح لگایا کہ وہ خالص شہری اور درباری زبان بن کر رہ گئی۔

لیکن اس عہد کی سب سے بڑی منفی لسانی تحریک جدید ہندی ہے جس کی داغ بیل انگریزوں کی حکمت عملی نے فورٹ ولیم کالج میں ڈالی تھی۔ جدید ہندی کی عمر کا اندازہ اس طور پر لگایا جا سکتا ہے کہ اسکا پہلا نثر نگار شاعر تا حال بقید حیات ہے۔ للو لال جی اور فورٹ ولیم کے دوسرے پنڈتوں کو واضح طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ہندوؤں کے لئے ایک ایسی زبان تیار کریں جو ان تمام لسانی روایات کی حامل ہو جو انہیں عزیز ہیں۔ اس کے لئے ترکیب یہ نکالی گئی کہ عربی فارسی الفاظ نکال کر اردو کا جو ڈھانچہ باقی رہ جاتا تھا اس میں سنسکرت کے لفظ بٹھا دئے گئے۔ سنسکرت

ہماری نئی مطبوعات

تمدن کے آداب عرض

آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران اپنے خیالات بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا "تمدن کے آداب عرض" انہی نشریات کا مجموعہ ہے بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویسی کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ دوسرا ایڈیشن قیمت [illegible]

دلیس سے باہر

آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی جنگی مضامین کا دوسرا مجموعہ لندن سے "آداب عرض" کی مقبولیت بی بی سی اور ان کے مضامین ادبی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قیمت [illegible]

ادبستان

حضرت مولانا خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین اور دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کر کے بے نظیر تصنیف بنا دیا ہے یہ مجموعہ بار بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

تیسرا ایڈیشن قیمت [illegible]

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

بہترین ڈراموں کا مجموعہ مرتبہ اختر شیرانی اس مجموعہ میں مرتب نے ملک کے بہترین ڈراموں کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے۔ یہ ڈرامے آپ کی ذہنی خوراک ہیں آج ہی آرڈر دیجئے تاکہ ابھی سے اندازہ کیجئے کہ ایک ڈرامہ سے دوسرا کیسا لاجواب ہوگا۔ قیمت تین روپے (۳)۔

بہار شریعت

مصنفہ حضرت مولانا مفتی حکیم امجد علی صاحب اسلامی عقائد کو قرآنی احکام کے لئے بہترین تصنیف تمام مسائل کو تشریح اور استدلال مرتب کیا گیا ہے اسلامی کتب میں بے نظیر تصنیف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ اپنے عقائد و اعمال نماز روزہ و دیگر عبادات و معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہر وقت بہار شریعت کو زیر مطالعہ رکھیں۔ یہ آپ کو عالم و مفتی سے بے نیاز کر دے گی۔ مفتیان کرام کے لئے نوٹ بک کا کام دیتی ہے۔ کامل ۱۷ حصے۔

بلا جلد ———— مجلد

پچیس روپے ۲۵ ———— اکتیس ۳۱ روپے

معاشیات قومی

ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی، کتاب فریڈرک لسٹ کے حقیقت افروز قلم کی مرہون منت ہے۔ جسے ڈاکٹر صاحب نے اردو کا لباس پہنایا ہے یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز اور تاریخی روداد ہے اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف۔ قیمت مجلد [illegible] روپے۔

مقالات شیرانی

از حافظ محمود شیرانی حافظ محمود شیرانی کا قلم ادبی دنیا میں بلند درجہ حاصل کر چکا ہے مقالات شیرانی ان کے بلند پایہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے یہ گرانمایہ تصنیف ہر اہل ذوق کے زیر مطالعہ ہونی چاہیئے۔ آج ہی طلب فرما کر ملاحظہ کریں قیمت تین روپے

تاریخ انقلاب روس

مصنفہ شیر جنگ روس کے اقتصادی انقلاب کا یہ منظر تاریخی، معاشی، اخلاقی اور مجلسی رد و بدل کی روح فرسا تاریخ فاضل مصنف نے سینکڑوں تاریخی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاریخ مرتب کی ہے جو اختصار کے باوجود مکمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ شیر جنگ کے انقلابی ذہن نے واقعات کو کس خوش اسلوبی سے مرتب کر کے ایک لاجواب تصنیف بنا دیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔

ہمارے ہاں

اسلامی، ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف۔ حمائل بیجو رسے اور سیپارے شائع ہوتے ہیں۔

فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

اوراق پارینہ

از شیر جنگ۔ ایک انقلابی قیدی کی وہ بھی اور پہلی بکی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں کی حالت غریب مزدور و کسان کی تکالیف، معاشی مشکلات اور سیاسی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ یہ کتاب انقلابی جذبوں کے لئے ایک پروگرام اور ادبا کے لئے بہترین انشاء، محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ۔

قیمت [illegible]

اُردو [illegible]

مصنفہ ناظم سید [illegible] رضوی اردو زبان کی ترقی اور اس کے دیگر [illegible] ہندو اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات [illegible] یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرے گی۔ تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔ قیمت مجلد [illegible]

قرآنی اخلاق

انسان کو دنیا میں بہت بڑی کا [illegible] کہلانے کا حقدار تو صرف جب ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم کیا گیا ہو۔ قرآن کریم اخلاقی فرمودات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی

(قیمت [illegible])

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شیر جنگ۔ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی درد سے سنا اور اسے ایک نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کا مشاہدہ کر کے انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ بیسیوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے۔

تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے

قیمت مجلد چھ روپے

ملنے کا پتہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار لاہور


"لکس
ٹائلیٹ صابن ہی میرے
حسن و جمال کا آسان طریقہ ہے"
مایا بینرجی کہتی ہے
میں لکس ٹائلیٹ صابن کا بہت زیادہ جھاگ تیار کرتی ہوں اور اسے اپنی جلد پر بلا جھجک لگاتی ہوں۔
اس کے بعد میں صاف و ستھرے اور ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالتی ہوں
آہستگی سے پانی چہرہ نرم تولیے سے خشک کرتی ہوں
LUX TOILET SOAP
فلمی اسٹارس کا حسن بخش صابن
فلمی ستارہ اپنے کمال جلد کی قدر اس سے زیادہ نہیں کرتی کہ وہ اس کے دلکش خوبصورتی کا ایک جز ہے۔ بلکہ وہ اس کے زندگی کی ایک انمول پونجی بھی ہے۔ وہ اسی لئے ہندوستان بھر کی فلمی اسٹارس لکس ٹائلیٹ صابن سے اپنے قیمتی حسن کی حفاظت کرتی ہیں۔ آپ خود اپنے مکان میں اس آسان طریقہ کو استعمال کر سکتی ہیں۔ اس کا روزانہ کے لئے تجربہ حاصل کیجئے یہ آپ کے صاف کرنے والے ترغیب دینے والے انجام سے خوش ہوں گی
LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

نقد و نظر

...ـمر۔ دہلی
...یں الیوں کی اور نفاست
...سب ان کی مطبوعات
...باعت واشاعت کے کام کو بھی
...۔ ہندوستان کے ان محدود سے چند اداروں میں
...ں کتاب گھر دہلی کو سب سے زیادہ نمایاں حیثیت دی
...ؤ۔ دہلی کی پیش کردہ کتابیں چھاپنے کا فخر حاصل ہے جنکے
...سے کام لیتے ہوئے صفِ اول کے بلند پایہ ادیبوں کے
...یں پھر جس طرح بیچنے والے ہر دلعزیزی کے خیال سے
...اسی طرح خاتون کتاب گھر کے مالک و منتظم (شاید
...ہوئے) ہر کتاب کو جہیز کے تحفہ کی طرح اسقدر سلیقے
...ں، نفاست اور پاکیزگی ہر صاحب ذوق کا دل موہ لیتی
...حنائیوں کے ساتھ مل کر ایک اچھا حسن امتزاج پیش
...راشد الخیری کی یادگار ہے اور اسے مرحوم کے صاحبزادوں
...ں خاطر میدان ادب میں ایک مضبوط عمارت کی بنیاد رکھی تھی
ذکر کے اس عمارت کو وسعت دے رہا ہے۔ اسوقت
...نظر ہیں جن پر مختصراً اظہارِ خیال کرنا مقصود ہے۔
...و کے مشہور نقاد پروفیسر وقار عظیم ایم اے نے (جنکی
...ں ہیں) مرتب کی ہے۔ اہلِ قلم میں مشہور ہستیاں شامل ہیں۔
...ی کی افسانہ نگاری، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے
...یں سے ان کی ٹریجیڈی، مولوی نصیر الدین ہاشمی نے
...لوی سے ان کی شاعری، جناب حامد علی نے ان کی انشاپردازی
...سے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مولوی شاہد احمد دہلوی
...مصرانہ، ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردی نے ان کے ادب
...۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ان کو بحیثیت مصلح پیش کیا ہے
...دلوں پر نظر ڈالی ہے غرض یہ کہ ہر پہلو پر اور ہر زاویے
...خصوصیت اور انکی افادیت پر لکھے ہوئے تنقیدی مقالات
...رت کے نام ہی کتاب کے معیاری ہونے کی ضمانت

...روس کا سب سے بڑا ناول نویس گذرا ہے۔ وہ گورکی
...ادھا۔ فرق اتنا ہے کہ اول الذکر نے زندگی کو بحیثیت
...ے یف نے غیر معمولی لوگوں کی غیر معمولی زندگی پر
...ظرافت کا رنگ اختیار کرتی ہے۔ وہ آندرے یف کے
...لفظ میں "سیدھا ہو یہ بیگڈ الشو کا بلند ..."

اس کو ہمارے ملک کے مشہور صحافت نگار اور مترجم شاہد احمد دہلوی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ کتاب بجائے خود فن کے اعتبار سے بہت زیادہ وقیع ہے اسمیں سات مجرموں کے ... زندگی بیان کرنے کے علاوہ بتایا گیا ہے کہ جب عدالت کی طرف سے ان کو پھانسی کا حکم سنایا گیا تو ان کے قلب و دماغ پر کیا کیفیات گذریں اور جب انہیں معلوم ہو گیا کہ بہت جلد موت کے گھاٹ اترنا یقینی ہے تو زندگی کے آخری لمحات انہوں نے کیونکر بسر کئے۔ وہ لمحات جنمیں خوف و ہراس، بے چینی و بے قراری اور اطمینان وسکون کی متضاد کیفیات ملی جلی موجود تھیں۔ وہ کبھی سہم کر اور کبھی اس خیال سے خالی الذہن ہو کر موت کا انتظار کر رہے تھے۔ اس دلکش کتاب کا ترجمہ بھی دلکش ہے۔ کیونکہ شاہد صاحب صفِ اول کے مترجموں میں شامل ہیں اور موریس میٹرلنک کی طرح آندرے یف بھی ان کا مقبول مصنف ہے جس کے طرزِ بیان اور نقطۂ نظر کو انہوں نے خوب سمجھا اور اچھی طرح پیش کیا ہے۔ قیمت دو روپے۔

طغیان | ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے قاضی نذر الاسلام کی نظموں کو اردو کا جامہ پہنا کر بنگال کے اس باغی شاعر کو ہمارے ادب میں روشناس کرایا تھا۔ افسانوں کے ضمن میں یہ گرانقدر خدمت جناب محمد یونس احمر نے انجام دی ہے۔ احمر خود بھی شاعر اور بنگال کے رہنے والے ہیں، نذر الاسلام کے قریب اٹھتے بیٹھتے ہیں اسلئے انہوں نے اس شاعر کی روح، اسکے اندازِ بیان اور نقطۂ نظر کو خوب سمجھا ہے اور چونکہ طبعزاد افسانے لکھنے میں وہ پہلے سے مشاق تھے اسلئے اس کام میں انہیں کسی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ نذر الاسلام کی نثر میں بھی وہی لطافت وشیرینی اور وہی حسنِ بیان اور رنگینی موجود ہے جو اس کی نظموں کے لئے طرۂ امتیاز ہے۔ یہاں بھی اسکے خیالات ملتہب آہنگ ہو کر سنائی دیتے ہیں۔ ان افسانوں میں بھی وہ ایک انقلابی شاعر کی حیثیت سے رونما ہوا ہے۔ اس نے ہندوستانی سماج کو خصوصاً اسکی کمزوریوں کو گہری نظر سے جانچا اور اچھی طرح پیش کیا ہے۔ یہ آٹھ افسانوں کا مجموعہ ہمارے ادب میں بالکل نئی چیز ہے۔ اس سے قبل بہت کم لوگ نذر الاسلام کو افسانہ نویس سمجھتے ہونگے۔ اس کی اشاعت ان کی معلومات میں اضافہ کرے گی۔ صادق الخیری صاحب کا دیباچہ سیر حاصل اور ٹھوس بنیاد پر قائم ہے۔ قیمت ڈھائی روپے۔

دھنک | علامہ راشد الخیری مرحوم کے صاحبزادے جناب صادق الخیری ایم اے نے ادبی ذوق ورثے میں پایا اور اسے اپنی خداداد ذہانت سے خوب نکھارا ہے۔ دھنک کے سات رنگوں کی طرح سات طبعزاد افسانوں کا یہ مجموعہ نہایت دلکش، رنگین، رومان پرور اور شعریت سے لبریز ہے۔ ہر افسانے میں زندگی اس طرح تڑپتی بلکھاتی اور جادو جگاتی نظر آتی ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں ایک ہلچل پیدا کرکے اپنا ہم آہنگ کئے بغیر نہیں رہتی۔ ہر افسانے کا ہر جملہ محسوس کراتا ہے کہ اسمیں ہماری ہی زندگی کے کسی ایک پہلو کا عکس جلوہ گر ہے۔ صادق صاحب نے روسی افسانہ نگاروں سے خوب متاثر ہو کر اپنے لئے ایک اسلوب پیدا کیا اور اسے بالکل مشرقی سانچے میں ڈھالا ہے جس طرح انگریز ناولسٹ ڈکنز کے ساتھ اس کے بیٹے کا نام زندہ ہے، مولانا مرحوم کے ساتھ صادق کا نام زندہ رہیگا۔ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ قیمت دو روپے۔

رنگ و نور | جناب جلیل احمد قدوائی ہمارے جدید ادب میں سب سے زیادہ قدیم اور

اس اعتبار سے نہایت اہم حیثیت رکھتی ہیں، چونکہ وہ بیک وقت اچھے شاعر اور کامیاب افسانہ نگار ہیں، اس لئے ان کی تحریریں دونوں رنگ لئے نظر آتی ہیں یعنی نثر میں شاعری کا رنگ اور افسانوں میں شاعری ان کی [illegible] معلوم ہوتی ہے جو بہت کم مصنفوں کو نصیب ہوتی ہے۔ "سنگ و لوزن" ان کی نظموں، غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر شعر کیف و سرور کا جادو لئے ہوئے ہے۔ خصوصاً وہ نظمیں جو مختلف حضرات کی وفات پر لکھے گئے ہیں، اپنے اندر اتنی تاثیر رکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اصل درد کی کسک دل میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ غزلیں یا نظمیں بحر و عروض سے ہونے کے باوجود جدت فکر کی حامل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر شعر ذاتی جذبات کے ماتحت لکھا ہے۔ تصنع اور بناوٹ کا رنگ کہیں جھلکتا نہیں دکھاتا۔ آجکل شائع ہونے والے کلام کے مجموعوں کی طرح اگر اشعار کو پھیلا پھیلا کر شائع کیا جاتا تو ضخامت بڑھ گئی ہوتی، اس مجموعے میں ناشر نے طباعتی عیاشی سے احتراز کیا ہے۔ قیمت سوا روپیہ۔

اصنام خیالی | قدوائی صاحب کے اس مجموعے میں سات افسانے ترجمہ شدہ اور کچھ طبع زاد ہیں۔ ترجموں میں ایک ترگنیف کا، ایک مولیاں کا اور باقی [illegible] کے ہیں۔ روس کے ان بلند پایہ مصنفوں کو زندگی کی سچی تصویر کھینچنے میں عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ اور چونکہ قدوائی صاحب [illegible] فطری میلان ایسے ہی افسانوں کی طرف تھا، انہوں نے ان مصنفوں کو [illegible] پسند کیا بلکہ ان کے خیالات کی ترجمانی نہایت کامیابی کے ساتھ کی۔ وہ ان لوگوں [illegible] ہیں جنہوں نے روسی افسانے پہلے پہل اردو میں پیش کئے۔ طبع زاد افسانے بھی ہمارے ادب میں ایک خاص درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ان کا ہر افسانہ ایک [illegible] کے تمام مضمون سے بعض نہایت معنی خیز ہیں۔ مثلاً "تین ملاقاتیں" "ایک خالہ [illegible]" نام جنہیں ان کے دل نے بھلا دیا۔ "بلی کے بچے" "چچیرے بھائی بہن" [illegible] "بھالو" ملا رموزی کے نام۔ جلد سازی کی ستم ظریفی سے اس کتاب میں بیچ کے [illegible] صفحے شامل ہونے رہ گئے۔ پہلے مطالعہ شروع سے آخر تک نہ ہو سکا۔ قیمت [illegible] روپے۔

بے غیرت المیم کے نامور ڈرامہ نگار [illegible] ہیں جن کو اس کی ادبی تخلیقات کے سلسلے میں نوبل پرائز ملا تھا، ا[illegible] لکھے ہیں جن میں ڈرامائی کشمکش کم اور مسائل حیات کی ترجمانی زیادہ [illegible] ہونا ڈرامہ ہے جو فنی اور مادی دونوں اعتبار سے بلند ہے [illegible] اسی کا کامیاب ترجمہ ہے جسے محسن قدوائی صاحب نے اردو کے سا[illegible] اردو ما[illegible] کتاب عورت سے اردو ادب میں دوسری بار پیش کیا ہے۔ [illegible] عصمت و عفت کی نفسیات پر روشنی ڈالتے ہوئے سماج کے مروجہ اصو[illegible] خلاف ایک آواز بلند کی گئی ہے۔ عورت کی حریت کے لئے ایک نیا پہلو [illegible] ہے۔ ترجمہ نہایت کامیاب اور دلکش زبان میں کیا گیا ہے۔ قیمت [illegible] روپے۔

آشوب [illegible]

اس طرح جس [illegible] زندگی کا ایک بہت [illegible] سوچ کر شرم سے گڑی [illegible] طرح گھومتی رہیں اور [illegible] کے بدن میں نوا جیک [illegible] کہا "آخر طاہرہ تم میں [illegible] تو یہی سوچ رہی تھی کہ [illegible] غبار نکال رہی ہے! مگر [illegible] بے شرم تو نہیں تھی، اس [illegible] اس قدر روئی کہ اس کی [illegible] جیسے بھو کی شیرنی کی آ[illegible] فساد کی جڑ حامد ہے، حا[illegible] سوچنے لگی کہ آج جیتی مر[illegible] اس کے رونے کا سبب [illegible] شہلا اس سے، اسی لئے [illegible] ہے۔" ایسے [illegible] بڑ[illegible] وہ اپنے والی [illegible] سکی نہ نکل جائے!

آئندہ اشا[illegible]

1 :- غزل ......
2 :- ادیبا[illegible]
3 :- ہندوستان کی [illegible]
4 :- بھائی بہن (افسا[illegible]
5 :- نادر شاہ کا آخری [illegible]
6 :- برطانیہ کا نظا[illegible]
7 :- حیوان سے انسا[illegible]
8 :- تیسری ملاقات [illegible]
9 :- سوویت ایشیا [illegible]
10 :- رخصت (نظم) [illegible]
11 :- یونیسکو اور [illegible]

...یروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں زبردست مشابہت ہے۔
...ال آبا داور راولپنڈی کو ایک ہی ضمن میں رکھا ہے لیکن
...کو ترجیح دی ہے جو جغرافیائی اعتبار سے گندھارا کے
...ح تھا۔

...فن کا آخری دور گپتا اسکول سے شروع ہوا جس نے
...اور نویں صدی کے درمیان حاصل کی۔ یہ ہندوستانی طرز
...کی ایک ارتقائی صورت تھی۔ اسے دو حصوں میں تقسیم
...دور دوسری سے چھٹی صدی تک رہا۔ اس کے نمونے
...دوسرا دور چھٹی سے آٹھویں صدی تک رہا۔ اس کے
...بلوراہیں ملے ہیں۔ گپتا اسکول نے اپنے طور پر بھی فن
...اثر ڈالا۔ یہ اثر افغانستان میں خصوصاً فوندوکستان (دوا)
...سے زیادہ نمایاں ہے۔

...بیان کیا جا چکا ہے بدھ مت نصف افغانستان پر کم و
...تک پھیلا رہا۔ نصف مغربی ملک پر زردشتی مذہب اور
...اثر جاتے رہیں۔ یہ بات کشان بادشاہوں کے ان سکوں
...جن پر اولیتائی اور ہندوستانی دیوتا اور دیویاں
...ستان گذرنے کے بعد چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں
...لوگوں نے سورج کی پوجا شروع کی۔ ان کی شان دار
...جبل اور کابل کے جانب جنوب لوگا زمیں
...کن نے وٹر شطر کی تاریخ ہندوستانی ادبیات'
...کے حوالے سے درہ خیرخانہ کے آثار قدیمہ کا ذکر کیا ہے۔
...سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی) ان کا بیان ہے کہ وہ آگ
...ی مسلک سیستان کے سارے علاقے پر چھا گیا اور پھر آہستہ
...ہ ہندوستان کے عین دروازے تک پہنچ گیا۔ یہ
...علوم ہوتا ہے کہ کیوں کر سورج کی پوجا جنوبی افغانستان
...ستان میں رائج ہوئی۔

...لام کے وقت کشان قوم کا ایک خاندان کابل پر حکمراں تھا
...ت کا سکہ چل رہا تھا۔ اس کی سلطنت سندھ سے بامیان
...کے جانب جنوب سارے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔
...ریخ میں اس خاندان والوں کو برہمنی شاہان کابل
...کیا ہے۔ ان بادشاہوں اور ہندوستان کے برہمنی
...ں میں بڑا ربط ضبط اور قریبی تعلق تھا۔ لوگا دیں شگانو
...افغانستان کے مذہبی عقائد کا مرکز تھا۔ محمود غزنوی کے بیان کے

مطابق ہندوستان کے بے شمار یاتری ہر سال وہاں پہنچتے تھے پھر افغانستان میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا تو روسائے کابل کا صدر مقام کابل سے منتقل ہو کر پہلے اٹک کے قریب ویہنڈ میں اور پھر اس کے بعد ہندوستان کے وسط میں قائم ہو گیا۔ اس منزل پر پہنچکر قدیم افغانستان و ہند کے مابین ثقافتی تعلقات کا پہلا باب ختم ہو جاتا ہے۔ نئے باب کا آغاز ظہور اسلام کے وقت سے ہوتا ہے۔

اسلامیات کے رائج ہوتے ہی افغانستان و ہندوستان نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ ذہنی انقلاب کے ساتھ ساتھ ثقافت" ادبیات، فنون لطیفہ اور فکر و نظر میں نت نئے پہلو پیدا ہونے لگے۔ ساتویں صدی کے نصف اوّل میں عربوں نے سیستان کو طے کیا اور افغانستان و ہندوستان کی جانب بڑھ گئے۔ لیکن ان کی یہ چڑھائی رتبیل شاہیوں کی رکاوٹوں سے التوا میں پڑ گئی۔ مکران اور سندھ نے مدافعت کی بیکار کوشش کی۔ محمد قاسم ثقفی نے سندھ پر دھاوا بول کر اس کے شہر منصوری، کسدار، کندابیل، بیضا، محفوظا اور ملتان پر اپنا قبضہ جما لیا۔ افغانستان میں اسلام خاص شہر کابل تک رائج ہو گیا۔ بنی امیہ کے زمانہ میں اہل عرب سندھ سے آگے قدم نہ بڑھا سکے تھے۔ عہد عباسیہ میں خلیفہ معتمد نے ہندوستان کے پہلے اسلامی صوبے کی عنان حکومت یعقوب بن لیث سفاری کے ہاتھ میں دے دی۔

اس وقت جبکہ اسلام نے ایک طرف افغانستان کے صرف ایک حصے تک اور دوسری طرف مشکل ہندوستان کی سرحد تک رسائی حاصل کی تھی ہم دیکھتے ہیں کہ افغانستان اور اسلامی ہندوستان کے مابین براہ راست کسی قسم کے ثقافتی تعلقات قائم نہیں ہو سکے تھے بلکہ یہ تعلق خلافت بغداد کی معرفت پیدا ہوا تھا۔ افغانی خاندان برامکہ کے افراد جو بلخ کے آتش پرستوں کی اولاد تھے، خلفائے بغداد کے وزیر تھے۔ اسی خاندان کے وسیلے سے ہندوستان اور دنیائے عرب کے مابین ثقافتی تعلقات پیدا ہوئے۔ انہی نے علم الادویات و فلکیات کے مطالعے کے لئے طالب علموں کو ہندوستان بھیجنے کی تجویز پیش کی اور انہی نے سائنسی کارناموں کو سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے ہندوستانی ارباب علم کو بغداد آنے کی دعوت دی۔

لیکن عربوں کے اس اثر و رسوخ کے باوجود اسلام سندھ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ صورت حال تقریباً دو سو سال تک قائم رہی حتی کہ خاندان غزنوی کو افغانستان میں عروج حاصل ہوا۔ اس خاندان کے بادشاہوں خصوصاً محمود غزنوی کے حملوں کے ساتھ اسلام کے مذہبی اور ثقافتی اثرات خاص قلب ہندوستان تک پھیلتے چلے گئے۔ شاہان غزنی نے تاریخ ہند میں روشن دار

ابواب کا اضافہ کیا۔ ان میں سے ایک مذہبی تھا اور دوسرا ادبی۔ پہلا جہاں سے فاضل علمائے کرام کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور دوسرا یہاں کے ادبا کی سرگرمیوں کا حاصل۔ فضلائے افغانستان میں سے جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں آباد ہو گئے، ہجویری اور جلالی خاندانوں کے کچھ افراد خاص اہمیت رکھتے ہیں جنہوں نے شاہ مسعود کے عہد حکومت میں ہجرت کی تھی۔ ہجویر اور جلاب غزنی کے دو علاقے تھے۔ علی ابن عثمان ہجویری میں لاہور پہنچے۔ یہ اس خاندان کے بڑے اہم رکن تھے۔ انہوں نے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کی اور اپنے مقلدین پر تصوف کا رنگ جمایا۔ ان کی تصانیف میں سے چند قابل ذکر ہیں مثلاً منہاج الدین البیان الاہل العیان اسرار الخرق والمعنیات، کاشف الاسرار، الرعایات بحقوق اللہ۔ اور آخر میں کاشف المحجوب جو ان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے۔ ہندوستان میں تمام عمر اپنے خیالات کی روحانی تبلیغ کرتے رہنے کے بعد میں ان کی وفات ہو گئی۔ سلطان مسعود پہلا شہنشاہ تھا جس نے غزنی جا کر اس فاضل اجل کے مقبرے کی زیارت کی اور اس پر ایک شاندار درگاہ تعمیر کرا دی۔

ہندوستان میں ادبی دور کا آغاز سلطان محمود کے زمانے سے ہوا۔ محمود کے ساتھ یا اس کے بعد افغان شاعروں اور ادیبوں کا ایک گروہ ہندوستان آیا۔ ان میں سے فرخی، انصاری، اسجدی، عوفی اور بیرونی قابل ذکر ہیں۔ ان کے دم سے ہندوستان میں ادبی ذوق کو نشوونما حاصل ہوئی۔ خراسان کی زبان "دری" میں جو عام طور پر فارسی کہلاتی تھی ایک خاص طرز شاعری رائج تھا جس کی نشاۃ الثانیہ کے لئے غزنی ایک اہم مرکز بن گیا۔ یہ زبان شمال مغربی ہندوستان میں پھیلی اور بہت جلد مقبول عوام ہوئی۔ محمود کی سخن پروری اور ادب نوازی کے سلسلے میں گردیزی نے ایک دلچسپ حکایت بیان کی ہے۔ "طویل محاصرے کے بعد قلعہ کالنجار کے لوگوں نے محمود کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ قلعہ کے محافظ راجہ نندا نے اس محاصرے اور طویل مدافعت کو موضوع بناتے ہوئے ایک عمدہ نظم موزوں کی اور اس کی ایک نقل سلطان کے پاس بھیجی۔ درباری شعرا نے ایک زبان ہو کر اعتراف کیا کہ فصاحت و ترنم کے لحاظ سے کوئی دوسری نظم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ بخشش کے طور پر سلطان محمود نے راجہ مذکور کو پندرہ قلعوں کا امیر بنا دیا۔" اس طرح سلاطین غزنی نے ہندوستانی شعرا کی ہمت افزائی کی، ان شاعروں کی بھی جو ہندوستانی بولیوں میں مشق سخن کرتے تھے۔ اس کی فیاضی نے عوام میں ایک ادبی ذوق پیدا کر دیا۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی کے شروع میں ادیب اور

سائنس داں افغانستان سے ہندوستان آئے۔ ...
رہنے کے باعث انہیں ہندوستان کی زبان، طور طریق ...
اور رسم و رواج کا بخوبی علم ہو گیا۔ چنانچہ ہندوستان ...
یا افغانستان واپس جانے کے بعد انہوں نے مفید کتا...
ان میں سے صرف بیرونی، گردیزی اور ایک صدی ...
ذکر کروں گا۔

خوارزم جیسے مختصر سے گاؤں کے رہنے وا...
ہندوستان کا خوب مطالعہ کیا اور اس کی روح کو ...
زیادہ سمجھا۔ اس نے جو خدمت اس ملک کے لئے کی ...
ہے۔ دربار غزنی سے متعلق ہونے کے باعث اس نے ...
میں مطالعے کی غرض سے ہندوستان کا سفر کیا۔ اس ...
سیکھی اور ہندوستان کے مذہبی، سائنسی اور ثقافتی نظ...
واقفیت میں اضافہ کیا۔ غزنی واپس جا کر میں ...
نامی کتاب لکھی۔ ہندوستان اور افغانستان کے ثقا...
میں ابوریحان البیرونی اور اس کی قابل قدر کتاب کو ...
ہے اس نے انقلابی تغیرات کی پیشین گوئی کی تھی ...
کیا کہ دنیائے اسلام کو ہندوستان سے روشنا...
بہت سی عمدہ کتابیں عربی سے سنسکرت میں ترجمہ ...
"مبادی اقلیدس" سب سے زیادہ قابل ذکر ...
کی سائنس کو ترقی دینے میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ ...
مورخ اعظم گردیزی نے ہندوستان کے ہندو...
تعلیم وغیرہ پر بہت کچھ لکھا۔

غوریوں کے بعد حکومت کرنے والے بادش...
کہلاتے تھے ہندوستان کی ثقافت، تعلیم اور فن ...
حصہ لیا۔ انہوں نے افغانی رسم و رواج اور خیالات ...
میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے تعمیری خاکوں ...
میں گردیزی فن تعمیر سے بہت کچھ اثر لیا گیا ...
میں نے البیرونی اور گردیزی کا ذکر کیا ہے ...
میں طبقات ناصری کے مصنف منہاج السرا...
جامع الحکایات کے مصنف عوفی کا ذکر کروں گا ...
کے دربار میں رہتے ہوئے ان دو فاضل مصنف...
تیار کیں نیز افغانستان اور ہندوستان کی ...

...یسی خدمات انجام دیں جن کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ طبقات ...ا کی تحسین کارنامہ ہے جس میں عام تاریخی حالات خصوصاً ...ری خاندانوں کے تاریخی واقعات درج ہیں۔ لبوب الالباب ...فغانی شعرا کے حالات زندگی کا مجموعہ ہونے کے باعث مشہور ...کایات میں قصے کہانیوں کے انداز میں ایسے رسم و رواج ...ت کا ذکر کیا ہے جن کے مطالعہ سے افغانیوں اور ہندوستانیوں ...بقوں کی زندگی پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ بلاشبہ یہ اہم کارنامہ ...لکوں کے لئے ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔

...کے بعد چنگیز خاں اور تیمور لنگ کے حملے شروع ہوئے موخرالذکر ...ں نے دو سلطنتیں قائم کیں اور دو خاندان پیدا کئے۔ افغانی ...وری کہلایا اور ہندوستانی خاندان کو "مغل" کہا گیا۔ اس ...دونوں ملکوں میں ادب وفنون کے نشاہ الثانیہ کا ایک نیا ...ہے۔ خراسان یا افغانستان کا ایک ادارہ ہرات میں قائم ...دروں اور خوشنویسوں کے لئے مرکز بن گیا۔ چنانچہ بہزاد ...سلطان محمد جیسے حسن کاروں نے اپنے عہد کے ذوق وشوق ...ور جانات کی ترجمانی کی ہے۔ اسی طرح ہندوستان بھی خوبصورت ...ذیب طرز تعمیر اور ایرانی ادبیات کا خاص مرکز بن گیا۔ زبان ...ن محمود ہی کے عہد میں افغان شعرا کے ذریعہ رائج ہو گئی تھی ...نی ماحول میں ترقی کرنے لگی اور اس نے ایک خاص ہندوستانی ...ر لیا۔ اس طرز نے ایسی مقبولیت حاصل کی کہ خود افغانستان ...حاصل کرکے وہاں کے لوگوں میں پسند کیا جانے لگا بہت سے ...عراور ادیب مغلوں کے دربار میں جمع رہے اور انھوں نے ...اور تاریخ وفنون کے ضمن میں بڑی خدمات پیش کیں۔ چونکہ ...ادر کارنامے بھی خاص توجہ کے مستحق ہیں اس لئے میں برسبیل تذکرہ ...ستی نظام الدین احمد ہراوی کا ذکر کروں گا جس نے طبقات اکبری ...لکھ کر تاریخ میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔

...س دور کے بعد افغانستان وہند کے مابین ثقافتی تعلقات میں ...ہونے لگی لیکن پوری طرح اس کا خاتمہ کبھی نہیں ہوا۔ دونوں ...اپنی جگہ ترقی کرتے رہے چنانچہ آج ہم نہایت مسرت وشادمانی ...کہہ سکتے ہیں کہ دونوں ملکوں کے ادبی تاریخی اور علمی ادارے ...ر کا پتہ دیتے ہیں کہ افغانستان اور ہند کے مابین ثقافتی تعلقات ...نیا دور شروع ہونے والا ہے۔

اس مختصر خاکے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان وہند کے پڑوسی ملک نہ صرف ظہور اسلام سے پہلے بلکہ قرن وسطیٰ اور موجودہ زمانے میں بھی آپس میں ثقافتی تعلقات قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

اب ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کو بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی سے کس حد تک فائدہ پہونچا ہے۔ کیونکہ یہی ایک ادارہ ہے جو ہندوستان، ایشیا بلکہ سارے مشرق میں تاریخی، ادبی اور علمی موضوعات پر چھان بین کرتا رہتا ہے۔ وہ نور جو سر ولیم جونز نے ۱۷۸۴ء میں چمکایا تھا، صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایشیا اور مشرق کے دوسرے ملکوں میں بھی روشنی پھیلا رہا ہے۔ اس کی جوت خصوصیت کے ساتھ افغانستان میں پھیل رہی ہے۔

بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی دنیا بھر میں پہلی تاریخی، ادبی اور علمی سوسائٹی ہے جس نے ہمارے ملک کے حالات کی چھان بین کی اور بتایا کہ وسطی ایشیا کے بین دروازے پر ہندوستان، چین اور ایران کے درمیان گھری ہوئی حالت میں اس کی تاریخی جغرافیائی اور ادبی حیثیت کس درجہ اہم ہے۔ اس ادارے نے تعصبات سے الگ ہو کر بالکل غیر جانبدارانہ انداز میں لائق اعتماد اور ٹھوس کام کیا ہے۔ چارلس میسن پہلا عالم ہے جس نے آج سے سو سال پہلے قدیم افغانی سکے جمع کرنے شروع کئے تھے۔ اس کا مقالہ بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کیا ہے۔ چارلس میسن اور جیمز پرنسپ پہلے دو عالم ہیں جنھوں نے خروشتی حروف ابجد کا مطالعہ شروع کیا۔ انھوں نے افغانستان اور ہندوستان کے خروشتی خط کے کتبات کو پڑھنے کی کوشش کی۔ بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک اور فاضل رکن پروفیسر ڈبلیو ایچ ایچ ولسن نے ان عالموں کے مقالات کو مربوط و مرتب کیا اور اپنی تحقیقات کے ساتھ ملا کر شائع کر دیا۔ اس کا نام "آریانہ اینٹیکا" رکھا جس کا ذکر میں شروع میں کر چکا ہوں۔ بعد ازاں دوسرے انگریزی عالم مثلاً جیرارڈ، ڈیبیٹ ہونگبرگر، تالبوٹ، ڈبلیو سمپسن اور میلا نیجیکے بعد دیگرے اسی قسم کی تحقیقات میں اضافہ کرتے رہے اور بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی انکے نتائج افکار وتحقیقات کو برابر شائع کرتی رہی۔ ان مطبوعات نے بعض مستشرقی اداروں کی توجہ افغانستان کی طرف مبذول کرائی۔ سب سے پہلے فرانس میں مسٹر رونیتی اور مسٹر جیکیٹ نے باختری سکوں پر اپنی تحقیق کا حاصل پیش کیا اسکے بعد جرمنی اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں تحقیقات و تصنیفات کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ میں اس مختصر مضمون میں ان مصنفوں اور ان مقالوں کی مکمل فہرست پیش نہیں کر سکتا جو افغانستان پر لکھے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات ثقافتی تاریخی اور ادبی اعتبار سے افغانستان اور ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی ثقافت کیلئے قابل قدر ہیں۔

(مجلہ "افغانستان" سے ماخوذ)

بہار کے دیہاتی گیت

شکیلہ اختر

دیہاتی شاعری آزاد آب و ہوا میں پروان چڑھتی ہے۔ بہار کے دیہاتی خوشی و غم فکر و مسرت کی جو کیفیتیں اپنے دھڑکتے ہوئے دلوں میں محسوس کرتے ہیں، وہی جذبات ان کی زبان پر ٹوٹے پھوٹے جملوں کی شکل میں قافیہ اور ردیف کی کڑی پابندیوں سے عموماً آزاد گیت کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ دیہاتی شاعر صرف اپنے کانوں میں بھلے لگنے والے ترنم کو جانتے ہیں اور بس۔ اسی سے خوش ہو لیتے ہیں۔ یادگار واقعات، جذبات کی تیزی اور محسوسات کی شدت کو محفوظ رکھنے کے لئے ان کے محدود دائرے میں کوئی اور ادبی صورت نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری ان کی اپنی روزمرہ زندگی کی طرح بہت ہی سادہ اور بے تکلف الفاظ میں ہوتی ہے۔ ان دیہاتی گیتوں کے بنانے والے زیادہ تر ان پڑھ اور گنوار مرد اور عورتیں ہوتی ہیں لیکن جہالت اور گنوارپن میں ڈوبے ہوئے تعلیم و علم سے ناواقف ہونے پر بھی ان کے گیتوں کا نمایاں کمال اور انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ مہذب شاعری کے پر تکلف گلدستوں کے سامنے ان کا دامن ہر سال ہر موسم اور ہر روز کھلنے والے ان گنت قسم کے پھولوں سے بھرا پڑا ہے۔ آئے دن کے خیالات، چھوٹی چھوٹی باتیں، شادی بیاہ، ملنے جلنے، غمی و خوشی کے قصے، گذرے ہوئے واقعات اور بدلتے ہوئے رُت کی کیفیتیں، ان کی شاعری میں آزاد، انوکھی جدت اور مٹھاس کے ساتھ موجود ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو کے گانے ان کے یہاں اتنی کثرت سے ملتے ہیں کہ اگر صرف شادی ہی کے گیت لکھے جائیں تو ایک داستان سے کم نہ ہوں۔ بڑی خوبصورتی سے ایک ایک گھڑی کی گیتیں اپنی جداگانہ حیثیت کے ساتھ موزوں کی گئی ہیں اور یہ نمایاں حسن سوائے دیہاتی شاعری کے اور کہیں نہیں ملے گا۔ شادی بیاہ میں ساری رسموں کے مخصوص ناموں کے ساتھ ساتھ گیتیں منزل بمنزل اپنی امتیازی شان سے آگے بڑھتی جاتی ہیں۔ شہانے گیت لڑکے لڑکی اور اس کے عزیزوں کے دلی جذبات کے آئینہ دار ہوتے ہیں جو کہ اور ٹونے دلہن اور دولہا کو محبت اور پیار میں جکڑ دینے والی مضبوط اور فولادی زنجیر سمجھے جاتے ہیں۔ سہاگ آنے والی خوشیوں کا پیغام بر ہے، جھومر پر مسرت جذبات کی گہرائیوں کا رسیلا اظہار ہے۔ جھومر کو ہم دیہاتیوں کی کامیاب غزلیں کہہ سکتے ہیں۔ گیتوں کی دوسری قسموں سے زیادہ جھومر میں شاعری کا عروج ترنم اور تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے۔ کہبر کی مخصوص گیتیں اور رخصتی کے دلسوز گانے اس کے علاوہ ہیں۔ اتنے قسم کی آزاد شاعری اتنے رسیلے دلربا بول کے ساتھ ہمیں اور کہیں نہ مل سکے گی۔ شہانے گیت میں شادی ہونے سے پہلے لڑکی اور اس کے باپ کی دلی کیفیتوں کی تھوڑی سی جھلک دیکھئے۔

(۱) "آبا جُوا، کھیلن تم کہاں جاؤ گے جی؟"
بیٹی جوا کھیلن تمہرے سسُرے جائینگے جی
آبا جُوا میں کس کو تم ہارو گے جی؟
بیٹی جُوا میں تم ہی کو ہاریں گے جی
آبا مال مُلک سب ہاری جاتیو جی
آبا لچھمی دھیا کیسے ہارو گے جی
بیٹی مال ملک بڑا لچھمی ہے جی
بیٹی لچھمی دھیا بڑی بھاری ہے جی

لڑکی اپنے باپ سے کہتی ہے کہ میرے ابا تم جوا کھیلنے کہاں جاؤ گے؟ اس کے جواب میں اس کا باپ کہتا ہے کہ "میں تمہارے سُسرال جوا کھیلنے جاؤں گا" اس پر وہ لڑکی سوال کرتی ہے کہ "اگر تم جُوا میں ہار گئے تو کیا کرو گے؟ اور کس چیز کو ہارو گے"؟ باپ جواب دیتا ہے کہ "جوا میں ہم تم کو ہی ہار دیں گے"۔ بچاری لڑکی اس کی محبت کا واسطہ دے کر کہتی ہے کہ "اے میرے باپ تم مال اور ملک سب ہار جانا لیکن اتنی دلاری بیٹی کو کیسے ہارو گے"؟ اس کا باپ کہتا ہے کہ "بیٹی مال و ملک عزیز تو ہے لیکن عزیز ترین کنواری بیٹی اپنے باپ پر بہت بھاری ہوتی ہے جس کا ہار ہی جانا بہتر ہے"

۲

دروازے پر بولی سُنایا لاڈو میں تیرے من کو آیا
تمرے آبا نے بھیجا آ بابا نے بھیجا پروانہ لاڈو پروانہ لاڈو
میں تیرے من کو آیا

"میری لاڈو۔ تو نے دروازے پر اپنی بولی سنا کر مجھ کو اپنے ملنے کا مشتاق بنایا اسی لئے میں تیرے من کو آیا ہوں۔ اور اس کے علاوہ تمہارے ابا نے بھی مجھ کو پروانہ بھیج کر بلایا ہے — اور اب میں تیرے من کو آیا ہوں۔

۳

ٹیکہ جولائے مُنّیا نہیں لائے کہو جانبسی کہ اب لاڈو رُوٹھیں

لاڈو جوڑ دھٹیں پلنگ چڑھی بیٹھیں —— کہو جا بیٹے سے

وہ جاکر بیٹے سے کہو کہ اس نے دلہن کے لئے جو ٹیکہ لیا ہے اس کا موتی نہیں لایا۔ اسی لئے لاڈو روٹھی ہوئی ہیں۔ ورنہ بیٹے سے جاکر کہو کہ لاڈو روٹھ کر پلنگ پہ بیٹھی ہوئی ہیں۔"

—— ۴ ——

سر بنے کے سونے کا سہرا لڑیاں لگے ہیرے لال

بنے کو میں جانے نہ دوں گی

ساس جو گنیاں کے دیس بنے کو میں جانے نہ دوں گی

"میرے بنے کے سر پر سونے کا سہرا بندھا ہے اب ایسے ہیرے کی لڑیاں لگے ہوئے اپنے لال بنے کو میں اس کی جادوگرنی ساس کے دیس میں کبھی جانے نہ دوں گی۔"

شادی کے موقعہ پر یہ گیت لڑکے کی طرف سے گایا جاتا ہے۔

—— ۵ ——

نسوانے گیت کا ایک اور لطیف نمونہ دیکھئے شرمیلی دلہن اپنے شوہر سے ملنا چاہتی مگر وہ جھجک رہی ہے ۔

"ارے میں کیسے آؤں نئے دولہے پائل بولے جی

پائل کی آواز سے میرے داداجاگیں جی دادا سکھیا جاگیں جی

ارے میں کیسے آؤں نئے دولہے پائل بولے جی

پائل کو اتار کے تم دھیرے آؤ جی ہولے ہولے آؤ جی

ارے میں کیسے آؤں یہاں بدن پائل بولے جی

"اے نئے دولہے میں تم سے ملنے کو کیسے آؤں۔ میرا پائل تو چلنے میں جھنا جھن بولنے لگتا ہے۔ میرے پاؤں میں جو پائل ہے اس کے جھنکنے سے میرے دادا جاگ اٹھیں گے۔ نئے دولہے اب میں کیسے آؤں —— ؟ اس کا دولہا کہتا ہے کہ آسان بات ہے پائل کو اتار کر آہستہ آہستہ چلی آؤ" لیکن دلہن اصرار کرتی ہے کہ میں آ ہی نہیں سکتی میرا پائل بہت بول رہا ہے۔"

دیہاتی شاعری کی ان تھوڑی سی مثالوں سے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس گنوار زبان میں جذبات کا کتنا خوبصورت اور دلآویز بہاؤ ہے۔

جھومر میں لفظوں کا ترنم اور لطیف اشارے اور کہیں کہیں پر تو خیال ایک عجیب حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ جھومر میں ہمیں تسلسل خیال کے ساتھ تخیل کی بلند پروازیاں بھی ملتی ہیں اور شوق کی بے قراریاں بھی۔

جھومر —— ۶ ——

پردیسیا سلا بیرن بھے رے میرا کیسے کہ ملنا ہوئے

چلو سیاں چلو باگوں میں ملنا ہوئے

ارے ہوواں تو مالی مالن جاگے رے میرا ہوواں بھی نہ ملنا ہوئے

"دشمن پردیسیا ہوا ہے چلی جا رہی ہے اپنے ساجن سے میرا ملنا کیسے ہو۔ میرے سیاں چلو باغ میں شاید وہیں کسی طرح ملنا نصیب ہو جائے۔ لیکن افسوس وہاں باغ میں بھی تو مالی اور مالن جاگ رہے ہیں وہاں بھی تو ہمارا ملنا نہیں ہو سکتا ہے۔"

—— ۷ ——

"چھیل ندیا نسی ڈوبت ناہیں۔ پرائی تریا ہاتھ آوت ناہیں

گھونگھٹ والی گھونگھٹ کھولو۔ گھونگھٹ لانبی بندیا چمکت ناہیں

لگائے نینا جیرا نت بائیں۔ چھیل ندیا نسی ڈوبت ناہیں"

"جس طرح کم پانی میں نسی نہیں ڈوبتی ہے اسی طرح پرائی عورت ہاتھ نہیں آسکتی۔ اے گھونگھٹ والی گھونگھٹ کھولو۔ تمہارا آنچل اتنا لمبا کھنچا ہوا ہے کہ تمہاری پیشانی پر لگی ہوئی بندیا بھی نہیں چمکتی ہے۔ جب سے مجھ کو تم سے محبت ہوئی ہے کہیں میرا دل لگتا ہی نہیں ہے"

ایک اور —— ۸ ——

کنکر دھیرے مارو مہاراجا ۔ کنکر لگنے کا کچھ ڈر نا ہیں

چندر بھینگ جئی ہیں مہاراجا ۔ کنکر دھیرے مارو مہاراجا

چندر بھیگنے کا کچھ ڈر ناہیں ساجن دیکھ پائیں مور مہاراجا

"میرے مہاراج دیکھو کنکر بہت آہستہ سے مارو گے۔ ہم کو کنکر کے لگنے کا تو کچھ ڈر نہیں ہے مگر میری ساری بھیگ جائے گی۔ اے میرے مہاراجا ساری بھیگنے کا بھی ہم کو ڈر نہیں پڑا ہے مگر اس کا خوف ہے کہ میری بھیگی ہوئی ساری کہیں میرے شوہر نہ دیکھ لیں اس لئے اے میرے مہاراجہ تم کنکر بہت آہستہ سے مارو —— (عاشق محبوب)

ان دیہاتی گیتوں میں اردو شاعری کی طرح کہیں کہیں قافیہ اور ردیف کا بھی خیال کیا گیا ہے۔ دیہاتی شاعری میں محبت اور ایثار کے جذبات بھی اجاگر ہیں۔

—— ۹ ——

جھومر سانولا رے تیرے لئے بدنام۔ سانولا رے

جیسے کوکت بن بن کی کوئلیا ویسے کر گوں تیرے ساتھ سانولا رے"

اور "تیرے کرتوان سیاں سبھی ہیو لے بگلا ہو را ما۔ تیرے کرتواں"

"اے میرے ساجن میں تو صرف تیرے لئے بدنام ہوئی ہوں دیکھو جس بن میں کوئل کوک رہی ہے ویسے ہی میں بھی تیرے ساتھ ہر ہر جگہ کوکنے کو ساری مصیبتیں سہنے کو تیار ہوں۔"

ہمیں ان گیتوں میں کہیں کہیں لطیف جذبات سلجھی ہوئی زبان بھی نظر آتی ہیں اور کسی جگہ ٹھیٹھ زبان کا مکمل حسن۔

——— ۱۰ ———

راتے کہیے سیاں چوڑیا منگا دے، چوڑیا جھنر جھنر کریلا ہو بالما

رتیا شُن شُن کریلا ہو بالما، جیرا دھڑکتہ لاگے لا ہو بالما

"رات وہ ہیں کہہ رہی تھی کہ سیاں چوڑی منگا دیے، وہی چوڑی جو کلائیوں میں جھن جھن کرتی ہے میرے بالم۔ رات کیسی خاموش ہے میرے بالم ایسی خاموشی جس کے سناٹے میں صرف میرا دل ہی زور زور سے دھڑکتا رہتا ہے"———

"بدیسیا" ایک بے بس اور مایوس جوانی کی نڈھال مگر بولتی ہوئی تصویر ہے بہار کے دیہاتی گیتوں میں یہ ایک مخصوص گیت ہے، یہ چیت سے میاکھ تک گایا جاتا ہے اور یہ گانا بہت ہی رومانی سمجھا جاتا ہے۔

——— ۱۱ ———

"آموان جو جھڑی کے بھین لگت لیئی ٹیکو رَ وا

سے تیؤ پیارا ہی پیارا ہی رہے بدیسیا

ہمرا سے چھوٹی چھوٹی بھیلن لرکو ریا

سے ہمرا کے دن بیتے رُوئی رسے بدیسیا

سے ٹُھنیاں تُوسے لالمبی کیس سے بدیسیا"

"آم کا پھل لگ کر جھڑ گیا اور پھر دوبارہ اس میں ٹیکورا بھی لگ گیا ہے۔ دنوں پر دن بیتتے چلے گئے مگر تب بھی میرا پیارا ہی کارا ہی ہے رے بدیسی۔ ہم سے چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بچوں کی ماں بن گئی ہیں۔ لیکن ایک ہم بدنصیب ہیں کہ میرا دن روتے ہی بیتتا ہے۔ اے بدیسی۔ میرے لمبے بال کس کام کے جو حزن و ملال میں صرف زمین ہی پر لوٹتے رہے ہیں"

ایک اور خالص بہار کا دیہاتی گیت سن لیجئے:۔

۱۲— "مَیا گے مَیا دَاماد اِل ہُوٗ ۔ اِلی کے سُور پر بیٹھیل ہُوٗ۔

حُقہ تماکُ مانگت ہُوٗ ۔ چلیا منگا دے سکتے جاون

چندری رنگا دے لچکتے جاوُں"

"ارے ماں رے ماں تیرا داماد آیا ہے جو املی کی جڑ پر بیٹھا ہوا ہے وہ حقہ اور تمباکو پینے کو مانگ رہا ہے۔ ارے ماں مجھ کو چولی منگا دے جس کو پہن کے مسکاتی ہوئی میں وہاں پر جاؤں جلدی سے چندری رنگا دے جس کو پہن کر لچکتی ہوئی میں اس کے پاس جاؤں"

غربت اور بیچارگی کا کتنا نمایاں اظہار ہے اس گیت میں بھیگی ہوئی آنکھوں کے سامنے کبھی کبھی موہوم سے خواب جھلک آتے ہیں مگر سسکتی ہوئی مضمحل روح ایک غمناک آہ کے ساتھ ان کے آنسوؤں کو پونچھ دیتی ہے۔

——— ۱۳ ———

"بابا مورا اُرہی تن، بگیا لگئی تن

ہم پھلوا لوڑیے جیتی نو ہیے یار گوئیاں

پھلوا لوڑھی اِیہے لوڑھی بھرتی چنگریا

بلموان پر چڑھیتی نو ہیے یار گوئیاں

"اگر میرا باپ زندہ رہتا تو وہ ایک باغ لگاتا اور ہم وہاں پھول چُننے کے لئے جاتے سنتی ہو میری سہیلی اور سکھیاں۔ ہم اتنا پھول چنتے کہ جس سے چنگریاں بھر جاتیں اور پھر ہم وہ سارے پھول اپنے بالم پر لاکر چڑھا دیتے"

حسرت و یاس کے کتنے شعلے ان گیتوں میں بھر دیے گئے ہیں غیر مانوس زبان کے ہوتے ہوئے بھی ان گیتوں کے نشتر دلوں میں چرکے لگا دیتے ہیں۔ بدیسیا چیت اور بسنت بھی بہار کے خاص گیتوں میں سے ہے۔

——— ۱۴ ———

"کَوُن بن کُو کت کوئیلا ہو راما۔ کَوُن بن کُو کت"

"یہ کوئل کس جنگل میں کوک رہی ہے۔ رام جس کی آواز سے میرے دل میں بھی ہوک اُٹھ رہی ہے"

اور

——— ۱۵ ———

"چیت ماسا چُندری رنگا دے ہو راما، چیت ماسا چندری"

میرے محبوب چیت کا جنوں خیز موسم آگیا ہے ہم کو چندری رنگا دو کہ ہم اس رنگ رلیوں میں زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں———

بڑھتے ہوئے موسم کے سنگم پر گلی گلی میں بسنت اور چیت کے نغمے کوئل اور پپیہے کے مضراب سے ہم آہنگ ہو کر کیف و سرود برساتے ہیں۔

بہار کی بھوجپوری بولی کا گیت بھی سن لیجئے جن کے اتار و چڑھاؤ زیر و بم اور اظہار میں کتنی نغمگی ہے۔

——— ۱۶ ———

مُسک میں رُواکے باٹے ہم تو بیٹھی لی بکرا ہے کُودی بیچے ہُولا جھین کے منوان ہمار ہمکو کا معلوم تھا دل کے کے توں کرباد کا۔ ہم تو اتنا جانتی تو پیت نا کرتی تہار"

"اے میرے محبوب ہم تمہارے عشق میں بہت زیادہ بیقرار ہیں تم نے میرا دل چھین کر ہم کو بیخود بنا دیا ہے ہم کو کیا خبر تھی کہ تم میرا دل لیکر ہم سے اس طرح بیوفائی کرو گے۔ اگر ہم کو یہ معلوم ہوتا تو ہم کبھی بھی تم سے محبت نہ کرتے"

۱؎ بہار میں آم کی کیری کو "ٹیکورا" کہتے ہیں۔ ۲؎ محبوب

آسٹریلیا کی مشین اور دنیا کی غذا کا مسئلہ

جیسے فصل پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے زمین تیار کرلی جائے اسی طرح کاشتکار طبقہ کو امداد باہمی کے اصول پر مشترکہ مشینوں کے ذریعہ کام کرنے پر بھی تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس اسکیم میں جو مفید امکانات پوشیدہ ہیں ان کی کوئی حد و انتہا نہیں۔"

نیو ساؤتھ ویلز کی فارم میکنائزیشن (مشین کے ذریعہ زراعت کرنے کی) اسکیم کے اکزیکٹو افسر مسٹر لیونرڈ جڈ نے اس تحریک کی ——— جو آسٹریلیا میں کافی ترقی کر چکی ہے اور جس میں ہندوستان کیلئے بھی کافی دلچسپی کا سامان ہے، دشواریوں کا خلاصہ اور اس کے مستقبل کے متعلق اپنا اندازہ مذکورہ بالا الفاظ میں پیش کیا ہے۔

مسٹر جڈ کی خوش امیدی بیجا نہیں ہے۔ نیو ساؤتھ ویلز کے بعض ساحلی ضلعوں کے ان علاقوں کی پیداوار جہاں کاشت ہوتی ہے اس اسکیم کے ذریعہ انفرادی کاشت کے مقابلہ میں سو فیصدی تک بڑھ گئی ہے اور یہ محض اسلئے ممکن ہو سکا کہ صحیح وقت پر مشینری فراہم کر دی گئی تھی۔ دودھ اور اس سے تیار ہونے والی اشیاء میں جو کمی ہوئی تھی وہ بہت کچھ اسی اسکیم کی وجہ سے خطرناک صورت اختیار کرنے سے رک گئی۔ اور یہ کامیابی ایسے حالات میں ہوئی جب ملک کے ایک بڑے حصہ میں قحط کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ یہ وہی دو سالہ قحط تھا جو ابھی حال میں دور ہوا ہے۔

مسٹر جڈ کا خیال ہے کہ "آگے چلکر پورے ملک میں اس اسکیم کے ذریعہ کاشتکاری کے طریقوں اور کاموں میں اہم ترقی ہوگی جس سے موسمی پیداوار بڑھیگی اور اس طرح ہی صنعت و حرفت کی خوشحالی میں اضافہ ہوگا"

مسٹر جڈ نیو ساؤتھ ویلز کے محکمۂ زراعت میں ایک بڑے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ انہیں سالہا سال کا عملی تجربہ ہے کیونکہ وہ گیہوں پیدا کرنے والے ضلعوں میں سے اس ضلعوں میں جہاں دودھ اور اس سے تیار ہونے والی چیزوں کا کاروبار ہوتا ہے بطور افسر رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہاکسبری ایگریکلچرل کالج اور ونسور اکسپریمنٹ فارم میں فارم مینجر بھی رہ چکے ہیں جہاں انہیں اس طرح کی چیزوں سے پوری واقفیت ہے۔

اس اسکیم کے مگر جنگ کوئی ایسی چیز تو نہیں ہو سکتی اسلئے کہ آسٹریلیا۔ جس کی کل آبادی ستر لاکھ ہے۔ جنگ کے زمانے میں علاقہ بحرالکاہل کے ایک کروڑ بیس لاکھ انسانوں کو غذا فراہم کرنے کی ذمہ داری لے چکا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ دیہاتوں میں سیکھے ہوئے اور تجربہ کار کام کرنے والوں کی بیحد کمی تھی کیونکہ لوگ لڑائی میں بھرتی ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ نئی مشینیں اور فالتو پرزے بھی نایاب ہو رہے تھے۔ اس سب کے باوجود یہ اسکیم کچھ ایسی کامیاب ہوئی کہ اب اس کا جاری رہنا لازمی ہے۔ ماہرین یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اگر آسٹریلیا کو سمندر پار کی منڈیوں میں تجارتی مقابلہ اور برابری کرنی ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ابتدائی اور اہم پیداوار کے سلسلہ میں بالکل مشینوں سے کام لینا شروع کر دے۔ اور آسٹریلیا کو مقابلہ بہر حال کرنا ہی پڑے گا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آسٹریلیا کی برآمد کا تقریباً ۸۰ فیصدی جسکی اوسط مالیت ڈیڑھ ارب روپیہ سالانہ آتی ہے۔ زرعی صنعتوں کی پیداوار ہے۔ آسٹریلیا کے فارموں کی کل پیداوار کا تقریباً چالیس فیصدی باہر بھیجا جاتا ہے۔

امداد باہمی کا طریقہ

مسٹر جیمس مارس باؤن (کوس لینڈ) صدر آسٹریلین امریکن اسوسی ایشن نے حال ہی میں اخبارات کو یہ اطلاع دی ہے کہ ان کے پاس محکمہ جنگ کے پندرہ سو آدمیوں کی فہرست ہے جو اپنے وطنی ضلع میں واپس آنا چاہتے ہیں مگر وہ چاہتے ہیں کہ انہیں نوآبادکاری کی کوئی اسکیم دی جائے اور وہ اپنے طور پر مشینی ذرائع استعمال کرکے اس کو عمل میں لائیں۔ وہ "کدال، بیلچہ اور ہاتھ گاڑی" کے تصور سے بیزار ہیں۔

اگرچہ آسٹریلیا میں جہاں تک وسیع پیمانہ کی کاشت کا تعلق ہے، خصوصاً گیہوں کی کاشت کا، وہ مشینی ذرائع سے ہوتی ہے تاہم "کدال، بیلچہ اور ہاتھ گاڑی" کا جو نام لیا گیا ہے وہ غلط نہیں ہے اس وجہ سے کہ جنگ شروع ہونے تک چھوٹی چھوٹی آراضیوں کی کاشت میں انہیں چیزوں کا استعمال رہا ہے بلکہ بعض بعض جگہ اب بھی یہی صورت قائم ہے۔ البتہ اتنا یقین کیسا تھ کہا جا سکتا ہے کہ نیو ساؤتھ ویلز کی میکنائزیشن اسکیم نے دلوں میں جگہ کر لی ہے۔ اس اسکیم نے نیز اس قسم کی دیگر اسکیموں مثلاً غذائی کنٹرول

ایڈگر بی

دکٹوریہ گورنمنٹ میکنائزیشن اسکیم وغیرہ نے یہ بات واضح کردی ہے کہ آسٹریلیا کے کاشتکار اور وہاں کی حکومتیں یہ تہیہ کرچکی ہیں کہ امداد باہمی کے طریقوں پر چل کر وہ خوش حالی کی منزل تک پہونچیں۔

مشترکہ مشینری، کے نظام نے ترقی پسند کاشتکاروں پر پوری طرح یہ بات روشن کردی ہے کہ کاشتکاری کے مختلف مرحلوں کو جنہیں وقت کا مسئلہ کافی اہم ہوتا ہے، اگر جلد از جلد طے کیا جائے تو اس سے کتنا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ کاشتکاری کے جن جدید آلات کو کاشتکار امداد باہمی کے اداروں سے کرایہ پر لیا کرتا تھا اب انہیں اوزاروں کو وہ چاہے گا کہ اس کی ذاتی ملکیت ہوجائیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر ان کی قیمتیں اس کی دسترس سے باہر ہوئیں تو وہ کرایہ ہی پر لیکر کام چلانے رہنے پر مجبور ہوگا۔

مسٹر جڈ کہتے ہیں کہ حکومت کی تحریک پر امداد باہمی کے ذریعہ کاشتکاری کا یہ تجربہ ایک انوکھی چیز ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں اس سے ملتی جلتی اسکیمیں تو ضرور چل رہی ہیں مگر بعینہٖ اس قسم کی کوئی اسکیم نہیں ہے۔ اس طریقہ میں جو نمایاں فائدے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس اسکیم کے ذریعہ غلہ پیدا کرنے والوں کی دیہی صنعت پر سو فیصدی اقتدار قائم ہونا آسان ہوجاتا ہے۔

اس قسم کا پہلا مرکز جو ۱۹۴۳ء میں نادر یا میں قائم ہوا تھا اور نومبر ۱۹۴۵ء تک نیو ساؤتھ ویلز کے ۳۰۹۴۳۳ میل تک پھیلے ہوئے علاقہ کے مختلف مقامات میں امداد باہمی کے اصول پر مشترکہ مشینری کے ۱۷ مرکز قائم ہوچکے تھے اور مرکز اور قائم ہورہے تھے مسنڈی جیسے دور دراز مقام پر بھی جو دریائے ڈارلنگ پر واقع ہے ترکاری کی کاشت کرنے والوں نے مشترک ہوکر کام شروع کردیا تھا۔ ان مشترکہ مشینری کے مرکزوں میں سے تقریباً ۳۷ فیصدی شمالی اور وسطی ساحل

پر ہیں۔ ۲۱ فیصدی اندرون ملک کے قطعوں میں ہیں۔ ۱۶ فیصدی جنوبی سطح مرتفع میں ہیں اور ۱۱ فیصدی شمالی سطح مرتفع میں یا اس کے قریب واقع ہیں۔

سرکاری امداد

مختصر یہ کہ ملکی حکومت نے غیرسودی رقمیں دیکر کاشتکار طبقہ کو امداد باہمی کے اصول پر استعمال کرنے کے لئے مشترکہ مشینری فراہم کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔ کیوں؟ اسلئے کہ اگر عام کاشتکار ذاتی طور پر اپنی کاشتکاری کا کام بالکل مشین کے ذریعہ سے انجام دینا چاہے تو اس کی مالی حیثیت اسے برداشت نہیں کرسکتی۔

سطح مرتفع کے علاقوں میں عام طور پر دو قسم کے مرکز قائم ہیں؛ ایک وہ جن سے غلہ کی کاشت میں مدد ملتی ہے دوسرے وہ جن سے فصل کاٹنے میں مدد ملتی ہے۔ جہاں دودھ وغیرہ کا کاروبار ہے وہاں عموماً پہلی قسم کے مرکز قائم ہوئے ہیں۔ جانوروں کے چارہ اور پانی کے ذخیروں کے سلسلہ میں بھی مشترکہ مشینری کے مرکز قائم کرنے کے لئے لوگوں میں قومی رجحان پایا جاتا ہے۔

پہلی قسم کے مرکزوں میں جو مشینیں ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔ ٹریکٹر، ہل، مشین اور نرسری کے آلات سطح مرتفع کے علاقوں میں ان مشینوں کے علاوہ کھیت کاٹنے کی مشین گٹھے باندھنے کی مشین اور آلو کھودنے کی مشینیں بھی ہوتی ہے۔ بعض مرکزوں میں پورے اوزار ہوتے ہیں مثلاً اناج کاٹنے گھاس کاٹنے، گٹھا باندھنے، سوکھی گھاس باندھنے، گھاس سمیٹنے وغیرہ کی مشینیں۔ ان میں سے بعض اوزار ایسے ہیں جنہیں باہر سے منگانا پڑتا ہے۔ جنگ سے پہلے آسٹریلیا میں اوزار بنانے کی صنعت تھی جو ڈرائیوں کی حدت اور اوزاروں کی عمدگی کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور تھی لیکن موجودہ حالات میں جس قسم کے اوزار وہاں کاشتکاری میں کام آتے تھے ان کی مانگ۔

معذرت

فرید جاوید

دیکھے دیکھے حسین چہروں پر
کس کو فرصت نگاہ کون اٹھائے؟

دل کہ سوز دروں سے ہے مانوس
ماہ پاروں سے کون آنکھ لڑائے؟

تیرا پیغام سرخوشِ تسلیم
شدتِ غم سے دل اگر بھر آئے!

مسکرانا بھی ہے محال اے دوست
کسطرح قہقہوں سے کھیلا جائے

بارہا نامراد آنکھوں سے
بے ارادہ بھی اشکِ خوں چھلکائے

جائزہ لے نہ یوں محبت کا
دیکھ اخلاص پر نہ حرف آجائے

ادھ کھلی ہی رہے تو اچھا ہے
پھول بنکر کلی عبث مرجھائے

مجھکو رنگین آبگینوں میں
تلخ تر گھونٹ زندگی نے پلائے

تجھ سے لازم ہے اجتناب مجھے
گل کدے پر ترے خزاں کیا چھائے

شامِ غم اضطراب کم نہ ہوا
دھیمے دھیمے سرود بن گئے بھی گائے

ایک بیدار دل جواں شاعر
تا کجے رنگ و بو سے دل بہلائے

یہاں تیار ہونے والے اوزاروں کی قسمیں جو محدود تھیں۔ لیکن لڑائی کے زمانہ میں اس سلسلہ میں کافی ترقی ہوئی۔ اسلئے اب جس جس قسم کی مشینوں کی ضرورت ہوگی وہ تقریباً سب کی سب یہاں بن سکیں گی۔

قرضہ اور پٹہ کی اسکیم کے ماتحت یہ صورت ہوگئی تھی کہ اگر کوئی مشینری آسٹریلیا میں بن سکتی ہے تو وہ ممالک متحدہ امریکہ سے نہیں آسکتی تھی۔ لہذا کامن ویلتھ فوڈ کنٹرول کے مشینری سکشن نے صنعتی سہولتوں اور پیداوار کی بدلتی ہوئی ضروریات کا جائزہ لینا شروع کیا اور ۱۹۴۲ء میں ایک ایسا پروگرام شروع کیا جس سے فرموں کو کامن ویلتھ گورنمنٹ سے معاملات طے کرکے نئے نئے اوزار اور مشینری بنانے کی ہمت افزائی ہوئی۔ کامن ویلتھ کی وزارت سامان جنگ نے احکام نافذ کئے جنگی رو سے فرموں کو ۱۹۴۵ء کے اختتام تک ساڑھے سات کروڑ سے اوپر مالیت کی مشین تیار کرنیکے لئے خام اشیاء مزدور اور وسائل فراہم کرلینے کا حق مل گیا۔ اب ایسی کئیں قسم کی نئی مشینیں تیار ہو رہی ہیں جو کامن ویلتھ میں اس سے پہلے نہیں بنی تھیں۔ ان مشینوں میں آلو کھودنے کی وہ مشینیں بھی ہیں جو پاور سے چلتی ہیں اور بیج بکھیرنے کی مشین۔ ترکاری بونے کی مشین، چقندر نکالنے کی مشین، سراون، پھلی توڑنے کی مشین وغیرہ بھی ہیں۔ آسٹریلیا میں مشینی کاروبار کی مسلسل ترقی کے لئے یہ ایک عمدہ بنیاد مل گئی ہے۔

ان مشینوں کے علاوہ باہر سے بھی مشینیں منگائی گئیں اور اب بھی منگائی جارہی ہیں۔ مثلاً لڑائی سے پہلے تقریباً ڈیڑھ ہزار ٹریکٹر سالانہ کی درآمد کا اوسط تھا۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں دو ہزار سے زیادہ ایسے ٹریکٹر درآمد کئے گئے جو ممالک متحدہ امریکہ میں وسیع پیمانہ کی کاشت کیلئے موزوں ثابت ہوچکے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سی دیگر اقسام کی مشین منگائی گئیں۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں چھ ہزار سے زیادہ ٹریکٹر درآمد ہوئے۔

سوسائیٹیوں کی امداد

امداد باہمی کے مشترک مشینری والے اداروں کی ترقی امداد باہمی کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ گذشتہ چند سال سے آسٹریلیا کی زندگی میں امداد باہمی کی سرگرمیاں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ نیو ساؤتھ ویلز گورنمنٹ ابتک اکیس لاکھ چالیس ہزار روپیہ سے زیادہ کاشتکار طبقہ کو قرض دے چکی ہے اور مزید رقمیں بھی مقرر ہوچکی ہیں۔

افراد کو بیس ہزار روپیہ تک دیا جاسکتا ہے اور وہ بھی بلاسود۔ یہ البتہ ضروری ہے کہ سوسائٹی منظور شدہ ہو، کاشت کرنے اور فصل کاٹنے کے سلسلہ میں منظور شدہ مشینریاں لینے پر آمادہ ہو اور اس کے لئے تیار ہو کہ ان مشینوں کو کاشتکاران ضلع کے فائدہ کے لئے اپنی نگرانی میں استعمال کرائیگی۔

اس رقم میں جو حکومت کی طرف سے دی جاتی ہے اس میں کام کا ابتدائی خرچ، تین مہینہ کی تنخواہ، ایندھن، تیل، پرزے اور مرمت کے اخراجات بھی لازماً شامل ہونے چاہئیں۔ اور بشرط ضرورت مکان فراہم کرنے کی سہولتیں بھی ہونی چاہئیں۔ اس اسکیم میں موٹر لاری یا ایسی مشین جو ضلع کی عام ضروریات کے لئے کارآمد نہ ہو یا وہ اوزار جیسے اوسط درجہ کے کاشتکار کو خود خریدنا چاہئے شامل نہیں ہیں۔

سوسائٹی کی ضروریات کی تفصیل نیو ساؤتھ ویلز کے دیہی بنک کی مقامی شاخ کے ذریعہ بھیجی جاتی ہے۔ جو رقم دی جاتی ہے وہ اسی شاخ کے مشینری ٹرسٹ اکاونٹ میں جمع کردی جاتی ہیں۔ مشینری کی خرید اس کی نگہداشت اور چلانے کے لئے جو رقم بھی نکالی جاتی ہے وہ ٹرسٹ اکاونٹ سے نکالی جاتی ہے اور مشین کے کرایہ کی جو رقم جمع ہوتی ہے وہ بھی اسی اکاونٹ میں جمع کی جاتی ہے۔ تین مہینہ کی ابتدائی مدت کے بعد کاشتکاروں سے جو رقم جمع کیجاتی ہے اس میں سے سوسائٹی مشین کی نگہداشت اور اس کے چلانے کے اخراجات وصول کرتی ہے۔

سوسائٹی کے ممبروں میں سے پچہتر فی صدی کا کاشتکار ہونا ضروری ہے۔ سوسائٹی کے لئے لازمی ہے کہ وہ مستقل اور معقول تنخواہ دار سکرٹری رکھے جسکے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ پورا وقت دینے والا آدمی ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہوشیار اور لائق مشین چلانے والا یا چلانے والے رکھے۔ سوسائٹی کے ڈائرکٹر ایسے لوگ ہوں جنکی اس طبقہ میں وقعت ہو۔ سوسائٹی کے لئے لازمی ہے کہ وہ ان قرضہ جات کی ادائیگی کا ذمہ لے اور کواپریٹیو ایکٹ ۱۹۲۳-۲۴ء کے ماتحت رجسٹرڈ ہو۔ منافع ادا شدہ سرمایہ کا چھ فیصدی سے زیادہ نہ مقرر کیا جائے اور کوئی رکن اس کے حصوں کی مجموعی تعداد کے ۱/۵ سے زیادہ حصہ نہ خریدے۔

امداد باہمی سوسائٹی کے ارکان کی تعداد کم از کم سات ہو اور ہر رکن کے پاس کم از کم پانچ حصے ہوں اور ایک حصہ کی قیمت ۲۱عہ ہو۔ ایک ہی قسم کی دو یا دو سے زیادہ سوسائیٹیاں اگر چاہیں تو باہمی

مفاد کے پیش نظر متحد ہوکر ایک سوسائٹی بنالیں اور دو یا دو سے زیادہ سوسائٹیاں متحد ہوکر ایک یونین بنالیں۔ یقین کیا جاتا ہے کہ ان طاقتوں سے امداد باہمی کے اصول پر فارموں کو مشینری کے ذریعہ چلانے میں کافی اہم قسم کی مدد ملے گی۔

کاشتکار کا نفع

اس اسکیم سے کاشتکاروں کے لئے نفع کی حسب ذیل صورتیں ہونگی۔

(۱) زندگی کا بہتر طریقہ۔ خصوصاً دودھ اور اس سے تیار ہونے والی چیزوں کا کاروبار کرنے والوں کو پبلک کاموں کیلئے یا مثلاً تفریحی اور تعلیمی مشاغل کیلئے زیادہ وقت ملیگا۔ خصوصاً پیداوار کے مسائل پر تفصیل کیساتھ غور و خوض کرنے کا زیادہ وقت ملیگا۔ (۲) پیداوار میں جلد اور موثر اضافہ ہوگا۔ (۳) اس وقت آدمیوں کی محنت کی کمی بیشی پر پیداوار کا بہت زیادہ انحصار ہوتا ہے اس کے بعد اس حد تک یہ انحصار نہیں باقی رہیگا (۴) ایک ایسے مکمل اور جدید ترین یونٹ کی خریداری کے لئے جو سوسائٹی کی ضروریات کے لحاظ سے موزوں ہو مالی وسائل باطمینان فراہم ہوسکیں گے اور اس رقم کی جو غیر سودی قرض کے طور پر ملے گی ادائیگی کی صورت بھی سوسائٹی کی حیثیت کے مطابق مقرر ہوگی (۵) ڈیری فارم کے مویشیوں کی بہتر نگہداشت ہوسکے گی اور ترقی کی نئی نئی صورتیں سوچنے کا موقع زیادہ ملے گا (۶) فارم کا کام زیادہ بہتر اور سلیقے ہوئے طریقہ پر ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے حوصلے بڑھتے رہینگے وہ زیادہ دلچسپی اور جوش و خروش سے کام کرینگے، زیادہ بہتر کام کرینگے۔ اور اس کا یہ اثر ہوگا کہ زراعت کا کام جدید ترین سائنٹیفک اور اقتصادی طریقوں پر ہونے لگیگا۔ (۷) ایک ایسی بنیاد مہیا ہوجائیگی جس پر صحیح معنوں میں کاشتکاروں کے درمیان امداد باہمی اور پیدا کرنے والوں کے اقتدار کی عمارت تعمیر ہوسکے گی۔ (۸) اس وقت کے ذاتی فارموں میں جو ضرورت سے زیادہ سرمایہ دارانہ حیثیت پائی جاتی ہے وہ ختم ہوجائے گی (۹) زراعتی کام وقت پر مکمل ہونگے۔ (۱۰) جدید طریقے بہت جلد پھیل جائینگے۔ (۱۱) غلامانہ مشقت کا قصہ ختم ہوجائے گا۔ (ڈائرکٹر یونائیٹڈ ڈیری بمبئی سے ماخوذ)

لکھنے والوں سے۔ رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو کسی رسالہ میں شائع کر لیا جائے یا اس وقت کے کسی دوسرے رسالے میں [illegible] رکھیں۔ (ادارہ)

آشوب

افسانہ

رفیق علی

[illegible] ہو کے رہ گئے تو نوبال جان ہو کر رہ گئے جب اس کی بوڑھی ماما پیالی میں سفید مکس کر لاتی تو اس کی روح کانپ اٹھتی، وہ ایک جھرجھری سی لیتی مگر اس کی تمام مدافعانہ کوششیں بے کار رہتیں، وہ اس کے سر کو بری طرح دبوچتی، وہ حیران رہ جاتی آخر اس مریل سی بڑھیا میں اتنی طاقت کہاں سے آجاتی ہے! اور اس کی سخت سخت سی انگلیاں جیسے کسی نے پتھر کی سلائی پھیر دی ہو، وہ سرِ شام ہی مرغی کی طرح لحاف میں سکڑ کر دبک جاتی، وہ خرخر خراٹے بھی لینے لگتی، اس کا باپ کہتا "طاہرہ بڑی گہری نیند سو رہی ہے" اسے اپنے باپ کی سادہ لوحی پر بڑی ہنسی آتی، وہ دوپٹے کا پلو اپنے منہ میں ٹھونس لیتی، مگر ماما کے پیروں کی چاپ سن کر وہ یوں کلبلانے لگتی جیسے بین پر سانپ ناچ رہا ہو، اس کے لیے ماما حوریان افسانوی جادوگرنی سے کم خونخوار نہ تھی، پوپلا منہ، سفید بال، جھریوں بھری کھال، موٹی موٹی ابھری نسیں مگر جب وہ پیار بھرے لہجہ میں کہتی "اٹھو بھی میری شہزادی" تو اس کا تمام خوف دور ہو جاتا، اور وہ یوں سب باتیں مان لیتی جیسے کہ سچ مچ وہ شہزادی ہے کیونکہ اس نے کہانیوں میں سنا تھا کہ شہزادی کبھی بری لڑکی نہیں ہوتی۔

وہ اگر بچوں کی طرح ٹھنکتی تو بڑھیا کی گرفت اور سخت ہو جاتی، وہ اسے جھنجھوڑ ڈالتی "اے ہے بی بی اب تم کچھ تھوڑی ہو" اور وہ اس طرح دل کڑا کر لیتی جیسے اس نے ماما کے چیلنج کو منظور کر لیا ہو، مگر اس کی تسلی میں بھی جھوٹ کی چاشنی ہوتی "بی بی اس میں میرا کیا فائدہ تمہاری ہی آنکھیں پھر بڑی ہو جائیں گی، ایسی بڑی بڑی کھل آئیں گی کہ بس دیکھا کرو" یہ سن کر وہ اطمینان کی ٹھنڈی سانس بھرتی، کیونکہ اسے احساس تھا کہ بغیر آنکھیں بڑی ہوئے اس کا شہزادہ اس کے پاس نہ آئے گا، وہی شہزادہ جس کے بارے میں وہ لاکھوں بار کہانیوں میں سن چکی تھی۔

وہ ایسی منزل پر کھڑی تھی جہاں بچپن اور جوانی گلے ملتے ہیں، اسی لئے جب وہ اپنے بچپن کے بارے میں سوچتی تو اوروں کی طرح ہلکی سی ٹھنڈی آہ اس کے نمکین ہونٹوں کو مرتعش نہ کرتی، ماضی کی یاد گدگدی بن کر بدن میں تحلیل نہ ہوتی بلکہ اسے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کل کی بات ہو، ایک ایسی کہانی جو بوجھل پلکوں کی وجہ سے پوری نہ سن سکی ہو اور دوسرے دن پھر اسی کی فرمائش کر لے۔

ماں کی وفات طاہرہ کے لئے ایک جانسوز واقعہ تھی، یہیں اس کو زندگی کا تسلسل دم توڑتا محسوس ہوتا جیسے زندگی کی کچھ کڑیاں ایک دوسرے میں پروئے جانے سے رہ گئی ہوں، وہ بھولی ہوئی تھی کہ اس کی ماں نہیں ہے، وہ تو یہی کہتی جیسے وہ پہیلیوں کے محل میں اس کے لئے شہزادہ ڈھونڈنے گئی ہے، اس کی ماں کی تمام چیزیں ویسی ہی رکھی تھیں، اس کا باپ ہر اس شے کو جو ہاجرہ کی زندگی سے متعلق تھی علیحدہ کرنے پر تیار نہ تھا، اس کی خالہ نادین نے اس سے رازدارانہ طور پر کہا "اے ہے بہنو! خالو آبا بھی کیا سٹھیا گئے ہیں، کوئی مردوں کے کپڑے بھی یوں سینت سینت کے رکھتا ہے" اور تو اور خود دادی جان نے بھی کہا "اس صمد کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے" جتنے منہ اتنی باتیں، سن کر وہ سراسیمہ ہو جاتی، وہ جائے نماز پر بیٹھ کر بہت گڑگڑا کر دعائیں مانگتی "یا اللہ میاں میرے ابا اچھے رہیں" مگر جب اس کی ماما اسے سمجھاتی کہ "بیٹی اس دنیا میں سچی محبت کرنے والے ہی تو دیوانے کہلاتے ہیں" تو اس کا تحیر کچھ مٹ جاتا اور وہ اپنی لٹوں کو اوپر پھینک کر کہتی "مٹ جائیں میرے ابا کو پاگل کہنے والے!"

اسے پچھلی باتیں اچھی طرح یاد تھیں جیسے وہ بھی چھوٹی چھوٹی کہانیاں سی ہوں، اس نے اپنی آنکھوں کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہ کی تھی مگر اس نے اپنے ابا کو اکثر کہتے سنا تھا کہ "ہاجرہ طاہرہ کی آنکھیں تم سے کتنی ملتی ہیں" اس کی ماں کی آنکھیں کتنی خوبصورت تھیں کتنی نیلی نیلی ابھری ابھری، وہ بڑے اشتیاق سے سنا کرتی کہ اس کے پیدا ہونے پر اس کی آنکھوں پر کیسا کیسا تبصرہ ہوا، اوٹ پٹانگ باتیں جن کا سر نہ پیر، کسی نے کہا یہ تو صمد کی لڑکی ہی نہیں معلوم ہوتی اور ہاجرہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا، طاہرہ سانولی تھی اور ہاجرہ اور صمد دونوں گورے۔ مگر وہ بہت ملیح تھی جیسے سپیدۂ سحر میں سے شبنمی رات کی تازگی جھلملاتی ہو، اس کی آنکھوں کے بارے میں سب کی ایک ہی رائے تھی، صمد جب یہ کہتا کہ "ہاجرہ اس کی آنکھیں تو تم سے بھی زیادہ کٹیلی ہیں" تو وہ اس طرح کھل اٹھتی جیسے اس کی تعریف میں آخری الفاظ کہہ دئے گئے ہوں، طاہرہ کی آنکھوں کے بارے میں عجیب عجیب تاویلیں پیش کی جاتیں، کچھ کا خیال تھا کہ ہاجرہ کلکتے میں جو ایک سال رہی ہے یہی تاویل سب سے زیادہ سراہی جاتی، اسی لئے سب اسے پیار میں بھولی بنگالن کہتے، اس کی لانبی پلکیں بڑا عجیب سحر پیدا کرتیں، اس کے بھولے چہرے میں دل میں گھر کرنے کی بے پناہ قوت تھی، طاہرہ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لی جاتی، ہر ایک کی گود میں اپنا بہت کم نصیب ہوتا جب وہ بہت کراہتی [illegible] خوبصورت نے کسی ایک کا اجارہ نہیں [illegible] دیکھتے ہیں تو میں بڑا تھوڑی ہی مانتا [illegible]

سے کہتی "آپ تو زبردستی شاعر ہیں، جس چیز کو چاہیں بی بی ہوئی کہیں گے حسن کا یہی سنا تھا کہ ساجدہ تھا سے حسن ہی کتنی ظاہر ہیں اور میں کتنا روکھا پھیکا آدمی ہوں کہ اس کی ایک طرح تعریف بھی نہیں کرسکتا۔

آج جب وہ اپنے گھر لوٹی تو اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں جذبات کے کالے کالے بادل اسکے عضو عضو میں منڈلا رہے تھے، اس نے تہیہ کرلیا کہ اب وہ خالہ کے گھر کبھی نہ جائے گی، کیونکہ ساجدہ، شہلا، فاخرہ، نے آج اسے دل کھول کر چندی چندی کہا۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ عابد کسی ایسی ویسی نظر سے نہ دیکھے، کتنی اتراتی ہیں بیچاری اپنی صورتوں پر، وہ چندی سہی تو اپنے سے لئے ہے۔ یہ یاد کرکے اس کی آنکھیں بھر آئیں کہ چندی کہنے پر اس کی ماں کتنی برہم ہوا کرتی تھیں، وہ بہت وہمی تھیں زیادہ محبت کرنے والے وہمی بھی ہوتے ہیں، ان کا خیال تھا کہ نانی عشو کی نظر طاہرہ کی آنکھوں کو کھا گئی کیونکہ انہوں نے ان کی شادی میں بھانجی ماری تھی، اس لئے وہ اکثر مرچوں سے اس کی نظر اتروا تیں وہ اپنی ماں کی سنگار میز کے پاس کھڑی ہوگئی، اس کی ماں کی ایک ساڑی الگنی پر ٹنگی ہوئی تھی جیسے جو سے کتر گئے تھے ڈھول میں آئنے پر پرانے چپل پڑے ہوئے تھے، کٹوری میں میلا میلا سا ناریل کا تیل جما ہوا تھا۔ طاہرہ مبہوت سی کھڑی تھی جیسے کسی نے اس پر مسمریزم کردیا ہو، اس کے دل و دماغ میں ایک تاریکی سی دوڑ گئی، اس نے یونہی ماما کو پکارا جیسے وہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ چائے تیار رکھے۔ امی طارق میاں کے یہاں سے لوٹیں گی تو چائے مانگیں گی مگر اسے ایک دھچکا سا لگا جیسے وہ آسمان سے زمین پر آرہی ہو، طلسم ٹوٹ چکا تھا، وہ اپنی ماں کی ساڑی کو گالوں سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر خوب روئی، وہ سوچتی اسکی تعلیم کی وجہ سے اکثر امی ننہیال جاتے وقت اسے چھوڑ جاتیں، وہ سوچتی جیسے وہ ان کو ایک لمبا چوڑا شکایتوں سے بھرا خط لکھے گی ... "امی تم ایسی گئیں کہ لوٹی ہی نہیں، ماما عزیزن کی انگلیاں گھسا گھسی جارہی ہیں۔ سب کام کاج میں کرتی ہوں ابا کہتے ہیں وہ تمہاری غیر موجودگی کو بھول سے گئے ہیں ...... میری اچھی امی اب آنا تو میرے لئے اچھی سی سہیلوں کی دو والیئے آنا ..... وہ ڈبڈبائی آنکھوں، گرم گرم گالوں اور بچے کچے خیالوں میں بالکل گڑیا سی لگ رہی تھی!

وہ جب کبھی بھی اپنی بہنوں کے ساتھ بازار جاتی تو بناؤ سنگھار نہ کرتی، بہت کیا تو کھونٹی سے دوپٹہ لپیٹ لیا، وہ بازار کی دکانوں اور چلتے پھرتے آدمیوں کو کچھ بھی زیادہ ترحّم

حیرت سے ساجدہ اور شہلا کو دیکھا کرتی کہ کس طرح ان کی آنکھیں ناچا کرتی ہیں، وہ دونوں پسینہ میں شرابور ہو جاتی ہیں، وہ اگر ان سے بازار میں خوش ہوکر باتیں کرنے کی کوشش کرتی تو وہ جھلک دیتیں "طاہرہ یہ کیا بدتمیزی ہے اپنے سہارے چلو" اور وہ یوں چونک اٹھتی جیسے واقعی اسے سہارے کی ضرورت ہے، اس نے اکثر بازار سے لوٹ کر گھبرا گھبرا کر ساجدہ کو کہتے سنا "نہ جانے کیا لوگوں کی بدتمیز عادت ہے جو گھور گھور کر دیکھتے ہیں" اور وہ یہ کہکر بہری سی ہو جاتی یہ سوچ کر اس کی آواز عابد نے ضرور سن لی ہوگی، مگر دل میں طاہرہ خوش ہوئی کہ وہ بہت خوش قسمت ہے لوگ اسے گھور کر نہیں دیکھتے، ورنہ اسکے ریشمین کپڑے بھی ساجدہ اور شیلا کی طرح پسینہ میں بھیگ جایا کریں!

اس کی آنکھیں اچھی ہوگئی تھیں پھر بھی وہ چندی تھی، اسی لئے اب وہ چڑچڑی سی ہوگئی تھی، وہ ساجدہ اور شہلا سے ایک عجیب قسم کا انتقام لینے کے منصوبے باندھا کرتی، وہ چاہتی کسی طرح عابد بھی اسے چندی کہے اور ادھر وہ ایک دو تھپڑ کس کے اس کے منہ پہ مارے کہ پانچوں انگلیاں بن جائیں اس طرح وہ ساجدہ اور شہلا سے اپنی ہتک کا بدلہ لے، مگر ایسا تو کوئی موقعہ ہی نہ آیا اور انتقام کی آگ اس کے دل و دماغ میں سلگتی رہی، ایک دن وہ کمرے میں بیٹھی چوٹی گوندھ رہی تھی، دالان میں سب بیٹھی باتیں کررہی تھیں، ان میں عابد بھی تھا، آنکھوں کی تعریفیں ہو رہی تھیں، ساجدہ کا کہنا تھا کہ شہلا کی فلانی آنکھیں اچھی ہیں، شہلا چیخ کر بولی نہیں "آپا مجھ کی ہرن جیسی بڑی تو خاندان میں کسی کی بھی نہیں" مگر عابد کے منہ سے یہ سن کر نہیں تھی طاہرہ کی سی کشش کسی میں نہیں جیسے کوئی دل کھینچ رہا ہو" وہ چونک پڑی اس نے غیر شعوری طور پر نرم نرم گالوں پہ ہاتھ پھیرنے شروع کئے یہ محسوس کرنے کے لئے کہ عابد کی انگلیوں کے لال لال نشان تو نہیں بن گئے ہیں!

وہ جب ان دونوں کے ساتھ بازار سے لوٹی تو بہت خوش تھی، مگر ساجدہ اور شہلا یوں کچھ خاموش خاموش سی تھیں، وہ دونوں کچھ اس طرح ہانپ رہی تھیں جیسے کسی نے ان کو دوڑایا ہو، وہ دونوں طاہرہ سے بول بھی نہیں رہی تھیں، ان کی نظر میں آج طاہرہ نے وہ ناگفتہ بہ حرکتیں کی تھیں کہ اس کے ہاتھ جوڑنے پر بھی اس کو معاف نہ کیا گیا ان کو اتنا تعجب ضرور تھا کہ آخر یہ حرکتیں اس نے سیکھی کہاں سے، ابھی کریمو بیٹھی کر ہنسکر دکاندار سے بولی "کیا کیجئے گا پیسے لیکر" وہ دونوں ہانپتی جاتی تھیں، زیور دکانوں میں جاتی تھیں اور فاخرہ کو سناتی جاتی تھیں "بہنو اس مردود نے جب پیسے پھینک دئے تو اس قطامہ نے اٹھا بھی لئے" اور طاہرہ یہ سب سن کر

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

ہندوستان اور چین کے مابین تجارت

شمشیر سنگھ

دنیا کے کوئی سے دو ملک ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ نہیں ہیں جتنے کہ چین اور ہندوستان ہیں۔ دونوں کے رقبے وسیع، آبادیاں گنجان، باشندے غریب اور ثقافتیں قدیم ہیں۔ دونوں اپنے اپنے ملک میں زراعت کو ترقی دینے، نت نئی صنعتوں کو اختیار کرنے اور عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ چین نے حال ہی میں صحیح معنوں میں آزادی حاصل کی ہے، ہندوستان اس آزادی کے دروازے پر ہے۔ قدیم زمانے میں ان دونوں کے مابین گہرے تعلقات قائم تھے۔ دونوں کا مستقبل بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہے کیونکہ دونوں ایشیا میں امن و عافیت کے خواہاں ہیں۔ ان کے پچھلے تعلقات اور آگے ارادوں کے پیش نظر کہنا پڑتا ہے کہ ان کے مابین اتحاد باہمی کا قائم ہونا لازمی ہے۔ اس پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے چین کے لئے ایک تجارتی وفد کا بھیجا جانا ثابت کرتا ہے کہ حکومت کا یہ اقدام بالکل مناسب اور برمحل ہے لہٰذا اقتصادی اعتبار سے چین اور ہندوستان کی راہ اتحاد پر یہ وفد ایک اہم سنگ میل نصب کرے گا۔

لڑائی سے پہلے چین و ہند کی تجارت کچھ زیادہ قابلِ ذکر نہیں تھی۔ ہندوستان سے جانے والے مال کی مجموعی قیمت دو کروڑ روپے کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ یہاں سے جانے والی چیزوں میں کچی روئی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ دوسری قابلِ ذکر چیزوں میں سن کا سامان، کپاس، تمباکو، کٹ پیس کا مال، کوئلہ، چٹائیاں، چمڑا، کھالیں لوہا اور صندل کا تیل شامل تھا۔ اس کے برعکس چین سے آنے والے مال میں سوتی دھاگے، کچے ریشم، اور ریشم کے سامان کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ دوسرے ملکوں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چین کی غیر ملکی تجارت میں ہندوستان کا حصہ بہت ہی قلیل تھا۔

تاہم لڑائی نے صورتِ حالات کو بڑی تیزی کے ساتھ یکسر بدل ڈالا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۱ء میں چین جانے والے ہندوستانی مال کی قیمت آٹھ کروڑ نوے لاکھ کے قریب ہو گئی۔ لیکن جب امریکہ لڑائی میں شامل ہو گیا اور جاپانیوں نے چین کے بہت بڑے علاقے پر قبضہ جما لیا تو تجارت کو ایک زبردست دھکا لگا چنانچہ اب امن و عافیت کی فضا قائم ہو جانے پر حکومت ہند نے چین کے ساتھ اپنے ملک کی تجارت کو بحال کرنے کے لئے اپنی توجہ مبذول کی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان چین کو وہ سب سامان دے سکتا ہے جو لڑائی سے پہلے یہاں سے جاتا تھا اس کے علاوہ ان مختلف صنعتوں کا مال بھی دیا جا سکتا ہے جنکو لڑائی کے دوران میں ترقی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ ہندوستان سے مال جانا شروع ہو یہ پتہ چلانا لازمی تھا کہ چین میں بازار کے حالات کیا ہیں اور وہاں کے لوگوں کو ٹھیک ٹھیک کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ اسی لئے حکومت ہند نے ایک تجارتی وفد اس ملک میں بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ ضروری معلومات حاصل کر لائے۔

اس وفد کے اراکین میں کے کے چیٹر، جسی ہڈاس، کلہ چند، جی پی کوٹھک، ایم ایس سی جستاد اللہ اور اے اے جاوری شامل تھے۔ یہ لوگ کلکتے سے ۲۰ فروری کو روانہ ہوئے اور تقریباً ۲ ہزار میل ہوائی سفر کرنے کے بعد ۲۹ مارچ کو واپس آ گئے۔ اس مختصر عرصے میں وفد نے ہانگ کانگ، شنگھائی، پاپنگ، ٹین تسن اور چنکنگ کا دورہ کیا۔ شنگھائی سب سے اہم بندرگاہ ہے عام دنوں میں چین کی نصف غیر ملکی تجارت اسی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ پاپنگ چین کا تاریخی شہر ہے اور اپنے شاندار محلوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ چنکنگ زمانہ جنگ کا صدر مقام اور ملکوں کے عزم راسخ اور تابندہ امیدوں کا مثالی نمونہ ہے۔ وفد مذکور نے ان تمام مقامات کے تجارتی حالات کا جائزہ لیا، اعداد و شمار جمع کئے، مشہور کاروباری لوگوں، سوداگروں اور ایوانِ تجارت کے ممبروں سے ملاقات کی، نیز جنرلیسمو چیانگ کائی شیک اور ڈاکٹر ٹی وی سونگ جیسے نامور چینی راہنماؤں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ ہر موقع و محل پر چینیوں اور ان ہندوستانیوں نے جو چین میں آباد ہیں اس وفد کے اراکین کا خیر مقدم کرتے ہوئے پرخلوص مہمان نوازی اور دلی اتحاد و تعاون کا اظہار کیا۔ وفد کی جمع کی ہوئی اطلاعات، ان بنیادوں پر نکالے ہوئے نتائج اور سفارشات ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہو گئی ہیں جس کا نام "چین جانے والے تجارتی وفد کی روداد" ہے۔ اس روداد میں چینی صنعت پارچہ بافی کی نوعیت، تمباکو کی پیداوار اور روپے پیسے کے مفصل حالات

شامل ہیں۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دونوں ملکوں کے مابین تجارتی امکانات کس حد تک قائم ہو سکتے ہیں۔

دنیا کے سنتے ترقی یافتہ ملکوں میں صنعت پارچہ بافی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جاپان اپنی اسی صنعت کی بدولت دنیا کے صنعتی ملکوں کی صف اول میں آگیا تھا۔ اب سے کچھ عرصے پہلے چین بھی اپنی اس صنعت کو ترقی دینے میں لگا رہا تھا۔ وفد کا بیان ہے کہ وہاں لڑائی کے ہاتھوں اس صنعت کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ لڑائی سے پہلے اس کے کارخانوں میں پچپن لاکھ تکلے موجود تھے جنکی تعداد اب چالیس لاکھ رہ گئی ہے۔ قیاس ہے کہ ان میں سے نصف تکلے اس سال کے آخر تک اور باقی ایک آدھ سال میں چلنے شروع ہو جائینگے۔ چین کے ارباب تجارت اس صنعت کو فروغ دینے کے لئے ایک پر امید لائحہ عمل بنا چکے ہیں تاکہ ایک طرف اس نقصان کی تلافی ہو جائے جس سے لڑائی کے ہاتھوں دو چار ہونا پڑا ہے۔ اور دوسری طرف جنوب مشرقی ایشیا میں ان منڈیوں پر قبضہ جما لیا جائے جنکو لڑائی سے پہلے جاپانیوں نے ہتھیا رکھا تھا۔ اگر وہ فالتو تکلے جنکی فراہمی کی فرمائش برطانیہ اور امریکہ سے کی گئی ہے، وقت مقررہ تک پہنچ گئے تو چین تین سال کے اندر اندر اپنے ملک میں تیار ہونے والے کپڑے کی مقدار کو دوگنا کر دے گا۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا چین اپنے کارخانوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کبھی روئی کافی مقدار میں پیدا کر سکتا ہے؟ لڑائی سے پہلے روئی کی پیداوار کے سلسلے میں چین کا تیسرا نمبر تھا۔ اسکی کوشش تھی کہ وہ اپنا کفیل خود بن جائے چنانچہ ۱۹۳۶ء تک اسے اس کوشش میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن لڑائی اور پھر ۱۹۳۷ء میں آنے والے طوفان نے اس کے لائحہ عمل کو درہم برہم کر دیا اور نتیجہ یہ کہ آج چین کو اپنے کارخانے چالو رکھنے کے لئے غیر ملکی کپاس پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ اب وہ اپنی اس حکمت عملی کو کہ اس سلسلے میں اپنا کفیل آپ ہو جائے، بروئے کار نہیں لا سکتا کیونکہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ پالنے کے لئے اسے لامحالہ اشیائے خوراک کی پیداوار کو ترجیح دینی پڑے گی لیکن صنعت پارچہ بافی کو جب اسقدر فروغ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ روئی کی مانگ بڑھ جائے گی۔ نیز جاپان کے قائم کئے ہوئے وہ کارخانے جو اب چین کے قبضے میں ہیں، بہتر طریقے پر چل سکتے ہیں بشرطیکہ درمیانی اور چھوٹی قسم کی ہندوستانی روئی استعمال کی جائے۔ ان حالات کے پیش نظر یقینی ہے کہ آئندہ کئی سال تک چین میں ہندوستانی روئی کی مانگ کا سلسلہ جاری رہیگا۔

روئی کے علاوہ چین کو ہندوستانی تمباکو کی بھی ضرورت پڑے گی۔ اس کی کاشت وہاں کے تقریباً سبھی صوبوں میں ہوتی ہے۔ کپاس کی طرح اس کی پیداوار میں بھی شنٹنگ ہی کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن اسوقت سگرٹوں میں استعمال ہونے والے تمباکو کی اس ملک کو سخت ضرورت ہے۔ کم سے کم پانچ کروڑ بیس لاکھ پونڈ درکار ہے۔ اس کمی کو امریکی اور ہندوستانی تمباکو کی درآمد سے پورا کرنا پڑے گا۔ سگرٹ بنانے کے واسطے معیاری مرکب کے لئے تیس فیصدی امریکی، دس فیصدی ہندوستانی اور ساٹھ فیصدی چینی تمباکو ملانا پڑتا ہے۔ اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال چین کو ستر لاکھ سے ایک کروڑ پونڈ تک ہندوستانی تمباکو کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ آئندہ چین کی منڈیوں میں ہندوستانی تمباکو کے امکانات کس حد تک خوشگوار ہونگے۔ چین میں موجودہ رجحانات یہ ہیں کہ کسی طرح سگرٹوں والے تمباکو کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے تاکہ باہر کا مال کم منگانا پڑے۔ تاہم شمالی چین میں غیر معین صورت حالات، حمل و نقل کی سہولتوں میں کمی، اور اقتصادی زندگی میں ابتری ہونے کے باعث ابھی کچھ عرصے تک ہندوستانی تمباکو کے بغیر گذارہ کر لینا چین کے لئے ممکن نہیں ہو سکے گا۔

عام ضروریات کی چیزوں کے لئے بھی چین میں عمدہ تجارت کا موقع ہے۔ روزمرہ استعمال ہونے والی اشیاء کا دس سال تک کال پڑا رہا ہے اسلئے ان کی مانگ بہت بڑھی ہوئی ہے۔ جنگ سے پہلے چین تقریباً چھبیس لاکھ روپے کا مال جرمنی سے منگوا تا تھا۔ اس مال میں بائسکلیں، صابن، چمڑا، چمڑے کا سامان، چینی کے ظروف، ٹین میز اور دفتر کا ضروری سامان شامل تھا۔ اب ان میں سے بعض چیزیں ہندوستان بھی بھیج سکتا ہے لیکن وہ اتنی ہی رقم کے عوض ان تمام اقسام کا سامان نہیں بھیج سکتا جو پہلے جرمنی سے آتا تھا کیونکہ اول تو دیگر ملکوں کے تاجر مقابلے کے لئے موجود ہیں اور پھر خود ہندوستان بھی خوبی اور پائداری کے لحاظ سے اتنا اچھا سامان تیار نہیں کر سکتا جو جرمن کے مال کا مقابلہ کر سکے۔ تاہم اس کے لئے اس تجارت پر حاوی ہو جانے کا زرین موقع ہے جسپر جاپان قبضہ کئے ہوئے تھا کیونکہ مغربی ممالک میں تیار ہونے والے عمدہ مال کے برعکس جاپانی مال کا مقابلہ کر لینا ہندوستانی مال کے لئے کہیں زیادہ ممکن ہے۔ لڑائی سے

سالانہ کروڑوں روپے کا مال جاپان سے منگاتا تھا مثلاً سوتی کپڑے کے ٹکڑے، لوہے اور فولاد کی چیزیں، چینی کے ظروف، عمارتی سامان، بجلی کی چیزیں اور دیاسلائی کے بکس وغیرہ۔ یہ چیزیں ہندوستان سے بھیجی جاسکتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تجارتی میدان میں دوسرے ملکوں سے سخت مقابلہ رہے گا خصوصاً امریکہ سے کیونکہ وہاں سے اس وقت بھی امداد باہمی اور رفاہ مشترک کے طور پر کثیر مقدار میں ہر قسم کا سامان اس ملک میں بھیجا جارہا ہے۔ تاہم یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ قیمت کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی مال کے لئے مغربی سامان کا مقابلہ کرلینا ممکن ہے بشرطیکہ کافی عمدہ اور پائدار ہونے کے ساتھ ساتھ قیمت کے لحاظ سے بھی وہ اتنا ارزاں ہو کہ چینیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلے۔ یہ ٹھیک ہے کہ خود ہندوستان میں بھی عام ضروریات کے سامان کی کمی محسوس ہورہی ہے تاہم یہ حقیقت بالکل صاف اور واضح ہے کہ اگر اس زریں موقع پر ہندوستان نے اپنے مال کا کچھ حصہ وہاں نہ بھیجا تو آئندہ وہ اچھی صورت مشکل ہی سے ممکن ہوسکے گی جو لڑائی سے پہلے جرمنی اور جاپان کو تمام جنوب مشرقی ایشیا کی منڈیوں میں حاصل تھی۔ پھر یہی نہیں کہ ہندوستان کی تجارت کا یہ تعلق صرف چین سے وابستہ ہوکر رہ جائیگا۔ بلکہ جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ بھی تعلقات پیدا ہونے کی صورتیں نکل آئیں گی۔

روئی، تمباکو اور عام ضروریات کے سامان کے عوض چین اپنا ریشم، ٹنگ کا تیل، ہری چھلیاں، سویابین، سبز چائے، سؤر کے بال اور دھات وغیرہ ہندوستان بھیج سکتا ہے۔

ریشم کو قدیم ترین زمانے سے چین کی برآمدی تجارت میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ پہلے بھی ہندوستان چین سے کچا ریشم اور ریشم کا سامان منگایا کرتا تھا۔ آج بھی اسے ہر قسم کے ریشمی سامان کی ضرورت ہے۔ اگرچہ آجکل چین کے ریشمی مال کی کمیت لڑائی سے پہلے کے مقابلے میں تین گنی ہوگئی ہیں تاہم ہندوستان میں اب بھی اس کا سکہ آسانی سے چل سکتا ہے۔ بہترین قسم کا کچا ریشم کوانگ سو اور چی کیانگ میں تیار ہوتا ہے۔ کچا زرد ریشم ذی شون میں اور شانٹنگ میں اور شان تنگ میں بنتا ہے۔ چین میں ریشم کا موسم مئی میں شروع ہوکر اکتوبر میں ختم ہوتا ہے۔ ٹنگ کا تیل ٹنگ کے درختوں سے شنگھائی کوانگ سی، ہونان، شمالی ہوپی اور چی کیانگ کے صوبوں میں نکالا جاتا ہے۔ یہ تیل مختلف چیزوں میں کام آتا ہے مثلاً وارنش، روغن، آئل کلاتھ اور چھاپے کی سیاہی وغیرہ بنانے میں۔ لڑائی کے دنوں میں ٹنگ کا تیل بڑے بڑے صنعتی اداروں میں ایندھن کے طور پر استعمال کیا گیا۔ یہ چینی سوداگر چاہتے ہیں کہ اس تیل کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ لڑائی سے پہلے چین سے ہندوستان آنے والے مال میں ہری چھلیوں کا اوسط بہت کافی ہوتا تھا۔ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ اس سال مال کی فراہمی کس حد تک ممکن ہوگی۔ ہندوستان میں سویابین کی کھپت کچھ زیادہ نہیں ہوتی تاہم اس کی غذائی ماہیت کا لحاظ رکھتے ہوئے غور کرنا پڑے گا کہ کیوں نہ اس کی کافی مقدار منگالی جایا کرے۔ ہندوستان میں سبز چائے کی سالانہ کھپت تین لاکھ من کے قریب ہے۔ چونکہ اس ملک میں چائے نوشی کی عادت برابر بڑھتی جارہی ہے، اسلئے آئندہ کثیر مقدار میں اسکے خرچ کی توقع کی جاسکتی ہے۔ برش بنانے کی صنعت کے سلسلے میں ہندوستان چین سے سؤر کے بال بھی لے سکتا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں برش کے کارخانوں میں تقریباً ایک سو ساٹھ ٹن بال کام آئے تھے، غالباً آئندہ ایک سو ٹن کی مزید ضرورت لاحق ہوگی۔ ہندوستان کو چین کی بعض دھاتوں مثلاً سرمے، ٹنگسٹن، پارے اور چاندی کی ضرورت پڑسکتی ہے۔

ہندوستان اور چین کے مابین آزادی سے تجارت ہونے میں کئی رکاوٹیں حائل ہیں مثلاً دونوں ملکوں کے درمیان تبادلۂ زر کی آسانیاں مفقود ہیں دوسرے حمل ونقل کی دشواریاں موجود ہیں۔ تیسرے یہ کہ چین اور ہندوستان کے ان تاجروں کو جو تجارتی حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ملک میں آنا جانا چاہتے ہیں، آسانی سے پروانۂ راہداری نہیں ملتا ہے۔ پہلی رکاوٹ کا آسان علاج یہ ہے کہ حساب کتاب کے خاص انتظامات اختیار کرلئے جائیں۔ دوسری دشواری کا حل یہ ہے کہ ہندوستان اپنے بحری اور ہوائی جہاز تیار کرے اور تیسرے یہ کہ پروانۂ راہداری جلدی سے مل جایا کرے۔

وفد مذکور نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ ہندوستان کی طرف سے ایک ٹریڈ کمشنر شنگھائی اور ایک اسسٹنٹ ٹریڈ کمشنر ہانگ کانگ میں مقرر کیا جائے اور چین سے ہندوستان آنے والے مال کے سلسلے میں درآمد کا لائسنس جاری کرنے کی شرط اٹھادی جائے۔ نیز یہ کہ اس ملک میں بیمے اور بنک کی ہندوستانی کمپنیاں قائم کی جائیں۔ اگر ان سفارشات کا خیال رکھتے ہوئے قدم اٹھایا گیا تو چین کے ساتھ ہندوستان کی تجارت نہ صرف اس حد تک آسکتی ہے جو لڑائی سے پہلے قائم تھی بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر بہتر صورت اختیار کرسکتی ہے۔

روس کی روزمرّہ زندگی

جان لورنس

روس میں زندگی کا صحیح نقشہ کیا ہے؟ لوگ کس طرح رہتے سہتے ہیں؟ یہ ہیں وہ سوالات جو روس سے واپس آنے کے بعد تقریباً ہر شخص نے مجھ سے کئے۔ آج بھی آپ کو بتانے کے لئے جب میں ان مسائل پر غور کر رہا تھا میں نے تصور کی آنکھ سے ماسکو کے ایک خاص گھرانے کو دیکھنے کی کوشش کی، یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ اس وقت وہاں کیا ہو رہا ہوگا۔ یقین مانئے۔ آپ کی طرح وہ بھی اتوار کے کھانے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے لیکن ایک بات ہے۔ وہاں ابھی لنچ کا وقت بھی نہیں ہوا ہوگا۔ روس میں کھانے کے مقررہ اوقات نہیں ہیں لیکن جس کھانے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ سہ پہر کے بعد تین اور چھ بجے کے درمیان کھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی کھانے ہلکے پھلکے اور غیر معین ہوتے ہیں۔ روس میں چائے ہم انگلستان والوں سے بھی زیادہ پیتے ہیں۔ لڑائی کے دنوں میں چائے سے زیادہ چینی کی کمی ان کے لئے تکلیف دہ تھی۔ روسی چائے میں دودھ ملا کر پیالیوں میں کبھی نہیں پیتے۔ وہ بغیر دودھ کی چائے گلاسوں میں پیتے ہیں مگر چینی ضرور ملائی جاتی ہے۔ وہ مٹھاس کے بغیر چائے کبھی نہیں پئیں گے۔ اگر اتفاق سے کبھی چینی نہ مل سکے تو مربہ ہی گھول دیں گے یا چائے پینے کے ساتھ چاکلیٹ چباتے رہیں گے۔ وہ چائے میں لیموں کا ٹکڑا ڈال دینا بھی پسند کرتے ہیں۔ آجکل روسی لوگ چائے عام طور پر چائے دانی میں بنا لیتے ہیں تاہم سماوار ناپید نہیں ہوئے۔ وہ اب بھی نظر آتے ہیں۔ سماوار کو قدیم زمانے کے انگریزی چائے دانوں سے مشابہ سمجھنا چاہئے۔ بس اتنا فرق ہے کہ اس میں انگیٹھی کی بجائے لکڑی کا کوئلہ جلتا ہے۔ اس طرح دن میں ہر وقت تازی چائے مل سکتی ہے۔

انقلاب سے پہلے روسیوں نے محض تجربے کے طور پر پانچ دن کا ہفتہ منانا شروع کر دیا تھا تاکہ لوگوں کی چھٹی ہمیشہ اتوار ہی کے دن نہ ہوا کرے۔ لیکن اب یہ طریقہ متروک ہو چکا ہے چنانچہ آج وہ کسی باغیچے میں یا شہر سے دور کسی دیہاتی ماحول میں تفریح کے لئے گئے ہوئے ہوں گے۔ یا ہو سکتا ہے کہ وہ سب ماسکو سے باہر کسی جگہ اپنے اپنے وقتی کھیت میں کام کرنے کے لئے گئے ہوں۔

لڑائی کے دنوں میں انھوں نے شہروں کے نزدیک وقتی کھیتوں کی ایک اہم تحریک شروع کی تھی۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو بعض مصیبتوں سے نجات پانا ان کے لئے دشوار ہو جاتا۔ ہمارے ملک کے مقابلے میں روس میں یہ تحریک زیادہ جدید تھی۔ چنانچہ میں نے ان دنوں ماسکو سے شائع ہونے والے اپنے اخبار میں ایسے مضامین اور تصویریں شائع کیں جن سے روسی یہ اندازہ لگا سکے کہ ہم فتح حاصل کرنے کی جدوجہد میں کیا کچھ کر رہے ہیں۔ ان کھیتوں میں زیادہ تر آلو اور کرم کلے کی کاشت کی گئی۔ کیونکہ کرم کلہ روسیوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ شوربہ بنانے کے علاوہ وہ لوگ کرم کلہ بھر کر سموسے کی قسم کا ایک کھانا پکاتے ہیں جو انگلستان میں تیار ہونے والے کرم کلے کے کھانے سے کہیں زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ پہلے پہل مجھے خیال ہوا کہ وہ کرم کلے کی کوئی مختلف قسم ہوگی لیکن پھر معلوم ہوا کہ صرف پکانے کا طریقہ مختلف ہے۔ یہ طریقہ معلوم کر لینا بہت مفید ثابت ہوگا۔

روس میں زیادہ اہم خوراک ڈبل روٹی ہے۔ چنانچہ وہاں روٹی کا خرچ انگلستان سے زیادہ ہے۔ حالانکہ پانچ سال سے اس پر راشن ہے۔ یہ روٹی زیادہ تر سیاہ رائی کی ہوتی ہے پکنے کے بعد بھی وہ سیاہ رہتی ہے۔ اس کا ذائقہ ترش ہوتا ہے۔ اس لئے نئے لوگوں کو پہلے پہل بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شراب کی طرح اس کا عادی ہو جانے پر وہ کیفیت برقرار نہیں رہتی۔ پھر اس روٹی میں غذائیت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ روسی مزدور روکھی روٹی کھا کر بھی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ روسی قد آور اور قوی ہوتے ہیں۔ ان کے دانت بھی اچھے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھیں قبض کی شکایت کبھی لاحق نہیں ہوتی۔ میرے ایک دوست نے جو ڈاکٹر تھا، مجھے بتایا کہ یہ سیاہ روٹی کی بدولت ہے۔

روٹی کے بعد دوسری اہم خوراک ایک قسم کا دلیہ ہے جسے "کاشا" کہتے ہیں۔ مختلف اناجوں سے کئی مختلف قسم کے "کاشا" بنائے جاتے ہیں۔ اگر آپ کبھی اٹلی گئے ہیں تو آپ کو "پولینتا" یاد ہوگا جو وہاں کے غریبوں کی خوراک ہے۔ آپ اسے مکئی سے بنا ہوا "کاشا" کہہ سکتے ہیں۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خوراک کی یہ یک رنگی اکتا دینے والی ہوگی لیکن کچھ کھانے اس کے علاوہ بھی ہیں۔ مثلاً موسم گرما میں "کسل" یعنی پھلوں کا عرق جو میٹھا کرنے کے بعد آلو کا آٹا یا میدہ ملا کر پیا جاتا ہے۔ اگر وہ ٹھیک طرح تیار نہ ہو تو بہت ہی برا معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ اس کا ذائقہ نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ اور پھر ککڑیاں ہیں، فصل کے موقع پر تازہ تازہ اور باقی دنوں میں نمک لگی ہوئی خشک۔ کھمبیوں کی چٹنی بھی مزا دیتی ہے۔

روسی اچار چٹنی کے بڑے شوقین ہوتے ہیں اور جب وہ اپنے ملک سے باہر جائیں تو وہاں کے تیز سرکے کا ذائقہ انھیں یاد آتا رہتا ہے۔ دوسرے ملکوں کی طرح دودھ مکھن اور گوشت وغیرہ بھی روزمرہ خوراک کا جزو ہیں۔ لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ آجکل ہر روسی کو یہ چیزیں کس مقدار میں نصیب ہو جاتی ہیں کیونکہ کوئی خاص معیاری قسم کا راشن رائج نہیں ہے۔ محفلوں میں مچھلی کے کباب کے ساتھ ووڈکا (شراب) کا دور بھی چلتا ہے۔ معمولی ووڈکا خالص جن کی طرح تیز ہوتی ہے۔ وہ

چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں پی جاتی ہے اور سارا گلاس ایک دم چڑھا لینا چاہیئے۔ اگر ووڈکا پینے کے بعد کوئی چیز کھائی نہ جائے تو اثر فوراً دماغ پر ہوتا ہے اور اگر اسے روسی "زاکوسکا" کے ساتھ پیا جائے تو سارے دن اثر رہتا ہے اور دوسرے روز بھی طبیعت بحال رہتی ہے بشرطیکہ شراب اعلیٰ قسم کی ہو اور جسم میں جان بھی ہو۔ روسی لوگ محفلوں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اگر آپ ایک بار کسی محفل میں شریک ہو جائیں تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا سلسلہ کب ختم ہوگا۔ ایک بار ایک روسی نے مجھے ڈیڑھ بجے کے قریب لنچ کے لئے مدعو کیا۔ ساڑھے پانچ بجے ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ میرا مطلب ہے کہ دوسرے روز صبح کے ساڑھے پانچ بجے۔ سہ پہر کی چائے، شام کا کھانا، رات کا سپر اور پھر ساری رات شراب و کباب۔ ابتدائی بارہ گھنٹوں میں گفتگو نہایت معقول رہی لیکن پھر مزا خراب ہوتا چلا گیا۔

آپ حیران ہوں گے کہ ایسی محفلوں کے لئے اتنی بڑی مقدار میں کھانا کہاں سے آجاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے راشن کے طریقے کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ سوویت یونین میں ہر چیز کا معاوضہ نتائج کے اعتبار سے ملتا ہے۔ اس لئے ہر شخص کے راشن کا انحصار اس کام پر ہے جو وہ انجام دیتا ہے۔ چنانچہ سخت کام کرنے والوں کو دفتر کے منشیوں سے زیادہ مقدار ملتی ہے۔ اگر کام زیادہ ذمہ داری کا ہو تب بھی اس میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ بے روزگار لوگوں کو بہت ہی کم راشن ملتا ہے۔ ایسی صورت میں بوڑھے اور بیمار لوگوں کو زیادہ دقت رہتی ہے۔ بڑی بوڑھیاں اگر بیٹیوں پوتوں کے ساتھ نہ رہیں تو گزارہ مشکل سے ہوتا ہے۔ وہ گھر کے کام کاج میں مدد دینے کے علاوہ راشن لانے میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ وہ ہر چیز کے لئے گھنٹوں قطار میں کھڑی رہتی ہیں۔ ماسکو میں بڑی لمبی لمبی قطاریں دیکھنے میں آتی ہیں۔ لوگ اپنی مرضی کے مطابق کسی دوکان کو اپنے راشن کے لئے مخصوص نہیں کر سکتے بلکہ کام کاج کے ہر مرکز سے ملحق ایک علیحدہ دوکان ہوتی ہے اور اس مرکز کے لوگوں کو وہیں سے چیزیں خریدنی ہوتی ہیں۔ ہر چیز کی قیمت سرکاری طور پر مقرر ہوتی ہے اور دوسرے ملکوں کے مقابلے میں وہاں گرانی کم ہے۔ لیکن ایک بات عام ہے۔ کوئی شخص سخت کام کرنے والا ہو، یا کسی ذمہ دار ادارے کا مالک و منتظم ہو، اسے صرف ضروریات زندگی ہی مل سکیں گی۔ اگر کوئی شخص زیادہ عیش کرنا چاہے تو اسے لازمی طور پر فالتو کام کرنا پڑے گا۔ بس یہی ایک طریقہ خاص طور پر دوسرے ملکوں کے راشنی نظام سے مختلف ہے اپنے نام کا مقررہ راشن لے چکنے کے بعد ہر شخص اس بازار میں جا سکتا ہے جہاں چیزیں کھلے بندوں بکتی ہیں۔ ان تجارتی دوکانوں سے فالتو اشیاء حسب ضرورت مل سکتی ہیں خواہ وہ راشن میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔

اب تک ان گھرانوں کے نظام حیات کی تصویر کھینچی گئی ہے جو بڑے بڑے شہروں میں آباد ہیں۔ لیکن یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بازار میں کھلے بندوں فالتو چیزیں کس طرح مل سکتی ہیں، یہ جاننا ضروری ہے کہ دیہات کے لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

روس کے زیادہ باشندے دیہاتوں میں رہتے ہیں اور بہت سے دیہات بڑے شہروں سے کافی فاصلے پر آباد ہیں۔ سڑکیں خراب ہیں اور اگر ریل کی پٹری کہیں پاس نہ ہو تو بہت سے دیہاتوں کا عام سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن روس میں دیہاتی ہونا فائدے سے خالی نہیں ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مقامی طور پر تیار کی ہوئی چیزوں پر کوئی راشن نہیں ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑائی کے زمانے میں دیہاتیوں کو کھانے پینے کی کوئی دقت نہیں ہوئی۔ البتہ دوسری چیزوں کی کمیابی یا نایابی نے ان کو مشکلات میں مبتلا کر رکھا۔ مثلاً جاڑے کی راتوں میں انھیں شدید تاریکی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ چراغوں میں جلانے کے لئے سیرافین بالکل نہ مل سکی۔

روس کے دیہات عموماً "مشترک کھیتوں" کی صورت میں منظم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گاؤں کے چاروں طرف کی ساری زمین ایک بڑے کھیت کی حیثیت رکھتی ہے جس میں سب لوگ مل کر کام کرتے ہیں۔ پیداوار میں سے ہر شخص کا حصہ اس کام کی نوعیت اور مقدار پر منحصر ہوتا ہے جو وہ انجام دیتا ہے۔ ہر "مشترک کھیت" کے لئے سرکاری ہدایت ہوتی ہے کہ وہ کونسا اناج بوئے۔ یہ صورت انگلستان کی "وار ایگریکلچرل کمیٹیوں" کے طریقۂ کار سے ملتی جلتی ہے۔ کل پیداوار میں ہر چیز کی ایک مقررہ مقدار حکومت کے سپرد کر دی جاتی ہے تاکہ اسے شہروں میں لیجا کر لوگوں میں تقسیم کیا جا سکے۔ اس مقدار کے علاوہ جو کچھ ہو وہ دیہاتیوں کا حصہ ہے اور وہ اسے جس طرح چاہیں صرف کر سکتے ہیں۔ اگر کسی کھیت میں فالتو مقدار پیدا نہ ہو سکے، تو اسے بہت ہی ناقص سمجھا جا سکتا ہے۔ اس فالتو مقدار سے دیہاتی اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد باقی چیزیں مختلف طریقوں سے شہر والوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔

روس میں قطاروں میں بنے ہوئے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے مکانات مل کر ایک گاؤں بن جاتا ہے۔ ان مکانوں میں فاصلہ بھی کافی ہوتا ہے۔ ہر مکان کے چاروں طرف ایک آدھ ایکڑ زمین ہوتی ہے۔ یہ مشترک کھیت کے علاوہ ہوتا ہے۔ لوگ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق اس میں چیزیں بوتے اور کاٹتے ہیں۔ اس پیداوار میں سے بھی جو کچھ مقدار اپنی ضروریات کے بعد بچ رہتی ہے اسے بازار میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ گھر کے لوگ اپنی چیزیں خود لے کر بازار میں جاتے ہیں کسی معاوضے یا کمیشن پر یہ کام دوسروں سے کرانا قانون کے خلاف ہے۔ چنانچہ کسانوں کی ایسی منڈیاں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان منڈیوں میں کسانوں کی عورتیں سر سے پاؤں تک شال لپیٹے، مکھن کی ٹکیاں، انڈے اور مرغیاں بیچتی نظر آتی ہیں۔ اگر یہ چیزیں ان کی ذاتی ملکیت ہوں تو وہ مرضی کے مطابق قیمت بھی وصول کر سکتی ہیں۔

غرض یہ کہ سوویت یونین میں رہنے والوں کا طریقۂ زندگی یہی کچھ ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ راشنی نظام سے بہت جلد

حاصل کرلینا چاہتے ہیں۔ انہیں امید ہے کہ اس سال غذائی اشیاء کی راشننگ ضرور ختم ہو جائیگی اور باقی چیزوں کی پابندی اگلے سال تک اٹھ جائے گی۔ ایسا ہو جانے پر کوئی بناوٹ باقی نہیں رہے گی کیونکہ پچھلے دو سال میں وہاں تمام بڑے بڑے شہروں میں ایسی دکانیں کھلی رہی ہیں جہاں کپڑے، مشین، ہر طرح اشیائے خوراک، شراب، گراموفون کے ریکارڈ، گرم پانی کی بوتلیں، کھلونے، اور تمام ضروریات کی وہ تمام چیزیں ملتی رہی ہیں جو انگلستان وغیرہ میں نایاب تھیں۔ بلیک کنٹرول کا طریقہ رائج نہ ہونے کے باعث قیمتیں بے پناہ اور انگلستان کے عام معیار سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہ دکانیں حکومت نے خود چلائی تھیں تاکہ ان کا نفع جنگی مصارف پورا کرنے کے کام آسکے لیکن یہی قیمتیں گھٹنی شروع ہو گئیں اور اب بھی کم ہوتی جا رہی ہیں۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں جب میں پہلے پہل سوویت یونین پہنچا تو صحیح معنوں میں ہر چیز خرید لینی ممکن تھی سوائے اس کے کہ نرخ ہوش اڑا دینے کی حد تک زیادہ تھا یعنی آرام سے زندگی بسر کرنے کے لئے لکھ پتی ہونے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ لوگ روپے پیسے کے دلدادہ نہیں تھے۔ کسی شخص سے کوئی کام لیا جاتا تو وہ یہ نہ پوچھتا کہ کیا تنخواہ ملے گی۔ بلکہ دریافت کرتا کہ اس کے عوض مجھے کیا ملے گا؟ مطلب یہ کہ کتنا کھانا اور کتنا کپڑا ملے گا؟ روسی جب کبھی کسی کارخانے میں کام کرتے ہیں، وہ معاوضہ کے طور پر کپڑا لینے کی توقع ضرور رکھتے ہیں۔

عشرتِ عید — تابش دہلوی

آج ہر اک پہ ایزد باری ۔۔۔ ہو گئی عید کی خوشی طاری
عیش و عشرت کی یہ فراوانی ۔۔۔ متبسم ہوئی فضا ساری
بیش قیمت لباس ہیں سب کا ۔۔۔ لوگ دکھلا رہے ہیں زرداری
ہے معطر دماغ خوشبو سے ۔۔۔ پائے تخیل عیش سے بھاری
خلد نظارہ ہے نگاہوں کو ۔۔۔ حسن صورت کی آئنہ کاری
پردۂ گوش پہ ہر اک آواز ۔۔۔ آج کرتی ہے خوب گلکاری
کیوں نہ ہر ایک ہو سبک نغمہ ۔۔۔ سب کی دولت جیب بھاری
لیکن ان کو خبر نہیں کچھ بھی ۔۔۔ رنگ لائی خرد کی عیاری
دہر کی ہر خوشی ہے مصنوعی ۔۔۔ عقل سے ہو گئے ہیں سب عاری
عیش غم کو بنا دیا تابش ۔۔۔ زندگی بھی ہوئی ایک بیکاری

سونے کیلئے — اظہار ملیح آبادی

کیوں گھٹا اٹھتی ہے منہ اشکوں سے دھونے کے لئے
آج ہم بیٹھے ہیں دنیا کو ڈبونے کے لئے
کیا حقیقت بجر کی، ہاں ایک صورت ہے فقط
آپ خود آئیں مری کشتی ڈبونے کے لئے
صبح کے تارے چمکتے ہیں نگاہیں چرخ پر
کتنا موزوں وقت ہے جی بھر کے رونے کے لئے
گاہ بادہ نوش گاہے عابد شب زندہ دار
دہر میں کیا کیا ہوئے تھے ہم نہ ہونے کے لئے
قبر کی جانب سے یہ کہتی ہوئی گذری حیات
اتنا شور و شر کیا تھا ایک کونے کے لئے
خار سے اظہار کیا امید ہو سکتی نہیں
پھول جب تیار ہے کانٹا چبھونے کے لئے

آج کل

اردو کا پندرہ روزہ تصویری رسالہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۲ | ۱۵ نومبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم
ایم۔ اے

ناشر — مدیران
فضل حق قریشی دہلوی — بھگت سروپ ایم۔ اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۰۲ دہلی

رفتار زمانہ

عہدوں کی نئی تقسیم

کئی ہفتے کی مسلسل گفت و شنید اور خط و کتابت کے بعد آخرکار یہ صورت پیدا ہوئی کہ ہندوستان کی دو بڑی جماعتیں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ ایک مرکز پر آکر عبوری حکومت میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہوگئیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے نمائندوں کو مناسب عہدے دینے کی خاطر تفویض شدہ عہدوں کو نئے سرے سے تقسیم کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں وائسرائے ہاؤس سے حسب ذیل اعلان شائع ہوا ہے:-

مسلم لیگ کے ان نمائندوں کو جو حال ہی میں عبوری حکومت کے اراکین مقرر ہوئے ہیں، ہز ایکسیلنسی گورنر جنرل نے حسب ذیل عہدے تفویض کئے ہیں:-

۱- مسٹر لیاقت علی خاں ...... مالیات۔ ....
۲- مسٹر آئی، آئی چندریگر .... تجارت ....
۳- مسٹر عبدالرب نشتر ...... مواصلات (ڈاک خانہ اور فضا)
۴- مسٹر غضنفر علی خاں .... حفظان صحت ....
۵- مسٹر جوگندر ناتھ منڈل ...... قانون سازی ....

اس طرح دوسرے عہدوں میں جو تبدیلیاں ہوئیں، وہ حسب ذیل ہیں:-

۶- مسٹر جان متھائی .... صنعت و حرفت اور فراہمی ....
۷- مسٹر راجگوپال آچاریہ .... تعلیم و فنون ... .
۸- مسٹر بھابھا .... امور عامہ، معادن و قوت ......

باقی عہدے جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی حسب ذیل ہیں:-

۹- پنڈت جواہر لال نہرو .... امور خارجہ اور تعلقات دولت مشترکہ
۱۰- سردار ولبھ بھائی پٹیل ...... امور داخلہ اور اطلاعات و نشریات۔
۱۱- ڈاکٹر راجندر پرشاد .... خوراک و زراعت۔ ....
۱۲- مسٹر آصف علی .... حمل و نقل اور ریلوے ....
۱۳- سردار بلدیو سنگھ .... دفاع ....
۱۴- مسٹر جگجیون رام .... لیبر ....

دوسرے دن صبح کے ساڑھے دس بجے کابینہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں نئے اراکین نے حلف وفاداری اٹھایا۔

چین میں قحط کے امکانات

غیر سرکاری طور پر اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس سال موسم سرما میں چین کے تقریباً پانچ کروڑ باشندوں کو قحط کا سامنا کرنا پڑے گا۔ موجودہ حالات اسوقت بھی نازک ہے چنانچہ شمالی کوانگسی کے اضلاع میں اوسطاً سو آدمی ہر مہینے بھوک سے مر جاتے ہیں۔ صوبہ ہونان کے قریب جوار میں شرح اموات اس سے بھی دس گنی زیادہ ہے۔ میڈم چیانگ کائی شیک نے اپنی قوم کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ چین کے نوّے فیصدی باشندے دیہاتوں میں آباد ہیں۔ اس وقت انکی خوراک کا خاطر خواہ انتظام ملک کے سامنے ایک دشوار مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وزارت اغذیہ پورے وثوق کے ساتھ یہ اعلان کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ جس لڑائی میں جو قحط روکنے کے لئے جاری کر رکھی ہے، کامیابی نصیب ہوسکیگی یا نہیں۔

وزیر اغذیہ مسٹر ہاؤکان نے کہا! "گذشتہ چند ماہ کے دوران میں قحط پر قابو پانے کے سلسلے میں ہماری کوششیں پوری طرح اطمینان بخش ثابت نہیں ہوسکیں کیونکہ لڑائی کے باعث حمل و نقل کی سہولتیں بالکل مسدود ہوگئی ہیں یا ناقابل اطمینان ہیں۔ آجکل چاول سے بھری ہوئی کشتی کو ہونان سے ذی خوان تک جانے میں پورے دو مہینے لگ جاتے ہیں خشکی کے راستے جانے میں تو مشکلیں اور بھی زیادہ ہیں غیر ملکی اناج کے مقابلے میں خود چین کے بعض صوبوں کا مال قحط زدہ علاقوں میں زیادہ دیر سے پہنچتا ہے۔" چین میں چاول بکثرت پیدا ہوتا ہے لیکن اسوقت گیہوں کے علاوہ اسے چاول کے لئے بھی دوسرے ملکوں کا دست نگر ہونا پڑ رہا ہے چنانچہ وزارت اغذیہ کو یقین ہے کہ بہت جلد آسٹریلیا، کینیڈا اور امریکہ سے گیہوں اور ہند چینی، سیام اور فارموسا سے چاول ان کے ملک میں پہنچ جائیگا۔

لندن کا ایک اخبار

لندن کے ایک ہفتہ وار اخبار نیوز آف دی ورلڈ نے حال ہی میں دعوی کیا ہے کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ہے۔ چار ہفتے کی کل فروخت کا اوسط نکالتے ہوئے حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ ہر اشاعت کے چھ کروڑ اکہتر لاکھ بہتر ہزار تین سو تیرہ ہی

پرچے فروخت ہوتے [illegible] ... [illegible] اخبار [illegible] دور
ہونے کے بعد ظہور میں آئی ہے۔ اس اخبار میں [illegible] سے متعلق کہانیاں
وتکمیل کو کے واقعات درج ہوتے ہیں۔ اس کا دعویٰ اگر صحیح ہے تو اس میں شک
نہیں کہ یہ تعداد حیرت انگیز ہے۔ ہندوستان جیسے ملک کا کوئی ہفتہ وار
اخبار پانچ سال بھر کی مجموعی اشاعتوں کی کل تعداد سے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

لاہور کے چھ نئے اخبارات

لاہور کی موجودہ آبادی تقریباً آٹھ لاکھ ہے اور وقت اس شہر سے اٹھارہ روزانہ اخبارات شائع ہوتے ہیں، جن کے باعث شمالی ہند کے میدانِ صحافت میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اب جبکہ تین انگریزی اور تین اردو اخبارات کی اشاعت عمل میں آ رہی ہے، وہ کلکتہ اور بمبئی کو بھی دور چھوڑ جائیگا اور اس طرح سارے ملک میں اولیت کا سہرا اسی کے سر رہیگا۔ بعض صحافتی حلقوں کا خیال ہے کہ ابھی اس تعداد میں اور اضافہ ہوگا کیونکہ عوام میں اخبار بینی کا شوق برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ ان چھ میں سے پہلا اخبار "پاکستان ٹائمز" کے نام سے نکلیگا مسلم لیگ کے چند مشہور اراکین جن میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر خان افتخار حسین والیٔ ممدوٹ بھی شامل ہیں، اس کی مالی مدد کرینگے یہ اخبار مسلم لیگ کے خاص نصب العین (پاکستان) کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ لیگ کی اہم کارگذاریوں سے عوام کو آگاہ کرے گا۔ ایک اور اخبار "نیو انڈیا" کے سرپرستوں میں دو نام قابلِ ذکر ہیں۔ پنجاب نیشنل بنک کے منیجنگ ڈائرکٹر مسٹر لودھراج اور وزیر مالیات مسٹر بھیم سین سچر بیٹھ سدرشن ایم ایل اے انگریزی اخبار "بھارت" نکالیں گے جس میں کانگریس کے نصب العین کا پرچار کانگریس کے بیان پر ہوگا۔ اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے سیکرٹری مسٹر دریندر اردو میں "بندے ماترم" ہند نکالیں گے۔ یہ بھی کانگریس کی حکمت عملی اور اس کے لائحہ عمل کی ترجمانی کریگا۔ لالہ لاجپت رائے "پنجابی کے" "مرحوم" اخبار "بندے ماترم" کو کانگریس کے چند نوجوان حیاتِ نو بخشینگے۔ نور دورڈھاک کے نئے اخبار کا نام "رنجیت" ہوگا۔ سبھاش چندر بوس کے سالار اعلیٰ سردار سردول سنگھ کولیشر اس کی مالی مدد کریں گے۔

اوسط پیداوار کا تناسب

کھیتی باڑی کے قدیم ترین طریقوں کو ابھی تک مدِ نظر رکھنے کے باعث ہندوستان زراعت کے میدانِ عمل میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ اسکا صحیح اندازہ آسانی کے ساتھ زمین کی اوسط پیداوار سے لگایا جا سکتا ہے یعنی یہ دیکھا جائے کہ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی ایک ایکڑ زمین میں ایک خاص پیداوار کا اوسط وزن کس قدر ہوتا ہے، تو حیرت انگیز اعداد و شمار علم میں آتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل نقشے سے چند اشیائے خوراک کی اوسط پیداوار کا باہمی تناسب ظاہر ہوتا ہے:-

ملکوں کے نام	گیہوں	چاول	روئی	گنّا
	پونڈ فی ایکڑ	پونڈ فی ایکڑ	پونڈ فی ایکڑ	ٹن فی ایکڑ
ہندوستان	۶۳۲	۸۵۱	۸۹	۳۸۸
ارجنٹائن	۷۸۰	——	۱۵۱	——
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۸۴۶	۱۳۴۳	۲۶۴	——
کینیڈا	۹۷۲	-	——	——
اٹلی	——	۲۷۹۷	——	——
مصر	——	۱۸۴۵	۵۳۱	——
جاپان	——	۲۱۲۴	——	——
جاوا	——	——	——	۴۶۴۳
پیرو	——	——	——	۱۱۷۰

سبھاش چندر بوس

گذشتہ ایک سال کے دوران میں ہندوستان کی قومی فوج کے سالار مسٹر سبھاش چندر بوس کی زندگی اور موت کے سلسلے میں مختلف قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ وہ جس پُراسرار طریقے پر لڑائی کے دوران میں ہندوستان سے غائب ہوئے تھے، اس سے کہیں زیادہ پُراسرار صورت لڑائی ختم ہونے کے بعد پیدا ہو گئی۔ تاہم ملایائی یونین کے محکمہ تعلقات عامہ کی طرف سے جو اعلان حال ہی میں شائع ہوا ہے، اُسے پڑھنے کے بعد اب شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ موصوف ۱۹۴۵ء میں یقیناً سورگباش ہو چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے اعلیٰ اتحادی کمانڈر کی درخواست پر ٹوکیو میں عمیق تحقیقات عمل میں آئیں اور اس نتیجہ پر پہنچا گیا کہ اب وہ اس دنیا میں زندہ موجود نہیں ہیں۔ امریکی محققین کا بیان ہے کہ ۱۸ اگست ۱۹۴۵ء کو ہوائی جہاز کے ایک حادثے سے زخمی ہو کر وہ تائی ہوکو ہسپتال میں داخل ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں چھ مختلف اشخاص کی مختلف اوقات میں جرح کی گئی اور سب کا بیان یکساں پایا گیا۔ انھوں نے یک زبان ہو کر اس واقعہ کی تصدیق کی۔ اس ضمن میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان لوگوں سے ان باتوں کے بارے میں پہلے سے کوئی سازش کر لی گئی ہوگی کیونکہ جن لوگوں کو طلب کیا گیا ان سب کو وقت کے وقت اطلاع دی گئی اور فیصلہ بھی عجلت کیا گیا تھا۔

فلسطین میں نئے آثارِ قدیمہ

فلسطین میں بڑا اہم ہوا کہ اوڈسے کے شمال میں راس العین کے مقام پر دوسری یا تیسری صدی قبل مسیح کی چند عظیم الشان یونانی

علاقوں کے آثار برآمد ہوئے ہیں۔ اگرچہ پوری تفصیل ابھی شائع نہیں ہوئی ہے حکومت فلسطین کے محکمۂ اثریات نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ان علاقوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ راس العین کانسی کے ابتدائی عہد یعنی دو ہزار قبل مسیح میں آباد اور حکومت کنعان کا مرکزی مقام تھا۔ عہد عتیق میں وہ آفک کہلاتا تھا۔ آسمانی صحائف میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے۔ حضرت سیموئیل کی پہلی کتاب کے چوتھے باب کی پہلی آیت میں ایک لڑائی کا ذکر ہے جو آفک کے مقام پر ہوئی اور جس میں اہل فلسطین نے اسرائیلیوں کو بری طرح شکست دی تھی۔ یونانیوں کے عہد میں اس شہر کا نام پیگائے یعنی چشمہ تھا لیکن ہیرود اعظم نے شہر کی تعمیر نئے سرے سے کی اور اپنے باپ اینٹی پیٹر کے نام پر اس کا نام اینٹی پیٹرس رکھا۔ ان انکشافات سے ظاہر ہے کہ تاریخ کے بہت سے گم شدہ اوراق تاریکی سے روشنی میں آ جائیں گے۔

ہندوستان کیلئے اناج

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد سمندر پار ملکوں نے جن اناجوں سے ہندوستان کی مدد کی، ان کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:-

اقسام اناج	۱۰ اکتوبر کو ختم ہونے والے ہفتے میں	یکم جنوری سے ۱۰ اکتوبر تک کل تعداد
گیہوں	۸,۷۰۰ ٹن	۱۰,۷۷,۰۰۰ ٹن
چاول	۴,۵۰۰ ٹن	۲,۲۹,۰۰۰ ٹن
مکئی	۹,۶۰۰ ٹن	۱,۰۶۲,۴۰۰ ٹن
جَو	۶,۰۰۰ ٹن	۴۲,۰۰۰ ٹن
جوار باجرہ وغیرہ	۸,۵۰۰ ٹن	۱۶,۵۰۰ ٹن

چھتیس سال میں تیس میل

۱۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو لندن سے ایک خط مسز آر جونسن کے نام روانہ کیا گیا تھا۔ لفافہ پر نصف پینی والا اسٹرلنگ کا ٹکٹ چسپاں تھا جس پر شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تصویر بنی ہوئی تھی کیونکہ اس وقت انہی کی حکومت تھی۔ یہ خط حال ہی میں مسز رونسن کے پتہ پر ہالنگ کورٹ، ایپنگ، چیمسفورڈ پہنچا ہے۔ حالانکہ ان کو وہ مکان چھوڑے کافی عرصہ ہو گیا اور وٹ کے مقام پر ان کے انتقال کو بھی چند ہفتے گزر چکے ہیں۔ لندن سے چیمسفورڈ کا فاصلہ تقریباً تیس میل ہے جسے مذکورہ بالا خط نے چھتیس سال میں طے کیا۔ انگلستان کے محکمۂ ڈاک کی جلدبازی اور عجلت پسندی ضرب المثل سمجھی جاتی ہے شاید یہ اس خصوصیت کی ایک زندہ مثال ہے جس طرح فوج کے بہت سے بہادر نوجوانوں کو اعزازی تمغے انتقال کرنے کے بعد عطا کئے جاتے ہیں تاکہ ان کی بجائے انکی روح مسرت و شادمانی محسوس کرے۔ اسی طرح یہ خط مرحومہ کے مکان پر ان کی وفات کے بعد پہنچایا گیا۔

دہلی کے دیہاتوں میں شاہی سکے

حکومت ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ کی رپورٹ بابت ۱۹۴۶ء کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ الٰہ آباد کے قریب ایک گاؤں میں کھدائی جاری تھی کہ اچانک نو عدد ہسپانوی سکے برآمد ہوگئے۔ ان سکوں پر شاہ فرڈیننڈ ہفتم کی تصویر ہے جو ۱۸۱۳ء سے ۱۸۳۳ء تک ہسپانیہ کا بادشاہ تھا۔ اس تحقیق کی بنا پر پتہ چلتا ہے کہ ہسپانیہ اور ہندوستان کے مابین اس زمانے میں تجارتی تعلقات قائم ہو گئے۔ مغل بادشاہوں کے چند سکے قنوج نامی گاؤں سے بھی نکلے ہیں جن میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی دو طلائی مہریں بھی شامل ہیں۔ ان میں سے ایک مہر احمد نگر کی ٹکسال سے اور دوسری اورنگ آباد کی ٹکسال سے جاری ہوئی تھی۔ اسی طرح دہلی کے بادشاہ علاؤالدین محمد شاہ ثانی خلجی کے جاری کئے ہوئے چند ایسے سکے برآمد ہوئے ہیں جن پر فارسی اور ناگری رسم الخط میں حروف کندہ ہیں۔ یہ سکے ۱۲۹۶ء سے ۱۳۱۶ء تک مختلف اوقات میں بنے تھے۔

جامعہ ملیہ کا جشن سیمیں

آج سے پچیس سال پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد علی گڑھ میں رکھا گیا تھا۔ اس کے پہلے امیر مولانا محمد علی مرحوم تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ درسگاہ وہاں سے منتقل ہو کر قرول باغ دہلی میں آگئی اور اب چند سال سے مستقل طور پر اوکھلے کے قریب جامعہ نگر میں قائم ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت اور تعلیمی سرگرمیوں پر ایک مفصل مقالہ آپ پچھلے شمارے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ یہاں اس کے جشن سیمیں کا ذکر کرنا مقصود ہے جو ۱۰ نومبر سے ۱۵ نومبر تک منایا جا رہا ہے۔ اس کے پروگرام پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی تقریب کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور کامیاب بنانے کے لئے جامعہ کے ارباب حل و عقد، خصوصاً ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (شیخ الجامعہ) نے صحیح ذوق نظر کا ثبوت دیا ہے۔ اس دوران میں جامعہ کی مسجد اور ابتدائی کی عمارتوں کے سنگ بنیاد رکھے جائیں گے۔ نمائش کا افتتاح ہوگا، خواتین، طلبائے قدیم، اساتذہ اور عربی کے جلسے ہونگے، تیراکی اور دوسرے کھیلوں کے مقابلے، ڈرامہ، مشاعرہ، اسکاؤٹ ریلی، کیمپ فائر اور علمائے کرام کی تقریریں ایسی ناگوں دلچسپیوں میں اضافہ کریں گی۔ امیر جامعہ کی طرف سے حضرات کی دعوت بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں ہے۔ اس طرح دماغی لطف و نشاط کے ساتھ ساتھ کام و دہن کی یہ لذت بھی اس تقریب کی ہمیشہ یاد دلاتی رہیگی۔

خواتین کے جلسے کی روح رواں محترمہ صالحہ عابد حسین ہیں۔ ان کے ایک پیغام سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ میں جلد سے جلد لڑکیوں کی تعلیم کے لئے بھی ایک مدرسہ قائم کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔

غزل

آرزو لکھنوی

تقدیر پہ شاکر رہ کر بھی، یہ کون کہے تدبیر نہ کر
وا باب اجابت ہو کہ نہ ہو زنجیر ہلا تاخیر نہ کر

غم بڑھنے دے اور ذرا اے دل جانچ آہ کی بے تاثیر نہ کر
ہے خواب ادھورا آپ ابھی، بے سمجھے غلط تعبیر نہ کر

جب ظلم کا بدلہ ظلم ہوا مظلوم کا حق کچھ بھی نہ رہا
دے درد ہی میں لذت یارب نالے کو عطا تاثیر نہ کر

ہو لاکھ کمان کڑی قاتل، کچھ جذب نشانے میں بھی ہے
بازو کے بل پہ نظر کر کے، اندازۂ زخم تیر نہ کر

پیمانِ محبت ختم ہوا، اب ذکر سے اسکے فائدہ کیا
بکھری کڑیوں کے منہ نہ ہلا، تیار نئی زنجیر نہ کر

الفت کے عہدِ محکم میں، بودے کاغذ کی ضمانت کیا
یہ دل سے دل کی باتیں ہیں، رکھ یاد فقط تحریر نہ کر

ہر دل ہے حیات کا سرمایا، اور دل میں جوشِ محبت کا
تو آرزو اور کہے گا بس رہنے بھی دے تقریر نہ کر

ادیب الملک اکبر حیدری مرحوم

جہانِ حسن میں جو ترنم ہے وفا میری ۔ میں نغمہ ہوں محبت کا محبت ہے صدا میری
بلا ہے ضعف کو جس پر امید کامرانی تھا ۔ ترا مسکن خود داری ہے وہ التجا میری
حقیقت کی نگاہوں میں [illegible] پرستش تھی ۔ ہوئی ہے جذبِ الفت مخفی افشاں ہیچ دعا میری
تمنا آئینہ وہ بھی دل کی بیکسی سے ہے بنایا ۔ نہ بھی جائے گی دنیا سے تصویرِ وفا میری
نیاز و ناز کا افسانہ سمجھنے کے لئے اکبر
سنی ہے کاتبِ قدرت نے بزبانِ التجا میری

یہ تھے وہ اشعار جو دہلی کی "بزم اردو" کے ایک اجلاس میں گونجے، سننے والوں نے داد کا غلغلہ بلند کیا۔ شاعر کی مترنم آواز نے ایک مخصوص تحت اللفظ کے انداز میں یہ اشعار پڑھے۔ مجمع میں دہلی اور بیرون دہلی کے مخصوص شعراء موجود تھے۔ داد کا شور کم ہوا تو حضرت سائل مرحوم کی بلند آواز گونجتی ہوئی سنائی دی۔ جو اس جلسہ کی صدارت فرما رہے تھے "حیدری صاحب۔ نیا رنگ اختیار کیا ہے آپ نے ماشاء اللہ، بہت خوب۔ نادر انداز ہے۔" یہ تھے ادیب الملک اکبر حیدری جن کی وفات کو اب چھ برس گزر چکے ہیں۔ مگر ان کے احباب کو اب تک یقین نہیں آتا کہ ایسا صحت مند، زندہ دل، آزاد مرد دیکھتے ہی دیکھتے بزمِ احباب کو اس طرح دغا دے سکتا ہے۔ مخصوص احباب میں ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اکبر نے شاعرانہ دل و دماغ مگر شکل پہلوانوں کی پائی ہے۔ متوسط قد، تنومند، گول چہرہ، خندہ پیشانی، مسکراتی ہوئی شربتی آنکھیں جن میں ہر وقت پائپ کے تمباکو کا دھواں ناچ ناچ کر ایک ہلکا خمار قائم رکھتا تھا۔ نہایت خوش پوش اور اتنا ہی خوش باش اور خوش مزاج مرنجان مرنج طبیعت کا انسان۔ اپنے مخصوص اصولوں کا سختی سے پابند۔ مذہب اسلام کا سچا شیدائی۔ دن بھر انگریزوں کو اردو ہندی پڑھاتا اور خود پنج وقتہ نماز پڑھتا۔ انہیں انگریزی اُردو کے علاوہ ہندی اور پشتو اور فارسی میں معقول مہارت تھی۔ بذلہ سنجی اکبر کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ بات بات میں لطیفے کہتے۔ دکھ درد میں بھی ہنستے رہتے لیکن دوسرے کے درد کے ہمدردی سے شریک تھے۔ اور دوستوں کا دکھ اپنا دکھ سمجھتے۔ صاف باطن اور صاف گو حد درجہ تھے۔ وضع اور اصول کی پابندی ان کا ایمان تھا۔

ذیل کے قطعہ میں تصنع اور پُرفریب زندگی سے کس دیدہ دلیری سے طنزیہ گریز کیا ہے ؎

تصنع ہے تملق ہے [illegible] تماشا ہے ۔ کبھی [illegible] زندگی کا
خداوندا مری گمراہیوں سے درگذر فرما ۔ میں اُن [illegible] تمام دنیا کا

اکبر کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا ان کی بذلہ سنجی بہت سے لوگوں کو ان سے بے تکلف بنا لیتی تھی۔ لیکن مخصوص دوستوں میں صرف چند ہی تھے جن میں حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ، سید ذوالفقار علی بخاری اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو، بھیا احسان الحق حقی، ملا محمد الواحدی، ڈاکٹر سعید احمد بریلوی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، قاری عباس حسین (آنند قوم دہلی) [illegible] (دہلی) اور مرحوم لطفی آور دہلوی۔ ایک نظم میں دہلی کی بزمِ ادب کا تذکرہ اکبر مرحوم نے اس طرح کیا تھا ؎

خوبیٔ قسمت سے ہیں اہلِ نظر ارباب ہوش ۔ معنوی فرزند تیرے تیری بزمِ ناز میں
تیری خدمت پر کمربستہ بصد جوش و خروش ۔ ہیں ترے نورِ نظر لیکن نئے انداز میں
ہیں بخاری، عشرت و محمود و تاباں و حزیں
تیری بزمِ علم و فن میں آج تحسین آفریں
بارگاہِ علم ہے نیرنگ کی بزمِ ادب ۔ خادمانِ بزمِ اردو ہیں یہاں معروفِ کار
اکبر و حقی، سعید و برق و قادری سب کے سب ۔ تیری محفل کے لئے ہیں باعثِ عزّ و وقار
اے جہان آباد کی خفتہ زمیں بیدار ہو
یعنی اب گل آفرینی کے لئے تیار ہو

اکبر مرحوم راقم الحروف اور مذکورہ بالا احباب مشاعروں، نجی صحبتوں اور ادبی جلسوں میں اکثر ساتھ رہے۔ ان دلچسپ علمی ادبی محفلوں کی رنگینیاں اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو چکی ہیں۔ فانی دنیا کے نقوش کس قدر بے ثبات ہیں۔ چند سال گذرے ہیں۔ کیا کیا صحبتیں برہم ہوئیں۔ زیادہ مدت بھی نہیں گذری لیکن معلوم ہوتا ہے ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

دہلی کی بزمِ ادب سالہا سال قائم رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُجڑ گئی۔ اکبر مرحوم اس بزم کے سکریٹری تھے۔ اچھے اچھے مشاعرے اور مفید معرکتہ الآرا جلسے منعقد ہوئے۔ اب صرف اکبر اور بزمِ اکبر کی یاد باقی رہ گئی۔ بقول اکبر ؎

ایک دم کے ساتھ تھا ہنگامۂ سوز و گداز ۔ اب وہ پروانے کہاں جب شمعِ محفل بجھ گئی

اکبر کی زندگی میں ان کی صحت قابلِ رشک تھی لیکن اس سے زیادہ رشک کے قابل شاید موت بھی ہوئی یعنی نہایت مختصر اور بے اعتبار سی علالت میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو بھرے گھر کو الوداع کہا اور چل بسے۔ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ محترمہ بیگم اکبر حیدری جو اکبر مرحوم کے احباب میں اپنی مہمان نوازی اور ان کی تصانیف میں قائم کے نام سے

عشرت رحمانی

یاد کی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر نے کبھی تحریر و تقریر میں بھی اس پہلو سے جدا
نہیں کیا۔ یہ سادگی پر مگر گزر کر سکیں۔ مولوی کا کہنا یہی کیا ہے اور احباب کے لئے
لکھا ہے۔ عیف دو چشم زدن صحبت یار آخر شد

اکبر حیدری کی شاعری ان کے ماحول اور اس کے اثرات سے عطا اور ذہنی اور اس صاف گو صاف باطن انسان کے دل میں جو کچھ تھا وہی زبان پہ بھی۔ ان کی شاعری کا مجموعہ اونچا پرواز ہے۔ غزل، مسلسل نظم، رباعی، قطعہ، مثلث، مسدس، تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں یکساں قادر الکلامی کے جوہر دکھائے۔ کیونکہ انہیں حکیم سید الطاف احمد صاحب آزاد سہارنپوری مرحوم تلمیذ مولانا حالی مرحوم سے تلمذ حاصل تھا اور بجا طور پر اپنے استاد کا اثر اور رنگ قبول کیا۔ اسلئے کلام اکبر، غالب اور حالی کے قدیم و جدید اثرات و شعور سے بھرپور نظر آتا ہے۔ غالب کی معنی آفرینی، علو تخیل اور فلسفۂ جذبات، خواجہ حالی کا بلاغت اسلوب، تسلسل بیان اور روانی، اور آزاد انصاری کا ترنم اور سہل ممتنع۔ یہ سب خوبیاں جمع ہو کر جو دلکش مرکب تیار ہو سکتا ہے وہی اکبر حیدری کا کلام اور یہی ان کی شاعری کی خصوصیت خاصہ سمجھنا چاہیے۔

انکی غزل تمام حسن سادگی کے ساتھ ارفع و اعلیٰ جذبات و احساسات سے مرصع ہوتی۔ عامیانہ انداز سے ہٹ کر انہوں نے جو مخصوص راستہ اپنی منزل کیلئے اختیار کیا ان کا ایک شعر اس حقیقت کا آئینہ دار ہے ؎

ہر قدم پر اک نئی راہ گزر ایجاد کی ÷ یاد رکھے گی قیامت تک مری منزل مجھے

سیدھے سادے انداز میں فلسفہ کے عمیق مسائل کو غزل کے اشعار میں بے تکلف ادا کر دینا اکبر کا عام رنگ ہے۔ جبر و اختیار کے مسئلہ کو کس احتیاط سے بے تکلف ادا کر دیا ہے کہتے ہیں ؎

خود پرستی خدا نہ بن جائے ÷ احتیاطاً گناہ کرتا ہوں

یا ذیل کے اشعار میں کیفیات تجمل ؎

درس عبرت عمر کی روداد ہے ÷ بڑھ گیا تو یہ فسانہ کم ہوا
خود غرض میں فنا ہو کر بقا کے راز سمجھا ہوں ÷ مری جمعیت خاطر ہوئی میری پریشانی
اب دیکھئے کہ کون ٹھہرتا ہے دیر تک ÷ بزم شباب بھی ہے رواں اور حباب بھی
کس چمن کی خاک میں پیدا کا مستقبل نہیں ÷ دور میں نشو نہیں رنگ نہیں بوئے گل نہیں
مری انجام بیں نظریں مجھے مغموم کرتی ہیں ÷ لرز جاتا ہے میرا دل عروج ماہ تاباں سے
مستقل ہے نامرادی مستقل انجام تک ÷ دیکھ کتنی لغزشیں پنہاں ہیں اب جام تک
تذکرہ بھی تو کرو شرر کا جو سنا میں نے کبھی ÷ آہ صبر کر دل کس نے کہا ہائے شباب

ہر شعر بجائے خود فلسفۂ حیات کی دلکش اور رنگین تصویر ہے۔ اکبر نے فلسفۂ گناہ پر مختلف اشعار و قطعات میں مخصوص رنگ سے روشنی ڈالی ہے۔

ہر جگہ ندرت تخیل نے ایک نئی دنیا پیش کر دی ہے۔ کہتے ہیں ؎

ز سلطے آدمی جگر رہے اکبر ÷ وہ ایسی کونسی غلطی تھی آدمی سے میں

"مذہب گناہ" ہر تراز گناہ کی حقیقت کو تسلیم کر کے اکبر ندامت کو ریاکاری کی معصیت تصور کرتے ہیں اور اقرار و انفعال میں عفو کے قائل ہیں۔ کیا خوب کہا ہے ؎

عبث لائیں بھی تو دیکھوں دھلے دامان عصیاں کے
ذرا سجدے سے سر اٹھنے تو دے ذوق پشیمانی

فطرت نے کے اشک ندامت کی سرخیاں ÷ عنوان لکھ دیا مری فرد گناہ پر
آبروئے گنہگاری ہوں ÷ عرق انفعال کیا کہنا

جوانی کی غلط روی کی طرف نئے انداز میں تلمیح و اشارہ کرتے ہیں (قطعہ)

ضمیر پاک طینت آہ کتنا بے مروت ہے
ہر مسرت کو گنہگاری بتاتا ہے
میں کس دل سے کروں طاعت کہ طاعت میں مسرت ہے
نکوکاری سے ڈرتا ہوں کہ مجھکو لطف آتا ہے
گناہوں میں یقیناً ایک احساس مسرت ہے
گناہوں کے لئے لیکن جوانی کی ضرورت ہے
جوانی میں گنہگاری بہت معصوم ہوتی ہے
یہی جرم جوانی ہے یہی آئین فطرت ہے

ریاکاری بدترین معصیت ہے۔ اور خود انکاری عین خدا پرستی ہے۔
ان حقائق کو اکبر نے کس کس انداز میں ادا کیا ہے ؎

نہ دنیا مصلحت آمیز ہے دل کی تسلی بھی
خدا کا واسطہ دیکر نہ پوچھو اہل ایماں سے

انسانی سرشت اور عام مسلک یہ ہے کہ ؎

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

لیکن بے ریا عبدیت اس سے کہیں بالاتر ہے۔ عبد و معبود کا رشتہ حقیقی معنوں میں یہ ہے ؎

نہ الفاظ حمد و ثنا جانتا ہوں ÷ نہ دلچسپ طرز ادا جانتا ہوں
مری بندگی ہے یہی ہیں کہ تجکو ÷ خدا مانتا ہوں، خدا جانتا ہوں

کسقدر بلند تخیل ہے۔ سبحان اللہ اور بے ریائی کی مزید تصریح ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

مشیت کی پرستاری ادا میں نماز کی اکبر ÷ دعا لب پہ نہیں آتی مگر آنسو نکلتے ہیں
یہ میری عبودیت الفاظ سے بالاتر ہے ÷ اشک بے سر مژگاں آ اور دعا بن جا

ایک اچھوتا طرز بیان اور دیکھئے ؎

بے تکلف مجھے خدا کہنا ۔ میری سادہ دلی کا کیا کہنا
جانتا ہوں نمود تھی اپنی ۔ مصلحت نے مجھے خدا کہنا

ان حقائق سے قطع نظر اکبر کی شاعری جمالیاتی پس منظر سے بھی بدرجہ رنگین ہے معاملات حسن و عشق کو مختلف انداز میں نادر و دلکش پہلو سے غزل اور نظم دونوں صنف میں خوب بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کس قدر حسین و جمیل کیفیات ہیں کہیں ایک بزم جمال آراستہ ہے کہیں عشق کی خودداریاں آشکار ہوتی جا رہی ہیں۔ فریاد و جفا کی بے پناہ کشمکش نازک مرحلوں سے گزر رہی ہے شب ہائے فراق کی کامگاریاں ہیں۔ کہیں امید و بیم کے دوراہے پر عجب عالم حیرت برپا نظر آتا ہے کبھی آرزوؤں کی دلداری ہے تو کبھی حسن معصوم کی طرفداری۔ کہیں وصل کی تدبیریں ہیں اور کہیں جمال جہاں افروز کے افسانے انداز و وصال کے ترانے اپنے اپنے رنگ میں کیف بار ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ہر ہر شعر کی دل کھول کر تشریح کی جائے مگر خوف ہے کہ لطف نہ کھو جائے اس لئے ناظرین خود ہی پڑھیں اور اپنے اپنے ذوق کی رعایت سے اکتساب کیف کریں۔ ؎

شمع میں اک سوز تھا اک ساز پروانے میں تھا
حسن گویا عشق کے خاموش افسانے میں تھا

اے درد محبت مجھے گمراہ نہ کرنا ۔ دل اشک میں بہ جائے گم راہ نہ کرنا
وہ اندیشیاں محبت کی ۔ بے وفاؤں کو با وفا کہنا
جو ہی رہا تبسم، جو ہی رہا ترنم ۔ میں سنا چکا افسانہ شب غم کی کاوشوں کا
سرگزشت دل مرحوم کا عنوان دیکھا ۔ ایک مبہم سا آنسو سر داماں دیکھا
شگفتہ تھا ادھر اور ادھر کعبہ ۔ تھی جوانی بھی کس رنگ پہ دلچسپ

ایک ہم ہیں دوستی پر بھی ہیں دشمن خطاب
ایک تم ہو دشمنی پر بھی تمہارا نام دوست

دیکھا ہوس و حسن کو باہم جو بغل گیر ۔ ناکام محبت نے کہا ہائے محبت

سنگلاخ زمینوں میں بھی اکبر کی رنگین نوائیاں کتنی عروج پر ہیں:۔

آنکھ کھل جائے گی اپنی زرا کی ۔ دیکھو نہ چشم نیم خواب نہ چھیڑ

سہل ممتنع کی سحر کاری ملاحظہ ہو ؎

یوں نہ فتنے اٹھا خرام ناز ۔ میلا بیان ہے قیامت ہے
ڈالدی بنیاد کعبہ جس جگہ ۔ یاد رکھے گا صنم خانہ مجھے
وہ انکھیں نہ دیدہ نظریں وہ انکھیں ۔ جھومتے کیف مستانہ مجھے
پرسش غم اگر تکلف تھی ۔ اس تکلف کو دور کیا کرتے

اک تبسم ہے ان کے ہونٹوں پر
یا مری گم شدہ خدائی ہے

۴ تڑپ کر کروٹیں پیہم دل ناکام لیتا ہے
لرزہ آتا ہوں جب کوئی وفا کا نام لیتا ہے

حسرت بھی ہے امید بھی ہے آرزو بھی ہے
سب کچھ مرے نصیب میں ہے ایک تو نہیں

طوفان برق و باد کی فتنہ طرازیو!
میں خانماں خراب کے آشیاں کہاں

۵ جدھر کروٹ بدلتا ہوں ادھر دنیا بدلتی ہے
شبا پوچھو کونسی لذت ہے آخر درد پنہاں میں

ابھی تو نا خدا کے بعد میرے اک خدا بھی ہے
حوادث کیوں تڑپ کر رہ گئے آغوش طوفاں میں

تکمیل درد ہوتی ہے جب ہر دوا کے بعد
حسرت سے دیکھتا ہے مرا چارہ گر مجھے

بے کسی کا لطف بھی جاتا رہا ۔ شام غربت بھی سحر نے چھین لی

اکبر حیدری کی طبع خداداد بڑی حد تک غالب کے تتبع پر مائل تھی کہ

داماں غزل تنگ و گل حسن تو بسیار

چنانچہ انہوں نے غزل میں تو ایک لطیف انداز قائم کیا ہی تھا لیکن نظم کے میدان میں اس سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر نظر آتے ہیں گو کہ ابتدا کی دور میں غزل گوئی کی طرف کس قدر متوجہ رہے تھے مگر رفتہ رفتہ ان کا میلان طبع نظم کی طرف زیادہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ ۱۹۱۸ء سے آخری دم تک معدودے چند غزلیات کہی ہونگی ورنہ اس عرصہ میں ان کے کلام کا تمام تر سرمایہ نظم گوئی پر مشتمل ہے۔ اکبر نظم میں قدیم روایات کی پابندی کا بحور و قوافی کی قید کے ساتھ ساتھ ایک حد تک طرز جدید کے موجد کہے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ردیف و قافیہ کی ایک آزاد پابندی اس انداز میں شروع کی جس سے ایک خوشگوار ترنم عام بحور میں پیدا ہونے لگا۔ یعنی مسدس اور مخمس کا عام رنگ لیکر انہیں میں ردیف و قافیہ میں اس طرح ترمیم کی کہ یہ انداز ان کا اپنا ہو گیا۔ یہ ایک دلکش اور مستحکم جدت تھی جو صرف اکبر کی نظموں ہی میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً نظم "محبت اور پرستش" کا ایک بند ہے ؎

مجھے اب تم نے سمجھایا کہ میری بے خودی کیا تھی ۔ وہ میں اب سمجھا حقیقت میں محبت کس کو کہتے ہیں
مجھے معلوم ہے میری پرستش میں کمی کیا تھی ۔ میں اب سمجھا کہ وہ پرشوق دل کیوں لیا کرتے ہیں
تمام زندگی برباد مری دنیا نے راحت میں
ذرا سا فرق تھا لیکن پرستش اور محبت میں

تخیل و جذبات کے لحاظ سے مسلسل نظموں میں تغزل کا رنگ اور

ملت میں بے اتفاقی سے پیدا کیا ہے جن کے نتائج کی الجھنیں "مجھے تم سے محبت
ہے" "کیوں یاد آنے لگے ہو" "ترانہ" "سحر کی روشنی" "پھول والی" "نور و ظلمت"
"جرأت پرواز" "مصور کی موت" "افسانہ" "ناکیوڑہ" وغیرہ خاص
طور پر قابل ذکر ہیں۔

"تصور" کے چند بند ملاحظہ ہوں۔ الفاظ کا در و بست، جذبات کی
دلکشی اور انداز بیان میں موسیقیت کا کمال معراج پر نظر آتا ہے۔

جب آدھی رات کو بزم جہاں خاموش ہوتی ہے
صبا جب عالم ایجاد جب بیہوش ہوتی ہے
دل مجبور جب کہتا ہے افسانہ محبت کا
فلک پر بزم انجم جب سراپا گوش ہوتی ہے
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

پپیہا "پی کہاں ہے" "پی کہاں ہے" کہتے رہتے ہے
کوئی کافر ادا بھونرا کلی کے دل میں سوتا ہے
تصور میں نظر آتی ہے اک دنیا محبت کی
گل و بلبل میں جب راز و نیاز عشق ہوتا ہے
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

بساط آب گل پر ہوتے ہیں جب رنگ و بو پیدا
کیا کرتے ہیں جب گلہائے تر جوش نمو پیدا
مری نظریں جب اٹھنے لگتا ہے کیف کرتی ہیں
مرے دل میں ہوا کرتی ہے جب اک آرزو پیدا
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

تخیل کے لحاظ سے اکبر کو قدامت کے پردہ میں ترقی پسند شاعر کہنا بجا
نہیں۔ انکی شاعری میں بھوک، ہڑتال، کسان، طوائف، مزدور، گھنگھور
اور گنبدِ دیوار۔ بھیانک راتوں کی تاریکیاں نہیں ملتیں۔ مگر وہ سب
کچھ پایا جاتا ہے جو شعر و ادب کی ترقی اور معراج کے لئے ضروری ہے۔ انکی
نظموں میں جگہ جگہ وہ نفسیاتی پہلو موجود ہیں، اور تخیل میں وہ لاشعوری
کیفیات ہیں جس سے صاف طور پر پرانی لکیر سے جائز طور پر ہٹتے اور
وجدانی تصورات کے سہارے پورے شعور کے ساتھ منزلِ ترقی کی ایک نئی
راہگذر کی طرف خطوط و نقوش بناتے چلے جاتے ہیں۔ اور صحیح معنوں میں
ادبیات کا ترقی پسند انداز یہی سمجھا جا سکتا ہے۔ جذبات حسن و عشق کے
اظہار میں تنوع اشعار میں موسیقیاتی ترنم، معنوی و تخیلی رنگین نوائیاں اور
کیف وارفتگی ترقیاں دیکھتا ہوں تو اکبر کی نظموں میں خصوصاً "تخلیق حسن و
عشق" "جمال آتشیں" "شہید آرائش" "وعدہ" "رندانِ بادہ خوار"

"زاہد حسینہ" "دنیا اور شاعری" "کچھ اقبال" "نوجوان شاعر سے" "
"رہبرانِ خود غرض سے" "شاعر کا پیغام" "عنوان" "نور و ظلمت"
"سکونِ دل اور تجربہ" شعر و غیرہ قابل مطالعہ ہیں۔

سکونِ دل

یہ احسان کم نظر انسان اور کیسیم د جواہر ہے
نہیں معلوم آخر کیا سمجھ کر جان دیتا ہے
یہ دُرِّ بے بہا یہ بیش قیمت آتشیں گوہر
یہ وہ چیزیں ہیں جن پر آدمی ایمان دیتا ہے
مگر اے کاش اس ظالم کو یہ معلوم ہو جاتا
سکونِ دل کبھی ان سے میسر نہیں آتا

تجربہ

محبت، دوستی، اخلاص، ہمدردی، وفاداری
یہ دولت لے کے آیا تھا میں انسانوں کی بستی میں
سمجھتا تھا کہ یہ چیزیں ہیں دنیا کو بہت پیاری
بہت کچھ ان کی قدر و منزلت ہے بزم ہستی میں
یہاں حق دوستی کے سینکڑوں ارمان رہتے ہیں
یہ انسانوں کی دنیا ہے یہاں انسان رہتے ہیں
مگر افسوس میرا تجربہ کچھ اور ہی نکلا + غلط فہمی پہ اپنی کسقدر اب میں پشیماں ہوں
میں کیا سمجھا تھا اس دنیا کو کیا نکلی ہے یہ دنیا + میں اس دنیا کے جلوے دیکھتا ہوں اور حیراں ہوں
نکوکاری کے پردوں میں گنہگاری کے جلوے ہیں
مقدس بارگاہوں میں ریاکاری کے جلوے ہیں

اکبر نے اصلاحی اور قومی نظمیں بھی لکھیں۔ جنکا پایہ ہمہ گیر اثرات کے
لحاظ سے کافی بلند ہے۔ اصلاحی نظموں میں تو نام نہاد مصلحین کے خلاف
بغاوت کی ترغیب دیتے سنے جاتے ہیں اور قوم کی پستی، بداخلاقی، اور
بے راہ روی پر آنسو بہاتے اور نعرۂ انقلاب بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ مذہبی
اور اصلاحی نظموں میں "مسلم اور ہلال" کے چند بند سنئے:۔

مسلم

اے ہلال عید اے عنوان رود انشاط
اے ہلال عید اے پیغام لطف انبساط
میرے غم خانے میں درد انگیز اک آواز ہے
احتیاط اے شادمانی کے پیمبر احتیاط

یاد آتا ہے مجھے عہد گزشتہ کا عروج + خون رلاتا ہے مجھے اسلام خستہ کا عروج
پرچم توحید پر وہ تیرے تصویر حسین + جس سے وابستہ کبھی تھا بخت زندہ کا عروج
ہاں تجھے بھی یاد ہو وہ سرگزشت اولیں + ہم صفیر و ہمنوا تیرے ابھی تھا یں عروج
بدنصیبی ہے مری وہ بجھ گئے خواب خیال + جو فسانے سن چکی ہیں مجھ سے افلاک و زمیں
آج جب بدلا ہوا ہے بزم دنیا کا نظام + آج کیوں آیا ہے تو لیکر مسرت کا پیام

تو کسکے دل سے دیکھوں تجھکو کسی آنکھ سے ❊ کیا کروں خونریزیٔ ناقیصر اقوام

ہاں مگر اے ہمدم دیرینہ و دمساز آ!
چند آہیں ہیں ابھی تک مائلِ پرواز آ!

ہلال

"ہوش میں آ ہوش میں او مسلم بے خانماں
کیوں مسلماں آپ کو کہتا ہے ننگِ دوجہاں
صاحبِ توحید ہوتا تو زمانے میں اگر
یوں نہ دنیا سے کبھی مٹتا ترا نام و نشاں

اپنی غفلت کا مجھے الزام کیوں دیتا ہے تو ❊ اپنی بربادی کے حیلے ڈھونڈتا ہے حیلہ جو
میں تو آمادہ ہوں تیری ہمسفری کیلئے ❊ تجھ میں باقی ہو اگر اب بھی کوئی شانِ نمو
کھول آنکھیں کھول کر اسلاف کا طرزِ عمل ❊ ہے اگر ہمت تو آ اس جادۂ مشکل پہ چل
چھوڑ دے باطل پرستی توڑ دے بت وابن کفر ❊ بتکدے میں پھر بنا کعبہ خدا کر دے بدل
از سرِ نو ملتِ برباد کی تنظیم کر ❊ مائل تبلیغ ہو قرآن کی تعظیم کر
اہلِ دنیا کو سنا حکم خدا حکمِ رسول ❊ نعرۂ تکبیر کی عظمت کو پھر تسلیم کر
پھر وہی نغمہ ہو تیرا پھر وہی سازِ حیات
پھر وہی میں ہوں وہی تو ہو وہی رازِ حیات

"آزادی کے نام"

منتقل سرمایہ داری اور نظم بے ثبات
اس سے بڑھکر ہوگی اب کیا اور توہینِ حیات
بزمِ ہستی میں نہ تھا جب زر پرستی کا جنوں
زندگی آزاد تھی آزاد تھی کل کائنات

شہیدِ وطن کے چند بند

اک گلِ افسردہ فرشِ خاک پر تھا محوِ خواب
جب مری نظریں پڑیں اک منظر غمناک پر
کانپ اٹھا میرے پہلو میں دلِ پُر اضطراب
اُف گلِ سرسبز اور صحنِ چمن کی خاک پر
خاک کے ذرّوں میں خوابیدہ تھی اک برقِ جمال
آہ یہ انجامِ رعنائی یہ ہستی کا مآل!

یہی پھول شاعر کے استفسار پر اپنی سرگزشت اسطرح سناتا ہے ؎

میں امانت دارِ حق تھا حق پرستی کیلئے ❊ منتظر تھی بزمِ گلشن مجھ سے ہر اشجار کی
میں نے دنیا کو دکھائے رنگ و بو کے معجزے ❊ میں نے اپنے خون سے نشوونمائے خار کی
میری نکہت سے معطر ہوگئی بزمِ نسیم
میں نے صحنِ باغ میں ہر سمت پھیلا دی شمیم

اور پھر یہی شہیدِ وطن پھول انسانیت کو حبِ الوطنی اور جانبازی کا پیغام سناتا ہے ؎

میری ہستی وقف تھی صحنِ چمن کے واسطے ❊ میں فنا ہو کر سماؤں گا چمن کی خاک میں

جانثاری ہے مگر اپنے وطن کیواسطے ❊ زندگی پیدا کروں گا میں وطن کی خاک میں
آب و گل میں جذب ہو کر گل کھلاؤں گا ابھی
ذرّے ذرّے میں ہے پنہاں پرتوِ زندگی

یہ امر غالباً واقفینِ ادب سے پوشیدہ نہیں کہ اکبر حیدری محض شاعر نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ نثر میں بھی ان کا انداز خصوصاً شگفتگی کی طرح مرغوب و دلپسند تھا۔ نظم و نثر دونوں میں مزاحیہ رنگ بھی انکے صنفِ ادب کا ایک جزو خاص تھا۔ فاز کے پردے میں انھوں نے متعدد مزاحیہ اور اصلاحی انقلابی نظمیں مضامین اور افسانے لکھے ملک کے بلند پایہ اخبارات و رسائل انکے اس مخصوص رنگ کے شاہد ہیں۔ دہلی کے اخبار "قوم" رسالہ "نیرنگ" اور دوسرے بلند پایہ جرائد میں حضرت فاز کے ملفوظات "ہماری ہجر کرم کی ڈائری" "شہرستانِ ..." وغیرہ مستقل عنوانات اربابِ ذوق کو اب تک یاد ہیں۔ فاز کی ایک غزل ملاحظہ ہو

اربابِ عقل و ہوش کہاں اہلِ فن کہاں ❊ بزمِ سخن ہے آج وہ بزمِ سخن کہاں
تبدیل ہو چکا ہے بیانِ معاشرت! ❊ قدرت دکھائے شعرِ شیریں سخن کہاں
اب تو اڑائے پھرتی ہیں ایروپلین کو ❊ اب فرشِ گل پہ کوئی گلبدن کہاں
کاکل تراش کرنے لگیں اب پوشیدگیاں ❊ اب وہ زلفِ شکن در شکن کہاں
اب مکیے کے نام پہ السن لگ گیا ❊ اب شراب ریز بہارِ چمن کہاں
اب ہاتھ میں رہے گا ہوٹل میں مقام ❊ اب عاشقوں کے حصے میں دیوانہ پن کہاں
آتا ہے دودھ ٹین میں بند ہوکے ریل پر ❊ اس بیسویں صدی میں کوئی کوہکن کہاں
جنگل تمام چلتے ہیں سینکے پہ آجکل ❊ جو وہاں دکھائے کوئی خستہ تن کہاں
موٹر بھی ریل بھی ہے ہوائی جہاز بھی!
اب بے وطن کے دل میں ہے یادِ وطن کہاں

اکبر کی مستقل تصانیف جو شائع ہو چکیں ان میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں "ربع جذبات (کلام کا انتخاب)" "عبرت کدہ" "رقاصہ" (ناول) "سیر خرابات" (ناول) "عیاش کی ڈائری"۔ "ارتقاء تمدن" اور "مجنوں کی ڈائری" ان کے علاوہ انگریزوں کے لئے اردو ہندی کی درسی کتابیں لکھیں جن میں "منشی" بہت زیادہ مخصوص اور مقبول ہے جو مختلف فوجی درسگاہوں میں انگریز افسروں کے کورس میں شامل ہے اور اس کے آٹھ نو اڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

محترمی پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے خوب فرمایا ہے ؎

اکبر حیدری وہ اہلِ قلم ❊ جسکے شعروں سے سب ہوئے مسرور
آہ وہ یارِ باصفا و خلوص ❊ آہ وہ شاعرِ فصیح و غیور
چھوڑ کر چل دیا ہمیں بے وقت ❊ کیوں احسا کا دل نہ ہو رنجور
بے سر و بانشاط بزم ہے آج
کہہ کے کیفی کہ اکبر مغفور

(۱۳۶۹ھ)

ہندوستان کی مشترک تہذیب

عابد حسین

تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے، جسے وہ اپنے اجتماعی ادارات میں ایک معروضی شکل دیتی ہے، جسے اس کے افراد اپنے جذبات و رجحانات، اپنے سجاؤ اور برتاؤ میں اور ان قدر مادی اشیا کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ (۱) اس کے معنی یہ ہیں کہ دراصل تہذیب کی روح ہے اقدار کا شعور اور وہ ترتیب جو ان میں اہمیت کے لحاظ سے قائم کی جائے۔ یہ روح اپنے آپ کو تین طرح سے ظاہر کرتی ہے (۱) اجتماعی ادارات مثلاً مذہب، ریاست، قانون وغیرہ کی صورت میں (۲) لوگوں کے عام مزاج، طرز عمل، طرز معاشرت کی صورت میں (۳) ان مادی اشیا کی صورت میں جو کسی معاشی، جمالی یا ذہنی قدر کے حاصل کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً غذا، لباس، مکان وغیرہ

یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ ہندویت اور اسلام میں مکمل اور مثالی تہذیب کے امکانات کیا ہیں، اور ان میں کیا کیا چیز مشترک ہے۔ بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت یعنی بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاں تہذیب کے مختلف اجزا کی، جنکا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے واقعی شکلیں کیا ہیں اور ان میں کس حد تک اشتراک ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ تہذیبی جائزہ کس طرح لیا جائے، جہاں تک محسوس مظاہر تہذیب کا تعلق ہے ہر شخص اگر ذرا توجہ سے کام لے تو ان کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ لیکن تہذیب کی غیر محسوس روح اور اس کے نفسی اور ذہنی عناصر کا ادراک نہایت ہی مشکل کام ہے، خصوصاً اس زمانے میں جب ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب دونوں کشمکش اور تغیر کے دور سے گذر رہی ہیں۔ اس کام کو جیسا چاہئے وہی شخص کر سکتا ہے جسکا قلب اپنے زمانے کا آئینہ ہو جسکی آنکھ اپنی قوم کی آنکھ جسکی زبان اپنے ملک کی زبان —— یہ شاعر کا کام ہے، اس شاعر کا جو پہلے اپنے ماحول کو اپنے اندر جذب کرے اور پھر خود اپنے ماحول پر چھا جائے اور اس کی رگ رگ میں اتر جائے۔ خوش قسمتی سے ہمارے زمانے میں ایسے دو شاعر ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ٹگور ہندوؤں میں اور اقبال مسلمانوں میں۔ دونوں کی رگوں میں وہ خون تھا جو ہزاروں سال سے ہندوستان کی آب و ہوا میں پرورش پا رہا تھا۔ دونوں مشرق کی قدیم حکمت کے حامل، مغرب کی جدید حکمت سے واقف اور اس کی خوبیوں کے قدردان تھے۔ دونوں کے وسیع قلب میں نہ صرف ہندوستان کی بلکہ دنیا کی محبت سمائی ہوئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ایک حقیقت کا عکس ایک اسلام کے پیالے میں دیکھتا تھا، دوسرا ہندویت کے ساز میں۔ انھوں نے اپنے وجدان صحیح کی مدد سے اپنی تہذیب کی حقیقی روح کو پا لیا اور اپنی حرارت قلب سے اسکی افسردگی اور جمود کو دور کر کے اس میں تازگی اور گرمی پیدا کر دی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے نئے رجحانات کو ان سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا اس لئے کہ یہ رجحانات بڑی حد تک انھیں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہمارے لئے بہترین تدبیر یہ ہے کہ تہذیبی جائزے کی کٹھن منزل میں جہاں ایسے مقام آ جائیں کہ راستہ نہ سوجھتا ہو وہاں ٹگور اور اقبال کی دلیل راہ بنائیں۔

کثرت میں وحدت کا ادراک اور مشاہدہ ہندوستانی روح کی بنیادی خصوصیت مانی گئی ہے۔ چونکہ مذہب اسی مخصوص شعور کا نام ہے کہ کثرت مظاہر ایک نقطۂ وحدت پر ملتی ہے جو اسے حقیقت اور زندگی بخشتا ہے اور اس میں نظم و ضبط پیدا کرتا ہے، اس لئے ہم اس بنیادی خصوصیت کو مذہبیت کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے محور اقدار میں مذہبی قدر ایک مشترک مرکز کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے گرد دوسری قدریں چھوٹے بڑے دائرے بناتی ہیں۔ آج بھی باوجود اس کے کہ قدامت پسند طبقہ کا مذہبی احساس زنگ آلود ہو چکا ہے اور جدت پسند طبقہ مغربی تہذیب کی بدولت مذہب کی طرف سے بے حس ہو گیا ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل کی گہرائی میں مذہب کا اتنا اثر باقی ہے کہ وہ زندگی اور کائنات کا کوئی تصور قائم ہی نہیں کر سکتے جس کی بنا پر مذہب پر نہ ہو۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، قدامت پسند تو ظاہر ہے کہ وہ مذہب کو بہت تنگ معنی میں لیتے ہیں۔ اسے وہ زندگی کا چشم و چراغ سمجھتے ہیں لیکن جدت پسندوں میں بھی کوئی ایسا نہیں جو مذہب کے ایک وسیع تصور کو تہذیب کی بنیاد نہ قرار دیتا ہو۔ ان کے خیال کے سچے ترجمان ہیں اقبال ہیں۔ اقبال اصل میں کوئی مذہبی آدمی نہ تھے۔ انھوں نے ٹگور سے بھی زیادہ آزاد خیالی سے کام لے کر مذہب کی راہ میں فلسفی شاعر کی حیثیت سے قدم رکھا اور شاعرانہ وجدان کے ساتھ ساتھ عقلی نظر اور تنقیدی فکر کو اپنا رہنما بنایا لیکن وہ اسی نتیجے پر پہنچے کہ مذہب زندگی کے کسی ایک شعبہ کا نام نہیں وہ نہ محض فکر ہے، نہ محض احساس، نہ محض عمل۔ اس سے انسان کی پوری شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ فلسفہ کو مذہب کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے وقت اسکی مرکزی حیثیت کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے اسکے سوا کوئی

چارہ نہیں کہ مذہب کو ترکیب فکر کے عمل میں مرکز کے طور پر جگہ دے۔

ہندو پیٹر جس کی ساری تحریک میں مذہبی روح سمائی ہوئی ہے اور وہ سب لوگ جن کے ہاتھوں میں ہندوؤں کی ذہنی قیادت ہے، مذہب کا مقام اخلاقی اقدار کے نظام میں وہی سمجھتے ہیں جو سورج کا نظام شمسی میں۔ ان میں سب سے زیادہ آزاد خیال اور قدامت پسندی کے سب سے بڑے حریف ٹیگور تھے۔ انھوں نے اپنے دل کا دروازہ عصر جدید کی نئی روشنی کے لئے کھول دیا تھا جسکی مدد سے انسان کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے، عالم طبیعی کی قوتوں کا اور ان کے قوانین عمل کا جائزہ لیتا ہے اور ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس سے انکی تسکین نہیں ہوئی۔ اس نے انکو حقیقت کائنات سے زندہ رشتہ قائم کرنے کا جس کے لئے انکی ہندوستانی روح بے چین تھی کوئی راستہ نہیں دکھایا اور آخر انھیں اس پرانی روشنی سے مدد لینی پڑی جو اپنشدوں نے ڈھائی ہزار سال سے دنیا میں پھیلا رکھی ہے۔ ٹیگور اسی تعلق کا ذکر کرتے ہوئے جو فنکار کائنات اور حقیقت کائنات سے رکھتا ہے کہتے ہیں" دنیا انسان کے وجود باطنی سے پوچھتی ہے "اے دوست کیا تم نے مجھے دیکھا ہے؟ کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو ـــ اس حیثیت سے نہیں کہ میں وہ ہوں جو تمہیں غذا بھی اور پھل دیتی ہوں، جس کے قوانین تم نے دریافت کئے ہیں، بلکہ میری شخصی اور ذاتی حیثیت سے"؟ فنکار یہ جواب دیتا ہے، "ہاں میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے، میں تمہیں جانتا ہوں اور تم سے محبت کرتا ہوں ـــ اس لئے نہیں کہ میں نے تم کو مسخر کرکے تمہارے قوانین کو اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے استعمال کیا ہے۔ میں ان قوتوں سے واقف ہوں جو کارفرما ہیں اور انسان کو منصب اقتدار پر پہنچاتی ہیں، مگر مجھے ان سے بحث نہیں۔ میں نے تو تمہیں اس رنگ میں دیکھا ہے جس میں تم وہ ہو، جو میں ہوں"۔ یہی حقیقت مطلق کی معرفت جو من و تو کے فرق کو مٹا دیتی ہے ہندو مذہب میں مرکزی حقیقت رکھتی ہے، اور یہی انسانی زندگی کی سب سے برتر قدر سمجھی جاتی ہے۔

مذہب کی حقیقت اقبال کے نزدیک بھی وہ رشتہ ہے جو وہ وجود مطلق سے رکھتا ہے۔ بقول ان کے قرآن کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان کے دل میں ان گوناگوں علاقوں کا برتر شعور پیدا کر دے، جو اسے خدا اور کائنات سے وابستہ کرتے ہیں۔

غرض ہندویت اور اسلام دونوں کی تہذیبی روح جہاں تک وہ ٹیگور اور اقبال کے کلام میں جھلکتی ہے، مذہب کو قدر اعلیٰ قرار دیتی ہے۔ وجود مطلق کی معرفت کو مذہب کا نچوڑ سمجھتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا حقیقت کا بنیادی تجزیہ جو تحلیل اور امتیاز سے بری ہے ابتک ایک ہے ـــ بالکل اسی طرح جیسے عہد وسطیٰ میں ہندو بھگتوں اور مسلمان صوفیوں کے ہاں تھا۔ اور یہ ایک ایسی قدر مشترک ہے جو انھیں دنیا کی اور سب قوموں کے مقابلے میں ایک دوسرے سے قریب تر کر دیتی ہے اور اس بات پر ہندو مسلم اتحاد کے بعض پرجوش اور مخلص حامی بہت زور دیتے ہیں اور اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تہذیب محض ایک مجرد اور مبہم واردات کا نام نہیں بلکہ اس واردات کو واضح تصورات میں تحویل کرنے اور انھیں حقیقت کا جامہ پہنانے کا نام ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا حقیقت مطلق کا تجزیہ ایک سہی لیکن جب اس تجزیہ کی تحلیل کی نوبت آتی ہے یعنی یہ سوال پیدا ہوتے ہیں کہ وجود مطلق کیا ہے، اس کی معرفت کس طریقے سے حاصل ہوتی ہے، اسکا تعلق کائنات اور ان دونوں کا تعلق انسانی زندگی سے کیا ہے تو ہندو ذہن اور مسلم ذہن میں فکر و عمل کے راستے الگ ہوتے ہوئے اور سفر حیات کی مختلف منزلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہندو مسلمانوں کے تصور حقیقت میں جو فرق ہے اور اسکا جو اثر ان کے تمدن و تہذیب پر پڑتا ہے اسکا اندازہ بھی ٹیگور اور اقبال کی بنیادی افکار کے مقابلے سے ہو سکتا ہے۔ ٹیگور بھگتی مارگ کے دوسرے سالکوں، راما نج، مادھو آچاریہ، راما نند، کبیر، چیتن وغیرہ کی طرح سرچشمہ حقیقت کا تصور بحیثیت "ایک ذات" کے کرتے ہیں، جو انسان سے جدا ہے اور اس کی محبت اور عقیدت کی سزاوار ہے لیکن وہ بھی ہندو ذہن کے اس جدید ترین رجحان سے متاثر ہیں کہ بھگتی کے شخصی خدا اور ویدانت کے وجود مطلق کو ایک ہی حقیقت کے دو رخ سمجھا جائے۔ ان کے کلام میں جہاں خدا کا ذکر ایک محبوب ذات کی حیثیت سے ہے، جسکی محبت میں روح انسانی تڑپ رہی ہے وہاں اسکو "فہم و ادراک سے باہر نام و صورت سے بری" بھی کہا گیا ہے۔ ایک اور جگہ ٹیگور کہتے ہیں "لیکن وہاں جہاں روح کی پرواز کے لئے آسمان کی نامحدود فضا پھیلی ہوئی ہے، ایک بے داغ، بے رنگ تجلی کا دور دورہ ہے وہاں نہ دن ہے نہ رات، نہ صورت ہے نہ رنگ اور نہ کوئی لفظ"۔ اسی طرح انسان اور خدا کے تعلق کے بھی دو رخ ہیں۔ کبھی خدا کے مقابلے میں انسانی روح کو اپنے تصور کا احساس ہوتا ہے اور وجود مطلق کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بالکل معدوم سمجھتی ہے۔ اس بات کو ٹیگور یوں بیان کرتے ہیں "محبت میں ایک سرے پر خودی ہے اور دوسرے سرے پر بے خودی۔ ایک طرف تعلی ہوتی ہے "میں موجود ہوں" دوسری طرف شدید انکار "میرا کوئی وجود نہیں"۔ اس انا میں محبت کا کیا لطف؟ اور اگر یہی انا ہے تو محبت کا کیا امکان؟

اس دوئی کو جو ٹیگور کے ہاں خدا کے تصور اور خدا اور انسان کے تعلق کے

تصور میں پائی جاتی ہے ٹیگور کے مفسر یا دعا کرشنن جو ہندو ذہن کے جدید ترین رجحان کے نمائندے ہیں اس طرح دور کرتے ہیں کہ جب انسان اپنی محدود قوت ذہنی سے خدا کا ادراک کرنا چاہتا ہے تو وہ شخصی خدا کے تصور تک پہنچ کر رہ جاتا ہے جسے وہ اپنے سے جدا ہستی سمجھتا ہے۔ لیکن جب وہ ذہنی سطح سے بلند ہو کر مذہبی وجدان کی سطح پر آتا ہے تو اسے وحدت کا علم شعور ہوتا ہے، جس میں خدا، کائنات اور انسان ایک وجود مطلق میں گھل مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔

اقبال کا تصور حقیقت نتیجہ ہے دو چشمہ ہائے فکر کے ملنے کا، جن کے سرچشمے بظاہر ایک دوسرے سے بہت دور نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک ان مسلمان صوفیوں کے خیالات کا سلسلہ ہے جنھوں نے حتی الامکان بیرونی اثرات سے آزاد رہ کر اپنا نظریہ حقیقت خالص قرآنی تعلیمات سے اخذ کیا۔ وحدت شہود اور انسان کامل کے تصورات جو مسلمانوں کو نظریہ وجودیت اور نظریہ فنا کے مہلک اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے قائم کئے گئے تھے، اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ دوسرا جدید یورپ کے فلسفہ ارادیت اور حیاتیت کا سلسلہ فکر ہے۔ اقبال نے ان دونوں کو سمو کر نظریہ حقیقت کا ایک خاکہ بنایا ہے جو عہد جدید کے مسلمانوں کے رجحان طبع کا آئینہ دار ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں اسپر اسقدر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں جو اسے اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ اس کے اہم ترین نکتوں کو اختصار سے بیان کر دیں۔

اقبال حقیقت کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے موضوع یعنی نفس انسانی کی طرف سے چلتے ہیں۔ ان کے نزدیک نفس انسانی کے دو پہلو ہیں، ایک نفس فاعلہ اور دوسرے نفس عارفہ۔ نفس فاعلہ کا رخ عالم خارجی کی طرف ہے، جہاں وہ اشیا کا ادراک مکان کے اندر کرنے پر مجبور ہے چونکہ مکان تقسیم پذیر ہے اور لفظوں سے بیل کرتا ہے اس لئے نفس فاعلہ کو زمانے کا شعور الگ الگ لمحوں کے سلسلے کے طور پر اور خود اپنا شعور الگ الگ کیفیتوں کے سلسلے کے طور پر ہوتا ہے۔ برخلاف اسکے نفس عارفہ، جو انسان کا حقیقی نفس ہے اور جسکا شعور ہمیں صرف بوقت ہوتا ہے جب ہم عالم خارجی سے قطع نظر کر کے اپنے اندر ڈوب جائیں، تصور مکان سے آزاد ہے۔ چنانچہ اسکا شعور زمانی مکان کے رنگ میں ڈوبا ہوا نہیں ہوتا بلکہ زمانہ اس کے لئے "دوران محض" ہے، یعنی ایک واحد لمحہ حالیہ جو ناقابل تقسیم ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نفس عارفہ میں لمحات زمانہ کی کثرت کا شعور نہیں ہوتا تو نفسی کیفیات بھی گھل مل کر ایک ناقابل تقسیم وحدت بن جاتی ہیں۔ نفس عارفہ کی شعور ذات کی خصوصیات یہ ہیں: (۱) اس کے اندر زمانہ دوران محض ہے۔ (۲) اس میں نفسی کیفیات کی کثرت ایک وحدت میں حل کی ہوئی ہے۔ اقبال کے نزدیک حقیقت مطلق کے شعور میں بھی جو نفس عارفہ حاصل کرتا ہے یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ "وہ دوران محض

ہے جس میں خیال، زندگی اور مقصد ایک دوسرے میں نفوذ کر کے ایک وحدت نامیہ بناتے ہیں۔ ہمارے لئے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ اس وحدت کا تصور وحدت ذات کی حیثیت سے کریں۔ ایک محیط اور مقرون ذات کی حیثیت سے، جو کل افراد کی زندگی اور فکر کا سرچشمہ ہے۔ یہ ذات مطلق اپنی حقیقی ماہیت کا اظہار تخلیق مسلسل کی شکل میں کرتی ہے۔ مگر ذات مطلق کا قیاس نفس انفرادی پر نہیں کرنا چاہیئے۔ اقبال کا تصور تجسیم اور تشبیہ سے بری ہے۔ "حقیقت مطلق ایک تخلیقی زندگی ہے جسے ہم نفس کا رز فعلیہ ہے۔ اس زندگی کو ذات سے تعبیر کرنے کے معنی یہ نہیں کہ خدا کو انسان کی شبیہ بنا دیا جائے، اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ زندگی کوئی بے تشکل سیال نہیں بلکہ ایک تنظیمی اصول وحدت ہے، ایک عمل ترکیب ہے، جو ہیئت نامیہ کے منتشر رجحانات میں ربط قائم رکھتا ہے اور انھیں ایک مرکز پر لے آتا ہے۔"

اس سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ٹیگور اور اقبال کے ہاں بنیادی مذہبی شعور کی تعبیر میں کیا فرق ہے۔ ٹیگور کا خدا درحقیقت ویدانت کا برہم ہے۔ شخصی خدا کا تصور جو ان کی شاعری میں جابجا ملتا ہے حقیقت کا ایک ادنی تصور ہے جو انسان کے محدود ذہن کو عموماً اختیار کرنا پڑتا ہے۔ برخلاف اسکے اقبال کے نزدیک خدا کا سچا تصور جو تجربہ حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے، وحدت ذات کے سوا اور کسی حیثیت سے نہیں کیا جا سکتا۔ وحدت وجود کو جس کے اکثر مسلمان صوفی قائل رہے ہیں اور بہت سے اب تک ہیں وہ حضرت مجدد الف ثانی کی طرح بعض "مقام قلب" یعنی خالص موضوعی احساس قرار دیتے ہیں جو راہ معرفت کا ایک درمیانی مقام ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ شعور حقیقت کی جو تعبیر ٹیگور کے اور سب پیروان ویدانت کے نزدیک آخری اور مکمل ہے وہ اقبال کے نزدیک عارضی اور نامکمل ہے اور جو تعبیر اقبال کے خیال میں حقیقی ہے وہ ٹیگور کے خیال میں اعتباری ہے۔

اس فرق کی بنیاد دراصل اس اختلاف پر ہے جو ٹیگور اور اقبال میں عرفان حقیقت کے بارے میں ہے۔ ٹیگور کے نزدیک وجدانی بصیرت جس کے ذریعہ ہم خدا کو دیکھ سکتے ہیں عقل و فہم سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ وہ ایک سیدھا سادہ معصوم بچوں کا سا غیر تنقیدی غیر عقلی مشاہدہ ہے۔ "ذات برتر کی رویت ہماری روح کے اندر ایک براہ راست بلا واسطہ مشاہدہ ہے جس کی بنا کسی دلیل و برہان پر نہیں۔" اسی لئے ٹیگور نے ویدانت کے شعور حقیقت کو جو فہم و ادراک سے بالاتر اور وجدان محض پر مبنی ہے، اعلیٰ اور مکمل مانا ہے۔ اقبال بھی واردات حقیقت کو بلا واسطہ اور وجدانی کہتے ہیں لیکن ان کے خیال میں جس طرح ہماری حسیات عالم خارجی کا علم بننے کے لئے عقل و فہم کی تعبیر کی محتاج ہیں اسی طرح واردات حقیقت بھی ذات الٰہی کا عرفان بننے کے لئے ذہنی تعبیر کی محتاج ہے۔ وہ کلام کی خصوصیت ہی یہ قرار دیتے ہیں کہ اس نے ذہن انسان کے بلوغ کو تسلیم کر کے

اس کو یہ سکھایا کہ آئندہ باطنی واردات کے معاملہ میں کسی شخص کی سند کو ماننے بلکہ اس واردات کو عقلی تنقید کی کسوٹی پر جانچے۔ اصل میں اقبال وجدان اور عقلی فکر کے تضاد ہی کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ فکر اور وجدان لازماً ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ "دونوں ایک ہی جڑ سے نکلے ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اول الذکر حقیقت کے اجزا کا الگ الگ ادراک کرتی ہے آخرالذکر اسکا من حیث الکل ادراک کرتا ہے۔" اس لئے اقبال وحدت وجود کے تصور کو جو محض وجدان پر مبنی ہے، ناکافی سمجھتے ہیں اور وحدت ذات کے تصور کو جو ان کے نزدیک وجدان اور عقل نے مل کر قائم کیا ہے حقیقت کی سچی اور مکمل تعبیر سمجھتے ہیں۔

نفس انسانی کے تصور اور اس تعلق کے تصور کے بارے میں جو انسان خدا سے رکھتا ہے دونوں میں اختلاف ہے۔ ٹیگور کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ نفس انفرادی کو محدود انسانی نقطۂ نظر سے حقیقی مگر حق مطلق کے نقطۂ نظر سے غیر حقیقی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک محدود میں جو کچھ حقیقت ہوتی ہے نامحدود کی نسبت سے ہوتی ہے۔ محدود انفرادی نفس کا نصب العین یہ ہے کہ نامحدود میں مل جائے۔ جوں جوں وہ نامحدود سے قریب ہوتا جاتا ہے اسکی حقیقت بڑھتی جاتی ہے اور انفرادیت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہی تعلیم خودی میں سعادت ہے۔ "انسان کی ابدی راحت کچھ پانے میں نہیں بلکہ اس میں ہے کہ اپنے آپ کو اسکے حوالے کردے جو اس سے بڑا ہے۔" بخلاف اسکے اقبال کے نزدیک محدود نفس انفرادی اسی طرح حقیقی ہے جس طرح لامحدود نفس مطلق یا خدا۔ اور نامحدود سے قریب تر ہونے سے اس کی انفرادیت گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی جاتی ہے "جو مشکل یہاں پیدا ہوتی ہے کہ محدود انا کی محدودیت نامحدود کے حضور میں کیونکر باقی رہ سکتی ہے اسے وہ اسطرح حل کرتے ہیں" "اس مشکل کی بنیاد نامحدود کا غلط مفہوم سمجھنے پر ہے۔ در اصل نامحدودیت کے معنی نامحدود وسعت کے نہیں، جسکا تصور اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ دنیا میں جتنی وسعتیں موجود ہیں سب اسکے اندر سمٹ لی جائیں۔ نامحدود کی ماہیت وسعت کی نہیں بلکہ شدت کیفی ہے۔ جیسے ہی ہم شدت کے مفہوم پر غور کرتے ہیں یہ بات سمجھ میں آنے لگتی ہے کہ محدود انا نامحدود سے جدا نہیں مگر اس سے مختلف ضرور ہے۔"

کائنات کا تصور ٹیگور کے ہاں بجنسہ ویدانت سے لیا گیا ہے۔ عالم طبیعی بھی حقیقت مطلق کا ایک مظہر ہونے کی حیثیت سے محض اعتباری وجود رکھتا ہے محدود ذہن اس کو اسی طرح ایک مستقل حقیقت سمجھتا ہے جیسے اپنے آپ کو۔ مگر یہ فریب نظر یا مایا ہے اور عالم طبیعی حقیقت انا اور غیر انا انسان مطلق کے دو پہلو ہیں ——— ایک فاعلی، دوسرا انفعالی۔ غیر انا یا عالم طبیعی ایک ذریعہ ہے انا کی روحانی قوت کے اظہار کا۔ لیکن یہ قوت اپنے آپ کو عالم طبیعی کے ساتھ کشمکش میں ظاہر نہیں کرتی بلکہ اس کے ساتھ یگانگی کا رشتہ قائم کرنے میں" جب تک انسان کو کائنات کے ساتھ رشتۂ اتحاد کا عرفان ہو، وہ ایک قید خانہ میں رہتا ہے جسکی دیواریں اس کے لئے غیر مانوس ہیں۔ جب وہ سب اشیاء میں روح ابدی کو پاتا ہے تو اس کو رہائی حاصل ہوتی ہے، اس لئے کہ اس وقت وہ اس دنیا کی پوری معنویت کو سمجھتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو کامل حقیقت کے اندر دیکھتا ہے اور وہ وجود کل کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے" اقبال کا تصور کائنات ان کے تصور الوہیت کی طرح جدید ارادیت کے فلسفہ کو تعلیم قرآنی کے ساتھ سمونے سے پیدا ہوا ہے۔ اقبال کے نزدیک عالم طبیعی حقیقت رکھتا ہے لیکن خدا کے بالمقابل کے طور پر نہیں بلکہ خطرۃ اللہ کے طور پر ——— وہ "کوئی کمیت مادی نہیں جو خلا کو پر کر رہی ہو بلکہ واقعات کی ایک ترتیب ہے، ایک منظم طرز عمل ہے، جو ذات مطلق سے نامیاتی علاقہ رکھتا ہے۔ عالم طبیعی کو ذات الٰہی سے وہی نسبت ہے جو سیرت انسانی کو ذات انسانی سے ہے" انسان کا محدود ذہن البتہ عالم طبیعی کو ایک مدمقابل سمجھتا ہے اور اسے اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسکا علم کائنات انفعالی نہیں بلکہ فاعلی ہے۔ "وہ ایک قسم کی بصیرت ہے جو سلسلۂ حیات کے ماورا ہے" "اس بصیرت سے مراد ہے اشیاء کے زمانی مکانی اور علّی علاقوں کا بصیرانہ ادراک جو انا کرتا ہے ——— یعنی معلومات کے پیچیدہ مجموعے میں سے بعض کا انتخاب اس مقصد کے لحاظ سے جو انا نے سر دست اپنے سامنے رکھا ہو۔ یہی کوشش کا احساس جو اس مقصد عمل کے تجربے میں ہوتا ہے اور وہ کامیابی جو مجھے اپنے مقاصد میں حاصل ہوتی ہے، مجھے ایک علت ذاتی کی حیثیت سے اپنی فعالیت کا یقین دلاتی ہے۔" اسی وجہ سے اقبال انسان کے ادراک کائنات کو "تسخیر" کے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں اور اس پر زور دیتے ہیں کہ تسخیر کائنات کے ذریعے انسان کی خودی زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ خدا، کائنات، انسان اور ان تینوں کے باہمی علاقوں کے بارے میں جو خیالات ٹیگور اور اقبال کے ہیں ان کے اندر ان دونوں کے فلسفہ ہائے حیات کا عکس نظر آتا ہے جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں ٹیگور کے ذہن میں حیات انسانی کے مقصد کا تصور وہی ہے جو اپنشدوں کے زمانے سے ہندو ذہن پر چھایا ہوا ہے یعنی اس جہل کے پردے کو اٹھا دینا جس کی وجہ سے افراد انسانی اور عالم طبیعی جداگانہ حقیقتیں نظر آتی ہیں۔ اس حقیقت عظمیٰ کی معرفت حاصل کرنا کہ وجود صرف ایک ہے اور وہ ہستی مطلق کا ہے" ہندوستان کی مخصوص فکر کا عقیدہ ہے کہ انسان کی اصلی نجات جہل سے چھٹکارا پانے میں ہے۔ اس کی نجات اس میں نہیں کہ کسی حقیقی اور مثبت چیز کو مٹائے، اس لئے کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا بلکہ مٹانا اس چیز کو ہے جو منفی ہے اور ہمارے مشاہدۂ حق میں حائل ہوتی ہے۔ جب یہ رکاوٹ، جسکا نام جہل ہے دور ہو جاتی ہے۔ تب جاکر آنکھ کا پردہ

اس طرح آفتاب خطرہ کو نقصان نہ پہنچے ، وہ مرقت انسان کو حق کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اس وقت وہ اس رنگ کی روحانی شوخی کا کہتا ہے جس کے اندر وہ پیدا ہوا ہے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو کائنات حقیقت کے مقابلہ کرتا ہے اور وجود کلی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔" یہ اعلیٰ مقصد انسان کو حواس اور عقل کی مدد سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس باطنی قوت کی مدد سے جسے وجدان کہتے ہیں۔ اسلئے تربیت نفس یعنی ذہنی کو دبانے اور شعور باطنی کو ریاضت کے ذریعے ابھارنے کی ضرورت ہے۔ انسانی زندگی کا اخلاقی مقصد بھی اسی مذہبی مقصد سے متعین ہوتا ہے۔ وحدت وجود کے شعور سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ سب انسان ایک ہی حقیقت کے مظاہر ہیں۔ اس لئے ہم دوسروں کو اپنے آپ سے متحد سمجھتے ہیں۔ ان کے فائدے کو اپنا فائدہ جانتے ہیں اور خود کو ان کی محبت اور خدمت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ یہی سب سے بڑی نیکی اور سب نیکیوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح بدی کی جڑ انسانوں کے وجود میں تفریق کرنا، اپنی ذات کو دوسروں سے الگ سمجھنا اور اپنی ذاتی خواہشات رکھنا ہے۔" یہی ہماری خواہشات ہماری معرفت نفس کی حدود کو تنگ کر دیتی ہیں، ہمارے شعور کی توسیع میں رکاوٹ ڈالتی ہیں اور گناہ کو وجود میں لاتی ہیں۔ یہ ایک اندرونی پردہ ہے جو ہمیں ہمارے خدا سے دور رکھتا ہے۔ تفریق و انتشار اور علیحدگی کا غرور پیدا کرتا ہے۔ گناہ کوئی ایک فعل نہیں بلکہ ایک طرز زندگی ہے جو اس مفروضے پر مبنی ہے کہ ہمارا مقصد محدود ہے خود ہمارا نفس آخری حقیقت ہے۔ ہم اصلاً ایک نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کی انفرادی زندگی الگ الگ ہے۔" شاعری کا کام یہی ہے کہ انسان کو خواہش نفس کے شکنجے سے چھڑائے "ہم (شعرا) انسانوں کو ان کی خواہشات سے نجات دیتے ہیں۔" خواہش سے نجات اسی وقت ممکن ہے جب فنکار احساس خودی کو دل سے دور کر دے۔ خود اور غیر خود کے فرق کو مٹا دے، جب وہ کائنات سے مخاطب ہو کر کہہ سکے "میں تجھے اس رنگ میں دیکھتا ہوں جس میں تو وہ ہے جو میں ہوں۔" یہی مشاہدہ حقیقت کی پاکیزہ مسرت، فنون لطیفہ کی اور شعر و ادب کی جان ہے۔" قدیم ہند کے ماہرین بلاغت کو یہ کہنے میں کوئی تامل نہ تھا کہ لطف و مسرت ادب کی جان ہے — وہ لطف و مسرت جو بے غرض ہو۔"

اب اس تصور زندگی کی بلاواسطہ کیجئے جو اقبال کے مابعد الطبیعی نظریات میں جھلکتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم عالم وجود سے عالم شہود میں، عالم سکون سے عالم سعی میں آ پہنچے گئے ہیں۔ یہاں ٹیگور نے بھی انسانی ذہن کے جمہور رجحان کے مطابق عمل پر بہت زور دیا ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، لیکن یہ ایک خارجی عنصر ہے جو ان کے بنیادی فلسفے سے نامیاتی تعلق نہیں رکھتا۔ اقبال کے فلسفۂ حیات میں تغیر اور حرکت، سعی و عمل کو رگ جان کی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں حیاتِ انسانی کا انتہائی مقصد خود کو غیر خود میں فنا کرنا نہیں بلکہ اثبات خودی ہے جسے خدا کا تصور ہے یعنی ذات مطلق کے کرتے ہیں جو خودی کی کامل شکل ہے۔ انسان کو تخلقوا باخلاق اللہ کے حکم کے مطابق بقدر استطاعت اس شان کی تقلید یعنی اپنی خودی کی توسیع اور استحکام کی کوشش کرنی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کائنات کا جسے وہ اپنے گرد دیکھتا ہے تحقیقی عرفان حاصل کرے یعنی اس کی قوتوں کو اور ان کے قوانین عمل کو دریافت کرکے ان سے اپنے مقصد کے لئے کام لینے کی کوشش کرے۔" انسان کے نصیب میں یہی ہے کہ اپنے گرد و پیش کی کائنات کے گہرے مقاصد میں شریک ہو، اپنی اور اس کی تقدیر کی تشکیل کرے، اس طرح کہ اپنے آپ کو اس کی قوتوں کے مطابق کرے اور کبھی اپنا پورا زور لگا کر اس کی قوتوں کو اپنے مقاصد کے سانچے میں ڈھال لے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے میں جو جدوجہد کرنی پڑتی ہے وہ صوفیوں کی ریاضت سے کہیں زیادہ معرفت حقیقت میں مدد دیتی ہے۔ اقبال اس اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے جو تسخیر کائنات انسان کے روحانی ارتقا کے لئے رکھتی ہے کہتے ہیں "اس راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کی ذہنی کوشش ہماری زندگی میں وسعت اور رنگینی پیدا کرنے کے علاوہ ہماری بصیرت کو تیز کرتی ہے اور اس طرح ہم میں یہ صلاحیت پیدا کرتی ہے کہ انسانی تجربے کے دقیق تر پہلوؤں پر زیادہ وثوق کے ساتھ نظر ڈال سکیں۔" کائنات کا یہ گہرا علم محض ذہنی اہمیت نہیں بلکہ انتہائی روحانی قدر رکھتا ہے۔" مشاہدۂ فطرت ایک طرح سے ذات مطلق کا محرم بننے کی کوشش ہے اور یہ عبادت ہی کی ایک دوسری شکل ہے۔" مگر اقبال انسانی خودی کو نٹشے کی طرح اخلاقی اقدار سے بالاتر، عالمگیر قوانین سے آزاد "اپنے لئے آپ قانون" نہیں سمجھتے۔ خودی کی صحیح نشوونما صرف ناموس الٰہی کی پابندی کے ذریعے ایسے منظم معاشرے کے اندر ہو سکتی ہے جو آزادی، اخوت اور مساوات کی بنیاد پر تعمیر ہوا ہو۔ وحدت انسانی کے احساس کو اقبال بھی ٹیگور کی طرح، اخلاقی زندگی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں لیکن ان کے ہاں یہ احساس وحدت مطلق کے تصور سے ماخوذ نہیں بلکہ وحدت تخلیق کے تصور سے۔ سب انسان ایک ہیں اس لئے نہیں کہ وہ سب بحر وجود مطلق کے قطرے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان سب کا ایک خالق ہے جس نے ان کو ایک ہی نفس حیات سے پیدا کیا ہے، یکساں فطرت اور طبیعت عطا کی ہے، اور یکساں قانون زندگی کا پابند بنایا ہے۔ اس قانون کی حدود کے اندر، اجتماعی زندگی کی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے، شخصیت کو نشوونما دیکر اس بلند درجے پر پہنچانا جہاں انسان حقیقت کا محرم، کائنات پر متصرف اور حیات ابدی میں حصہ دار بن جاتا ہے، خلیفۃ اللہ فی الارض کے لقب کا مستحق ہوتا ہے۔ یہی اخلاق کا نصب العین ہے اور یہی آرٹ کا۔

اقبال بھی، ٹیگور کی طرح، وجدانی مشاہدۂ حقیقت کو فنون لطیفہ کا

(باقی صفحہ [illegible] پر)



جدید تیرنے کے تالابوں کی تعمیر

تیرنے کے تالاب ہر طبقے کے لوگوں کی زندگی کی دلچسپی اور تندرستی میں زبردست اضافہ کرتے ہیں۔

یہ خواہ عوام یا خواص کیلئے تعمیر کیا جائے مگر ایک شہر میں کم از کم ایک ایسا تالاب ضرور ہونا چاہیے تاکہ بوڑھے اور جوان سب ہی اس تندرستی میں اضافہ کرنیوالی ورزش سے لطف اندوز ہو سکیں۔ تیرنے کے تالابوں کی مکمل تعمیر اور ان سے متعلقہ عمارتوں کی تعمیر کے لئے سیمنٹ کانکریٹ سے زیادہ کوئی دوسرا مسالہ موزوں نہیں ہے۔ یہ نہایت صاف اور محفوظ ہے اور اسکی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دیکھنے میں جاذب نظر اور دل خوش کن ہے اور بالکفایت ہونے کے علاوہ دیرپا بھی ہے۔

کانکریٹ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ مفید تعمیرات کیلئے دی کانکریٹ ایسوسی ایشن آف انڈیا، پرکنس ہاؤس نئی دہلی سے فنی امداد کی اعانت حاصل کی جا سکتی ہے۔

> ڈاک خرچ وغیرہ کیلئے تین آنے کے ٹکٹ مندرجہ بالا پتہ پر ارسال کر کے تیرنے کے تالابوں کے متعلق کتابچہ منگوا لیجئے

دی سیمنٹ مارکیٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ

CM. 104 A—

بھائی بہن

افسانہ

ستیہ وتی ملک

"ممی جی! .... ہائے! ماں جی! ..... ہائے!"

ایک بار، دوبار، لیکن تیسری بار "ہائے ہائے" کی دردناک پکار ساوتری برداشت نہ کرسکی۔ کاربن پیپر اور ڈیزائن کی کاپی وہیں کرسی پر پٹک جلدی سے اس نے غسل خانے کے دروازے کے باہر کھڑے کمل کو گود میں اٹھالیا اور پچکارتے ہوئے کہا "بچے سویرے سویرے نہیں روتے۔"

"تو نرملا میرا گانا کیوں گاتی ہے۔ اور اس نے میری ساری قمیص کیوں چھینٹے ڈال کر گیلی کر دی ہے؟"

غسل خانے کے اندر ابھی تک پتلی سی آواز میں نرملا گنگنا رہی تھی "ایک ..... لڑکا ..... تھا ..... وہ روتا ..... رہتا ......"

"بڑی ڈھیٹ لڑکی ہے۔ تہا کر باہر نکلے تو سہی، ایسا پیٹوں کر وہ بھی جانے" ماں سے یوں دلاسا پا کر کمل کپڑے بدلنے چلا گیا۔

نجانے کتنی نیک آرزوؤں، ارمانوں اور دعاؤں کو لے کر ساوتری نے اپنے بھائی کے جنم دن پر تحفہ بھیجنے کے لئے ایک سپید ریشمی کپڑے پر تتلی کا خوبصورت ڈیزائن کھینچا ہے۔ ہلکے پیلے، سنہرے اور گہرے لال رنگ کے ریشم کے تاروں کے ساتھ ہی ساتھ جانے کتنی ہی میٹھی یادیں بھی اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھ اٹھ کر بندھی سی جا رہی ہیں۔ اور کتنی ہی پربتوں، ندی نالوں اور میدانوں کے پار دور سے ایک چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے آکر اس کے رونئیں رونئیں کو سرشار کر رہا ہے۔ کبھی ایسا بھی لگنے لگتا جیسے سامنے دیوار پر لٹکتی ہوئی نریندر کی تصویر ہنس کر بول اٹھے گی۔ ساوتری کی آنکھوں میں محبت کے آنسو چھلک آئے۔ تتلی کا ایک پنکھ کاڑھا جا چکا ہے لیکن دوسرا شروع کرنے سے پہلے ہی کمل کی سسکیوں اور آنسوؤں نے ساوتری کو وہاں سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

سکول کی چیزوں کو بیگ میں ڈالتی ہوئی نرملا کے پاس کھڑے ہو کر ساوتری نے کڑک کر کہا "نرمل! تجھے شرم نہیں آتی کیا؟ اتنی بڑی ہو گئی ہے! کمل تجھ سے پورے چار سال چھوٹا ہے۔ کسی چیز کو اسے چھونے تک نہیں دیتی۔ ہر گھڑی وہ بیچارہ روتا رہتا ہے۔ اگر اس نے تیرے پنسل کو دیکھ لیا تو کیا ہوا؟"

نرملا سر نیچا کئے مسکرا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر ساوتری کا پارہ اور بھی زیادہ چڑھ گیا۔ اس نے بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔ "رانی جی، بڑے ہونے پر پتہ چلے گا، جب انہی نایاب صورتوں کو دیکھنے کیلئے بھی ترسوگی۔ بھائی بہن سدا ساتھ نہیں رہتے۔"

ماں کی جھڑکیوں نے نرملا کے ننھے ذہن کو ایک الجھن میں ڈال دیا۔ حیرت زدہ ہو کر وہ ماں کے غضبناک چہرے کی طرف صرف ایک بھاکت، گہری متعجب نگاہ ڈال کر رہ گئی۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد ذرا اداس سا منہ لئے نرملا جب کمل کو ساتھ لے کر سکول چلی گئی تب ساوتری کو اپنی ساری بیکہر بازی بے معنی سی معلوم ہونے لگی۔ دفعتاً اسے یاد آنے لگی کچھ سال پہلے کی ایک بات۔ تب وہ نریندر سے کیوں روٹھ گئی تھی؟ چھی! ایک معمولی سی بات پر..... لیکن کچھ جوبات معمولی سی جان پڑتی ہے۔ ان دنوں اسی معمولی، حقیر، ذرا سی بات نے اتنی بھیانک شکل کیوں اختیار کر لی تھی، جس کی وجہ سے بھائی بہن نے آپس میں پورے ایک مہینے تک ایک بات بھی نہ کی تھی۔ ایکا ایک ساوتری کے چہرے پر ہنسی کھل اٹھی، جب اسے یاد آیا نریندر کا دن رات نئے نئے ریکارڈ کا گراموفون پر بجانا اور ایک دوست سے دوربین مانگ کر بہن کے کمرے کی طرف جھانکنا کہ کسی طرح ان دونو چیزوں کا اثر ساوتری پر پڑ رہا ہے یا نہیں۔ اسے یہ بھی یاد کر کے خوب ہنسی آئی کہ کیسے وہ ہونٹوں پر مہر سکوت لگائے مٹھائی کی طشتری نریندر کے کمرے میں رکھ آتی تھی۔ میز پوش پھر ہاتھ میں لے کر کاڑھتے ہوئے ساوتری نے من ہی من میں عہد کیا کہ اب سے وہ بچوں کو بالکل ڈانٹ پھٹکار نہیں بتائے گی لیکن ادھر بارہ بجے کی آدھی چھٹی میں کھانے کے وقت پھر کئی شکایتیں کمل کی طرف سے موجود تھیں۔ "نرملا مجھے اپنے ساتھ ساتھ نہیں چلنے دیتی، پیچھے چھوڑ آتی ہے۔" "منداکنیر پورن دھارائے" کے بدلے "کمل کنیر پورن دھارائے" گانا گاتی ہے اور گندا کہتی ہے۔"

معاملہ کچھ اتنا سنگین نہ تھا۔ اور دن ہوتا تو شاید نرملا کی ان شرارتوں کو ساوتری ہنسی سمجھ کر ٹال دیتی، لیکن یہ سرکش لڑکی سویرے ہی اس کے عزیز ترین اور ضروری کام میں بار بار رکاوٹ ڈال رہی ہے! ایک ہلکی سی چپت نرملا کے لگاتے ہوئے ماں نے ڈانٹ کر کہا "بس کل ہی سکول سے تیرا نام کٹوا دیا جائے گا۔ یہ سب انگریزی سکول کی تعلیم کا ہی نتیجہ ہے۔ ذرا سی لڑکی نے گھر بھر میں آفت مچا رکھی ہے۔ اپنے بھائی بہنوں کی شکل صورت نہیں بھاتی۔ بڑی ہونے پر نہ جانے کیا کیا کرے گی۔" پھر تھالی میں پوری ترکاری ڈال کر بچوں کے آگے رکھتے ہوئے نرم دھیمی آواز میں کہا "دیکھو نرمل، جب میں تمہارے برابر کی تھی تو اپنے بھائی بہنوں کو کبھی تنگ نہیں کرتی تھی۔ کبھی اپنے ماتا پتا کو دکھ نہیں دیتی تھی۔" مگر یہ بات کہتے ہوئے اندر ہی اندر ساوتری نے کچھ جھجک سی محسوس کی۔

"ہم دونو سیتا کے گھر سے جلوس دیکھیں گے ماں! اچھا۔" کمل نے عاجزانہ لہجے میں اجازت مانگی۔

"چلیں جی، کیا اپنے گھر سے دکھائی نہیں دیتا؟" دروازے کی اوٹ میں نرملا کھڑی تھی۔ "کیسی چالاک لڑکی ہے۔ اسی غریب کو آگے کرتی ہے جب خود کچھ کہنا ہوتا ہے۔" "جاؤ، جانا ہے تو۔" ساوتری نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

پانچ بجے محرم کا جلوس نکلنے والا تھا۔ پل بھر میں چوراہے پر سینکڑوں مرد عورتوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ ساوتری کا دھیان کبھی کالے ہرے رنگ برنگے کپڑے پہنے مجمع کی طرف اور کبھی جلوس کی وجہ سے رکی ہوئی موٹر گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف خود بخود کھنچ رہا تھا اور ادھر ننھی نرملا کے ہوش و حواس یکایک گم سے ہو گئے جب اسے گھر میں کمل کا سایہ تک نظر نہ آیا۔ بیکل سی ہو کر وہ ایک کمرے سے دوسرے میں اور پھر آنگن میں بے چینی کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی دوڑنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ اسے سب کچھ سنسان سا معلوم ہونے لگا۔ وہ ماں سے کئی بار چھوٹے بچوں کے بھیڑ بھاڑ میں کھو جانے کا حال سن چکی ہے۔ آہ ... اس کا بھیا کمل ..... وہ کیا کرے؟

نیچے سڑک پر بھانت بھانت کے رنگ برنگے کھلونے، نئی نئی شکل کے غبارے، کاغذ کے پنکھے، پتنگ اور طرح طرح کے سُر نکالتے ہوئے باجے لاکر بیچنے والوں نے بچوں کے لئے پر سحر جال سا بچھا رکھا ہے، کچھ دور سے جیسے کسی شیخ کے پیچھے سے، ڈھما ڈھم ڈھما ڈھم ڈھول باجوں کی آواز بڑھتی آ رہی ہے۔ نرملا ان سب دلکش چیزوں کو بنا دیکھے سنے بھیڑ کو چیرتی پھلانگتی سیتا کے گھر بھی ہو آئی۔ لیکن کمل تو وہاں بھی نہیں ہے۔ روتے روتے نرملا کی آنکھیں سوج آئیں۔ چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا۔ آخر وہ ہچکیاں لیتے ہوئے زینے کے سے ماں کے پاس جا کر بولی۔ "کمل ... کمل تو سیتا کے گھر بھی نہیں ہے"۔

ساوتری کا تن بدن سُن سا ایک بار کانپ اٹھا۔ لمحہ بھر میں بھیڑ، موٹر اور گاڑیوں کے خوف سے بلائے ناگہانی کے کئی تصورات اس کی آنکھوں کے آگے گھوم سے گئے۔ لیکن وہ ڈرپوک لڑکے کی نس نس سے واقف تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ کمل ضرور ہی کہیں نہ کہیں کسی دوکان پر کھڑا ہو کر یا کسی نوکر کے ساتھ جلوس دیکھ رہا ہوگا۔ پھر بھی اس نے پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی نرملا کو چھاتی سے نہیں لگایا اور نہ اسے ڈھارس ہی بندھائی بلکہ متحیر سی ہو، تسلی و تشفی کا ایک لفظ تک کہے بغیر گویا وہ اپنی لڑکی کے آنسوؤں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رہ رہ کر ایک تذبذب سا اس کے دل میں اٹھنے لگا۔ "مجھ سے بھی زیادہ ——— بھلا ماں کے دل سے بھی زیادہ۔ کسی اور کو درد اور چنتا ہو سکتی ہے؟ اللہ نرملا تو دن رات کمل کو ستایا کرتی ہے"!

جلوس ختم ہو گیا۔ دھیرے دھیرے تماشائیوں کے جھنڈ بھی منتشر ہونے لگے۔ موٹر کاروں کا پہلے کی طرح دھڑا دھڑ آنا جانا پھر جاری ہو گیا۔ اور سامنے ہی کٹ ہاتھ پر سفید نکر اور سفید قمیص پہنے پڑوسی ٹھاکر صاحب کے نوکر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کمل کشور گھر آتا ہوا دکھائی دیا۔

سیڑھیوں سے پھر سسکنے کی آواز سن کر ساوتری نے دیکھا تو مبہوت سی رہ گئی۔ نرملا کمل کو اپنی باہنوں میں کس کر باندھے، ہچکی ضرب سے رو رہی ہے۔ اس کے کومل گلابی گال موٹے موٹے آنسوؤں سے بھیگے جا رہے ہیں اور وہ بار بار کمل کا منہ چوم چوم کر کہہ رہی ہے، "بچھلے! تو کہاں چلا گیا تھا؟ گدھے! تو کیوں چلا گیا تھا؟"

ساوتری کا دل بھر آیا۔ پاک محبت کے اس منظر کو دیکھ کر مسرت کی ایک دھارا سی اس کے دل کی گہرائیوں میں بہنے لگی، ابھرتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس نے کمل کی جگہ نرملا کو چھاتی سے لگا کر اس کا منہ چوم لیا اور کہا "بیٹا! بہن کو پیار کرو۔ دیکھو، وہ تمہاری خاطر کتنا روئی ہے۔ تم بلکہ جانتے ہو؟" نرملا کا اطمینان ہوتے دیکھ کر کمل بول اٹھا۔ "تو کیا میں وہاں نہیں رو رہا تھا؟" "تم کیوں روئے تھے جی؟" ماں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "مجھے غبارہ لینا تھا۔ پیسہ نہیں تھا۔" نرملا نے دوڑ کر اپنی جمع کی ہوئی چونی کے پیسوں سے دو غبارے اور دو کاغذ کے کھلونے کمل کو لا کر دیئے اور ایک بار پھر اسے باہنوں میں جکڑ کر کہا "گدھے، تو چلا کیوں گیا تھا؟"

ہندوستان کی مشترک تہذیب : ——— بقیہ صفحہ ۴

مقصد سمجھتے ہیں لیکن چونکہ ان کے نقطۂ نظر سے مشاہدۂ حقیقت محض انفعالی نہیں، بلکہ فاعلی، محض ادراکی نہیں بلکہ تخلیقی ہے، اس لئے درحقیقت ان کا آرٹ اور اس کے مقصد کا تصور ٹیگور سے بہت مختلف ہے۔ اقبال کے نزدیک آرٹ کا مقصد خود اور غیر خود کے فرق کو مٹانا نہیں بلکہ اس پر اور زیادہ زور دینا یعنی انسانی خودی کو محکم اور مکمل کر کے حیات ابدی بخشنا۔ اس کا کام سکون، رقت، سپردگی کی کیفیت پیدا کرنا نہیں بلکہ تخلیقی بے چینی، ایک حرکت دینے والے اور مجاہدانہ جوش کا ابھارنا ہے۔

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے ✽ یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا

جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا ✽ اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو ✽ جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں ✽ جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

نادر شاہ کا آخری غیور سپاہی

ڈرامہ (۱)

اشہر لکھنوی

یہ ڈراما جدید فارسی زبان میں آقائے سید نفیسی تبریزی نے لکھا ہے جس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ دوسری موثر تدابیر کے ایرانیوں میں جوش وطن پرستی پیدا کیا جائے اور ان کے اسلاف کی شاندار روایات کو یاد دلا کے شجاعت قومی کی دبی ہوئی چنگاریوں کو دوبارہ مشتعل کیا جائے۔

اس کی تشکیل کے سلسلے میں مصنف نے آخری جنگ روس و ایران کا حوالہ دیا ہے جو میدان قفقاز میں ہوئی تھی۔ پلاٹ نہایت سادہ ہے جس میں ایرانیوں کے تمدن و معاشرت کے تمام خصوصیات موجود ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس غم انجام واردات کو نہایت خوش اسلوبی سے حوالۂ قلم کیا گیا ہے۔

اشہر

اشخاص

(۱) اللہ یار بیگ۔ نادر شاہ کی فوج کا ایک عمر رسیدہ افسر (ایک سو بیس سال عمر)
(۲) اردشیر بیگ۔ اس کا فرزند (پچاس سال کا)
(۳) فلک ناز۔ اردشیر کی لڑکی (دس سال کی)
(۴) میرزا مسیح طبیب (قراچہ داغی) (ساٹھ سال کا)

شہر تبریز میں ایک مکان ہے جس کے ایک وسیع کمرے کے دو دروازے مشرق و مغرب کی طرف اور تیسرا شمال کی سمت۔ مشرقی دروازے کے سامنے ایک توشک بچھی ہے جس پر صاف چادر ہے اور ایک بڑا گاؤ تکیہ لگا ہے۔ کمرے کے مغربی جانب دو اور موٹی قالینیں ہیں۔ اس کے علاوہ تمام کمرے کا فرش بھی قالین ہی کا ہے۔ اور شمال کی جانب پہلو میں ایک بڑا لکڑی کا صندوق رکھا ہوا ہے۔

پردہ اوّل

(اللہ یار بیگ اور فلک ناز بیٹھے ہیں۔ بعد کو اردشیر بیگ بھی آ جاتا ہے)

کمرے کے بیچ سے توشک پر اللہ یار بیگ شکستہ سا بیٹھا ہوا ہے اور فلک ناز اس کے بائیں جانب خاموش بیٹھی ہے۔

اللہ یار بیگ: فلک ناز! بیٹی تمہارا باپ کہاں ہے؟ آدھ گھنٹے سے میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ ابھی تک نہیں آیا۔ کھانے کے وقت بھی موجود نہ تھا۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں یہ وقت نہ آئے کہ پھر کچھ نہ ہو سکے۔

فلک ناز: دادا جان۔ مایوس نہ ہوجیے۔ بابا کہیں ہوں مگر یہ وقت اُن کے آنے کا ہے۔ آپ خود جانتے ہیں کہ روزانہ تقریباً بارہ بجے گھر آتے ہیں۔ آج نہار کے وقت بھی نہیں آئے۔ بہت ممکن ہے کہ گرفتار ہو گئے ہوں۔ مگر دادا جان ازبرائے خدا یہ تو بتلائیے کہ آپکا مزاج کیسا ہے۔ آج صبح سے اب تک میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کچھ بجھے سے بیٹھے ہیں! آپ تو برابر باتیں کیا کرتے تھے۔ اپنے دور دراز سفروں کے دلچسپ قصے۔ نادری لڑائیوں کا حال برابر بیان کیا کرتے تھے جن کی وجہ سے مجھے تنہائی بالکل نہیں کھلتی تھی۔ آج کیا ہے کہ آپ سخت متفکر معلوم ہوتے ہیں۔ خدا کے لئے بتلائیے تو کیا معاملہ ہے؟ مجھے بھی تو معلوم ہو۔ اب مجھ میں اتنی طاقت و صبر نہیں کہ آپ کو زیادہ رنجیدہ دیکھ سکوں۔

اللہ یار بیگ: جان پدر بس تم دونوں (باپ بیٹی) میری دکھ بھری زندگی کا سکھ ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ نہ تو میرے پاس کوئی اندوختہ ہے جسے دیکھ کر خوش ہوں۔ نہ میرا کوئی جاہ و وقار باقی ہے کہ اس میں مست رہوں۔ یہی چالیس سال سے (کچھ توقف کے بعد) ہاں چالیس سال سے۔ میں نے تبریز میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ ابتداءً تو یہ کافی دلچسپی کا سامان تھا۔ یہی سوچا کرتا تھا کہ ممکن ہے زمانہ پھر مجھے موقع دے کہ میں کسی قومی جنگ میں دوبارہ ان بازوؤں سے کام لوں۔ ان پنجوں کو (جو اس قدر کمزور ہو گئے ہیں) دشمنوں کے خون سے رنگین کر لوں!....

اس کے علاوہ۔ بیٹی! تمہاری دادی اور ماں زندہ تھیں۔

ایسے لوگوں کے لئے جنھوں نے اپنی طاقتور جوانی نادر شاہ ایسے جبّار بادشاہ کے ساتھ لڑائیوں میں گذاری ہو ضروری ہے کہ بڑھاپے کے دم چند روز گوشۂ عافیت میں بسر کریں۔ اپنے گرد تم ایسی معصوم ہستیوں کو دیکھیں اور ان کی تفریح کیلئے دلچسپ باتیں کریں۔

پاک نہیں ہوئے کہ موت کے بے رحم ہاتھ نے میری اس مسرت کے
دائرے کو تنگ کر دیا۔ او تمہاری بوڑھی دادی اور جوان ماں کو
ہم سب سے جدا کر دیا۔ اب میری خوشی اور دل کا چین۔ بیٹی!
تم اور تمہارے باپ کی ذات سے وابستہ ہے تم دو تو میری
دھندلی آنکھوں کی روشنی اور مرجھائے ہوئے دل کی ٹھنڈک ہو
اگر تم کبھی مجھے رنجیدہ پاؤ تو یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ اس کا باعث تم یا
تمہارا باپ ہے۔ بھلا دنیا میں کون ایسا ہے جو اپنے مطیع اور
فرمانبردار بچوں سے ناراض ہو۔

نہیں بیٹی! نہیں۔ تم دو تو میری آخری امید ہو۔ شاید آج
یا کل میں اپنی آخری سانس تیری گود میں۔۔ نہیں ... تنہائی
میں.... تیرے سینے پر سر رکھ کر ختم کر دوں! اور اس جاتی ہوئی
دنیا کا آخری نقش جو میری بند ہوتی ہوئی آنکھوں میں رہ جائے
وہ تیرا نورانی اور محبوب چہرہ ہو۔

لیکن نہیں... نہیں... میں اتنے جلد مرنا نہیں چاہتا۔ اگر
دو تین روز قبل موت آتی تو شاید نہایت خوشی سے منظور کر لیتا۔
مگر اسوقت محسوس ہو رہا ہے کہ ممکن ہے، چند روز اور زندہ
رہوں کہ اس جنگ کو بھی دیکھ لوں اور اس آخری فتح کی مسرت
کو بھی اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں۔

فلک ناز:۔ دادا جان کیسی دہشت انگیز باتیں آپ کر رہے ہیں! لڑائی؟
کیا پھر لڑائی ہو رہی ہے! ہم ایرانیوں میں اب اس بدقسمتی کے برداشت
کرنے کی طاقت بالکل نہیں رہی۔ دادا جان! جب سے میں نے
ہوش سنبھالا ہے اسوقت تک اطمینان سے پانی کا گھونٹ حلق
سے نہیں اترا۔ برابر زحمت و پریشانی سے سابقہ رہا۔ آج گرجیون
سے لڑائی ہے تو کل کردوں سے۔ پرسوں اور کسی سے۔ روزانہ
ایک تازہ مصیبت نازل ہوتی ہے۔ آج پھر آپ جنگ کی خبر بد
سنا رہے ہیں.... خدا کا واسطہ۔ دادا جان۔ جلد بتائیے کہ
کیا خبر ہے۔ میرا تو کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے۔

اللہ یار بیگ:۔ نا بیٹی۔ پریشان نہ ہو۔ کوئی ہماری طرف رخ نہیں
کر سکتا۔ ایرانی فوج طاقت دار اور تجربہ کار ہے۔ ہم اپنے دشمنوں
کے باپ کو پچھاڑ دیں گے اور انھیں پیوند زمین کر دیں گے!
ابھی ایرانی نادر شاہ کو نہیں بھولے ہیں..... جنگ خراسان و
بغداد.... و گرجستان انھیں یاد ہے (جوش میں) اور خود
میں کسی سے کم ہوں..... جب تک یہ ہاتھ میرے جسم میں ہیں۔

... مجھے برداشت نہ ہوگا کہ دشمنوں کے منحوس پاؤں سے ایران کی
مقدس زمین ناپاک ہو...... فلک ناز!... بیٹی اطمینان
رکھو یقین رکھو! (اس درمیان میں اردشیر بیگ کے پاؤں کی آہٹ
بائیں جانب سے آتی ہے)

ہا! تیرا باپ آگیا۔ بیٹی ذرا خاموش رہ میں اردشیر سے کچھ باتیں
کر لوں۔

اردشیر بیگ: پدر جان۔ السلام علیکم۔ اب تک آپ میرے منتظر ہونگے
اگر مجھے کچھ دیر ہوگئی ہو تو معاف فرمائیے۔ میں صبح کو مسجد گیا تھا کہ
سب احباب جمع تھے۔ سلطنت روس نے دو ہفتہ قبل سلطنت ایران
سے اعلان جنگ کیا ہے اسی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ چونکہ یہ
ایک اہم معاملہ تھا اس وجہ سے دیر تک بحث مباحثہ ہوتا رہا۔
میں نے بارہا صحبت سے اٹھنے کا ارادہ کیا مگر دل نے نہ مانا۔

اللہ یار بیگ:۔ جان پدر! یہ انتظار معمولی نہیں تھا۔ میرا جی چاہتا تھا
کہ ذرا جلدی چلے آتے کہ اس معاملے میں میرے تمہارے درمیان
کچھ گفتگو ہو جاتی۔ اب یہی وقت ہے اس کے متعلق ہم مفصل
گفتگو کر سکتے ہیں...... ہاں تو مسجد میں کیا گفتگو ہو رہی تھی۔
اور تازہ خبر کے متعلق لوگ کیا کہہ رہے تھے؟

اردشیر بیگ:۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ دو ہفتے ہو گئے کہ سلطنت روس
کا اعلان جنگ پایہ تخت طہران میں پہونچ گیا ہے۔ شاہ نے بڑی
کوشش کی کہ روس اعلان جنگ واپس لے مگر کوئی نتیجہ نہ ہوا۔
روسی جنگ کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ شاہ عجم کلاہ بھی مجبور
ہے کہ تمام قبائل کو جنگ کے لئے تیار کرے۔ لہٰذا تمام اطراف ایران
سے شاہی فوج کو طلب کیا گیا ہے تاکہ قفقاز کی طرف کوچ کرے۔
...... کل شہر میں علماء کی طرف سے اعلان جہاد بھی ہو گیا ہے۔
اور ایک جم غفیر جنگ میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہے۔ وزیر جنگ
بھی کل اپنی فوج کے ساتھ کوچ کر دیں گے۔
روسی فوج کے متعلق سنا گیا ہے کہ ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور
ماسکو سے چل پڑی ہے۔ مزید براں ان میں کی کچھ تعداد گرجستان
پہونچ بھی چکی ہے۔ آج وزیر جنگ نے تمام قبائل آذربائجان
کو طلب کر کے حکم دیدیا ہے کہ اپنے اپنے سوار و پیادوں کو ساحل ارس
پر جمع کر دیں..... تبریز میں یہ عالم ہے کہ جو شخص ہاتھ میں
تلوار پکڑ سکتا ہے لڑائی پر جانے کے لئے تیار ہے اور فناسراہوں
پر تو ایک عجیب ہمہمہ ہے۔ جوانان جنگ جو اپنے دوستوں سے

رخصت ہو رہے ہیں۔ کمانیاں ـ زین ـ اور جنگی سامان بنانے والوں کی دکانوں پر بڑی بھیڑ لگی ہوتی ہے۔ بڑے بڑے عمائدین نے اپنے خاص گھوڑے شاہی رسالوں کو پیش کر دئے ہیں نیز چوپایہ فروشوں کے پاس جتنے گھوڑے۔ خچر ـ اونٹ وغیرہ تھے سب محکمۂ جنگ کی نذر کر دئے۔ میرے احباب میں سے اس وقت تک تقریباً انیس جوان فوج میں بھرتی ہو چکے ہیں بابا جان! جن میں سے آٹھ آدمیوں کو تو آپ بھی جانتے ہیں محمود بیگ ـ ارسلان بیگ وغیرہم ـ اور کل یہ سب وزیر جنگ کے ساتھ کوچ کر دیں گے احباب مجھ سے بھی شرکت جنگ کے لئے مصر ہیں۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں۔ ۔ ۔ ۔

اللہ یار بیگ: ـ ہاں پسر! کیا تمہارا جانے کا ارادہ نہیں؟

اردشیر بیگ: ـ نہیں تو۔

اللہ یار بیگ: ـ بیٹا کیوں نہیں جاتے۔ کونسی شے مانع ہے؟

اردشیر بیگ: ـ بابا جان! آخر میری ذمہ داریوں کو تو ملاحظہ کیجئے۔

اللہ یار بیگ: ـ ہاں سب سے بڑھ کر تم پر ایک اور ذمہ داری ہے۔

اردشیر بیگ: ـ میں آپ کو اور فلک ناز کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔

اللہ یار بیگ: ـ اردشیر! شرم کر۔ ۔ ۔ شرم تو میرے لئے اور اپنی لڑکی کی محبت میں اس ایران کو نظر انداز کر رہا ہے جس کے لئے میرا اور تیرا دونوں کا خون بہ جائے تو اچھا۔ کیا اسی کے لئے مادر وطن نے تیری پرورش کیا تھا۔

اردشیر بیگ: ـ بابا جان! ـ آپ کمزور بھی ہیں اور بیمار بھی ـ آپ کے لئے ایک تیماردار کی ضرورت ہے ـ فلک ناز کمسن ہے۔ اس کے سر پر اور کوئی بزرگ نہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کے دشمن نہ رہے تو۔ ۔ ۔ میری پیاری ـ باعصمت فلک ناز! اس دیار غربت میں تنہا کیا کرے گی ـ جہاں جنگی دور دورہ ہوگا ـ تباہی ہوگی۔ قحط ہوگا! ـ

اللہ یار بیگ: ـ اردشیر کیا تو بھول گیا کہ تو اللہ یار بیگ کا فرزند ہے ـ کیا تو بھول گیا کہ تو اس کا فرزند ہے جس نے نادر شاہ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں۔ ۔ ۔ ۔ نادر شاہ کے ہمراہ رکاب خونی لڑائیاں لڑی ہیں!!۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شیر مادر تجھ پر حرام! اردشیر! سن! میں پندرہ سال چین سے نہیں بیٹھا ـ کرمان و خراسان ـ اصفہان و شیراز ـ خوارزم و بغداد ـ گرجستان و ہندوستان ـ ہر میدان جنگ میں موجود تھا۔ ۔ ۔ نہ برف و بارش کی پرواہ کی ـ نہ خستگی و مرض کی ـ نہ زخم و تکلیف کی ـ و شکست و فرار کی ـ غرض یہ ہے کہ کسی بلا سے بھی نہیں ڈرا۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اردشیر! ذرا اس بڈھے کا دل گردہ دیکھ!

اس مدت میں کسی رات آرام کی نیند نصیب نہیں ہوئی اطمینان کا ایک گھونٹ پانی حلق کے نیچے نہیں اترا ـ نہ تو کسی عورت کی صورت دیکھنے کو ملی کہ اس کے نازک ہاتھوں سے ایک جام شربت پیتا ـ نہ جاڑے میں گرم بستر سنجاب پر پاؤں پھیلا کے آرام کی نیند سوتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم شیر درندہ کی طرح اس صحرا سے اس صحرا ـ اور اس شہر سے اس شہر ـ دشمن کا تعاقب کرتے رہے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم نے بلخ سے لیکے بغداد تک ـ سلیمانیہ سے لے کے محمد آباد تک بادشاہوں اور امیروں کے عالیشان محلوں کی دیواروں پر (نوک خنجر سے) جلی حرفوں میں اپنا نام کندہ کر دیا!

وائے ہو تجھ پر ـ اے انقلاب زمانہ! اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم ایسے بہادروں کے لڑکے محبت پدر و دختر کا بہانہ ڈھونڈ کے چاہتے ہیں کہ ایسے نازک موقع پر مادر وطن کی خدمت سے منہ موڑ لیں جبکہ وہ ان کی مدد کی محتاج ہے ـ عورتوں کی طرح اوڑھنی اوڑھ کے گھر میں بیٹھے رہیں اور دور سے تماشا دیکھیں کہ حمایت وطن میں برادران وطن کا خون زمین پر بہہ رہا ہے۔

اردشیر! اگر تو جنگ میں کام آ گیا تو مجھے بھی ختم سمجھ ـ تیری دختر عزیز فلک ناز کا ـ غلاں روسی افسر کی کنیز ہو جانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم اس گھر میں جان چرائے بیٹھے رہیں! ـ اور کل یا پرسوں ان سفید چہرے والے روسیوں کے سامنے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ـ جھک کے سلام کریں ـ اردشیر! شرم کر! شرم کر! بس خاموش رہ!

آج نادر شاہ نہ ہوا جو تیرا سر تن سے اڑا دیتا! لیکن اگر وہ نہیں ہے۔ ۔ ۔ تو میں جو اس کے دروازے کے کتے کی حیثیت بھی نہیں رکھتا ـ خدا کا شکر ہے کہ زندہ ہوں ـ میرے بازوؤں میں ابھی اتنی سکت ہے کہ تیرا نجس خون اس پاک سرزمین پر بہا دوں!!!

فلک ناز: ـ (بیتاب ہو کے ـ اور اللہ یار بیگ کے قدموں پر سر رکھ کے) دادا جان! آپ تو کبھی ایسے سخت دل نہیں تھے ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ ہم لوگوں سے پیش آتے تھے ـ اور محبت آمیز باتیں کیا کرتے تھے ـ آج آپ کو کیا ہو گیا ـ کہ یک لخت آپ نے اس اچھے برتاؤ کو بھلا دیا؟ دادا جان! اپنی ضعیفی پر

اور میری معصوم امنگیں پر تستر بکھلے۔ خیر میری طرف نہ دیکھیے ... مگر اپنے بڑھاپے پر۔ بٹ اپنے بڑھاپے پر رحم کیجئے!

[illegible]: بیٹی! تو چپ رہ۔ یہ معاملہ ایسا معمولی نہیں جس میں عورتیں دخل دیں۔ تو ابھی بچی ہے۔ تجھے ماں بننے کا موقع نہیں ملا ہے۔ تو کیا سمجھ سکتی ہے کہ مادر وطن کے لئے فرزندان وطن کی کیا روش ہونی چاہیئے؟ جان پدر! میں وہی مہربان اور نازک دل مرد ضعیف ہوں جیسا پہلے تھا۔ لیکن اسوقت ایران کی نازک حالت دیکھ کے میرا دل سخت اور مزاج تند ہو گیا ہے۔ بیٹی تو اپنے امور متعلقہ کو سہولت اور دلجمعی سے انجام دے اور مجھے اپنے ذاتی خرخشوں میں چھوڑ دے تاکہ میں تیرے بے سمجھ باپ کو ان بُرے خیالات سے باز رکھوں ...... تو جانتی ہے کہ ہمارے خاندان کی شرافت صرف اسی وجہ سے ہے کہ میں نے اپنے زمانۂ شباب کے پندرہ برس نہایت سخت مصیبتوں اور ناگوار زحمتوں میں گذارے ہیں۔ ایک ایسے صاحب جلال بادشاہ کے ہمراہ رکاب جنگ کی ہے جس کے خوف سے روم و روس سے لے کے دریائے جمنا تک لوگوں کو رات کو نیند نہیں آتی تھی .... بیٹی! تجھے کیا معلوم کہ میں نے یہ تمام فخر و شرف اپنے قوت بازو سے اور دشمنوں کے خون سے پیدا کیا ہے!

آج زمانے نے پھر ایک موقع دیا ہے کہ مجھ ایسے سپاہی کا اکلوتا لڑکا جو دنیا میں میرا قائم مقام ہوگا۔ میرے فخر و شرف کی تکمیل کرے ...... میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے .... بس اب مجھے اپنے باپ سے دو ٹوک بات کر لینے دے!

(اردشیر کی طرف متوجہ ہو کر) اردشیر! یاد رکھ تیرے ضعیف باپ نے جو شاید دو ایک روز کا اس دنیا میں اور مہمان ہے۔ ایک سو بیس برس میں صرف دو چیزیں اپنے لئے مہیا کی ہیں اور وہ بھی صرف آج کے دن کے لئے!

اے بے رحم فرزند! تو یہ چاہتا ہے کہ سب میرا کیا کرایا خاک میں مل جائے۔ پہلی چیز میری شرافت ذاتی ہے جو پندرہ سال تلواروں کے سائے میں ... موت کے منہ میں رہ کے حاصل کی ہے۔ اور وہ بھی نادرشاہ افشار .... ہاں ... نادرشاہ افشار کے تخت پر رحم کے نیچے! اردشیر! فقط تو نے نادرشاہ کا نام ہی سنا ہے۔ تیرے تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ یہ شجاع مرد۔ اور مردمیدان فرد کیا تھا۔ اور کون تھا ..... میرے عزیز فرزند! نادر نام کا بادشاہ نہیں تھا۔ وہ ایسا صاحب جبروت تھا کہ اب ایران میں اس کا ثانی پیدا ہونا دشوار ہے ... نادر شاہ وہ تھا کہ صرف جس کے خیال سے مجھ ایسے ایک سو بیس سال کے بڈھے میں جوش جوانی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اس جلیل القدر انسان کی بدولت میں نے یہ ذاتی شرف حاصل کیا ہے! اردشیر جان! تو تیری ذات مجھے سو درجہ عزیز ہو سکتی ہے لیکن میں تجھ پر اس شرف عزت پر نثار کرنے کو تیار رہوں!

دوسری چیز۔ اردشیر! تیری عزیز ذات میرا اندوختہ۔ تو ہی میرا میوۂ زندگی ہے۔ تیری ہی ذات ہے جسے میں نے زمانۂ شباب سے اسوقت تک ذخیرہ کیا ہے۔ اردشیر! آج جبکہ میں اس شرافت دیرینہ کی حفاظت کرنے سے مجبور ہوں مجھے امید ہے کہ تیرے قوی بازو اس کی حفاظت کریں گے۔

اے بے رحم سخت دل۔ اردشیر! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میرا تمام ثمرۂ زندگانی تباہ و برباد ہو جائے؟ نہیں۔ نہیں ......

میں نہیں مان سکتا! یا تو میرے یہ ہاتھ تیرے خون سے رنگین ہونگے جنھوں نے تجھے پرورش کیا ہے۔ یا تو دشمنوں کے ہاتھ سے قتل ہوگا!!! اور کوئی تیسری صورت نظر نہیں آتی۔ اردشیر! تو تیری زندگی جسکو تو اسقدر عزیز سمجھتا ہے۔ تیری نہیں۔ بلکہ میری ملکیت ہے میں نے تجھے بخشی ہے مجھے حق ہے کہ میں خود اسے واپس لوں۔ یا میرے دشمن اسے ختم کر دیں۔ اب جیسی تیری مرضی! بول تجھے ان دونو صورتوں میں کونسی صورت پسند ہے؟

اردشیر:۔ پدر جان! میری دلی خواہش ہے کہ حیات کی دولت پانے کے بعد آپ ہی کے پاک ہاتھوں سے مجھے موت کی نعمت بھی نصیب ہو!

اللہ یار بیگ:۔ اردشیر! مجھے ایک بات اور کہنا ہے۔ شاید یہ آخری فقرے ہوں جنہیں تو اپنے بڈھے باپ سے ...... ہاں! شریف خیال باپ سے ... سنے گا!۔ اردشیر! غور سے سن میرے لئے دنیا کی کوئی شے اس سے زیادہ باعث ننگ و عار نہیں کہ اس موقع پر جبکہ مملکت ایران خطرے میں ہے اور ہزاروں ہمارے برادران وطن جو ظاہری حیثیت سے مجھ سے اور تجھ سے بہت کم ہیں حفاظت ایران کے لئے کمربستہ نظر آتے ہیں۔

تبریزی جوان ... نہیں ... بلکہ تمام ایرانی رود جیحون سے لیکے دریائے فرات تک جہاں نشانان وطن نظر آرہے ہیں ہم دونوں پر ان کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں تاکہ دیکھیں کہ آتش نادری کے یہ آخری شعلے جنہوں نے پندرہ سال تک دنیا میں آگ لگا رکھی تھی وطن کے لئے کیا کارنمایاں کرکے دکھلاتے ہیں؟ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ کل تبریز سے تیس نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے ہیں جن میں سے ایک بھی فوج نادری کے سپاہیوں کی اولاد سے نہ تھا اب لوگوں کو کہنے کا موقع ہے کہ سب گئے لیکن اللہ یار بیگ سنادرشاہ کی خاص پلٹن کے افسر کا لڑکا اردشیر بیگ نہ گیا۔ اور گھر میں اپنے بڈھے باپ اور نوجوان لڑکی کے ساتھ گھسا بیٹھا رہا ... یا اللہ ... آج میرے لئے موت کا سامنا ہے! اردشیر! تیری اس کوتاہی خدمت وطن سے جبکہ نادرشاہ قبر میں تڑپ اٹھا ہوگا ... میں ... کل روز قیامت کس منہ سے اس کے سامنے جاؤنگا!!! - اچھا۔ اچھا! تو اس طویل داستان کے بعد اردشیر تیرا کیا ارادہ ہے؟ میدان جنگ میں جانا ہے یا نہیں؟

اردشیر :- پدر جان! کیا عرض کروں!

اللہ یار بیگ :- کیا تو نہیں جائیگا؟ نہیں جائیگا! (اپنا ہاتھ غصے میں اردشیر کے گریبان کی طرف بڑھاتا ہے مگر کچھ سوچ کر رک جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے) میں تیری طرح بے رحم نہیں ہوں ... بیغیرت۔ نہیں ہوں۔ اردشیر! گھر میں عورتوں کی طرح چادر اوڑھ کے بیٹھ ... تیری طرف سے میں خدمت وطن انجام دونگا۔ اللہ یار ابھی زندہ ہے! اس کی رگوں میں خون جاری ہے!

(غصے میں کھڑا ہوجاتا ہے۔ اور دروازے کی جانب دو تین قدم تیزی سے بڑھاتا ہے لیکن چوتھی بار اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں اور زمین پر گر کے بے حس وحرکت ہوجاتا ہے۔ جیسے فالج گر پڑا ہو۔ کمرے میں خاموشی پھیل جاتی ہے۔ اردشیر اور فلک ناز دونوں اس کے پاؤں پر سر رکھ دیتے ہیں۔)

فلک ناز :- (آنکھوں میں آنسو بھر کے) پدر جان! آپ کو کیا ہوگیا؟

اردشیر بیگ :- پدر جان! مجھ سے سخت غلطی ہوئی معاف کیجئے۔ برائے خدا اتنا غصہ نہ کیجئے۔ آپ کا جو حکم ہو میں اسے بجالانے کیلئے تیار ہوں۔

فلک ناز :- (اللہ یار بیگ کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کے) پدر جان! اپنی ضعیفی پر رحم کیجئے۔ اس قدر جوش اچھا نہیں (رونے لگتی ہے)

.... (باقی دارد)

رخصت

احمد ندیم قاسمی

ترے کہنے پہ کی ہے کوشش ضبطِ فغاں میں نے
مگر اٹھتا ہوا دیکھا ہے اب دل سے دھواں میں نے

مجھے ماضی کے فردوسِ حسیں میں گھوم لینے دے
تجھے پایا تھا اکثر جس میں اپنا ہم عناں میں نے

وہ تیرے التفاتِ جانفزا کی مختصر گھڑیاں
چکھا تھا اُن دنوں کیفِ حیاتِ جاوداں میں نے

وہ دن جب تیری دھن میں اک سفر تھی زندگی اپنی
پلوں میں چھان ڈالی وسعتِ کون و مکاں میں نے

وہ لمحے، جب سجا کر پیڑیوں سے اپنے ہونٹوں کو
تری بندہ نوازی کا لیا تھا امتحاں میں نے

وہ پل، خوف و خطر سے کھیلتا تھا جب شباب اپنا
بنائے تھے شکستہ ڈالیوں پر آشیاں میں نے

ہدف بننے کی خاطر کہکشاں دامن بڑھاتی تھی
کچھ اس شدت سے کھینچی تھی محبت کی کماں میں نے

ترے ہونٹوں سے جو گیتوں کی صورت میں ٹپکتا تھا
پیا تھا ایک مدت تک وہ خونِ ارغواں میں نے

وہ جس کو دیکھ کر جی چھوٹ جائیں ناخداؤں کے
کیا تھا اس سمندر میں سفینے کو رواں میں نے

یہ سب کچھ خواب تھا، اور خواب بھی ساون کی راتوں کا
بہاروں پر نہ دیکھا سایۂ دورِ خزاں میں نے

بچھڑ کر تجھ سے آخر روح کی تسکین کی خاطر
کیا ہر ذی نفس پر اپنا دردِ دل عیاں میں نے

حسینوں میں پھرا، باغوں میں گھوما، دشت میں بھٹکا
کہیں پایا نہیں لیکن مسرت کا نشاں میں نے

اگر تو اذن دے تو یہ جہاں فتح کر چلا جاؤں
ذرا اس آسماں کی چاردیواری میں گھوم آؤں

نئی مرکزی حکومت کے اراکین



(اگلی صف میں بائیں طرف سے) سردار بلدیو سنگھ۔ ڈاکٹر جان متھائی۔ مسٹر سی راجگوپال اچاریہ۔ پنڈت جواہرلال نہرو
مسٹر لیاقت علی خاں۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ مسٹر آصف علی اور مسٹر سی ایچ بھابھا۔ (پچھلی صف میں بائیں طرف سے
مسٹر جگ جیون رام۔ مسٹر غضنفر علیخاں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور سردار عبدالرب نشتر۔

کئی ہفتے کی مسلسل گفت و شنید اور خط و کتابت کے بعد
انجام کار ہندوستان کی دو بڑی جماعتیں یعنی کانگریس اور مس
لیگ ایک مرکز پر آکر عبوری حکومت میں حصہ لینے کیلئے آما
ہوگئیں۔ مسلم لیگ کے نمائندوں کو مناسب عہدے دینے کی خا
تفویض شدہ عہدوں کو نئے سرے سے تقسیم کرنا پڑا۔ انکی تفصیل اس
شمارے کے "رفتار زمانہ" میں ملاحظہ فرمائیں۔

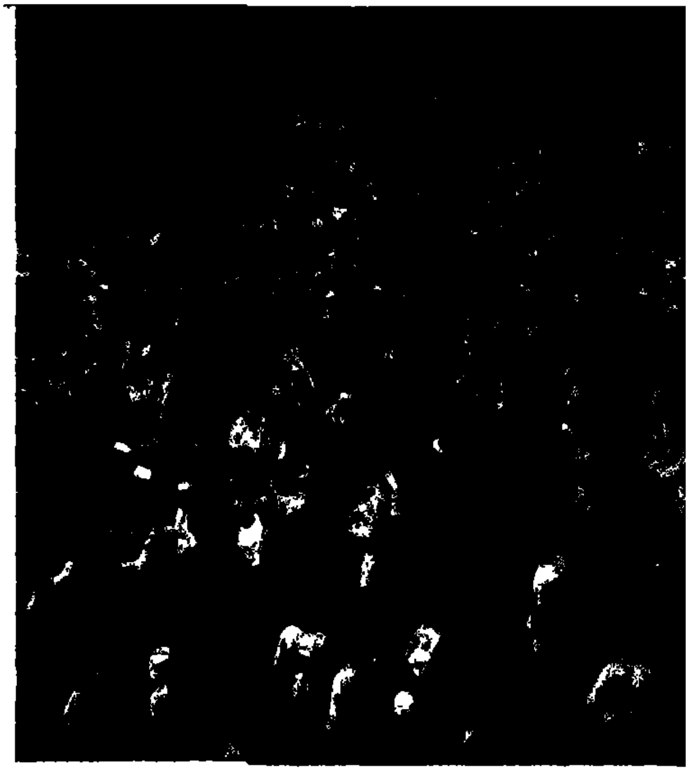
۲۶ اکتوبر کی صبح کو مسلم لیگ کے چار اراکین نے حلف وفادار
اٹھایا۔ انکی طرف سے نامزد کئے ہوئے پانچویں رکن مس
جوگندر ناتھ منڈل، جو اچھوت ذات کے نمائندے ہیں، اس وق
دہلی میں موجود نہیں تھے۔ اسلئے انہوں نے اپنے عہدے کا چار
تار کے ذریعہ لے لیا لیکن حلف وفاداری بعد میں اٹھایا۔



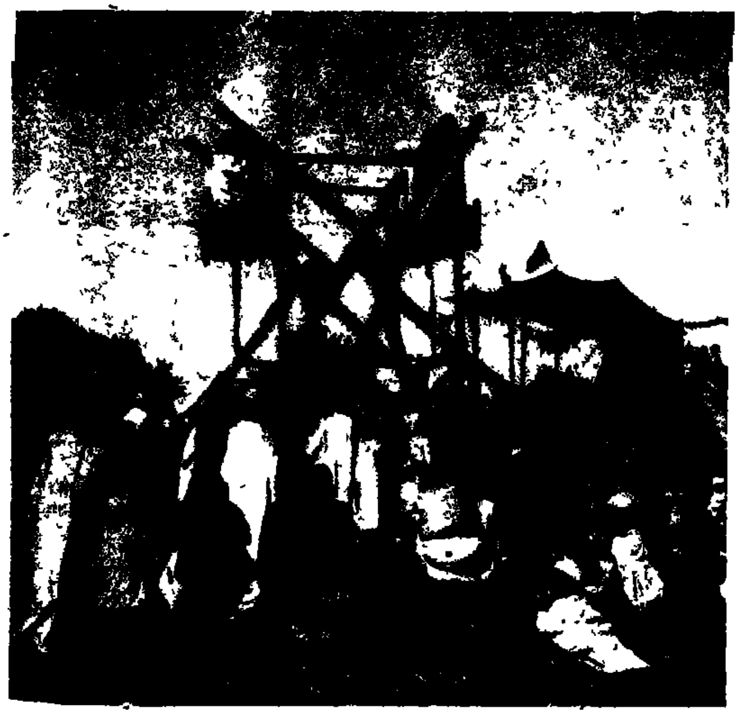
مسٹر جوگندر ناتھ منڈل

مصر کے میلے

مصر کے شہر طنطا میں جو نیل کے دہانے پر واقع ہے ' ہر سال سید احمد البدوی کے یوم پیدائش پر ایک عظیم الشان میلہ لگتا ہے۔ یہ مصری ولی اٹھارویں صدی میں مرافش کے شہر فاس میں پیدا ہوئے تھے۔ حج اور بیت اللہ کی زیارت کے بعد انکے زہد وتقوی کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اس میلے کا زور خاص طور پر آخری رات میں ہوتا ہے۔ جو عموماً جمعہ کی شب ہوتی ہے۔ جمعہ کے روز آخری جلوس نکلتا ہے جسکا تماشا دیکھنے کیلئے لوگ صبح ہی سے بازاروں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ جلوس میں ایسی بڑی بڑی گاڑیاں بھی شامل ہوتی ہیں جن پر مختلف جھنڈے اور کتبے لگے ہوتے ہیں۔ اس موقع پر تماشوں اور تفریحوں کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔



اس میلے کا جلوس سب سے زیادہ قابل ذکر ہوتا ہے۔ اس تصویر کے عین بیچ میں احمدا لبدوی کے جانشین نظر آرہے ہیں۔ یہ انہی کے حاادان کے رکن ہیں۔



میلے کے دوران میں اس ھنڈولے کی آواز ہر وقت سنائی دیتی ہے۔ بچے اس میں بیٹھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔



اس جلوس کا ایک اور منظر۔ اگلے حصے میں گاڑیاں دکھائی دے رہی ہیں



بلوچی (جنوبی ترکمانستان)



قرقز (قرقزستان)



بلقرالی (قفقاز)



تاجک (تاجکستان)

سویٹ ایشیا کے لوگ

ہندوستان میں سینکڑوں ملی جلی نسلوں کے لوگ آباد ہیں لیکن اسکی مغربی سرحد سے چند میل کے فاصلے پر ملک روس کے باشندے اور بھی زیادہ مخلوط النسل ہیں۔ اگرچہ کل آبادی کے اسی فیصدی لوگ روسی یا سلاوی ہیں، تاہم یونین میں پورے دوسو مختلف قومیتوں کے لوگ شامل ہیں۔ جو ڈیڑھ سو کے قریب زبانیں اور بولیاں بولتے ہیں۔



کالمک (شمالی قفقاز)



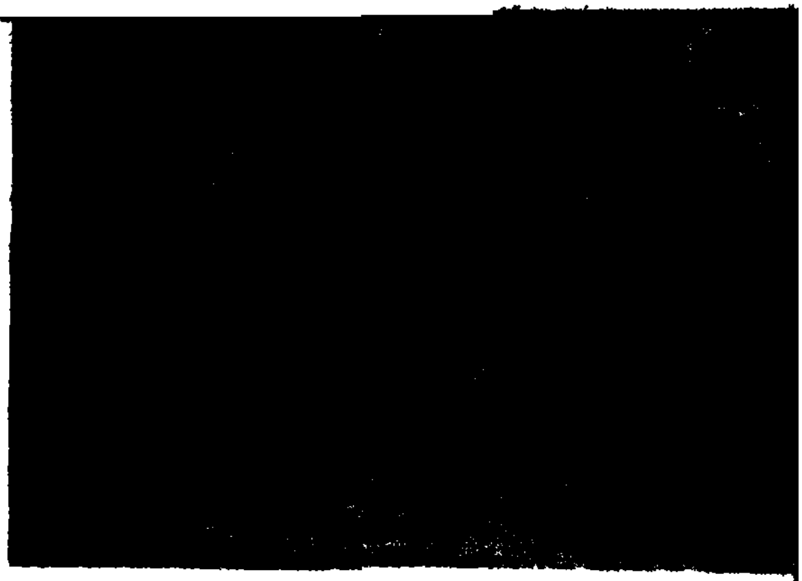
ازبک (ازبکستان)



قازق (قازقستان)



بریات منگول (سائبیریا)



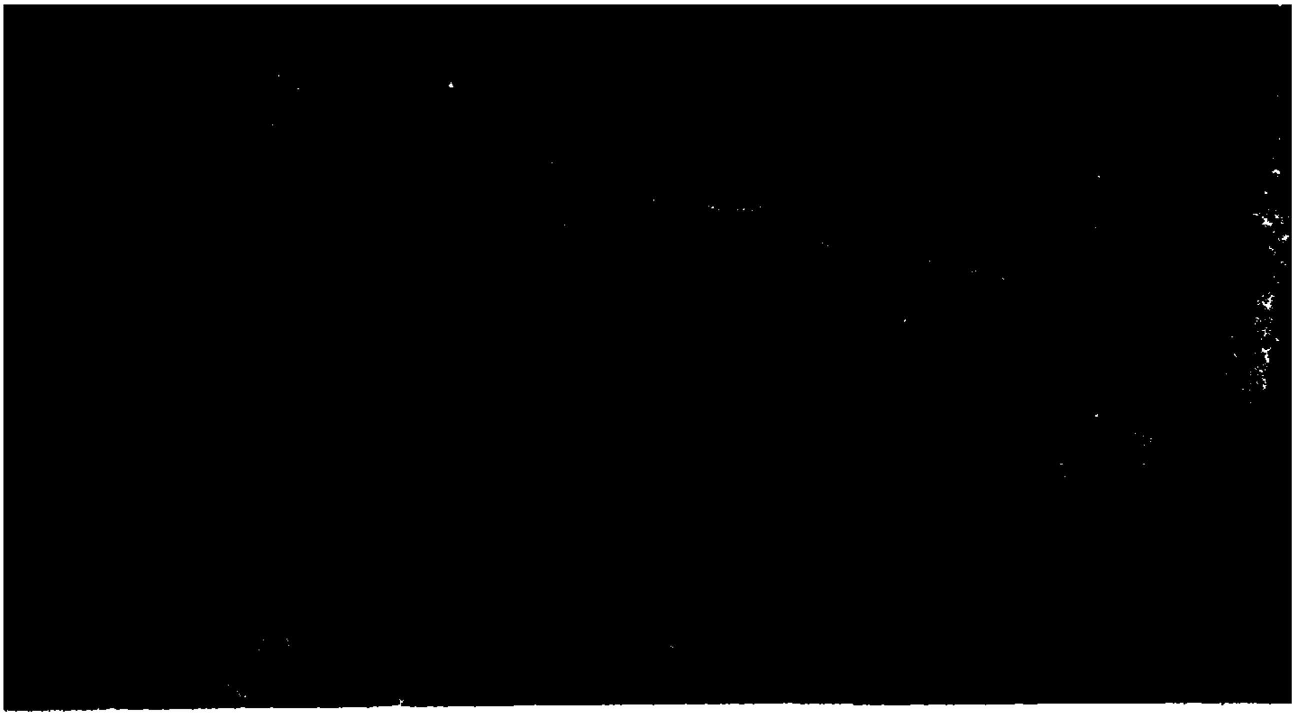
ہڑپا کا ایک اونچا ٹیلا۔ کھدائی سے پہلے مٹی کی اینٹوں کی ایک دیوار نے اسے بچا رکھا تھا۔

اہم ثبوت فراہم کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وادئی سندھ اور عراق کی قدیم تہذیبیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔ نئی تحقیقات میں زیادہ اہمیت دفن کرنے کی رسم کو دی جاسکتی ہے۔ یہ ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی چیز ہے۔ مردے کو لکڑی کے صندوق میں سرکنڈوں سے ڈھک کر رکھا جاتا تھا مردے کے قریب برتن وغیرہ رکھنے کا دستور تھا۔ تیسری صدی قبل مسیح کے عراق میں بھی یہ رسم رائج تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اینٹوں کی ۴۰ فٹ اونچی اور ۴۰ فٹ چوڑی دیوار بناکر شہر کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ اندازہ ہے کہ اس تہذیب کی داغ بیل ڈھائی ہزار قبل مسیح میں پڑی تھی۔ اور سیلاب کے ہاتھوں ڈیڑھ ہزار قبل مسیح میں اسکا خاتمہ ہوگیا۔

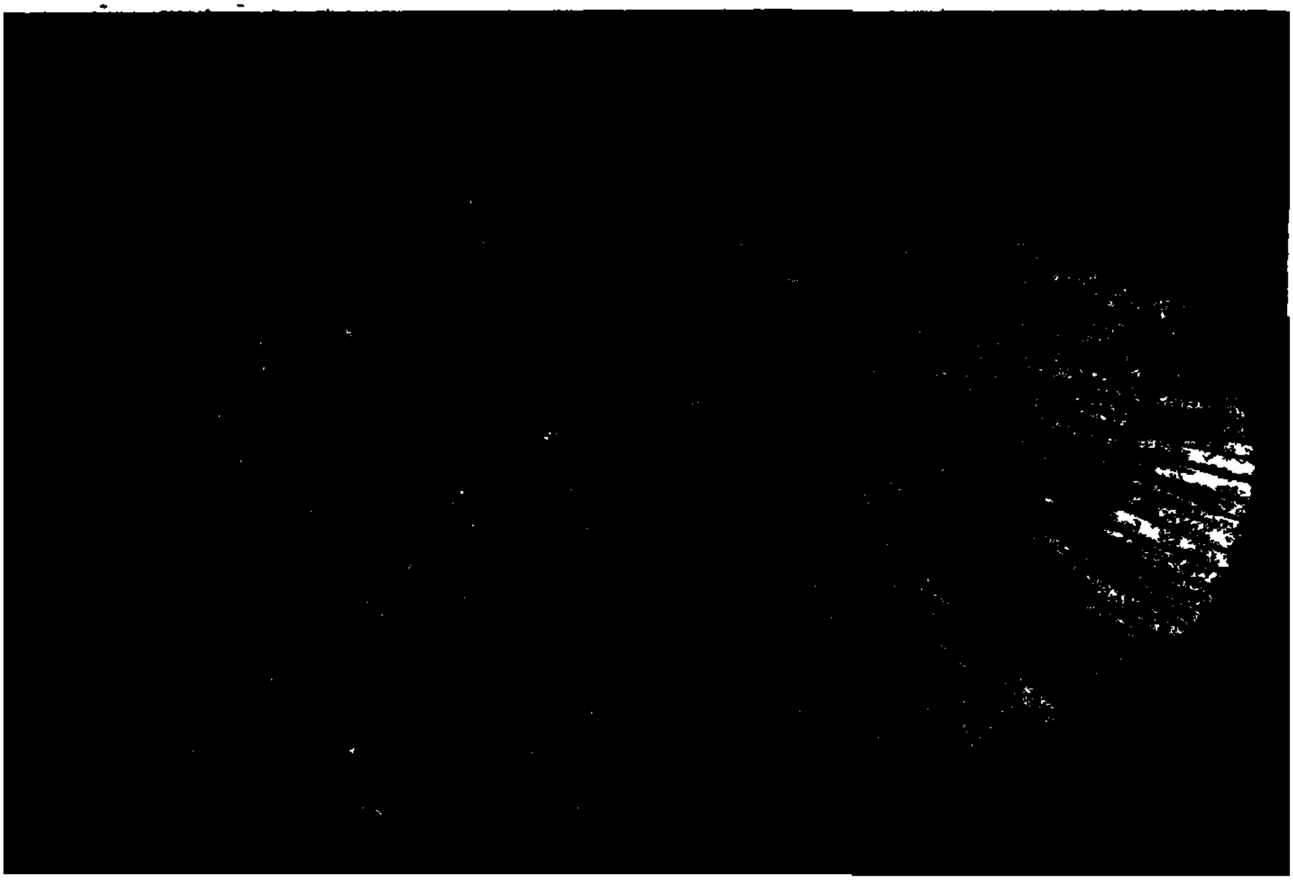
ہڑپا کے نئے انکشافات

ہڑپا میں دفن کرنے کا ایک اور نظارہ۔ ٹھلیاں وغیرہ غالباً روایتی عقیدے کے ماتحت رکھی گئی ہونگی۔





ڑپا کا قبرستان۔ چاروں طرف لگی ہوئی مٹی کی اینٹیں لاش کی حفاظت کرتی ہیں۔ (نیچے) اوکھلی کی وضع کا ایک پختہ گڑھ
جس میں اناج کٹتا تھا۔ چاروں طرف لگی ہوئی بہت سی اینٹیں کثرت استعمال سے گھس گئی ہیں۔





ں زنجبار کا عالیشان محل ـ اسکے قرب و جوار میں قحط کبھی ایسا واکا نہیں جمانا ۔

اعلیحضرت سلطان زنجبار

زنجبار

جزیرہ زنجبار افریقہ کے مشرقی ساحل سے چند میل کے اصلے پر واقع ہے۔ اسکا رقبہ ۶۴۰ مربع میل اور آبادی ۱۴۰۰۰۰ ہے ہرھائی نس سید سر خلیفہ بن حارث بن نوبنی لطان زنجبار کی حکومت آس پاس کے چھوٹے چھوٹے جزیروں ر بھی ہے وہ نہایت ملنسار' خوش خلق' عالم باعمل اور ترقی سند حکمراں ہیں۔ کسی زمانے میں یہ جگہ غلاموں کی تجارت ے لئے مشہور تھی لیکن اب لونگوں نے اسکی جگہ لے لی ہے۔

ہ کشتیاں کسی زمانے میں غلاموں کو زنجبار سے غیر ملکوں یں بکنے کیلئے لے جاتی تھیں۔ لیکن اب جزیرے کی سب سے بڑی پیداوار یعنی لونگیں لادکر لے جاتی ہیں۔



تنگ اور سانپ کی طرح بل کھانے والی گلیوں میں مکانات ایک دوسرے کے بالکل قریب بنائے جاتے ہیں۔



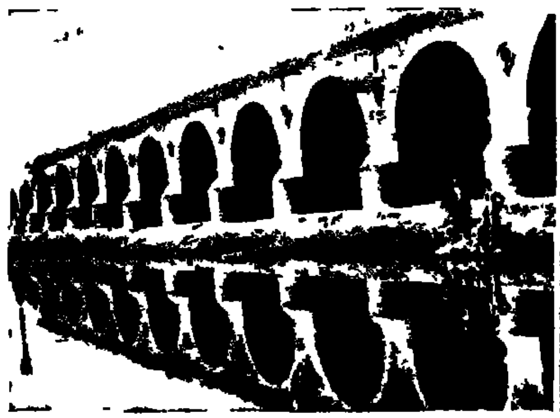


موصل

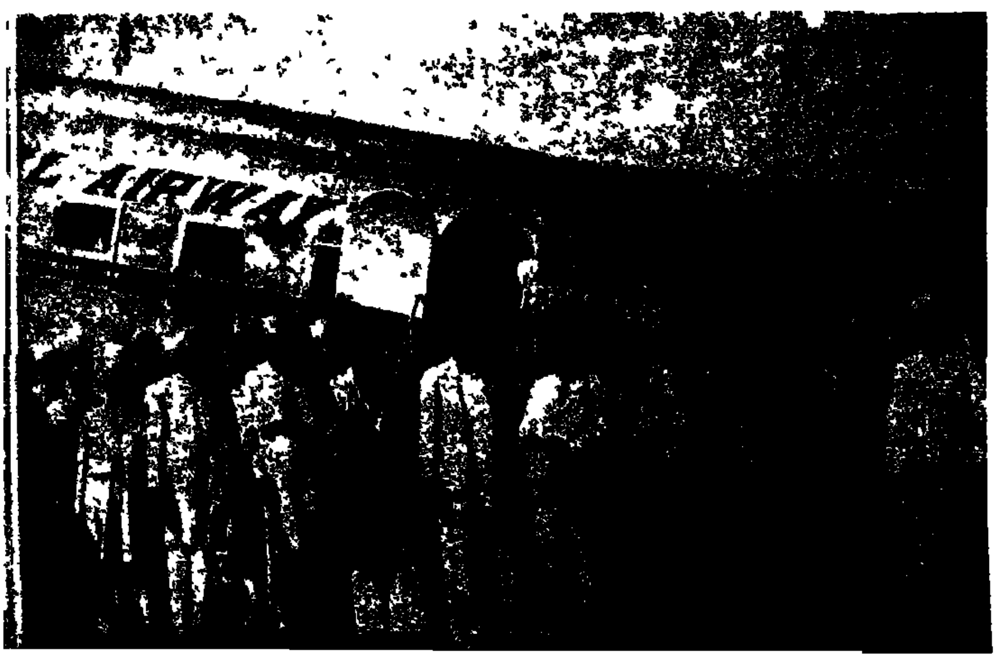
اق کا ایک
ہور شہر۔

موصل کا ایک
پرانا پل جو
اشک قائم
ہے۔ ↓

شہر موصل کا ایک عام نظارہ ۔

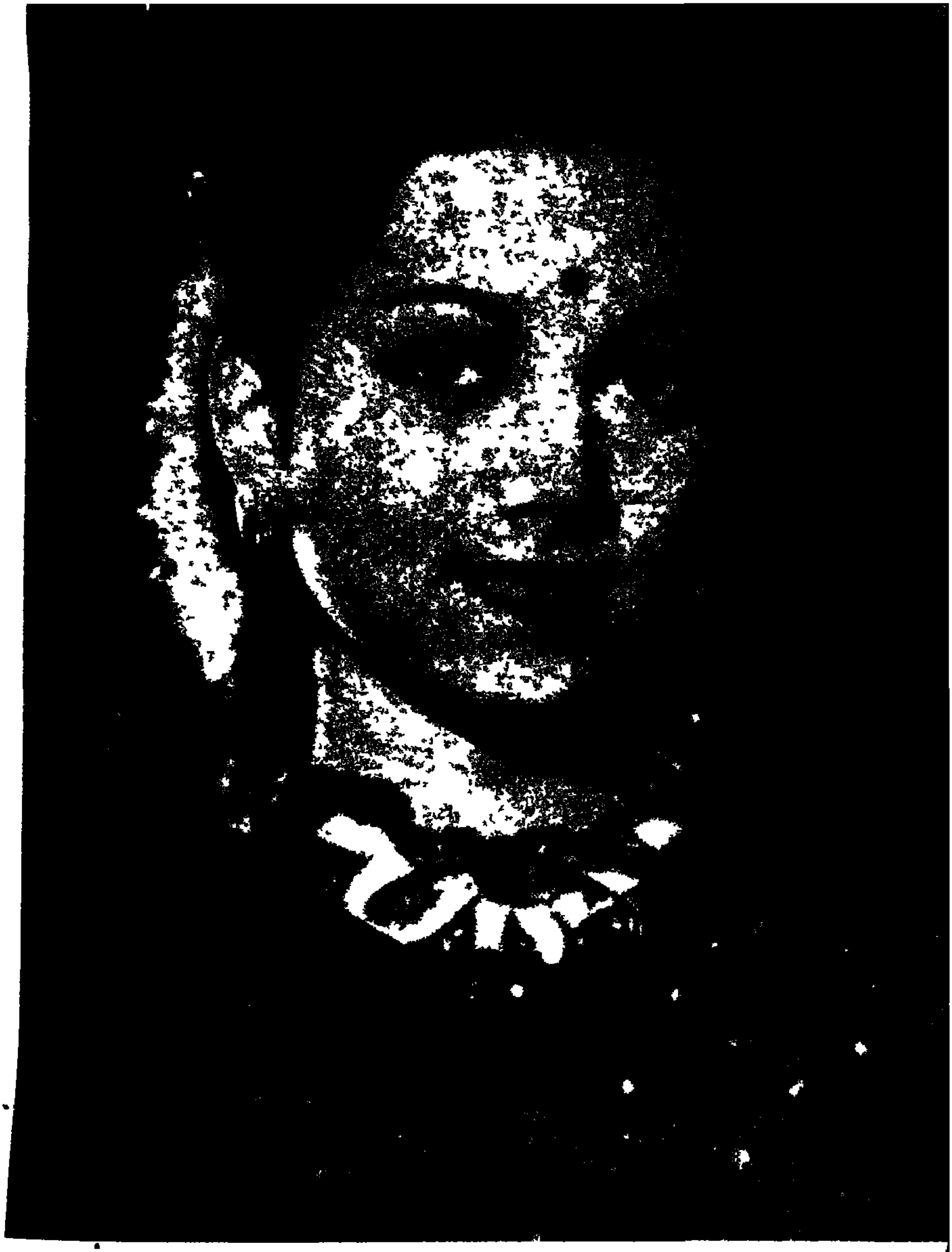


موصل عراق کا تیسرا اہم شہر ہے۔ یہ دریائے دجلہ کے کنارے ۔تاریخی شہر نینوا کے بالمقابل واقع ہے۔ باشندوں میں عربوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شامل ہیں۔ شمالی علاقہ ایک اہم تجارتی مرکز ہے۔ چمڑے اور دھات کی بنی ہوئی چیزوں کا تبادلہ غیر ملکی اشیا سے کیا جاتا ہے۔ جنوبی علاقہ پٹرول کی وجہ سے اہم اور مشہور ہے۔ آثار قدیمہ کے لحاظ سے بھی یہ مقام قابل دید ہے۔ تعمیرات و آرائش میں نئے پرانے دونوں رنگ ملے جلے نظر آتے ہیں۔



حاجیوں کا ہوائی جہاز

۱۲ اکتوبر کی صبح کو پہلا ہوائی جہاز حاجیوں کو لیکر نئی دہلی سے جدہ روانہ ہوا ان حاجیوں کی پیٹھ کے پیچھے ان کا جہاز روانگی کیلئے تیار کھڑا ہے۔



مس ثریا — ایک فلمی ستارہ۔

کیا معنی

عرش ملسیانی

جس غم سے دل کو راحت ہو اس غم کا مداوا کیا معنی
جب فطرت طوفانی ٹھہری ساحل کی تمنا کیا معنی

راحت میں رنج کی آمیزش عشرت میں الم کی آلائش
جب دنیا ایسی دنیا ہے پھر دنیا دنیا کیا معنی

خود شیخ و برہمن مجرم ہیں انجام سے دونوں بی نہ سکے
ساقی کی بخل پسندی پر ساقی کا شکوا کیا معنی

اخلاص و وفا کے سجدوں کی جس در پر داد نہیں ملتی
اے غیرتِ دل اے عزمِ خودی اس در پہ سجدا کیا معنی

اے صاحبِ نقد و نظر مانا انساں کا نظام نہیں اچھا
اس کی اصلاح کے پردے میں اللہ سے جھگڑا کیا معنی

جلووں کا تو یہ دستور نہیں پردوں سے کبھی باہر نہ آئیں
اے دیدۂ بے توفیق ترا یہ ذوقِ تماشا کیا معنی

مچلے نہ ہیں تو اے واعظ تلقین کے کچھ اسلوب بدل
اللہ کا بندہ بننے کو جنت کا سہارا کیا معنی

ہر لحظہ فزوں ہو جوشِ عمل تسلیم و رضا کی راہ پہ چل
تقدیر کا رونا کیا مطلب تدبیر کا شکوا کیا معنی

اظہارِ وفا لازم ہی سہی اے عرشؔ مگر فریادیں کیوں
وہ بات جو سب پر ظاہر ہے اس بات کا چرچا کیا معنی

سوگند

قمر فاروقی

نگار خانۂ فطرت کی آب و تاب مدام
سرور و کیف کی ہے ایک داستان تمام
رواں دواں ہے بدن میں شرابِ گلبوی
ادا ادا سے نمایاں جھلک قیامت کی
نگاہ، مد سے ہے بوجھل چمن چمن ہے عذار

وہ کیف و رنگِ شفق، وہ سپیدۂ سحری
وہ لشند چاند ستاروں کی وہ تحرّوں کی ہنی
سما گئی ہے رگ و پے میں تیرو پکار کر
ادائیں جوشِ جوانی کی کیف میں ڈوبی
قدم قدم پہ ہویدا شرارتوں کے شرار

فضا ہے رنگ سے لب ریز تیری آہٹ سے
کلی جو تجھ کو کہیں دیکھ لے کھِل جائے
بہارِ عیش کا پالا ہے انگ انگ ترا
محال ہے کہ مراد دل ترا بدل پائے

یہ سادگی ہے تری جس کا شور برپا ہے
ترا جمال ہے مشاطگی سے بے پروا
نہ جانے کتنے حسیں نقش دیکھتا ہوں میں
سیاہ رات میں کرتا ہوں جب دھیان ترا
یہ تیرے قامتِ رعنا کی دلکشی، محبوب
کشاں کشاں لئے جاتی ہے مجھ کو سوئے حرا

چاند کے بیچھ کی سوگند تجھ کو دیتا ہوں،
کہ تھوڑی رات گئی ہے ابھی نہ سو جانا

جھولے سے اُتر آنے کے بعد

(ایک چینی نظم)

باغ میں پھر بہار آئی ہے،
اور جھولے کی دو سنہری ریشمی رسیاں،
اونچی ہوتی ہوئی،
بیدکی ٹہنیوں اور شاخوں میں جا کر چھپی ہیں
سامنے کے مکاں سے نکل کر وہ لڑکی
جھولے میں ٹھہرتی ہے اور جھولتی ہے
بن کے پیار نے کتنا ہے ملبوسِ رنگیں
بار بار اُڑتی ہے آسماں کی طرف وہ
چاہتی ہے وہ شاید کہ جنت میں جا کر
کوئی تیتری بن کے اُڑنے لگے
تھوڑی دیر اُڑنے کے بعد وہ
چھوڑ دیتی ہے جھولا
اور سبزے پہ استادہ ہوتی ہے یوں
کر کے نیچی نگاہیں
جیسے جنت کی وہ حور ہو کوئی جس کو
وہاں سے نکالا گیا ہو
اور وہ شرم سے
اپنی نظریں جھکائے کھڑی ہو۔

(ہینگ چوخان) راجہ مہدی علی خاں

برطانیہ کا نظامِ تعلیم

ایس، بی، آرنگ

برطانوی مجلس قانون ساز کے اکثر موضوعات کی تاریخ بہت پرانی ہے اور یہ بات انگریزی نظامِ تعلیم پر بھی بالکل صادق آتی ہے کیونکہ قرونِ وسطیٰ اور عہدِ نشاۃ الثانیہ کے تعلیمی طریقوں پر اس نظام کی بنیادیں قائم ہیں۔ بعض انگریزی مدرسے جو اس وقت پوری شان دکھا رہے ہیں، اس زمانے کے راہبانہ مذہب نے قائم کئے تھے جب مغربی یورپ میں رومن کیتھولک کا مدِ مقابل کوئی نہیں تھا۔ کچھ مدرسے ان امیر مردوں اور عورتوں نے قائم کئے تھے جن کا عقیدہ تھا کہ فیاضی اور خیرات کا مناسب بدلہ آخرت میں ضرور مل جاتا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ مدرسے ایسے بھی تھے جو لندن کے تجارتی اداروں کی طرف سے قائم ہوئے تھے۔ عہدِ نشاۃ الثانیہ میں انگلستان پر ٹیوڈر خاندان کی حکومت تھی جس نے زبانِ دانی کے مدرسے قائم کرنے کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی تاکہ متوسط طبقوں کے بچوں کو یونانی اور لاطینی کی تعلیم دی جا سکے۔ ٹیوڈر خاندان کے لوگ متوسط طبقہ کے افراد کو اس لئے ابھارنے کے شائق تھے کہ وہ کسی طرح ان امراء کے ہم پلہ ہو جائیں جن کو سیاسی اقتدار حاصل تھا۔ غرض یہ کہ ۱۸۷۰ء تک انگلستان کے عام لوگوں کی تعلیم ان خاص طریقوں پر مبنی تھی۔

بعض مذہبی فرقوں کے لوگ قدرتی طور پر اس بات کے آرزومند تھے کہ ان کے معتقدین کے بچے صرف اس ماحول میں پرورش پائیں جسے وہ اپنے عقیدے کے مطابق صحیح اور سچا سمجھتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے ہم مسلک امیروں اور دولتمندوں کو ایسے مدرسے قائم کرنے کے لئے ابھارا جہاں غریب بچوں کی تعلیم کا انتظام ہو سکے۔

اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں ان مدرسوں کے پہلو بہ پہلو کچھ ایسے مدرسے بھی قائم ہوتے چلے گئے جو لوگوں نے ذاتی منفعت کے خیال سے قائم کئے اور اس میں شک نہیں کہ ان مدرسوں میں ایک خاص رقم کے عوض اچھی تعلیم مل جاتی تھی۔ مشہور ناول نویس چارلس ڈکنس نے اپنے ایک ناول میں ایک فرضی مدرسے کے نام سے ان اداروں کے نکمے پن اور وہاں کے ظلم و ستم پر اظہارِ خیال کیا ہے جو ذاتی منفعت کے لئے قائم کئے گئے تھے۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ اس قسم کے بعض مدرسوں میں استاد کم پڑھے لکھے تھے اور انھیں تنخواہیں بھی کم ملتی تھیں۔ نیز طلباء اتنی زبوں حالت میں زندگی بسر کرتے تھے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ سمجھ لینا بالکل غلط ہوگا کہ اٹھارویں اور انیسویں صدیوں کے سبھی پرائیویٹ مدرسے اس قسم کے تھے جس کا ذکر ڈکنس نے اپنے ناول میں کیا ہے۔ بہرحال اب ایسے مدرسے انگلستان میں نہیں ہیں درانحالیکہ کم سن بچوں کے بہت سے مدرسے ایسے ہیں جو کسی وقف کے بغیر قائم ہیں اور بالکل ذاتی مفاد کے اصول پر چل رہے ہیں۔ یہ مدرسے تیرہ سال کی عمر تک بچوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح مقصد پورا کرتے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ ثانوی جماعتوں کے مدارس میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس طرح یونیورسٹی تک ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

انیسویں صدی کے دوسرے چوتھائی حصے میں انگلستان کی آبادی بڑی سرعت کے ساتھ بڑھ رہی تھی اس لئے حکومت نے ملک بھر میں ذرائع تعلیم کو وسیع کرنے کے مسائل پر زیادہ سے زیادہ غور کرنا شروع کیا تاکہ ایک صنعتی ملک کی صحیح ضرورتوں کو اچھی طرح پورا کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں پہلا قدم ۱۸۳۳ء میں اٹھایا گیا جبکہ پریوی کونسل کی ایک کمیٹی تعلیمی نظم و نسق کے لئے بنا دی گئی۔ اس طرح سب سے پہلے ادارۂ تعلیم کی داغ بیل پڑی اور پھر موجودہ وزارتِ تعلیم کا قیام عمل میں آیا۔

تعلیم سے متعلق پریوی کونسل کی کمیٹی کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ تعلیم کو ترقی دینے اور اس سلسلے میں لوگوں کی ہمت بڑھانے کے لئے سرمایۂ عوام میں سے مدارس کو امدادی رقمیں عطا کرے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت حصولِ مقصد کے لئے ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔ ۱۸۳۹ء کے تھوڑے ہی عرصہ بعد پارلیمان نے لگاتار کئی قانون نافذ کئے جن کی رو سے بہت سے پرانے تعلیمی اوقاف کی نئے سرے سے تنظیم کی گئی۔ ان قوانین کی رو سے بعض قدیم ترین مدرسوں کے وقف نامے شروع سے آخر تک دوبارہ لکھے گئے اور بعض مدرسوں اور وظیفوں کو کسی پابندی کے بغیر ہر شخص کے لئے عام کر دیا۔

نتیجہ یہ کہ ۱۸۷۰ء میں تمام بچوں کے لئے جبریہ تعلیم کا قانون نافذ کرنا پارلیمان کے لئے ممکن ہو گیا۔ چنانچہ اس سال منظور ہونے والے اہم تعلیمی قانون نے ان تمام کم سن لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مدرسے میں جبریہ حاضری لازمی قرار دے دی جن کو کسی اور طریقے سے قابلِ اطمینان تعلیم و تربیت نہیں دی جا رہی تھی۔ اس زمانے کے تعلیمی نصب العین کی جھلک ۱۸۷۶ء کے ایک واحد قانون میں بھی دکھائی دیتی ہے جس کی رو سے تمام والدین پر پابندی عائد ہو گئی کہ وہ اپنے بچوں کو لازمی طور پر مناسب تعلیم و تربیت دلوائیں۔

اس میں شک نہیں کہ غریب لوگوں کے بچوں کی جبریہ تعلیم و تربیت کے لئے کوئی قانونی زبردستی نافذ کر دینا بالکل بے معنی اور ناقابلِ عمل ہے تاوقتیکہ وہ تعلیم مفت اور بلا معاوضہ نہ ہو۔ اسی لئے ۱۸۹۱ء میں ان تمام

قصبوں میں درسی ادارے قائم کر دئے گئے جہاں ابتدائی تعلیم کی مروجہ صورتیں اور امکانات ناقص یا ناکافی تھے۔ مذکورہ بالا قانون نے ان اداروں پر یہ فرض عائد کیا کہ وہ حسب ضرورت ابتدائی تعلیم کے مدارس قائم کیا کریں۔

ان درسی اداروں کی طرف سے قائم کئے ہوئے مدرسے "بورڈ کے مدرسے" کہلانے لگے اور اس طرح انگلستان میں اس نظام تعلیم کی داغ بیل پڑ گئی جو "دوعملی نظام" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک طرف غریب بچوں کی ابتدائی تعلیم کے ایسے نجی مدرسے قائم تھے جن کو خیراتی سرمائے سے چلایا جاتا تھا۔ ایسے مدرسوں کے نصاب میں مذہبی تعلیم کو خاص اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ دوسری طرف بورڈ کے مدرسے تھے۔ مذہبی تعلیم ان میں بھی یکساں تھی لیکن کسی خاص مسلک یا فرقے کے مخصوص نقطہ نظر کا پرچار قانوناً ممنوع تھا بلکہ وہاں عیسائیت کے عام ارکان ذہن نشین کرائے جاتے تھے۔ حکومت قومی سرمائے کی مد میں سے ان دونوں قسم کے مدرسوں کو مالی امداد دیتی تھی۔ لیکن وہ رقمیں اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھیں کہ مدرسوں کے تمام اخراجات کی پوری طرح کفالت کر سکیں اور اس کے علاوہ نجی مدرسوں کو مقامی فنڈ سے بھی کوئی رقم نہیں مل سکتی تھی۔ البتہ بورڈ کے مدرسوں کے لئے یہ دقتیں نہ تھیں کیونکہ قومی سرمائے کی مد سے ملی ہوئی امداد کے علاوہ تھوڑی بہت فیس بھی بچوں کے والدین سے وصول کر لی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ باقی خرچ مقامی ٹیکسوں کی رقم سے پورا کیا جاتا تھا۔

نجی مدارس کی دقتوں کو سنہ ۱۹۰۲ء کے تعلیمی قانون نے ایک حد تک کم کر دیا۔ اس وقت انگلستان بھر میں مقامی حکام کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا یعنی ایسی منتخبہ جماعتوں کا جن کے ذمے بہت سے مختلف کام ہوتے تھے اور جن کو ٹیکسوں کے ذریعہ مالیانے میں اضافہ کر لینے کا اختیار بھی حاصل ہوتا تھا۔ سنہ ۱۹۰۲ء کے قانون کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے ہر حصے میں ان منتخبہ جماعتوں کا ایک ایک رکن ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں مقامی طور پر مختار سمجھا جائے اور اس پر یہ فرض عائد ہو کہ وہ اپنے علاقے میں تعلیم عامہ کے ابتدائی مدرسوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی اور فروغ دے۔

نجی مدارس کے منتظمین جو اصل بانی کے دینی مقاصد کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے، سب سے زیادہ اس امر کے ذمہ دار ٹھیرائے جاتے کہ وہ مدرسے کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو قائم رکھیں۔ لیکن روزمرہ کے اخراجات جن میں استادوں کی فیس بھی شامل ہوتی تھی، تعلیم کے مقامی حکام کو برداشت کرنے پڑتے تھے۔ اس کے برعکس استادوں کی تقرری کا اختیار پھر بھی منتظمین ہی کو حاصل تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ سنہ ۱۹۰۲ء کے قانون نے مقامی حکام کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا خود انتظام کریں یا اس سلسلے میں امداد دیں۔

لیکن سنہ ۱۹۰۲ء کا قانون نافذ کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ان بڑی عمر کے بچوں کے لئے ثانوی تعلیم کے اچھے ذرائع پیدا کئے جائیں جو اپنی ابتدائی تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے ہوں۔ مقامی حکام نے اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں اپنے فرائض اس طرح پورے کئے کہ انھوں نے [illegible] کے ان قدیم مدرسوں کو مالی امداد دی جو اپنے افتتاح کے زمانے سے اس وقت تک بدستور لاطینی اور یونانی تعلیم دیتے چلے آئے تھے۔ اسی اثنا میں زیادہ وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے ثانوی مدارس کے نصاب تعلیم کو زیادہ وسیع کیا جانے لگا اور سائنسی موضوعات نے بھی اپنے قدم جمانے شروع کر دئے۔

تاہم بعض صورتوں میں مقامی حکام بالکل نئے ثانوی مدارس قائم کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ خصوصیت کے ساتھ مقامی حکام نے تعلیم نسواں کی ترقی کے لئے ایسی صورتیں پیدا کیں جن کی طرف اس وقت تک عملی طور پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ محض تدریجی طور پر ہم انیسویں صدی کے اس انوکھے خیال سے اپنا دامن بچا سکے ہیں کہ لڑکیوں کے لئے زیادہ تعلیم حاصل کر لینا خلاف نسائیت ہے۔

سنہ ۱۹۰۲ء کا قانون نافذ ہونے کے بعد سے تعلیم کے مقامی حکام جن عمدہ مفید کارروائیوں میں لگے رہے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایسے وظائف کا انتظام کیا جن کو حاصل کرنے کے بعد غریب طبقوں کے لڑکے اور لڑکیاں یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لئے داخل ہو سکیں۔

ان کے علاوہ سنہ ۱۹۴۴ء سے پہلے ہمارے نظام تعلیم میں کچھ اور ترقیاں بھی ہوئی ہیں جن کا ذکر مجھے اس مختصر سے مقالے میں کرنا ہے۔

اس صدی کے شروع میں مقامی حکام کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ان بچوں کی خوراک کا انتظام بھی کریں جو ابتدائی مدارس میں داخل ہوں۔ تقریباً اسی زمانے میں پارلیمان نے ان مقامی حکام پر یہ فرض بھی عائد کر دیا کہ وہ ان مدارس کے طلبا کی طبی دیکھ بھال اور علاج معالجے کا خیال رکھیں جو ان کے دائرۂ انتظام میں شامل ہوں۔ اور اب سنہ ۱۹۱۸ء میں جبریہ تعلیم کے ضمن میں عمر کی آخری حد چودہ سال مقرر کر دی گئی ہے۔ اور پھر چودہ سال سے زیادہ عمر کے بچوں کے لئے بھی یہ قاعدہ بنا دیا گیا کہ اگر وہ مدرسہ چھوڑ کر کسی اور کام میں لگ گئے ہوں تب بھی اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ کچھ دیر کے لئے تھوڑی بہت تعلیم ضرور حاصل کیا کریں۔

غرض یہ تھا وہ نظام تعلیم جس میں سنہ ۱۹۴۴ء کے قانون نے مناسب ترمیمات کیں۔ اس نظام تعلیم سے کسی قدر الگ ہٹ کر لیکن اس کی افادیت کو صحیح معنوں میں ملحوظ رکھتے ہوئے سوچا جائے تو ان مدرسوں کی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑے گا جو کچھ تو اپنے وقف کی آمدنی کی بدولت اور کچھ فیسوں کے ذریعے جمع ہو جانے والی رقم کے باعث اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکے۔ کچھ اور ایسے مدرسے بھی تھے جن کو وقف اور فیسوں کی آمدنی کے علاوہ بھی محکمۂ تعلیم سے براہ راست کچھ نہ کچھ مدد لینی پڑتی ہے۔

حیوان سے انسان تک

عبد المجید

آج سے لاکھوں برس بیشتر کا ذکر ہے کہ اس کرۂ ارض پر زندگی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ زمین اس قدر گرم تھی کہ اس پر کوئی جاندار زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ زمین سے حرارت کا انتشار ہوتا گیا اور اس کا درجہ حرارت کم ہو گیا جس سے کرۂ ارض کی سطح سرد ہو کر سکڑنے لگی۔ اس لئے اس میں جا بجا شگاف اور دراڑیں پڑ گئیں۔ کچھ مدت کے بعد ہوا کے بخارات نے بارش کی شکل اختیار کر کے ان گڑھوں اور نشیبی جگہوں کو پُر کر دیا۔ اب زمین اس قابل ہو گئی کہ اس پر زندگی کے وجود کا آغاز ہو سکے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ زندگی پانی کے اندر وجود میں آئی۔ ماہرین علم ارتقا کا خیال ہے کہ مادہ حیات بے جان مادہ میں کیمیائی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔

ابتدا میں جاندار صرف ایک خانہ (Cell) پر مشتمل تھے۔ ان کی شکل و شباہت بکٹیریا یا جراثیم کی طرح تھی۔ بعض ایک خانے والے جراثیم جن کی زندگی ہوا، پانی اور پانی میں حل شدہ نمکوں پر تھی اپنی ادنیٰ اور ابتدائی حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ اور ترقی یافتہ قسم کو معرض وجود میں لانے کا باعث ہوئے۔ پھر ان میں سبز مادہ یا (Chlorophyll) پیدا ہوا۔ یہی سبز مادہ ہے جس کی وجہ سے درختوں کے پتے ہرے رنگ کے دکھائی دیتے ہیں۔ مادہ حیات کے کیمیائی عمل سے یہ سبز مادہ ہوا کی کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی میں حل شدہ معدنی اشیاء سے پودوں کی غذا تیار کرتا ہے۔ اس قسم کے ادنیٰ جراثیم سے عالم نباتات وجود میں آیا۔ بعض ایک خانہ والے جراثیم کی قسم کے جاندار جن میں سبز مادہ پیدا نہ ہوا۔ اور جس کے بغیر وہ اپنی خوراک تیار کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے ان سبز مادہ نہ رکھنے والے جراثیم کی قسم کے جانداروں سے عالم حیوانات ظہور پذیر ہوا۔

مسلسل تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ مادہ حیات کے عناصر کی ترکیب کیچڑ میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ عالم حیوانی میں سب سے پہلی ابتدائی اور سادہ ترین مخلوق جس کو امیبا (Amoeba) کہا جاتا ہے جوہڑوں کے کیچڑ یا ساکن پانی کے ذخیروں کی تہوں میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں نشو و نما پاتا ہے۔ ابتداً اس امیبا یا اسی قسم کے بعض دوسرے جاندار اپنی حالت پر قائم رہے۔ رفتہ رفتہ بعض اپنے ماحول کی تبدیلیوں کے باعث بدلنے لگے۔ پس ان کے اندر کئی قسم کے جسمانی تغیرات رونما ہو گئے۔ چنانچہ طویل مدت کے بعد ایک خانہ والے جانداروں سے ایسی مخلوق معرض وجود میں آئی جن کا جسم متعدد خانوں سے بنا ہوا تھا۔ امیبا کو اگر "یک خانہ" جاندار کہا جائے تو یہ "کثیر خانہ" جاندار تھے۔ کثیر خانہ جاندار ایک دوسرے کے ساتھ مل کر جماعتیں بنا کر رہنے لگے تاکہ بیرونی خطرات سے محفوظ رہیں اور زیادہ آسانی سے ترقی کے مراحل طے کر سکیں۔

یہ ابتدائی زندگی سالہا سال نئے نئے تغیرات اور نئی نئی تبدیلیوں کی منزلیں طے کرتی رہی۔ اس میں طرح طرح کی رنگینیاں اور گوناگوں قسمیں پیدا ہو گئیں۔ یک خانہ والے امیبا سے بہت سے خانہ والے جاندار، حلقہ دار کیچوے، اسفنج، مونگے، کیڑے مکوڑے، پھر ریڑھ کی ہڈی والے اور اعلیٰ حیوانات پیدا ہوئے اور اپنے اپنے مخصوص ماحول میں زندگی گزارنے لگے۔ ماہرین علم حیات نے یہ متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ امیبا ہی مختلف مدارج ارتقاء طے کرتا ہوا، انسان کی ساخت اختیار کر لیتا ہے گویا پیچیدہ ترین ساخت کا جاندار "انسان" سادہ ترین جاندار "امیبا" کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

غور کیا جائے تو سب جانور اپنی اندرونی ساخت کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہیں:—

۱۔ صلبی یا ریڑھ کی ہڈی والے جانور
۲۔ غیر صلبی یا ریڑھ کی ہڈی کے بغیر جانور

"صلبی" وہ جانور ہیں جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی ہے جو پسلیوں کے ڈھانچہ کا مرکزی سہارا اور مجموعہ ہوتی ہے۔

"غیر صلبی" وہ جانور ہیں جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کا ڈھانچہ نہ ہو۔

علم حیاتیات کے سرسری مطالعہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ وہ جاندار جن کے جسم ریڑھ کی ہڈی اور ڈھانچہ کے بغیر ہیں اور جنہوں نے صفحۂ ہستی پر ابتدائی ایام میں فروغ پایا نہایت ہی حقیر اور بے وقعت تھے۔ ان میں سے اکثر تو مٹ گئے کیونکہ وہ نئے ماحول کے مطابق اپنی زندگی کو نہ ڈھال سکے۔ کچھ ایسے سخت جان اور ضدی مزاج بھی ہیں جو اب تک اپنی ابتدائی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ بعض نے اپنی شکل اور ساخت بدل لی تاکہ وہ نئے ماحول میں زندہ رہ سکیں۔

ان جانوروں میں سے بتدریج ریڑھ کی ہڈی والے جانور پیدا ہوئے۔ یہ اپنی بناوٹ اور قوائے جسمانی کے لحاظ سے غیر صلبی جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ریڑھ ان کی ترقی کی ایک نمایاں اور مستقل نشانی ہے۔ پس اسی ایک اعتبار سے ترقی یافتہ حیوانات کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ صرف پانی کے اندر رہنے والے جانور مثلاً مچھلیاں۔
۲۔ خشکی پر اور پانی کے اندر رہنے والے جانور یا جل تھلیے مثلاً مینڈک۔
۳۔ خشکی پر رینگنے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانور مثلاً چھپکلیاں، سانپ۔

۴۔ ہوا میں اڑنے والے جانور یا پرندے مثلاً کوا، فاختہ۔
۵۔ دودھ پلانے والے جانور یا شیر خوار مثلاً گائے، بندر، انسان۔

ریڑھ کی ہڈی والے یا صلبی جانوروں میں سب سے پہلے مچھلی ظہور میں آئی۔ یہ جانور صرف پانی کے اندر ہی رہے اور یہاں ہی سے زندگی بسر کرنے کا سامان پیدا کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ ایک زمانہ ایسا آیا کہ خشکی (زمین) پر نباتات کی بہتات ہونے لگی تو بعض مچھلیاں پانی سے نکل کر کنارے پر آگئیں۔ جب زمین سے ان کا تعلق ہوا تو ان کے اعضا میں تغیر و تبدل ہونے لگا اور وہ جانور عالم ظہور میں آئے جو خشکی اور پانی دونوں میں رہتے ہیں اور جن کو ہم جل تھلیے کہتے ہیں۔ مینڈک ان کی واضح مثال ہے۔

جل تھلے جانوروں کے بعد رینگنے والے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانوروں کا وجود ہوا۔ ان جانوروں کے ہاتھ اور پاؤں اس قدر کمزور اور مختصر ہوتے ہیں کہ ان کی رفتار سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیٹ کے بل رینگ رہے ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے۔ مثلاً سانپ اور وہ حقیقتاً اپنے پیٹ پر رینگ کر چلتے پھرتے ہیں۔

اب عالم حیوانی کے ارتقائی دور میں ایک طویل مدت ایسی آتی ہے جب کہ رینگنے والے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانور بکثرت ظہور پذیر ہوئے۔ یہ حیوانات دیکھنے میں بیحد خوفناک، جسمانی لحاظ سے لحیم و شحیم اور عادات کے مطابق بڑے ہی خونخوار اور جنگجو تھے۔ اکثر دریاؤں کے قرب و جوار میں اُگی ہوئی سبزی چٹ کر جاتے یا سمندروں کے ساحلوں پر خشکی کی گھات میں پڑے لیٹے رہتے۔ (Brontosaurus) اس وقت کے رینگنے والے حیوانات کا سردار تھا اور اپنے جسم کی لمبائی کے لحاظ سے جو ستر فٹ سے زیادہ تھی آج تک سب سے طویل قامت حیوان مانا گیا ہے۔ اس کے پتھرائے ہوئے ڈھانچے (Fossil) کو دیکھ کر عقل مبہوت رہ جاتی ہے یہ حیوان اور اس کے بھائی بند اس قدر عظیم الجثہ تھے کہ موجودہ زمانہ کا سب سے زیادہ جسیم حیوان ہاتھی بھی ان کے سامنے ایک چڑیا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ظلم و استبداد کی بے پناہ قوت کے باعث انہوں نے زمین پر ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ اد نٰی، چھوٹے، اور عاجز جانور ہراسان اور پریشان ہو کر رہ گئے۔ مگر قدرت کا قانون زور اور زبردستی پر مبنی نہیں۔ یہ عظیم الشان جانور اپنی ناقابل برداشت جسامت کے باعث تنازع للبقا میں کامیاب نہ ہوسکے اور اس لئے معدوم ہو گئے۔ ان کے مقابل میں وہی کمزور و ناتوان رینگنے والے جانور مثلاً کچھوے، گرگٹ اور ننھی ننھی چھپکلیاں جنہوں نے زمانہ کے ساتھ مطابقت کی آج بھی روئے زمین پر آرام و عیش کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

زمین اپنے ارتقائی دور میں اس وقت گرم اور مرطوب تھی۔ رینگنے والے جانوروں نے اپنے ماحول میں تغیرات پائے تو ان میں بھی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ وہ عظیم الجثہ چھپکلیاں بھی (Trinosaurus) جو اب تک زمین پر اپنی حکمرانی کا سکہ جمائے بیٹھی تھیں آہستہ آہستہ مفقود ہونے لگیں۔ مگر چھپکلیوں کی وہ اقسام جن کی جسامت موزوں اور متناسب تھی زندہ بچ رہیں۔ انہوں نے گڑھوں اور بلوں میں چھپ کر گذارنے کا طریق اختیار کیا۔ ان میں سے بعض کے پر نکلنے لگے۔ چونکہ ان کے جسم ہلکے پھلکے اور کم وزن واقع ہوئے تھے اس لئے ان میں طاقت پرواز جلد آنے لگی۔ ابتدائی پرندوں کی جسمانی ساخت میں رینگنے والے جانوروں کی بہت سی خصوصیتیں موجود تھیں۔ چونچ ندارد، دُم گرگٹ کی طرح، انگلیاں ناخن دار، چمگادڑ کی طرح کا جھلی دار آلۂ پرواز اور جبڑوں میں بڑے بڑے نوکیلے دانت تھے۔ اس قسم کے جانوروں نے ترقی کی اور وہ پرندے کہلائے۔

زمین پر کشمکش حیات پوری سرگرمی سے کارفرما تھی۔ اس عہد میں نباتات کی نوعیت عہد حاضر کی نباتات سے بہت قریب ہوگئی۔ پانی کم ہو گیا، خشکی کا رقبہ بڑھ گیا۔ رطوبت پسند نباتات (Moisture-Loving Flora) ناپید ہونے لگی۔ اس کی جگہ میلوں تک پھیلی ہوئی ہری بھری چراگاہیں منظر عام پر آگئیں۔ ان ہی سرسبز وادیوں اور میدانوں میں چھپکلیوں، کیڑے مکوڑوں اور پرندوں کی بستیاں آباد ہوگئیں۔ ماحول کی تبدیلیوں نے بعض رینگنے والے جانوروں میں حیرت انگیز تغیرات پیدا کر دیئے۔ اب ان کی ساخت ایسے حیوانات میں منتقل ہونے لگی جو انڈوں کی بجائے بچے جنتے تھے اور انہیں اپنی چھاتیوں سے دودھ پلاتے تھے۔ یہ حیوانات دودھ پلانے والے یا شیر خوار جانور کہلاتے تھے۔ دودھ پلانے والے جانور عالم حیوانی کے سرتاج ہیں۔ یہ حیوانات اپنی جسمانی، دماغی اور قوتی کی خوبیوں میں سب سے اعلیٰ ہیں۔ ویل مچھلی، کنگرو، دریائی گھوڑا، سم دار، جگالی کرنے والے چوپائے، گوشت خور درندے، کرم خور خارپشت، چمگادڑ، گینڈے اور بندر نما حیوانات مثلاً لنگور، گبن، اورنگ اوٹان اور چمپانزی ان ترقی یافتہ حیوانات میں شامل ہیں۔

ان ہی دودھ پلانے والے جانوروں نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے انسانی شکل اختیار کرلی۔ عرصہ دراز تک انسان غیر متمدن رہا۔ اس کی زندگی ان وحشی جانوروں سے کچھ بہتر نہ تھی جن کا یہ شکار کیا کرتا۔ لاکھوں برس تک وہ وحشی جانوروں کی غاروں میں زندگی بسر کرتا رہا۔ ان ہی کی طرح لڑتا، جھگڑتا اور چیختا چلاتا پھرتا رہا۔ غالباً آج سے ایک لاکھ سال قبل انسان میں گفتگو کی قوت پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں نہ صرف منصوبے بنانے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

یونیسکو اور اس کے کام

جولین ہکسلے

یونیسکو (UNESCO) یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشنل سائنٹفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن کا مخفف ہے۔ ایک بین الاقوامی ادارے جو چند خاص مقاصد کے لئے بنایا گیا ہے۔ اسی قسم کے چند بین الاقوامی ادارے اور بھی ہیں مثلاً ایف۔ اے۔ او یعنی فوڈ اینڈ ایگری کلچرل آرگنائزیشن اور آئی۔ ایل۔ او یعنی انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن یا وہ ہیلتھ آرگنائزیشن جو ابھی حال میں بنا ہے اور پروویژنل انٹرنیشنل سول ایوی ایشن آرگنائزیشن۔ ان میں سے ہر ایک ادارہ کا اپنا الگ الگ مقصد ہے۔

دماغی کاموں میں بین الاقوامی شرکت کی ابتدا پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں لیگ آف نیشنز کے ماتحت پیرس میں "انسٹی ٹیوٹ آف انٹلیکچوئل کوآپریشن" قائم ہوا لیکن یہ انسٹی ٹیوٹ آج کے "یونیسکو" سے بہت مختلف تھا۔ اس زمانہ میں انسٹی ٹیوٹ کے پاس روپیہ بہت ہی کم تھا۔ اسے تعلیم کے مسائل سے کوئی واسطہ نہ تھا کیونکہ اس وقت عام خیال یہ تھا کہ تعلیم ہر ملک کا خاص اندرونی معاملہ ہے جس میں دوسرے ملکوں کو دخل نہیں دینا چاہیے اسی طرح انسٹی ٹیوٹ کو ریڈیو جیسی چیز سے جو ساری دنیا میں گھر گھر موجود ہے کوئی تعلق نہ تھا۔ اب آج کے "یونیسکو" کو دیکھئے۔ اس کا پندرہ سال کا بجٹ تقریباً ساڑھے سات ملین ڈالر ہے۔ لفظ ایجوکیشنل یعنی لفظ تعلیم خود ادارے کے نام میں شامل ہے۔ لاسلکی کے متعلق ادارے کے دستور میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ یہ آلہ اور اسی قسم کی تمام وہ چیزیں جن سے ہم اپنے خیالات عوام تک پہنچا سکتے ہیں مثلاً پریس اور فلمیں قوموں کے درمیان آپس کا اتفاق اور سمجھ پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جائیں گی۔

"یونیسکو" کے دستور میں اس ادارے کے جیسے مختلف اغراض اور مقاصد بیان کئے گئے ہیں ویسے شاید ہی کبھی کسی بین الاقوامی معاہدے میں بیان کئے گئے ہوں۔ اس دستور کا پیش لفظ منشور اٹلی کے ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے کہ "چونکہ لڑائی کا تخیل انسانوں کے دماغوں میں پرورش پاتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ امن کے تحفظ کے لئے جو قلعے بنائے جائیں وہ بھی انسانوں کے دماغوں ہی میں ہیں۔" آگے چل کر دستور میں جتایا گیا ہے کہ تمام قوموں کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ انسانیت کے رتبہ کو پہچانیں، انسانوں میں تہذیب پھیلائیں اور ان کو انصاف، آزادی اور امن کی تعلیم دینا ...... وہ امن جس کی بنیاد حکومتوں نے اپنی سیاسی اور معاشی مصلحتوں پر رکھی ہو دنیا کی قوموں میں مقبول نہیں ہو سکتا اور نہ اسے پائیداری حاصل ہو سکتی ہے۔ صرف وہی امن دنیا میں قائم رہ سکتا ہے جس کی بنیاد نوع انسان کے ذہنی اور اخلاقی اتحاد پر ہو۔"

اس دستور میں شامل ہونے والی تمام ریاستوں نے اس عقیدے کو ماننے کا اقرار کیا ہے کہ "تعلیم کے لئے سب کو پورے پورے اور برابر کے موقعے حاصل ہونے چاہئیں، سچائی جہاں بھی ہو تلاش کی جائے اور دنیا کی قومیں آپس میں ایک دوسرے کے خیالات اور علم سے بے روک ٹوک فائدہ اٹھائیں۔"

ابھی حال میں کوپن ہیگن میں سر جان اور نے کہا کہ ایف۔ اے۔ او کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے نئے ورلڈ فوڈ بورڈ کے ذریعہ ساری دنیا میں بھوک اور افلاس کا مقابلہ کرے، ہم "یونیسکو" کے کام کو بھی مختصر لفظوں میں ذرا سی ترمیم کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں کہ یہ دنیا میں روحانی بھوک اور ذہنی افلاس کا مقابلہ کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے اپنی چند مہینوں کی زندگی میں متعدد عملی تجاویز پر کام شروع کر دیا ہے۔ مثلاً "انرا" (UNRRA) کو اختیار نہ تھا کہ وہ تعلیمی، تہذیبی اور سائنٹفک میدان میں کچھ کام کر سکے اس لئے اب ہم ان مقاصد کے لئے روپیہ فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور جنگ نے جن ملکوں کو اجاڑ دیا ہے ان میں اس قسم کی تنظیم شروع کر رہے ہیں۔ ہماری یہ تنظیم یورپ میں بھی ہوگی اور مشرق بعید میں بھی۔

اپنے اس کام کے سلسلہ میں ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ دنیا کے بعض ملکوں کو تو ہر قسم کے سائنٹفک آلات میسر ہیں اور بعض کو بالکل میسر نہیں۔ اس کمی کی وجہ سے تعلیم کو خاص نقصان پہنچ رہا ہے اس لئے ہم ایسی سفارشات تیار کر رہے ہیں جن سے یہ خرابی دور ہو سکے۔

ہمارا دوسرا کام ان پڑھ لوگوں کو تعلیم دینا ہے، ایک ایسی دنیا میں جہاں کے بسنے والوں میں آدھے سے زیادہ لوگ ان پڑھ ہوں۔ یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ "یونیسکو" کو اپنے مقاصد میں پوری کامیابی حاصل ہو سکے گی، اسی لئے ہم تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ

ہوتے ہیں۔ ہم نے مختلف ملکوں مثلاً میکسیکو، چین، روس، ترکی اور برطانوی، فرانسیسی اور دوسری نوآبادیات کے ان مختلف طریقوں کا جائزہ لیا ہے جو ان ملکوں نے اپنے یہاں سے جہالت دور کرنے کیلئے اختیار کئے ہیں ہر قوم کا اپنا جدا طریقہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ تمام قوموں کو ایک دوسرے کے طریقہ میں کوئی نہ کوئی مفید بات ضرور ملیگی۔

یونیسکو نے اس طرف بھی قدم اٹھایا ہے کہ کاپی رائیٹ یعنی حق تصنیف و تالیف کے متعلق ایک نیا قانون تیار کرے اور اس قانون کی تیاری کے لئے ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ کاپی رائٹ کا مسئلہ نہایت اہم ہے اور اس اہمیت کی دو وجوہ ہیں، اول یہ کہ دنیا کی دو سب سے بڑی طاقتوں یعنی امریکہ اور روس میں سے کسی ایک نے بھی کاپی رائیٹ کے متعلق برن کنونشن کی پیروی نہ کی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ریڈیو میں فلموں میں اور آرٹ کے تمام کاموں میں کاپی رائیٹ کی حیثیت نہایت مبہم اور لغو ہے۔

ہم درسی کتابوں کا مطالعہ بھی شروع کر رہے ہیں: تاریخ، جغرافیہ اور عمرانیات کی کتابوں پر ہم خاص کر نظر ڈالیں گے، پھر ہم یہ سوچیں گے کہ بین الاقوامی نفرت اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے ہم ان درسی کتابوں میں کیا کیا تبدیلیاں کریں۔

یورپ میں تعلیمی براڈکاسٹ کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ہم ایک کانفرنس منعقد کرنے والے ہیں۔ ہم اس مسئلہ پر بھی غور کرنا چاہتے ہیں کہ عام تعلیم میں آرٹ سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے — آرٹ سے فائدہ اٹھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم پیشہ ور آرٹسٹ یا گویّے تیار کریں گے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ آرٹ کی مدد سے ہم بچہ کی شخصیت اور اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ترقی دیں گے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ زبان ان بڑی رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ ہے جس کی وجہ سے دنیا کے ایک ملک کے بسنے والے دوسرے ملک والوں کے خیالات سمجھنے سے مجبور رہتے ہیں۔ اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ کتابوں کے ترجمے فراہم کرنے کا ہم کوئی معقول انتظام کریں، اس کے لئے ہم نے دو تدبیریں سوچی ہیں ایک تو یہ کہ ان تمام نئی اور پرانی کتابوں کی فہرستیں تیار کر دی جائیں جن کے ترجمے ضروری ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کے ترجمہ کرنے والوں کی ایک ایسی جماعت مقرر کر دی جائے جو مختلف زبانوں میں ان کتابوں کے ترجمے کر سکے۔

اصل میں یونیسکو قائم کرنے کا خیال اس تعلیمی کانفرنس میں پیدا ہوا جس کے اجلاس جنگ کے پرآشوب زمانہ بھر لندن میں ہوتے رہے اور جس میں اتحادیوں کے تعلیمی وزیر شریک ہوتے تھے۔ ان سب نے مختلف تجاویز تیار کیں جو ۱۹۴۵ء کی گرمیوں میں سین فرانسسکو، کے مقام پر اپنی آخری شکل میں مرتب کر لی گئیں۔ اسی جگہ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ایک ایسا یونائیٹڈ نیشنز آرگنائیزیشن قائم کیا جائے جو تعلیم اور تہذیب کے معاملات کو طے کرے اور جس کا صدر مقام پیرس ہو۔ اس کے بعد گذشتہ نومبر میں لندن میں ایک بڑی کانفرنس کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ اس قائم ہونے والے ادارہ کا خاکہ تیار کیا جائے اور اس کے لئے دستور بنایا جائے۔ اس کانفرنس میں جہاں اور بہت سی باتیں طے ہوئیں وہاں ایک یہ بھی تھی کہ اس کے نام میں حرف "ایس" اور بڑھا دیا گیا جو سائنٹفک کا مخفف ہے۔ اس کانفرنس نے ایک ابتدائی کمیشن بھی مقرر کر دیا۔ تمام کاموں کا مفصل پروگرام تیار کرے گا اور ایک عارضی بجٹ تیار کر کے "یونیسکو" ایس سی او کی پہلی کانفرنس میں پیش کرے گا۔ یہ کانفرنس اس سال نومبر میں پیرس میں منعقد ہوگی، ایک انگریز ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ "یونیسکو" نے لندن میں جنم لیا اس لندن میں جو لڑائی کے کل زمانہ بھر دنیا کا تہذیبی مرکز بنا رہا حالانکہ ہم نے اس کے لئے کبھی کوئی کوشش نہیں کی بعض اوقات تو ہمیں اس کا پتہ بھی

غزل

کرامت فاطمہ بیگم

دیتا ہے سرِ محفل کیوں جان کا نذرانہ
کیوں شمع کو کرتا ہے بدنام یہ پروانہ

کم بخت کے ہاتھوں سے دشوار ہے جینا
تعزیر کے قابل ہے میرا دل دیوانہ

یہ جام ہی بس پی کر توبہ مجھے کرنی ہے
قربان ترے ساقی بھر دے مرا پیمانہ

اپنوں میں جو اپنایت باقی نہیں کچھ بھی
یکساں ہی ہیں دونوں اپنا ہو کہ بیگانہ

کیا کیجئے گا سنکر کچھ لطف نہ آئے گا
درد و غم و حسرت سے پُر ہے مرا افسانہ

آزاد تعیّن سے ہو جائیں اگر نظریں
ہر جگہ وہ ملتا ہے کعبہ ہو کہ بت خانہ

کیا ہوں میں حقیقت میں معلوم نہیں بیگم
دیوانہ سمجھ لیجئے یا جانئے فرزانہ

نہیں ہوا کہ لندن کی یہ مرکزیت کس طرح بڑھ گئی۔ لندن کا باشندہ ہونے کے ساتھ میں دنیا کا باشندہ بھی ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ یونیسکو کا اجلاس پیرس کے شہر میں جا رہا ہے جو دنیا کے ان شہروں میں ہے جہاں علم، ادب اور سائنس ہمیشہ پھلے پھولے ہیں۔

ابتدائی کمیشن کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ اس ادارہ کا ایک مفصل پروگرام تیار کر کے نومبر میں کانفرنس کی منظوری کے لئے پیش کرے۔ کمیشن کی یہ رپورٹ تقریباً ستر اسی ہزار الفاظ پر مشتمل ہوگی، الفاظ کی اتنی بڑی تعداد کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ "یونیسکو" کی کارروائی تعلیم کے ہر پہلو سے متعلق ہوگی، اس کے پروگرام میں تمام قسم کے طبعی، سماجی، نظری اور عملی علوم شامل ہوں گے، تخلیقی آرٹ مثلاً مصوری، موسیقی اور ادب بھی اس کے پروگرام کا ایک حصہ ہیں، پھر ریاضی اور عمرانیات کے علوم ہیں، میوزیم ہیں کتب خانے ہیں اور علوم کی نشر و اشاعت کا انتظام ہے اور آخر میں رسل و رسائل کے وہ تمام طریقے ہیں جن کے ذریعہ سے عوام تک ہم اپنے خیالات پہنچائے جا سکتے ہیں، ان طریقوں میں پریس ہے، ریڈیو ہے، فلم ہیں اور ٹیلی ویژن ہے۔ ان تمام کاموں کے پروگرام تیار کرتے وقت ہمارے سامنے چند عام اصول رہے ہیں، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ یونیسکو ہمیشہ اپنا کام ان اداروں کے ذریعے انجام دے گا جو پہلے سے موجود ہیں، پھر یونیسکو کی ہمیشہ یہ کوشش رہے گی کہ قوموں کے درمیان ہر قسم کے تبادلے عمل میں آئیں، مثلاً ایک ملک کے طالب علم دوسرے ملک بھیجے جائیں، مدرسین اور علمی تحقیقات کا کام کرنے والے بھی اسی طرح بدلے میں ایک ملک سے دوسرے ملک کو بھیجے جائیں۔ کتابوں، فلموں، موسیقی اور آرٹ کے کاموں کے تبادلے ہوں، عام معلومات اور سائنٹیفک تحقیقات کے نتائج آپس میں، ایک قوم دوسری قوم سے سیکھے۔ اگر ہم نے ایسا کر لیا تو امید ہے کہ ہمارے درمیان سے وہ تمام پردے ہٹ جائیں گے جنہوں نے قوموں کو ایک دوسرے سے دور کر رکھا ہے۔

"یونیسکو" ان تمام تبادلوں کے متعلق ایک ایسا نظام تیار کرے گا جس کے ذریعہ سے تعلیم، تہذیب اور سائنٹفک علوم سے فائدہ حاصل کرنے میں دنیا کے تمام ملک برابر کے حصہ دار ہیں۔ ہم دنیا سے جہالت کو مٹانا چاہتے ہیں، ہماری خواہش ہے کہ پس ماندہ ملکوں کو تعلیم کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچائے جائیں، ہم چاہتے ہیں کہ دنیا میں اب تک جتنی سائنٹفک تحقیقات ہوئی ہے اسے دنیا کے ملکوں کی ملکیت بنا دیا جائے "یونیسکو" کے سامنے ایک دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ وہ ہر ملک کے مخصوص مسائل کا جائزہ لے اور ان کا گہری نظر سے یا تو خود مطالعہ کرے یا ان لوگوں کی مدد کرے جو اس قسم کے کام میں مصروف ہیں۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے میں دو ایک مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ سائنس نے اب تک ایسی تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے کہ خود اس کی یہ ترقی اس کے راستے میں ایک خطرہ بن گئی ہے، سائنٹفک اشاعتوں میں انتشار نظر آتا ہے سائنٹفک تحقیقات کے جو خلاصے اور اس پر جو ریویو عوام کے سامنے آئے ہیں وہ نہایت ناقص ہوتے ہیں۔ "یونیسکو" کے سامنے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ وہ اس مسئلہ کی طرف توجہ کرے ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں بہت سے ایسے ملک ہیں جو خود اب تک صنعتی نہیں ہوئے ہیں لیکن صنعتی تہذیب وہاں پہنچ چکی ہے، اس تہذیب نے اس ملک کے قدیم فن اور دستکاریوں کو یا تو بالکل ختم کر دیا یا اتنا دبا رکھا ہے کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گیا ہے۔ ان حالات نے ہمارے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ان ملکوں کی دستکاریوں کو برباد ہونے سے کس طرح بچائیں ہمیں علم ہے کہ دو ایک موقعوں پر مثلاً امریکا میں "نواہو انڈینز" کے معاملہ میں اس قسم کی کوشش خاصی کامیاب رہی،

اسی قسم کا ایک اور مسئلہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ لڑائی کے زمانہ میں بڑی عمر کے ان پڑھ لوگوں کو تعلیم کے لئے مباحثی بحث کا طریقہ ڈسکشن گروپ سسٹم ایجاد کیا گیا تھا، یہ طریقہ بہت کامیاب ثابت ہوا لیکن دنیا میں بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں اس طریقہ پر تعلیم نہیں دی جاتی، مثلاً چین، افریقہ اور ہندوستان ہم چاہتے ہیں ان ملکوں میں بھی اس طریقہ کو رائج کر دیا جائے۔

بہت سے لوگوں کی یہ تجویز ہے کہ ایک بین الاقوامی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا معلوم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یونیسکو اس مسئلہ پر پوری طرح غور کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرے گا۔ اخیر میں مجھے یہ بتانا ہے کہ ان منصوبوں کے علاوہ اور بھی متعدد منصوبے ہیں جن کو یا تو یونیسکو خود چلائے گا یا ان لوگوں کی مدد کرے گا جو ان کو چلا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اور بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ یونیسکو کے پاس جو رقم ہے وہ محدود ہے اور اسی میں اسے یہ تمام کام کرنے ہیں۔ اس لئے بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ نمونے کے منصوبے چلا دے تاکہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہر کام کے سلسلہ میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے چنانچہ ہماری ایک تجویز ہے کہ ایک انٹرنیشنل یوتھ کیمپ (بین الاقوامی نوجوانوں کی جماعت) تیار کریں جو تعمیری کاموں کی ذمہ داری لے۔ ہمارا یہ بھی ارادہ ہے کہ اس سلسلہ کی تمام مشکلوں کا

جائزہ لینے کے بعد ہم ایک "انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہوم اینڈ کمیونٹی پلاننگ" قائم کریں جس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ دنیا کے مختلف جغرافی علاقوں کے حالات کا اندازہ کرکے وہاں شہروں قصبوں اور گاؤں کے تعمیری نقشے تیار کرنے کے اصول مقرر کرے۔ اسی طرح ہمارا ارادہ ایک "انٹرنیشنل ہمی ایبڑا انسٹی ٹیوٹ" قائم کرنے کا بھی ہے۔ یہ بھی ارادہ ہے کہ ہم یونیسکو کا ایک "انسٹی ٹیوٹ آف ایپلائیڈ میتھمیٹکس" قائم کریں یہ انسٹی ٹیوٹ غالباً ہندوستان میں بنے گا۔ اور اس میں موجودہ زمانہ کی تمام وہ مشینیں مہیا کی جائیں گی جو اعداد و شمار کرتی ہیں، اور جن کا کام ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔ آخیر میں میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جرمنی چڑیوں کی داشت اور ان کی ہجرت کا اہم سٹیشن ہیلی گولینڈ میں ہے اسے ہم خریدنا چاہتے ہیں مستقبل کی کامیابی کی امیدوں سے ہمارا دل لبریز ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میری یہ باتیں سن کر بہت سے لوگ یہ کہیں گے کہ ایٹم بم اور ایک نئی جنگ کے خطرے تو سامنے کھڑے ہیں، پھر یونیسکو جیسی چیز بنانے سے فائدہ کیا؟ ان لوگوں کو میں یہ جواب دوں گا کہ جنگ تو صرف ایک امکانی چیز ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے رہ گیا ایٹم بم، تو اس کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ اس کی تباہ کاریوں نے انسان کو ایسا خوف زدہ کر دیا ہے کہ وہ جنگ کو روکنے کا کبھی اتنا خواہشمند نہ تھا جتنا آج ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔ یونیسکو، اگر ایسے مواقع بہم پہنچا سکا جن سے دنیا کی قوموں کو ایک دوسرے کے صحیح حالات آزادانہ طریقہ پر معلوم ہو سکے اور دنیا میں تعلیم سائنس اور فنون کے بین الاقوامی ادارے قائم ہو سکے تو یہ کام خود ایسا ہوگا جس سے جنگ کے امکانات کم ہو جائیں گے۔ پھر آخیر میں میں یہ بھی کہوں گا کہ اگر خدانخواستہ وہ بری گھڑی آ ہی گئی اور دنیا کو ایک نئی جنگ کا سامنا کرنا پڑا تب بھی مجھے یقین ہے کہ یونیسکو کا کام بیکار نہ جائے گا اور اس جنگ کے بعد بھی جاری رہے گا۔ ہمارے سامنے ایسی ایک مثال پہلے سے موجود ہے اور وہ انٹرنیشنل لیبر آفس کی ہے، باوجود اس کے کہ لیگ آف نیشنز کبھی کی ختم ہو چکی تھی اور دوسری جنگ عظیم بھی پانچ سال تک لڑی گئی انٹرنیشنل لیبر آفس آج تک زندہ ہے اور اپنے اس کام کو جو اس نے پچیس سال پہلے شروع کیا تھا نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیتا رہا ہے۔ (لسنر سے)

اعلان

دفتر رسالہ "آجکل" میں مضامین نثر و نظم کافی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبہ کے بغیر اپنے رشحات قلم روانہ نہ فرمائیں ——— (ادارہ)

تیسری ملاقات

افسانہ

اختر انصاری

ایک خواب کی روداد سناتا ہوں۔ اور اگر شروع ہی سے یہ کہہ دوں کہ یہ ایک غیر معمولی خواب تھا تو اس سے میرا مقصد نہ تو یہ ہوگا کہ پڑھنے والوں کے شوق مطالعہ کو زبردستی بھڑکایا جائے اور نہ یہ کہ خواہ مخواہ رعب گانٹھ کر اپنی یا افسانے کی اہمیت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ یہ محض حقیقت کا اظہار ہوگا۔ اس اظہار حقیقت میں مجھے یوں اور بھی کوئی تامل محسوس نہیں ہوتا کہ اس سے میرے افسانے کی فنیت کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔

خواب کی روداد شروع کرنے سے پہلے ایک بات اور بتا دینی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ گو میرا خواب غیر معمولی ہے مگر میں خود ایک بالکل معمولی یعنی نارمل انسان ہوں۔ یونان کے بوڑھے فلسفی سقراط یا فرانس کی ان پڑھ دیہاتی دوشیزہ جون آف آرک کی طرح میں نے کبھی کوئی غیبی آواز نہیں سنی۔ میں نے کبھی رات کو نیند کے عالم میں بستر سے اٹھ کر نہ شبو کیا، نہ سڑک پہ چہل قدمی کی، نہ چھت پہ سے کودنے کا خطرناک اقدام کیا۔ اور نہ ہارڈی کے ایک ناول کے ہیرو کی طرح اپنی محبوبہ کو بازوؤں میں لے کر گھر سے باہر کی سیر کی۔ میں کبھی کسی دماغی بیماری یا کسی نفسیاتی عدم اعتدال یا کسی قسم کی عارضی یا مستقل دیوانگی ——— مثلاً غشی یا مالیخولیا یا ہسٹیریا ——— کا شکار نہیں ہوا۔ میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی انوکھی یا ان ہونی بات کے ہونے کی خواہش کی ہو اور وہ خواہش ایک معجزانہ انداز میں پوری ہو گئی ہو۔ میں بار ہا مصیبتوں میں گھر گیا ہوں۔ مگر کبھی یہ نہیں ہوا کہ خلاف عادت امور کے ذریعہ مجھے مصیبتوں سے چھٹکارا ملا ہو۔ میں نے اکثر ہوائی محل تعمیر کئے ہیں اور بیداری کے خواب دیکھے ہیں، مگر ان خوابوں اور محلوں نے کبھی مادی شکل اختیار نہیں کی۔ مجھے بھوتوں اور آسیبوں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ نہ میں نے کبھی اپنی آنکھوں سے کسی جن یا چھل پیری کو دیکھا۔ میں بچپن میں بالکل ایک معمولی بچہ تھا، اور طالب علمی کے زمانے میں ایک بالکل معمولی طالب علم۔ اپنی زندگی کے کسی دور میں میں نے کسی حیرت انگیز ذہانت یا طباعی کا ثبوت نہیں دیا۔ غرضیکہ ہر طرح سے ایک نارمل انسان ہوں اور رہا ہوں۔ سوتے میں جو خواب اکثر دیکھتا ہوں وہ بھی بالکل معمولی آدمیوں کے سے خواب ہوتے ہیں۔ سوا اس ایک بات کے۔ اور ضروری نہیں کہ یہ بات بھی کوئی غیر معمولی چیز ہو اور دوسروں کو اس کا تجربہ نہ ہوا ہو۔ کہ میں کبھی کبھی "خواب در خواب" دیکھتا ہوں۔ یعنی خواب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میں ابھی سو رہا تھا اور خواب دیکھ رہا تھا اور اب جاگ گیا ہوں۔ اور پھر خواب ہی میں اپنے "خواب در خواب" پر غور کرتا ہوں، اور اپنے آپ سے کہتا ہوں، "اُف میں نے کیسا بھیانک خواب دیکھا! کیسا عجیب خواب دیکھا! مگر خیر اب تو میں جاگ گیا ہوں۔ اب کوئی اندیشے کی بات نہیں آخر وہ محض ایک خواب ہی تو تھا، ایک بے حقیقت خواب . . . . . " یہ ایک قدرے غیر معمولی کیفیت تو ضرور میں نے اپنے خوابوں میں پائی ہے، ورنہ کیا سوتے میں اور کیا جاگتے میں میرا ذہن بالکل ایک نارمل انسان کے ذہن کی طرح کام کرتا ہے۔

اور اب سنئے میری زندگی کے تنہا غیر معمولی خواب کی روداد!

روز کی طرح اس دن بھی میں نے دوپہر کا زیادہ وقت سونے میں گزارا، اور رات کو ڈیڑھ دو بجے تک اپنے مطالعے کے کمرے میں رہا، جو مکان کے بڑے دروازے کے پہلو میں ہے اور جس کے دروازے اور کھڑکیاں گلی کی جانب ہیں۔ حسب معمول کبھی ایک کرسی پہ بیٹھتا کبھی دوسری پہ اور کبھی کمر سیدھی کرنے کو جی چاہتا تو صوفے پہ دراز ہو جاتا۔ اس دوران میں میں نے پڑھا بھی لکھا بھی، سوچا بھی اور خالی الذہن بھی رہا اور عادت کے مطابق تقریباً مسلسل سگار پیتا رہا، یہاں تک کہ کمرے کی نصف درجن راکھ دانیاں سگار کی راکھ سے اٹ کر رہ گئیں۔ ڈیڑھ اور دو بجے کے درمیان کمرہ بند کر کے گھر کے اندر چلا گیا جہاں برآمدے میں ایک طرف ملازم سو رہا تھا اور دوسری طرف میرا پلنگ بچھا تھا۔ بستر پہ پہنچ کر سونے سے پہلے میں نے اس دن کا آخری سگار سلگایا۔ رات اندھیری تھی۔ آسمان ستاروں سے بھرا تھا، مگر ستارے کجلائے ہوئے سے تھے اور ان کی روشنی میں ابھی وہ جگمگاہٹ اور برقیت پیدا نہیں ہوئی تھی جو عام طور پر رات کے آخری حصے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ برآمدے میں قدرتی طور پر صحن سے زیادہ اندھیرا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے سگار پینے میں کچھ زیادہ لطف نہ آیا۔ سگار کا دھواں جو بجلی کی روشنی میں ایک خاص حسن اور رومانی کیفیت کا حامل نظر آتا ہے۔ تاریک کثافت کی ایک لہر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سگار بجھا دیا۔ کلی کی اور سونے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ عادت کے مطابق فوراً نیند آ گئی اور میں خوابوں کی اس دنیا میں پہنچ گیا جس میں ہر شخص اپنی زندگی کا آدھا نہیں تو ایک تہائی حصہ تو ضرور بسر کرتا ہے۔

اس دنیا میں منتقل ہو کر میں نے دیکھا کہ میرے سامنے صحن کے اس پار جو دیوار ہے اس کی منڈیر پر ایک شخص اکڑوں بیٹھا ہوا ہے وہ کبھی مکان کے مختلف حصوں کی طرف نظر دوڑاتا ہے۔ کبھی پیچھے مڑ کر

دبی آواز میں اور ہاتھ کے اشاروں کے ساتھ کسی سے باتیں کرتا ہے اور کبھی آگے کی طرف جھک کر صحن کی زمین کی طرف نظر ڈالتا ہے۔ گویا کود کر نیچے آنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ میں اس خوفناک شخص کو دیکھتا ہوں اور اس کے خوفناک تراروں کو بھانپ کر سر سے پاؤں تک لرز جاتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ بستر سے اٹھوں اور بچاؤ کی کوئی تدبیر کروں مگر محسوس کرتا ہوں کہ میرے بدن میں ہاتھ پاؤں ہلانے تک کی بھی سکت باقی نہیں ہے۔ میں آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں اور کانوں سے سن سکتا ہوں مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ملازم کو جگانے کے لئے آواز دینا چاہتا ہوں لیکن آواز حلق میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ پھر مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ چنانچہ بار بار پلکیں جھپکاتا ہوں اور متعدد مرتبہ آنکھوں کو بند کر کر کے کھولتا ہوں۔ اور آخرکار اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا ہوں، بلکہ میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور میں حقیقت سے دوچار ہوں۔ اس کے علاوہ میں یہ سوچتا ہوں کہ خواب میں انسان جو کچھ دیکھتا ہے اس میں اتنی صفائی اور ٹھیٹ واقعیت کبھی نہیں ہوتی۔ خواب میں ہر چیز دھندلی، الجھی ہوئی، بے ربط، غیر یقینی اور غیر متصل ہوتی ہے۔ خواب میں تو اکثر یوں ہوتا ہے کہ ابھی آپ اپنے مکان کے اندر کسی پر تکلف کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں، اور ابھی کسی درخت کی ٹہنی پر پہنچ گئے ہیں، یا یہ کہ جس شخص سے آپ الجھ رہے ہیں وہ ابھی آپ کا بھائی ہے اور ابھی ذرا دیر میں آپ کے کسی دوست یا دشمن کا روپ دھار لیتا ہے۔ مگر یہاں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے جو منظر ہے وہ بالکل ٹھوس ہے اور واقعیت اور اصلیت سے بھرپور ہے۔ اس منظر کی جزئیات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ میں برآمدے میں اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں۔ داہنی جانب سرہانے کے پاس چھوٹی میز ہے اور اس پر سگار کیس اور دیاسلائی کا بکس اور پانی سے بھرا ہوا شیشے کا گلاس۔ اسی جانب ذرا آگے بڑھ کر کھانے کی میز اور کرسیاں ہیں، اور ان کے برابر ایک کھلا ہوا شیلف ہے جس میں برتن بھرے ہیں اور جو سائڈ بورڈ یا ڈنگن کا کام دیتا ہے۔ بائیں طرف دیوار سے لگا ہوا ایک لکڑی کا ٹرنک ہے جو معمولی سائز کے آٹھ نو ٹرنکوں کے برابر ہے اور برآمدے میں اس لئے رکھا ہوا ہے کہ کمرے میں پوری ایک بڑی میز کی جگہ گھیر لیتا ہے۔ ٹرنک کے برابر دو تین کرسیاں پڑی ہیں اور کرسیوں کے اس طرف ملازم اپنی چارپائی پہ بے خبر سو رہا ہے۔ برآمدے کے بعد صحن ہے جس کے چپے چپے سے کیا، ذرے ذرے سے مجھے گہری واقفیت ہے، کیونکہ میں اس مکان میں آٹھ دس سال سے رہتا ہوں۔ صحن کے خاتمے پر دس گیارہ فٹ اونچی دیوار ہے جس کی بلندی میں مزید اضافہ کے لئے میں ہمیشہ مالک مکان پر ایک بے نتیجہ اور بے سود تقاضہ کرتا رہا ہوں۔ اسی دیوار کے ایک حصہ پر کھپریل کا وہ سائبان ٹکا ہوا ہے جو باورچی خانے کو دھوپ اور بارش کے حملوں سے بچاتا ہے اور کھپریل کے برابر دیوار کی منڈیر پر یہ شخص، یہ بن بلایا مہمان، اکڑوں بیٹھا ہے۔ اور خطرناک ارادوں سے لبریز نظر آتا ہے۔ نہ اس کے حلیے میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے نہ وہ خود بندر کی شکل میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس کا وجود یقینی ہے۔ اس کی ہر حرکت بالکل واضح ہے اور پورے طور پر سمجھ میں آتی ہے۔ میں یقیناً خواب نہیں دیکھ رہا ہوں بلکہ بیدار ہوں —— سوتے سوتے جاگ گیا ہوں اور اس ناخوشگوار صورت حال سے دوچار ہوں۔

اپنی بیداری کا یقین کر لینے کے بعد میں اپنی پھٹی ہوئی آنکھیں منڈیر اور منڈیر پر بیٹھے ہوئے شخص پر جما دیتا ہوں۔ اس کے جسم پر ایک کسے ہوئے لنگوٹ اور ایک چیت شلوکے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہاتھ اور ٹانگیں بالکل ننگی ہیں۔ سر پر ایک مٹیالے رنگ کا صافہ بندھا ہے اور شاید اسی کا کچھ حصہ ہے جو اس کے گالوں اور ٹھوڑی کو بھی ڈھانپے ہوئے ہے۔ تاہم اسکا چہرہ، یعنی آنکھیں، ناک، اور منہ صاف نظر آ رہا ہے۔ میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہوں تو میری حیرت زدگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ ایک آنکھ سے بھینگا ہے، اس کا ایک نتھنا بیچ میں سے کٹا ہوا ہے۔ اور پھولے ہوئے ہونٹ دو موٹے موٹے چوہوں کی مانند ہیں۔ میرے ذہن میں ایک بجلی سی کوند جاتی ہے، اور میرا حافظہ چیخ کر کہتا ہے "بدو!"

اس مقام پر میں اپنے پڑھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لئے خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں واپس لانا چاہتا ہوں۔

میری ساری عمر بڑے بڑے تجارتی اور صنعتی شہروں میں گزری ہے اور کسی گاؤں یا قصبے میں چند دن گزار دینے کو میں تعطیلات کا بہترین مصرف خیال کرتا ہوں۔ لوگ ایام فرصت میں کلکتہ اور بمبئی یا مسوری اور کشمیر جانے کے پروگرام بناتے ہیں۔ میں اس کے برعکس کسی اداس گاؤں یا ویران قصبے کی طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ میرے اس رجحان کو دیکھتے ہوئے ایک ہم پیشہ و ہم مشرب دوست مظہر نے گزشتہ سال کرسمس کی چھٹیوں میں مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ یوں میں نے چند روز ایک چھوٹے سے پرسکون قصبے میں بسر کئے۔ مظہر کا مکان جو کچھ خام ہے اور کچھ پختہ، قصبہ کے ایک سرے پر واقع ہے۔ مکان کے ایک طرف ایک کچی سڑک ہے جس پر صبح سے شام تک اونگھتی ہوئی بیل گاڑیاں، بے ضرورت شور کرنے والے بچے، مویشی اور انسان گزرا کرتے ہیں، اور جو اس سارے ہنگامے کے باوجود

بے رونق ہی رہتی ہے۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا برساتی تالاب اور اس سے آگے کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ مکان کی پشت پر ایک سایہ دار املی کا درخت ہے۔ اسی درخت اور اس کی بہاروں اور اس کے سائے میں برپا ہونے والی صحبتوں کو مظہر نے اپنے قصبے کی سب سے بڑی کشش بتایا تھا۔ شاید اس نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا کیونکہ میں نے دیکھا کہ آس پاس کے ہر مرجے اور ہر قماش کے لوگ اپنی فرصت کے اوقات میں یہاں جمع رہتے ہیں اور ہر وقت اور ہر موسم میں ایک جلسے کا سا سماں بندھا رہتا ہے۔ میرے لئے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہ تھا کہ برسات کے زمانے میں اس درخت کے نیچے بیٹھنا کس قدر لطف و مسرت کا موجب ہوتا ہوگا۔

اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں میں ایک دن جو صبح کو سو کر اٹھا تو دیکھا کہ آسمان پر ابر چھایا ہوا ہے اور ٹھنڈی ہوا غیر معمولی تیزی کے ساتھ چل رہی ہے لیکن اس پر بھی مظہر اور اس کے چند دوست املی کے درخت کے نیچے حسب معمول جمع تھے۔ کوئی گرم کوٹ پہنے تھا، کوئی کمبل لپیٹے ہوئے تھا اور کوئی لحاف سمیت ہی آنکلا تھا۔ مگر ایسا کوئی نہیں تھا جو سی سی نہ کر رہا ہو اور سردی کے مارے ٹھٹھرا نہ جاتا ہو۔ سب اس حال میں کھڑے تھے کہ مظہر نے ایک شخص کو جو ادھر سے گزر رہا تھا بدو کہہ کر پکارا۔ وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے بدن پر ایک پھٹی ہوئی گھٹنوں تک اونچی دھوتی اور کھدر کے ایک کثیف نیم آستین شلوکے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس برہنگی سے زیادہ جاذب توجہ اس کی صورت تھی۔ وہ حد سے زیادہ کریہہ المنظر تھا۔ اس کا سر گنجا تھا، ایک آنکھ بھینگی تھی، ایک نتھنا بیچ میں سے کٹا ہوا تھا، اور ہونٹ دو موٹے موٹے چوہوں کی طرح پھولے ہوئے تھے!

"میاں بدو! ایسی سردی میں آج صبح ہی صبح کہاں چل دئے؟" کسی نے اس سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں میاں!" اس نے جواب دیا، "مجھ بدبخت کو تو موت بھی نہیں۔ سچ جانیو آدھی رات سے جب سے کہ ہوا تیز چلی ہے اور بادل ہوئے ہیں صبح تک دونوں میاں بیوی بچی کو بغل میں دبائے، گھٹنوں میں سر دئے بیٹھے رہے ہیں۔"

"پھر اب اتنے سویرے سردی میں کیوں نکل کھڑے ہوئے؟ اس وقت کہاں کا ارادہ ہے؟"

"میاں اویر سویر کی کیا بات ہے۔ یہاں تو ہر وقت سردی ہی ہے۔ رات جس طرح کاٹی ہے بس اپنا ہی دل جانتا ہے۔ اب تمہیں بتاؤ میاں! ایک کھدر کی چادر اس کڑا کڑاتے جاڑے میں کیا کام آسکتی ہے؟ اور وہ بھی تین آدمیوں کے بیچ میں!"

"ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ مگر اس وقت جا کہاں رہے ہو؟"

"میاں! جانا کہاں۔ مزدوری کی فکر ہے۔ سالے دو آنے کی پیدا وار کر کے پیٹ کو لگا دوں گا۔"

"اچھا اچھا، جاؤ،" سب نے مل کر کہا۔ اور وہ رخصت ہو گیا۔

یہ میری اور بدو کی پہلی ملاقات تھی۔

اس سال ستمبر کے پہلے ہفتے میں مظہر کے کنبے میں ایک شادی تھی اور مجھے ایک مرتبہ پھر اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ کنوار کا مہینہ تھا اور برسات کا آخری زمانہ۔ سب جانتے ہیں کہ اس موسم میں کیسی چلچلاتی دھوپیں پڑتی ہیں۔ صحیح یا غلط مشہور ہے کہ انہیں دھوپوں میں ہرن کالا ہوتا ہے۔ ایک دن یہ اور غضب ہوا کہ ہوا بالکل بند ہو گئی۔ قیامت کی دھوپ اور اس پر حبس! گھروں کے اندر ٹھہرنا ناممکن ہو گیا۔ اگر کہیں کچھ امن تھا تو املی کے درخت کے سائے میں ہی تھا۔ چنانچہ دوپہر کے وقت میں اور مظہر اور کچھ اور لوگ درخت کے نیچے اپنے ہاتھوں میں پنکھے لئے بیٹھے تھے کہ چند مزدور گھاس کے گٹھے سروں پر رکھے آتے ہوئے دکھائی دئے۔ سب کے چہرے گھاس کے گٹھوں میں چھپے ہوئے تھے۔ درخت کے نیچے پہونچ کر سب نے اپنے اپنے سر کا بوجھ زمین پر لڑھکا دیا، اور بیٹھ کر جانوروں کی طرح ہانپنے لگے۔

"کہو بھئی بدو! کیا حال چال ہیں؟"

مظہر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں نے اپنے حافظے میں ایک ہلکی سی جنبش محسوس کی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا اور بیک نظر اس گنجے سر، اور بھینگی آنکھ، کے طوے نتھنے اور پھولے ہوئے ہونٹوں والے شخص کو پہچان لیا جس سے پچھلے جاڑوں میں پہلی دفعہ واقفیت حاصل کی تھی۔

"اچھا ہوں میاں!" بدو نے کہا۔ "اب کے تو میاں تم بہت دنوں میں گھر کو آئے؟"

"ہاں بھئی، کیا بتائیں چھٹی نہیں ملتی۔ کہو اب تمہاری کیسی گزر رہی ہے؟ جاڑوں میں تو تم بڑی تکلیف اٹھا رہے تھے؟"

"میاں! غریب کے لئے جاڑا گرمی سب برابر ہے۔ جاڑوں میں سردی کے مارے اکڑے جاتے تھے اور اب گرمی میں یہ دھوپ جلائے ڈالتی ہے۔ لو دیکھو۔"

یہ کہہ کر بدو نے اپنی پشت ہماری طرف کی، اور ہم نے دیکھا کہ اسکی پشت پر چونی کی گولائی کے برابر بیسیوں آبلے پڑے ہوئے ہیں۔

"یہ آبلے کیسے؟" مظہر نے پوچھا۔ "کیا کہیں جل گئے؟"

"میاں! جل نہیں گئے،" بدو بولا۔ "کپاس کے کھیت میں بیٹھے گھاس صاف کر رہے تھے۔ اپنے پاس کوئی کپڑا تھا نہیں جو پیٹھ پر ڈال لیتے

دھوپ کی تیزی سے آبلے پڑ گئے ہیں۔"

منظر اور اس کے ساتھی "اچھا" کہہ کر خاموش ہو گئے اور آسمان کی طرف منہ کر کے بارش کی دعائیں مانگنے لگے۔

یہ میری اور بدّو کی دوسری ملاقات تھی!

اور تیسری ملاقات خواب کی دنیا میں ہوئی جس کی روداد کا ایک حصہ میں سنا چکا ہوں اور باقی حصے کی طرف اب متوجہ ہوتا ہوں۔

میں منڈیر پر بیٹھے ہوئے شخص کو پہچان لیتا ہوں، اور زور سے چیخ کر کہنا چاہتا ہوں "بدّو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟" مگر آواز حلق میں سے نہیں نکلتی، اور میں بے دست و پائی کے عالم میں اس کو دیکھتے رہنے پر مجبور ہوں۔ اتنے میں ایک اور شخص کا سر منڈیر سے اونچا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ایک لمحے میں وہ بھی بدّو کے برابر آن بیٹھتا ہے۔ میں صورتحال کو اس ارتقائی تبدیلی میں پوری طرح غور بھی نہیں کر پاتا ہوں کہ اسی طرح ایک تیسرا شخص دیوار کے پیچھے سے نمودار ہوتا ہے اور منڈیر پر آکر اپنے ساتھیوں کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دیوار کے اس طرف زمین شق ہو گئی ہے اور کسی غلیظ اور ملعون دنیا کے بسنے والے اپنے ناپاک مسکنوں سے نکل نکل کر میرے مکان پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ میں اپنی نظریں یہ دیکھنے کے لئے منڈیر پر جمائے رکھتا ہوں کہ ان تین حملہ آوروں میں اور کتنے حملہ آوروں کا اضافہ ہونے والا ہے۔ بارے یہ اضافہ تو نہیں ہوتا مگر یہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ تینوں شخص کھپریل کے سائبان کا سہارا لیتے ہوئے یکے بعد دیگرے نیچے صحن میں اتر آتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر چیخنے کی کوشش کرتا ہوں، اور پلنگ سے اٹھنے کے لئے اپنے جسم کی انتہائی قوت کو کام میں لاتا ہوں مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ میری آواز میرے دماغ میں گونج کر رہ جاتی ہے اور میرے جسم کی قوت تحلیل ہو کر مجھے پہلے سے زیادہ مفلوج بنا دیتی ہے۔ وہ تینوں شخص آگے پیچھے ایک قطار سی باندھے ہوئے مکان کے بڑے دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز مجھے سنائی دیتی ہے۔ وہ دروازے کو چوپٹ کھول دیتے ہیں گویا فرار کے راستہ کا انتظام سب سے پہلے کرتے ہیں، اس انتظام سے فارغ ہو کر تینوں دوبارہ صحن میں آجاتے ہیں۔ تھوڑی دیر متامل رہتے ہیں اور آپس میں اشاروں سے باتیں کرتے ہیں۔ اس کے بعد برآمدے کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ میں برق زدہ ہو کر رہ گیا ہوں میری حالت بیہوشی کی حالت سے کہیں بدتر ہے، کیونکہ بیہوشی میں انسان شعوری احساس سے بہرحال عاری ہوتا ہے۔ برآمدے میں لوہے کا ضخیم ٹرنک سب سے پہلے ان کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ وہ کچھ دیر تک جھک جھک کر اس کے قفل کو دیکھتے ہیں۔ شاید کوئی کام بنتا نظر نہیں آتا اس لئے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس دروازے میں بھی ایک قفل پڑا ہوا ہے چنانچہ ادھر سے بھی پسپا ہوتے ہیں اور تینوں برآمدے سے نکل کر صحن میں چلے جاتے ہیں۔ تقریباً بیس منٹ تک کھپریل کے سائبان کے نیچے کھڑے رہتے ہیں۔ ادھر اُدھر دیکھتے ہیں اور آپس میں مشورہ کرتے ہیں اس کے بعد دوبارہ برآمدے کی طرف بڑھتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر چیخنے کی اور پلنگ سے اٹھنے کی زبردست کوشش کرتا ہوں مگر آواز میرے حلق میں مر چکی ہے اور بستر میرے لئے قبر بن کر رہ گیا ہے۔ ایک شخص ملازم کی چارپائی کی طرف بڑھتا ہے اور اس کے قریب جا کر کھڑا ہو جاتا ہے، دوسرا برآمدے کے بیچ میں ٹھہر جاتا ہے۔ اور تیسرا یعنی بدّو میرے پلنگ کی طرف اپنے قدم بڑھاتا ہے۔ وہ میرے سرہانے کے پاس پہنچ کر چند لمحوں تک بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد آگے کو جھکتا ہے اور میرے چہرے کو بغور دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں چیخنے کی ایک آخری اور بے پناہ کوشش کرتا ہوں اور کامیاب ہوتا ہوں۔

ایک بھیانک چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں خواب کی دنیا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ خواب کے تاریک غار سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آجاتا ہوں۔

اور یہ تھا وہ خواب جو میں نے دیکھا۔

"لیکن" آپ کہیں گے! "یہ تو بالکل معمولی خواب تھا"

ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو، مگر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص میرے سرہانے کھڑا ہے اور جھک کر میرے چہرے کو بغور دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ ایک آنکھ سے بھینگا تھا، اس کا ایک نتھنا بیچ میں سے کٹا ہوا تھا۔ اور اس کے پھولے ہوئے ہونٹ دو موٹے موٹے جونکوں کی مانند تھے۔ وہ بدّو تھا!

حیوان سے انسان تک ——— بقیہ صفحہ ۲۹

اور تدبیریں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوئی بلکہ یہ بھی کہ وہ اپنے ساتھیوں سے تبادلہ خیالات کر سکے اور اپنا مافی الضمیر ان کو بتا سکے۔ ان خصوصیات کی بدولت اس کو دنیا کے سب جانوروں پر غیر معمولی فوقیت اور سرفرازی حاصل ہو گئی۔ اس کی فطرت نے اب اسے مجبور کر دیا کہ وہ صحیح معاشرتی زندگی اختیار کرے جس سے کہ اس کے ذہنی اور دماغی قوئے میں حیرت انگیز ترقی ہوئی اور بالآخر موجودہ دور کے مہذب اور ترقی یافتہ انسان کی خلقت کی تکمیل عمل میں آئی۔

سوویٹ ایشیا کے لوگ

جان لورنس

جس طرح برطانیہ عظمیٰ کے معنی صرف انگلستان کے نہیں بالکل اسی طرح سوویٹ یونین محض روس کا نام نہیں روسی نئی طرح کے لوگ ہیں مگر سوویٹ یونین میں انھیں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اب میں آپ کو سوویٹ ایشیا کے متعلق کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جغرافیائی نقطۂ نظر سے "سائبیریا" ایشیا کا ایک حصہ ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو سائبیریا یورپی روس ہی کا پھیلاؤ ہے۔ اس میں ویسے ہی لوگ بستے ہیں اور اس کی آب و ہوا بھی ویسی ہی ہے۔ اصلی ایشیا تو آپ کو درحقیقت کازکستان اور سوویٹ ترکستان ہی میں نظر آئے گا۔ یہیں زرخیز وادیاں اور سمرقند بخارا جیسے مشہور عالم شہر ہیں اور یہیں وہ صحرا ہیں جو وادیوں کو ایک دوسری سے جدا کرتے ہیں۔ یہ دراصل اس قسم کا ملک ہے جس کا ذکر الف لیلہ میں آیا ہے۔ یہاں اونٹ ہیں اور اسی طرح کی چیزیں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں جاڑوں میں خاصی سردی ہوتی ہے۔ اور جب برف پڑتی ہے تو برف کا ٹیاں اونٹ ہی کھینچتے ہیں البتہ انھیں گرم رکھنے کے لئے بوتیں اڑھا دیتے ہیں۔ مرد لمبے لمبے سلکی چغے اور منقش ٹوپیاں پہنتے ہیں۔ اور عورتیں اپنی لمبی کالی زلفیں پشت پر لٹکا لیتی ہیں۔ ان سب کے بال کالے ہوتے ہیں۔ روسی زندگی کا یہ دلکش پہلو مجھے بہت پسند ہے۔ مگر "الف لیلہ" میں نظر فریبی بہت کم ہے اور نہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اسکے پس منظر میں خوفناک غربت چھائی ہوئی ہے۔

سوویٹ ایشیا ہمیشہ غریب رہا ہے۔ روس کے مقابلے میں اسکی مفلسی کہیں زیادہ ہے۔ یہاں مسلمان آباد ہیں۔ تمام سوویٹ یونین میں کوئی دو کروڑ مسلمان ہوں گے۔ وہ عموماً روسی میں نہیں بلکہ اپنی مادری زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ البتہ جو لوگ مدرسوں میں روسی سیکھتے ہیں وہ کبھی کبھی روسی بول لیتے ہیں لیکن ان دونوں زبانوں میں کچھ زیادہ اختلاف بھی نہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ تھوڑی سی مشق سے مختلف قبیلوں کے لوگ ایک دوسرے کی بات بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں۔ روسیوں کے مقابلے میں یہ لوگ بہت پیچھے تھے پچیس سال قبل ان میں صرف دو تین فیصدی لوگ پڑھنا جانتے تھے وہ بھی اپنی زبان میں نہیں بلکہ زیادہ تر عربی اور فارسی میں اس لئے کہ ان زبانوں کو ان کے نزدیک فوقیت حاصل تھی۔ چھپی ہوئی کتابوں کی تعداد نفی کے برابر تھی۔ ملک بھر میں معدودے چند ڈاکٹر تھے۔ ایک پورے ضلع میں جہاں کی آبادی کوئی ڈھائی لاکھ تھی صرف ایک ڈاکٹر تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بیمار کو مرض کے ایام میں موت سے کھیلنا ہوتا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے لوگوں کو شہری آزادی حاصل نہ تھی اور ان کا دار و مدار محض حکام کے رحم و کرم پر تھا۔ یہ حاکم بعض صورتوں میں روسی افسر ہوتے لیکن ان کے اپنے "امیر" اور "خان" تو فقط مختار تھے۔ لوگ قرون وسطیٰ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض وجوہ سے قرون وسطیٰ کی تہذیب کا معیار بہت بلند تھا اور وسط ایشیا کے یہ لوگ وسطی بلند تہذیب کے وارث ہیں۔ چونکہ وسط ایشیا زیادہ تر صحرا ہے اس لئے ان لوگوں کی زندگی کا مدار پانی پر ہے۔ البتہ اگر وہاں بند بنا لئے جائیں اور نہریں کھود لی جائیں تو زمین کی آبپاشی ہو سکتی ہے اور یہی بنجر زمین زرخیز بنائی جا سکتی ہے۔ بند سے بجلی حاصل ہو سکتی ہے اور پھر یہی پانی کیمیائی مشینوں کے ذریعے کھاد کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے یا پھر زمانۂ جنگ میں اس سے بارود وغیرہ تیار کر سکتے ہیں جب کبھی وسطی ایشیا میں کسی اچھی حکومت کا دور دورہ ہوا تو اس نے بند بنائے اور نہریں کھدوائیں۔ اس لحاظ سے سوویٹ حکومت ان لوگوں کے لئے رحمت ثابت ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ بند بندھوانے اور نہریں کھودنے کے لئے مزدوروں کی بہت بڑی تعداد درکار ہوتی ہے۔ یہاں کھدائی کے کام کے لئے زیادہ تر مقامی لوگ لگائے گئے ہیں اور حقیقت میں یہ انکے اپنے فائدے کی چیز ہے جب کبھی اس قسم کی مہم درپیش ہوتی ہے تو پوری آبادی دل و جان سے اس میں لگ جاتی ہے۔ اور یہ ان کی زندگی کا دلچسپ پہلو ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی دور رہ کر حکومت ان لوگوں کا اعتماد کیسے حاصل کرتی ہے جب کہ یہ لوگ دیگر پس ماندہ اقوام کی طرح بڑے تنگ دل واقع ہوئے ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ سوویٹ حکومت نے ان لوگوں کے معاملے میں کئی غلطیاں کھائیں، اور اول اول حکومت کی سخت مخالفت ہوئی اور لوگ مسلح بغاوت پر اتر آئے لیکن رفتہ رفتہ معاملات سلجھ گئے۔ سوویٹ یونین ایک طرح کا وفاقی نظام حکومت ہے گو ویسا نہیں جیسا ریاستہائے متحدہ یا سوئٹزرلینڈ یا آسٹریلیا کی جمہوری حکومتوں میں ہے۔ قانون یہاں جلد حرکت میں آجاتا ہے اور تمام احکام ماسکو سے صادر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے وزرا میں سے ایک نے مجھ سے کہا کہ "ماسکو ہی سب کا آقا ہے"۔

یہ واقعہ ہے کہ مقامی باشندوں کے لئے سوویت نظام کیلئے ہر طرف سے مقامی لوگ ذمہ دار رہے ہیں۔ وہ لوگ مقدور بھر کوشش کرتے ہیں کہ عوام ان اپنے کاموں میں حصہ لینے کو فخر سمجھیں۔ پچھلے چالیس سال میں انہوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ان دیہاتی علاقوں میں سوویت نظام کو قائم ہوئے ابھی چالیس برس سے کچھ ہی اوپر گزرے ہیں۔ ۷ سال کے سب بچے اسکول جاتے ہیں۔ یہ ہر چیز مادری زبان میں سیکھتے ہیں۔ بہت سے طالب علم جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں، ثانوی درجوں بلکہ یونیورسٹی تک پہنچ جاتے ہیں جس کے لئے تاشقند اور سمرقند کی دونوں یونیورسٹیاں کھلی ہیں۔ ان میں بیشتر کے باپ ابھی تک [illegible] رہے ہیں لیکن اب ایک نوجوان کی کافی تعداد [illegible] کے لئے تیار ہو رہی ہے۔ اس زمانے میں چونکہ اکثر لوگ پڑھنا لکھنا سیکھ گئے ہیں اس لئے اب ہر علاقے میں مقامی ادب سے دل چسپی لی جا رہی ہے۔ ان لوگوں نے اپنے قدیم ادب کو پہلی مرتبہ بہت بڑی تعداد میں چھپوا کر محفوظ کر لیا ہے۔ مجھے ایک ناٹک دیکھنے کا موقع ملا یہ ایک قدیم نظم سے تیار کیا گیا تھا۔ میں الفاظ سمجھنے سے تو قاصر رہا لیکن اداکاری ایسی واضح تھی کہ پورے کا پورا منظر آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میرے خیال میں آج سے پچیس سال پہلے کسی مقامی زبان میں کوئی کھیل نہیں کھیلا گیا۔ لیکن اب وہاں ایسے تھیٹر قائم ہو چکے ہیں جو ماسکو کے بہترین تھیٹروں سے کسی طرح کم نہیں۔

مگر ناٹک اور تھیٹر تو محض ضمنی چیزیں ہیں کسی متمدن معیار زندگی کے لئے اصل چیز مناسب طور پر کاشت کردہ کھیت اور جدید کارخانے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وسط ایشیا میں کوئلے کی کانیں نہیں ہیں اور غالباً اسی وجہ سے وہاں عام طور پر صنعت و حرفت کو کچھ زیادہ فروغ حاصل نہیں۔ البتہ پارچہ بافی کی صنعت وہاں بڑے زوروں پر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وسط ایشیا میں کپاس بکثرت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے

تاشقند میں کپڑے کا ایک بہت بڑا کارخانہ دیکھا۔ [illegible] سے اس کا مقابلہ کوئی ماہر فن ہی کر سکتا ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کارخانے کو سرسری طور پر دیکھنے کے لئے بھی کئی گھنٹے وقت درکار ہے۔ میں نے تاشقند میں کپڑے کی چھپائی تک کے سارے عمل دیکھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مستقبل قریب میں ان لوگوں کو پہننے کے لئے بہت عمدہ کپڑا مہیا ہو جائے گا لیکن انہیں مغربی یورپ کی صف میں کھڑا کرنے کے لئے بہت عرصہ درکار ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کپڑے کے اور بھی کارخانے ہیں۔

آبادی وہاں کی طرح بڑھ رہی ہے لیکن اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں کہ زمین اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے ناکافی ہوگی کیوں کہ زمین کو آبپاشی کے ذریعے کارآمد بنایا جا سکتا ہے۔ حکومت برطانیہ ہند بھی آبپاشی کی بعض بڑی بڑی اسکیمیں عمل میں لا چکی ہے اور شاید یہ خیال کرنا درست نہ ہو کہ روس ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں اس قسم کی بڑی بڑی اسکیموں پر عمل ہو سکتا ہے۔ ہاں ان کے متعلق یہ بات بالکل صحیح ہے کہ جب یہ لوگ کسی کام کو کرنے کا تہیہ کر لیتے ہیں تو اس میں سر توڑ کوششوں سے تیزی رفتار پیدا کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وادیٔ فرغانہ کو لے لیجئے۔ قدیم زمانے میں یہ زرخیز ترین علاقوں میں سے تھی لیکن آبپاشی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے یہ بہت بنجر ہو گئی۔ نہر فرغانہ کھد گئی تو اس علاقے کی زرخیزی بحال ہو گئی۔ مجھے اس کے متعلق جو قصے بتائے گئے اول اول میں نے انہیں باور نہیں کیا لیکن اب میں اسے بچشم خود دیکھ چکا ہوں۔ اس کا صرف ایک حصہ کئی سو میل لمبا ہے۔ جن لوگوں کو اس کے پانی سے فیض یاب ہونا تھا ان کو اس کے فوائد اچھی طرح سمجھا دئے گئے۔ انجینیروں نے اس نہر کی حدود زمین پر قائم کر دیں اور پلوں وغیرہ کے نشانات بھی لگا دئے۔ گویا کھدائی کے سوا ہر چیز تیار ہو گئی۔

اب دیکھئے کہ کھدائی کس طرح عمل میں آئی۔ اس علاقے میں کپاس

غزل

شفق جالپوری

ہو گیا نقش دل پہ تیرا نام ÷ بس محبت کا مل گیا انعام
حسن ہر چند بے نیاز سہی ÷ عشق کو لیکن اپنے کام سے کام
ہم کو مرنا تھا عشق کے ہاتھوں ÷ حسن نے مفت لے لیا الزام
رنگ اب اور ہے زمانے کا ÷ کب تلک! یہ حدیث بادہ و جام
اب نہ منزل نہ راہ منزل ہے ÷ عشق میں پیش آ گیا وہ مقام
لاکھ طوفاں ہیں اور سفینۂ زیست ÷ ایک دل اور صد ہزار آلام
جس میں کیف و سرور و سوز نہیں ÷ وہ مئے شوق مطلقاً ہے حرام
نظروں نظروں میں کہہ گئے سب کچھ ÷ آنکھوں آنکھوں میں دے گئے پیغام
کسی رنگیں ادا کا صدقہ ہے ÷ ہم کہاں! اور کہاں یہ رنگ کلام
زلف مشکیں گھٹائیں ساون کی ÷ چشم مخمور یعنی بادہ بجام

تم چھپاتے تو ہو شفق لیکن
صاف غماز ہے یہ طرز کلام

خوب پیدا ہوتی ہے۔ سال بھر میں قریب قریب ایک مہینا ایسا ہوتا ہے کہ کھیتوں پر کوئی کام نہیں ہوتا۔ ایک بار ایسے ہی سال میں کچھ نہر کے کنارے کنارے سب لوگوں نے مل کر ایک بستی کی تعداد ایک لاکھ ڈیڑھ ہزار تھی۔ سات کلو میٹر لمبا کھودا گیا۔ دن بھر کام کیا جاتا تھا۔ شام کو انھیں سوویٹ یونین کے بہترین ثقافتی کھیل دکھائے جاتے تھے دن بھر تقریریں کرنے والے ایک گروہ سے دوسرے گروہ کے پاس جاتے اور انھیں ایک دوسرے سے کام کی مسابقت بتا کر اکساتے۔ اس طرح انھیں جذبہ مسابقت پیدا ہو جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا کام تین ہفتے میں ختم ہو گیا یعنی سوشلسٹ کسی نہر تیار ہو گئی جس نے اتنے بڑے بنجر علاقے کو زرخیز بنا دیا۔ بعد میں اس نہر میں اضافہ کیا۔ اسی طرح کئی بند اور نہریں اسی قومی اشتراک کی بدولت معرض وجود میں آئیں۔

جو لوگ ان کھیتوں میں کام کرتے ہیں عام طور پر ان کی کشتواری تنظیم ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہر گاؤں کے گرد جو زمین ہوتی ہے اسے ایک بڑا قطعۂ اراضی مان کر مشترک طور پر کاشت کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ اپنے منتظم کا انتخاب خود کرتے ہیں۔ ہر خاندان کو کچھ مویشی وغیرہ پالنے کی اجازت ہوتی ہے اور تھوڑی سی جداگانہ زمین کاشت کرنے کا بھی حق ہوتا ہے۔ مجھے ایک گاؤں دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں اپنا ہائیڈرو الیکٹرک اسٹیشن (بجلی گھر) تھا۔ اس کی بدولت ہر گھر میں بجلی موجود تھی۔ ازبکستان میں ترانوے گاؤں ایسے تھے جن کی بجلی اپنی تھی۔ لیکن اس چیز کو عام کرنے کے لئے بڑی مدت درکار ہے۔

مکانات وہاں گارے کے ہوتے ہیں اور گارا اس قسم کی آب و ہوا کے لئے کوئی بری چیز نہیں۔ مجھے چند مکانات کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ نہایت چھوٹے اور تاریک تھے لیکن میں نے وہاں جدید مکانات بھی دیکھے جن میں باقاعدہ صحن، پھل دار درخت اور ہوادار کمرے تھے۔ ان کے رخ عموماً شمال کی طرف تھے۔ اس سے انھیں دھوپ سے بچاؤ رہتا تھا۔ مکان کے ایک حصے میں مردانہ کمرے تھے اور دوسرے میں زنانہ۔ آجکل لڑکیاں بھی اسکول جاتی ہیں اور انھیں ایک گونہ آزادانہ زندگی بسر کرنے کا موقع مل رہا ہے لیکن ابھی تک کسی غیر مرد کو زنانہ کمروں میں جانے کی اجازت نہیں۔ آج سے چند سال پہلے تک عورتیں پردوں میں رہتی تھیں۔ یہ پردہ کیا تھا ایک عجیب وضع کا لبادہ نما برقع جسے لکڑی کے ایک ٹکڑے فریم کے ذریعہ سر سے چہرے پر لٹکایا جاتا تھا۔ سوویٹ حکومت نے کبھی پردے کی مخالفت نہیں کی حالانکہ ترکستان اور ایران میں ایسا ہو چکا ہے البتہ اشتمالی جماعت اور کمیونسٹ پارٹی پردے کے خلاف تبلیغ کرنے کی پوری پوری کوشش کرتی ہے۔ ایک نوجوان عورت نے مجھے بتایا کہ میں سب سے پہلی عورت ہوں جسے پردہ ترک کرنے کا فخر حاصل ہے۔ اس نے اس سلسلے میں مجھے کئی دردناک واقعات سنائے۔ پرانے خیال کے لوگ اس حرکت سے سخت برہم ہوتے اور بعض اوقات چہرہ ننگا کرنے والی لڑکی کو خفیہ طور پر ختم کر دیا جاتا۔

سوویٹ ایشیا بلاشبہ ترقی کر رہا ہے لیکن یہ لوگ ابھی تک بہت مفلس ہیں اور انھیں مغربی یورپ کے معیار تک پہنچانے کے لئے ابھی بہت عرصہ درکار ہے لیکن روس میں ان پسماندہ لوگوں کی امانت داری کے فرائض انجام دینے کے لئے حالات سازگار ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان دو کروڑ نفوس کی دیکھ بھال کے لئے روسیوں اور دیگر متمدن لوگوں کی تعداد کوئی سترہ کروڑ ہے جن میں سے اکثر برطانوی نوآبادیات کے لوگوں کے مقابلے میں بھی کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ سوویٹ یونین کے لئے افریقہ کے منطقۂ حارہ کی سی مشکلات نہیں ہیں۔ ان کے لوگوں میں سب سے زیادہ پسماندہ انتہائی شمال کے "اسکیمو" ہیں لیکن ان کی تعداد کچھ اتنی زیادہ نہیں۔ روس میں اس قسم کے لوگوں کی کثیر تعداد موجود ہے جو دور دراز علاقوں میں صنعتی کام اپنے ہاتھ میں لے کر زیادہ پسماندہ لوگوں کو اپنی حفاظت آپ کرنے کے طریقے سکھا سکتے ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ تمام سوویٹ یونین کا علاقہ زمین کا ایک ہی بڑا قطعہ ہے چنانچہ ہم ریل کے ذریعے ماسکو سے تاشقند چند روز میں پہونچ سکتے ہیں۔ اس سے ملک کو متحد کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ یہاں نسلی جھگڑے بھی نہیں ہیں کیونکہ پوری سوویٹ یونین میں صرف دو نسلیں ہیں یعنی یورپی اور منگولی۔ اگر کوئی انگریز جادو کے زور سے یکایک ماسکو پہنچ کر روسی لباس پہن لے تو اس کے چہرے کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ یہ روسی نہیں ہے۔ دوسری قوم ہو بہو چینیوں کی سی ہے لیکن وہاں کسی معاملے میں نسلی امتیاز کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ روسیوں کو ہر خوددار قوم کی طرح اپنے آپ پر ناز ہے لیکن ان میں جرمنوں جیسی "خودنمائی" کا رجحان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بنیادی طور پر صلح جو واقع ہوئے ہیں۔

لکھنے والوں سے

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ قلمی معاونین اس شرط کو ملحوظ رکھا کریں۔
(ادارہ)

ہندوستانی فلموں میں ڈرامانگاری

بدر العظیم

ابھی کل کی بات ہے کہ ہندوستان میں پہلی بولتی فلم "عالم آرا" بنائی گئی۔ عالم آرا میں بس خوبی یہ تھی کہ فلم تھی اور بولتی ہوئی۔ لیکن اس وقت کے شائقین اس سے زیادہ کچھ چاہتے بھی نہ تھے۔ اور یہ فلم ہر طرح مقبول خاص و عام ہوئی۔ یہ فلم دیکھنے والوں کے لئے ایک نیا ذریعہ دلچسپی بنا اور بنانے والوں کے لئے ایک نیا ذریعۂ آمدنی۔ اور فلمی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے آج کیا ایک زمانہ گذرنے کے بعد بھی کچھ کم دلچسپ نہ ہوگی۔

شروع ہونے کی دیر تھی کہ فلموں کا تانتا بندھ گیا۔ فلم دیکھنے والوں نے فلم بنانے والوں کے دل بڑھائے اور فلم بنانے والوں نے فلم دیکھنے والوں کے۔ سیناؤں میں طوطی بولنے لگا اور تھیٹروں میں اُلّو۔ راستہ میں کئی کئی تھیٹر چھوڑ کر لوگ سینما کی طرف بڑھنا شروع ہوئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ ان دنوں نہ صرف بمبئی۔ پونا۔ حیدرآباد۔ دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ کلکتہ وغیرہ میں بے شمار تھیٹر کمپنیاں قائم ہو گئی تھیں بلکہ ہندوستان کے بہت سے چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی تھیٹر عام ہو گیا تھا۔ اور دوسری طرف سینما بھی تھیٹر سے کچھ کم دلچسپ جگہ نہ تھی۔ سینما کے دروازوں پر لوگوں کے استقبال کے لئے مستقل مسخرے رکھے جاتے تھے۔ اور چونکہ مشین ایک ہی ہوتی تھی اس لئے ایک ریل ختم ہونے کے بعد دوسری ریل چڑھانے میں وقت لگتا تھا۔ اس لئے سامعین کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے ہر ریل کے خاتمہ پر اسٹیج پر ناچ وغیرہ کا باقاعدہ انتظام رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ فرسٹ کلاس اسکرین سے نیچے ہی ملا ہوا ہوتا تھا۔ اور اوپر گیلری میں وہ لوگ بیٹھتے تھے جو "خرچ اور بالا نشیں" کے قائل تھے۔ یہاں بھی سامعین کے حقوق کا کافی خیال رکھا جاتا تھا۔ اور ان کے اصرار پر ناچ وغیرہ ہر بار مکرر سہ کرر دہرانے میں تکلف نہ کیا جاتا تھا۔ فلم تو یوں کچھ ایسی لمبی نہ ہوتی تھی مگر اس طرح دیگر لوازمات سے وقت تھیٹر کی نسبت کچھ کم نہ لگایا جاتا تھا۔

زمانے کا مذاق بدلنا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ وقت خواہ مخواہ زیادہ ضائع ہونے کا خیال آنے لگا۔ ادھر لوازمات میں کمی آنی شروع ہوئی۔ ادھر فلموں میں دلچسپی کی زیادتی۔ مسخرے بجائے باہر کے فلم میں آنے لگے اور ناچ بجائے اسٹیج کے اسکرین پر پہنچ گیا۔ اگلی کرسیاں پیچھے اور پچھلی کرسیاں آگے کی گئیں۔ بجائے بار بار وقفہ دے کر تسلسل قائم نہ رکھنے کے فلم لگاتار دکھانے کا انتظام کیا گیا بس ایک بار وقفہ دیا جانے لگا۔ وہ بھی کسی مجبوری سے نہیں بلکہ سامعین کے اکتا نہ جانے کے خیال سے۔

اس کے بعد فلم کمپنیاں کھلنے کی باری آئی اور انھوں نے بھی رفتار دکھائی۔ لیکن وقت ڈراموں کی کمیابی تھی۔ جو کچھ قدیم ڈرامے موجود تھے وہ اسٹیجوں پر بار بار کھیلے جا رہے تھے۔ اور وہ ڈرامے جو کمپنیوں کے منتظم خود لکھتے تھے کامیاب نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ اول اول تو کھیلے ہوئے ڈرامے ہی پھر فلم میں دہرائے گئے لیکن یہ کب تک ممکن تھا۔ اس لئے ڈرامے لکھنے کے لئے اس زمانے کے پڑھے لکھے لوگوں کو ملازم رکھنا شروع کیا۔ پرانے ڈرامے پھر لکھے گئے اور ان میں کہیں کہیں تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ گجراتی، مرہٹی، بنگالی ڈراموں کا اردو ہندی میں ترجمہ کیا جانے لگا۔ لیکن ایسے ترجموں کی زبان بس برائے نام ہی ان کی اپنی زبان سے بدلی ہوئی ہوتی تھی بلکہ مکالموں میں بھی ویسی ہی تک بندی کا خیال رکھا جاتا تھا جیسے کہ اسٹیج پر بولے جاتے تھے یعنی۔ باوزن اور تلے ہوئے مکالمے ڈرامے کی جان سمجھے جاتے تھے۔ فلم کمپنیوں کو علاوہ ازیں چارہ نہ تھا کہ شُدبُد زبان جاننے والوں کے جیسے بھی برے بھلے ڈرامے ملیں انھیں فلمائیں۔ اور دیکھنے والے بھی اس کی زحمت نہ کرتے تھے کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ سب سے بڑا معیار دلچسپی تھا اور اس کے ساتھ گانے سونے پر سہاگے کا کام کرتے تھے۔

ہر فن کی ترقی اس کی ضرورت پر مبنی ہوتی ہے۔ زمانے نے کروٹ بدلنی شروع کی۔ رفتہ رفتہ سمجھدار ڈائرکٹر میدان میں اترنے لگے اور ڈرامانگاری بھی اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں نے شروع کی۔ لیکن یہاں اگر ڈرامانگار اور ڈائرکٹر دونوں یک زبان ہو کر ایک ہی اسٹیج پر کامیابی کے ساتھ نہ آسکے۔ اگر ڈائرکٹر پرانی روش سے ہٹ کر نئے راستہ کی جستجو کرتے تو ڈرامانگار ان ہی خوبیوں کو ڈرامے کی جان سمجھتے۔ اور اگر ڈرامانگار ہمت کر کے ڈرامے کو نیا رنگ دینے کی کوشش کرتے تو ڈائرکٹر اس کے کامیاب ہونے میں شک کرتے۔ وجہ یہ تھی کہ یہ بیچارے ڈرامانگار نہ تو ڈرامانگاری کے فن سے واقف تھے اور نہ زبان و بیان کی خوبیاں سمجھتے تھے۔ چنانچہ نہ تو وہ خود اپنے نئے ڈرامے لکھ سکتے تھے اور نہ غیر زبانوں کے عمدہ ڈراموں کے اپنی زبان میں اچھے ترجمے کر سکتے تھے۔ دوسری طرف ڈائرکٹر بھی ظاہری دلچسپی پیدا کرنے کو فنی خوبی سمجھتے تھے۔ اور پرانی روش کو بدل کر نئی چیز پیش کرنے میں مالی نقصان ہو جانے کا خیال پیش نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ فلمی کہانی اس وقت تک صحیح معنوں میں ڈراما کہلانے کی مستحق نہ تھی۔

وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اب اور تعلیم یافتہ۔ فن کو سمجھنے والے۔ باہمت ڈائرکٹروں نے قدم بڑھایا اور آن کی آن میں فلمی دنیا کی صورت بدل گئی۔ قابل ڈائرکٹروں نے اندازہ کر لیا کہ فلم صرف تفنن مذاق یا جسمانی کرتب یا مدد کے کرتب دکھانے کا ذریعہ نہیں بلکہ اس میں ادبی اور فنی خوبیاں جھلک رہی ہیں۔ فلم علاوہ ظاہری دلچسپی کے جذبات لطیفہ کے لئے بھی باعث لطف بن سکتا ہے۔ یہ بھی خیال کیا جانے لگا کہ ہر فن کی ترقی کی صورت یہی ہے کہ ترقی یافتہ اقوام کی نقل کی کوشش کی جائے۔ اور علاوہ ازیں چارہ نہیں کہ اول اول غیر زبانوں کے اچھے ڈراموں کے اچھے ترجمے کئے جائیں چنانچہ فن کو سمجھنے والے زبان دان ادیبوں کی تلاش ہوئی جو کم از کم غیر زبانوں کے ڈراموں کو بعینہٖ تمام خوبیوں کے ساتھ اپنی زبان میں بدل سکیں۔ ڈراما نگاروں نے ڈائرکٹروں کو سہارا دیا اور ڈائرکٹروں نے ڈراما نگاروں کو اور دونوں دست بدست ترقی کے زینہ پر چڑھنے لگے۔ دونوں نے فن کو اپنانا شروع کیا۔ ادھر پلاٹ بنا ادھر کیپال گندلا۔ ادھر باغبان تیار ہوا ادھر باغی سپاہی اور فلمی دنیا کی فضا ہی بالکل بدل گئی۔

ڈراما نگاروں اور ڈائرکٹروں کا باہم اتفاق اور کامیابی نہ محض ان کے ہم مشرب اشخاص کے لئے باعث ترغیب ہوا بلکہ اس نے ایک حد تک سامعین کا مذاق بدل دیا۔ ان کو بتا دیا کہ فلم صرف دفع الوقتی کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ بھی ایک صنف ادب ہے۔ ان میں باریکیوں اور خوبیوں کو سمجھنے کی صلاحیت کی بنیاد ڈال دی۔ چنانچہ اب وہ ذی علم اشخاص جو اب تک ڈراما نگاری کو مذاق یا بیرون ادب خیال کرتے تھے اس طرف راغب ہوئے اور ان اشخاص نے بھی جو اس میں ناکامیاب ہو کر بیٹھ رہے تھے پھر قلم اٹھایا۔ اور اصولی خوبیوں پر توجہ دینی شروع کی اور اس راستہ پر چلنا شروع کیا جس نے دوسری اقوام کو ترقی کی راہ دکھائی۔ چنانچہ ہر چند کہ یہ درست ہے کہ ہماری فلمی دنیا ابھی عالم طفلی سے گزر رہی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کل کی بنی ہوئی فلموں جتر لیکھا اور پکار نے اپنی عمدگی کو منوا لی اور آنے والی دنیا بھی جب دیکھے گی تعریف لکھے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ ہر عمدہ اور شاندار کامیابی آہستہ آہستہ ہوا کرتی ہے اس لئے اگر ہماری فلم سازی نے اپنی فنی حیثیت منوانے میں وقت لیا تو اسے لینا چاہئے تھا لیکن اس کامیابی کا سہرا ڈراما نگار اور ڈائرکٹر دونوں کے سر ساتھ ساتھ بندھا۔

آج ہمارے ڈراما نگاروں اور ڈائرکٹروں کو خوش ضرور ہونا چاہئے مگر خاموش ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہئے۔ دونوں کو اپنی اپنی قابلیت اور محنت سے ترقی کی رفتار گھٹنے نہیں دینی چاہئے۔ ان کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے کہ جلد از جلد ہماری فلمیں ڈرامائی اصولوں کو اپنا لیں اور تماشہ کا صفت سے نکل کر حقیقت نمائی کا ادبی درجہ حاصل کر لیں۔ اور ہماری کل کی فلمیں موضوع اور پلاٹ کی دلچسپی۔ کردار اور سیرت نگاری۔ اور برجستہ و برمحل مکالموں کی خوبیوں سے پر ہوں۔

ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ اب ہمارے موجودہ ڈائرکٹر فلم کمپنیوں کے منتظم فلموں کا معاوضہ بڑھانے میں بہتری کوششوں سے کام لے رہے ہیں۔ قابل ادیبوں سے ترجموں میں مدد لی جا رہی ہے اور عمدہ ڈراموں کو فلمانے کی کوشش ہو رہی ہے لیکن ذرا سی دیر کو بھی اس خیال سے ہٹنا چاہئے کہ اچھے ڈائرکٹر اچھے ڈراما نگاروں کے بغیر یا اچھے ڈراما نگار اچھے ڈائرکٹروں کے بغیر ساتھ دئے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ دونوں یک رائے ہو کر محنت کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری فلم سازی بہت جلد دوسری ترقی یافتہ اقوام کے ہم پلہ ہو جائے۔ ضرورت اس کی ہے کہ فلم کمپنیوں کے منتظم۔ قابل ڈائرکٹر۔ ادیبوں۔ آرٹسٹوں اور فوٹوگرافروں کو دوسرے ممالک میں بھیجیں تاکہ وہ کہنہ مشق کمپنیوں کا معائنہ کریں اور فلم سازی کی فنی حیثیت کا مطالعہ کریں۔ اور واپس آکر اپنی قابلیت کا اسکرین پر مظاہرہ کریں اور پھر اپنی کامیابی سے ان کی کامیابی کا مقابلہ کریں۔ یہ مانا کہ یہیں وہ کامیابی فوراً حاصل نہیں ہو سکتی لیکن کوشش کی جائے تو آج نہیں کل ہماری کوششیں ضرور بار آور لائیں گی۔

ہر دور میں ہر فن کی کامیابی ایک حد تک اس دور کے روٴسا کی ذرہ پروری کی وجہ سے ہوا کرتی ہے۔ ہمارے ملک کا گوشہ گوشہ ذی عزت اور با مذاق اشخاص سے بھرا ہوا ہے۔ اگر یہ فلمی دنیا میں دلچسپی لینا شروع کریں جیسا کہ اور ملکوں میں رواج ہے تو ہماری فلم سازی کا معیار دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگے۔ اگر سالانہ مقابلہ ہوا کرے اور ادبی و فنی لحاظ سے جو فلمیں اول اور دوم آیا کریں ان میں محنت کرنے والوں کو انعام وغیرہ دیا جانے لگے تو یہ نہ محض ایک دلچسپ مشغلہ بن جائے بلکہ ہمارا ملک اس فن کی ترقی میں چند ہی دنوں میں اور ممالک سے پیچھے نہ رہے گا۔

اگر ہمارے معیاری فلمی رسالے فلم کے مختلف پہلوؤں پر برابر مضامین شائع کر رہے ہیں لیکن انھیں یہ بھی چاہئے کہ وہ سامعین کو ہر اچھی فلم پر بے دھڑک تنقید لکھنے کی ترغیب دیں اور ان کے تنقیدی مضامین اپنے رسالوں میں چھاپنے کا مستقل انتظام کریں۔ تاکہ دیکھنے والوں میں بھی فنی خوبیوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ ہمارے ادبی رسالے بھی اگر ڈراما نگاری پر اچھے مضامین شائع کریں تو ایک طرف تو ادب کی خدمت ہو گی اور دوسری طرف عوام پر ڈرامے کی باریکیاں سمجھنے کا مادہ پیدا ہو گا۔ اس طرح اگر ادبی اور فلمی رسالے دست بدست کوشش کریں تو بہت جلد ہمارے ملک میں اچھے ڈراما نگار پیدا ہو سکتے ہیں اور یہ صنف ادب بھی جو اب تک تاریکی میں پڑی ہے اور زیادہ دن تاریکی میں نہ رہ سکے گی۔

بازی گر

فیض

افراد

(۱) بازی گر (۲) رمضانی - ایک تماشبین -
(ڈگڈگی کی آواز سے شروع کیا جائے)

بازی گر: حضرات! اب میں آپکو تاش کے وہ چند عجیب کھیل دکھاتا ہوں جن سے آپ کی عقل دنگ رہ جائیگی - آپ نے غور سے تو دیکھے ہونگے لیکن ہاتھ کی جو صفائی میں پیش کرتا ہوں اس کی مثال نہیں ہے - (ڈگڈگی کی آواز) اچھا - آپ حضرات ایک ایک قدم پیچھے ہٹ جائیں - (مختلف قدموں کی آواز) ہے کوئی نوجوان جو میرے ساتھ کھیل میں حصہ لے - تم آجاؤ میاں - کالی ٹوپی والے! - بھلا کیا نام ہے تمہارا؟

رمضانی: - رمضانی -

بازی گر: - بہت خوب! - کیا کام کرتے ہو میاں رمضانی؟

رمضانی: - کام کاج کیا - ابھی تو چوتھی جماعت میں پڑھتے ہیں - والد کی جو ا کھاتے ہیں -

بازی گر: - کیا کہنے - بہت ہونہار معلوم ہوتے ہو - آتی ربا؟ علاوہ چوتھی جماعت - خیر - ذرا دیکھو تو میرے ہاتھ میں کیا ہے؟

رمضانی: - تاش کی گڈی ہے -

بازی گر: تاش کے پتے پہچانتے ہو؟

رمضانی: - اچھی طرح -

بازی گر: - چڑی تن کا غلام دیکھا ہے -

رمضانی: - جی ہاں آپ کھڑے تو ہیں میرے سامنے -

(ناظرین کا قہقہہ)

بازی گر: - بہت معقول ہو - (تاش پھینٹنے کی آواز) اچھا اس گڈی میں سے ایک پتا لے لو -

رمضانی: - معاف کیجئے - میرے پاس اپنی بہت سی گڈیاں موجود ہیں - مجھے کسی اور پتے کی ضرورت نہیں ہے -

بازی گر: - اوہو - میرا مطلب ہے کہ ایک پتا نکال کر دیکھو اور گڈی میں رکھ دو - (تاش پھینٹنے کی آواز)

رمضانی: - آخر اس سے فائدہ - یہ بھی کوئی کمال کی بات ہے

بازی گر: - کیوں نہیں - تم ایسا کرو تو سہی - میں فوراً بتادونگا کہ تم نے کون سا پتا نکالا تھا -

رمضانی: - اچھا تمہاری مرضی - لیکن یہ تو بتاؤ کہ کس شکل کا پتا نکالوں -

بازی گر: - (ڈگڈگی بجا کر) جو تمہاری مرضی ہو - کسی رنگ کا کوئی پتا -

رمضانی: - پان کی بیبی نکال لوں - یا اینٹ کا بادشاہ؟

بازی گر: - جو تمہیں پسند ہو - مجھ سے مت پوچھو -

رمضانی: - اچھا تو یہ تاش کی گڈی ذرا مجھکو دیدو - مجھے حکم کا یکہ بہت پسند ہے - چین چھپی میں سب سے پہلی چال اسی کی ہوتی ہے

بازی گر: - پھر وہی غلطی - (تاش پھینٹنے کی آواز) میرا مطلب ہے کہ پتا چھپا کر اس طرح نکالو - کہ میں اسے نہ دیکھ سکوں -

رمضانی: - اچھا تو تم آنکھیں بند کر لو - میں ایک پتا نکال کر پھر گڈی میں رکھ دونگا -

بازی گر: - ہاں یہ ٹھیک ہے - (تاش پھینٹنے ہوئے) لو صرف ایک پتا نکالنا -

رمضانی: - جی نکال لیا - اور یہ لو - رکھ بھی دیا -

بازی گر: - اچھا میاں رمضانی - ذرا دائیں ہتھیلی منہ کے سامنے تو پھیلاؤ - اور زور سے کہو "میرے پتے آجا"

رمضانی: - یہ بعد میں کہوں گا - پہلے سب پتوں کو پھینٹ لو کیونکہ پھینٹے بغیر بتانا آسان ہے - میرا پتا سب سے اوپر رکھا ہوا ہے -

بازی گر: - ارے رے رے - غضب کرتے ہو یار - میں نے کہا تھا کہ گڈی کے بیچ میں کہیں رکھ دو -

رمضانی: - اچھا پھر سہی - (چند قدموں کی ایسی آواز گویا لوگ چلا جانا چاہتے ہیں)

بازی گر: - اجی صاحب! ذرا ٹھہرئیے - اس چھوکرے نے تو میرے کھیل کا ستیاناس کر دیا - واللہ ایسے ایسے کمالات دکھاؤنگا - کہ آپ حیران رہ جائینگے - (ڈگڈگی بجاکر تاش پھینٹتا ہے) لو میاں رمضانی! دیر نہ کرو - جلدی سے ایک پتا نکال لو -

رمضانی: - آنکھیں بند کرو - ہاں ٹھیک - ایک دو - تین - کھول لو اپنی آنکھیں -

بازی گر: - بس اب ہاتھ پھیلاؤ - اور زور سے اپنے پتے کو آواز دو -

رمضانی: - آجا او میری اینٹ کی نہلی - آجا -

(لوگوں کا قہقہہ)

بازی گر: - لاحول ولا قوۃ - کاٹھ کے الو سے بھی کا کام لیا پالا پڑا

رمضانی: - تم ہی نے تو کہا تھا کہ اپنے پتے کو آواز دو - بھلا نام لئے بغیر کس طرح آواز دی جا سکتی تھی -

بازی گر: - تم یوں کہتے کہ میرے پتے آجا - (لوگوں کے قدموں کی آواز) ابھی تھوڑا ذرا ٹھیرئیے -

رمضانی: - اچھا - تم کہتے ہو تو اسی طرح آواز دے لونگا -

بازی گر: - لو جلدی سے نکالو پتا - اور اب کوئی غلطی نہ کر بیٹھنا - خدا کی قسم! عجیب ہی احمق انسان سے پالا پڑا ہے -

رمضانی: - اس میں کیا شک ہے لیکن پھر بھی تم سے کم احمق ہوں -

(لوگوں کا قہقہہ)

بازی گر: - اچھا اب باتیں نہ بناؤ - جلدی سے پتا نکال لو -

رمضانی: - بہت خوب آنکھیں بند کرو - دیکھنا مت - ایک دو - تین - بس کھول لو آنکھیں -

بازی گر: - (ڈگڈگی بجا کر) غور کیجئے مہربان میری آنکھیں بند تھیں - مجھے بالکل معلوم نہیں کہ کون سا پتا نکالا اور گڈی میں کس جگہ رکھا گیا لیکن پھر بھی ....

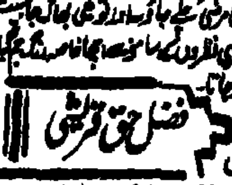
رمضانی: - اوہوں - معاف کرنا بھائی - تمہارے جلدی مچانے سے میں اس قدر گھبرایا کہ اس دفعہ پتا رکھنا بھول گیا - یہ دیکھو وہ میرے ہاتھ میں موجود ہے -

بازی گر: - ہت تمہاری ایسی تیسی - لاؤ - اب جلدی سے رکھ دو - (وقفہ پھر تاش پھینٹنے کی آواز) خبردار - اب کوئی حماقت نہ کرنا اور جب تک میں نہ دیکھوں پتے کا نام نہ بتانا -

رمضانی: - پتے کا نام - غضب خدا کا - وہ تو میں نے جھوٹ موٹ کا تھا رکھ دیا ہے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں - بتاؤنگا کیا خاک -

(لوگ چلے فروش ہو جاتے ہیں - قدموں کی چاپ)

بازی گر: - بھائیو - ذرا ٹھہرو - ایک منٹ اور ٹھہر جاتے - بابو جی کے ساتھ نہیں ٹھہرتے - اچھا تمہاری مرضی چلے جاؤ - اور تم بھی بھاگ جاؤ - تو ابھی یہیں کھڑا ہے - وہ جو میری نظروں کے سامنے سے بھاگا جا رہا ہے - ڈھیلی پاتا فرنگی بنا تھا -



کم بخت تو نے میری روزی میں لات ماری - اب کیا ہوئیں بازیاں - چار کا نا ایک پیٹ بھر دیگا -

رمضانی: - بھیا! قصور ہو تو معاف - بھلا تاش کا کھیل کس طرح دلچسپ ہو سکتا ہے - میری بات مانو تو بندر نچایا کرو - بلکہ بہت کچھ کمانے لگے - یہ کام تم نے بہت ترس کیا ہے - مجھے اپنا شاگرد بنا لو - تم ساتھ دو تو پیٹ بھر ہی مانگ کھائیں ہم -
تم ڈگڈگی بجاؤ تو بندر نچائیں ہم (ڈگڈگی کی آواز)

فضل حق قریشی

جرمن قوم کی حالت

میں حال ہی میں جرمنی سے واپس آیا ہوں۔ وہاں میں نے قریباً دو ہفتے انگریزی اور امریکی علاقوں میں گزارے۔ سب سے پہلا اور اہم ترین نقش جو میرے دل پر جما شہروں کی بربادی اور تباہی کا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس خوبی اور حسن اسلوبی سے رائل ایرفورس اور امریکن ایرفورس نے اپنے کام کو سر انجام دیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قریباً تمام بڑے بڑے شہروں کی کم و بیش دو تہائی عمارتیں یا تو بالکل برباد کر دی گئیں یا ان کو اس قدر نقصان پہنچایا گیا کہ وہ بالکل قابل رہائش نہیں رہیں۔ باقیماندہ ایک تہائی عمارتوں میں سے بہت سی خراب ہو چکی ہیں جن کی کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی ہیں اور جن کی چھتوں پر سے پانی ٹپکتا ہے۔

شہروں کی اس تباہی نے (اور انگریزی علاقہ تو زیادہ تر شہری ہے) ایک خوفناک رہائشی مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر کہیں رہائشی مکان ہیں بھی تو وہاں یہ حالت ہے کہ جس مکان میں پہلے ایک کنبہ رہتا تھا اب وہاں تین کنبے رہتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو تو عام طور پر بڑے بڑے شہروں میں کوئی جائے رہائش ملتی نہیں۔ ایک ایک کمرہ میں ایک ایک چھپر کے نیچے دس دس آدمی رہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض ان ہوائی حملوں سے بچانے والے ان گڑھوں میں مقیم ہیں جو ہمارے ہوائی حملوں سے محفوظ رہ گئیں زمین دوز گڑھوں میں رہنا گویا ایک قسم کا قبر میں رہنا ہے۔ جس میں نہ تو روشنی داخل ہو سکتی ہے اور جس میں نہ ہی سوائے دیواری تختے کے اور کوئی آراستگی کا سامان ہوتا ہے۔ اور جس میں نہ ہی کھانے پکانے کی کوئی سہولیت مہیا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود آج کئی مہینوں سے لوگ اس طریقہ سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کو ایسی حالت میں نہ جانے کب تک رہنا ہوگا۔

اس خوفناک رہائشی مسئلہ کے ساتھ ساتھ زندگی کی دوسری ضروریات، مثلاً خوراک، کوئلہ اور کپڑا، کی بھی کمی ہے۔ قدرتی طور پر خوراک کی ہر ایک چیز کا راشن ہو چکا ہے۔ اس راشنبندی کی بدولت خوراک اس مقدار سے جو ہم برطانیہ میں صحت کے لئے لازمی خیال کرتے ہیں نصف بھی نہیں ملتی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ چربی، گوشت، چینی اور پنیر کا راشن جو برطانیہ میں ایک ہفتہ کے لئے کم سمجھا جاتا ہے۔ ایک مہینہ کے لئے اکتفا کرے۔ حالات میں بہتری ہونے کی امید تو ہے لیکن جس کو ہم کافی اور تسلی بخش بہتری کہ سکیں وہ ابھی بہت [illegible] ہے۔ [illegible] جاڑے میں گرم استعمال کے لئے کوئلہ کا راشن دیتا تھا اور موجودہ تقاضوں کی بنا پر شاید جاڑے میں راشن ہوگا۔ جرمنی ایک سرد ملک ہے اور شہروں میں ایسے مکانات ہیں جن میں لوگ رہتے ہیں کافی عرصہ تک شیشہ نہ لگ سکے گا۔ عملی طور پر نہ صرف نئے کپڑے نہیں بن رہے بلکہ پرانے کپڑے پھٹے جاتے ہیں۔ اگلے جاڑے میں یا تو بہت سے بچوں کو ننگے پاؤں برف میں سے گزر کر اسکول جانا ہوگا یا اسکول چھوڑنا ہوگا۔ باقی ہر ایک چیز مثلاً صابن اور دوا دارو کی چیزیں نہایت کم مقدار میں میسّر ہوتی ہیں۔

بے شک کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو صرف راشن شدہ خوراک پر گزارا نہیں کرتے اور وہ کر بھی کس طرح سکتے ہیں۔ انگریزی علاقہ میں تو قریب قریب ہر ایک چیز کی کمی ہے۔ گرد و نواح کے دیہاتوں میں قدرتی طور پر خوراک آسانی سے اور زیادہ مقدار میں ملتی ہے۔ شہروں سے کارکنوں کی غیر حاضری کا باعث ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہفتہ میں دو تین روز خوراک کی تلاش میں دیہات میں پھرتے ہیں لیکن ہر ایک شخص کے لئے یہ غیر ممکن ہے۔ بعض شخص خاصکر تن تنہا ضعیف آدمی شہروں میں بھوکے مرتے ہیں۔ دیہاتوں میں جہاں خوراک زیادہ ملتی ہے وہاں رہائشی مکان بھی تباہ نہیں ہوئے۔ لیکن ایک دیگر سبب کی بنا پر وہاں بھی مکانوں کی قلت ہے۔ انگریزی علاقہ کی معمولی آبادی پناہ گزین اور دوسرے ممالک سے منتقل شدہ اشخاص کی آمد کی وجہ سے پہلے کی نسبت دوگنی ہو گئی ہے۔ پناہ گزین سے مراد وہ جرمن لوگ ہیں جو جرمنی کے دیگر حصوں سے یا جرمنی کے پڑوسی ممالک مثلاً پولینڈ اور چیکوسلاواکیہ سے یا تو بھاگ کر آئے ہوئے ہیں یا وہاں سے نکالے گئے ہیں۔ منتقل شدہ سے ایسے لوگ مراد ہیں جو جرمن قوم سے تعلق نہیں رکھتے لیکن کسی وجہ سے اپنے گھروں کو لوٹ نہیں سکتے۔ ایسے پناہ گزین اشخاص لاکھوں کی تعداد میں اپنے گھروں سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور انھوں نے جرمنی کی اپنی حالت کو اور بھی پیچیدہ کر دیا ہے۔

اگر آج کوئی جرمنی کو جا کر دیکھے تو اسے سخت صدمہ ہو گا۔ آج جرمنی میں ہر طرف مصیبت ہی مصیبت نظر آتی ہے۔ کیا جسمانی قریباً کی کمی۔ کیا بھوک اور سردی اور کیا رہائشی مکانوں کی قلت۔ ایسی بیچارگی کی حالت چھائی ہوئی ہے کہ کیا بچے اور کیا بوڑھے سب ما جاتیں۔

پریم چند کھنہ

بیکاری عام ہے۔ سائنسدان اور فنکار یا تو اپنے وطن کو واپس جانہیں سکتے یا جانے سے ڈرتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہونہار نوجوان بھی ہیں جن کے لئے یونیورسٹی کے دروازے بند ہوگئے ہیں کیونکہ وہ لڑکپن میں نازیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے ہی جانگاہ نظارے اور بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کنبے ایسے ہیں جن کے افراد ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں۔ لاکھوں ایسے ہیں جن کی عورتیں اور مائیں جنگی قیدی ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں ایسے خاوند اور بیویاں ہیں جو جرمنی، پولینڈ، یوگوسلویا اور بالٹک ریاستوں سے تعلق رکھتی ہیں اور جنہوں نے سالوں سے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں اور نہ ہی وہ یہ جانتے ہیں کہ ان کے ساتھی زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

مجھے اس بات کا کامل احساس ہوا کہ اپنا کام کرنے سے کس قدر خوشی حاصل ہوتی ہے جب میری ملاقات لفٹوائی کیمپ میں خوش اور خرم لوگوں سے ہوئی۔ وہ ڈاکٹر اور ایک نرس اپنے ساتھیوں کی صحت کے نگران تھے۔ وہ ایک نوزائیدہ بچے کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ بچہ ایک چادر میں جو ہاتھ سے کاڑھی ہوئی تھی لپٹا ہوا تھا۔ خانگی محبت سے جو خوشی پیدا ہوتی ہے مجھے اس کا احساس تب ہوا جب میں وہ ہمبرگ کوٹھریوں سے جن میں اکیلی اکیلی عورتیں نہایت بری حالت میں رہتی تھیں۔ ایک تیسری کوٹھری میں گیا جہاں خاوند اور بیوی اکٹھے رہ رہے تھے۔ وہاں ہم نے ایک نئی یعنی انسانی فضا پائی۔ میں نے ایک مکوحہ جوڑے سے گفتگو کی جن کے گھر کی جسامت صرف آٹھ مکعب فٹ تھی اور جس میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی سامان۔ وہ رات کا چوکیدار تو دیواری تختے پر آرام کر رہا تھا اور اس کی بیوی اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ پوچھنے پر دونوں کہنے لگے کہ ہم گذارہ کر رہے ہیں۔

اگرچہ جرمنی کی سیر ان دنوں ایک جانگاہ تجربہ ہے تاہم ملک (جرمنی) کی حالت بالکل مایوس کن نہیں ہے۔ حالات اس بات کے شاہد ہیں کہ انسانی فطرت کس قدر حیرت ناک تحمل اور برداشت کی طاقت رکھتی ہے۔ ایک انگریز میڈیکل افیسر نے مجھے بتلایا کہ اگرچہ تپ دق کے پھیل جانے سے خطرہ کے آثار نمایاں ہوگئے ہیں، لیکن جرمنوں کی صحت اچھی ہے، گو یہ بات بظاہر غیر معقول سی نظر آتی ہے، وہ غیر معمولی طور پر صاف ستھری اور باقاعدگی پسند قوم ہے، تمام یونیورسٹیوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور وہ طالب علموں سے بھرپور ہیں۔ کتابوں کی مانگ ویسی ہی شدید ہے جیسی خوراک کی۔ میں نے سامعین کے ہجوم دیکھے جو میری معاشرتی سلامتی اور مستقل روزگار کے عنوان پر تقریر سننے کے بیحد شائق تھے۔ میرے سے انھوں نے بہت معقول سوال کئے۔

ان موجودہ جانکاہ حالات کے پس پردہ ہٹلر کی بارہ سالہ حکومت کو جس میں سے ابھی نکلے منظر ہے۔ اگر آپ کسی تجارتی یونین کے لیڈر سے بات کریں تو وہ آپ کو بتلائے گا کہ اگرچہ بظاہر طور پر صحت مند نظر آتا ہے در اصل اس کی صحت اس قدر بگڑ گئی ہے کہ سدھر نہیں سکتی کیونکہ سیاسی قید خانے میں لوگوں نے اس کے جسم کو خوب کچلا تھا۔ اکثر کیمپ میں عورت بھی دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایک کمرہ میں چار چار کنبے رہتے ہیں اور دو دو پردے برائے نام لگے ہوئے ہیں۔ اس سے پوچھا کہ تمہارا خاوند کہاں ہے تو جواب ملا کہ اب تو میرے پاس ہے۔ لیکن تین سال تک ایک ممنوع اخبار کو گھر میں رکھنے کی وجہ سے ہٹلر نے اس کو تین سال کی سزائے قید دی۔ ایک کیمپ میں ایک عورت بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس سے پوچھا کہ یہ بچے تمہارے ہیں تو اس نے جواب دیا۔ نہیں۔ میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔ میرا خاوند ایک انجینئر تھا جس نے نازی پارٹی میں ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہماری شادی کے بعد ہی وہ اس کو سیاسی قید خانے میں لے گئے۔ اور تین مہینے کے بعد مجھے بذریعہ ایک خط کے اس کی موت کی خبر ملی۔ کیا نازیوں کے ستائے ہوئے کیا دوسرے، سب اسی قسم کی مصیبت میں گرفتار ہیں۔

انگریزی علاقہ کی حالت بہت تشویشناک ہے۔ یہ اس لئے کہ اگرچہ آج لڑائی کو ختم ہوئے پندرہ ماہ ہو چکے ہیں لیکن بہتری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس حالت کو بہتر بنانے کے لئے میں یہاں کوئی تفصیلی تجویز پیش نہیں کر سکتا جس سے زیادہ مقدار میں کوئلہ، خوراک اور دیگر روزمرہ کے استعمال کا سامان مل سکے، رہائش کا خاطر خواہ انتظام ہو سکے، دنیا کے باقی حصوں کے ساتھ ذرائع آمد و رفت مہیا ہو سکیں اور مصیبت زدہ لوگ باقاعدہ زندگی بسر کر سکیں۔ لیکن اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں چند اخلاقی نتائج پیش کرنا چاہتا ہوں پہلا اخلاقی نتیجہ شہروں کی مکمل تباہی سے پیدا ہوتا ہے۔ گھر بار، دوکانیں، اسکول، گرجے، گھر، ہسپتال، لائبریریاں، تاریخی اور کئی عمارتیں جو ایک زیادہ مہذب زمانہ کی یادگار ہیں سب ٹوٹی پھوٹی مٹی کا ڈھیر بنی پڑی ہیں۔ یہ اچھا ہوا کہ جرمنوں نے جنہوں نے دوسرے ممالک کو اپنی وحشیانہ جنگ کا شکار بنایا خود اپنے ہی ملک میں موجودہ زمانے کی جنگ کے نتائج کا مشاہدہ کیا۔ چند مجرم لیڈروں کے ماسوا تمام جرمنوں کو اسے انصاف کی رو سے کافی سزا سمجھنی چاہئے۔ ہماری غرض ہے کہ اب ہم سزا کا خیال چھوڑ کر ان کی بہتری کے متعلق سوچیں۔

دوسرا اخلاقی تجربہ ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں یہ ہے کہ
چاہئے کہ جرمنی کے انگریزی علاقہ کو ایسا اقتصادی زندگی کا نمونہ
بنایا جائے کہ وہاں کے لوگ ... نہیں سکتے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ
عمدہ نتائج جن کے لئے ہم نے لڑائی لڑی بحال رہیں تو ہمیں وہاں ٹھہرنا
ہوگا۔ اور یقیناً ایسا بندوبست کرنا ہوگا جس سے کہ اہل جرمنی دوبارہ
لڑائی کا جھنڈا بلند نہ کرسکیں اور جب تک کہ وہ اور باقی قومیں بھی
لڑائی کا خیال ہی نہ چھوڑ دیں ہم جرمنی میں اپنے موجودہ پروگرام جس کا
مدعا جرمنی کو مفلس کر دینے کا ہے بغیر کافی خرچ کرنے کے قائم نہیں رہ سکتے۔
اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ دو کروڑ جرمن ہمارے پنشن خوار بنے رہیں،
بھوکے مریں اور ہم سے نفرت کرتے رہیں تو ہمیں چاہئے کہ جرمنی کے
برطانوی علاقے کی درآمدی پیداوار بڑھانے کی اتنی ہی کوشش کریں
جتنی خود برطانیہ کی۔

تیسرا اخلاقی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے علاقہ کو نفسیاتی طور پر کامیاب
بنائیں، وہاں کی آبادی کو امن چین کی زندگی بسر کرنے کا موقع دیں اور
ان کو دوست بنانے کی کوشش کریں۔ جولائی ۱۹۴۵ء میں پوٹسڈم کے
مقام پر خفگی اور گھبراہٹ کی وجہ سے سنہ ۱۹۴۱ء کے اٹلانٹک چارٹر کو
خیرباد کہا گیا۔ اس چارٹر میں ہمارے نصب العین یہ قرار دیئے گئے
تھے: ہر ایک قوم کے اندر مزدوروں کے حالات بہتر بنائے جائیں،
اقتصادی ترقی اور معاشرتی سلامتی کے حالات پیدا کئے جائیں، تمام
ملک، فاتح و مفتوح دونوں تجارتی لحاظ سے یکساں خیال کئے جاویں۔
ہر ایک قوم کو اس کی اقتصادی بہبودی کی خاطر ان اشیا کی ضرورت
ہے، مساوی بنیاد پر مہیا کی جائے۔ اس کے برخلاف پوٹسڈم میں ہم
نے جرمنی کے زندگی کے معیار کو کم، اس کی صنعت کو تباہ کرنے اور اس
کی تجارت کو چھین لینے کا تہیہ کیا۔ جب سے جرمنی نے ہتھیار ڈالے
ہیں، اتحادیوں کے عمل نے اٹلانٹک چارٹر کو ریاکاری کا نمونہ بنا دیا ہے۔

جرمن لوگوں نے اس بات کا ثبوت دے دیا ہے کہ ان میں کچھ
خوفناک صفات ہیں۔ لیکن ان میں صنعت و حرفت، حسن انتظام اور
خانگی محبت کی اعلیٰ صفات بھی موجود ہیں۔ علم موسیقی اور سائنس میں
وہ لاثانی ہیں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کی خوفناک صفات
کو نظر انداز کریں۔ ہمیں نازیوں کے ہاتھوں ستم رسیدہ لوگوں کو نہ
بھولنا چاہئے اور دوبارہ ان کو اپنی وحشیانہ ظلم اور فریب کو عمل
میں لانے کا موقع نہ دینا چاہئے۔

انجام کار برائی کو دور کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کی بجائے

غزل — خمار دہلوی

میں خود بھی سراپا جلوہ ہوں جلووں کو فقط دیکھا ہی نہیں
جب پھونک دے میری ہستی کو ایسا تو کوئی جلوا ہی نہیں

احساس نظر کے ساتھ مجھے احساس دل بھی حاصل ہے
ہر جلوہ ہے حسن ذات ترا مستور بھی ہے پیدا بھی نہیں

ان مدبھری آنکھوں سے دل کا انجام تصادم ہائے توبہ
اس طرح لٹی دل کی بستی جیسے کہ کبھی کچھ تھا ہی نہیں

حیرانی چشم شوق بھی شاید حسن میں تیرے شامل ہے
ہر جلوہ ہے مثل آئینہ حیراں تو نے مجھے دیکھا ہی نہیں

ہر چند نگاہیں حیراں ہیں وہ حسن تجلی عام تو ہے
اس دل کی بدولت ذوق نظر مشہور بھی ہے رسوا ہی نہیں

احساس طلب کا ہوش کسے، کہنے کو طلب بھی باقی ہے
کیا خاک لگے گا تیرا پتہ، اپنا تو پتہ ملتا ہی نہیں

اس دور سے پہلے بے کیفی بھی کتنی سرور آگیں ہے خمار
وہ درد نہ جانے کیا ہوگا جو درد ابھی پیدا ہی نہیں

نیکی کی جائے، انسانی مروت سے ظلم کی آگ کو بجھایا جائے، مطلق العنانی
کے بجائے جمہوریت قائم کی جائے اور ریاکاری کو دور کرنے کے
لئے خودداری اور عزت کا مادہ پیدا کیا جائے۔ ہمیں ماننا پڑیگا
کہ بچوں کو بھوکا رکھنے اور بوڑھوں کو سردی میں مارنے سے انسانیت
کا سبق نہیں سکھایا جاسکتا، نہ ہی سختی سے جمہوریت کا ریاکاری
کے طریقوں کو عمل میں لاکر ت کے اصول سکھانا ممکن ہے۔

آؤ ہم تمام اتحادیوں کو ایک دفعہ پھر اس بات پر آمادہ کریں کہ
پوٹسڈم کے معاہدہ کو خیرباد کریں اور اٹلانٹک چارٹر کے اصولوں
کو جرمنی سے سلوک کرتے وقت استعمال کریں۔ اگر اس کوشش میں
کامیابی نہ ہو تو ہمیں چاہئے کہ کم از کم جرمنی کے انگریزی علاقہ کو
اٹلانٹک چارٹر اور جمہوریت، رواداری، انصاف اور کفایت کے
برطانوی نظریوں کے مطابق منتظم کرنے کا فیصلہ کریں۔

نقد و نظر

کیا سنسار — مصنف جناب عشرت رحمانی۔ ناشر الہ آباد پبلشنگ ہاؤس۔ الہ آباد۔ سائز ۲۰×۳۰ کے ۱۹۴ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈھائی روپے۔ عشرت صاحب آل انڈیا ریڈیو میں ڈرامہ انچارج ہیں اور چونکہ اس محکمہ میں آنے سے پہلے بھی ایک ادیب تھے اس لئے ریڈیو ڈراموں کے ضمن میں ان کی تخلیقات کا ادبی و فنی معیار اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ بلند ہے۔ پیش نظر مجموعے میں ان کے ڈرامے شامل ہیں جو حزنیہ بھی ہیں اور مزاحیہ بھی۔ زبان اور عمل کے لحاظ سے فطری طور سب میں نمایاں ہے یعنی افراد تمثیل کے اقوال و افعال ان کے صحیح ماحول اور کردار کی ترجمانی کرتے ہیں۔ "دکھیا سنسار" اور "پریم دان" ٹیگور کے ڈراموں سے ماخوذ ہیں لیکن ان میں بھی ان کا انفرادی رنگ اپنی جھلک دکھا رہا ہے۔ "منکر ایک مصنف" پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ عشرت صاحب کی آپ بیتی ہی نہ ہو۔ اسے ختم کر لینے کے بعد بھی بیوی کا یہ مسلسل مطالبہ کہ گھر کے خرچ کے لئے ستر روپے دلواؤ، دماغ کے پردے پر منڈلاتا رہتا ہے۔ زبان و بیان میں اردو و ہندی کے مناسب امتزاج نے بڑی حلاوت پیدا کر دی ہے۔ کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔ امید ہے کہ ناشران کتب اگلے ایڈیشن میں اس کا لحاظ رکھیں گے۔

دیس سے باہر — مصنف: جناب آغا محمد اشرف۔ ناشر: شیخ غلام علی اینڈ سنز کتاب منزل لاہور۔ سائز ۲۰×۲۶ کے ۲۴۰ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈھائی روپے۔ "لندن سے آداب عرض" اور "پیرس کا لندن" پیش کر چکنے کے بعد اب آغا صاحب نے یہ تیسرا مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اسے موصوف کی یادداشت یا ایک قسم کی ڈائری کہا جا سکتا ہے۔ اس میں بھی ہندوستان سے باہر کے کوائف جمع ہیں۔ آٹھ نو سال ہندوستان سے باہر رہ کر انھوں نے سیر و سیاحت کا لطف خود ہی نہیں اٹھایا بلکہ اپنے تاثرات کو قلمبند کر کے دوسروں کو بھی استفادہ کا موقع دیا ہے۔ انگلستان والے مضامین کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دیس سے باہر اردو زبان کس قدر رائج اور مقبول ہے اور انگلستان کے مستشرقین نے اس کی ترقی کے لئے کیسی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ "سر ... کی ادبی زندگی" کا جائزہ، نیز جان گلکرسٹ اور جارج ... پر تحقیقی مقالے بہت قابل قدر ہیں۔ چند مضامین میں زمانۂ جنگ کے ... ایسے حالات شامل ہیں جن کا مطالعہ کسی دوسری جگہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ ... سے بھی یہ کتاب بڑی مفید ہے۔ ایران والے حصے میں کئی مضمون تاریخی اور ... کی اعتبار سے دلچسپ اور مفید ہیں۔ ایک مقالے میں حافظ کے مزار پر شراب لنڈھانے ... تو بہت ہی پر لطف ہے۔ ... کچھ بھولی بسری باتیں، موضوع کے اعتبار سے اس میں ... ہوتا تو اچھا تھا۔

BENGAL LAMENTING — مصنف: محترمہ فریدہ بیدی۔ ناشر: لائن پبلشنگ ہسپتال روڈ لاہور۔ سائز ۲۰×۳۰ کے ۸۰ صفحات۔ مجلد۔ انگریزی زبان۔ قیمت تین روپے۔ اس کتاب میں اس قحط عظیم کے تفصیلی حالات اور کچھ افراد و شواہد ... مقالات ہیں جو قحط بنگال ۱۹۴۳ء کے آخر میں جاتے جاتے ناگہانی کی صورت میں سارے مشرقی ہندوستان پر نازل ہوا تھا۔ محترمہ بیدی نے بنگال کے دیہاتوں میں جا کر صورت حالات کا جائزہ لیا اور جو باتیں اپنے مشاہدے میں نہ آ سکتی تھیں وہ دوسروں سے پوچھ پوچھ کر یادداشت میں محفوظ کر لیں۔ اس دوران میں ان کے مضامین مختلف اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ یہ کتاب انھیں مقالات و تصاویر کا مجموعہ ہے۔ اس میں عام حالات بیان کرنے کے ساتھ کہیں کہیں قحط کے اسباب و علل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر چند وہ مصیبت باشندگان بنگال کے سر سے ٹل چکی ہے لیکن اس کی یاد ابھی دردناک ہے اور دردناک رہے گی۔ اگر اس کتاب کا مقصد جیسا کہ بیان بھی کیا گیا ہے یہ ہے کہ لوگ متاثر ہو کر اتحاد عمل کی صورت پیدا کریں تاکہ ایسے حادثات کی بازگشت ممکن نہ ہو تو کہنا پڑتا ہے کہ اس کی قیمت باعتبار ... سے زیادہ نہ ہونی چاہئے تھی۔ اس کے برعکس ۸۰ صفحات کے تین روپے وصول کرنا ظاہر کرتا ہے کہ سماجی فلاح و بہبود کی بجائے ذاتی مفاد پیش نظر ہے۔ گویا بنگال کا قحط مصنفہ اور ناشر دونوں کے لئے نفع بخش ثابت ہوا۔ وہی مثل ہوئی کہ کسی کا گھر جلے اور کوئی ہاتھ تاپے۔

روح تبسم — مصنف ظریف الملک حضرت ظریف دہلوی۔ ملنے کا پتہ: ساقی بک ڈپو کھاری باؤلی دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰ کے ۱۹۴ صفحات۔ مجلد۔ قیمت دو روپے۔ اس دور رنج و محن میں جبکہ بہت سے روح فرسا سیاسی اور معاشی حالات کے ماتحت زندگی اجیرن اور وبال جان ہو گئی ہے لطف و مزاح کی باتیں دل بہلانے کے لئے بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ پھر اگر یہ باتیں کلام موزوں کی صورت میں جلوہ گر ہوں تو کیا کہنے۔ لہٰذا ظریف صاحب کے مزاحیہ کلام کا یہ مجموعہ برمحل ہونے کے باعث ایک ادبی اور روحانی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ ان غزلوں، نظموں اور رباعیوں وغیرہ میں بعض اشعار اتنے قہقہہ انگیز ہیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ انسان بھی ہنسی ضبط کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عہد جدید کے خاص موضوعات مثلاً جنگ اور راشننگ وغیرہ پر ان کا کلام اور بھی زیادہ مزا دیتا ہے۔ یوں تو ہر چیز اپنی جگہ خوب ہے لیکن صنعت الکن (ہکلاپن) کے ماتحت جو غزلیں لکھی ہیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ تحت اللفظ ہکلا کر دونوں طرح پڑھنے پر پورے وزن اور بحر میں رہتے ہیں۔ یہ خصوصیت آج تک کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ چند سلام اور نعت جو بالکل سنجیدہ ہیں اس مجموعے میں شامل نہ کئے جاتے تو اچھا تھا۔ شاید "مزا منہ کا بدلنے کے لئے" یہ التزام کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب خوب ہے ــــ اسے پڑھ کر روتوں کو ہنسی آئے گی۔

مانیں — مصنف جناب منور تجبز۔ ملنے کا پتہ: کتب خانہ علم و ادب، اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ سائز ۲۰×۲۶ کے ۱۴۴ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈیڑھ روپے۔ شاعری جذبات قلب کا آئینہ سمجھی جاتی ہے لیکن یہ قول سب سے زیادہ گیتوں پر صادق آتا ہے کیونکہ تصنع اور بناوٹ سے اس کا دامن بالکل پاک ہوتا ہے۔ پھر جس طرح ڈرامے اسٹیج پر کھیلے جاتے ہیں اسی طرح گیت گائے جانے کے لئے ہوتے ہیں۔ ترنم کی

فسح

فراوانی ان کا اسلوب [illegible] ہے۔ تبصرہ صاحب نے گیت [illegible]
جھک سائی طرح سے بھی طرح واقف ہیں بیکر عمر اس کے نیچے وہ ایسے لیے گیت کہہ ہی نہیں سکتے تھے ان کے گیتوں کا معیار عام فلمی گیتوں کے معیار سے الگ درجہ بلند ہے کاش وہ لوگ جو فلمی دنیا کے اس شعبے میں دخل رکھتے ہیں، ان گیتوں کو پڑھیں اور اندازہ لگائیں کہ وہ کچھ راستہ کی کس منزل میں اب تک [illegible] الماسطہ ہیں۔ اور آئندہ اس سطح سے ابھر کر آگے بڑھنا ان کے لئے کیونکر ممکن ہے تاثیر بیچ گیتوں کا مجموعہ ہے جن میں زبردست ترنم کے علاوہ زبان کا لوچ بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

گھریلو صنعتیں

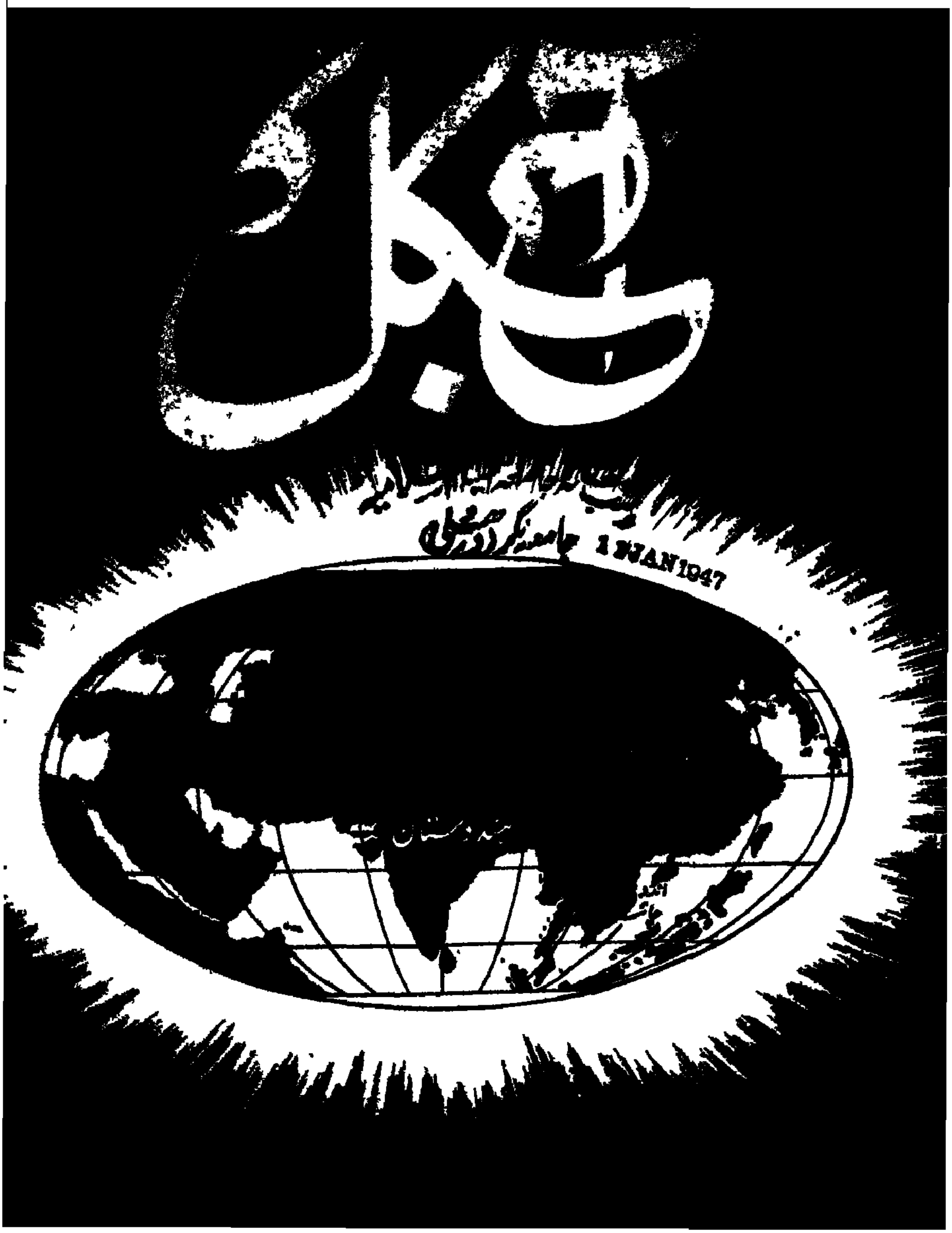
مصنفہ جناب اشفاق علی ایم اے بی ٹی۔ ملنے کا پتہ: اردو بک سٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔ ۱۳۰ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ہندوستان کی تقریباً اسی فیصدی باشندے دیہاتوں میں رہتے ہیں اور ان کا سب سے بڑا مشغلہ کھیتی باڑی ہے لیکن انھیں سال میں کئی مہینے مسلسل اور کبھی کبھی بیکار رہنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ کنبے کے افراد جب بڑھ جائیں اور کاشت کی زمین محدود ہو تب بھی کچھ لوگ فالتو ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے لئے زراعت سے الگ کوئی اور کام ضروری ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ایسی ہی صنعتوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے جو کام آ سکتے ہیں جن کو گھریلو طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اچار، مربے، چٹنیاں اور شربت بنانے کے علاوہ مرغیوں اور شہد کی مکھیوں کی پرورش اور تجارتی اعتبار سے ان کے رکھ رکھاؤ کے طریقے سمجھائے ہیں۔ دیہاتیوں کے علاوہ شہر والے بھی ان صنعتوں کو تجارتی یا ذاتی طور پر اختیار کریں تو یہ کتاب فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔

مست قلندر کا آپ بیتی نمبر

اس خاص نمبر میں بعض حضرات نے اپنی اور بعض نے دوسروں کی آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ صرف اول الذکر صورت کا اہتمام کیا جاتا تو کہیں زیادہ مناسب ہوتا کیونکہ دوسروں کی آپ بیتیاں تو ویسے بھی عام افسانوں میں شامل ہوتی رہتی ہیں۔ سید علی عباس صاحب حسینی، جناب ماہر القادری، جناب میرزا ادیب، کوثر صاحب چاندپوری اور ڈاکٹر کاظم حسین کے مضامین دلکش ہیں۔ (اکثر حضرات نے دوسروں کی آپ بیتی میں مبالغے سے کام لیا ہے۔) رئیس صاحب امروہوی کا اسم گرامی بھی لائق ذکر ہے۔ جو نصف درجن مضامین نظم و نثر کے ساتھ اس رسالہ کے ادارہ [illegible] جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ایکٹرسوں کی عکسی نقاشی تصویریں اور مختلف اشتہاروں نے بھی اس خاص نمبر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

دفتر رسالہ مست قلندر۔ لاہور سے طلب کیجئے

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین


آجکل
جامعہ نگر دہلی
JAN 1947
ہندوستان



سید سجاد حیدر یلدرم

اس شمارہ کے صفحہ ۶ پر سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مضمون یلدرم کی یاد میں ملاحظہ فرمائیے۔

آجکل

ماہنامہ دہلی
اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۴ | فہرست | ۱۵ دسمبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم
ایم۔ اے

ناشر
فضل حق قریشی
دہلوی

مدیران
بھگت سروپ گوہر
ایم۔ اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

رفتارِ زمانہ

لاہور کی بادشاہی مسجد

لاہور میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی تعمیر کی ہوئی بادشاہی مسجد امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں بوسیدہ اور بے رونق ہو چلی تھی کہ لوگوں کی توجہ اسطرف منعطف ہوئی اور وہ اس کی تجدید و مکرر تعمیر کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ مغل شہنشاہ کو اسکی تعمیر پر چھ لاکھ روپے خرچ کرنے پڑے تھے لیکن تب زمانے کا رنگ اور تھا اور ہر چیز سستی ملتی تھی۔ اب اس کی محض مرمت اور زیبائش پر تیرہ لاکھ خرچ ہو چکے ہیں اور دس لاکھ خرچ ہونے باقی ہیں۔ اس سلسلے میں پنجاب کے کسی بھی طبقے نے چندہ دینے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ سب سے زیادہ فیاضی مسلمان کاشتکاروں نے دکھائی۔ انھوں نے ایک انجمن بنا کر ہر شخص کی سالانہ آمدنی پر ایک اوسط رقم مقرر کی اور دل کھول کر اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔ اس انفرادی امداد کے علاوہ مرکزی حکومت، حکومتِ پنجاب اور حکومتِ نظام نے بھی مالی مدد کے علاوہ ماہرینِ فن کے مشوروں سے مستفیض فرمایا۔ تینوں حکومتوں کے چیف انجینئر یکجا جمع ہو کر اس کے بناؤ سنگھار پر غور کرتے رہے۔ بنیادی اعتبار سے کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی بلکہ اس امر کا خیال رکھا کہ اورنگ زیب کے زمانے میں جو مسالۂ تعمیر استعمال ہوا تھا، حتی الامکان وہی فراہم کیا جائے۔ چنانچہ دھولپور سے سنگِ سرخ، مکرانہ سے سنگِ مرمر اور شمال مغربی سرحد کے قبائلی علاقے سے ابرقی تعمیر کی سلیں منگائی گئیں۔ ۳۰۰ فٹ مربع وسیع صحن کی اینٹیں گھس گھسا کر ختم ہو چکی تھیں۔ انکی جگہ سلیں بچھا دی گئیں جس سے مسجد کی ظاہری رونق کو چار چاند لگ گئے۔ اورنگ زیبؒ کے انجینیروں نے کنکریلے چونے کو پیس کر چنائی کا گارا تیار کیا تھا۔ اب سیمنٹ نے اسکی جگہ لے لی۔ اسی طرح پتھروں کے جوڑ ملانے کے لئے لوہے کی بجائے تانبے کی پتیاں استعمال کی ہیں۔ اسطرح زیبائش کے ساتھ ساتھ اس کی استقامت بھی بڑھ گئی ہے۔ وسیع صحن کے چاروں کونوں کے پہرہ دار سپاہیوں کی طرح کھڑی ہوئی میناریں بھی کچھ تھکن ظاہر کر رہی تھیں۔ خصوصاً شمال مغربی اور جنوب مشرقی گوشے کی دو میناریں بہت ہی زبوں حالت میں تھیں۔ ان سب کو نئی زندگی بخشی گئی ہے۔ یہ میناریں جنکا بیرونی پھیلاؤ ۶ فٹ اور بلندی ۱۷۶ فٹ ہے، ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے بگلے کی طرح زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ چکی ہیں۔ ان کے تھوڑے تھوڑے حصے مسمار کر کے نئے سرے سے بنائے گئے اور برجیاں بھی دوسری ہی چڑھائیں کیونکہ زلزلے سے ان کو سخت نقصان پہنچ چکا تھا۔ شاندار صدر دروازے اور اس کے باہر کی مدور سیڑھیوں کی مرمت ہونی باقی ہے۔ اس لئے فی الحال اس میں اور باقی مسجدوں میں وہی تفاوتِ حسن موجود ہے جو مور کے خوبصورت پروں اور اس کے پیروں میں پایا جاتا ہے۔ وہ کوٹھریاں بھی جن میں کبھی مسجد کے طالب علم رہتے تھے آجکل زیرِ مرمت ہیں۔

سر مانک جی دادابھائی

مسلسل چودہ سال تک کونسل آف اسٹیٹ کے صدر رہنے کے بعد ۲۰ نومبر کو سر مانک جی دادابھائی اپنے فرائضِ منصبی سے سبکدوش ہو گئے۔ ایسا بڑا اعزاز اور اتنی طویل مدت کے لئے ذرا مشکل ہی سے نصیب ہوا کرتا ہے۔ وہ گذشتہ اڑتیس سال تک ہندوستان کی مجلسِ قانون ساز کے رکن رہے ہیں۔ ان کے معاصروں میں سے مسٹر سری نواس شاستری، سر سوامی آئر، مسٹر جی کے گوکھلے، سر سریندرناتھ بنرجی، اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ کونسل کو خیرباد کہتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ گذشتہ چند سال دونوں ایوانوں کے طریقۂ کار اور مختلف پہلوؤں میں یکجہتی اور یگانگت مفقود رہی ہے۔ تاہم اب یقین ہے کہ نئی حکومت کے ماتحت یہ فضا سازگار ہو جائے اور باہمی اعتماد و تعاون پر کام چلنے لگے بشرطیکہ اقلیت کے مسئلے کو جسے ہندوستانی سیاست میں بڑی اہمیت حاصل ہے، کسی بہتر طریقے سے سلجھا لیا جائے۔ اگر ایسا ممکن ہو سکے تو ہمیں شک نہیں کہ مرکزی حکومت کو ان سے بے حد مدد مل سکتی ہے۔ ان کی یہ بھی رائے ہے کہ موجودہ صورتِ حالات کے ماتحت زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہندوستان سلطنتِ برطانیہ میں شامل رہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان کو اسٹرلنگ بیلنس حاصل کرنے کے لئے انتہائی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ صنعت کو فروغ دینے کے علاوہ اناج کی کمیابی کا مداوا بھی صرف اسی طرح ممکن ہے۔ ہندوستان کو ترقی کی مہنگی اسکیموں کو ٹال کر کفایت شعاری سے بھی کام لینا ہوگا۔

سائنس کانگریس کا اجلاس

انڈین سائنس کانگریس ایسوسی ایشن کا چھتیسواں سالانہ اجلاس ۲ سے ۸ جنوری ۱۹۵۰ء تک پونا یونیورسٹی کی عمارات میں منعقد ہوگا جس کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو فرمائیں گے۔ رسم افتتاح ہز ایکسیلینسی وائسرائے ہند کے ہاتھوں ادا ہوگی۔ یہ اجلاس غیر معمولی طور پر نہایت شاندار رہے گا کیونکہ ایسوسی ایشن کی مجلس عاملہ نے تعمیر ترقی کے پیش نظر ایک خاص اہتمام کا انتظام کیا ہے جس میں بڑے بڑے سائنسداں اور ماہرین علم حصہ لیں گے۔ برطانیہ، امریکہ، روس، فرانس، بلجیم، چین، مصر، ڈنمارک، پاکستان اور دوسرے ملکوں کے مشہور اور نامور سائنسدانوں کو دعوت نامے بھیجے جاچکے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ سر ہنری ڈیل، سر رابرٹ رابنسن، پروفیسر برنارڈ، ڈاروِن، بلیکیٹ وغیرہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ پروفیسر ہیکلے کے آنے کی امید ہے۔ نیشنل اکیڈمی اوف سائنسز واشنگٹن، رائل سوسائٹی اوف لندن اور رائل سوسائٹی اوف کینیڈا کے صدروں نے اپنے اپنے نمائندے بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ حکومت ہند کے شعبۂ تعلیمات نے ایسوسی ایشن کو پچھتر ہزار روپے کی رقم عطا کی ہے۔ امید ہے کہ غیر ملکی نمائندے سارے ملک کا دورہ کرینگے اور مختلف مقامات پر اپنے خیالات کا اظہار بھی فرمائیں گے۔

ایٹم بم اور مدافعت

پروفیسر البرٹ آئن سٹائن اور ان کے رفیق کار سائنسدانوں کی ایک جماعت نے عوام سے دس لاکھ ڈالر چندہ کا اپیل کیا ہے۔ یہ کثیر رقم، اگر جمع ہوگئی تو ملک کے نوجوانوں کو ایٹمی قوت کی سماجی پیچیدگیاں سمجھانے اور اگر ضرورت ہوئی تو تہذیب و تمدن کو تباہی سے روکنے کے سلسلے میں صرف کی جائیگی۔ موصوف نے بتایا کہ مندرجہ ذیل حقائق کو سب سائنسداں تسلیم کرتے ہیں :-

(۱) اب ایٹم بم قیمت پر اور زیادہ تعداد میں تیار کئے جاسکتے ہیں وہ زیادہ تباہ کن بھی ثابت ہوسکیں گے۔

(۲) ایٹم بم سے بچنے کے لئے کوئی فوجی قوت موجود نہیں ہے اور نہ اسکی توقع کی جاسکتی ہے۔

(۳) دوسری قومیں ذاتی کوششوں سے ہمارے خفیہ طریقوں کو سنتے سے تحقیق کرسکتی ہیں۔

(۴) ایٹمی طریقۂ جنگ کے برعکس کسی قسم کی تیاری کرنا محض حماقت ہے اور اگر ایسی کوشش ہوئی تو ہمارے سماجی نظام کا شیرازہ بکھرے بغیر نہ رہ سکیگا۔

(۵) اگر لڑائی چھڑ گئی تو ایٹم بم لازمی طور پر استعمال ہونگے اور اس میں شک

نہیں کہ وہ ہمارے تمدن کو تباہ کر دینگے۔

(۶) ان مشکلات کا حل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایٹمی قوت کے استعمال پر بین الاقوامی احتساب لگائی جائے اور اس طرح جنگ کے امکانات کا یکسر قلع قمع ہو۔

جرمنوں کو وسیع تر اختیارات

جرمنی کے برطانوی علاقے میں جو فوجی حکومت قائم ہے، اس نے فیصلہ کیا ہے کہ یکم جنوری ۱۹۵۰ء سے تین صوبوں میں باشندگان ملک کو مقامی طور پر خودمختار حکومت کے اختیارات دیدئے جائیں۔ خصوصاً تقسیم خوراک کے سلسلے میں جتنی ذمہ داری خود انہی پر عائد کر دی جائے۔ یہ بھی فیصلہ ہوا ہے کہ خوراک اور دوسرے شعبوں کی صوبجاتی وزارت جرمنوں کو تفویض کر دی جائے اور برطانوی فوجی حکومت کے افسران محض مشیران خاص کی حیثیت سے کام کریں۔ ہمبرگ سے اطلاع ملی ہے کہ پانچ سو ٹن اناج سے بھرا ہوا جہاز روس سے جرمنی کی بندرگاہ روٹرڈام پہنچ گیا ہے اور امید کیجاتی ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ کنٹرول کمیشن کا اعلان ہے کہ صوبہ روہر کے لئے جہاں اسوقت سب سے زیادہ قحط پڑ رہا ہے، فوری تقسیم کے واسطے امریکہ نے ایک ہزار ٹن گیہوں بھیجدیا ہے۔ علاوہ ازیں برطانوی فوج کے پاس بیس ہزار ٹن بسکٹ فالتو تھے، وہ بھی اہل جرمنی کو دیدئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ بیس ہزار جرمنوں کو ملازمت دیکر انہیں فکر معاش سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ دوپہر کا کھانا انہیں سرکاری طور پر دیا جاتا ہے۔ برطانوی سپاہی اپنے راشن میں کمی کر کے کرسمس کے تحفے جرمن بچوں کو بھیج رہے ہیں۔

انڈونیشیا کا مستقبل

بٹاویا سے اعلان ہوا ہے کہ ولندیزی اور انڈونیشیا کی حکومتوں کے مابین ایک سیاسی معاہدہ عمل میں آیا ہے جسکی رو سے تمام ولندیزی جزائر شرق الہند کو وفاقی بنیادوں پر ایک خودمختار سلطنت کی حیثیت دیدی گئی ہے۔ انڈونیشیا کی اس جمہوری حکومت کو جاوا، مدورا اور سماٹرا پر پورا اقتدار حاصل ہوگا۔ معاہدے کے مسودہ کا مطالعہ کرنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ تمام علاقے جو فی الحال بٹاویوں یا ولندیزیوں کے زیر تسلط ہیں باہمی مفاہمت کے اصول پر بتدریج آزاد ہوکر اس جمہوریت میں شامل ہوجائیں گے۔ اقرارنامے میں بیان کیا گیا ہے کہ "مفاد مشترک" پر دونوں حکومتوں کو اختیار حاصل ہوگا۔ اس "مفاد مشترک" کے ضمن میں امور خارجہ، دفاع اور حسب ضرورت، ایسا ہی نیز اقتصادی اور ثقافتی قسم کے موضوعات

نئے سال کا تحفہ

ادارۂ آجکل سال بھر تک اپنے قارئین کو ادبی تحفے پیش کرتا رہا ہے تاہم نئے سال کے موقع پر وہ کیلنڈر کی صورت میں فن مصوری کا ایک ایسا شاہکار ہدیۂ قارئین کرنا چاہتا ہے جو ہر گھر اور ایوان کی زینت خاص بن سکتا ہے۔ لہٰذا التماس ہے کہ یکم جنوری کا آجکل خریدتے یا ڈاک سے وصول کرتے وقت یہ ضرور معلوم کر لیا جائے کہ کیلنڈر اس شمارے میں موجود ہے یا نہیں۔

شامل ہیں پچھلے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ انڈونیشیا کیلئے یہ صورت بہر نوع زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔

قوتِ برداشت کی اعلیٰ مثال

لندن کے ایک شخص مسی برٹ کوزنس نے جس کی عمر ۲۴ سال ہے تین ہزار میل کا طویل فاصلہ پیدل چل کر صرف ۴۰ دن میں طے کر لیا جس سے ساری دنیا محوِ حیرت ہو گئی۔ قوتِ برداشت کی یہ سب سے بڑی مثال ہے۔ کیونکہ اس اثناء میں اس نے صرف چھبیس گھنٹے آرام کیا اور سو گیلن چائے پی۔ آرام کی مدت محسوب دی جائے تو گویا اس نے روزانہ ۷۵ میل کا پیدل سفر کیا۔ اتنی قلیل مدت میں کثرتِ استعمال سے جوتیوں کے چھ جوڑے زردحال ہو گئے۔ اس سلسلے میں اسے کسی خاص حصۂ ملک کا سفر اختیار کرنا نہیں پڑا بلکہ رومفورڈ نامی میدان میں مسلسل چکر لگائے گئے۔ تاہم اب اس کا ارادہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایسی ہی قلیل مدت میں عبور کرے۔ اس سے ۱۲۷ سال پہلے قوتِ برداشت کی مثال کپتان جے باسلی نامی ایک اور برطانوی باشندے نے قائم کی تھی۔

مشینی دماغ

لندن میں ریڈیو انجینیرز کی برٹش انسٹیٹیوٹ میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن نے فرمایا کہ برطانوی سائنسدانوں نے ایک ایسی مشین بنالی ہے جو انسان کی طرح واقعات کو یاد رکھ سکتی اور دماغ سے سوچ کر جواب دے سکتی ہے۔ اسے ایسے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کا حل پیش کرنے میں صرف چار سکنڈ صرف کرنے پڑتے ہیں۔ جن کا جواب ماہرین ریاضی سے دس دن میں بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ ابتک جو مشینیں استعمال ہو رہی ہیں وہ ریاضی سے زیادہ متعلق ہیں لیکن عنقریب ایسی صورت بھی پیدا ہو جائے گی کہ وہ اپنے فیصلے اور اپنی ذاتی پسند کا اظہار کر سکیں گی۔

ہوائی موٹر

امریکہ کے ایک ٹکنیکل انجینیر نے اعلان کیا ہے کہ میں نے حقیقی معنوں میں اڑنے والی موٹر ایجاد کر لی ہے یعنی ایک ایسی گاڑی جو بظاہر موٹر کار معلوم ہوتی ہے لیکن اسے ہوائی جہاز بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ پنکھوں اور بازوؤں کی تبدیلی کے بعد زمین پر اور ہوا میں برابر کام دے سکتی ہے۔ پنکھوں اور بازوؤں کو لگانے یا الگ کرنے میں صرف پانچ منٹ لگتے ہیں۔ اس میں ڈیڑھ سو گھوڑوں کی قوت والا چھ سلنڈر کا انجن لگایا گیا ہے۔ ہوا میں اس کی رفتار ۱۲۰ میل اور زمین پر ۷۰ میل فی گھنٹہ ہے۔ زمین پر ۲۵ میل اور ہوا میں ۱۳ میل فی گیلن کے حساب سے پٹرول خرچ ہوتا ہے۔ موجد کے دل میں اس کا خیال اس وقت پیدا ہوا جبکہ وہ دورانِ جنگ میں پرواز کا ساز و سامان ساتھ لیکر جہاز پر سوار ہو رہا تھا۔ لڑائی ختم ہوتے ہی اس نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا۔

مچھلی کے پیٹ میں

پچھلے مہینے کے آخر میں ایک زبردست طوفان بادوباراں آیا جس نے بمبئی کے قرب و جوار میں بہت سی بستیوں کو برباد کر دیا۔ جھونپڑے اڑ گئے، عمارتیں بیٹھ گئیں اور کچھ انسان بھی سیلاب کی نذر ہو گئے۔ جب یہ بلائے ناگہانی ختم ہوئی تو لوگوں کے مشاغل نئے سرے سے شروع ہو گئے۔ مچھیروں نے بھی مچھلیاں پکڑنے کے لئے سمندر میں جال ڈالدئے۔ چنانچہ بمبئی سے کوئی تیس میل کے فاصلے پر بارہ فٹ لمبی ایک ایسی شارک مچھلی پکڑی گئی جس کا وزن سات سو پونڈ تھا۔ جب اس کا پیٹ چاک کیا گیا تو اس میں سے ایک آدمی کا پورا ڈھانچہ اور لباس نکلا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ شخص اسی سیلاب کی نذر ہو کر سمندر میں پہنچا ہوگا اور رو میں مچھلی نے اسے نگل لیا ہوگا۔ غالب نے صرف غرقِ دریا ہونے کی آرزو کی تھی تاکہ جنازہ اٹھنے کی صورت میں جو رسوائی ہوتی اس سے بچ جاتے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ غرقاب ہونے کے بعد انسان کو مچھلی نگل بھی لیتی ہے اور اس کا پیٹ چاک ہونے پر جب جنازہ ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں برآمد ہوتا ہے تو وہ زیادہ رسوائی کی صورت ہوتی ہے۔ خدا بچائے ایسی موت سے۔

ہندوستان کیلئے اناج

امریکہ نے حسبِ وعدہ ہندوستان کیلئے مزید اناج بھیجنا شروع کر دیا ہے چنانچہ اسکی پہلی قسط کے طور پر نو ہزار ٹن گیہوں کراچی پہنچا اور اس میں سے آٹھ ہزار ٹن دہلی بھیج دیا گیا کیونکہ دہلی میں غلے کی کمی نے نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ امریکہ سے آٹھ ہزار ٹن گیہوں اور آنے والا ہے۔ اس کے علاوہ ترکی سے آٹھ ہزار ٹن گیہوں اور ساڑھے ہزار ٹن جو اور عراق سے آٹھ ہزار چھ سو ٹن جو بہت جلد آنے کی امید ہے۔ اس مقدار میں سے بیشتر حصہ دہلی، یو۔پی، صوبہ سرحد، بلوچستان اور راجپوتانے کے لئے وقف ہے۔

سانحۂ ارتحال

نہایت افسوس کے ساتھ سنا گیا کہ ۲۲ نومبر کو لکھنؤ کے مشہور غزل گو شاعر حضرت مرزا ثاقب لکھنوی دنیائے شعر و ادب سے منہ موڑ کر خلد آشیاں ہو گئے۔ اِنَّ للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی تصویر کے ساتھ آپ کی شاعری پر پروفیسر آغا اشہر لکھنوی کا لکھا ہوا ایک مفصل مضمون یکم مئی سنہ ۱۹۴۶ء کے آجکل میں شائع ہوا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ وہ اس سال کے آخر میں ہم سب کو داغِ مفارقت دے جائینگے۔ دعا ہے کہ خداوندِ کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو توفیقِ صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

مرحوم اکبر آباد میں پیدا ہوئے لیکن تمام عمر لکھنؤ میں رہنے کے باعث لکھنوی کہلانے لگے تھے ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو ۔

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی ۔۔۔ اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

تخمیس حسرت بر غزل حافظ

رئیس المتغزلین حضرت حسرت موہانی

مرے حق میں کیا نہ ہوگا کبھی رحم کا اشارا نہ کبھی خطاب پنہاں نہ عتاب آشکارا؟
کہ یہ ہو تو بیکسی کا مجھے غم بھی ہے گوارا بہ ملازمانِ سلطاں کہ رساند ایں دعا را
کہ بہ شکر پادشاہی ز نظر مراں گدا را

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے غم کی بے پناہی ہے بیاں کی حد سے باہر مرے حال کی تباہی
پہ کچھ اور دے رہی ہے مری آرزو گواہی ہمہ شب امید دارم کہ نسیمِ صبح گاہی
بہ پیامِ آشنائی بنوازد آشنا را

یہی التجا ہے کہ "بہ زہد نخوت انگیز" یہ جو تھا بصد تکلف مجھے شغلِ مے سے پرہیز
اسے کر دے ختم ساقی "بہ عطائے رافت آمیز" بخدا کہ جرعۂ دہ تو بہ حافظِ سحر خیز
کہ دعائے صبح گاہی اثرے کند شمارا

یلدرم کی یاد میں

رشید احمد صدیقی

اُن کے بعض رفقاء اور طلباء سے مجھے اکثر اس مسئلہ پر بحث کرنے کا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی معقول شاعر نہیں ہو سکتا جس شخص میں شریفوں کے لوازمہ ہوں اس میں فنون شریفہ کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔ مرحوم اصغر گونڈوی اور سید سجاد حیدر میرے پیش نظر ہیں۔ ان کی دل فروز شاعری اور انشاء پردازی تمام تر ان کی دل آویز شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ میرے سامنے ایسے اشخاص بھی ہیں جو شاعر اور انشاء پرداز کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ لیکن ان کی شاعری اور انشاء پردازی میں خامی بھی اسی حد تک ملتی ہے جس حد تک بحیثیت انسان یہ گھٹیا واقع ہوئے ہیں۔

میرے نزدیک فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں۔ ایسا کوئی فن نہیں ہے جو انسان سے اونچا یا اس سے علیحدہ ہو۔

یلدرم مرحوم علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے اور علی گڑھ کے اُس زمانہ کے طالب علم تھے جب زندگی خوش باشی نہ تھی تو کچھ نہ تھی نہ اب جب زندگی سوا خوش باشی سب کچھ ہے۔ میں نے ان کی طالب علمی نہ دیکھی لیکن علی گڑھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب ؎

بزم کو برہم ہوئے مدت نہ گزری تھی بہت

جب سے اب تک زمانہ کے رویّہ اور روانی میں بہت کچھ فرق آگیا ہے کیا کچھ فرق۔ جن قدروں پر جب مرنے والے لاکھوں تھے" اب ان پر "رونے والا کوئی نہیں" لیکن سجاد حیدر کی حیثیت جداگانہ تھی۔ ان میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی اور یہ ان کی سیرت و شخصیت کا بہت اہم اور عظیم الشان پہلو ہے۔

انھوں نے روزگار کی بہت سی گردشیں دیکھیں اور ایسی، ایسی گردشیں جو معمولی اشخاص کو یکسر زیر و زبر کر سکتی تھیں۔ لیکن یلدرم میں فن کا ایسا جستہ وہ امید آفرین تھی کہ ان کو بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ سیاسی فرائض بھی ان کے سپرد ہوئے انتظامی اور ادبی بھی لیکن وہ شروع سے آخر تک اور سر کے بال سے پاؤں تک شریف شاعر اور ادیب رہے۔

مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی عہد میں سجاد حیدر اس کے رجسٹرار رہے انھوں نے مہاراجہ صاحب محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نواب سر مزمل اللہ خاں، ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد سب کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا طریقہ جداگانہ تھا اور ان سب سے جدا سجاد حیدر کا تھا۔ انھوں نے کام سب کے ساتھ کیا۔ سازش کسی سے نہ کی میرے نزدیک یہی ایک بات یلدرم کی شرافت نفس اور سیرت کی پختگی کی بڑی محکم دلیل ہے۔

سجاد حیدر کا ڈپٹی کلکٹری راس آئی نہ رجسٹراری۔ وہ یونیورسٹی میں بھی رہے اور کالا پانی میں بھی لیکن روزگار کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ وہ کالا پانی تو گئے لیکن کسی کردہ یا ناکردہ گناہ کی پاداش میں نہیں جس کے بغیر کالا پانی کے تصور میں نہ گرمی آتی ہے نہ روشنی، اور یونیورسٹی آئے تو ایسے منصب پر جسے دُنیا بھر کی سرگرمیوں سے سروکار ہو سکتا ہے، اِلّا شعر و ادب سے۔

اس یونیورسٹی میں شعر و ادب کے رہنے میں نے دو ہی پائے۔ دونوں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکے ہیں۔ ایک مولانا حسن مارہروی دوسرے سید سجاد حیدر یلدرم ترکی۔ ترک اور ترکی ادب سے سجاد حیدر کو عشق تھا ان کا نام آتے ہی ان پر عجیب وارفتگی طاری ہوتی تھی۔ میں ترکی سے واقف نہیں ہوں لیکن ترکی ادب سے آشنا مختلف اصحاب کے ترکی کے اردو تراجم دیکھے ہیں۔ سجاد حیدر اور دوسروں کے ترجموں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ میں نے ایک بار سید صاحب سے پوچھا کہ ترکی ادب ہی جاندار ہے یا اس میں آپ کی شائستہ خوبی تحریر کا بھی کچھ دخل ہے؟ ایک دفعہ مجھوم ہی تو گئے، آنکھوں میں روشنی پیدا ہو گئی، اور چہرہ جگمگا اٹھا۔ کہنے لگے۔ جناب (سید صاحب جوش میں آتے تو جناب کا لفظ ضرور استعمال کرتے اور اس پر مخصوص انداز سے زور دیتے) ترکی زبان جانتے ہیں کس کی زبان ہے۔ ہماری آپ کی نہیں ہے۔ میں نے بات کاٹ کر کہنا ہی تو میں کہہ رہا تھا کہ میری تو یقیناً نہیں ہے۔ آپ کی تو کہیں نہیں ہے۔ مسکرائے اور بولے ترکی ترکوں ہی کی زبان ہے اور انھیں کی ہو سکتی ہے یہ ان لوگوں کی زبان ہے جو نہ کبھی غلام رہے نہ کسی کو غلام رکھا۔ معرکہ آراؤں کی زبان ہے جس میں ترک تازی ہے۔ سید صاحب پر اب کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ چنانچہ اب وہ اپنے بس کے تھے نہ میرے۔ نامق کمال کا مشہور ڈرامہ جلال الدین خوارزم شاہ میری ہی درخواست پر سید صاحب نے اردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا جس کا بیشتر حصہ سہیل میں شائع ہوا۔ سید صاحب قلم کاغذ لے کر خود ترجمہ نہیں کرتے تھے بلکہ کسی کو مامور کر دیا جاتا۔ سید صاحب ترجمہ بولتے جاتے وہ لکھتا جاتا۔ شاذ و نادر کہیں ترمیم کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ترجمہ پڑھتے جا رہے ہیں۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مترادفات کیسے ہوتے لیکن جہاں تک اردو الفاظ فقروں اور ترکیبوں کا تعلق ہے میں سید صاحب کے اس کمال کا معترف ہوں کہ وہ بڑے اچھوتے بڑے جاندار اور بڑے گوارا اردو الفاظ استعمال کرتے تھے۔ الفاظ کے انتخاب اور ترکیبوں کی اختراع کا ترجمے میں بڑا دخل ہوتا ہے اور یہ بات صرف کسی غیر معمولی مترجم کے حصہ میں آتی ہے۔ یہاں مجھے مولوی عنایت اللہ مرحوم دہلوی یاد آتے ہیں جن کا سا باکمال ترجمہ کرنے والا اردو ادب میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اردو اور انگریزی

دونوں زبانوں کو سیکھنے کی استعداد عنایت اللہ مرحوم میں خرق عادت کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ یہ بات انہیں کے حصہ میں آ بھی سکتی تھی۔ وہ اردو کے گہوارہ میں نہیں پلے تھے بلکہ اردو ان کے گہوارہ میں پلی تھی۔ وہ اہل زبان ہی نہ تھے اہل تمدن بھی تھے۔

یلدرم نے ترکی سے تراجم زیادہ کئے ہیں۔ اردو مضامین نسبتاً کم لکھے ہیں۔ ترکی انشاپردازی کا انداز ان میں کچھ ایسا رچ گیا تھا کہ اردو لکھنے میں ان کا قلم ترکی تال و سم قبول کر لیتا تھا۔ سید صاحب کے اس رنگ و آہنگ پر بعض لوگوں میں چہ میگوئیاں بھی ہوئی ہیں بذات خود میں اردو میں اس انداز تحریر کو بڑا اچھا اضافہ سمجھتا ہوں۔

سید کے اسالیب انشاء اور ان کی موضوعات سید کی شخصیت کی بڑی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ اردو میں انشاء لطیف کی ابتداء شرر، ریاض اور یلدرم کی تحریروں سے ہوئی۔ انشاء لطیف کا رشتہ کھینچ تان کر ملا وجہی کی سب رس سے بھی ملایا جاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک سب رس کا انداز متصوفانہ تصوف کا ہے جو انشاء لطیف سے جوڑ نہیں کھاتا۔ انشاء لطیف نے آگے چل کر ٹیگوریت کا رنگ اختیار کر لیا اور ٹیگوریت نے اردو میں سستے اور ادنی درجہ کی تحریروں کو اس درجہ عام اور مقبول بنایا کہ ثقات ادب کو سختی سے احتساب کرنا پڑا۔ وہ یہ انداز جلد ہی نظروں سے گر گیا یہاں تک کہ جو اصحاب اس کے سب سے بڑے حامی تھے وہ سب سے پہلے تائب ہوئے۔ اردو میں ٹیگوریت کی جس طرح ابتدا ہوئی اور جیسا اسکا انجام ہوا، مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے شعر و ادب کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے جس کے آثار نمایاں ہو چلے ہیں۔

شرر اور ریاض کے عاشقانہ مضامین اور یلدرم کی انشاء لطیف میں فرق ہے۔ شرر کا اسلوب انشاء اور ان کا عشق دونوں کتابی ہیں۔ سیدھے سادھے ڈھلے ڈھلائے سطحی تاثرات کی ترجمانی ہیں۔ شاعرانہ زبان و بیان کی مالش ملتی ہے۔ ریاض میں زبان و بیان کا مظاہرہ شرر سے زیادہ غیر معتدل ہے۔ ریاض کی شاعری میں جو پر تکلف لیکن سطحی شوخی ملتی ہے وہ ان کی نثر میں پہنچکر سستی اور عامیانہ بن گئی ہے۔ شاعری میں جو انداز بیان شاعری کا حسن ہے وہ نثر میں پہنچکر مصنوعی اور بے محل ہو جاتا ہے۔ موضوع اور مطمح نظر کو یکساں ہونے کے باوجود نثر اور نظم کی مقتضیات میں فرق ہے۔ ریاض اور ناصر علی دہلوی نے اس امتیاز کو اپنی اپنی نثر میں نظر انداز کر دیا ہے۔

یلدرم کے ہاں بھی حسن و محبت کا کاروبار ہے لیکن یلدرم میں مجاز کی شگفتگی و تازگی ہے شرر اور ریاض کی پیداوار کی سطحیت ہے۔ سجاد کی ذہنی۔ سجاد انصاری کو بھی انشاء لطیف کا پیرو قرار دیا جاتا ہے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ سجاد انصاری کے یہاں نفسیاتی تحلیل ملتی ہے جس کو انشائے لطیف سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ انشاء لطیف اور غزل سرائی کا سرچشمہ ایک ہے تو ہے۔

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے

لیکن جس طرح غزلوں میں آرٹ اور تغزل کے اختلافات ملتے ہیں، ادب لطیف میں بھی یہ امتیازات نظر آتے ہیں۔ یلدرم اور ادب لطیف کے بعض دوسرے علم برداروں میں یہ فرق واضح ہے۔ سجاد حیدر کے ہاں شوخی بھی ہے شرارت بھی لیکن شہدپن نام کو نہیں۔ یلدرم کے ہاں عورت کا بڑا عمل دخل ہے لیکن ان کے ہاں خیالات کی رعنائی ملتی ہے۔ اعصاب کا تشنج نہیں مہدی افادی کے ہاں خیالات کی رعنائی اتنی نہیں ہے جتنی جذبات کی رنگینی۔ مہدی کے اعصاب پر اگر عورت سوار نہیں ہے تو کچھ بیدل بھی نہیں ہے۔ افادی کہیں کہیں تو شوق کی مثنویوں سے جا ملی ہے اور میرا خیال ہے کہ ان دونوں کی تحریروں میں جہاں تک عورت کا تعلق ہے مراتب میں کا اتنا ہی فرق ہے جتنا تفاوت رعنائی کی بہر ہونا چاہئے اگر ان دونوں کو ایک دوسرے کے عہد میں منتقل کر دینا ممکن ہوتا تو مہدی شوق بن جاتے اور شوق مہدی۔

سجاد حیدر کی تحریروں میں ایک بات نہایت واضح طور پر ملتی ہے یعنی وہ جذبات کی رو اور روانی میں بھی اپنے وزن اور وقار کو یہ نہیں جانے دیتے۔ سجاد صاحب کے جذبات کچھ زیادہ تیز اور تند نہ تھے جس کے ہاں خیالات کی رعنائی ہو اس کے ہاں جذبات کا ہیجان و طغیان یوں بھی کم ہوتا ہے۔ پھر بھی جہاں کہیں ایسے مواقع آ گئے ہیں سجاد صاحب نے ایک ہلکی جنبش قلم سے ان کو معتدل کر دیا ہے اور اس طور پر معتدل کیا ہے کہ اظہار مطلب میں کوئی فرق نہ آیا اور شرم و شرافت کا دامن بھی داغدار نہ ہوا۔

میرے نزدیک انشائے لطیف میں خیال کی رنگینی اور نزاکت کے ساتھ جذبہ کی متانت و عفت کو جس طرح یلدرم نے توازن رکھا ہے کسی اور نے نہیں رکھا ہے۔ سجاد حیدر کی تحریروں میں جذبات سے زیادہ تخیل کی کار فرمائی ہے۔ قاضی عبد الغفار اس بارے میں یلدرم سے ملتے جلتے ہیں لیکن دونوں کی نثر کی پرداخت میں تفاوت ہے۔ غفار کی تحریروں میں طنز کی تیزی و تلخی بھی شامل رہتی ہے۔ اس طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عبد الغفار، سجاد حیدر کے مقابلے سجاد انصاری سے زیادہ قریب ہیں۔ مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ خوش قسمتی اور اطمینان چاہیے کہ انشائے لطیف کے تین بڑے اچھے اور مکمل نمونے ہمارے یہ تین چوٹی کے انشاء پرداز بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ سجاد حیدر، سجاد انصاری اور قاضی عبد الغفار۔

بعض اعتبار سے سجاد حیدر شروع سے آخر تک نوجوان رہے۔ وہ اس زمانہ میں بھی جوان تھے جب جسم و جان کے اعتبار سے نحیف و نزار ہو چکے تھے۔ تعلیم نسواں، اردو ٹائپ، اسالیب شاعری میں نئے تجربات اور اس قبیل کی اور باتوں میں اوائل عمر سے سجاد حیدر ترقی پذیر واقع ہوئے تھے اردو ٹائپ کو مقبول بنانے میں تمام عمر کوشاں رہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کی نئی شاعری کے بڑے مداح تھے اور انکی ایک مخصوص نظم بڑے مزے لے لیکر پڑھتے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک فارسی مجلہ "ایرانشہر" نامی برلن سے ٹائپ میں شائع ہوتا تھا اس کا پہلا نسخہ سجاد صاحب کو موصول ہوا۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ سجاد صاحب اپنی کوٹھی سے دفتر آ رہے تھے۔ سہ پہر بہت سے لفافے اور کاغذات کے کچھ منتشر اجزا اور ایک آدھ اخبار و رسالے بغل میں دبائے ایک رسالہ پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ میں ان سے کوئی بیس بائیس قدم پیچھے آ رہا تھا۔ اس کی خبر سجاد صاحب کو نہ تھی۔ سید صاحب کے چلنے کا خاص انداز تھا۔ خود ہلکے پھلکے تھے۔ رفتار اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی، ہموار، کسی قدر تیز، چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے تھے نگاہ نیچی تقریباً عمودی۔ دس بارہ قدم چل کر یک لخت ذرا کی ذرا رک سے جاتے اور ٹھیک سامنے ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر پھر گرم رفتار ہو جاتے۔
اس پر ان کے ایک بے تکلف دوست نے ایک فقرہ چست کیا تھا کہ سجاد تم چلنے میں سانپ کو شرماتے ہو وہ بھی چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا ہے اور پھر چل دیتا ہے۔ اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے۔ کہنے لگے۔ سانپوں میں یہ وصف سانپوں کی چال آتی ہیں کی تعریف نہ کروگے؟ اسی انداز سے چلے جا رہے تھے کہ یکایک ایک لفافہ سرک کر زمین پر آ رہا۔ سجاد صاحب کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ میں نے اٹھا لیا۔ کچھ ہی دور آگے بڑھے تھے کہ دوسرا لفافہ گرا، وہ بھی میں نے اٹھا لیا۔ باب العلم کے قریب پہنچے کہ تیسرے لفافہ نے مفارقت کی وہ بھی میں نے قبضہ میں کیا۔ سجاد صاحب برابر رسالہ کے مطالعہ میں منہمک رہے۔ سید صاحب کے پیچھے میں بھی یونیورسٹی آفس پہونچا۔ آفس پہنچکر موصوف نے بچے ہوئے لفافے متعلقہ لوگوں کے حوالے کئے۔ معلوم ہوا تین لفافے گم ہیں چونک پڑے اور تھوڑی دیر تک سخت متفکر رہے میں نے تینوں لفافے کچھ وقفے سے واپس کئے۔ سید صاحب فرمانے لگے کہ آپ بھی کمال کرتے ہیں فوراً کیوں نہ دے دئے، اس وقت مجھ پر کیا گزر گئی۔ میں نے کہا آپ مطالعہ میں منہمک تھے میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔
میرا یہ کہنا تھا کہ سب کچھ بھول گئے۔ فرمایا خوب یاد دلایا یہ ملاحظہ فرمائیے "ایرانشہر" ہے۔ ٹائپ میں کتنا ستھرا چھپا ہے اور کیسے اچھے اور جاندار مضامین و نظمیں ہیں۔ ایرانی وطن پرستوں نے برلن سے اسے شائع کیا ہے۔ کاش اردو میں ایسا پاکیزہ اور دیدہ زیب ٹائپ رواج پا جائے۔ اور جناب بات تو یہ ہے کہ جب تک آپ "بت سنگی" (لیتھو کی چھپائی) سے رشتہ نہ توڑیں گے اردو کی اشاعت مسدود رہے گی۔ میں نے کہا۔ سید صاحب "بت سنگی" کا تو ہمارے شعر و ادب میں ایک درجہ بھی ہے۔ بت آہنی میں کیا رکھا ہے۔ بقول شخصے ؎

"حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا"

کسی قدر تیز ہو کر فرمایا یہی تو ستم ہے، آپ سب کا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ اچھی بھلی باتوں میں بحث ملا دیتے ہیں۔ اکبر نے ٹائپ کی خواہ مخواہ مٹی پلید کر دی۔ میں نے عرض کیا سید صاحب اکبر نے کہیں بحث نہیں ملائی صرف بحث میں چنگاری لگائی ہے۔ ہنسے پھر فرمایا اور جناب بھی تو کچھ دور نہیں کھڑے ہیں۔

سجاد صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ یلدرم کوئی غیر معمولی شاعر نہ تھے۔ ان کی سب سے بہتر نظم "مرزا پھویا" بتائی جاتی ہے۔ اس میں شاعرانہ خوبیاں کچھ بہت زیادہ نہیں لیکن گزشتہ علی گڑھ کی زندگی کے بعض دلکش پہلو لطیف انداز سے بیان کئے گئے ہیں۔ ہلکی پھلکی تفریحی نظموں میں اس کو اچھا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ سید صاحب کی نقاشی نازک خطوط اور ہلکے رنگوں کی ہے۔ ان کا مزاج رومانی تھا، وہ رومان جو انسان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے پستی کی طرف ہرگز نہیں۔ موجودہ عہد میں رومان کی حیثیت مسخ کر دی گئی ہے۔ اس کو مزاج و خیال کی رنگینی کی بجائے مطالبات جنسی قرار دیا گیا ہے، وہ بھی اس طور پر کہ جو چیز صحت کی دلیل تھی وہ مستقل (اور لا علاج) مرض قرار پائی۔

سجاد صاحب کی ایک نظم جو ان کی رنگینی، رسائی طبع، سیرت کی پاکیزگی اور ان کے نقطۂ نظر کی دل آویزی کی ترجمان ہے۔ شملہ کالکا لائن پر ایک نظارہ کے عنوان سے سب سے پہلے سہیل میں شائع ہوئی۔ سید صاحب کی یاد کے ساتھ نظم ہمیشہ وابستہ رہے گی ؎

ماتھے پہ بندی — آنکھ میں جادو
ہونٹوں کی بجلی — گرتی تھی ہر سو
چال لچکتی — بات لہکتی
جیسے کسی نے — پی ہو دارو
انکھڑیاں ایسی — جن میں تھے رقصاں
لمحہ میں رادھا — لمحہ میں راگھو
ایسی پھڑک تھی — خلق تھی حیراں
ریل پہ آیا — کہاں سے آہو!

سجاد صاحب کو جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ترکی، ترکی ادب اور ترکوں سے والہانہ شغف تھا۔ ان میں سے کسی کا نام آ جاتا تو سید صاحب وجد میں آ جاتے۔ جس زمانہ میں وہ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے ایک بار ان کو ترکی جانے کا موقعہ مل گیا! میں کیا بتاؤں ان پر کیا نشاط طاری تھا۔ صحت اچھی نہ تھی۔ میں نے کہا سید صاحب سفر طویل ہے تکلیف دہ بھی کیسے گزرے گی؟ فرمایا ترکی کے خیال میں طبیعت مگن ہے۔ یہ شگون اچھا ہے اور ہوا تمہارے اچھا یا یہ خاک وہاں کی خاک میں مل جائے گی یا پھر دیکھیے گا کیا رقصاں و شاداں واپس آتا ہوں۔ چند ماہ بعد واپس آئے۔ سید صاحب یوں بھی سبک رفتار تھے واپسی پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پاؤں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہیں۔ جسم پر توانائی، چہرہ پر بشاشت اور سرخی آ گئی تھی۔ میں نے پوچھا ترکی میں کوئی تبدیلی پائی؟ فرمایا شروع سے آخر تک تبدیلی ہی تبدیلی نظر آئی، لیکن مجھے تو

لڑکی سے الفت ہے جسے تف ہے بدلنے سے کیا سروکار۔

جن کی زندگی خالدہ خانم اور ان کی ابتدائی تحریروں کے بڑے دلدادہ تھے۔ موصوفہ علی گڑھ تشریف لائیں تو زینیں میں سجاد صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا اور موصوفہ کے ابتدائی مضامین اور انشاء پردازی کو بڑے لطف سے سراہا۔ خالدہ خانم نے فرمایا کہ اب جتنا بھی لگے اسلوب انشاء سے تائب ہوگئی ہیں اور اسے صرف ایام جہالت کی یادگار سمجھتی ہیں۔ سجاد صاحب خاموش ہوگئے بعد میں ایک صحبت میں اس واقعہ کا ذکر آیا تو فرمانے لگے خالدہ خانم کو کیا معلوم ان کی ایام جہالت کی باتوں نے کیا شگوفے کھلائے۔ پھر غلط بحث سے کیا حاصل۔ سوال یہ نہیں ہے کہ خالدہ خانم کو کیا پسند ہے۔ اصل یہ ہے کہ میں کیا پسند کرتا ہوں۔

سجاد حیدر بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے۔ ان کو توڑ جوڑ بالکل نہ آتا تھا۔ وہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ ایک سچے آرٹسٹ اور ادیب کی طرح وہ اہل مناصب سے کبھی مرعوب نہ ہوئے لیکن فن کے کمال کی داد دینے میں بڑے سخی تھے۔ سید صاحب کو میں نے شاید کبھی "تم" کے لفظ سے کسی کو مخاطب کرتے سنا ہو۔ انھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو ذاتی رفعت اور منفعت کا کبھی وسیلہ نہیں بنایا۔ ان کو میں نے برہمی میں آپے سے باہر نہ پایا اور ہنسی دل لگی میں ان کے منہ سے کبھی ایسے الفاظ نہ سنے جو مذاق سلیم پر بار ہوں۔ یلدرم جیسے رکھے رکھے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ تمام آداب ان میں پیش ہوتے تھے جو ثقافت کی جان اور جواز ہیں۔ ان آداب کو وہ اس لطف اور آسانی سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہو یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے بغیر کسی الجھن یا تصنع کے۔ یلدرم میں کبھی تکلف بالکل نہ تھا۔ ان کی بے تکلفی میں رندانہ اور خلیفانہ شان پائی جاتی تھی۔ وہ اسی حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقہ کا تقاضا ہوتا تھا اور بے تکلف بھی اسی حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسن معاشرت کا جزو سمجھی جاتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو اونچی سے اونچی اور بڑی سے بڑی محفلوں میں ہماری اور خود اپنی نمائندگی کر سکتے تھے۔ شعر و ادب کا ان کا ذوق محض فطری نہ تھا بلکہ وہ شعر و ادب کے رنگ و آہنگ اور قدر پر حکیمانہ نظر بھی رکھتے تھے۔ وہ اچھی اور بے تکلف انگریزی لکھتے تھے جو اس عہد کے ہندوستانیوں میں بہت کم لکھتی ہیں۔ ان کی قدر کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع اور متنوع تھا۔ شعر و شرافت کے جو لوگ قائل یا قدر داں تھے وہ تمام کے تمام خواہ ہندوستان کے کسی گوشہ میں ہوں یلدرم سے واقف اور ان کی خوبیوں کے معترف تھے۔

سید سجاد حیدر ان لکھنے والوں میں تھے جن کا قائل نہ ہونا کم سوادی کی دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ تک یک رنگی اور توازن ہو۔ وہ ہم سے جدا ہوگئے لیکن ہم اور ہمارے بعد آنے والے ان سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ مجھے یقین ہے فردوس میں ان کو وہ رنگینیاں اور نزہتیں میسر یا نصیب ہوں گی جن کی صرف جھلکیاں ان کی تحریروں میں ہم کو نصیب ہیں +

اب یاد نہیں — نکہت نسیم

تاروں سے سونا برساتا تھا چشموں سے چاندی بہتی تھی
پھولوں پر موتی بکھرے تھے ذرّوں کی قسمت چمکی تھی
کلیوں کے لب پر نغمے تھے شاخوں پہ وجد سا طاری تھا
خوشبو کے خزانے لٹتے تھے اور دنیا بہکی بہکی تھی

اے دوست تجھے شاید وہ دن اب یاد نہیں اب یاد نہیں

سورج کی نرم شعاعوں سے کلیوں کے روپ نکھرتے تھے
سرسوں کی نازک شاخوں پر سونے کے پھول لچکتے تھے
جب اودے اودے بادل سے امرت کی دھاریں بہتی تھیں
اور ہلکی ہلکی خنکی میں دل دھیمے دھیمے تپتے تھے

اے دوست تجھے شاید وہ دن اب یاد نہیں اب یاد نہیں

پھولوں کے ساغر اپنے تھے شبنم کی صہبا اپنی تھی
ذرّوں کے ہیرے اپنے تھے تاروں کی مالا اپنی تھی
دریا کی لہریں اپنی تھیں لہروں کا ترنم اپنا تھا
ذرّوں سے لے کر تاروں تک یہ ساری دنیا اپنی تھی

اے دوست تجھے شاید وہ دن اب یاد نہیں اب یاد نہیں

ہم دونوں ایک حقیقت تھے ہم دونوں ایک فسانہ تھے
ہم آپ ہی اپنی دنیا تھے ہم دنیا سے بیگانہ تھے
ہم اپنے راگ پہ ہنستے تھے ہم اپنی آگ میں جلتے تھے
ہم اپنے ہی عشق کا نغمہ تھے ہم اپنے ہی غم کا گانا تھے

اے دوست تجھے شاید وہ دن اب یاد نہیں اب یاد نہیں

یہ ساز کے پردے یہ مطرب سب اپنا ترنم کھو بیٹھے
یہ پھول یہ کلیاں یہ تارے سب اپنا تبسم کھو بیٹھے
یہ نرم ہوائیں یہ بادل سب بھول گئے شاید ہم کو
خاموش مناظر فطرت کے سب اپنا تکلم کھو بیٹھے

اے دوست مجھے بھی وہ لمحے اب یاد نہیں اب یاد نہیں

آواز

پولستانی افسانہ

مصنفہ
جوزف ویسن ہاف

مترجمہ
آخر لکھنوی

پولینڈ کے دیہات میں موسم گرما کا دن ختم ہونے کے وقت ایک ایسا لمحہ آتا ہے جب کھیتوں کی پکی فصل کا فرستادہ ہوا کا ایک جھونکا پھولوں سے معمور چمن کے تن بدن میں سنسنی ڈال دیتا ہے اور گراں بار خوشبوؤں کو آزاد کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ گرم ہوا کے لمس میں آدمیوں کی آوازیں، جانوروں کی پکاریں، خواہشات نفس کے بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں اور ہوا تسکین کی توقع میں خوشی سے تھرتھراتے ہیں۔ یہی اسباب درختوں کی لطیف موسیقی میں بھی کارفرما ہوتے ہیں نیز اس دھندلی اور ہرا زرد روشنی میں جو تمام کھیتوں میں تحلیل ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ صرف جنگلی فاختائیں بدرجہ کمال خوش و خرم نظر آتی ہیں جب اپنے بچھڑے جوڑے سے ملنے کا اعلان سب سے اونچے سفیدے کے درخت کی پھنگی سے کرتی ہیں ایسے آسمان کے نیچے جو شدت اہتزاز سے زرد ہو گیا ہے۔

اگر الزبتھا میتھونسکا[1] اپنے تاثرات کا اظہار کرتی تو اسی طرح کرتی۔ وہ ایک نیچے کوچ پہ اپنے آرام کمرے میں لیٹی ہوئی تھی اور کھلی کھڑکی سے باغ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی اس کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش نازک اور متناسب تھے سرخی کی تیز جھلک گورے گورے گالوں پر گلاب کے پھولوں کی مصوری کر رہی تھی۔ باریک بلاؤس کے نیچے اس کے سینے کا طوفانی اتار چڑھاؤ اتنا نمایاں تھا اور چھوٹے چھوٹے پاؤں بےچینی سے ہل رہے تھے، لیکن اس کی سیاہ آنکھیں جو سفیدے پر بیٹھی فاختاؤں پر جمی ہوئی تھیں ایک خوابناک محویت کے عالم میں آسمان کی پہنائیوں میں گم ہو گئی تھیں۔

یکایک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے، کیا اینٹنی تم ہو؟" الزبتھ نے اپنا منہ پھیرے بغیر پوچھا۔

"جی ہاں بیگم صاحبہ میں ہی ہوں" یہ کہتا ہوا پرانی وضع کا ایک دیانت دار ملازم جس کے بال سفید تھے داخل ہوا۔ اس کی وردی خوشنما اور فیشن کے مطابق تھی۔ "آپ کے مہمانوں نے مجھے یہ عرض کرنے کو بھیجا ہے کہ آپ کے بغیر وہ سخت اداس ہیں"

"اوہ، ان سے کہدو کہ میں ان کی صورت سے بیزار ہوں اور اسی وجہ سے چلی آئی" یہ کہکر وہ کھڑکی کے قریب جاکر جھانکنے لگی تاکہ اینٹنی کو یقین ہو جائے کہ وہ اپنے مہمانوں سے کتنی بے پروا ہے۔ لیکن اس ادا میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ بڈھے ملازم نے حکم کی تعمیل میں جلدی نہیں کی۔ ذرا دیر بعد جب اس نے اینٹنی کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں، البتہ اینٹنی سے ناراضگی کا اظہار نہیں ہوتا تھا اور اپنے پہلے حکم میں اتنا اضافہ کیا "ان سے کہدو کہ...... نہیں ٹھہرو...... ان سے کہو کہ میں ان کے لئے کھانا پکا رہی ہوں۔ ہاں ان کو کہدو کہ میں بہت مصروف ہوں" یہ کہکر تو کہہ دیا مگر اپنے بہانے کے ناقابل قبول ہونے پر خود ہی قہقہہ لگایا کیونکہ ہر شخص آگاہ تھا کہ الزبتھ ایسی مالکہ نہیں جو گھر بار کے دھندوں میں الجھی رہے۔ محل کے انتظام میں جو کچھ سلیقہ یا سگھڑاپا نمودار تھا وہ دراصل اینٹنی اور داروغہ کی توجہ اور محنت کا منت پذیر تھا۔

اینٹنی جو دیگر ملازموں اور مہمانوں کی طرح اپنی مالکہ کی پرستش کرتا تھا یہ باتیں رواداری سے مسکراتا ہوا سنتا رہا اور پھر کمرے سے چلا گیا۔

الزبتھ کا عمل سے بیگانہ مزاج اس کے خاندان والوں میں اکثر زیر بحث رہتا تھا کیونکہ اس کی ولادت کے حالات، زندگی میں اس کی منفرد جگہ، نیز قسمت کے داؤں اس کے متقاضی تھے کہ وہ سراپا عمل ہو۔ وہ خاندان کڈناسکی سے تھی۔ اس کے وارث دو سوتیلے بھائی، ایک سوتیلی بہن اور ایک پورا دھاڑا خالاؤں کا تھا جن کے پاس تاریخی شجرہ اور ہوس نام و نمود کے علاوہ کچھ نہ تھا یا پھر روپے پیسے کا ہوکا۔ بیس برس پیشتر قدرت نے ان کی تنگدستی دور کرنے کا وسیلہ الزبتھ کی شکل میں بھیجا۔ ایک ننھی منی قبول صورت لڑکی کا ورود خالص "افلاطونی" تسلی کا باعث ہو سکتا تھا مگر قابل ہاتھوں میں یہ بظاہر ناچیز مخلوق کل قبیلہ کڈناسکی کے لئے ایک بیش بہا خزانہ اور ان کا واحد سہارا ثابت ہونے والی تھی۔ الزبتھ بڑھتی اور بڑھنے کے ساتھ نکھرتی گئی۔ والدین کی وفات کے بعد اس کے اعزہ نے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ ان کے سرگرم کار تخیل نے اسے ابھی سے کسی پریوں کے شہزادے سے منسوب دیکھا۔ لیکن آجکل پریوں کے شہزادے اکا دکا ہی نہیں بلکہ دور اندیش بھی ہیں اور ایسی بیوی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جو ڈھیروں جہیز لائے۔ دوسرے بڑے بڑے آدمی مثلاً لوہے یا روئی یا کافی کے "بادشاہ" شاذ ہی ملتے ہیں اور بالعموم دور دراز مقامات مثلاً امریکہ میں براجتے ہیں۔ معاملے کی اہمیت اور نزاکت بڑھتی گئی کیونکہ قبیلہ کڈناسکی کے افراد اسپر تلے ہوئے تھے کہ ان کا عروج مال کی شہرت انہیں کے عین حیات میں ہو اور یہ شرف ان کے بعد کی آنے والی نسلوں کے لئے نہ اٹھا رہے۔ اس تمام بلند حوصلگی اور حب جاہ کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ سترہ برس کی الزبتھ مائکسلاف میتھونسکی سے بیاہ دی گئی، وہ کروڑپتی تھا مگر ایک ایسے خاندان سے جس نے حال ہی میں دولت کمائی تھی اور دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔

مائکسلاف ابھی جوان تھا۔ اس نے مال و زر، زمین اور کارخانے اپنے باپ سے ترکہ میں پائے تھے۔ اسی شخص سے خاندانی خوش حالی کا آغاز ہوا تھا اور جو

[1] آئندہ سے ہم اس کو اختصار کے لئے الزبتھ کہیں گے۔

حال ہی میں سونا کمانے اور سٹے بازی کی جنگ میں موت کے گھاٹ اترا تھا۔ مانگسلاف بہت خوش رہ رہا تھا اور اس بنا پر ایک روایت قائم ہو گئی تھی کہ وہ ہنومنکی کا لڑکا نہ تھا بلکہ کسی شہزادے کے صلب سے تھا کیونکہ ہنومنکی کی شکل و شباہت کچھ یوں ہی سی تھی۔ مگر غالباً یہی سبب ہے کہ اسے گھوڑ دوڑ کا شوق اور ذی رتبہ اشخاص کی صحبت میں وقت گزاری کا چسکا تھا۔ خاندانی امراء اور رؤسا بھی اس سے بہت جلد گھل مل جاتے تھے اور بے تکلف جیکر بیاب کے نام سے پکارنے لگے تھے اور یہ لطف بعض اوقات شمتی گرم ہونیکا دست نگر نہ ہوتا تھا۔ لیکن دوسری طرف مانگسلاف کی کاروباری خرافات اور کسب دولت کی ہوس باآواز بلند اعلان کرتی تھی کہ نہیں صاحب ہم اپنے ہی باپ کے بیٹے ہیں۔ قصہ مختصر مانگسلاف الزبتھ کے لئے موزوں بر تھا۔

دو برس ادھر شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور ملک کے اخباروں نے اس کی طمطراق کا دیس اخباروں میں خوب ڈھنڈورا پیٹا۔

افواہیں ضرور پھیلیں کہ الزبتھ نے اپنی اس خالہ کے گھر سے بھاگ جانا چاہا جہاں سے اس کی شادی ہو رہی تھی اور جب گرجے میں پادری نے پوچھا کہ وہ مناکحت بخوشی و بلاجبر و اکراہ قبول کرتی ہے تو اس کا جواب نفی میں تھا۔ لیکن آپ جانتے لڑکیاں بعض وقت حماقت کر بیٹھتی ہیں چاہے یتیم ہی کیوں نہ ہوں۔ حقیقت جو کچھ ہو شادی ہو گئی اور ہنومنکی سے رشتہ قائم ہونے سے خاندان کلڈ ناسکی کی خوش حالی میں بیّن اضافہ ہو گیا۔

ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ الزبتھ اپنی حاصل کردہ حیثیت کی اہل ثابت نہ ہوتی۔ پیارے مانگسلاف نے مال و زر سے بھا بھا بھرے ہوئے صندوقوں پر قبیلہ کلڈ ناسکی کے مطالبات کثیر اور متواتر ہوتے تھے مگر اسی فراخدلی سے پورے نہ ہوتے تھے کیونکہ ان مطالبات کو واجبی اور مضبوط بنانے میں سفارش کیسی الزبتھ نے کبھی زبان نہ ہلائی۔

اس طرف مانگسلاف جو یہ تھا کہ ایک خوبصورت بیوی کا مالک ہونے کے باوجود اس کی ذات سے حسب توقع مالی منفعت اور رسوخ حاصل نہیں ہو رہے تھے۔ وہ اس جنس خوب و گراں بہا کی تلاش کرتا مگر نتیجہ ہمیشہ ناقابل اطمینان نکلتا۔ حالانکہ ایسا نہ ہونا چاہئے تھا۔ الزبتھ کے ذریعے گھوڑ دوڑ کے میدان یا سرکاری حلقوں میں پالا مارتا یا کسی ذی اثر شخص کو قابو میں لاتا ایک خواب تھا جو کبھی شرمندۂ

تعبیر نہ ہوتا۔ ایسی کشیدہ تعلقی نہیں کہ الزبتھ کی طرف سے ضدی پن بلکہ قریب قریب وحشیانہ مخالفت کا مظاہرہ شروع ہوا۔ ہنومنکی کو کاروباری چالیں چلنی آتی تھے اور یہ بالکل فطری تقاضا تھا کہ اپنی بیوی سے وقت پر مدد کی امید رکھے۔

اس کے علاوہ بھی الزبتھ میں متعدد معائب تھے جن کی وجہ سے خاندان والے نالاں رہتے تھے۔ مثلاً اس کی نظر میں روپے پیسے کی وہ "عظمت" توقیر نہ تھی جو زیبر کی اور اونچے گھرانوں کی شان امتیاز ہے۔ فیاض شوہر سے جتنا روپیہ ملتا "بے معنی" کتابوں یا صناعت کے شاہکاروں کی بہم رسانی میں اڑا دیتی۔ ایک عادت تو ایسی خراب، ایسی خراب تھی کہ اغماض ناممکن تھا۔ وہ کیا؟ جو کچھ روپیہ پیسہ موجود ہوتا بلا کسی تفریق کے آوارہ گردوں، فقیروں اور محتاج کسانوں میں تقسیم کر دیتی یا ایسے لوگوں کو بخش دیتی جو چلتے ہوئے فقرے گھڑ لاتے کہ ہم کام کرنا اور اپنی دنیا کی سدھارنا چاہتے ہیں۔ ان میں ایک سے زیادہ "اصلاح یافتہ" حضرات پیشہ ور جرم بن چکے تھے!

حاصل کلام دو خاندانوں کی اس شادی کو جو سراسر مصلحت اور دوراندیشی پر مبنی تھی اور اس سے وابستہ منصوبوں کو من موجی الزبتھ کا "جنون" ملیامیٹ کر رہا تھا۔ وہ ایک طرف تو ناقابل اصلاح "بہن" اور ایک طرف سرکش بیوی تھی۔

ابھی ابھی عزائم میں ایک شدید تصادم ہوا تھا۔ کس قدر حماقت! کیا یہ امر فطری نہیں کہ اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ اپنے خاندانی افراد اور اثر کو حصول مقصد کے لئے استعمال کریں؟ جب ایسے مواقع حاصل ہیں تو ان سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

قدرے مزید وضاحت کی ضرورت ہے:۔

ایک کارخانے مسمی از ڈورا وڈن اینڈ کمپنی کو فکر تھی کہ اس کے بنائے ہوئے گیس کے چولہے روسی ریلوں میں رواج پائیں۔ اس کا دارومدار ایک بڑے عہدہ دار پر تھا جو "کسلنسی" تھا اور پیٹرسبرگ میں رہتا تھا۔ وہ مانگسلاف سے بخوبی واقف تھا اور اس سے زیادہ کاؤنٹ وشیولاد سے جو اسی غرض سے ہنومنکی سے اس کی دیہی فرودگاہ میں ملنے آیا تھا۔ حال ہی میں "ہز کسلنسی" اور الزبتھ سے ایک دعوت میں تعارف ہوا تھا۔ "ہز کسلنسی"

بھول گئے — سردار جلیل

طوفانِ محبت میں دل کی کشتی کا بچانا بھول گئے
بس ایک ہی جلوے میں ان کے ہم ہوش میں آنا بھول گئے
پہلے تو اٹھایا کرتے تھے طوفان ہم اپنی آنکھوں سے
اب اشک بہانے کے دن ہیں اور اشک بہانا بھول گئے
اللہ رے شومیٔ قسمت جب پرسشِ غم کو وہ آئے
غیروں کے فسانے یاد رہے اپنا ہی فسانہ بھول گئے
انجامِ محبت تک ہمدم کیا جانئے کیا کیا ہو جائے
آغازِ محبت ہی سے جب ہم ہنسنا ہنسانا بھول گئے
جب سے کہ پلائی ہے ہمکو اک شوخ نے آنکھوں آنکھوں میں
اس وقت سے ہم دختِ رز کو ہونٹوں سے لگانا بھول گئے
بتلاؤ جلیل آخر کچھ تو ہر آن تبسم کیا معنی؟
چھپ چھپ کے بہاتے تھے آنسو کیا اب وہ زمانہ بھول گئے

ابھی جوان تھے بہت جلد ترقی کی تھی اور مستقبل میں مزید ترقی کی توقع بے جا تھی انہوں نے محل کھلا پہلا تمثال الزبتھ کو پسند کیا تھا اور اعلان فرمایا تھا کہ اس کے ہر حکم کی بسر و چشم تعمیل کریں گے۔ اب موقع آیا تھا۔ مانکسلاف اور کاؤنٹ ڈیولڈ الزبتھ کو لے کر پیٹرسبرگ جانے کے عازم تھے تاکہ ہز اکسلنسی سے گیس کے جواہروں کا سوال طے ہو جائے اور مانکسلاف اور کاؤنٹ ڈیولڈ دونوں کی جیبیں اعزازی "حق الخدمت" سے گرم ہوں۔ یہ ذکر ہی بیکار ہے کہ اس طرح وہ اپنے ملک کا بھی حق خدمت ادا کرتے۔ لیکن بغیر الزبتھ کے ہاتھ بٹائے بیل کا منڈھے چڑھنا مشکل تھا کیونکہ ہز اکسلنسی نے صاف صاف کہدیا تھا کہ رضامندی کی سند الزبتھ کے نرم و نازک ہاتھوں میں شرف قبول پائے گی۔

لیکن الزبتھ کا دو ٹوک جواب تھا کہ "مجھے اس جھگڑے سے کوئی سروکار نہیں، بھاڑ میں جائیں گیس کے جوہر"! اور جب اس سے (غالباً نادانستہ) یہ کہا گیا کہ فابرگ کے بنائے ہوئے زیورات عجیب و غریب ہوتے ہیں تو اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بھلا بتائیے کیا حرج تھا اگر وہ پیٹرسبرگ تک چلی جاتی جہاں کئی سربرآوردہ اشخاص سے ملاقات ہوتی اور دکھاتے میں فابرگ کے تیار کئے ہوئے زیور بھی دیکھنے میں آتے۔ لیکن ان ضدی عورتوں کو اپنے حسن و جمال کا صحیح مصرف آتا ہی نہیں۔

وہ کوچ پر لیٹی ہوئی تھی اور آنکھوں کی کھڑکیوں سے کبھی محبت جھانکتی تھی اور کبھی نفرت ـــ نفرت اس وقت جب دروازے کی طرف گھورتی کہ بہترین سوسائٹی کا کوئی تازہ نمونہ داخل ہو، محبت اس وقت جب پائیں باغ کی طرف تکتی جہاں شام کے سائے پھیل پھیل کر خنکی میں اضافہ کر رہے تھے اور شفاف نیلگوں آسمان کی گہرائیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ فطرت کا تناسب اور مقدس سکون دعوت نظر دے رہا تھا اور اس کے علی الرغم زر پرست دنیا داروں کے سرد و بے مہر ذہن سے تازہ تصادم کی وجہ سے اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا، اور اس کا ضمیر احتجاج پر آمادہ تھا۔

دوبارہ کسی نے دستک دی اور ایتھنی نے داخل ہو کر بادل ناخواستہ کہا کہ ایک کسان حاضری کا سائل ہے۔ کسان کبھی ذکار سے نہیں گئے اگر انہوں نے الزبتھ سے اپنا دکھ درد کہنا چاہا۔

وہ کوچ سے اٹھ بیٹھی اور کہا کہ "بلاؤ"۔ ایتھنی نے ادب مگر استقلال سے عذر کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کوئی اجنبی ہے اور تنہائی میں ملنا چاہتا ہے۔ میں نے سمجھایا تھا کہ یہ ممکن نہیں کیونکہ آپ کے یہاں مہمان آئے ہوئے ہیں لیکن وہ نہیں مانتا۔ ... ایسے وحشی کے ساتھ آپ کو ہرگز تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"کیوں، وہ میرا کیا بگاڑے گا؟"

"کچھ بگاڑے کہ نہ بگاڑے، اس کی صورت ایسی ہولناک ہے کہ ڈاکو معلوم ہوتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ جب وہ آئے تو میں موجود ہوں تاکہ گستاخی پر آمادہ ہو تو فوراً اسے ٹھکانے کر دوں"۔ ایتھنی نے کہا۔ اس کا انداز بدستور مؤدبانہ تھا مگر ہاتھوں کی ہم گردش ایسی تھی گویا کسی کی گردن مروڑ رہا ہے۔

"ایتھنی اسکو بلا لاؤ اور پھر تم چلے جاؤ گے، کیوں نا؟ میرا دل بولتا ہے کہ اس آدمی کو مجھ سے ضرور کچھ نہ کچھ کہنا ہے۔ میرے ایتھنی، میرے اچھے ایتھنی مجھے اس سے اکیلے ہی میں باتیں کرنے دو"۔ یہ کہکر الزبتھ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا جسکو بوڑھے ایتھنی نے پرجوش بوسہ دیا اور چلا گیا۔

جلد ہی بھاری بھدے قدموں کی دھمک سنائی دی اور دروازے تک آکر ایک کسان رک گیا۔ اس کی وضع درحقیقت اطمینان میں خلل ڈالنے والی تھی۔ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں رسمی سلام بجا لایا اور تعظیماً کمر خمیدہ کی۔ چپ چاپ کھڑا تھا، نظر اس بھورے قالین پر جمی ہوئی تھی جس پر الزبتھ کھڑی تھی۔

وہ دراز قد اور صنوبر کے درخت کی طرح کشیدہ قامت تھا۔ خوشنما یکہ مائل بغیر کالر کا سلیمانہ[1] پہنے تھا جس پر نیلے نقشوں کا کام تھا۔ بالوں کی لٹیں جھالر کی طرح پیشانی پر لٹک رہی تھیں جو دریائے بگ کے اس پار کی ترکیب ہے۔ وہ بظاہر رتھینین تھا۔ اتنا جوان تھا، مگر چہرہ ستا ہوا، رنگ بجھا بجھا جس سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے، آنکھیں وحشتناک اور خوفزدہ تھیں، ترشی ہوئی مونچھیں اور لب اس طرح ہلتے تھے گویا ان جملوں کو چبا رہا ہے جن کا زبان سے ادا ہونا مشکل ہے۔ ہاتھ پہلوؤں سے لگے ہوئے یوں لٹک رہے تھے جیسے درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سزائے موت ملی ہے اور پھانسی کے تختے پر چڑھنے کو ہے۔

جب وہ اس طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا الزبتھ نے ایسی آواز میں جذبات کا غلبہ جس کا گلا گھونٹ رہا تھا پوچھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"ہا، جنگل سے....." یہ کہکر وہ زور زور سے[2] سانس لینے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ صنوبر کے درختوں میں ہوا سرسرا رہی ہے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"یان کلوڈوا"

اس اطلاع سے وہ دہشت دور نہیں ہوئی جو اس جنگلی آدمی کے ساتھ کمرے میں گھس آئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے وحشت اور بھید کی حیا دے دیدنی برستی تھی، وہ دیوار کا سہارا لئے ہوئے تھا اور الزبتھ اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہوئی اس "مرقع الم" کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ اس کے دل میں کوئی فاسد خیال نہیں ہے بلکہ مبتلائے کرب و اضطراب ہے، تاہم اس کی آواز کی قدرتی موسیقیت اور ہمت آفرینی جواب دے گئی۔ دونوں خاموش کھڑے تھے۔ آخرکار کسان نے

---

[1] غالباً کوٹ۔ سلیمانہ کے صحیح معنی مجھکو معلوم نہیں۔ اثر

[2] بے اختیار دل چاہا کہ "زور زور سے" کی جگہ "زور سے زور سے" لکھدوں مگر مترجم صاحب نے ... باندھا۔ (اثر)

نہیں کیا کہ گفتگو کا سلسلہ شروع کرنا چاہیئے۔

"مہربان خاتون، میں جنگل سے آیا ہوں......"

"بلاشبہ ڈاکو ہے" الزبتھ دل ہی دل میں سوچی، "لیکن چونکہ یہاں علانیہ درانکسارانہ طور سے آیا ہے غالباً اس کا مطلب یہ التجا کرنا ہے کہ اس کو چھپا کر اس کے پیچھا کرنے والوں سے پناہ دوں، مجھے سنبھل جانا چاہیئے، کئی منٹ گزر چکے ہیں اور یہ اللہ کا بندہ ہکلا ہکلا کر اپنا نام دہرانے اور جنگل سے آیا ہوں بڑبڑانے کے سوا کچھ نہیں بولتا؟"

"تم جنگل سے بھاگ آئے ہو؟" اس نے پوچھا، "کس سے بھاگے ہو؟"

"بھاگ آیا ہوں؟" اس دیوپیکر نے گھبرا کے کہا اور پہلی مرتبہ آنکھ اٹھا کر الزبتھ کی طرف دیکھا۔ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ کھلے، سفید دانتوں کی چمک پھیلی، سامنے ایک مجسمۂ حسن دیکھ کر چہرے کا تناؤ ڈھیلا پڑا اور خشونت نرمی میں بدل گئی۔

اب اس نے جلد جلد بولنا شروع کیا۔

"میں جنگل سے نہیں بھاگا بلکہ جنگل میں بھاگا جب میرے اندر کی آواز نے پکارا۔ تین برس سے میری زبان بند ہے لیکن مہربان خاتون اب میں آپ کے پاس آیا ہوں کیونکہ لوگ کہتے ہیں آپ دیوی ہیں......"

الزبتھ کانپ گئی کہ یہ تو کوئی باؤلا ہے۔

"یہاں ایک آواز ہے......" کسان نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا اور اپنے سینے پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ اس کی آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔

"کیسی آواز؟" الزبتھ نے پوچھا۔

کسان نے منہ پھیر لیا اور اپنے آگے کی طرف پھیلے ہوئے اور ایک دوسرے سے گتھے ہاتھوں کو یوں مروڑا کہ گوشت سے خالی انگلیاں کڑکنے لگیں، پھر ایک عجیب لہراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مہربان خاتون جنگل پھر جنگل ہے۔ وہاں خدا کی آواز درختوں کی چوٹیوں سے سرگوشی کرتی ہے مگر نیچے زمین پر ایک ناپاک روح رینگتی اور پھنکارتی اور اکثر انسان کے جسم میں اتر جاتی ہے جب وہ آس پاس ہوتا ہے گویا آدمی جانتا ہے کہ اسے کس آواز پر دھیان دینا چاہیئے کیونکہ یہاں خود اس کی آواز موجود ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دوبارہ اپنے سینے پر گھونسا مارا۔ الزبتھ کو اب بھی گمان تھا کہ اس کے دماغ میں کچھ نہ کچھ خلل ضرور ہے، لیکن خوف دور ہو چکا تھا اور کسان کی باتیں زیادہ تندہی سے سن رہی تھی۔

"تم جنگل سے اچھی طرح واقف ہو؟" اس نے پوچھا

"جی ہاں، جنگل کے ملازم کے لئے جنگل کا جاننا ضروری ہے۔" جواب ملا۔

"تو تم ہمارے ہاں کے جنگلوں میں نوکر ہو؟"

"مہربان خاتون اس سال تک نوکر تھا جب یہ افتاد پڑی"

"کیا افتاد پڑی؟"

کسان نے آنکھیں پھیر لیں اور پھر اپنی انگلیاں توڑنے مروڑنے لگا۔

الزبتھ نے بھانپ لیا کہ اس کی بے چینی بڑھ گئی ہے کیونکہ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں جمع ہو رہی تھیں۔

"مہربان خاتون میں آپ کے سامنے سارا کچا چٹھا بیان کر دوں گا، لوگوں کا کہنا سچ ہے کہ آپ دیوی ہیں۔ جنگل میں کتنی ہی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے عام لوگ ناواقف رہتے ہیں لیکن جنگل کے ملازم کو جاننا چاہیئے، یہ تو اسکا اٹل فرض ہے۔ رات کے وقت جنگل ہمیشہ چوکس رہتا ہے اور آپ جھیل کے کنارے کھڑی ہو جائیں تو کوسوں ادھر کی آواز سن لیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ میرا یہ فرض تھا کہ اونچ نیچ پڑے تو فوراً اس کی اطلاع دوں......"

الزبتھ بے صبر ہوتی جا رہی تھی کہ اس تمام ہذیان کا مطلب کیا ہے، لہذا ہمت دلانے کو مسکرا کر کہا۔ "ارے بھئی صاف صاف کہدو نا کہ کیا ہوا۔ ڈرو مت"

"میں جانتا ہوں...... میں غریب ہوں اور تنخواہ سے کبھی کچھ بچا نہ سکا۔ گناہوں کا اقرار کرنے اور بچوں کو بپتسمہ دلانے کبلسیا جایا کرتا تھا، اس میں بہت پیسا اٹھتا تھا کیونکہ گنتی کے پادری ہیں اور بہت دور رہتے ہیں۔ تین برس سے کسی گرجے کے اندر سپاؤں نہیں رکھا اور وہ بچے مذہب کی برکتیں حاصل کئے بغیر بڑے ہو رہے ہیں[1] حالانکہ یہ روبل (روسی سکہ) میرے پاس ہیں اور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں......"

یہاں تک پہنچ کر اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے جیب سے ایک چکٹی ہوئی تھیلی اور تھیلی سے کچھ میلے نوٹ نکالے۔

"تم نے...... تم نے کسی کا روپیہ لے لیا؟" الزبتھ نے پوچھا

"کیا آپ کا مطلب ہے کہ میں نے چرا لیا؟ جی نہیں انہوں نے خود دیا"

"کھل کے کہو! شاید ریاست کی لکڑی بیچ ڈالی؟"

---

[1] زار کے عہد حکمرانی میں یونانی کیتھولک گرجا جسے یونیٹ بھی کہتے ہیں تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ ایسے گرجوں میں عبادت کی ممانعت تھی اور خلاف ورزی پر سزا دی جاتی تھی، اس وجہ سے پولینڈ اور روتھینیا کے کاشتکار جو اس عقیدے کے پیرو تھے اور آسٹریا کی پولینڈ کی سرحد کے قریب رہتے تھے جہاں یہ پابندیاں عائد نہیں تھیں کوشاں رہتے تھے کہ وہاں چوری چھپے جائیں، بچوں کو بپتسمہ دلائیں اور دیگر مذہبی رسوم ادا کریں۔ یہ کسان مذہب سے بہت شغف رکھتے تھے اور عبادت سے محروم ہو جانا بڑی مصیبت سمجھتے تھے۔ یہ لوگ اپنے عقائد پر سختی سے قائم رہے گو حکومت کی طرف سے برابر کوشش ہوئی اور جبر و تشدد کیا گیا کہ روسی آرتھوڈاکس مذہب قبول کریں۔ انہوں نے جان دینا گوارا کیا مگر اپنے عقائد سے جو ان کو محبوب تھے منحرف نہ ہوئے۔ کاشتکاروں کی متعدد آنے والی نسلیں ان لوگوں کو شہید کا مرتبہ دیتی رہیں۔

"جی نہیں"

"تو پھر کیا کیا؟ کسی کو قتل کر ڈالا؟"

"مہربان خاتون! اس سے بھی بری بات!"

الزبتھ نے اسکے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں، وہ آنکھیں جن سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور جن کی تاب لانا دشوار تھا۔ اس نے تحکمانہ طریقے سے ہاتھ بلند کرتے کہا۔

"ہاں کہو! کہو!"

کسان نے سر اٹھا کر دیکھا اور دیکھتے ہی چہرے پر مردنی چھا گئی، اسے خبر ہو گئی کہ اعتراف جرم کا لمحہ آ گیا۔

"میں ...... میں نے عدالت کے سامنے جھوٹا حلف اٹھایا اور ایسا کرنے کے لئے انہوں نے مجھے دس روبل دیئے ......"

"کہے جاؤ، پورا حال بیان کرو" یہ کہکر الزبتھ اس سے اور تھوڑی قریب ہو گئی۔

"میں نے انہیں دیکھا ...... درخت کاٹتے سنا ...... دبے پاؤں ان تک پہنچا اور ان کو دیکھا ...... انہوں نے بھی مجھکو دیکھا ...... جب مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو وہ میرے پاس آئے اور مجھے دس روبل دیئے کہ ان کے خلاف گواہی نہ دوں ...... میں بہت غریب تھا ...... میری بیوی بیمار تھی ...... میں نے [illegible] لے لیا ...... اور جھوٹی قسم کھائی ......"

الزبتھ برابر اس کی طرف تک رہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پوری روح کھنچ کر اس کی آنکھوں میں آ گئی ہے، اس قدر سرگرمی سے ہمدردی کا اظہار ہو رہا کہ مجرم کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب اس کی آنکھیں جھکی ہوئی نہیں اور آزادی سے گفتگو کر سکتا تھا، دل کا بوجھ ہلکا ہو چلا تھا۔

"لیکن میں نے روبلوں کو خرچ نہیں کیا ...... اس تھیلی میں وہی روبل ہیں ...... مہربان خاتون آپ لے لیجئے ...... تین سال سے مصیبت جھیلتا رہا ہوں، لڑکوں کو تیتسمہ نہیں دلایا، بیوی کے علاج کو ڈاکٹر نہیں بلایا ...... ان روبلوں کو نہیں چھوا ...... کیا آپ کا مطلب ہے کہ اعتراف گناہ کے وقت میں خود کسی پادری کو دے دوں؟ لیکن اسے ڈھونڈنے کہاں جاؤں اور میں نئے روسی پادریوں کے سامنے اپنے کو ذلیل بھی نہیں کر سکتا ...... اسی الجھن میں جنگل کے لگاتار پھیرے لگاتا رہا تاکہ اپنے اندر کی آواز سے پوچھوں کہ کیا یہ جھوٹے حلف کا روپیہ کلیسا میں بچوں کے بپتسمہ پر لگا سکتا ہوں لیکن آواز نے منع کیا۔ اسی سال موسم بہار میں آواز نے مجھ سے کہا کہ محل کی مہربان خاتون کے پاس جا کیونکہ وہ ولیہ ہے۔ یہ روبل اس کے حوالے کر کے رحم کی التجا کر۔ میں کئی دفعہ باغیچہ میں آیا، باورچی خانے کے گرد بھی چکر کاٹے لیکن درخواست کی ہمت نہ پڑی ...... آج آواز نے حکم دیا کہ فوراً جا ...... مہربان خاتون یہ روبل لے لیجئے اور میری روح کا بوجھ ہلکا کیجئے!"

تیسری مرتبہ اس نے وہی میلے کچیلے نوٹ الزبتھ کی طرف بڑھائے

وہ اس کے قریب گئی اور نفرت زدہ نوٹ اس کے ہاتھ سے لیکر اپنے پس پشت پھینک دیئے۔

کسان اس کے قدموں میں گر پڑا اور اس کے گھٹنوں سے لپٹ کر چلا یا۔

"مقدس خاتون کیا خدا مجھے معاف کر دے گا؟"

الزبتھ نے جھکے ہوئے دیہاتی کا سر اپنے دونوں ننھے ننھے ہاتھوں میں لے لیا اور گردن قدرے خم کر کے اس کے الجھے ہوئے اور جنگل کی خوشبو سے بسے ہوئے بالوں کو چوم لیا نیز اس چہرے کو جو خود آزاری کے پسینے اور ندامت کے آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ پھر گرفتہ آواز میں کہا۔

"تمہاری خطا ...... تمہارا گناہ سنگین ہے۔ لیکن تم نے اپنے اندر کی آواز سنی اور اس کے حکم کی تعمیل کی، خدا تم کو معاف کر دے گا"

کسان ابتک جھکا ہوا تھا، ہاتھ جوڑے ہوئے اور آنکھیں بند کئے، گویا دعا میں محو ہے۔ عالم رویا نیز اس مرئی خواب سے جو پیش نگاہ تھا طمانیت کی ایسی کرنیں پھوٹیں جنکی جوت نے اسکے چہرے کو بھی منور کر دیا۔ اس کا چہرہ آنند سے بھر گیا، اب وہ تھا اور از خود رفتگی۔ جب آنکھیں کھولیں اور اس معجزنما مجسمہ کو دیکھا اور روحانی نجات کا مژدہ ان لبریز ترحم آنکھوں میں پڑھا تو اس نے متانت سے کہا "بوجھ دور ہو گیا ......"

وہ دوبارہ جھکا اور دوبارہ الزبتھ کے گھٹنوں سے لپٹ کر آنسو بہاتا رہا۔

بعد ازاں وہ ایستادہ ہوا تو عظیم پرشکوہ تھا لیکن اس رحم سے چوندھیایا ہوا جس کا سزاوار ٹھہرا تھا۔ اس نے ادب سے سر تسلیم خم کیا اور چلا گیا۔ وہ بشاش تھا کیونکہ اس عذاب سے خلاصی پا چکا تھا جو سوہان روح تھا۔

دیر تک الزبتھ جہاں کھڑی تھی کھڑی رہ گئی، چہرہ دمک رہا تھا اور آنکھوں میں چمک تھی وہ خیالات جو محل سے جنگل اور جنگل سے محل آ جا رہے تھے لفظوں میں با آواز بلند اس طرح ادا ہوئے "کم سے کم جنگل کے بسنے والوں میں ابتک روح باقی ہے ......"

اس شام کو وہ کچھ ایسی کھوئی ہوئی اور اپنی ہٹ پر اڑی ہوئی تھی کہ اسکے شوہر یا کاؤنٹ ویٹولڈ نے گیس کے چولہوں کا تذکرہ بالکل فضول سمجھا انہوں نے گفتگو کے مختلف موضوع کرید کرید کر نکالے مگر الزبتھ کی طرف سے بے پروائی کا اظہار ہوتا رہا، البتہ کبھی کبھی یہ عجیب و غریب فقرہ دہرائی تھی جو ان خیالات سے یکسر غیر متعلق تھا جو اعلیٰ سوسائٹی کی کسی فرد کے ذہن میں آ سکتے ہیں۔

"ہاں اب بھی روحیں موجود ہیں ...... جنگل کے ان لوگوں میں"

اس ناقابل فہم فقرہ نے بعض لوگوں کو کھوج لگانے پر ابھارا۔ یقیناً محل کا کوئی ملازم جھانک رہا تھا جب پان کلوڈ ا اور الزبتھ کا واقعہ رونما ہوا کیونکہ بہت جلد یہ افواہ پھیل گئی کہ بیگم الزبتھ کسانوں کا منہ چومنے کی خوگر ہے!

کیمبرج یونیورسٹی کا دارالتجربہ

ٹھیک سو سال پہلے کی بات ہے ۱۸۴۶ء کی گرمیوں کا آغاز تھا کہ مشہور سائنس داں ولیم ٹامسن جو بعد میں لارڈ کیلون کے نام سے مشہور ہوئے، گلاسگو یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کے شراب خانہ پر قبضہ کیا۔ خالی پیپوں کو باہر پھنکوایا۔ نالیاں بنوائیں، نل لگوائے، اور اس طرح برطانوی یونیورسٹیوں کے سب سے پہلے معمل کی بنیاد پڑی۔

آج ہمیں یہ ساری باتیں بالکل معمولی اور غیر اہم نظر آتی ہیں۔ لیکن بات یوں ہے کہ ابھی انگلستان میں بھی دوسرے ملکوں کی طرح سائنس کا باقاعدہ مطالعہ کے خیال نے عوام کے دلوں میں جڑ نہیں پکڑی تھی۔ پھر بھی سائنس کا یہ ابتدائی معمل کیمبرج یونیورسٹی کی موجودہ مشہور معمل کیونڈش لیبوریٹری کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس لیبارٹری کو سلطنت برطانیہ کا بہترین دارالتجربہ کہا گیا ہے۔ اور ساری دنیا اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ جتنے بڑے بڑے اہم تجربات اس مرکزی لیبارٹری میں ہوئے ہیں دنیا کی کسی اور لیبارٹری میں نہیں ہوئے۔

گلاسگو یونیورسٹی کی بنیاد کے چند سال بعد کیمبرج کے چند ماہرین سائنس نے اپنی ایک لیبارٹری قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر خرچ کا اندازہ چھ ہزار پونڈ سے زائد کیا گیا۔ اس زمانہ کے معیار کے مطابق اتنی بڑی رقم کسی کالج میں سائنس کی لیبارٹری کے لئے بہت غیر معمولی تھی۔ اس لئے اگر ڈیون شائر کے ڈیوک خاندان کیونڈش کی فیاضی اور دریا دلی سہارا نہ دیتی تو اس مشہور عمارت کے بننے میں ابھی نہ جانے کتنا عرصہ لگتا۔ انہیں کی دی ہوئی رقم سے یہ دارالتجربہ تیار ہوا۔

ان دنوں یونیورسٹی کے چانسلر ڈیون شائر کے ڈیوک ہفتم تھے جو ہنری کیونڈش سائنسداں کے رشتہ دار تھے۔ ان کی مربیانہ عنایات کے سایہ میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ جیمز کلارک میکسویل جنہوں نے گرمی، روشنی اور مقناطیسی قوت کے متعلق بہت سا کام کر رکھا تھا۔ اس نئے کام کی صدارت کے لئے منتخب ہوئے۔ اور ۱۸۷۳ء تک اس لیبارٹری کا کچھ حصہ بن کر تیار ہو گیا۔ اگلے سال ۱۶ جون کو ڈیوک آف ڈیون شائر نے یونیورسٹی کے چانسلر ہونے کی حیثیت میں اس کا افتتاح کیا۔ موجودہ صدی کا ماہر سائنس اس لیبارٹری کے سازوسامان کی فہرست کو پڑھ کر بہت حیران ہوگا۔ پروفیسر میکسویل نے جو فہرست تیار کی تھی اسے دیکھ کر بے حد حیرت ہوتی ہے۔

کیونڈش لیبارٹری میں جو اولین تجربات کئے گئے ان کا دائرۂ عمل بے حد وسیع تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہر سچے طالب علم کو کیونڈش لیبارٹری استعمال کرنے کی پوری پوری اجازت تھی۔ ان کے نصاب تعلیم سے ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کا ہر ایک ممبر جو تجرباتی طریقہ جات یا طبیعاتی تحقیقات کو سیکھنے کی خواہش رکھتا ہو۔ اس لیبارٹری میں آزادی سے کام کر سکتا ہے۔

کیونڈش لیبارٹری نے اپنی اوائل عمر ہی میں وہ شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی جو اس کو آج حاصل ہے یعنی یہ کہ وہ پوسٹ گریجویٹ تحقیقات کا مرکز بنی اور وہ بے شک و شبہ سب جگہ سلطنت متحدہ کے مشہور ترین ماہران سائنس کا کارخانہ بن گئی۔ میکسویل کے بعد اس عہدہ کے لئے ایک دوسرے شہرۂ آفاق سائنسداں لارڈ ریلے ہوئے جنہوں نے کیونڈش لیبارٹری میں برقی مزاحمت کی اکائی کے شبہات کو نہایت خفیف لمبائی، چوڑائی، گہرائی کی صورت میں ظاہر کیا۔ نچلی منزل پر آخری کمرے کے اینٹ کے ستون پر ایک تختی کے کتبہ لگا ہے کہ سپننگ کوائل (Spinning Coil) کو جس کی بدولت لارڈ ریلے نے کامیابی حاصل کی اسی جگہ نصب کیا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ کے ہر حصہ سے کامیابی کی بو آتی ہے۔ مثلاً اسی جگہ پروفیسر جے جے ٹامسن نے برقیہ (Electro.) کی حقیقت کو ثابت کیا۔ یہیں کچھ عرصہ بعد ایک اور کیمبرج یونیورسٹی کے سائنسداں لارڈ رتھرفورڈ ایٹم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے یعنی بنیادی تجزیہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اور یہ کام ایٹم کی زبردست قوت کو اپنے قبضہ میں لانے کی سب سے پہلی منزل تھی۔ حقیقت میں اس قدر ضروری اور اہم تجربات و انکشافات کیونڈش لیبارٹری میں کئے گئے ہیں کہ اگر ان کی اہمیت بتلانے کے لئے بھی انسان کو بے حد ماہر سائنسداں ہونا چاہئے۔ بہرحال ہمیں ایک یا دو تجربات پر جن کی اہمیت مسلّم ہو چکی ہے توجہ دینی چاہئے۔ مثلاً ۱۹۳۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے دو سائنس دانوں کاک کرافٹ اور والٹن نے ایٹم کے ٹکڑوں کے ذریعہ جن کو ایک نئے طریق سے چلایا گیا تھا۔ ایٹم کے مرکزی حصے کے ٹکڑے ٹکڑے کئے۔ اس سے کچھ عرصہ پیشتر سر جیمز چیڈوک نے جو کیمبرج کے ایک اور مشہور سائنسداں ہوئے ہیں۔ نیوٹرون (neutron) کے انکشاف کا اعلان کیا۔ دو اور اشخاص ولیم بریگ اور اس کا بیٹا لارنس (جو ۱۹۳۸ء میں کیونڈش پروفیسر کے عہدہ پر ممتاز ہوا) کیونڈش لیبارٹری سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں انہیں نائٹ (   ) کا خطاب ملا اور ۱۹۱۵ء میں دونوں کی تحقیقات کی اہمیت کو تسلیم کر کے نوبل پرائز (Prize) دیا گیا۔ آج کیونڈش لیبارٹری کو اس کے بانی ڈیون شائر کے ڈیوک مرحوم اگر دیکھیں تو پہچان نہ سکیں گے۔ یہ اس قدر ترقی پا چکی ہے کہ اگر اس کو دنیا کی عظیم ترین تجربہ گاہ کہا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ انڈر گریجویٹ اور تحقیق کرنے والوں کے ساتھ آزادانہ طور پر اس کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کا سازوسامان کس قدر فراخدلی سے مہیا کیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہو جائے گا کہ لارڈ آسٹن مرحوم نے اس لیبارٹری کی ایک نئی شاخ کی تعمیر کے لئے جو ابتدائی تجربوں کے لئے بنائی گئی تھی ڈھائی لاکھ پونڈ کا عطیہ دیا۔ اس جنگ عظیم میں جو ابھی ختم ہوئی ہے کیونڈش لیبارٹری کا بہت سا سامان گورنمنٹ نے لے لیا تھا۔ اور وہ وقت شاید دور نہیں جب دنیا کو یہ معلوم ہوگا کہ کیونڈش لیبارٹری میں کام کرنے والے ماہران سائنس نے جرمنی اور جاپان کے خلاف لڑائی جیتنے میں کس قدر امداد کی۔

مادھورام

دارالعلوم ندوۃ العلماء

فکر ندوی

گذشتہ صدی کے اواخر اور اس صدی کے اوائل میں مسلمانوں کے "امراضِ تنزل" کے لئے جو بے شمار نسخے لکھے گئے تھے منجملہ ان کے ایک نسخہ "ندوۃ العلماء" کی تحریک بھی تھا۔

قوموں اور ملکوں کے عروج و زوال کے ہر ایسے موسم میں کچھ لوگ وقت سے پہلے بیدار ہوجاتے ہیں جبکہ تمام ملک خواب غفلت میں سرشار ہوتا ہے۔ چنانچہ قدرتی طور پر اس وقت بھی بعض ذکی الحس اور صاحب فکر طبائع دنیت کے اثرات سے متاثر ہوئیں۔ اور اپنی حالت پر مغرب کے اقتدار اور عروج کے مقابلے میں غور کرنے لگیں ـــــــ اس طرح تغیر و اصلاح کی تحریکوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا ـــــــ جس کا محرک اصلی تو مغربی تمدن کے اقتدار کا انفعالی اثر تھا ـــــــ لیکن اس اثر نے مایوسی کی بجائے سعی و کوشش کے جذبات پیدا کردئے۔ مطالعہ و مشاہدہ تنزل کے اسباب پر غور کرنے کا ذریعہ بن گیا ـــــــ اور اصلاح و درستگی کی تدابیر پر غور کیا جانے لگا۔

ہندوستان کے ارباب علم و فضل بھی ان حالات سے بےخبر نہ تھے۔ اور اب وہ بھی یہ سمجھ چکے تھے کہ آج مسلمانوں کی سرفرازی و سربلندی کا راز محض "دین و دنیا کے اجتماع" میں مضمر ہے۔ چنانچہ وہ اسی جد وجہد میں انتہائی انہماک سے مصروف ہوگئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے مصلحین بلاد اسلامیہ کے مقابلے میں ذرا دیر سے بیدار ہوئے۔ لیکن انھیں اس اثنار میں کافی غور و فکر کا موقع مل گیا۔ اور بہت سے مشاہدات تجربات حاصل ہوگئے جو ان کے لئے شمع راہ ثابت ہوئے۔

ندوۃ العلمار کا قیام

۱۸۹۲ء میں کانپور کے مشہور مدرسہ فیض عام کا جلسہ تھا۔ دور دور سے علمار وقت شرکت کے لئے آئے۔ دوران گفتگو میں یہ مسئلہ بھی آیا۔ گفتگو نے عمل کا قالب اختیار کیا اور "ندوۃ العلماء" کے نام سے ایک انجمن کی تشکیل ہوگئی ـــــــ اس انجمن کے اہم مقاصد یہ تھے:

(۱) ایسے علمار تیار کرائے جائیں۔ جو علوم مذہبی قرآن و حدیث و فقہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے ہوں اور خصوصاً علم کلام میں۔ تاکہ غیر مذہب والوں کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت و صداقت ثابت کرسکیں۔

(۲) قوم میں ایسے علمار کی بھی ایک جماعت موجود ہونی چاہئے جو علوم و فنون مثلاً صرف و نحو، ادب و انشا، منطق و فلسفہ وغیرہ میں مہارت تامہ رکھتی ہو۔ دوسری قوموں کے سامنے جب اسلام کی علمی عظمت کا تذکرہ آتا ہے۔ تو خواہ مخواہ خلیل، سیبویہ، عبدالقاہر جرجانی، سکاکی، فارابی، ابن سینا کا نام لینا پڑتا ہے۔

(۳) ایسے علمار بھی پیدا کئے جائیں جو دنیا کے حالات اور واقعات سے باخبر ہوں۔ اور ان کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ بستے ہیں اس کے اصول سلطنت کیا ہیں اور اس وقت مسلمانوں کی دنیاوی ضرورتیں کیا ہیں سلطنت کے انتظام میں جو تبدیلیاں پیش آتی رہتی ہیں ان سے مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑے گا۔ الحصر واقفیت، انتظام، تدبر، حزم اور مصلحت اندیشی میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہو۔

جب یہ طے ہوگیا کہ مذکورہ جماعت کے بغیر اسلام اور اسلامی علوم کی ترقی و استحکام ممکن نہیں تو پھر یہ غور کیا گیا کہ وہ کن ذرائع اور اسباب سے پیدا ہوسکتی ہے۔ بڑے غور و فکر اور مشورہ و استصواب کے بعد جو رائے اس معاملے میں قائم ہوئی وہ یہ کہ جب تک طلبار کو ابتدائی زمانۂ تعلیم سے اواخر تعلیم تک ایک خاص قسم کی تربیت و تعلیم نہ دی جائے اس قسم کے علمار پیدا نہیں ہوسکتے۔ اس لئے یہ قرار پایا کہ چند مخصوص اصولوں پر ایک عظیم الشان درسگاہ قائم کی جائے۔

کچھ دنوں کی ابتدائی جد وجہد کے بعد اس نقطۂ نظر کے تحت لکھنؤ کے مقام پر جو کسی زمانے میں اسلامی علوم و معارف کا مرکز رہ چکا ہے ایک درسگاہ "دارالعلوم ندوۃ العلمار" کے نام سے قائم کی گئی جو کہ روز اوّل سے آج تک انتہائی کامیابی سے چل رہی ہے۔

درسگاہ کی شاندار دو منزلہ عمارت شہر سے باہر ایک پر فضا اور پرسکون مقام پر واقع ہے جس میں بیس بڑے بڑے کمرے تعمیر کئے گئے ہیں اور ہر ایک کمرہ ایک خاص فن کیلئے مخصوص ہے اور اس فن سے متعلق انتہائی سہولتیں بھی اسی کمرہ میں بہم پہنچادی گئی ہیں۔

حال ہی میں چند ایسی عمارتیں بھی تعمیر ہوئی ہیں جن کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی تھی۔ مثلاً دارالاقامہ جس میں بیرونی طلبار کے لئے خوش فضا کمرے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ایک شاندار اور خوبصورت مسجد جو دارالعلوم کی عمارتوں کے درمیان دور سے ایسی نظر آتی ہے گویا انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہو۔

نظام عمل

دار العلوم کا پورا انتظام ایک مجلس کے سپرد ہے جو بیشتر ایسے ارکان پر مشتمل ہے۔ ان ارکان میں جہاں علماء اور مشائخ وقت ہیں وہیں جدید تعلیم یافتہ اصحاب فکر و نظر بھی موجود ہیں تاکہ قدیم و جدید تعلیم کے امتزاج سے جو جماعت تیار ہو وہ بہت سی خصوصیات کی حامل ہو۔

روزمرہ کے انتظامی معاملات کی سربراہی اور انجام دہی کے لئے معتمد مالیات کے عہدے قائم ہیں۔ دار العلوم کا اندرونی انتظام ایک پرنسپل کے سپرد ہے جو اپنے عہدے کے لحاظ سے مہتمم اور ناظر کہلاتا ہے۔ ناظر دار العلوم کے تمام تعلیمی اور انتظامی معاملات کا بھی ذمہ دار ہے۔ اس کی وہی ذمہ داریاں ہیں جو ایک کالج کے پرنسپل کی ہوتی ہیں اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی۔

دار العلوم کے مہتمم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ تبحر علمی، حسن انتظام، وسعت نظر اور زہد و تقویٰ کی صفات کا بخوبی حامل ہو۔

ناظر دار العلوم کی امداد و اعانت اور عام دفتری امور کی دیکھ بھال کے لئے "منصرم" کا عہدہ قائم ہے۔ اس کی ذمہ داریاں وہی ہوتی ہیں جو ایک یونیورسٹی کے رجسٹرار کی ہو سکتی ہیں۔

درس و تدریس کے لئے لائق ترین اساتذہ کی جماعت ہے جو بڑے انہماک و توجہ اور پوری دلچسپی کے ساتھ تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ اساتذہ کے انتخاب میں دار العلوم کا روز اوّل سے یہ مطمح نظر رہا ہے کہ ہر فن کے معلم علیحدہ علیحدہ ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ اہتمام کے ساتھ وہ اپنے خاص فن میں درس دے سکیں اور طلباء میں علم کا ذوق اور فنی تعلیم حاصل کرنے کا زیادہ سے زیادہ سلیقہ پیدا کر سکیں۔

خصوصیات

دار العلوم ندوۃ کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا نصاب تعلیم ہے۔ دار العلوم کے نصاب تعلیم میں قدیم و جدید علوم کے امتزاج کی کوشش کی گئی ہے۔ زبان عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی لازمی ہے۔ دار العلوم نے زبان انگریزی کے سلسلے میں ایسا نصاب مرتب کیا ہے جس کی مدد سے جلد سے جلد طالب علم میں انگریزی کے رسائل و اخبارات پڑھنے کا سلیقہ آجاتا ہے اور حسب ضرورت دوسری کتابوں سے استفادہ حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

انگریزی کے ساتھ جغرافیہ، حساب، جومیٹری اور تاریخ کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں تاکہ اگر کوئی متعلم میٹرک کا امتحان دینا چاہے تو بلا کسی مزید تیاری کے دیدے۔

ان ابتدائی علوم کے علاوہ علوم جدیدہ معاشیات و سیاسیات سے بھی طلباء کو روشناس کرایا جاتا ہے۔ معاشیات و سیاسیات کی تعلیم میں اصول و نظریات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے معاشی و سیاسی حالات بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ موجودہ معاشی مسائل کے حل میں اسلامی اصول سے بھی کام لیا جاتا ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام طلباء کے سامنے آجائے۔

سیاسیات کی تعلیم میں نظریات کی تشریح کے بعد سب سے پہلے ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے بحث کی جاتی ہے۔ واسکوڈی گاما کی آمد سے برطانوی قبضہ تک کی ساری سرگذشت سنادی جاتی ہے پھر منٹو مارلے اصلاحات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگست ۱۹۱۷ء کے تاریخی اعلان کا ذکر آتا ہے اور مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات پر گفتگو ہوتی ہے۔ اور اس سلسلے میں ملک کے ترقی پسند عناصر کا ذکر بھی آتا ہے اور ساتھ ہی قومی مطالبات کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ آخر میں موجودہ اصلاحات پر گفتگو ہوتی ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر بحث کی جاتی ہے اور اختصار کے ساتھ تمام ضروری باتیں بتائی جاتی ہیں تاکہ طلباء موجودہ مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے مطالعہ کے بعد بصیرت اور سنجیدگی سے کوئی رائے قائم کر سکیں۔ اس سلسلے میں اسلام کا نقطۂ نظر بھی واضح کیا جاتا ہے اور اسلامی نظام حکومت کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کشاکش حیات میں صحیح راہ بن سکے۔ سیاسی مسائل کو زیادہ ذہن نشین کرانے کی غرض سے ایک نقلی پارلیمنٹ بھی قائم ہے تاکہ نظری بحثوں کی عملی مشق ہو جائے۔

دار العلوم کے نصاب تعلیم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عربی زبان کی تعلیم ایک زندہ زبان کی طرح ہوتی ہے۔ طلباء کو محض کتاب فہمی کا عادی نہیں بنایا جاتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ لکھنے اور بولنے کی مشق بھی کرائی جاتی ہے اس سلسلہ میں دار العلوم ندوہ کا طریق تعلیم تمام عربی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بالکل مختلف ہے۔

سب سے پہلے طلباء کو روزمرہ کے مفردات ایک خاص ترتیب سے یاد کرائے جاتے ہیں اس کے ساتھ قواعد کے طرز پر آسان اور دلچسپ طریقے سے جملوں کی مشق کرائی جاتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب صرف و نحو کے ضروری قواعد آجاتے ہیں تو "حکایات اطفال" کا پہلا حصہ شروع کرا دیا جاتا ہے۔ بالعموم یہ منزل ایک مہینہ میں ختم ہو جاتی ہے۔ جب اس طرح ایک حصہ ختم ہو جاتا ہے تو اسی انداز میں استاد چھوٹے چھوٹے قصے لڑکوں کو سناتا ہے اور پھر ان سے وہی قصے بار بار زبانی کہلواتا ہے چند مشقوں کے بعد "القراۃ الرشیدہ" کا سلسلہ شروع کرا دیا جاتا ہے۔ اس طرح تین چار ماہ میں متعلم میں اتنی استعداد اور صلاحیت پیدا کرا دی جاتی ہے کہ وہ سادہ زبان میں چھوٹی چھوٹی حکایتیں لکھ سکے اور روزمرہ کی ضروری بات چیت کر سکے۔ ایک عرصہ دراز کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دو سال میں متعلم لکھنے بولنے اور سمجھنے میں کافی مشاق ہو جاتا ہے اور آسانی سے ہر قسم کے خیالات عربی زبان میں ظاہر کر سکتا ہے

آگے چل کر مصر کے ابتدائی ثانوی مدارس کے دو منتخب مجموعے پڑھائے جاتے ہیں۔ جو اسی غرض سے "وزارت معارف" نے مرتب کرائے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں ایک میوزیم بھی قائم ہے جس میں تمام چیزوں کے نمونے جمع ہیں تاکہ ترجمہ کے بغیر چیزوں کا تصور قائم ہو سکے۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً لڑکوں کو مشاہدۂ اشیاء کی غرض سے باہر بھی لے جایا جاتا ہے۔

دارالعلوم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عربی ادب کی جانب خصوصیت سے توجہ کی۔ اس لئے کہ ادب ہماری تعلیم کی حقیقی روح ہے۔ قرآن و حدیث کے بیشتر خزائن و علوم اس کے اندر مدفون ہیں۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ ہندوستان میں اسی فن کی جانب نسبتاً کم توجہ کی گئی۔ چنانچہ دارالعلوم نے فن ادب پر خاص زور دیا تاکہ طلباء فصاحت و بلاغت کے ساتھ صحیح عربی لکھ پڑھ سکیں۔ دارالعلوم کا یہ طریق تعلیم قدیم عربی مدارس کے ارباب حل و عقد کے لئے ایک عجوبۂ روزگار بن گیا اور اس وقت ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دارالعلوم ندوہ کے طلباء کو عام جلسوں میں عربی زبان میں فی البدیہہ تقریر کرتے اور برجستگی سے گفتگو کرتے دیکھا۔ اس سے عام لوگ بہت متاثر ہوئے اور خصوصیت سے ندوہ کی جانب متوجہ ہوئے۔

دارالعلوم ندوہ میں عربی ادبیات کے ساتھ تاریخ ادب بھی پڑھائی جاتی ہے تاکہ ادب کے متعلم کے سامنے عہد جاہلیت سے آجتک کے تمام ادبی تغیرات آجائیں۔

دارالعلوم کی ایک خاص چیز یہ ہے کہ اس نے اپنے نصاب تعلیم میں دینیات کی تعلیم پر خصوصیت سے زور دیا ہے۔ علوم اسلامیہ کی درس و تدریس کا اصلی مقصد قرآن پاک تھا لیکن عام طور پر معقولات اور فلسفہ مطمح نظر بنکر رہ گئے۔ قرآن اور علوم قرآن بالکل نظر انداز کر دیئے گئے۔ اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے دارالعلوم نے عربی ادبیات کے بعد قرآن پاک کی جانب خاص طور پر توجہ کی اور معانی و مطالب اور تفسیر و ترجمہ کے لحاظ سے اسے مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا اور ایسی کتابیں خصوصیت سے داخل درس کی گئیں جن میں علوم قرآن سے بحث کی گئی ہے اور بالخصوص وہ جن سے قرآن پاک کا اعجاز ثابت ہو جیسے "اعجاز القرآن باقلانی" وغیرہ۔

دارالعلوم نے اپنا طریقۂ تعلیم بہت حد تک فطری رکھا ہے اور ہر فن کو تین ادوار میں تقسیم کر دیا ہے۔ سب سے پہلے وہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جنھیں سلیس زبان میں نفس مسائل مذکور ہوں۔ دوسرا دور ان کتابوں کا ہے جن میں مسائل کے ساتھ ان کے دلائل بھی واضح طور پر بیان کئے گئے ہوں۔ اور تیسرا دور ان کتابوں کا آتا ہے جن کی عبارت دقیق اور پیچیدہ ہو تاکہ متعلم میں دقت نظر اور مشکل عبارتوں کے سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ قرآن پاک کی تعلیم بھی اسی ترتیب سے دی جاتی ہے۔

سب سے پہلے قرآن مجید کا تشریحی ترجمہ پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد علمی انداز میں تعلیمی مسائل پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے اور پھر اس کے بعد مفسرین کی کاوشیں اور ان کی تحقیقات انہی کے الفاظ میں بتائی جاتی ہے۔ بالکل یہی ترتیب حدیث کی تعلیم میں بھی رکھی گئی ہے۔ اس سلسلے میں خاص کوشش یہ کی جاتی ہے کہ متعلم میں ذاتی تحقیق و جستجو کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے۔ اسی کے ساتھ اسلامی تاریخ پر خصوصیت سے زور دیا جاتا ہے اور طلباء کو اسلامی عہد سے متعلق سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تمدنی مسائل سے آگاہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان پر غور کر سکیں اور اس عہد نو کی تشکیل میں ماضی کے ان تجربوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔

یونین "الاصلاح"

طلباء کو ذہنی و فکری تربیت کے لئے علمی و ادبی مجلس "الاصلاح" قائم ہے جس کے تحت تمام علمی ادبی اور تفریحی مشاغل انجام پاتے ہیں۔ اس انجمن کا تمام انتظام طلباء کے ہاتھ میں ہے اور انہی کے نمائندے انتظام کرتے ہیں۔ ہر سال نئے انتخابات ہوتے ہیں اور ایک نئی مجلس انتظامیہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ "ناظم" اس انجمن کا سب سے بڑا عہدہ ہے اور اس کی امداد و اعانت کی غرض سے متعدد عہدے دار ہوتے ہیں۔ انجمن کے پاس اپنا ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں اردو کی تقریباً تمام اہم مطبوعات موجود ہیں۔ کتابوں کے ساتھ پرانے اخبارات و رسائل کے فائل بھی موجود ہیں۔ اس کتب خانہ کے علاوہ ایک "ریڈنگ روم" بھی قائم ہے جس میں اردو، انگریزی، عربی اور فارسی کے تمام موقر جرائد و مجلات آتے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی ممالک کی سیاسیات سے واقفیت کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔

مصر کے مشہور روزنامہ "البلاغ" کے علاوہ (جو سارے عالم اسلامی کی کیفیات اور واقعات کا حامل ہوتا ہے) افغانستان، عراق، شام، حجاز، الجزائر اور ٹیونس وغیرہ کے اخبارات بھی آتے ہیں تاکہ براہ راست ان ممالک کی سیاسیات پر گہری نظر رہ سکے۔ طلباء اپنی مشق کے لئے خود بھی قلمی رسائل و اخبارات نکالتے ہیں۔ عربی اردو کی تقریروں کے لئے ہفتہ وار جلسے بھی ہوتے ہیں جن میں مختلف عنوانات تقریریں کی جاتی ہیں۔ ان جلسوں میں اکثر اساتذہ بھی شرکت کرتے ہیں اور بعض اوقات خود بھی حصہ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں باہر کے مشاہیر اور ماہرین فن کو بھی دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے خیالات سے طلباء کو مستفید کر سکیں۔

دارالعلوم ندوہ نے تکمیل فن خاص (ایم۔ اے) کی کلاس بھی قائم کی ہے تاکہ طلباء اپنی طبعی مناسبت کو دیکھ کر دو سال کے عرصہ میں کسی ایک فن میں مہارت تامہ حاصل کر سکیں جس سے انھیں طبعی مناسبت ہے۔

دارالاقامہ

دارالعلوم ندوہ نے طلباء کے قیام کے لئے ایک عالیشان دارالاقامہ تعمیر کرایا ہے۔ یہ دارالاقامہ

ہ شبلی ہوسٹل انکے نام سے موسوم ہے۔ ہوسٹل کے اندرونی انتظامات کے لئے نگراں مقرر ہیں جو طلباء کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ ہوسٹل میں لڑکوں کی تقسیم عمروں کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ بڑے چھوٹے اور متوسط عمر کے طلباء کو علیٰحدہ علیٰحدہ کمروں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ متعدد استاد مقرر ہیں جو شب و روز ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ اور پورے انہماک و توجہ کے ساتھ طلباء کی ذہنی صلاحیتوں کو ترقی دینے کی فکر میں مصروف رہتے ہیں۔ شبلی ہوسٹل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں رہنے والے طلباء کے باہمی تعلقات دوستی کی حد سے گذر کر یگانگت کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور یگانگت کا یہ رشتہ تعلیمی زندگی ہی میں نہیں بلکہ عمر بھر قائم رہتا ہے۔ ایک "ندوی" خواہ دنیا کے کسی حصہ میں کیوں نہ ہو دوسرے "ندوی" کے لئے اپنی آغوش ہمیشہ وا رکھتا ہے۔

ندوہ کے اس نظام تعلیم سے گزشتہ تیس چالیس برس کے عرصہ میں جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں ان کے متعلق کچھ کہنا غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔ ملک کے گوشے گوشے میں ندوہ کے تربیت یافتہ "فرزند" موجود ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔

رموز و اسرار

دنیا کی فضا سے مسکراتا ہوا جا
جینے والوں کے دل بڑھاتا ہوا جا
وہ ترکِ وطن تھا اور یہ عزمِ وطن
روتا ہوا آیا تھا تو گاتا ہوا جا

⁂

نعمت ایک ایک یاد آ سکتی ہے
دل میں امید مسکرا سکتی ہے
احسان شناس ہے تو تسنیم تیرے
اک صبح کی تازگی بھلا سکتی ہے

⁂

انسان کی زندگی کو شرماتے ہیں
خوش خوش آتے ہیں خوش خوش چلے جاتے ہیں
پھولوں میں نہ جھگڑا ہے کوئی اور نہ فساد
کھلتے ہیں مہک دیتے ہیں مرجھاتے ہیں

⁂

کیا کیجئے نگاہ عارفانہ لیکر
چلتا ہے مجھے ساتھ زمانہ لیکر
دم بھر جو ترددمیں قدم رکتا ہے
قسمت بڑھتی ہے تازیانہ لیکر

⁂

چڑھتی ہوئی دھوپ دم میں ڈھل جاتی ہے
گردوں کی طرح نظر بدل جاتی ہے
تیری ہی زمیں ہے جیسے اطمینان نہ چل
یہ پاؤں سے بھی کبھی نکل جاتی ہے

نجم آفندی

دارالعلوم ندوۃ العلماء

دارالعلوم ندوہ اے مرکزِ ترقی
گہوارۂ علوم دینی و فکرِ عصری

اے مہدِ علم و حکمت۔ سرچشمۂ ہدایت
اے گلشنِ ذہانت اے محفلِ فطانت

تو نے ہمیں سکھایا دانش فروز ہونا
تو نے ہمیں بتایا۔ ہنگامہ سوز جینا

اسلاف کے علوم و حکمت کا رازداں ہو
تو اس جہاں میں گویا اک باغ بے خزاں ہو

ماضی کی نکتہ سنجی۔ ماضی کی نکتہ دانی
افکارِ اہلِ مغرب۔ با صد ضیا فشانی

اسلام کی نظر سے تو نے دکھائے ہم کو
اسرارِ علم و دانش تو نے بتائے ہم کو

رازی کا رازِ پنہاں۔ بحرزی کا فخرِ حکمت
یعقوب کا تخیل۔ فارابی کی فطانت

بغداد و قرطبہ کے پُر نور کارنامے
ہم نے تری بدولت عصرِ رواں میں دیکھے

ہندوستاں میں جتنے اربابِ علم و فن ہیں
وابستہ ہیں وہ تجھ سے یا تیرے ہم سخن ہیں

شبلی کی روحِ علمی رگ رگ میں تیری جاری
اے مرکزِ سلیمان ہر چیز تجھ پہ واری

ہندِ جدید میں ہے از بسکہ ہم نوا تو
امت کا راہبر تو۔ ملت کا رہنما تو

بخشی ہے تو نے ہم کو فکر و نظر سلف کی
پائی ہے ہم نے تجھ سے گویا خبر سلف کی

ندوہ کا نام روشن ہو بزمِ زندگی میں
پنہاں ہے اپنا رازِ علم و عمل اسی میں

اربابِ علم و دانش تابندہ باد یا رب
دارالعلوم ندوہ۔ پائندہ باد یا رب

علم و عمل کی رو سے یہ گھر بنے ہمارا
ندوہ ہر اک طرح سے اختر بنے ہمارا

محمود الحسن قریشی

اردو اور سائنس

۲

رضی الدین صدیقی

اصطلاح بناتے وقت اس امر کو بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ اس لفظ کے مرکبات اور مشتقات آسانی سے حاصل ہو سکیں۔ مثلاً فرض کیجئے کہ لفظ (Axiom) کے لئے اپنے بہار کمیٹی کی منظور شدہ اصطلاح "آپ سچ" اختیار کر لی۔ اب بتایئے کہ اس کی جمع کیسے بنائی جائے گی (.Axiomatic Method) اور (Axiomatisation) کے لئے کیا الفاظ ہوں گے۔ غرض وضع اصطلاحات کے موقع پر ایسے ہی باریک نکتوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔

اس کے باوجود اگر اردو اصطلاحوں پر مشکل اور غیر مانوس ہونے کا الزام برقرار رکھا جائے تو پھر میں عرض کروں گا کہ یہ الزام دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں پر بھی اسی طرح عائد ہوتا ہے۔ مثلاً انگریزی میں ایک اصطلاح (Transversal) ہے اگر ایک لکیر کسی دائرے کو کاٹے تو اس لکیر کو دائرے کی (Transversal) کہتے ہیں حالانکہ انگریز سائنس داں اس کو (Caste) بھی کہہ سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی زبان ہو یا جرمن اور فرنچ صرف نامعدودے چند اصطلاحیں ایسی ہیں جو شاید عام طور پر استعمال ہونے والے الفاظ سے مطابقت رکھتی ہیں ورنہ بے شمار اصطلاحیں عام زبان سے بالکل مختلف ہیں اور سائنسی ادب میں یہ عمل بالکل ناگزیر ہے۔

غرض عربی اور فارسی سے علمی اردو میں استفادہ نہ کرنے کا جو رجحان آج کل عام طور پر پیدا ہو گیا ہے، وہ اردو کی فطری ترقی اور تقاضوں کے حق میں سراسر ناانصافی ہے۔ ماہرین لسانیات اس پر متفق ہیں کہ ہندی فارسی اور عربی، اردو کے اہم اور بنیادی ترکیبی عناصر ہیں اس لئے نئی اصطلاحوں کے بناتے وقت سب سے پہلے انہی زبانوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

ہندی زبان سے شروع سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ اردو کی قدیم ترین سائنسی کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی الفاظ کو اصطلاحات کے سلسلے میں مناسب حد تک شروع ہی سے استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہی طریقہ دہلی کالج اور علی گڑھ سوسائٹی کے علاوہ آج کل جامعہ عثمانیہ اور انجمن ترقی اردو میں بھی رائج ہے۔

بقول میر حسن صاحب "اگر اردو زبان اپنی علمی اور سائنسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے سلسلے میں ہندی سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندی زبان کا سرمایہ زیادہ تر عشق و عاشقی کے مخصوص مضامین، مناظر فطرت کی عکاسی، ہندو تصوف و فلسفہ اور روزمرہ کی عام باتوں تک محدود ہے اور ہندی میں علمی اور سائنسی ضرورتوں کو پورا کرنے والے لفظوں کی بہت کمی ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے کہ انگریزی زبان ابتداء میں ترجمہ کے دور سے گزر رہی تھی تو اس نے سائنسی اور علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دیسی زبان یعنی اینگلو سیکسن زبان لاطینی اور یونانی زبان سے استفادہ کیا۔ اینگلو سیکسن زبان سے زیادہ استفادہ اس لئے نہیں کیا گیا کہ اس زبان کا سرمایہ تخیلی اور رومانی ادب، شعر و شاعری اور روزمرہ تک محدود تھا۔

غرض میری رائے میں سائنسی اور علمی اردو کی تشکیل اور ترقی کے لئے عربی اور فارسی سے مناسب استفادہ ناگزیر ہے۔ اور اگر مصنوعی طور پر ان کے استعمال کو ممنوع قرار دیا جائے تو ہماری علمی زبان خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکے گی اور ملک کو ہمیشہ انگریزی یا دوسری غیر زبانوں کا محتاج رہنا پڑے گا۔

ایک اور اعتراض اردو اصطلاحوں پر یہ کیا جاتا ہے کہ ہندی الفاظ کے ساتھ عربی یا فارسی کے لاحقے اور سابقے لگائے گئے ہیں اور یہ طریقہ غلط ہے اور اس قسم کے بہت سے لفظ جیسے پان دان اگال دان وغیرہ موجود ہیں۔ اگر نئی اصطلاحیں بھی اسی قدیم اصول پر بنائی جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر زبان میں وسعت اسی طرح پیدا کی جاتی ہے کہ مختلف زبانوں سے ضروری لفظ لئے جائیں۔ چنانچہ جدید کوانٹم نظریے میں انگریزی سائنسدانوں نے جرمن اصطلاح (Eigenwert) کا ترجمہ اپنی زبان میں (Eigenvalue) کر لیا یعنی جرمن لفظ (Eigen) کو انگریزی لفظ (.Value) سے ملا کر ایک لفظ بنا لیا۔

غرض علمی زبان کی تشکیل میں اردو ٹکنیکل اصطلاحوں کے بناتے وقت نہ صرف مختلف علوم و فنون کی واقفیت بھی ضروری ہے اور جامعہ عثمانیہ کے علاوہ انجمن ترقی اردو، ادارۂ ادبیات اردو، جامعہ ملیہ وغیرہ میں انہی اصولوں پر کام ہو رہا ہے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ ابتداء میں یہ زبان لوگوں کو قدرتی طور پر نامانوس سی معلوم ہوئی لیکن اب یہی اصطلاحات اخباروں رسالوں اور کتابوں کے علاوہ ریڈیو میں بھی استعمال ہونے لگی ہیں اور جب انگریزی زبان کی مرعوبیت دور ہو جائے گی اور اردو ہندی کے تعصبات سے نجات ملے گی تو اس وقت جامعہ عثمانیہ کی زبان سارے ملک میں تعلیمی زبان کی حیثیت سے عام ہو جائے گی۔ ہندوستان میں آئے دن اردو کی جو کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بہت کم کسی علمی معیار

کو پورا کرتی ہیں۔ ان کی حیثیت سوائے رسانی کے ان افسانوں کی سی ہوتی ہے جن کو لوگ ریل کے سفر میں یا چھٹی کے دن محض وقت کاٹنے اور دل بہلانے کی خاطر پڑھتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس قسم کی کتابوں کی قطعی ضرورت نہیں، لیکن ان کا تناسب ہمارے ادب کی مجموعی پیداوار میں اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے جتنا کہ ایک سنجیدہ انسان کی زندگی میں تفریح کے اوقات کا ہوتا ہے۔ یہی حال ہمارے اخباروں اور رسالوں کا ہے۔ یوں تو اردو کے بیسیوں نئے اخبار اور رسالے نکلتے رہتے ہیں لیکن دو چار کے سوا ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو کسی ترقی یافتہ قوم کے رسالوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ بعض اس قسم کی کتابوں اور رسالوں کی بنا پر ہماری زبان اور ہمارے ادب میں ترقی نہیں ہو سکتی۔

کسی شخص کی عمر نوح کی طرح اتنی طویل تو نہیں ہوتی کہ وہ طبع ہونے والے تمام رطب و یابس کو پڑھ سکے۔ اس مختصر زندگی میں کوئی انسان صرف چند منتخب کتابیں ہی پڑھ سکتا ہے اور اس لئے اعلیٰ معیار کی چند کتابوں کا شائع کرنا ناقص معیار کی بہت سی کتابوں کے شائع کرنے سے بہتر ہے۔ مصنفین کے علاوہ ناشرین کو بھی چاہئے کہ جب تک کوئی تصنیف یا تالیف نہایت اعلیٰ معیار پر پوری نہ اترے اس کو شائع نہ کیا جائے۔ پرانی اور فرسودہ باتوں کو دہرانا اپنے اوقات ضائع کرنے کے علاوہ سننے اور پڑھنے والوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اچھا مصنف بننے کے لئے زبان پر مہارت کے علاوہ تین چیزیں نہایت ضروری ہیں

(۱) مشاہدہ (۲) مطالعہ (۳) غور و فکر   بدقسمتی سے ان تینوں اجزاء کی ہم میں بہت کمی ہے اور اس کمی کی وجہ سے ہماری تقریریں اور تحریریں ایک لایعنی طومار ہو کر رہ جاتی ہیں جن میں چند خیالات کی تکرار اور بار بار تکرار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ ادب اور شاعری میں بڑا عنصر غیبی الہام اور القا کا ہوتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ شاعر اور ادیب تو کجا پیغمبروں پر بھی الہام اسی وقت ہوتا ہے جب وہ پہاڑ کے غاروں میں اپنی عمر کا بڑا حصہ سوچ بچار میں صرف کر دیتے ہیں۔

بہر حال جس طرح محض افراد کی تعداد سے کوئی قوم بلندی کے مدارج طے نہیں کر سکتی اسی طرح محض کتابوں کی تعداد میں اضافہ سے کوئی زبان اور ادب ترقی نہیں کر سکتا۔ پھر اس کے لئے محض افسانوں یا نظموں کی کتابیں کافی نہیں بلکہ شدید ضرورت ہے کہ ہماری زبان میں ہر قسم کی علمی، فنی اور سائنسی کتابیں اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کی اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں شائع ہوں۔ کسی ترقی یافتہ قوم کی زبان مثلاً جرمن، فرنچ یا انگریزی ہی کو لیجئے۔ اس زبان میں بھی معمولی افسانوی اور نظموں کی کتابیں کافی تعداد میں چھپتی ہیں لیکن کیا کوئی سمجھدار شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اس زبان کی اس قدر عالمگیر اہمیت محض ان افسانوں اور نظموں کی وجہ سے ہے۔ دنیا کے ہر خطہ میں رہنے والوں کی ایک کثیر تعداد جو اس زبان کو سیکھتی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس زبان میں تاریخ، معاشیات، فلسفہ، عمرانیات، ریاضی، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، انجینیری، طب، قانون، فن تعلیم وغیرہ تمام علوم و فنون کی بیش بہا اور بلند پایہ کتابیں زیادہ شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اگر ہم اردو زبان کے معیار کو بلند کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ اردو میں اعلیٰ درجہ کی علمی اور فنی کتابیں کثیر تعداد میں شائع کریں جن میں سے بعض ماہرین اور محققین کے لئے ہوں اور بعض عام دلچسپی رکھنے والوں کے لئے۔

اگر پورے ہندوستان کے باشندے نہیں تو کم از کم دس بارہ کروڑ ہندوستانی تو ضرور اردو لکھ پڑھ سکتے ہیں اور بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ جرمن اور فرانسیسی بولنے والوں کی تعداد بھی اس قدر نہیں لیکن اس کے باوجود یہ زبانیں جیسی کچھ ترقی یافتہ ہیں اس سے کم و بیش سب لوگ واقف ہیں۔ اگر ہمارے ملک کی معاشی اور تعلیمی حالت اچھی ہو تو ہماری زبان کو بھی اس کے ہم پلہ بننے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگے گی لیکن ملک سے جہالت اور پستی کو دور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے کہ علم کی روشنی کو عام کیا جائے اور علوم و فنون کی مختلف کتابوں کا جال سارے ملک میں بچھا دیا جائے۔ اگر یہ کتابیں مسلمہ ماہرین کی لکھی ہوئی ہوں اور اچھے پیرایہ میں لکھی جائیں تو لوگ ان کو ایسی دلچسپی سے پڑھیں گے جیسے آج کل افسانوں کو پڑھتے ہیں۔ یہ ہمارا چشم دید واقعہ ہے کہ انگلستان میں سر جیمز جینس اور سر آرتھر ایڈنگٹن کی کتابیں افسانوں کی کتابوں سے زیادہ مقبول ہوئی ہیں۔ حالانکہ ان مصنفوں نے جدید ترین سائنسی انکشافات کو بیان کیا ہے۔

اسی طرح ہمارے جلسوں اور کانفرنسوں میں علمی مضامین کو بیش بیش جگہ دینے سے دوگونہ فائدے حاصل ہوں گے۔ اول تو یہ کہ اردو زبان میں ہر قسم کے جدید ترین علمی خیالات کے اظہار کی صلاحیت پیدا ہوگی، دوسرے یہ کہ اس سے خود اہل ملک کی ذہنیت میں بڑا انقلاب ہوگا یعنی آج کل نظموں اور افسانوں کو پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے جو غلبہ جذبات کا ان کے دل و دماغ پر ہو گیا ہے اس کی بجائے وہ زیادہ معقول پسند ہو جائیں گے۔ اور اس طبیعی کائنات کی حقیقت سے بھی بخوبی واقفیت ہو جائیگی۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سائنسی ذہنیت کی ہم میں بہت کمی ہے اور اسی وجہ سے ہمارے اکثر افراد جو تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتے ہیں شاعری اور لفاظی میں گم ہو جاتے ہیں۔ علوم و فنون سے ہماری ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ معمولی سے معمولی ایجاد یا انکشافات بھی ہمارے نزدیک ایک خطرہ سے کچھ کم حیرت انگیز اور ناقابل فہم نہیں۔

(باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

کچھ غزل کے بارے میں

(۱)

مخمور اکبرآبادی

غزل کے بنیادی عناصر کی تلاش کے لئے پہلے لفظِ غزل کے لغوی معنی اور پھر صنفِ شعر کی حیثیت سے، غزل کے تاریخی ارتقا پر نظر ڈالنی پڑے گی۔

غزل کے لغوی معنی، راز گفتن بہ معشوق ہیں۔ غزلیہ شاعری فی الجملہ جذباتی شاعری ہے اور جذبات کے دائرے میں ذاتی تجربے کی بڑی اہمیت ہے، اس لئے غزل کا موضوع بہت وسیع ہے۔ وہ سارے رموز و تاثرات، وہ تمام مسائل و مباحث، جن سے کوئی فردِ واحد دوچار ہو سکتا ہے اور جن پر وہ اپنے ذہنی ماحول اور علمی ساز و برگ کے حدود کے اندر، اپنی محبوبہ سے گفتگو کرنا چاہے، غزل کا موضوع بن سکتے ہیں۔

حقیقی تغزل، اصل میں ہلکی پھلکی، پیاری پیاری، لطیف اور نازک باتوں کا نام ہے جو دل سے نکل کر بلا راست دل تک پہنچتی ہیں اور پہنچتی ہوئی محسوس بھی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ، بہت سے محسوسات، بہت تجربات کا بھی بوجھ سا ہوتا ہے۔ ان کی موجودگی سے جیون بھاری بھاری محسوس ہوتا ہے۔ ان کے کہہ ڈالنے سے جی ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے، بھڑاس سی نکل جاتی ہے، دل کی تھکن سی اتر جاتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ خود اپنے نفس میں ان کے کہہ ڈالنے کی شدید خواہش بیتاب معلوم ہوتی ہے اور ان کے کہہ ڈالنے سے خود بہ خود مزہ بھی آنے لگتا ہے۔ اس بوجھ کے اتار دینے کا ایک ادبی نام (Self-Realisation) بھی ہے اور یہی تغزل کا مترادف ہے لیکن تغزل کا اقتضا یہیں تک محدود نہیں، بسا اوقات، یہ عظمت و وقار، رقت و عمق، تفکر و تصور کا مطالبہ بھی کرتا ہے، اور ان تمام منازل و کوائف میں رومانیت کی ایک لہر، جمال پرستی کا ایک خفیف شائبہ ضرور شامل ہوتا ہے۔ ان سب سے بالاتر سچی واقعیت ہے۔ رومانیت قلب پر کبیر چھا جاتی ہے، لیکن سچی واقعیت کو رومانیت پر یہ فوقیت ہے کہ وہ قلبِ انسان کو اس مقام پر کھینچ لاتی ہے جہاں دل سجدہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں، سچی رومانیت، خود بیرنگ واقعیت کا دوسرا نام ہے۔ بہر حال، اگر ہلکا پھلکا تغزل، جو ہوا اور چنبیلی کی بھینی بھینی بو کے پروں پر سوار کر کے، فضا میں لے اڑتا ہے تو گہرا تغزل، جو میر اور غالب کے بیشتر اشعار میں میسر آتا ہے، یونانی حزنیہ کی طرح، تصفیۂ باطن کا موجب بن جاتا ہے۔

اب رہا، غزل کا تاریخی ارتقا، تو اس موضوع پر دو حیثیتوں سے بحث ہو سکتی ہے۔ ایک غزل کی ظاہری اور دوسری اس کی باطنی صورت۔ شعر کی ظاہری صورت کے لئے، میں ہمیشہ پیکر کا لفظ استعمال کرتا ہوں۔ اس مقالے میں بھی یہ لفظ یعنی پیکر انگریزی لفظ (Form) کے مترادف کے طور پر بار بار استعمال ہوا ہے۔ (Form.) کے لئے ہیئت کا استعمال، میرے خیال میں غلط ہے۔ اس کی ایک وجہ یا ادنیٰ وجہ یہ ہے کہ "ہیئت" ایک علم کا نام ہے اور مدتِ مدید سے علمی اصطلاح کے طور پر رائج ہے۔ اس لئے ہیئت کے استعمال سے ذہن میں وہ تصور بیدار نہیں ہوتا جو انگریزی شعری اصطلاح (Form) کے اندر مرکوز ہے اور جو اس کے ذریعے سے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بیان اپنے مرکز سے ہٹ گیا۔ بہر حال، یہاں غزل کے تاریخی ارتقا سے بحث ہے۔ اس سلسلے میں پہلے غزل کے پیکر کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

غزل کا پیکر، مدت ہوئی عربوں نے وضع کیا تھا جو ایران کے واسطے سے ہندوستان تک پہنچا۔ رسمی بحریں تعداد کے لحاظ سے انیس ہیں اور زحافات کی مدد سے زیادہ ہو جاتی ہیں اور غزل چند بحروں کے علاوہ جو صرف عربوں کے لئے مخصوص ہیں، سب ہی بحروں میں کہی جا سکتی ہے۔ استادوں کے کلام میں کم و بیش سب ہی بحروں کے پیکر میسر آ جاتے ہیں۔ بہر عنوان سترہویں صدی کی ابتدا سے، بیسویں کے وسط تک غزل کے پیکر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ولی نے اپنا غزلیہ کلام جس پیکر میں پیش کیا تھا، عہدِ حاضر کا متغزل غزل گو بھی اپنا کلام اسی پیکر میں پیش کر رہا ہے۔

غزل کے پیکر میں تغیر نہ ہونے کا خاص سبب ہے جو اردو فنِ شعر کے اصولوں سے وابستہ ہے۔ اردو شعر کے بعض اصناف، بعض بحروں سے تو ضرور وابستہ ہیں، مثلاً یہ کہ مثنوی اور رباعی کے لئے بحریں مخصوص ہیں لیکن کوئی موضوع، کسی خاص پیکر سے مربوط نہیں۔ کہانی اور مرثیہ مثنوی اور مسدس سے بظاہر مربوط نظر آتے ہیں لیکن یہ رابطہ لاینفک یا لازمی نہیں ہے۔ تاریخ اس لزوم کا ابطال کرتی ہے۔ نظیر نے کہانیاں، مثنوی کے پیکر کے علاوہ، دوسرے پیکروں میں بھی پیش کی ہیں۔ بیسویں صدی کے پہلے ربع میں، چکبست نے رامائن کا ایک سین، مسدس کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ سودا کے مرثیے مربع یعنی چو مصرعے ہیں اور حالی نے، غالب کی نوحہ خوانی کے لئے ترجیع بند کا پیکر تجویز کیا ہے۔

غزلیہ صنفِ سخن، بیشک، ایک خاص پیکر میں پیش ہوتی رہی ہے لیکن وہ محسوسات و تاثرات، وہ انفرادی تجربے اور مشاہدے، وہ حقائق و معارف، جن کا نام تغزل ہے، غزل کے روایتی اور مروج پیکر کے علاوہ، مثلث، مربع، مخمس اور بعض دوسرے پیکروں میں

بھی بیان ہوئے ہیں۔ بعض استادوں نے مثنوی اور قصیدے کے متن میں غزل پیش کی ہے۔ تضمین جس طرح بیان کا نام ہے وہ بھی کوئی مختلف پیکر اختیار کر سکتی ہے اور تضمین عموماً غزل ہی کی ہوتی ہے۔

ایک پہلو تو یہ ہوا، دوسرا رُخ یہ ہے کہ غزل کا روایتی پیکر تغزل کے علاوہ اور اصنافِ سخن کا بھی حامل ہے۔ مثلاً یہ کہ سہرا عموماً غزل کے پیکر میں کہا جاتا ہے۔ ہجو، واسوخت اور شہر آشوب جیسے موضوعات کے لئے غزل کا پیکر اکثر استعمال ہوا ہے۔ قصیدہ خود، غزل کے پیکر کی ایک طولانی صورت ہے۔

تو جب غزل کا پیکر، تغزل سے اور تغزل کسی خاص پیکر سے ناقابلِ افتراق رشتے وابستہ نہیں تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو زبان میں نفسِ شعر کو پیکر سے اتفاقی علاقہ ہے، لازمی علاقہ نہیں۔

جیسا کچھ ظاہر ہے کہ اردو غزل کے پیکر میں تین صدیوں کی مدت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ ارتقا فطرت کا مطالبہ ہے۔ ہر ذی حیات شے کو، جہدِ للبقا میں، ماحول سے مطابقت کرنی پڑتی ہے ورنہ وہ فنا ہو کر رہ جاتی ہے لیکن یہ اصول اس ماحول میں نافذ ہے جہاں، فرد یا جنس، کی فطرت ارتقا کا جواز پیدا کر دیتی ہے۔ اگر بطونِ شئے خود مطابقت کا مطالبہ نہ کرے تو ارتقا کے منازل و مراحل پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ غزل کے پیکر میں اس کی اتفاقی حیثیت کے باعث، کسی تغیر کی ضرورت ہی نہ تھی، اس لئے زمانے کا استبداد اس میں کوئی تغیر پیدا نہ کر سکا۔

انیسویں صدی کے شعری سماج میں بات بات پر سند کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں شاعروں کی اس خو نے علالت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ رام پور کے دبستان میں یہ مرض، اپنی انتہائی شدت کے ساتھ خیال کی آزادی پر چھایا نظر آتا ہے۔ بیسویں صدی کے دوسرے ربع میں ہم نے ذہنی غلامی کے بہت سے بت توڑ ڈالے ہیں، پابندیوں کی بہت سی بیڑیاں کاٹ دی ہیں، لیکن بعض مشرقی بیڑیاں پاؤں سے نکل، ہاتھوں کی مغربی ہتکڑیاں بن گئی ہیں آج مرعوب کرنے کے لئے مغربی ادیبوں اور مغربی نقادی کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے اس نوع کے حوالے، اعتدال اور دیانت کے ساتھ بالکل جائز اور قابلِ قبول ہے لیکن جہاں ان کا بے جا اثر، مشرقی شاعری کو مشرقی انفرادیت اور مشرقی کیف و رنگ سے محروم کرتا نظر آئے، اس کا ٹھکرا دینا ضروری ہے۔ تنقید وہ تنقید ہے جو فطری اور داخلی ہو اور جو ادب و شعر کے بطون سے پیدا ہو کر توازن کا اہتمام برقرار رکھے۔

جتنا کچھ غزل کو مغربی نقادی کے اصولوں سے پرکھنا، غزل کے مزاج کی صحیح تشخیص نہیں ہے۔ غزل، خالص مشرقی صنف ہے۔ اور بطبعت مغربی نقادی کے کسوٹی پر نہیں تولی جا سکتی۔ جس طرح بعض مغربی دوائیں ہندستانی مرض کی خو پر کارگر نہیں ہوتیں اور بعض مغربی لذائذ اور مشروبات مثلاً سارڈن اور بیئر، ہندی ذوق و طبیعت سے فی الفور مطابقت نہیں کرتے اور ان کا مزاق کوشش سے پیدا کرنا پڑتا ہے اسی طرح نقادی کے وہ اصول، جو مغرب کے ادب کے نفس سے پیدا ہوئے ہیں، غزل کا پورا پورا جائزہ نہیں لے سکتے۔

حریتِ خیال کا جو اصول ہم نے مغربی نقادی سے سیکھا ہے، اسی کا مطالبہ ہے کہ ہم خود اپنے طور پر، جانچیں کہ آیا پیکر کی وہ بحث جو خاص مغربی ادب سے متعلق ہے، مشرقی شاعری پر صادق آتی ہے یا نہیں اور غزل کے پیکر کی لطافت و نزاکت اس بحث کا بارِ گراں برداشت کر سکتی ہے یا نہیں۔ انگریزی ادب میں، پیکر کا بیان سے خاص علاقہ ہے انگریزی فورم (پیکر) لفظوں کی ترتیب اور بیان کے اسلوب کو متاثر کرتا ہے۔ پیکر، بیان کو اور بیان موضوع کو متاثر کرتا ہے۔ ہر موضوع ہر بیان سے اور ہر بیان، ہر پیکر سے مطابقت نہیں کرتا۔ اس لئے ہر موضوع ہر پیکر میں بیان نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ فن کی روایت بھی، اس نوع کے تداخل میں حائل ہے۔ لیکن اردو شعر کی دنیا میں، بیان، پیکر سے اس حد تک متاثر نہیں ہوتا اور پیکر اور موضوع کے درمیان اتنے موانع حائل نہیں جتنے انگریزی ادب میں ہیں۔ اس لئے پیکر اور موضوع کا رابطہ بھی اتنا شدید نہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ اردو کی غزلیہ شاعری کے باب میں، ارتقا کا اصول، حقیقت میں پیکر پر نہیں بلکہ موضوع پر نافذ ہے۔ ہمارا معاشرتی اور سیاسی ماحول، نفسِ غزل سے اب تغیر کا مطالبہ کرتا ہے اور ارتقا کی قہری قوت غزل کے موضوع کو برابر متاثر کر رہی ہے۔ پیکر میں تغیر، تناقض کا مترادف ہے۔ جبریہ تغیر ایک نیا پیکر ضرور خلق کر سکتا ہے جو غزل کا پیکر نہ ہوگا اور خود غزل کے پیکر کی موت کا باعث ہوگا۔ اس نوع کی تباہ کاری جسے اصطلاح میں (   ) کہا جاتا ہے، صناعت یا آرٹ کی تاریخ میں کبھی جائز نہیں سمجھی گئی۔

پیکر کے ذکر کے بعد اب میں اردو غزل کے موضوع کا ذکر چھیڑتا ہوں موضوع سے، میرا وہی مفہوم ہے جو عموماً لفظ "مضمون" کے استعمال سے ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں غزل کی لفظی صورت کے لئے "پیکر" اور معنوی کے لئے "موضوع" استعمال کرتا ہوں۔ غزل کا موضوع وسیع ہے، بہت وسیع ہے اور اتنا وسیع کہ حیات، کائنات اور ماورائے حیات و کائنات اس کے ظرفِ امکان میں سما سکتے ہیں۔ اس کا بلند ملاءِ اعلیٰ کو چومتا ہے اور اس کا پست، حضیض زمین کی گہرائی میں لوٹتا نظر آتا ہے۔ شاعری کا وہ عنصر جس کو جدید نقادی آفاقیت کے نام سے موسوم کرتی ہے، غزل کی فطرت سے ہم آہنگ ہے اور بہ آسانی غزل کے قالب میں سمویا جا سکتا ہے۔

اس کا موضوع نہ صرف عالمگیر و ہمہ گیر کو محیط ہے، نہ صرف ان رموز کا مترادف ہے جن کی صداقت ازلی و ابدی ہے بلکہ ایسا دریا ہے جو کوزے میں بھی بند کیا جا سکتا ہے۔ پھیلاؤ کو مختصر اور اشارتی بنانا، آرٹ کا منتہائے کمال ہے اور غزل کے موضوع، آرٹ کی اس قدرت سے پورا مستفید ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ جتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ اردو زبان کا سرمایہ شعر و سخن، اتنا حقیر و فرومایہ نہیں، جتنا بعض حلقوں میں سمجھا یا بعض دائروں کی طرف سے بتایا جاتا ہے۔ یہ ذہنیت، کمتری کا شدید احساس ہے اور ذاتی لاعلمی اور بے اعتنائی کا لازمی نتیجہ ہے۔ ہمارے بہت سے تعلیم یافتہ حضرات کو اردو ادب کا اگر علم ہے تو سطحی سا ہے اور عرفان تو بالکل نہیں۔ اس کے علاوہ ہم میں سے بعض کو، ٹین کے ڈبے کی مچھلی تازے جھاشیر سے زیادہ لذیذ معلوم ہونے لگی ہے۔ ہم اپنے اخلاق کے محاسن کو اغیار کی کسوٹی پر کس کر کھوٹے کھرے کا فرق سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری محرومی ہے اور سیاسی غلامی سے بدتر لعنت ہے۔ غزل کے باب میں بھی ہمارے بہت سے فیصلے، مغربی نقادی کے بے محل انطباق کی پیداوار ہے۔ غزل کے موضوع کے اجزاء، اپنی لطافت اور پاکیزگی کے لحاظ الہامی وہی ہیں اور ان شعری قدروں کے حامل ہیں جو انسانی مشاہدہ اور تجربے کے ذخیرے میں منفرد بھی جا سکتی ہیں۔ ان میں عمومیت بھی ہے اور خصوصیت بھی ہے، وہ اجتماعی قلب اور واحد قلب دونوں کی روداد ہیں اور اپنی اپنی جگہ، دونوں پر صادق آتے ہیں۔ غزل کے موضوع میں شاعرانہ اور فلسفیانہ قدروں کے علاوہ انسانی قدریں بھی معتد بہ مقدار میں شامل ہیں۔

جس وقت اردو زبان کے یہ اشعار زمین پڑھے جاتے ہیں:-

کہتے ہو کہ غیر کو نہ چاہا ہو ۔۔۔ معلوم ہوا کہ تم خدا ہو
میں تری یاد میں ہوں او کافر ۔۔۔ مسجدوں میں نماز ہوتی ہے
دامن دوست کا خیال شام الم بجا نہیں ۔۔۔ اشک غم آؤ پونچھ لیں، اپنی ہی آستین سہی

تو فرشتے عرش پر ساز بجاتے ہیں اور حوریں رقص کرتی ہیں۔

آخری شعر میں جذباتی شاعری کا پورا کیف و اثر، ذاتی تجربے کے عناصر کے ساتھ سمو یا گیا ہے اور ان سب سے بالاتر حسن بیان کی پوری قوت موجود ہے۔

غزل میں تسلسل کا سوال، پیکر اور موضوع دونوں سے متعلق ہے لیکن بیشتر موضوع سے علاقہ رکھتا ہے۔ اول تو یہ الزام غلط ہے کہ اردو شاعری میں مسلسل غزلیں بڑی تعداد میں میسر آتی ہیں۔ اقبال اور جوش نے اس خصوص میں نظیر کا اتباع کیا ہے۔ دوسرے غزل میں تسلسل کا فقدان عیب نہیں، ایک حسن ہے جو غزل کی فطرت سے پیدا ہے اور اس کی نوعی خصوصیت ہے۔ ہمیں غزل کو اس کی حدود و تعینات اور اس کی طلب و قبول کی قوت کے دائرے کے اندر جانچنا چاہئے۔ تسلسل، نہ صرف غزل کے فن سے انحراف کا نام ہے بلکہ غزل کی صناعانہ نفاست اور اس کے پیکر کے ہلکے پھلکے پن کے بھی منافی ہے۔ غزل کا ہر شعر فی نفسہ ایک واحدہ (   ) ہے، ایک عالم اصغر ہے، آرٹسٹ کی پیدا کی ہوئی ایک چھوٹی سی دنیا ہے، جس کی صنعتی وحدت زائل دینے سے، اس کی یکتائی، اس کا اچھوتا پن، اس کا جمال، زائل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس کے علاوہ، فن کے اعتبار سے بھی، ہمیں اس تحریف و تصرف کا حق حاصل نہیں۔ غزل کا ہر فرد، ایک مکمل نفسیاتی تجربے، ایک بسیط مطالعے، ایک وسیع مشاہدے کے نتائج کا حامل ہوتا ہے اور غور و فکر کے لئے غذا بہم کرتا ہے۔ وہ ایک نوع کا صنعتی اشارہ، ایک قسم کی لطیف علامت ہے جو ذہن کو بیدار و ہشیار کر دیتی ہے اور جس کی مدد سے بحر و حقائق کے وسیع میدانوں کی سیر ممکن ہے، وہ ایک لوح ہے جس کے نقوش کی رہنمائی سے، قلب کائنات کے رموز و حکم کا انکشاف ممکن ہے، وہ ایک شمع ہدایت ہے جس کی روشنی سے زندگی کے غیر محدود و بے پایاں مگر تاریک اور اندھیرے صحراؤں کی وسعت و پہنائی میں پرتو ڈال سکتی ہے۔ جس طرح مادہ کا ایک جوہر بہت سے مفید و حیات پرور لطیف نشاط آور اجزا کی روح ہوتا ہے، اسی طرح، غزل کا ہر شعر، اپنے پس منظر کا پورے عالم کو محیط ہوتا ہے:-

زندگی اپنی جب اس طرح سے گزری غالب ۔۔۔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب کا یہ مقطع، ایک پوری زندگی کے تلخ تجربے کا نچوڑ ہے۔ جن حضرات کو، ہارڈی کی مشہور ہیروئن (   ) کی زندگی کے پے در پے ناکامیوں، اور اندھی، گونگی، بہری فطرت کی بے ہنگام اور پرستم ظرافت کا علم ہے، وہ جانتے ہیں کہ غالب نے ایک پوری داستان، ان دو مصرعوں میں سمو دی ہے۔ شالامار کی نئی تصویر، من کی جیت میں، جو ٹیس (   ) کی کہانی سے، بنائی گئی ہے، (   ) یا آرسی کی زبان سے، جوش کا یہ گیت "دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی" غالب کے محرک خیال کا پرتو اور اسی کے انداز بیان کا سچا انعکاس ہے۔ جب ایک پوری واردات محبت، ایک پوری روداد حیات، ایک شعر میں، اس قدرت سے بیان ہو سکتی ہے تو تسلسل کی اتنی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ محض، اس کے فقدان پر غزل کے آرٹ کو ناکمل اور تشنہ ٹھہرا دیا جائے۔

اس کے بعد، اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ غزل کی صنف، اپنے پیکر کی اہلیت اور موضوع کی پہنائی کے اعتبار سے مستقل اور مکمل ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ (باقی آئندہ)

اردو اور سائنس

بقیہ صفحہ ۳۲

مختصر یہ کہ ملک کی فضا، حد درجہ غیر سائنسی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ سرکاری اور خانگی طور پر علمی اور فنی تحریروں اور تقریروں کی ایسی قدر افزائی نہیں کی جاتی جس کی وہ مستحق ہیں۔ اگر ہماری زبان اور ادب کے معیار کو بلند کرنا ہے تو پھر ان تمام اقدار کو بھی بدلنا پڑے گا اور علوم و فنون کو شعر و سخن کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دینی ہوگی۔

غزل

شفیق کوٹی

تمہارے درد کو ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
تمہارے عشق کو یہ درد گاہِ دل سمجھتے ہیں

محبت کو مرادِ کاروانِ دل سمجھتے ہیں
وفا کو ہم فقط گردِ رہِ منزل سمجھتے ہیں

نہیں زیبا ہمارا شکوہ سنجِ بے رخی ہونا
یہ کیا کم ہے وہ ہم کو جور کے قابل سمجھتے ہیں

یہ سوچا تھا کہ دل ہی دل میں شکوہ حسن کا کرلیں
مگر مشکل تو یہ ہے وہ زبانِ دل سمجھتے ہیں

وہ کیا جانیں وہ کیا سمجھیں کسی پر کیا گزرتی ہے
جو بسمل ہیں وہی دردِ دلِ بسمل سمجھتے ہیں

بنا ڈالا سراپا دردِ آلام محبت نے
جہاں پر ٹھیس لگتی ہے اسی کو دل سمجھتے ہیں

حرم ہو دیر ہو یا ہو کلیسا یا ہو بت خانہ
جہاں درشن تمہارے ہوں وہیں منزل سمجھتے ہیں

حوادث سے جہاں بھی کشتیٔ عمرِ رواں ڈوبے
اسی ہنگامۂ طوفاں کو ہم ساحل سمجھتے ہیں

انھیں کی روشنی میں ڈھونڈ لیں گے وہ انھیں اک دن
جو دیوانے مآلِ داغ ہائے دل سمجھتے ہیں

انھیں جب توڑتا ہے کوئی تو دل ٹوٹ جاتا ہے
شفیق ان بند کلیوں کو ہم اپنا دل سمجھتے ہیں

اداؤں نے مارا

بڑی خیریت ہوگئی زندگی کی بڑھاپے نے بخشا کچھ آکر سہارا
سیاہ وقفِ الفت جوانی کا عالم نگاہوں نے تاکا اداؤں نے مارا

بہت کوششیں کیں بہت ہم نے چاہا بہت پیار سے بیٹھے بہت دن گزارا
بہے سطح پر ہم نہ ڈوبے نہ ابھرے نہ حاصل ہوا بحرِ غم سے کنارا

کلیجے نے بھی چوٹ پر چوٹ کھائی جگر چھن گیا دل ہوا پارا پارا
ستم کی نظر نے تو ناوک ہی پھینکے کرم کی نگاہوں نے کیا تیر مارا

اسی کے سبب ہیں مرے ہوش قائم اسی کا ہے صدقہ جو میں جی رہا ہوں
تری یاد کو دل سے کیونکر نکالوں کہ ہے یہ مری زندگی کا سہارا

مریضِ محبت کا عالم جو دیکھا تو اٹھے یہ کہہ کر مسیح و اطبا
نہیں اس کے بچنے کا اب کوئی نقشہ نہیں کوئی جز موت اب اس کا چارا

نہ رکھو قیامت پہ ان کو اٹھا کر نہ جانے قیامت میں ہو کیا قیامت
یہ دنیا کے جھگڑے ہیں دنیا میں طے ہوں یہیں فیصلہ ہو ہمارا تمہارا

یہ کیا مجھ کو سوجھا یہ کیا ان کو سوجھی جو بیٹھے لب داغِ محبت بچھا کر
برابر کی بازی لڑی ہی برابر نہ وہ مجھ سے جیتے نہ میں ان سے ہارا

نہ کچھ اور روداد غم ان کو لکھیں جو لکھیں تو خط میں یہ ہم ان کو لکھیں
ستم تو رہ ہو نہ سکے وہ ہوچکے سب کرم اب تو کچھ ہم پہ کیجے خدارا

یہ مانا نئے تم ہو دنیا نئی ہے مگر بات کچھ اہلِ ماضی کی بھی ہے
آزل رنگ بازار الفت یہی ہے یہاں نفع کم بیشتر ہے خسارا

آزل شاہجہانپوری

غزل

جو ہے مری نگاہ میں حسن کا وہ جہاں ہے اور
دسترسِ نظر سے دور وہ کوئی آسماں ہے اور

تیرا خیال ہے غلط بات ہی راز داں ہے اور
تیرا گمان کچھ نہیں ہو میرا گمان ہے اور

میں تو قفس نصیب ہوں۔ مجھ کو خبر ہے ہم صفیر
جس پہ گری ہیں بجلیاں کیا کوئی آشیاں ہے اور

جس کی بہار ہو خزاں۔ داغ ہی جس کے پھول ہوں
دل کے سوا جہان میں کیا کوئی گلستاں ہے اور

بڑھتی ہیں اور الجھنیں دل کو نہ کشمکش میں رکھ
صاف بتا پیامبر! مجھ سے وہ بدگماں ہے اور

اس میں وہ دلکشی کہاں اس میں یہ بے بسی کہاں
قصۂ عشق اور ہے حسن کی داستاں ہے اور

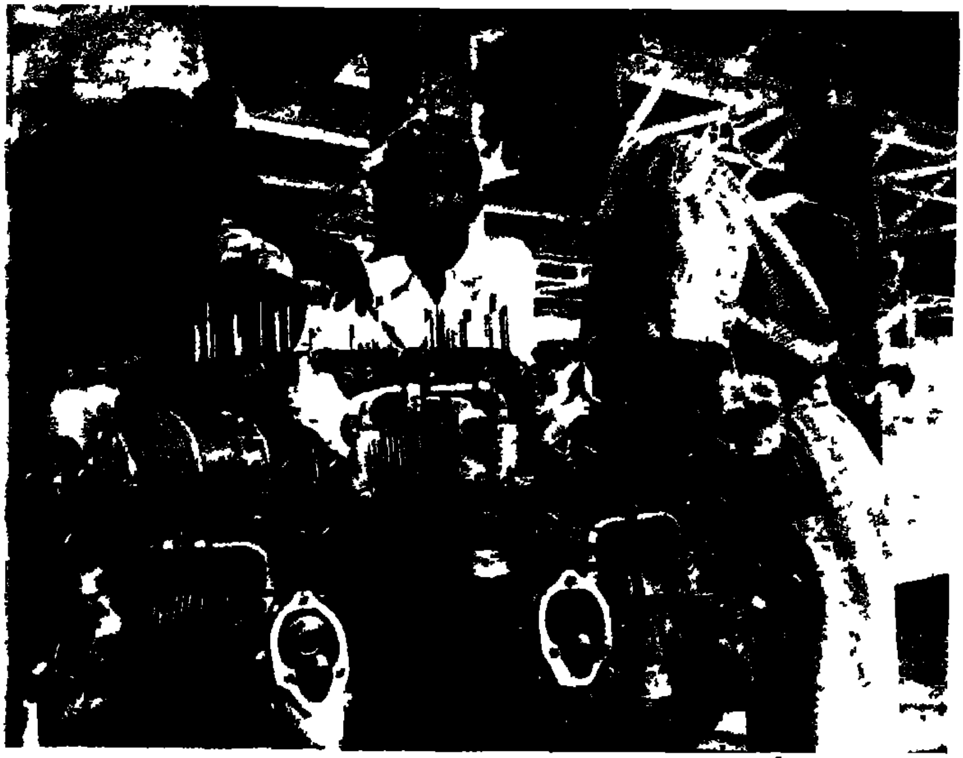
دیر و حرم کا امتیاز مٹنے نہ پائے عشق میں
سجدۂ شوق ہے روا جس پہ وہ آستاں ہے اور

لے تو چلا ہے ساتھ ساتھ جذبۂ بے خودی مجھے
راستہ میرا اور ہے جادۂ کارواں ہے اور

درد کی جستجو نہیں۔ سوز کی آرزو نہیں
آج تو دل کا حال ہی رمزیؔ ناتواں ہے اور

رمزی بھوپالی

...ہندوستان میں
...ہوائی جہاز



...ی جہازوں سے متعلق ایک
...وستانی کارخانے میں ایک
...ف انسٹرکٹر "کیفیلیا"
...ڑن کشتی کے انجن پر
...وں بیٹھا دو مندوبوں کو
...ی جس کی ساخت اور
...ررں کا طریقۂ عمل سمجھا
رہا ہے۔

ہندوستان میں ہوائی جہازوں کی صنعت نے دوران جنگ میں جنم لیا اور بڑی تیزی سے فروغ پانا شروع کر دیا۔ سرکار اور نجی کارخانے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ک... گئے۔ پہلا جہاز بھی ۱۹۴۱ء میں بنایا گیا۔ ان تمام کارخانو... نے اتحادیوں کی بڑی مدد کی، خصوصاً ان ہوائی فوجوں ... جنہوں نے اپنے مورچے ہندوستان میں لگا رکھے تھے۔ ... کارخانے مرمت، جڑائی اور دیکھ بھال کے فرائض انجام دیتے رہے... اگرچہ ماہرین کاریگروں کی بڑی کمی تھی اور صحیح اوزار ... نایاب تھے تاہم ان کارخانوں نے بہت سے فالتو پرزے وغیرہ بنا... ڈالے جن میں وہ خاص قسم کی ٹنکیاں بھی ہیں جن کو دیس... سامان سے تیار کیا گیا ہے۔ اب لڑائی ختم ہوچکی ہے لیکن



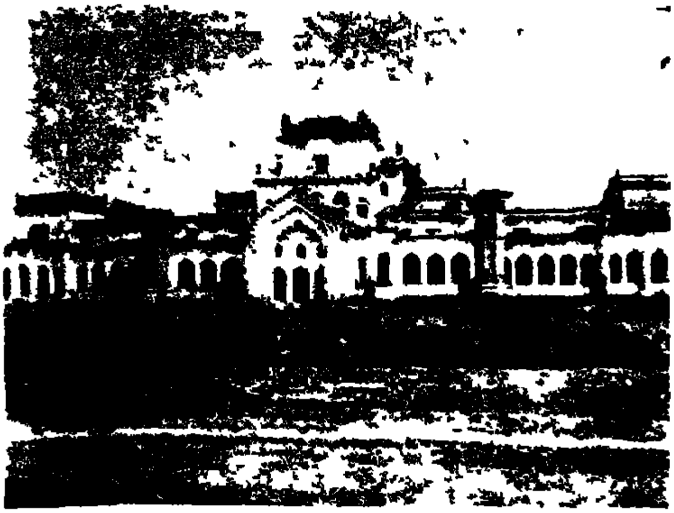
...ک کاریگر جہاز کے اندرونی حصے میں ایک پیچ کس رہا ہے۔

...وں کو بند کرنے کی بجائے زیادہ وسعت دینے کے خاکے
... کئے جارہے ہیں تاکہ ضروریات عامہ کو پورا کرنے کے
...دنی محکمہ اچھی طرح ترقی پاسکے۔



...ڈ ہوائی جہاز میں اسلحے اور گیر لگائے جا رہے ہیں۔

دارالعلوم ندوة العلما



درسگاہ کی شاندار دومنزلہ عمارت

۱۸۹۲ع میں کانپور کے مشہور مدرسے «فیض عام» کا جلسہ ہو رہا تھا اور بہت سے علما جمع تھے۔ اس وقت سب نے اس زبردست کمی کو محسوس کیا کہ ہمارے ملک میں دنیا کے دوسرے اسلامی ممالک کی طرح کوئی ایسی بڑی درسگاہ نہیں ہے جسے مذہبی تعلیم و تنظیم کا مرکز قرار دیا جاسکے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ حاملان مذہب و ملت اس خیال

✡

کو عملی جامہ پہنانے کیلئے کمربستہ ہوگئے اور لکھنؤ شہر سے باہر ایک پر فضا اور پرسکون مقام پر «ندوة العلما» کے نام سے ایک درسگاہ کی بنیاد رکھدی اس میں تمام مذہبی موضوعات پر اعلی تعلیم شروع ہوگئی۔ اب اس ادارہ کا انتظام ایک مجلس کے سپرد ہے جو پچھتر ارکان پر مشتمل ہے۔ درسگاہ کے دارالاقامہ میں تقریباً ہر حصۂ ملک کے طلبا



شاہی مسجدوں کے نمونے پر بنی ہوئی مسجد جو دارالعلوم کی عمارتوں کے درمیان واقع ہے۔

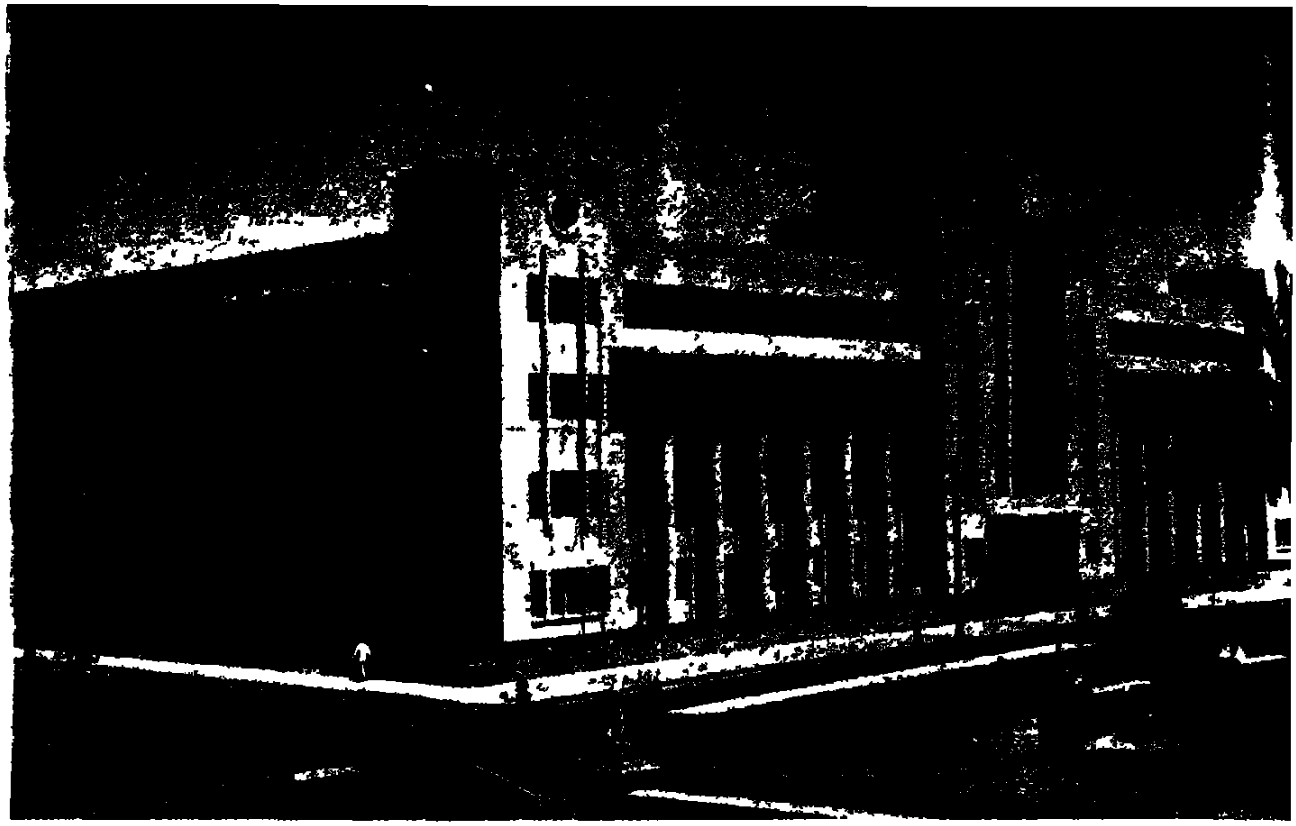
✡

رہتے اور فیض علمی حاصل کرتے ہیں مفصل مضمون اسی شمارے کے صفحہ ۱۷ سے ملاحظہ کیجئیے۔ صفحہ ۲۰ پر ندوہ سے متعلق ایک نظم بھی شریک اشاعت ہے۔

✡



عمارت کا ایک اور خوشنما منظر۔ ←



میونسپل کمیٹی کی شاندار عمارت۔

سندھ کا صدر مقام۔ کراچی

ہندوستان کے مغربی ساحل پر کراچی صوبہ سندھ کا صدر مقام اور مشہور تجارتی بندرگاہ ہے۔ تجارت کے سلسلے میں یہاں مختلف قوموں کے لوگ حتی کہ عرب اور ایرانی بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ عہد قدیم میں بھی شرق وسطی کے تمام ممالک کے ساتھ ہندوستان کی تجارت اسی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ موتیوں کے تاجروں سے لیکر گھوڑوں کے سوداگر تک ہر قسم کے کاروباری آدمی یہاں نظر آتے ہیں۔ یہاں بہت بڑا ہوائی اڈا پہلے سے قائم ہے۔ اب ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی تجویز بھی زیر غور ہے۔ شمالی

—o—

ہند کیلئے جتنا بھی غلہ بیرونی ممالک سے آتا ہے اسی بندرگاہ پر اترتا ہے۔ یہاں روئی کی بہت بڑی منڈی ہے اس شہر کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ ہے۔

—o—



اس عمارت کے اندر روئی کی زبردست منڈی ہے۔

نیویورک
ہیں جن
سے دیا
ہی میں
سمجھے کی
مالائی
ہے۔ یہ
علاقے
آنے جانے
اقتدار
اس کا
ویت ر



اتھلواں ٹوکریوں میں اناج پھٹکتے وقت کسان عورتیں بڑے بڑے ہیٹ اوڑھ لیتی ہیں تاکہ چہرے تیز دھوپ سے بچے رہیں۔

حضرموت میں نیویورک جیسے اسکائی اسکریپر۔



خشک صحرا میں ایک شاداب مرغزار



حضرموت

جنوب میں حضرموت ایک مشہور مقام ہے۔
اس حصے میں بھی اونچے اونچے اسکائی اسکریپر
طرز تعمیر کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس وادی
کذرے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کا انکشاف حال
کی سوبروں اور تحریروں سے ہوا ہے۔ اس
کی ایک کتاب سے لی گئی ہیں حضرموت کے
کا ایک شاداب شہر صیبون اب بھی موجود
اور کھجور کے باغوں سے پٹا پڑا ہے۔ اس
رفاقت کی فضا قائم رہتی ہے۔ لوگ اطمینان سے
یہاں کے حکمراں سلطان علی کو پوری طرح
غلام فرمانبردار ہیں بلکہ بدو لوگ بھی
شاہی محل میں ایک عالیشان ایوان ہے جسکی
اور نرم غالیچوں نے دوبالا کر رکھی ہے۔



ایک خوبصورت بچی اپنے بہترین لباس میں۔

کھجور کے درختوں نے گھیر رکھا ہے۔



جوار کے کھیتوں میں کسان عورتیں بڑے بڑے لمبے ہیٹ سر پر اوڑھے اور ڈھیلے ڈھالے نیلے لباس زیب تن کئے نظر آتی ہیں۔ سرراہ کھجوروں کے زیر سایہ پانی کے ایسے بہت سے حوض نظر آتے ہیں جن پر بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گنبد پاس سے گذرنے والے پیاسوں کو فوراً دعوت کام ودہن دینے لگتے ہیں۔ عورتیں چھوٹی چھوٹی صراحیاں سروں پر اٹھائے ڈھیلے ڈھالے نیلے لباس پھڑکاتی ہوئی ایک قطار میں آتی اور پانی بھر بھر کر لے جاتی ہیں۔ دلہنیں اپنی روایتی شان کے مطابق اونٹوں پر بیٹھ کر سسرال جاتی تھیں لیکن دولہا نئی وضع کی موٹرکار کو ترجیح دیتے ہیں۔

لکڑی کے کھلونے

ہندوستان میں کھلونے بنانے کا فن گھریلو صنعت کے طور پر قدیم ترین زمانے سے برابر فروغ پاتا رہا ہے۔ آجکل بھی بنارس، لکھنو اور میسور کے بنے ہوئے کھلونے ہر شہر کے بازاروں میں خوب بکتے اور پسند کئے جاتے ہیں۔ چونکہ بچے مٹی اور ٹین کے مقابلہ میں لکڑی کے کھلونے زیادہ پسند کرتے ہیں اسلئے اس صنعت کو وسیع پیمانے پر اختیار کرنے کیلئے بہت سے کارخانے کھل گئے ہیں جہاں سینکڑوں کاریگر صبح سے شام تک نت نئی وضع کے ایسے کھلونے بناتے رہتے ہیں جو ملک کے لاکھوں بچوں کی خوشی اور دلچسپی کا باعث بن سکیں۔ عام طور پر لکڑی کے کھلونوں پر لاکھی رنگ چڑھاتے ہیں لیکن بعض کی سطح اتنی چکنی اور دیدہ زیب بنادی جاتی ہے کہ کسی قسم کے رنگ و روغن کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔



لکڑی کی ان گھوڑا گاڑیوں پر روغن چڑھایا جارہا ہے۔ سب سے پہلے سفید رنگ کی تہ چڑھائی جاتی ہے۔



رنگ و روغن ختم ہونے کے بعد کیلیں، پیچ اور تار وغیرہ لگائے اور باندھے جاتے ہیں۔



اس تصویر میں ایسے کھلونے دکھائے گئے ہیں جو تک سے سک تیار ہوچکے ہیں۔

قفقاز

ققار ایشیائے کوچک کا ایک مشہور
رہی ملک ہے۔ پریوں کی اس
رمیں میں جو سیاح بھی ایک بار
پچ گیا وہاں ہر چیز پر مائل ہوکر
گیا۔ سر سبز و شاداب پہاڑ' تیزی
بہتے ہوئے صاف و شفاف دریا
ر کھلے میدانوں کے قدرتی مناظر
شخص کا دل موہ لیتے ہیں۔ کسی
دے میں یہاں کے راستے مشکل اور



پسانور کے مقام پر سڑک کے بالکل قریب چند دیہاتی عورتیں اور لڑکیاں دم لینے کے لئے رک گئی ہیں۔

✡

دشوار گذار تھے لیکن اب وسیع اور ہموار سڑکیں بن گئی ہیں جن کے ذریعہ پڑوسی ملکوں کے ساتھ اسکا سلسلہ قائم ہوگیا ہے ماشندے زیادہ تر کاشتکار ہیں لیکن وہ زراعت کی جدید ترین مشینوں سے کام لیتے ہیں' حتی کہ بیج کے طور پر چاول ہوائی جہازوں کے ذریعہ بویا جاتا ہے۔

✡

پہاڑی علاقے کا رہنے والا ایک دیہاتی اپنی بیوی سمیت شہر آ کر سرراہ لگی ہوئی دوکاں سے کچھ چیزیں خرید رہا ہے۔





ققار کے پہاڑوں کا ایک دلکش نظارہ۔ ←



بینا - ایک فلمی ستارہ۔

عزائم

حرماں خیرآبادی

مٹا دیں آپ کو گو ہم کہ ہم الفت کی راہوں میں
مگر فطرت کو ملتا ہے مزہ کچھ رزم گاہوں میں

پس از خلد بریں انجام آدم اور کیا ہوتا؟
بڑی مشکل سے پائی عافیت، وہ بھی گناہوں میں!

بہت در پردۂ ارض و سما ان کو نہاں پایا،
تجسس ہے بلا، رہنے لگے آخر نگاہوں میں!

دل عاجز نہ ہو ممنون کیوں کر اس کی قدرت کا
مجھے بخشی گئی، جو مکنت ہوتی ہے شاہوں میں!

ہمیں ناقص سمجھنے والے رضواں پر یہ واضح ہو
کہ وہ انسان گم ہے فکر کی دشوار راہوں میں

پہونچتی تو نظر کیوں کر پہونچی حسن بستاں تک
یہاں تو ذوق دل ٹھہرا خزاں کے خیرخواہوں میں

زمانے کو یہ لطف یک نظر جنت بنا دیتا
بشر ہی تھا، الجھ کر رہ گیا کلفت کی راہوں میں

مسرت کے تمنا دار یوں تو غم بری شے ہے
چھلک جاتے ہیں اکثر شکر کے جذبات آہوں میں

گذر آہستہ اے تاراج گر! آثار ہستی سے
یہ کشتے سو رہے ہیں دامن دل کی پناہوں میں!

عروس زر کی عالم میں ہوئی بے پردگی ایسی
کہ آخر میکدے کھلنے لگے پھر خانقاہوں میں

یہ نجم و مہر و مہ سب صدقۂ نوع بشر ہوں گے
ابھی تو چند ہیرے جگمگاتے ہیں کلاہوں میں

عزائم بھی گذر جائیں گے برق کی طرح حرماں
موانع گو پہاڑوں کی طرح حائل ہیں راہوں میں

غزل

اقبال عظیم

مجھے خبر نہ تھی، احساس زندگی کی قسم
کہ روٹھ جاؤگے تم اپنی بے بسی کی قسم

میں اپنے غم سے بھی ہوں مطمئن، خدا شاہد
جو مجھ سے روٹھ چکی ہے اسی خوشی کی قسم

جو تیری یاد میں ٹپکا وہ اشک حاصل غم
جواب نہ آئے گی ہونٹوں پہ اس ہنسی کی قسم

فریب دیدہ و دانستہ کھا رہا ہوں میں
تری نگاہ کی معصوم سادگی کی قسم

تری تلاش میں کھو کر میں پا گیا سب کچھ
جو مجھ کو راس نہ آئی اس آگہی کی قسم

مری نگاہ کو اب بھی ہے تاب نظارہ
نقاب اٹھا تجھے دل کی شکستگی کی قسم

یہ تو نے کیوں مجھے بیٹھے بٹھائے چھیڑ دیا
میں اپنے حال میں خوش تھا تری خوشی کی قسم

کسی کے کام نہ آئے کسی کے ہو نہ سکے
کچھ ایسے کھو گئے اقبال بے خودی کی قسم

غزل

تسکین قریشی

ابھی تک ہے یہ راز سینہ بہ سینہ
محبت میں مرنا ہے مشکل کہ جینا

نہ ہو جب تک آہوں سے آباد سینہ
محبت کی ہر آرزو بے قرینہ!

وہی عظمت زندگی سے ہیں واقف
کہ طوفاں سے گذرا ہے جن کا سفینہ

غم عشق سے زندگی، زندگی ہے
جو مرنا نہ جانے وہ کیا جانے جینا

نہ احساس طوفاں، نہ امید ساحل
نجانے کہاں جا رہا ہے سفینہ

تری آرزوئے محبت کے صدقے
مجھے آگیا زندگی کا قرینہ

کچھ ایسے بھی ساحل ہیں اپنی نظر میں
کہ آکر جہاں ڈوبتا ہے سفینہ

بڑے لطف سے دن گذرتے ہیں تسکیں
کہ اب دل کا ہر زخم ہے تا بہ سینہ

آخری دیدار

فضل نقوی لکھنوی

ستارے دھیرے دھیرے جھلک رہے ہیں چاند چھپکے چھپکے نکل رہا ہے۔ اور میدان جنگل کی گود میں پھیلی ریگ زاروں، فرعون کے خیموں میں جلتے ہوئے چراغوں کا عکس دریا میں تیر رہا ہے۔ سورج کی گرمی جذب کئے ہوئے ذرات دہک رہے ہیں۔ زبانیں چپ ہیں لیکن سناں بول رہا ہے۔ بارہ گھنٹے کا سیاہ پردہ اٹھ جانے کے بعد وہ خونی سین پیش ہونے والا ہے جس کے لئے تاریخ کے سادے اوراق کروٹیں بدل رہے ہیں۔ اگر لڑائی ملک گیری اور جاہ طلبی کے لئے ہوتی تو شاید اتنی جاذبیت اور روحانیت پیدا نہیں ہو سکتی تھی کہ بیویاں اپنے شوہروں کے۔ بہنیں اپنے بھائیوں کے۔ اور مائیں اپنے بیٹوں کے دلوں میں جنگ کرنے اور بات پر مر جانے کا طوفان پیدا کرتیں جینے کی نہیں بلکہ مر جانے کی تمنائیں کرتیں۔

جوان بیٹا! ۔ اٹھارواں سال، ستارے سے زیادہ پیارا۔ چاند سے زیادہ خوبصورت، بڑی آنکھیں، اونچی پیشانی، چوڑا سینہ، بھرے بازو، سرخ و سفید رنگ۔ جب انگڑائی لیتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ :-

"کہکشاں ٹوٹ کے ہاتھوں پہ اتر آئی ہے"

جب سفید رنگ کے عربی گھوڑے پر بیٹھ کر نیزے کو ہوا میں گردش دیتا ہوا ماں کی نگاہوں کے سامنے سے گذر جاتا ہے تو یہ نظر آتا ہے کہ چاند کے چہرے پہ ہالا گھوم رہا ہے۔

تیرہ سو سال پہلے آپ کے تصورات ایسے میدان جنگ کو دیکھ رہے ہیں جو اپنے بعض خصوصیات کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک جانب دولت ثروت، سلطنت، اور ایک لاکھ ساٹھ ہزار فوج کا موجیں مارتا ہوا سمندر، پسلیوں تک آلات حرب کی جگمگاہٹ، زرق برق لباسوں پہ کسی ہوئی سنہری رو پہلی زرہوں اور دور تک پھیلے ہوئے خیموں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ دوسری طرف، بہتر انسان۔ جن میں چھ ماہ سے لے کر بارہ سال تک کے بچے اور اسی نوے برس کے بوڑھے بھی شامل ہیں۔ اور جنگ صرف حق و صداقت پر ہونے والی ہے!۔

اگر کسی سلطنت کا بادشاہ ذاتی عیش و عشرت میں پڑ جائے، غریبوں کی زندگی کو کڑوا بنا کر روحانیت کو مادیت سے دبا دے، مندروں مسجدوں، اور گرجاؤں کو مسمار کر دے۔ ساقیوں کی نگاہوں میں عقیدت گھوم رہی ہو اور شراب کے جام میں مذہب چکر کھا رہا ہو جھوٹ بولنا ہنر، زنا کاریاں عام اور ظلم و تشدد واجب ہو۔ اس کے خلاف اگر چند آوازیں بھی بلند ہو جائیں تو بہت ہوتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آوازوں کو کسی مذہب کے کانوں سے سنا یا کسی قوم کی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ کیونکہ جو جنگ انسانیت کے تحفظ۔ اور حق کی بقا کے لئے ہوتی ہے اس کی حمایت ہر انسان پہ لازم ہوتی ہے۔ خواہ اس کا تعلق کسی ملت، کسی جماعت اور کسی مذہب سے کیوں نہ ہو۔

"مادر گرامی! پھر کو تھکن سی محسوس ہو رہی ہے"۔ جوان بیٹے نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں بیٹا۔ دن بھر تو گھوڑے کی زین پہ کٹ گیا۔ آ میرے اندھیرے گھر کے چراغ میری آنکھوں میں سو جا"۔ ماں نے جواب دیا۔ بیٹے نے کمر کھولی خود، زرہ اور موزے اتارے۔ نیزے کو خیمے کے ایک کونے پر رکھ کر اس پر ڈھال رکھی اور چاہنے والی ماں کے زانو پر سر رکھ کے لیٹ گیا۔

"تھوڑا پانی تو نہ ہوگا؟" ۔۔۔ بیٹے نے ماں کے چہرے پہ نظر جماتے ہوئے کہا

ماں ۔ نہیں بیٹا ۔۔۔ بھلا، پانی کہاں۔ آج تیسری رات ہے کہ تمہارا چھوٹا بھائی اور تمہاری چھوٹی بہن پیاس سے تڑپ رہی ہے۔

بیٹا۔ (تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد) نیند نہیں آتی ماں۔ جب سوتا ہوں حلق کی خشکی میں سانس الجھتی ہے اور پھر آنکھ کھل جاتی ہے۔

ماں۔ کیا کروں بیٹا۔ تین دن سے مشکیزوں نے پانی کی صورت نہیں دیکھی۔ ورنہ سوچی تھی کہ اگر کوئی گیلی مشک ہوتی تو وہی تیرے پھنکتے ہوئے سینے پہ رکھ دیتی۔

بیٹا۔ ایک تو گرمی دوسرے پانی کی نایابی۔ یہ معلوم ہو رہا ہے کہ میرا سینہ میدان جنگ کی طرح دہک رہا ہے۔

ماں۔ سو جا بیٹا۔ ممکن ہے نیند آنے سے پیاس میں کمی ہو جائے۔

بیٹا سو یا تو کیا۔ بیٹھتے ہوئے دل نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر دیں۔ یا دوسرے الفاظ میں غش آ گیا۔

رات کے لمحے بڑھ رہے ہیں، ماں کی امیدیں گھٹ رہی ہیں، نوجوان بیٹا آرام کر رہا ہے، خیمے کی فضا میں سکون ہے، ماں آنکھوں میں آنسو بھرے، ٹکٹکی باندھے، نگاہیں جھکائے، ہاتھ میں شمع لئے اس چراغ کی صورت تک رہی ہے جس کو دنیا کی دوسری شام دیکھنا نصیب نہ ہوگی۔ بیٹے کی زلفیں سلجھ رہی ہیں اور ماں کی قسمت الجھ رہی ہے۔ دل دھڑک رہا ہے، آنسو برس رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ماں اپنے وارث سے اپنی محبت کا واسطہ دے کر کہے کہ "جس طرح ممکن ہو میرے بچے کو چمکتی ہوئی تلواروں اور لو دیتی ہوئی برچھیوں کی زد پر نہ بھیجو" کیونکہ ماں کی فطرت صرف یہی چاہتی ہے۔

مگر نہیں، بیٹے کی محبت جہاں نہیں دیکھی جاتی وہ فرض انسانی کی منزل ہوتی ہے۔ یعنی اگر "انسان کامل" یہ دیکھے گا کہ کسی جابر حکومت کے ہاتھوں میں "انسانیت" کا گلا گھٹ رہا ہے تو اس وقت! ۔ نہ وہ اپنی اولاد کی فکر کرے گا، نہ گھر کو بچانے کا خیال۔ نہ اپنی جان کی پروا۔ اس کا پہلا اور آخری فرض یہ ہوگا کہ تشدد کی مٹھی سے انسانیت کا گلا چھڑا کر اپنی گردن پیش کر دے۔

ستاروں کی آڑ۔ اور چاند کی اوٹ میں نا امید ماں کا چراغ کب تک جلے گا؟۔ صبح کا ستارا قضا کا پیام نے کر جگمگا رہا ہے۔ موت کی ہوا سنک رہی ہے۔ تصورات خون کی چادر میں لپٹ رہے ہیں۔ تلواروں کی بجلی جھنکاریں فضاؤں میں پھیل رہی ہیں۔ ماں کی سانسیں رک رہی ہیں، دم الجھ رہا ہے۔ اب دیکھئے کیا ہو۔؟۔ میرے پیدا کرنے والے میرے نوجوان بیٹے کی خیر!۔۔۔ دل کہتا ہے شاید بچ جائے ۔۔ دماغ کہتا ہے کہیں لاکھوں پر بہتر بھی فتح پاتے ہیں۔؟۔۔ دل کہتا ہے ہو سکتا ہے ۷۲ کی بات رہ جائے۔ دماغ جواب دیتا ہے ہاں بہتر کی بات تو رہ سکتی ہے لیکن بہتر کی جانیں نہیں رہ سکتیں اور انھیں ۷۲ میں میرا نوجوان بھی ہے۔

صبح کا آفتاب، سنہری نہیں بلکہ خونیں شعاعیں پھینکتا ہوا نکلا۔ لاکھوں کے مقابلہ میں بہتر انسان، چھوٹی سی صف میں بڑے حوصلوں اور اونچے ارادوں کے ساتھ ایستادہ ہو گئے۔ دو پہر سے لڑائی چھڑ گئی، تیروں کی سنسناہٹ نے فضاؤں کو چونکا دیا۔ نیزوں کی چمک نے نگاہیں تلملا گئیں، تلواروں کی چھائیوں نے میدان جنگ کو آئینہ خانہ بنا دیا۔ لاکھوں اور بہتر؟۔ ایک ایک کو ہزاروں نے گھیر لیا۔ نیزوں کی نوکوں پر پشت ٹیک کر پیچھے نہ ہٹنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ گھمسان کا رن پڑا کہ ہزاروں لاشیں تتر بتر ہو گئیں مگر زوال آفتاب کے ساتھ ۷۲ کا چھوٹا سا لشکر بھی پراگندہ ہو گیا۔ اب تو صرف اتنے باقی رہ گئے جتنی ہاتھوں کی انگلیاں ہیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے اور ماں کا نوجوان بیٹا بھی۔

خیمے کا پٹ لہرایا۔ ماں کے دل پر جھٹکا لگا۔ نگاہوں کے ساتھ خود بھی اٹھ بیٹھی

ماں۔ کون۔ میرا بچہ علی اکبر؟

علی اکبر۔ جی ہاں مادر گرامی۔

ماں۔ اتنی دیر میں کیوں پلٹے؟

علی اکبر۔ لڑائی چھڑ گئی تھی ماں۔ میرے بہت سے عزیز بہت سے دوست، اور بہت سے اصحاب قتل ہو گئے۔

ماں۔ (گھبرا کر) اور تمہارے چچا عباس علمدار۔

علی اکبر۔ دریا کے کنارے آرام کر رہے ہیں۔

ماں۔ کیا وہ بھی شہید ہو گئے؟

علی اکبر۔ جی ہاں۔ اب تو میں ہوں اور بابا پدر بزرگوار۔ اچھا مجھے بھی اجازت دیجئے۔

ماں۔ اجازت کیسی بیٹا؟۔

علی اکبر۔ نصرت کی اجازت، جنگ کرنے کی اجازت اور آخر میں جان دینے کی اجازت!

ماں۔ نہیں نہیں۔ میرے بچے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی تمناؤں، آرزوؤں، اور امیدوں کو ہمیشہ کے لئے کربلا کی جلتی ہوئی خاک میں دفن کر دوں۔

علی اکبر۔ مادر گرامی غور تو کیجئے۔ جب حق پر آنچ آ رہی ہو جب صداقت پامال ہو رہی ہو۔ جب انسانیت حیوانیت کے پنجوں میں دم توڑ رہی ہو۔ اس وقت صرف یہی ہو سکتا ہے کہ حقیقت کی قربانی پیش کر کے حقیقت کو بچا لیا جائے۔

ماں۔ مگر میرے بچے میں نے تجھے کبھی دھوپ میں نہیں نکالا، تیری کوئی ضد نہیں ٹالی، اٹھارہ سال آنکھوں میں رکھا۔ بھلا کس دل سے مرنے کی اجازت دوں؟

علی اکبر۔ مادر گرامی میں خوب جانتا ہوں کہ میرے سوا آپ کے دل کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے۔ مگر انسانیت اور صداقت کو بچانے والا بھی میرے سوا دوسرا نظر نہیں آتا۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟۔ مجھ کو یا مخلوق خدا کے آرام اور زندگی کو؟

ماں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تیری جان بھی بچ جائے اور مخلوق خدا بھی ظلم و استبداد سے نجات پا جائے؟۔

علی اکبر۔ نہیں مادر گرامی۔ یہ متضاد خیالات ہیں۔ جب تک خون درخت کے تھالے میں نہیں ڈالا جاتا۔ پتوں، ڈالیوں اور پھلوں پر تازگی نہیں آتی۔

ماں۔ (گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے) مگر نہیں میرے بچے دل سے مجبور ہوں۔ فطرت سے معذور ہوں۔ دنیا کی کوئی ماں اپنے بچے کو خوشی سے مرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

علی اکبر۔ آپ بالکل سچ فرماتی ہیں۔ مگر خدا اپنی مخلوق کا بچاؤ صرف اپنے برگزیدہ بندوں ہی کے ذریعے کرتا ہے آج میری نوجوانی کو خاک میں مل جانے دیجئے۔ پھر دیکھئے گا دنیا کے کروڑوں نوجوان بوڑھے ہوں گے اور مر جائیں گے۔ لیکن آپ کے بیٹے کی جوانی قیامت تک نکھرتی رہے گی۔ میں ہمیشہ جوان رہوں گا۔

ماں۔ مگر میں تیرے بعد کیونکر زندہ رہوں گی؟۔

علی اکبر۔ دیر ہو رہی ہے ماں۔ دیکھئے دیکھئے میرا باپ ہزاروں میں اکیلا ہے، سنئے سنئے میرا فرض مجھے پکار رہا ہے۔ خدا حافظ۔

ماں۔ میرے بچے۔ آخری دیدار تو دیکھ لوں؟۔

خیمہ کا پردہ اٹھا کر علی اکبر نکلے۔ یا ماں کا سینہ شق ہو کر کلیجا نکلا۔ ادھر بیٹے نے کھنچی ہوئی انگڑائی لے کر گھوڑے کی باگیں سنبھالیں۔ ادھر ماں کی دل کی رگیں کھنچ کر ٹوٹ گئیں۔ خیمے کا پردہ ماں کے دل کی طرح ہلتا رہا۔ اور چودھویں کا چاند فوجوں کی گھٹا میں غروب ہو گیا۔

محرم اور واقعہ کربلا کو دنیا کا ہر شخص جانتا ہے، حضرت امام حسینؑ نے تیرہ سو چار سال قبل روز عاشور حق و صداقت کا یزیدی فوجوں سے مقابلہ کر کے بچاؤ کیا تھا۔ اس دفاعی جنگ میں حضرت امام حسین نے اپنا گھر بار لٹا دیا تھا۔

حضرت علی اکبر، حضرت امام حسین کے نوجوان صاحبزادے تھے اور حضرت ام لیلاؑ ان کی والدہ معظمہ تھیں جنھوں نے حق کی بھلائی اور مخلوق خدا کی اچھائی کے لئے اپنی ممتا کا خیال نہیں فرمایا اور حضرت علی اکبر شہید ہو گئے۔

گرگسوں کا سماج

افسانہ

اصغر علی

یہ تو اچھی طرح یاد نہیں کہ میں پہلی مرتبہ اس سے کہاں ملا مگر یہ واقعہ ہے کہ میری اور اس کی واقفیت کوئی اتفاقیہ یا ہنگامی وقت نہیں تھی، کم از کم میں اسے چار سال سے جانتا تھا، اور ان چار سالوں میں تقریباً ہر روز ہی وہ مجھ سے ملتی رہی کیونکہ جب سے میں تبدیل ہو کر اس قصبے کے اسکول میں آیا تھا، اور اس محلے میں رہائش اختیار کی تھی ہفتہ میں تین چار مرتبہ میں ضرور سبزی پکاتا تھا، اور اس سے زیادہ تازہ اور سستی سبزی اور کوئی فروخت نہیں کرتا تھا۔

یہ ایک معمولی قسم کا قصبہ تھا، بہت قلیل سی آبادی تھی جو زیادہ تر کاشتکاروں پر مشتمل تھی، کچے مکانات، گندی اور اداس گلیاں، چاروں طرف پھیلے ہوئے وسیع کھیت، کہیں کہیں ریت کے ابھرے ہوئے ٹیلے اور ان ٹیلوں پر اگی ہوئی ببول اور بیر کی جھاڑیاں، جوہڑوں کے کناروں پر تناور پیپل اور نیم کے درخت اور درختوں پر بیٹھے ہوئے اونگھتے ہوئے گرگس، یہ تھا اس قصبے کا غیر شاعرانہ اور افسردہ ماحول اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس جگہ مڈل اسکول، تھانہ اور ایک چھوٹا سا شفا خانہ نہ ہوتا تو یہ قصبہ بالکل ایک گاؤں تھا۔

جس محلہ میں میں رہتا تھا وہ کاشتکاروں کا محلہ تھا، یوں تو اس محلہ میں کوئی ایسی دلکشی نہ تھی، جس سے متاثر ہو کر میں اس جگہ رہائش اختیار کرتا، لیکن چونکہ اسکول یہاں سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا، اتنا قریب کہ میں اسکول سے غیر حاضر ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود تصور کیا جاتا تھا، میں نے یہاں رہنا پسند کیا، اس کے علاوہ جاہل گنوار کاشتکاروں کی اس بستی میں مجھ ایسے معمولی پڑھے لکھے انسان کو ایک غیر معمولی اہمیت حاصل تھی، میں ان کی نظر میں نہ صرف اسکول کا منشی تھا بلکہ ضرورت کے وقت وکیل، پٹواری اور پنچ کے فرائض بھی ادا کرنے کا اہل سمجھا جاتا تھا، اس محلے کی کوئی تقریب ایسی نہ تھی جس میں مجھے خاص طور پر مدعو نہ کیا جاتا ہو، اور ان تمام باتوں نے ایک شدید احساس برتری مجھ میں پیدا کر دیا تھا،

محلے والے مجھے ایک نیک اور برگزیدہ انسان سمجھتے تھے، کیونکہ پٹواری کے لڑکے کی طرح انہوں نے کبھی مجھے کوئیں پر پانی بھرنے والیوں کے گرد گھومتے یا کسی نوجوان لڑکی کو دیکھ کر خواہ مخواہ گنگناتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، میں عام معنوں میں ایک شریف اور نیک آدمی تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام شرافت بالارادہ یا بلا ارادہ میں نے اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لئے اختیار کر لی تھی،

وہ سبزی کا ٹوکرا سر پر رکھے بے جھجک میرے مکان میں داخل ہو جاتی تھی، حالانکہ وہ جانتی تھی کہ میں اس مکان میں تنہا رہتا ہوں، اس کی عمر زیادہ نہ تھی، مگر پھر بھی وہ جوان نظر نہ آتی تھی اس کے رخساروں میں تازگی ضرور تھی، مگر اس تازگی میں دوشیزگی کی رعنائی نہ تھی۔ اس کا جسم کچھ زیادہ موزوں نہ تھا، اعضا بھرے بھرے تھے، لیکن شباب کی جذبات انگیز کیفیت پیدا نہ کر سکتے تھے، اسے دیکھ کر شاید ہی کسی دل میں ہیجانی تاثر پیدا ہوتا ہو، اس کی آنکھوں میں زندگی کی ایک مبہم سی چمک تھی جسے ایک نمایاں افسردگی نے اپنے دامن میں لپیٹ لیا تھا، ممکن ہے جنسی بھوک کسی نوجوان کی نظروں میں کچھ دیر کے لئے اسے حسین بنا دیتی ہو، لیکن اس کے چہرے پر کھنڈی ہوئی ہلکی ہلکی پژمردگی نے اس کے خد و خال کی عام ملاحت کو پس منظر میں ڈال دیا تھا، جب وہ گلی میں آکر آواز لگاتی تو میں فیصلہ کر لیتا کہ آج کونسی سبزی پکانی ہے، وہ اندر آجاتی، اور میں سبزی کا نام بتاتا، مقدار وہ خود ہی جانتی تھی، وہ سبزی تولتی، چارپائی پر ڈالتی اور چلی جاتی قیمت میں اکثر تنخواہ ملنے پر ادا کیا کرتا تھا، یہ تمام معاملہ صرف چند منٹ میں ختم ہو جاتا، اور ابتدا میں اسے میری زندگی میں صرف اتنا ہی دخل تھا،

لیکن اس کا پژمردہ چہرہ اور افسردہ آنکھیں رفتہ رفتہ میرے خیالات پر چھانے لگے، اور میرے تحت الشعور میں چند الجھنیں ابھر آئیں، جب وہ سبزی دے کر چلی جاتی، تو میں بعض اوقات اس کے متعلق سوچنے لگتا، بالکل غیر ارادی طور پر، یہ سوچ اکثر خواب کی غنودگی کی طرح ہوتی تھی، غیر مسلسل اور مبہم خیالات کی چند بے ربط لہریں ذہن میں اٹھتیں، اور مٹ جاتیں، اور جیسے خواب کے بے نظام تصورات سے کوئی خاص مفہوم مرتب نہیں کیا جا سکتا، میری سوچ بھی اکثر بے معنی ہوتی تھی، بعض اوقات سوچتے سوچتے میرے جسم میں ایک پھریری سی آتی اور ایک جنسی خواہش دل کے کسی کونے سے اپنا سر ابھارتی مگر فوراً ہی مٹ جاتی، اور کوئی دوسرا تخیلی سلسلہ شروع ہو جاتا، اور ذہن میں چند بھاری بھاری خیالات رینگنے لگتے۔

سوچ بڑھتی رہی اور اس کی ملاقاتیں طویل ہوتی گئیں اب وہ سبزی رکھ کر چلی جاتی، بلکہ بیٹھ کر قصبے کے مختلف معاملات پر تبصرہ شروع کر دیتی، "اس سال بارش نہیں ہوئی، سبزی کم پیدا ہوگی، جیت رام کا بیل مر گیا، ہماری بھینس کا دودھ سوکھتا جا رہا ہے"، اور اسی قسم کی دوسری

باتیں اس کی گفتگو کا موضوع بن جاتیں، مجھے ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی، کیونکہ فتح سنگھ نمبردار سے لے کر چھو ٹو حجام تک مجھے سب صبح و شام اسی قسم کی باتیں سنایا کرتے تھے، مجھے اس کے چہرے کے مایوس خدوخال اور اس کے یاس میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں دلکشی محسوس ہوتی تھی، وہ ایک مشین کی طرح اپنی بے ربط و بے معنی باتیں کرتی چلی جاتی، اور میں اس کے چہرے کو گھورتا رہتا۔

اور پھر رفتہ رفتہ یگانگت بڑھتی گئی، وہ بغیر سبزی کے بھی میرے پاس آکر بیٹھ جاتی اور گھنٹوں بیٹھی رہتی، اس کی باتوں میں گہرائی پیدا ہونے لگی، اور میں اس کی روح کے قریب تر ہوتا گیا، اس کے دل کے چھپے ہوئے چور باہر نکلنے لگے تھے، وہ غیر محسوس طور سے مجھے اپنی زندگی میں داخل کرتی جا رہی تھی، میں اس کی روح کو ٹٹولتا رہا، اور اس کی عمر کی گزری ہوئی کہانیاں میرے حافظے میں تیرنے لگیں، وہ دور کسی گاؤں کی رہنے والی تھی، اس نے مجھے بتایا تھا، اس کا باپ ایک بڑا زمیندار تھا، ان باتوں کو برسوں بیت گئے تھے، اور وہ چاندنی رات اسے اب تک یاد تھی جب وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ایک بیل گاڑی میں بیٹھ کر ہردوار چلی تھی، تمام رات میٹھے رسیلے گیت گاتے گزر گئی تھی، اور جب وہ کئی دن کے سفر کے بعد میلے میں پہنچے تھے، تو وہ بھونچکا ہو کر رہ گئی تھی، کیونکہ اتنی رونق، اتنی دھوم دھام اور اتنی گہما گہمی اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھی تھی، اور اسے وہ المناک حادثہ بھی یاد تھا، جب وہ اس گہما گہمی میں یکایک اپنے رشتہ داروں سے بچھڑ گئی تھی، اور پھر کئی دن رونے دھونے کے باوجود بھی وہ اپنے رشتہ داروں کو نہ ڈھونڈ سکی تھی، جگلال اسے ان رشتہ داروں سے ملا دینے کا وعدہ دے کر اس قصبے میں لے آیا تھا، اور اسے وہ خوفناک رات بھی یاد تھی جب مایوس ہو کر اس نے جگلال کے پاس سے بھاگنے کی کوشش کی تھی، اور جگلال نے قتل کی دھمکی دے کے اسے اپنی بیوی بننے پر مجبور کر دیا تھا، اور وہ اپنے ماں باپ سے کوسوں دور اپنی خواہشات کے خلاف ایک اجنبی کی گرہستن بن کر رہ گئی تھی، اور پھر اس کو جوانی کے وہ رس بھرے سپنے بھی یاد تھے، جو جگلال کی گرم گرم آغوش میں اس نے دیکھے تھے، اور جن کے سحر انگیز اثر سے وہ ایک خوابناک رومان میں گھل مل گئی تھی، یہ تمام کہانیاں اسے یاد تھیں، اور اب وہ انہیں میرے حافظے میں سموتی جا رہی تھی، مجھے ایسا محسوس ہوتا گویا میں ان کہانیوں میں جذب ہوتا جا رہا ہوں،

دو روحوں کا تعلق شدید ہوتا گیا، اور میں اب اس کے بغیر کچھ اداس اور بے چین سا رہنے لگا، جس روز وہ نہ آتی، مجھے اپنے احساس دل میں ایک خلا سا محسوس ہوتا، اس لئے نہیں کہ اس کی متواتر قرابت نے میری جسمانی ضرورتوں کو بیدار کر دیا تھا اور میرے جنسی جذبات میں تندی پیدا ہو گئی تھی، بلکہ واقعہ یہ تھا کہ اس کی گزشتہ زندگی کی المناک داستان سے متاثر ہو کر میرے ذہن نے ایک عجیب جذباتی تار و پود اس کی شخصیت کے گرد بن لیا تھا، رحم کے وہ احساسات جو اس کی کہانیوں نے میرے دل میں تخلیق کر دئے تھے، مجھے اس کے بہت قریب لے آئے تھے، میں اس کے لئے کڑھتا تھا، معلوم نہیں کیوں!

پھر یکایک ایک روز مجھے محسوس ہوا کہ محلہ کی فضا میں کچھ تناؤ سا پیدا ہو گیا ہے، کاشتکاروں کی آمد و رفت میرے پاس رفتہ رفتہ کم ہونے لگی، میرا وقار اور میری اہمیت روز بروز گھٹتی جا رہی تھی، اور میں وکیل اور مختار تو کیا، شاید منشی بھی نہیں رہا تھا، محلے والوں کی پیشانی کے بل گہرے ہوتے جا رہے تھے، اور وہ لوگ جو ملتے بھی مجھے اس طرح آداب عرض کہا کیا کرتے تھے، گویا کوئی قرض ادا کر رہے ہوں، اب نظریں بچا کر نکلنے لگے، اور جگلال تو جب مجھے دیکھتا، ناک بھوں چڑھا لیتا تھا، آخر یہ نفسیاتی جنگ کب تک جاری رہتی، ایک دن فتح سنگھ نے مجھ سے آکر کہہ ہی دیا، کہ رام دئی ایک بدچلن عورت ہے، وہ جگلال کے ساتھ بھاگ کر آئی تھی، تمام قصبے میں بدنام ہے، اس کا بار بار میرے پاس آنا ٹھیک نہیں محلے والے اسے اچھا نہیں سمجھتے، اور ان تمام باتوں کا یقین دلانے کے لئے فتح سنگھ نے رام دئی کے متعلق کئی گھناؤنی کہانیاں مجھے سنائی تھیں،

اس روز میں تمام رات جاگتا رہا، رام دئی کی زندگی کا یہ پہلو اس کے بالوں سے بھی زیادہ سیاہ تھا، اس کی بے بسی اور بے چارگی نے ہمدردی کے جو بت میرے دل میں تراش کر رکھ دئے تھے، منہدم ہونے لگے، اور میرے ذہن پر نفرت اور پچھتاوے کے تاریک سائے چھا گئے، آج مجھے یکایک محسوس ہوا، کہ کسی نے ستاروں کی معصوم بستی سے گھسیٹ کر مجھے تلخ حقیقتوں سے بھری دنیا میں پٹک دیا ہے، مجھے رام دئی کے وجود سے ڈر لگنے لگا، کتنی خوفناک تھی وہ، میرے کئی سال کے قائم کئے ہوئے وقار کے تار و پود کو توڑنے کے لئے کتنی خطرناک سازش کی تھی اس نے، میرا دل غصہ سے ابل رہا تھا،

دوسرے دن صبح کو جب وہ سبزی لے کر آئی، تو میں نے اسے اپنے مکان میں داخل ہونے سے روک دیا، وہ کافی دیر تک بت بنی کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں کی اسرار بھری پتلیاں بہت گہری ہو گئی تھیں، اور ان سے رحم کی التجا ٹپک رہی تھی، دو گرم گرم آنسو ڈھلک کر اس کے رخساروں پر آ گئے، یکایک میری نفرت کا ابال کچھ دھیما پڑ گیا، اور مجھے ایسا محسوس ہوا، گویا وہ آنسو

کہہ رہے ہوں، "بابوجی! یہ بالکل بے گناہ ہے محلے والوں نے تمہیں بہکا دیا ہے"، مگر اشکوں کا یہ تریاق میرے دل کے ابلتے ہوئے زہر کو دور نہیں کرسکتا تھا، ہمدردی کے ٹوٹے ہوئے بت اب میرے دل میں زندہ نہیں ہو سکتے تھے، وہ ایک بدچلن عورت تھی فتح سنگھ نے نفرت کا جو انجکشن میرے ذہن میں لگایا تھا، اس کا اثر میرے ریشے ریشے میں پھیل چکا تھا میں نے دھکا دے کر اسے اپنے دروازے سے ہٹا دیا، اور وہ گردن جھکا کر چلی گئی، اور محلے والے جو اس حادثے کو دیکھ کر جمع ہو گئے تھے، دیر تک کھڑے دانت نکالتے رہے،

میں پھر منشی، وکیل، پٹواری اور پنچ بن گیا تھا، اور محلے والے میرے گرد جمع ہونے لگے تھے، مگر جگلال کی پیشانی کے بل بدستور گہرے تھے،

رام دئی اب کبھی کبھی ملتی تھی، اس کی آنکھوں کی افسردہ لکیریں اب بہت زیادہ گہری اور تاریک ہو گئی تھیں، محلے والوں کے طعنوں کے نشتر تیز تر ہوتے جا رہے تھے، اور جگلال کی بربریت اور غصے کی شدت خوفناک حد تک بڑھ گئی تھی، اور ایک روز اس نے رام دئی کو اتنا مارا تھا کہ بیچاری کا دایاں بازو ٹوٹ گیا تھا، وہ کئی دن سے سبزی بیچنے باہر نہیں آئی تھی، مگر محلے والوں نے پھر بھی اس کی بدچلنی کے متعلق دو چار اور نئی کہانیاں تراش لی تھیں، اور جگلال کی بربریت اور زیادہ تند و تیز ہو گئی تھی،

اگرچہ اب رام دئی کو میری زندگی میں کوئی دخل نہ تھا، اور میں اس کے وجود کو اپنے وقار کے لئے اب بھی ایک خطرہ تصور کرتا تھا، مگر فتح سنگھ کے انجکشن کا اثر کچھ کم ہو گیا تھا، اور رام دئی کی زندگی کی گزشتہ کہانیاں پھر میرے ذہن کے پس منظر میں تلملانے لگی تھیں،

ایک دن صبح جب مکان سے اسکول جانے کے لئے باہر نکلا، تو کچھ لوگ ایک چارپائی کندھوں پر اٹھائے آ رہے تھے، جگلال گردن جھکائے ان کے ساتھ تھا، اس کی پیشانی کے بل گہرے ہوتے ہوتے ایک دوسرے سے الجھ گئے تھے، اور آج ان سے رنج و غصہ کی بجائے تفکر اور حسرت کے آثار نمایاں تھے، "رام دئی کوئیں میں ڈوب کر مر گئی" کوئی میرے قریب سے بولا، اور میرے دل کو ایک دھکا سا لگا، رام دئی کی سنائی ہوئی تمام کہانیاں یکایک میرے ذہن کی سطح پر ابھر آئیں، میں سوچ رہا تھا، وہ ایک دور دیس کی رہنے والی جگلال کے جھوٹے وعدوں میں پھنس کر اس قصبے میں آ گئی تھی، جگلال نے قتل کی دھمکی دے کر اس کو اپنی بیوی بننے پر مجبور کر دیا تھا، اور اس نے اپنے دور دیس کے سپنوں کو بھلا کر اس محلہ میں گھل مل جانے کی کوشش کی تھی، اور پھر فتح سنگھ نے جیسے میرے کان میں کہہ دیا ہو، وہ بدچلن ہے، محلے والے اسے بدچلن سمجھنے لگے تھے، بدچلن، بدچلن، بدچلن، اور ان نشتروں

حقیقت و مجاز

زندگی موت سے بدتر ہی سہی، ہے تو سہی
یہ قفس آہ کہ کلبہ ہی سہی، ہے تو سہی

عیش رفتہ کے نشاں دیکھ کے خوش ہوتا ہوں
دل مرا اجڑا ہوا گھر ہی سہی، ہے تو سہی

شورش عشق بھی کیا چیز ہے اللہ اللہ!
اُن کی نظروں میں یہ کمتر ہی سہی، ہے تو سہی

تم شب ماہ میں آؤ تو چھپانے کے لئے
چاندنی رات کی چادر ہی سہی، ہے تو سہی

شیخ پیاسا ہے اسے پینے دو اک جام کہ یہ
تشنۂ بادہ کوثر ہی سہی، ہے تو سہی

بیر ہے مجھ سے زمانے کو مگر ساتھ مرے
ایک برگشتہ مقدر ہی سہی، ہے تو سہی

کہئے کافر نہ برہمن کو کہ اس کا بھی خدا
بت ہے، بت اصل میں پتھر ہی سہی، ہے تو سہی

ہم بھی نازاں ہیں کہ ہے دوست ہمارا کوئی
اس کا غم کیا وہ ستمگر ہی سہی، ہے تو سہی

سنئے سائل کے بھی اشعار سر بزم کہ وہ
ایک گمنام سخنور ہی سہی، ہے تو سہی

سائل دہلوی

نے جگلال کے رگ و پے میں جو بربریت اور غصے کے شرارے بکھیر دئے تھے، اور خون کے اس خوفناک ابال سے تنگ آ کر اس نے ایک روز رام دئی کا ایک ہاتھ توڑ دیا تھا، اور وہ اس غیر فطری زندگی سے جنگ کرتے کرتے تھک گئی تھی، اور آج بالآخر وہ تنگ آ کر اس قصبے سے کہیں دور بھاگ گئی تھی، دور بہت دور ایک ایسے دیس میں جہاں وہ محلے والے نہیں تھے، جہاں جگلال نہیں تھا،

لوگ چارپائی اٹھائے جگلال کے مکان کی طرف بڑھ گئے، سامنے نیم کے درخت پر چند گرگس بیٹھے اونگھ رہے تھے، اور نیچے کسی جانور کی ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔

یورپ نے اسلامی تمدن سے کیا استفادہ کیا؟

حفیظ رشید

اس عہد میں بھی جبکہ یوروپ ابھی اسلام کی طرف معاندانہ طور پر رجوع نہیں ہوا تھا اس کی نظریں اسلامی کمالات اور عجائبات سے خیرہ ہو چکی تھیں اور اس نے زیادہ تر عرب ہی کی آرائشی اور تعمیری فطانت سے اپنا چراغ روشن کیا۔ گہری تحقیقی نظر ڈالنے پر یہ بات جلد ہی ثابت ہو جاتی ہے کہ روم و یونان کی قدیم صنعتوں سے زیادہ وہ اس باب میں اسلام کا رہین منت ہے۔ لیکن اس بحث کا چھیڑنا یہاں مناسب نہیں ہے۔ ہم اپنے موضوع سے دور ہٹ جائیں گے۔ تاہم اس عجیب حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا خالی از لطف نہ ہوگا کہ پیرس کی کلیسا ناترداَم Parisian Cathedral of Notre Dame کی تعمیر کے لئے عرب معمار مقرر کئے گئے تھے۔

سائنس اور علوم کے میدان میں مسلمانوں کا اثر کس حد تک وسیع ہے۔ اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔

"سب سے پہلے یہ اعتراف ضروری ہے کہ تجربات اور مشاہدات جو علوم اور سائنس کی بنیاد ہیں ہم نے تمام تر عربوں سے سیکھے" عام طور سے یہ امر بیکن (Bacon.) سے منسوب کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

مشہور و معروف سائنسدان ہمبولٹ Humboldt. اس بات کا تعین پہلے کرتے ہوئے کہ سائنس کا سب سے اہم منصب یہ ہے کہ وہ طبعی مظاہرات کو ارادی طور پر پیدا کرتی ہے لکھتے ہیں کہ عرب اس بلندی پر پہنچ گئے تھے جس سے سائنسدان ناواقف تھے۔

ریاضی سے عربوں کو بڑا شغف تھا۔ جبر و مقابلہ ALG[illegible]R میں تو یہاں تک تکمیلی ترقی دکھائی کہ اس کی کایا ہی پلٹ دی۔ چنانچہ اس کی ایجاد انھیں سے منسوب کر دی گئی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے جبر و مقابلہ کو اقلیدس پر چسپاں کیا اور مماس Tangent. کو علم مثلث میں شامل کیا۔

بغداد، شام، سمرقند، قاہرہ، فز، ٹولڈو، کارڈیو وغیرہ میں علم ہیئت کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے ہوتا رہا۔ ان کی تحقیقات اور انکشافات حسب ذیل ہیں :-

علم ہیئت کے حساب میں علم مثلث کا شمول۔

ستاروں کی حرکت کے جدول بنانا۔

ان خطوط کی کجی کا تعین جس سے سورج گزرتا ہے Obliquity of the eclimptic.' اور پھر اس کی بتدریج تقلیل۔

اعتدالین (Equinoxes) سے سورج کے گذرنے کا قطعی انداز اور امتداد سال کا پہلا صحیح تعین۔

عرض البلد ماہتاب کی بے ضابطگی کی تحقیق اور محوری حرکت سے قمر کا ایک تیسرا انحراف جس کو آج کل Variation کہتے ہیں انہیں کی منت کش ہے۔

جغرافیہ کے ضمن میں ان بہادر سیاحوں کے کارنامے سائنس کے نقطۂ نظر سے انتہا اہم ہیں انھوں نے ان قطعی ہیئتی تعینات Astronomical Determinations) کی تشکیل کر دی جو اولین نقشہ کشی کی بنیاد ہیں اور ان کثیر التعداد غلطیوں کی تصحیح بھی کر دی جو مقامات کے تعین کے سلسلے میں یونانیوں سے سرزد ہوئی تھیں۔

سیاحت کے نقطۂ نظر سے انھوں نے بہت سے سفرنامے شائع کئے جن کی وجہ سے دنیا کے وہ مختلف حصے جن کا علم و گمان بھی نہیں تھا اور جہاں کسی یورپین نے قدم بھی نہیں رکھا تھا نظر کے سامنے آ گئے۔

الادریسی (Alldrisi نے ۱۱۶۰ء میں دریائے نیل کے منبعے جو بڑی بڑی خط استوائی جھیلوں سے پھوٹتے ہیں اسی طرح اپنے نقشے میں صحت کے ساتھ دکھائے ہیں جو اہل مغرب نے اب انیسویں صدی کے نصف میں دریافت کئے۔

علم طبیعیات میں ان کی جستجو اور انکشافات اور بھی زیادہ قابل غور اور قابل قدر ہیں۔ ذیل کے بیانات سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

تجرباتی اور نظریاتی طبیعیات Practical and Theoretical Physics میں وسیع معلومات بالخصوص بصریات میں بے مثل قیمتی آلات کا وضع کرنا۔

علم کیمیا کے سب سے بنیادی اجزاء اور مقدار کی دریافت مثلاً الکحل Alcohol، شورہ کا تیزاب Nitric Acid گندھک کا تیزاب Sulphuric Acid. اور تقطیر کا اہم ترین عمل۔

علم کیمیا کا دوا سازی اور تجارت میں شامل کرنا۔ خاص طور سے دھاتوں کا علیحدہ کرنا۔ چیتھڑوں سے کاغذ بنانا جو چہری کاغذ پیپرس Papyrus

اور چینی کے ریشمی کاغذوں کی جگہ کام میں لائے جاتے تھے۔

جہاز رانی میں غالباً سب سے پہلے پرکار (Compass) کا استعمال انھیں نے کیا اور اتنا تو یقینی ہے کہ یوروپ کو اس ضروری ایجاد سے روشناس انھیں نے کرایا۔

اختتام پر ہم اتنا اور کہہ دینا چاہتے ہیں کہ توپ و بندوق کی ایجاد بھی مسلمان سائنسدانوں نے کی ہے۔ یعقوب نے محاصرہ مہدیہ میں توپ خانہ کا استعمال کیا تھا۔

۱۲۷۳ء میں سلطان ابو یوسف نے محاصرہ سجلماسہ (Sijilmasa) میں توپوں سے کام لیا تھا۔ ۱۳۴۲ء میں لارڈ ڈربی (Lordderby) اور لارڈ سیلسبری (Salisbury) نامی دو انگریز الجیسیرس (Algeciras) کے محاصرہ میں موجود تھے جس میں عربوں نے اسی طرح حفاظت کی تھی۔ ان سیاحوں نے بارود کے اثرات دیکھے اور اس ایجاد کو اپنے ملک میں پھیلایا۔ یہ انھیں کا ورغلانا تھا جس کی وجہ سے چار سال کے بعد کریسی (Cressy) میں انگریزوں نے بارود کا استعمال کیا تھا۔

علوم طبی کے سلسلے میں مسلمانوں نے یونانی مصنفوں کی پیروی کی اور بعد میں کافی ترقی کی۔ طب کی تقریباً جتنی بھی معلومات میں یوروپ نے نشاۃ الثانیہ کے دور میں انھیں سے حاصل کیں طب کے جن مشہور شعبوں میں انھوں نے ترقی کی ان میں سے چند یہ ہیں۔ جراحی، بیماریوں کی تفصیل اور علامات، مخزن الادویات اور دوا سازی۔

انھوں نے معالجہ کے مختلف طریقے نکالے تھے، مثلاً میعادی بخار میں ٹھنڈے پانی کا استعمال، جن میں سے بعض صدیوں کے بھلائے جانے کے بعد آج دور جدید میں پھر نمایاں ہوئے ہیں۔

دواؤں کے اجزا میں سے بہت سی چیزیں انھیں لوگوں کی دی ہوئی ہیں۔ جیسے تیزپات (Cassia)، ریوند چینی (Rhubark)، تمر ہندی (Tamarind)، کافور، الکحل، امونیا (Ammonia) وغیرہ وغیرہ۔ صحیح معنوں میں دوا سازی کے خالق وہی تھے۔

بہت سے مرکبات جو آج مستعمل ہیں انھیں کی بدولت ہم تک پہنچے ہیں مثلاً شربت، عرقیات، روغنیات، مرہم اور کشید کیا ہوا پانی۔

جراحی کی بھی اساسی ترقی کی بنیاد عربوں کے ہاتھ پڑی ہے۔ ان کی تصنیفات ابھی تھوڑے دنوں پہلے شعبۂ طب کے درس میں مبادیات کے طور پر شامل تھیں۔

گیارھویں صدی میں وہ موتیا بند کا علاج جانتے تھے۔

سیلانِ خون کا علاج بذریعہ آب سرد کرنا جانتے تھے۔

سوزش ناک دواؤں (Caustics.) اور زخم کشا (Setons.) کا استعمال اور آگ سے داغنے کے طریقوں سے واقف تھے۔

بے ہوشی اور بے حسی کی دوا جو موجودہ دور کی ایجاد سمجھی جاتی ہے حقیقتاً انھیں کی دریافت کی ہوئی تھی۔ عمل جراحی سے قبل وہ بے ہوش اور بے حس کرنے کی دوا سے واقف تھے۔ تاکہ مریض اعصابی اذیت سے محفوظ رہے۔

اسی طرح انھیں تحفظانِ صحت، طبی معالجہ اور تقویت کے ذرائع پر بڑا اعتبار اور بھروسہ تھا موجودہ طب جو اس زمانہ کی سائنس میں صرف آخری حکم رکھتی ہے بالکل اسی راستہ پر گامزن ہے۔

خیالات اور فکر کے میدان میں بھی مسلمان بہت سے اہم علمی اور عملی نظریوں کے حامل ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے مساوات اور اخوت کی تعلیم دی تھی۔ مگر حضرت محمدؐ کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں کے زمانہ میں ان کے ماننے والوں نے دونوں کے نمونے پیش کر دیے۔ یہ ماننا البتہ حماقت ہے کہ انقلاب فرانس کی ذمہ دار ان کی ذات ہے جس پر ان کے معتدل اور ہموار عمل کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا تاہم یہ ماننا پڑے گا، اور اس کے کافی ثبوت ہیں، کہ خیالات اور جدید ہیئت اجتماعی کے حق رائے دہی کا نیا معیار حضرت محمدؐ ہی کی تعلیم کا منطقی نتیجہ ہے۔ یوروپ کو اس آزاد خیالی سے جس کو دہریت سے کوئی سروکار نہیں روشناس کرنے کا سہرا ابن رشد یا (Averroes. کے سر ہے جو ۱۱۲۶ء سے ۱۱۹۸ء تک اسپین میں موجود تھا۔

ابن رشد نے اسلام کی خالص وحدانیت کو عیسائیت کے صنمیاتی وحدت الوجود اور تشبیہی مذہب کے مقابل پیش کیا۔ ارسطو پر اس کی تنقیدوں نے، گو ان میں اسلامی خیالات کی صاف طور پر رنگ آمیزی تھی، قرون وسطیٰ کے یوروپ میں تمام آزاد دماغوں کو بے انتہا متاثر کیا۔ رشدیت، Averroism جو اسی ذوق و شوق کے ماتحت پیدا ہوئی تھی صحیح معنوں میں نہ صرف تحریک اصلاح (Reformation.) کی پیشرو بلکہ جدید عقلیت کی خالق بھی سمجھی جا سکتی ہے۔

اسلامی طرز معاشرت کا اثر صالح بھی یوروپ پر کافی پڑا ہے عربوں نے بڑی فراخدلی اور حوصلہ مندی کے ساتھ انتہائی مذہبی رواداری برتی تھی یہ ہسپانیہ کے عرب تھے جن میں مجاہدانہ جذبہ موجزن تھا جس کے مالک بعد میں مشرقی جنگجو بن بیٹھے۔ مشہور ہسپانوی مصنف بلاسکو ہنز (Blascoibanez.) اپنے ناول "کلیسا کے سایہ میں" (The Shadowof The Cathedral-Dans L dubre de la cathedal.

میں لکھتا ہے۔ "گویا یہ وصف ایسا تھا جو عیسائی قوم میں پہلے ہی سے موجود تھا اس سلسلے میں ہم ڈاکٹر لیباں کا اقتباس پیش کر سکتے ہیں "عیسائی

شجاعت کی طرح جو بعد میں نمودار ہوئی عربی شجاعت اپنا مخصوص معیار اور اصول رکھتی تھی۔ اس وقت تک کوئی آدمی شجاع نہیں کہلایا جاسکتا تھا جب تک ان اوصاف کا حامل نہ ہو۔ رحم، قوت، اولوالعزمی، سخن سنجی، فصاحت، شہسواری، نیزہ بازی، سیف زنی، تیر اندازی۔

۱۱۳۹ء میں قرطبہ (Cardova) کے والی نے طلیطلہ (Taledo) کا محاصرہ کیا جو عیسائیوں کے قبضہ میں تھا اور جس کی ملکہ (Berengaria) نے شہر پناہ میں اپنے کو بند کر لیا تھا۔ اس نے ایک سفیر سے اس کے پاس کہلوایا کہ یہ جوانمردی، اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کے خلاف ہے کہ ایک عورت پر حملہ کیا جائے۔ عربی سپہ سالار اس مہم سے دست کش ہوگیا اور اس نے ملکہ سے اس بات کی اجازت بھی چاہی کہ اپنا ہدیہ تبریک بھی اس کے حضور میں پیش کر سکے۔

ہسپانیہ کے عربی روزنامچے اس قسم کے ہزاروں واقعات سے بھرے ہوئے ہیں جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ مردانہ اوصاف کس قدر پھیلے ہوئے تھے۔

ایک بہت مذہبی آدمی (St Hilaire) اس بات کا پوری وفاداری کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ مغربی رسم و رواج عربوں سے کس قدر اثر پذیر ہوئے ہیں۔ قرآن پر جو کتاب اس نے لکھی ہے اس میں رقمطراز ہے "عربوں کے ربط و ضبط، گفتگو، اور ان کی تقلید سے قرون وسطیٰ کے اجڈ امراء کے ناشائستہ حرکات سدھر گئے۔ اور بہادروں (Knights) میں بغیر اپنی شجاعت کو کم ہوئے نرمی، لطافت، انسانیت اور شرافت کے اوصاف پیدا ہو گئے۔ یہ امر مشکوک ہے کہ عیسائیت اپنے علم اور بردباری کے باوجود یہ جذبات پیدا کر سکتی تھی یا نہیں۔

ممکن ہے قارئین یہ پوچھ بیٹھیں کہ پھر کیا وجہ ہے کہ ایسی صورت میں ہمارے زمانے کے اہل علم حضرات جو اپنے فضل و کمال کی بنا پر مذہبی تعصبات سے بلند معلوم ہوتے ہیں عربی تمدن کے اثرات سے روگرداں ہیں؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزاد خیالی ظاہری زیادہ ہے اور حقیقی کم اور ہم نے اسلام اور اس کے پیروؤں کے بارے میں جو رائے صدیوں سے قائم کر رکھی ہے اور اس کا اظہار کرتے رہے ہیں وہ ہماری ذہنیت میں رس بس گئی ہے۔

اگر ہم تمام تعصبات کے ساتھ ساتھ نسلی اور موروثی تعصبات کو بھی ملا لیں جو ہماری ہر نسل میں قابل نفرت کلاسکی تعلیمات کے ساتھ افزوں ہوتے گئے۔ یعنی یہ کہ زمانہ گذشتہ کے تمام علوم و ادب محض یونانیوں اور رومیوں نے پیدا کئے ہیں تو ہماری سمجھ میں بآسانی آجائے گا کہ کس طرح مغربی تمدن کی تاریخ میں عربی تمدن کے یہ عظیم اثرات نظر انداز کر دئے جاتے ہیں بعض حضرات کو یہ بات ہمیشہ مضحکہ خیز معلوم ہوگی کہ یہ مسلمانوں ہی کا فیض ہے جو کبھی یورپ جہالت سے دور نظر آتا ہے پھر کیا وجہ ہوئی کہ اسلام اس قدر جلد گر گیا؟ جس نے آٹھ صدیوں تک ہسپانیہ پر حکمرانی کر کے ایسے نہ صرف مغربی تمدن و تہذیب سے برتر کر دیا بلکہ اپنی چمک دمک سے کیا دلی، کیا بخارا، کیا قسطنطنیہ، کیا قمر ( ) تمام میں روشنی پہنچا دی۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ یہ لوگ ان اصول دین سے غفلت برتتے جاتے ہیں جن کی پابندی لازم ہے اور جن کے قائم کرنے کے لئے رسول مقبولؐ نے عمر بھر جانفشانی کی اور حواں کی اور خلفائے راشدین کی کامیابی کے ضامن رہے۔

ایک مثال پیش کر دینی کافی ہے کہ کس سختی سے ان اصول پر شروع میں عمل کیا جاتا تھا۔ ایک امیر اور طاقتور جبالہ نامی بادشاہ نے جو نیا نیا مسلمان ہوا تھا ایک غریب بدوی کے منہ پر جس سے خانہ کعبہ کے طواف کے وقت ذرا سا دھکا لگ گیا تھا، کئی طمانچے زور سے رسید کر دئیے۔ بغیر اس کے جاہ و حشم اور ایک مشہور ہستی کی ناراضگی کا خیال کئے ہوئے خلیفہ عمرؓ نے اس غریب بدوی کے ہاتھ سے بادشاہ جبالہ کو وہی سزا دلوائی جو اس نے غریب کو دی تھی۔ کیونکہ اسلام کی آئندہ عزت کے لئے قانون اور انصاف کی نظروں میں ہر ایک کا برابر ہونا مجملہ پس و پیش پر فوقیت رکھتا تھا۔

بغیر ان سخت اصولوں کے کوئی شخص سوائے ذاتی خوبیوں کے اور کسی چیز پر فخر نہیں کر سکتا۔ کسی شخص کا انتخاب سرداری کے لئے اس وقت تک نہیں ہوتا تھا جب تک وہ اس کا اہل نہ ہو اور ایک مرتبہ منتخب ہو جانے کے بعد اس کا فیصلہ آنکھ بند کر کے مانا جاتا تھا کیونکہ دراصل مخلصانہ طور پر اس کی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔

رسول مقبولؐ نے جو اپنی پیاری بیٹی فاطمہ زہراؓ سے کہا تھا کہ کام سے غافل نہ رہنا اور اس پر نہ بھولنا کہ تم رسولؐ کی بیٹی ہو وہ دیگر لوگوں پر بے کار ثابت ہوا۔ بہت سے غیر معروف اشخاص کے بیٹوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو بڑی چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنا پر حقارت سے دیکھنا شروع کیا اور یہ خیال کیا کہ ان کی سماجی حیثیت ان کی ترقی کی کوششوں میں مانع ہے۔ علاوہ اس کے ان اشخاص کی وجہ سے جو اپنے ذاتی کارناموں سے زیادہ اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر فخر کیا کرتے تھے ایسی ہی شدید اور بے رحم جنگیں چھڑ گئیں جیسے پہلے ہوا کرتی تھیں۔

چنانچہ پھر وہی بدمزاجی اور بدانتظامی پھیل گئی جس نے قبل اسلام عربوں کو مفلوج کر دیا تھا۔

سارا علمی مذاق کھو کر، خانہ جنگی سے منتشر ہو کر اور تھک کر مسلمان عیسائیوں کی تاب نہ لا سکے جو انتقام کا خواب دیکھ رہے تھے اور ان اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اپنے کو منظم کر کے حملہ آور ہوتے تھے۔

عہد ماضی (اور آج بھی) اسلام اپنی بہت سی بدنصیبیوں سے بچ سکتا تھا بشرطیکہ مسلمانوں نے رسولؐ کی آخری سماجت اور قسم کو یاد رکھا ہوتا جو انھوں نے اپنے خطبہ کے موقع پر دی تھی "کبھی مت بھولنا کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا سچا بھائی ہونا چاہیے"

اسلام کے تنزل کا دوسرا سبب خود اس کی ایک اساسی خصوصیت سے نکلتا ہے۔ اسلامی عقائد جو مافوق الفطری عنصر سے تقریباً مبرا تھے باآسانی عقلی دلائل پر پورے اترتے تھے۔ شروع میں یہ بہت مفید ثابت ہوا کیونکہ علوم توہمات کی رکاوٹوں سے آزاد رہے۔ یہی اسلام کے فوری عروج کا کافی سبب ہے۔ مگر رفتہ رفتہ مسلم دماغوں پر غنودگی طاری ہو گئی۔ وہ ان عظیم الشان نتائج سے جو پہلی صدی ہجری کے جوش و خروش میں نمودار ہوئے تھے کافی سے زیادہ مطمئن ہو کر غافل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نئے مفتوح ممالک میں اسلام بہیمانہ جذبات اور اشیا پرستی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ فقرا اور شافعین (Intercessors ' اولیا اور مرابطوں نے جو عیسائیت کے ذریعہ پیدا ہو گئے تھے اور جن کی قرآن میں سخت مخالفت ہے، علم اور عقل کی جگہ لی اور اپنے صریح توہمات سے تمام ترقیوں کو مسدود کر دیا۔ حکمار مثلاً ابن رشد نے اس کے خلاف جہاد کیا مگر بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ معصیت عوام میں اچھی طرح جڑ پکڑ چکی تھی۔ وہ ان روشن دماغ حضرات کو ملحد کہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ مردود قرار دے دئے جائیں۔

امجد حیدرآبادی کی نثر نگاری

نصیرالدین ہاشمی

ایک گزشتہ مضمون میں حضرت امجد حیدرآبادی کی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے[1]۔ آج ہم آپ کی نثر نگاری اور انشاپردازی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ تاریخ نثر اردو پر نظر ڈالی جائے تو یہ امر بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ جس طرح اردو شاعری کے ارتقاء میں دکن کا نمایاں حصہ ہے اسی طرح اردو نثر کو فروغ اور ترقی دینے میں دکن نے بڑا کام کیا ہے۔ یہاں زمانہ دراز سے نہ صرف ادبی اور مذہبی کتابیں اردو نثر میں مرتب ہوتی رہیں بلکہ سائینٹفک کتابوں کی تدوین اور اشاعت کا کام بھی انجام پاتا رہا۔ اگر کلکتہ میں کمپنی کی جانب سے ڈاکٹر گلکرائسٹ کی زیر نگرانی قصے اور کہانیوں کی کتابوں کا ترجمہ ہوتا تھا تو یہاں علوم سائنس، ریاضی، کیمیا، اور طبیعیات کے ترجمے ہوتے تھے۔ جس زمانہ میں شمال میں ہنوز مقفیٰ اور مسجع تحریرات کا دستور تھا تو دکن میں صاف اور سادہ اسلوب بیان کو اہمیت دی جاتی رہی۔ بہرحال جس طرح زمانہ گزشتہ میں دکن نے اردو زبان کی خدمت گزاری کی ہے اسی طرح اب بھی اردو کی ترقی میں نمایاں حصہ لے رہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں نہ صرف اردو زبان میں علوم سائنس کی تعلیم ہوتی ہے بلکہ سائنٹفک اردو کتابوں کی اشاعت میں بھی جامعہ کا خاصا حصہ ہے۔ دوسری طرف شعراء ادیب شاعر اور سائنسداں اردو کی خدمت گزاری میں مصروف اور منہمک ہیں۔ حیدرآباد کے شعراء میں حضرت امجد کو جس طرح خاص اہمیت حاصل ہے اسی طرح آپ ایک نثار کی حیثیت سے اپنا مقام رکھتے ہیں۔ یہاں ہم کسی قدر صراحت کے ساتھ آپ کی نثر کا تعارف کراتے ہیں۔

حضرت امجد کی نثر کی پانچ کتابیں اب تک شائع ہوئی ہیں۔ یعنی جمال امجد، حج امجد، حکایات امجد، گلستان امجد اور میاں بی بی کی کہانی۔

"جمال امجد" کے آٹھ نوشتے یا آٹھ باب ہیں۔ ابتدائی دو باب میں اپنی زندگی کے حالات درج کئے ہیں اور آخری نوشتہ جو کتاب کے بڑے حصہ پر مشتمل ہے، تصوف کے اسرار اور سلوک کی باتیں عام فہم اور سادہ الفاظ میں درج ہیں۔ دراصل یہ آپ کی اہلیہ خانہ مرحومہ جمال النساء بیگم کے ملفوظات ہیں جو سلوک اور باطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر یہ تصوف کی ایسی باتیں نہیں ہیں جو خاص صوفیا اور اہل باطن کی کارآمد ہوں بلکہ وہ زندگی کی سدھار اور اخلاق حمیدہ کے لئے ایک بہترین دستور العمل ہو گئے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نوشتہ اچھا طرز میں دلکش اور دل آویز ہے۔ اس کی عبارت عبرت انگیز اور معنی خیز ہے۔ اس سے ایمان کی تازگی اور روح کو مسرت ہوتی اور سکون ملتا ہے۔

"حج امجد" آپ کا سفرنامہ حج ہے جو دلچسپ حالات کا حامل اور ایک طالب صادق اور عاشق حبیب کی زیارت کا حال نہایت سوز و گداز کے انداز میں قلمبند کیا ہے۔ یہ ایک تجلی ہے جو کوندتی نظر آتی ہے۔ عام سفرناموں سے اس کا انداز بالکل جداگانہ ہے۔ حج کے حالات حجاز کی کیفیت وہاں کے رہنے والوں کی معاشرت وہاں کے مناظر وغیرہ کے حالات اس خوبی سے بیان کئے گئے ہیں کہ پڑھنے والوں کو خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔

"حکایات امجد" مختلف مضامین کا مجموعہ ہے ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خود امجد صاحب کی زندگی سے متعلق ہیں اخلاق اور تصوف کی بیش بہا معلومات کے ساتھ ہی ساتھ دلچسپ مکالمے پرلطف محفلوں کی تصویر جس انداز میں پیش کی گئی ہے وہ دیدۂ بصیرت کے لئے سبق آموز اور نتیجہ خیز ہے۔

"گلستان امجد" دراصل سعدی شیرازی کی گلستان کا ایک بہترین ترجمہ ہے۔ سعدی کی نظم و نثر دونوں کا ترجمہ امجد صاحب نے اپنی دلچسپ نثر میں کیا ہے۔ اور جابجا اپنی رباعیات اور قطعات پیش کرتے گئے ہیں اس طرح گویا یہ گلستان سعدی گلستان امجد بن گئی ہے۔ اس کا مقدمہ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے۔ مولانا کے خیالات کا مختصر اقتباس ملاحظہ کے قابل ہے۔

"دونوں (سعدی شیرازی اور امجد حیدرآبادی) میں عجیب مناسبت ہے۔ وہ بھی صوفی یہ بھی صوفی۔ وہ شاعر یہ بھی شاعر۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے فقروں والی نثر کی پیالیوں میں قند و نبات گھول کر دیتے اور یہ بھی۔ اخلاق اور نصیحت کی تلخی کو شہد و شکر میں ملا کر وہ بھی پلاتے تھے اور یہ بھی پلاتے ہیں۔ مجاز و حقیقت کا پردہ وہ بنتے تھے اور یہ بھی بناتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، مختصر جملے، ٹھیٹ محاورے، دلکش ترکیبیں، میٹھے میٹھے لفظوں سے یہ چیزیں اس کتاب کی خاص خصوصیتیں ہیں۔"

"میاں بی بی کی کہانی" میں خوبصورت افسانہ میاں بی بی کے تعلقات کا تذکرہ ہے۔ عورت کی مظلومی کو ابھارا گیا ہے۔ مگر اس کو بھی اخلاق اور

[1] ملاحظہ ہو آجکل بابت ۱۵ جولائی ۱۹۴۶ء صفحہ [illegible]۔

تصوف کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ امجد صاحب کی نثر کے بعض خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

آپ کی نظم کی طرح نثر بھی بالکل صاف۔ سادہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ اس میں فارسی اور عربی کے لغات اور ثقیل الفاظ نہیں ہوتے۔ اس کے سمجھنے میں کسی کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔

آپ کی نثر چھوٹے چھوٹے جملوں سے مرکب ہوتی ہے۔ اس کے جملوں میں مبتدا اور خبر میں زیادہ فصل نہیں ہوتا۔

آپ کی نثر میں کبھی کبھی شوخی اور ظرافت کے گرم گرم فقرے آجاتے ہیں جن سے ہر پڑھنے والے کو ایک خاص لطف ملتا ہے۔ اور کبھی ہندی کے الفاظ اور جملے آپ کی نثر میں آجاتے ہیں جس سے ایک شیرینی پیدا ہو جاتی ہے۔

اخلاق اور نصیحت کی کڑوی کسیلی باتوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کی تلخی شیرینی سے بدل جاتی ہے اور پڑھنے والوں کو گراں نہیں گزرتا بلکہ دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

نظم کی طرح نثر میں بھی حکمت، معرفت، سلوک اور باطن کے بیش بہا مضامین اس طرح صاف اور واضح طور پر ادا ہوتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو گراں نہیں گزرتے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وعظ اور نصیحت کے بڑے بڑے مضمون یا طولانی تقریر سے وہ بات حاصل نہیں ہوسکتی جو آپ کی ایک مختصر حکایت یا فقرے سے حاصل ہوسکتی ہے۔

آپ نظم ہو یا نثر دونوں میں کسی شخص خاص کے اسلوب بیان کی پیروی نہیں کرتے بلکہ آپ کا طرز بیان سب سے بالکل جداگانہ اور نرالا ہے۔ اس کے آپ ہی موجد ہیں۔

ادبی حیثیت سے آپ کی نثر بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے لطف زبان اسلوب بیان کی جدت طرز ادا کی دلکشی قابل داد ہوتی ہے۔

یہاں مختصر طور پر آپ کی نثر کے بعض اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔

"ایک دفعہ نیند سے اٹھ کر کہنے لگیں۔ رات میں نے عجیب تماشا دیکھا وہ یہ کہ لیلیٰ محمل میں سوار ہے اس کے ناقے کی مہار قیس کے ہاتھ میں ہے کیونکہ ناقہ لیلیٰ کا حامل قیس کے سوا اور کون ہوسکتا ہے قیس انتہائے مسرت میں کودتا پھاندتا ناچتا اچھلتا مہار تھامے ہوئے چلا جارہا ہے۔ قیس کی طرح ناقہ تو مجنوں نہیں تھا وہ اپنی معمولی رفتار سے ریتیلے میدان میں ایک ایک قدم رکھتا ہوا چل رہا ہے۔ مہار ہے۔ کہ خدا جانے لمبی ہوتی چلی جارہی ہے" (جمال امجد)

"بڑھاپے میں جوانی کا رنگ کس طرح آسکتا ہے بہا ہوا پانی پھر ندی میں واپس نہیں ہوسکتا۔ سوکھا ہوا کھیت سبزہ نو کی طرح کہاں لہلہا سکتا ہے۔ افسوس جوانی جاتی رہی۔ ہائے جوانی، جوانی کے ساتھ ہی اصل زندگی رخصت ہوگئی۔ اب تو مردوں کی طرح ایک جگہ پڑا ہوا ہوں۔ ایک بڑھیا نے خضاب لگا کر اپنے سپید بال کالے کر لئے تھے۔ میں نے کہا نانی اماں بالوں کو تو تم نے خضاب سے کالا کر لیا۔ مگر اس کبڑی پیٹھ کا کیا علاج کرو گی" (گلستان امجد)

"عائشہ شادی کے پہلے کس قدر ہنس مکھ۔ ملنسار۔ بامروت لڑکی تھی عزیز تو عزیز اکثر پڑوس والیاں بھی اس پر جان دیا کرتی تھیں۔ اس سے ایک دفعہ مل لینا ہمیشہ کے لئے طوق بندگی گردن میں ڈال لینا تھا۔ نوکر اس کے شیدا۔ سہیلیاں اس کی دیوانی۔ گھر میں ہر آنے والا پہلا قدم رکھتے ہی پوچھتا عائشہ ماں کہاں ہیں۔ صورت میں ماہتاب۔ سیرت میں لاجواب۔ گھر بھر کی جان تھی۔ آخر بدر کامل بغیر ہالے اور پیکر ناز بغیر آغوش محبت کے کب تک رہ سکتا ہے۔ عائشہ کی شادی ہوگئی" (حکایات امجد)

امجد صاحب ناول یا افسانہ نگار نہیں ہیں اور نہ آپ نے کوئی ڈرامہ لکھا ہے بلکہ تصوف اور اخلاق ہی آپ کا موضوع ہے۔ مگر اس کی خوبی یہ ہے کہ آپ تصوف اور اخلاق کو ایسے پیرایہ میں اور ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان سے ناول کا اور افسانہ کا مزہ ملتا ہے۔ اور ایسے مکالمے لکھتے ہیں جس سے ڈرامہ کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ یہ آپ کی وہ خصوصیت ہے جو کسی اور انشاپرداز ادیب میں نہیں پائی جاتی۔

افسانہ نویس کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے سدھار کے لئے افسانہ کی صورت میں سبق آموز واقعات پیش کئے جائیں پڑھنے والوں کو یہ نہ معلوم ہو کہ افسانہ کا مقصد عبرت انگیزی یا آموزی ہے بلکہ بظاہر تفریح طبع اور دلچسپی ہوتی ہے لیکن ان کا حاصل مقصد سبق آموزی ہوتا ہے۔ امجد صاحب افسانہ نویس نہیں ہیں۔ مگر ان کا مقصد یا پیام انسانی زندگی کا سدھار ہے۔ وہ "محبت" "نیک زندگی" "اچھی عادت" "برائی سے پرہیز" کے لئے اپنے کلام نظم و نثر سے سامان ضیافت کرتے ہیں۔ نصیحت کی کڑوی کسیلی باتوں کو شیرینی لپیٹ کر پیش کرتے ہیں غرض آپ کا انداز بالکل فارسی کے ادیب سعدی کا سا ہے۔ اسی لئے مولانا سید سلیمان ندوی نے آپ کو حیدرآباد کے سعدی کا لقب دیا ہے جو بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ فقط۔

آپ کیا چاہتے ہیں

افسانہ

بلدیپ کور

آج طبیعت کچھ عجیب الجھی ہوئی سی تھی دل بہلانے کے خیال سے بازار کی طرف نکل گیا. چلتے چلتے سینما تک پہنچ گیا. فلمی ریکارڈ بج رہے تھے. لوگ انہیں سننے کے لئے اکٹھا ہو گئے تھے اور خوب غور سے سن رہے تھے. بھلا وہ لوگ جنہیں کچھ کام نہ ہو اور جائیں بھی کہاں ہیں؟ —— میٹھے میٹھے ترانے فضا میں گونج رہے تھے۔ ان کی مٹھاس کانوں کی راہ سے میرے احساس میں گھلتی چلی گئی۔ میں نے سوچا کہ آج سینما ہی کیوں نہ دیکھا جائے؟ طبیعت بھی بہل جائے گی اور وقت بھی آسانی سے کٹ جائے گا۔

سینما گھر کے بکنگ آفس کے پاس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ٹکٹ بابو کی کرسی پر ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے اور وہ ہر ٹکٹ لینے والے کو دیکھ کر مسکرا دیتی ہے اب سمجھ میں آیا کہ یہاں اتنی زیادہ بھیڑ کیوں ہوتی ہے!

اس دوشیزہ کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عیسائی ہے، عمر بیس کے لگ بھگ ہوگی —— فلم شروع ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں نے کئی بار کھڑکی کے اندر سے اسے جھانک کر دیکھا اور اس کی مسکراہٹ سے لطف اندوز ہوا۔ اس نے مجھے اپنا منہ تکتے دیکھ کر اسی طرح مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟" میں اس سوال کا جواب نہ دے سکا اور کھڑکی سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

اب فلم شروع ہونے والی تھی۔ بھیڑ دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔ کھڑکی خالی دیکھ کر میں پھر کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اب وہ بالکل سنجیدہ سی بیٹھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ مسکراتے مسکراتے اس کے ہونٹ تھک گئے ہیں یا پھر کسی کی یاد اسے ستا رہی ہے اور اس میں وہ کھو گئی ہے۔ جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑی پھر اسی انداز سے مسکراتے ہوئے اس نے سوال کیا

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

میں نے کچھ کہے بغیر ٹکٹ کے پیسے بڑھا دیئے وہ مجھے جونہی ٹکٹ دینے لگی میں نے جان بوجھ کر اس کی انگلیوں کو پکڑ لیا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔ میرا دل دھڑکنے لگا —— اور اس نے مسکراتے ہوئے پھر وہی سوال کیا

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں ..... میں" الفاظ میرے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔

"اچھا آپ سینما دیکھ آئیے۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔" وہ مجھ سے بہت نرم لہجہ میں بولی۔

میں ٹکٹ لیکر بغیر کچھ کہے ہال کی طرف بڑھا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ فلم شروع ہوئی اور ختم ہو گئی مگر مجھے خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں ختم ہو گئی۔ میرے حواس میں عجیب قسم کا جمود پیدا ہو گیا تھا۔ بس وہی الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ سینما سے لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے سینما کی دکانیں بند ہو گئیں اور آخرکار سینما کے سامنے والی بڑی بتی بھی بجھا دی گئی۔ میں ایک کونے میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں کہ اتنے میں وہی عورت میرے پاس آ کر بولی۔ "کیا آپ میرے ساتھ چلنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟"

پہلے تو میں نے سوچا نہ جانے یہ مجھے کہاں لے جائے؟ اس وقت جانا ٹھیک نہیں! مگر پھر آپ ہی آپ میرے منہ سے نکل گیا۔ "چلئے چلتا ہوں" اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنی چھتری کھول لی اور مجھے بھی چھتری میں لے لیا۔

ہم دونوں خاموش چلے جا رہے تھے —— میری سانس کی تیزی وہ ضرور محسوس کر رہی ہوگی —— میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ آخر چلتے چلتے وہ ایک گلی میں مڑ گئی۔ یہ گلی بہت تنگ تھی —— چلتے چلتے وہ ایک مکان کے سامنے کھڑی ہو گئی اور چابی نکال کر دروازہ کا تالا کھولا —— میں دل میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ اسی مکان میں رہتی ہے؟ گھر دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کسی بہت ہی غریب آدمی کا مکان ہو جو بمشکل تمام اپنا پیٹ پالتا ہو اور بری طرح اپنے زندگی کے دن پورے کر رہا ہو۔ ایک معمولی سی چارپائی، کچھ کام چلاؤ برتن۔ کچھ ٹوٹے ہوئے صندوق ایک مٹی کا چراغ —— اور ایک طرف وہ مسکراتا ہوا چہرہ جو سینما کے شیدائیوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا مجھے اس کے رہنے سہنے کا یہ سادہ انداز دیکھ کر اس پر ترس آ رہا تھا —— کتنی معمولی زندگی گزار رہی تھی وہ؟ دکھوں سے بھری ہوئی زندگی، مجھے وہ لوگ یاد آ گئے جو اسے سینما میں غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یہ کیا خبر تھی کہ اس کی مری ہوئی مسکراہٹ کے نیچے دکھ اور درد کی کتنی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ تبسم کے ان شعلوں میں غم کا کتنا دھواں ہے؟ کاش وہ دیکھ سکتے کہ اس مسکراہٹ کے پردہ میں کتنی تلخیاں اور مایوسیاں ہیں، اس کے دل میں کتنے زخم ہیں جنہیں چھپانے کے لئے وہ ہنس رہی ہے، مسکرا رہی ہے، مگر عورت کو صرف عورت سمجھ کر دیکھنے والوں میں اتنی حس کہاں کہ ذرا سی دیر کے لئے وہ جذبات کی آگ کو بجھا کر انسانی سطح پر آ کر دیکھیں کہ ایک مسکراتی ہوئی عورت کی چھاتی میں کتنی چنگاریاں بھری ہوئی ہیں —— !

میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ وہ چراغ اٹھا لائی اور اسی طرح مسکرا کر بولی۔

مجھے میری آنکھوں ہی تو دیکھ لیجئے!" میں سوچنے لگا کہ اب کونسی ایسی یا بری چیز رہ گئی ہے جو یہ مجھے دکھانا چاہتی ہے؟ بہرحال میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہولیا۔ پہلے وہ مجھے رسوئی گھر میں لے گئی پھر صحن سے گذر کر ایک کمرہ میں داخل ہوئی۔ اس میں ایک الماری تھی جس میں دواؤں کی چند شیشیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک پلنگ پر سفید چادر اوڑھے کوئی لیٹا تھا، چادر سانس کی حرکت سے نیچے اوپر ہو رہی تھی پاس ہی ایک صراحی رکھی تھی، اس سے لگا ہوا ایک گلاس رکھا تھا —— ایک چراغ جلنے سے وہاں ٹمٹما رہا تھا دوسرا آجانے سے روشنی میں کچھ اضافہ ہوا۔ وہ بڑی ہوشیاری اور نرمی سے چادر کو سرہانے سے اٹھا کر بولی۔ "یہ میرے پتی ہیں" تین سال پہلے ریلوے میں ٹریفک انسپکٹر تھے، ہماری زندگی آرام سے گذر رہی تھی مگر قسمت نے پلٹا کھایا اور یہ بیمار پڑ گئے اور پھر ان کی حالت روز بروز بگڑتی ہی چلی گئی" —— اس کے گال پچکے ہوتے تھے، آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، ہونٹ جیسے زندگی کے رس سے خالی ہوتے جا رہے تھے —— میرے سینہ میں ایک گھونسا سا لگا، میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے حیرت اور تعجب سے دیکھ رہا تھا اور وہ کہتی چلی جا رہی تھی "جو کچھ پونجی تھی دھیرے دھیرے کرکے ختم ہونے لگی اور آخر ایک دن سب کچھ ختم ہوگیا مگر یہ اچھے نہ ہوئے پھر بھی جب تک سانس تب تک آس، میں ان کا علاج کئے جا رہی ہوں اور ان کی صحت کی آس پر جی رہی ہوں —— نوکری کرنے کے بعد اپنے فرائض کا احساس بھی کرنا پڑتا ہے یہی احساس ہے جو سینما کی کھڑکی پر بیٹھنے کے بعد مسکراہٹ بن کر ہونٹوں پر دوڑنے لگتا ہے۔ دل روتا ہے۔ آتما سسکتی رہتی ہے مگر میں مسکرائے جاتی ہوں، اس لئے کہ مسکرانا میرے فرائض میں داخل ہے، رونا دھونا تنہائی کی باتیں ہیں نوکری پر تو مسکرانا ہی پڑتا ہے، اسی کی تنخواہ ملتی ہے، میں مسکراتی رہتی ہوں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ میری اس مسکراہٹ میں مٹھاس ہے" —— اتنے میں مریض کراہتے ہوئے اپنی بیوی سے بولا۔

"آج اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

"تم نے دوائی پی؟" عورت بات کاٹ کر بولی

"نہیں!" اس نے کہا "آج اٹھنے کی سکت ہی نہ تھی مجھ میں، دوا تک پر ہاتھ نہ پہنچ سکا لیٹے لیٹے!"

عورت نے جلدی سے گلاس میں بھر کر دوا پلائی۔ اس کے بعد ہم لوگ وہاں سے ہٹ کر ذرا دور کھڑے ہوگئے —— کچھ دیر چپ رہ کر وہ پھر بولی۔

"اس طرح میں مسکراہٹ کے پردہ میں اپنے دکھوں کو چھپا کر روز پیسہ کما لاتی ہوں جو ان کی دوا پر خرچ ہو جاتے ہیں انہیں پیسوں سے اپنے دوزخ کو کسی نہ کسی طرح —— ورنہ؟"

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ مجھے مسکرانے کی مہلت کہاں؟ —— جب میں مسکراتی

ساجن سے

آؤ ساجن آؤ نا!

دیکھو چپ او گگن میں سویا جگ ہے اپنی نیند میں کھویا

میں دکھیاری تم بن تڑپوں

آؤ دھیر بندھاؤ نا! آؤ ساجن آؤ نا!

پل پل آئے یاد تمہاری! ساجن تم بیتے میں ہاری

درشن کو انکھیاں ترستی ہیں

آؤ اب ترساؤ نا! آؤ ساجن آؤ نا!

کون تمہیں جا کر سمجھا دے برہ کی اگنی کون بجھا دے

ڈول رہی ہے من کی نیا

آؤ پار لگاؤ نا! آؤ ساجن آؤ نا!

قاسم علی

ہوں میرے دل کی آگ اور بھڑک جاتی ہے، ہونٹوں کی وہ مصنوعی حرکت جسے آپ تبسم کہتے ہیں میرے زخموں کو اور کھرچے ڈالتی ہے پھر بھی میں مسکراتی ہوں —— زندگی اسی کا نام ہے آگ اور پانی کے اسی ملاپ کو زندگی کہتے ہیں"

میرا سر چکرانے لگا میں اپنے کئے پر پچھتا رہا تھا، مجھ میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ اس سے نگاہیں ملا سکوں —— بغیر کچھ کہے میں دروازہ کی طرف بڑھا —— نہ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی۔

آہ عورت! —— مجبور اور وفادار عورت!! میرے سینہ میں انگارے دہکنے لگے، احساس میں ایک دم بہت سی چنگاریاں سلگ اٹھیں، مجھے دنیا اور دنیا والوں سے ایک شدید نفرت محسوس ہونے لگی ——

اب میں ایک چوڑی سڑک پر چل رہا تھا جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بجلی کے کھمبے کھڑے تھے، روشنی سڑک پر پھیل رہی تھی، ایک کھمبے کے نیچے سے گذرتے وقت بہت سے پتنگے میرے منہ سے چمٹ گئے —— وہ روشنی کے گرد اکٹھے ہوگئے تھے —— میں نے سوچا روشنی میں کتنی کشش ہے، وہ ہزاروں لاکھوں پروانوں کو گھسیٹ لاتی ہے اور پروانے یہ دیکھے بغیر کہ اس روشنی کے پیچھے کیا ہے؟ اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ —— مجھے سینما کی وہ بھیڑ یاد آگئی جو محض ایک تلخ مسکراہٹ کے لئے وہاں اکٹھی ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا وہ لوگ بھی —— جو ایک ستائی ہوئی عورت کے گرد تبسم کے لئے سینما کی کھڑکی پر جمع ہو جاتے ہیں ان پروانوں —— بے حس اور بے شعور پروانوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اسی وقت گھبرا کر میں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار دیا اور دو تین کیڑے میرے ہاتھ کے نیچے کچل کر رہ گئے!

حسینؑ اور انسانیت

ذاکر حسین خاں

آج دنیا کے ہر گوشے میں ایک غمناک واقعہ کی یاد لوگوں کو آرہی ہے جسے ہوئے ۱۳۰۰ برس سے اوپر گذر گئے۔ کیا یہ کسی خاص عصبیت کو قائم رکھنے کی خواہ مخواہ کوشش ہے؟

انسانی تاریخ کا دامن کیا المناک حوادث سے اتنا خالی ہے۔ اور رنج والم اور درد و کرب کیا انسانی زندگی میں ایسے نادر تجربے ہیں کہ بس بعض المناک حوادث کو چن چن کر یاد رکھا جائے؟ میں سمجھتا ہوں کہ بات اس سے زیادہ گہری اور انسانیت کے لئے زیادہ اہم ہے مجھے تو اس واقعہ میں انسانی ارتقاء کے اصل اصول کا راز چھپا نظر آتا ہے جسے یاد کرکے لئے یاد رکھ کر یہ انسانیت جو بھولتی بھی ہے بھٹکتی بھی ہے سیدھی شاہراہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر ہر رنگ ڈنڈیوں پر پڑی پھرا بھی کرتی ہے اور آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے ہٹتی بھی ہے۔ وہ انسانیت اس واقعہ کو یاد کرکے، سچ یہ ہے کہ اپنی صحیح راہ کو یاد کرتی ہے۔ اور ایک دفعہ پھر منازل ارتقائی کو طے کرنے کا قصد کرتی ہے چاہے یہ یاد دھندلی سی یاد ہو۔ چاہے یہ قصد بہت ہی کمزور سا ارادہ ہو۔

تاریخ کا ہر واقعہ کسی خاص سیاسی اور تمدنی ماحول میں ہوتا ہے۔ اور بہت سے دوسرے واقعات سے مربوط ہوتا ہے۔ ربط کا یہ حلقہ اکثر بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اور تاریخ انسانی کی وسعت میں یہ مربوط وحدت زیادہ عرصہ تک موثر وحدت کی حیثیت نہیں رکھ سکتی۔ اور تاریخ اسے ہوتے ہوتے بھلا دیتی ہے لیکن بعض واقعات باوجود اپنی تاریخی، مکانی و زمانی پابندیوں کے حیاتِ انسانی کے کسی ایسے اہم اصول کے ترجمان ہوتے ہیں۔ کہ جب تک وہ اصول کار فرما ہے۔ ان کا بھلانا ذہن انسانی کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ وہ ایک منفرد واقعہ نہیں ہوتا۔ سارے واقعات کی روح ہوتا ہے۔ ان واقعات کا فہم حوادث تاریخی کے بے ربط و بے ترتیب سے انبار میں ربط و ترتیب پیدا کر دیتا ہے۔ ان سے تاریخ کی تاریکیوں کو روشنی نصیب ہوتی ہے۔ اور اس کا بظاہر بے معنی سا سلسلہ واقعات بامعنی معلوم ہونے لگتا ہے۔ شہادت حسین کا واقعہ اسی قسم کے واقعات میں سے ہے۔ یہ ایک مخصوص تاریخی جو کھٹے میں دراصل زندگی کے عالمگیر اصل اصول کو انسانیت کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

قدرت نے انسان کے علاوہ ہر بے جان اور جاندار مخلوق کو اپنے وجود کا توازن پانے کے لئے اندرونی کشاکش سے بچایا ہے۔ کہیں مادی خواص کو، کہیں فطری جبلتوں کو اس توازن کا ضامن بنا دیا ہے۔ داخلی تضاد کی کٹھن منزل جو انسان کے لئے انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں مقدر ہے۔ اس سے اور ساری مخلوق محفوظ ہے۔ پتھر بھی اس سے مامون ہیں، جانور بھی فرشتے بھی۔ ایک انسان ہی ہے۔ جس کے نصیب میں متضاد عناصر کی کشاکش سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہے یہ اپنا توازن کھو بھی سکتا ہے پا بھی سکتا ہے ایسا لگتا ہے کہ انسان شاید ایک عبوری مخلوق ہے۔ اس کے وجود کی سرحدیں ایک طرف حیوانی علاقہ سے ملتی ہیں۔ ایک طرف الٰہی سے۔ اس کے سینے کو متضاد قوتوں اور میلانوں کا جولانگاہ بنا کر۔ کفر و شرک کی کشاکش میں اسے ڈال کر، روح انسانی کو یہ سعادت ارزانی کی گئی ہے۔ کہ وہ اسی مشکل میں ایک ہم آہنگ و متوازن حیات طیبہ کی تعمیر کر سکتی ہے۔ مادی اشیا کی دل فریب شکل سے بھی اسے واسطہ ہے۔ اور مادیت سے دامن چھڑانے کا شدید ولولہ بھی اس میں کار فرما ہے۔ یہ خود غرضی خود بینی کا مرکز بھی ہے۔ اور محبت کی بے غرضی و بے نفسی سے بھی اسی کا سینہ معمور ہے، یہ سفاکانہ تاخت و تاراج کے بے خیال اور بر خود غلط جنون کا شکار بھی ہو سکتا ہے اور بے تھکن کٹھن سے کٹھن جماعتی تعمیر کے لئے اپنی قوت کا ایک ایک شمہ بھی وقف کر سکتا ہے، یہ تمرد اور رعونت و غرور کے نشہ میں معصوم گردنوں سے خون کے دریا بہانے سے نہیں جھجکتا، اور خنجر تسلیم و رضا کا کشتہ بننا بھی اسی کو آتا ہے۔ یہی حریصوں کی طرح بٹورتا ہے یہی بہار کی طرح لٹاتا ہے۔ یہی اوروں سے چھینتا ہے۔ اور یہی اپنا سب کچھ اوروں پر نثار کر دیتا ہے۔ یہی پلی پلی جوڑتا ہے، یہی کچے ڈھلکاتا ہے۔ یہی ہر تغیر سے ڈرتا ہے اور سارے تغیر اسی کے شرمندۂ احسان ہیں۔ یہی احتیاط کے مارے پھونک پھونک کر قدم اٹھانے سے بھی ڈرتا ہے اور پھر یہی سرفروشانہ دہکتی آگ میں کود پڑتا ہے، یہی زمین سے نگر نہیں ہٹا سکتا۔ یہی ستاروں سے باتیں کرتا ہے۔ یہی غفلت میں اعلیٰ سے منہ موڑ کر ادنیٰ کا گرویدہ ہو جاتا ہے یہی ہوشیار ہو کر ادنیٰ کی آلودگیوں سے دامن چھڑا کر اعلیٰ کی طرف بے تابانہ بڑھتا ہے، یہی زندگی پر جان دیتا ہے اور حیات بے شرف تک پر راضی ہو جاتا ہے، یہی جان دے کر زندگی کا چراغ روشن کرنا بھی جانتا ہے اور مرگ باشرف کو اصل حیات اور ضامن حیات مانتا ہے یہی سرکشی کرتا ہے، یہی سر تسلیم خم کرتا ہے یہی کافر ہے یہی مومن، یہی فرعون ہے یہی موسیٰؑ یہی شرار بولہبی ہے یہی چراغ مصطفویؐ، یہی یزید یہی شبیرؑ۔

اور اس کے ارتقا کا سارا راز، بہا ہم پر اس کی فضیلت کی اصل، اس کی انسانیت کا سارا شرف اس میں ہے کہ یہ ادنیٰ پر اعلیٰ کو ترجیح دینے کے لئے اپنے ضمیر کی پکار، اپنے قلب کے حقیقی میلان، اپنی عقل سلیم کے سچے رجحان کی وجہ سے مجبور ہے۔ یہ اس پکار کو ٹالتا ہے۔ اس میلان کو دباتا ہے۔ اس رجحان کو توڑتا مروڑتا ہے لیکن ان سے خالی نہیں ہو سکتا یہ برائیاں کرتا ہے مگر اچھائی سے ہمیشہ کے لئے روگردانی نہیں کر سکتا، ظلم کرتا ہے مگر عدل کے مطالبے

اسے بے چین رکھتے ہیں جو باطل کی حمایت کرتا ہے مگر حق سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔ بدنما تیوں پر قانع نظر آتا ہے مگر حسن کے جادو سے پوری طرح محفوظ کبھی نہیں ہوتا۔ اسفل کی گھاٹیوں میں رہتے ہوئے بھی ایک گوشہ چشم سے اعلیٰ کی چوٹیوں کو تکتا رہتا ہے جب برائیوں کا غلبہ ہوتا ہے جماعتی زندگی مفاسد سے بھر جاتی ہے اور جب کبھی انفرادی زندگی اس سموم ہوا میں دم توڑتی ہوتی ہے اس وقت کا اس کا کوئی نہ کوئی فرد اس کے حقیقی ضمیر کا ترجمان، اس کی اعلیٰ قدروں کا محافظ اور معلم بن کر اسے جھنجھوڑتا ہے، بیدار کرتا ہے، اور اپنے کو خطرہ میں ڈال کر اسے اپنی حقیقی تقدیر کے لئے فراموش کرنے یعنی روحانی خودکشی سے باز رکھتا ہے۔ کربلا میں شہادت حسینؑ کا واقعہ ارتقاء انسانی کے اس عمل کا ایک عظیم بالشان غیر فانی تاریخی مظاہرہ تھا۔ یہ باطل کے مقابلہ میں حق کا، جماعتی مفاسد کے مقابلہ میں افراد کے فریضہ انقلاب کا، حکومت کے ظلم کے مقابلہ میں شہری کے مطالبۂ عدل کا، بے دینی کے مقابلہ میں دین کا سینہ سپر ہونا تھا کہ کہیں مصلحت اندیشی، خوف، تن آسانی انسان کو اقدار مطلقہ کے مطالبوں سے بیگانہ نہ کر دیں۔

وہ قوت ارتقائی ہی جس کے حامل حسینؑ اس تاریخی واقعہ میں تھے، انسان کی حیات طیبہ کی ضامن ہے۔ یہی اسے بہیمیت کے اسفل السافلین میں لوٹ جانے سے روکتی ہے اور اس کا طریق کار بس یہی ہے کہ اس کے حامل اپنے تقاضوں کو اپنی زندگی میں پورا کریں کہ اس کے تقاضے، اس کے مطالبے، دلیلوں سے منوائے نہیں جا سکتے نہ خالص عقلی مقولوں میں ثابت کئے جا سکتے ہیں۔ ان کو اپنی زندگی میں برت کر دکھانا ہوتا ہے ان کے لئے آرام و آسائش کو تجنا ہوتا ہے۔ اپنے پرائے کا برا بننا ہوتا ہے۔ محبت کے پھول برسا کر پتھر کھانے ہوتے ہیں۔ دعاؤں کے جواب میں گالیاں کھانی ہوتی ہیں۔ مخلصانہ خدمتوں کے عوض میں بدگمانیاں اور بے اعتمادیاں ملتی ہیں۔ اور ان سب کو مسکرا کر سہنا ہوتا ہے۔ اور ان کی خاطر جیے جانا ہوتا ہے۔ مگر سب سے زیادہ وضاحت سے اور اپنی غیر مشروط مطلق شکل میں اسوقت سامنے آتے ہیں جب ان کے لئے ناکامیابیوں کو کامیابیوں پر اور محرومیوں کو کامرانیوں پر ترجیح دی جاتی ہے اور اپنی پوری شان اور رنگینی میں اسوقت جب ان کے لئے جان کی بازی لگانی ہوتی ہے۔ کربلا کے میدان میں اقدار مطلقہ کی یہ حمایت اپنی اسی صاف اور واضح اور بے میل شکل میں دنیا کے سامنے آئی اور ایک داستان سادہ رنگین سے تاریخ انسانی کو ہمیشہ کے لئے مالا مال کر گئی۔

کس سادگی سے فرمایا اس شہید انسانیت نے حق پر اپنی آخری شہادت سے ایک شب پہلے لوگو! دنیا نے رنگ کیسا بدل لیا ہے؟ نیکی سے خالی ہو گئی ہے! افسوس دیکھتے نہیں کہ حق کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اور باطل پر اعلانیہ عمل کیا جا رہا ہے، اور کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑے۔ اسے سہارا دے! بس اب وقت ہے کہ مومن حق کی رضا میں لقاء الٰہی کی خواہش کرے۔ میں شہادت کی موت چاہتا ہوں، ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود جرم ہے۔ یہ شہید حق تاج و تخت لینے نہیں نکلا ہے۔ تاج و تخت لینے والے لقائے الٰہی کی خواہش نہیں کیا کرتے! تاج و تخت چاہنے والے یکسوئی سے شہادت کا قصد کر کے نہیں نکلا کرتے۔ تاج و تخت کے طالب مٹھی بھر آدمیوں سے لشکر جرار کا مقابلہ نہیں کرتے۔ یہ شہید حق اس سستی کامیابی کے لئے نہ نکلا تھا۔ جو انسان کو اکثر سچائی اور اچھائی سے بے تعلق و بیگانہ کر دیتی ہے۔ کامیابی چاہنے والے اپنے گنے چنے ساتھیوں کو معرکہ سے پہلے ساتھ چھوڑ سکنے کی رخصت نہیں دیا کرتے۔ وہ مقابلے کی پہلی کی شب میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کل میدان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ میری صلاح ہے کہ تم خاموشی سے نکل جاؤ۔ میں خوشی سے تمہیں رخصت کرتا ہوں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہید اپنی شہادت کو انسانیت کے لئے اتنا صاف اور واضح بنانا چاہتا ہے۔ کہ کسی کو سمجھنے میں ذرا دشواری نہ ہو۔ پھر جب وفادار ساتھی ساتھ نہیں چھوڑتے تو قربانگاہ تسلیم و رضا پر اپنی آنکھوں کے سامنے سب کی قربانی پیش فرماتے ہیں۔ ایک ایک کر کے وفادار ساتھی قربان کئے جاتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کو بے وارث ہوتے دیکھا جاتا ہے۔ جوان بیٹے کو اپنے آگے راہی ملک بقا کیا جاتا ہے۔ شیر خوار پیارے بلکتے بچے کو اپنے ہاتھوں میں دم توڑتے دیکھا جاتا ہے اور پھر اپنی جان کا ہدیہ جان آفریں کی بارگاہ میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ گویا حق کے لئے قربانی کا سبق دینے والا قربانی کی ہر دشوار سے دشوار اور دل شگاف سے دل شگاف شکل کی مثال بیک وقت پیش کر دینا چاہتا ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس راہ میں کوئی قربانی بھی ایسی ہے جو نہ کی جائے۔ قدرت کو بھی شاید اس سبق کی وضاحت منظور رہی ہے ادھر سے قوت و جبروت بھی اپنی سب عادتوں کا پورا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان بظاہر ناکام مخالفوں کے سر کاٹے جاتے ہیں۔ ان کی لاشیں روندی جاتی ہیں۔ انکی عورتوں کے سروں سے چادریں اتاری جاتی ہیں۔ ان کے خیمے جلائے جاتے ہیں رسیوں سے باندھا جاتا ہے۔ طوق پہنائے جاتے ہیں۔ ناکامی کی ہر ممکن شکل کا ظہور ہوتا ہے۔ تاکہ حق پرستی کا سب سے مؤثر سبق انسانیت کے ذہن نشین ہو جائے۔ حق کا ساتھ دینا جب کامیابی سستی وقتی کامیابی، اس کے جلو میں ہو کچھ بہت دشوار نہیں۔ اس کی راہ میں ناکامیوں کو سینہ سے لگانا اور اس کی آخری فتح پر ایمان رکھنا حق کی حقیقی قوت کو آشکار کرتا ہے۔ یہی ارتقاء انسانیت کی ضمانت ہے یہی شہادت حسینؑ کا ماحصل۔ انہی حسینؑ انسانیت کے محسنین اعظم میں ہیں۔ اور ان کی شہادت کی داستان تاریخ انسانیت کا ایک نہایت قیمتی رنگین ورق۔

(آواز سے منقول)

ترکی ادب کے بنیادی عنصر

ایس کے چودھری

ترکی انقلاب پر ترکی ادب کا اثر بے حد نمایاں ہے۔ اس بات کو خیری حالبیر نے ایک جگہ یوں بیان کیا ہے "ترکی کے موجودہ حیرت انگیز انقلاب کے پیچھے جن قوتوں کا اثر نظر آتا ہے ان میں سے ایک قوت اس کے ادیبوں کی ہے۔ کسی قوم کے بہت بڑے حصہ میں اگر اس حد تک بنیادی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں جتنی پچھلے چند برسوں میں ترکی میں ہوئی ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ خیالات بہت بڑی حد تک اس کے ادب میں کافی عرصہ سے موجود ہیں۔ سرسری نظر سے دیکھنے والوں کو تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ ترکی انقلاب بغیر کسی تیاری کے جیسے یکایک کہیں سے پیدا ہو گیا۔ حالانکہ ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ ترکی عوام میں خیالات کی جو نئی رو دوڑ چکی ہے اس کی جڑیں کئی طرف کو پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ اور ان میں سب سے اہم شاید ترکی ادیبوں کی قیادت ہے۔"

پہلا شخص جس نے مغرب کی طرف اپنا منہ موڑا اور انقلاب فرانس کے عجیب و غریب نئے تصورات ترکوں تک پہنچائے شناسی آفندی (۱۸۲۶ء۔۱۸۷۱ء) تھا۔ اس کام میں اس کے دوسرے شریک ضیا پاشا (۱۸۲۵ء۔۱۸۸۰ء) اور نامق کمال (۱۸۴۰ء۔۱۸۸۸ء) تھے۔ شناسی آفندی کے اخبار "تصویر افکار" اس نئی تحریک کو لوگوں تک پہنچانے میں سب سے بڑا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ نامق کمال کے اخبار "حریت" نے بھی یہ خدمت انجام دی۔

عبدالحمید کے عہد میں نامق کمال کو بڑی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ یہاں تک کہ اس کی موت بھی جلاوطنی میں ہوئی۔ اس عہد میں قومیت کی تحریک کے سلسلہ میں سب سے نمایاں نام ضیا گیوک آلپ (وفات ۱۹۲۴ء) کا ہے۔ اس نے نہ صرف قومیت کے تصور کو اپنا مسلک بنایا بلکہ ایک اہم خدمت یہ بھی کی کہ فرانس کے مشہور ماہر عمرانیات درخیم کو ترکی میں روشناس کیا اور اس کا مادی عمرانی نظریہ ترکی حلقوں میں عام ہوا۔ ضیا گیوک آلپ نے "ترکی قومیت" کی بنیادی کتاب "ترک چولق اساسلری" (ترکیت کا اساس) کا مصنف بھی ہے۔ یعقوب قدری بھی ترکی کے انقلابی دور کا بڑا جوشیلا اور بلیغ مصنف ہے۔ اس نے بھی ترکی کے انقلابی جذبہ اور عمل پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس کی کتاب "سوذوم وگومورے" (جس کا ترجمہ فرانسیسی میں بھی ہوا) ۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد قسطنطنیہ پر برطانیہ، فرانس اور امریکا کے فوجی مشنوں کے قبضہ کی بھیانک تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس کتاب میں اس نے ان متوسط طبقہ کے ترکوں کا تذکرہ کیا ہے جو بیودرے اور ستوطری کے عیش کوش علاقوں میں آباد تھے۔ ان سارے مصنفوں نے سیاسی انقلاب اور کمالی نشاۃ ثانیہ میں نمایاں عملی حصہ لیا۔ اس بات کو خیری حالبیر نے ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے "ترکی میں ادیبوں کی حیثیت بے حد موثر جماعت کی سی ہے۔ جس کسی نے کمالی انقلاب سے پہلے کے واقعات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کو محسوس کر سکتا ہے کہ یہ ادیب حقیقت میں انقلابی تھے اور یہی شاعر اور ناولسٹ تھے جن کے پیش کئے ہوئے آدرشوں کو سیاسی لیڈروں نے عملی جامہ پہنایا۔"

ضیا گیوک آلپ کے ناول "قزل المہ" (سرخ سیب) کو پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں ترکی قومی نشاۃ ثانیہ کی خواہش کس درجہ تیز تھی۔ کہانی بالکل ایک پیغمبرانہ شان میں لکھی گئی ہے اور مصنف کے سارے تصورات اتاترک کی قیادت میں عملی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کہانی کا ہیرو ترغوت نامی ایک شخص ہے۔ وہ ترکی کے زوال سے مایوس ہو کر کسی "پاک سرزمین" کی جستجو میں نکلتا ہے۔ آذربائیجان کے قریب آئی قاتم نامی ایک پری سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ دونوں میں بات چیت ہوتی ہے اور آخر میں ترغوت سے کہتی ہے "صدیوں تک ترکوں نے اپنی دلیرانہ فتوحات سے اپنی عظمت و شان کو بڑھایا ہے۔ انھوں نے زمین کے دور افتادہ حصوں میں اپنے خیمے نصب کئے ہیں، لیکن انھیں "موعودہ سرزمین" کبھی نہ مل سکی۔ انھوں نے اپنے آپ ہندوستان، چین، عرب، فارس، روم اور یورپ ہر ایک کے رنگ میں رنگا۔ لیکن جب وہ اپنی فتوحات سے دوسروں کی عظمت و بزرگی کو بڑھانے کا خیال چھوڑ کر وہ اپنے وطن لوٹ آئیں گے، صرف جب ہی وہ "موعودہ سرزمین" انھیں مل سکے گی۔ ترکوں کی صرف ایک تاریخ نہیں بلکہ "تاریخیں" ہیں۔ یعنی اس کی تاریخوں میں دوسروں کے لئے ادب اور تاریخ کے بڑے بڑے دفتر پوشیدہ ہیں۔ اس لئے انھیں چاہئے کہ وہ پھر اپنی تاریخ کی طرف لوٹیں۔ اپنی تاریخ کی طرف، اپنی زبان کی طرف اور اس کے ابجد کی طرف۔ اور اس طرح وہ موعودہ سرزمین کے بالکل قریب پہنچ جائیں گے" اسی کے لفظوں میں "ترک قوم دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے۔ جب کبھی اسے کسی ہیرو کی سرداری مل جاتی ہے تو وہ شعلہ کی طرح چمک جاتی ہے۔ سیاست میں بھی، جنگ میں بھی اور کلچر میں بھی۔ یہ ہیرو، یہ لیڈر نہ ہو تو اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی قیادت کے لئے ہمیشہ کسی نہ کسی ہیرو کی موجودگی ضروری ہے۔"

یہ پرجوش تمنا آگے چل کر اتاترک کی شکل میں پوری ہوئی۔

دورِ تنظیمات (۱۸۳۹ء۔۱۸۷۶ء) کے دوسرے مصنفوں میں سے ایک کا نام عبدالحق حامد ہے۔ عبدالحق حامد ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور سیاست داں بھی تھے اور پچھلی صدی کے آخری حصہ میں بمبئی میں قونسل جنرل کی حیثیت سے رہ بھی چکے تھے۔ اور انھوں نے ہندوستانی زندگی کے متعلق ایک ناول بھی لکھا ہے۔ اسی دور کا ایک دوسرا مصنف محمود اکرم پاشا (۱۸۴۷ء-۱۹۱۴ء) ہے۔ ترکی زبان میں اس کی نظمیں اپنے قومی اور وطنی

جذبات کی وجہ سے ... ہوز بیکا ... فامیری، رادلو، تھاسن اور بنیلی جیسے مشہور یورپین ماہروں نے قدیم ترکی تاریخ کے متعلق اپنی تحقیقات کیں اور رادلو اور تھاسن نے خاص کر آٹھویں صدی کی ان ترکی یادگاروں پر بہت کام کیا اور ترکوں نے سائبیریا میں قائم کی تھیں۔ ان یورپین محققوں کی تحقیقات اور ان کے انکشافات سے ضیا گوک الپ (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) بہت متاثر ہوا۔

کمالی انقلاب سے ذرا پہلے عمر سیف الدین (وفات ۱۹۲۰ء) اور احمد حکمت (وفات ۱۹۲۷ء) نے ایسے ناول لکھے تھے جنھیں ترکی ادب میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے لیکن وہ حقیقت میں صحیح قومی جذبات سے بہت دور ہیں۔ ترکی ادب میں وطنیت اور قومیت کو ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے داخل کرنے کا کام خالدہ ادیب خانم (پیدائش قسطنطنیہ ۱۸۸۴ء) اور یعقوب قادری قرا عثمان اوغلو نے انجام دیا۔ ان دونوں لکھنے والوں نے ترکی قومی آزادی کی جنگ کا پرشورش زمانہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور عظیم المرتبت اتاترک کے آہنی پنجوں کو ترکی کی نئی تشکیل کرتے بھی دیکھا تھا۔

تاریخی کتابیں لکھنے والوں میں محمد فواد کوپرولو نے اپنی مشہور کتاب اناطولی اسلامیت (اناطولیہ میں اسلام) لکھ کر تنقیدی تحقیق کو ایک نئی راہ دکھائی۔ حکومت عثمانیہ کے آغاز کے متعلق اس کی کتاب تاریخی تحقیق کا ایک بے بہا سرمایہ ہے، جس میں قدیم اور جدید، مغربی اور مشرقی ہر طرح کے ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔ محمد فواد کوپرولو نے تاریخ اور زبان کی تحقیقات سے ترکی میں منظم تحقیقات کا ایک نیا راستہ کھول دیا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ پہلا ترک محقق ہے جس نے بین الاقوامی شہرت پائی۔

کمالی عہد کے مصنفوں میں ہم اوناسیدن (جو ایک زمانہ میں لندن میں سفیر تھا) احمد ہاشم، محمد عاکف، احمد رفیق اور جلال نوری کا نام لے سکتے ہیں۔ یہ سارے مصنف، احمد رفیق اور جلال نوری کو چھوڑ کر شاعر بھی ہیں اور ناول نگار بھی۔ احمد رفیق مورخ تھا اور جلال نوری ماہر عمرانیات۔ ترکی کے یہ سب عظیم المرتبہ مصنف ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک ایک ایک کرکے موت کی نذر ہو گئے۔

موجودہ نسل کا نوجوان لکھنے والوں میں صدری اتم (پیدائش ۱۸۹۸ء) ناولسٹ اور ناٹک نویس (پیدائش ۱۸۹۸ء)، سزت جلال، نجیب فاضل، کمال عسجی اور آکا گوندوز زیادہ مشہور ہیں۔

ترکی کے موجودہ ادب کے عام عناصر گہرے قسم کی وطنیت اور قومیت سے مملو ہیں، اور ان کے علاوہ شخص، سماج اور واقعہ کی تحلیلی تاویل اور انسانی ذہن پر وقت اور مقام کے اثرات جیسی چیزوں کو بھی ادب میں اہمیت حاصل ہے۔ ترکی ادب تاریخ میں موجودہ سماج میں انسان کی شخصیت کا مطالعہ منفرد حیثیت سے نہیں کرتا بلکہ اسے پیچیدہ نظام کا ایک جزو سمجھ کر اس سے بھی زیادہ اس کا موضوع یہ ہے کہ تاریخ میں اور ہمارے موجودہ پیچیدہ اور نہ سمجھے میں آنے والے احوال میں شخصیت کا مقام کیا ہے۔

چین میں شادی کی رسمیں

فضل حق قریشی دہلوی

چین میں شادی کی رسمیں دلچسپ اور توجہ کی مستحق ہیں۔ زندگی کی منزل ثانی میں داخل کرنے سے پہلے والدین اپنی لڑکیوں کی اعلیٰ تربیت کا خاص اہتمام کرتے ہیں وہ انہیں سلیقہ مند اور گھر بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن اس تمام سعی و کاوش کی تہ میں عورت کی اپنی ذات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ والدین کے پیش نظر یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ان کی بیٹی اپنی ذہانت و لیاقت سے پرائے گھر جا کر راج کرے بلکہ اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کی لڑکی کی وجہ سے سسرال والوں کے نظام حیات پر کوئی ناگوار اثر نہ پڑے۔ چنانچہ زیادہ توجہ اس امر پر مرکوز کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ساس سسر اور جیٹھ دیور کی اطاعت و فرمانبرداری اور خدمت گزاری کے ڈھنگ سیکھ لے۔ خاوند کی خدمت گزاری کا مسئلہ زیادہ قابل غور نہیں ہوتا کیونکہ بیوی براہ راست اس کے آرام کی ذمہ دار نہیں ہوتی۔ خود اس کے گھر والے اس کی آسائشوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ بیوی کو تو اتنی اجازت بھی نہیں ہوتی کہ وہ سب کے سامنے اپنے خاوند سے بات چیت کرے یا کسی بھی حالت میں اس کے ساتھ ایک ہی چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھائے۔

جہاں تک گھریلو معاملات کا تعلق ہے شادی انفرادی کی بجائے اجتماعی حیثیت رکھتی ہے۔ کسی فرد واحد کی بجائے پورے گھرانے کے احترام کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ وہاں کسی مرد کے پیش نظر شادی کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس رسم کی ادائیگی صرف ذاتی فائدے کی غرض سے کر رہا ہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ بیوی اس کے گھر والوں کی خدمت کرے، بچے جن کر افراد خاندان میں اضافہ کرے جس سے خاندان کا نام روشن ہو اور اس طرح آبائی پرستش کا سلسلہ ابتک قائم رہے۔ یہ بات اس درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں کہتا کہ میں نے اپنی لڑکی فلاں مرد سے منسوب کر دی بلکہ اسے خاندان کا نام ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ نسبت قرار پا جانے کے بعد اگر شادی کی رسم ادا ہونے سے پہلے مرد کا انتقال ہو جائے تو عورت اپنے کنبے والوں کو خیرباد کہہ کر اس منگیتر کے گھر رہنا شروع کر دیتی ہے جس کی صورت سے بھی وہ نا آشنا ہوتی ہے اور اس طرح اپنی ساری عمر سسرال والوں کی خدمت میں بسر کر دیتی ہے۔

شوہر کا انتخاب کرنے کے سلسلے میں ہندوستان کی طرح چین میں بھی لڑکے اور لڑکی کی مرضی یا ان کی پسند کا مطلق لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ وہ شب عروسی سے قبل ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ بعض دفعہ ان کی تخمین کی ساعتوں سے قبل ہی ان کے دامنوں میں شادی کی گرہ لگ جاتی ہے۔ یعنی دو گھرانوں کے شادی شدہ مردوں میں یہ بات طے پا جاتی ہے کہ اگر ان میں سے ایک کے ہاں لڑکا اور دوسرے کے ہاں لڑکی پیدا ہو تو ان کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا جائیگا۔

کوئی شادی آپس کے رشتہ داروں میں کبھی طے نہیں پاتی خواہ وہ رشتہ قریب کا ہو یا دور کا ہمیشہ کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ناواقف لوگوں میں یہ سلسلہ چلے تاکہ اس طرح نئے نئے میل جول پیدا ہوں اور بیگانگی شناسائی میں بدلتی چلی جائے۔ چنانچہ ہر مشاطہ کا فرض ہے کہ وہ اپنا قدم درمیان لاتے ہی سب سے پہلے یہ معلوم کرے کہ دونوں فریق پہلے سے ایک دوسرے کے رشتہ دار یا دیرینہ واقف کار تو نہیں ہیں۔

ضلعوں اور صوبوں کے لحاظ سے شادی کی ضمنی رسمیں مختلف ہیں۔ لیکن جہاں تک بنیادی اصولوں کا تعلق ہے وہ سارے ملک میں یکساں ہیں۔ کوئی منگنی کسی مشاطہ کے بغیر دائرہ عمل میں نہیں آتی۔ مشاطائیں عموماً زیادہ عمر کی عورتیں ہوتی ہیں اور وہ اس کام کو پیشے کے طور پر اختیار کرتی ہیں۔ البتہ کہیں کہیں گھر کی مامائیں بھی یہ خدمت انجام دینے لگتی ہیں۔ ہر مشاطہ کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ ایسے گھرانے میں جہاں شادی کے قابل لڑکا یا لڑکی موجود ہو بے روک ٹوک جائیں اور بیاہ شادی کے مسئلہ پر گفتگو کرنے لگیں۔

بعض دفعہ لڑکے یا لڑکی کے والدین کی مرضی اور ایما سے یہ کام شروع کیا جاتا ہے لیکن عموماً مشاطہ اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے یہ سوال اٹھا بیٹھتی ہے۔ اس طرح شروع سے آخر تک اس کا قدم درمیان رہتا ہے اور وہ ہر معاملہ کی اونچ نیچ کا خیال رکھتی ہے۔

سب سے پہلی رسم یہ ہے کہ لڑکے کے والدین کسی مشاطہ کو لڑکی والوں میں بھیجتے ہیں تاکہ وہ لڑکی کا نام اور اس کا وقت پیدائش دریافت کر آئے۔ یہ دونوں باتیں کسی نجومی یا پنڈت کو بتا کر معلوم کرایا جاتا ہے کہ لڑکے اور لڑکی کی جنم پتریوں کے مطابق ستاروں کا میل ممکن ہے یا نہیں۔ اگر نجومی کا فیصلہ خاطر خواہ ہوا اور وہ یقین دلائے کہ دونوں میں نباہ ہو سکتا ہے تو دوسری رسم ادا کی جاتی ہے ورنہ نہیں۔ دوسری رسم یہ ہے کہ پھر مشاطہ کو شادی کا پیغام دے کر لڑکی والوں میں بھیجا جاتا ہے۔ اگر لڑکی والے اس رشتہ کو قبول کر لیں تو ان سے تحریری وعدہ لیا جاتا ہے اور یہ شادی کی تیسری رسم ہے۔ پھر چوتھی رسم کے طور پر لڑکی کے والدین کو چند تحفے بھیجے جاتے ہیں۔ منگنی کے تحفے دو چار ہی ہوا کرتے ہیں۔ ان میں چائے کے بنڈل، مٹھائیاں، سپاری اور کچھ نقد روپے شامل ہوتے ہیں۔ مشاطہ ان تحفوں کو لکڑی کے چھوٹے بکسوں میں سجا کر لے جاتی یا زیادہ ہونے کی صورت میں مزدوروں کے ساتھ لڑکی کے مکان تک جاتی ہے۔ لڑکی والے جواب میں ایک جملہ لکھ بھیجتے ہیں یعنی "شیرین چائے[1] ہم نے رسمی تحفے قبول کئے اور کھا لئے"۔ اس طرح منگنی کی رسم

[1] چائے ابتدائی طور پر چینی زبان کا لفظ ہے اور اردو کی طرح یورپ کی بھی بہت سی زبانوں میں رائج ہے۔

پکّی ہوجاتی ہے۔ اگر تحفے نہ بھیجے جائیں تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ منگنی کی رسم ادا نہیں کرنی اور جو سلسلہ اب تک چلا تھا وہ کالعدم ہوگیا۔ منگنی ایک بار طے ہوجانے کے بعد لڑکی والوں کی طرف سے توڑی نہیں جاسکتی۔ البتہ لڑکے والے نقدی کی صورت میں کفارہ ادا کرکے اپنا دامن بچالیتے ہیں۔ تحفے قبول ہونے کے بعد مشاطہ لڑکی والوں سے جاکر کہتی ہے کہ شادی کے لئے کوئی مبارک گھڑی مقرر کرلی جائے۔ یہ پانچویں رسم ہے۔

لڑکی کی زندگی یوں بھی کچھ زیادہ پرلطف نہیں ہوتی لیکن نسبت قرار پانے کے بعد ساری دلچسپیاں ختم ہوجاتی ہیں جس طرح یہاں شادی سے پہلے لڑکی کو مایوں بٹھا دیا جاتا ہے وہاں بھی نسبت قرار پاتے ہی لڑکی گوشہ نشین ہوجاتی ہے لیکن اتنی شدید پابندی کے ساتھ کہ وہ اس حالت میں نظر اٹھاکر اپنے سگے بھائیوں کو دیکھ بھی نہیں سکتی۔ ان سے گفتگو کرنی تو بڑی بات ہے۔ البتہ اس دوران میں مامائیں یا مشاطائیں اور گھر کی بوڑھی والیاں اسے گھیرے رکھتی ہیں اور وہ اس دوران میں شادی کے بعد کی زندگی سے متعلق بہت سی باتیں سیکھ لیتی ہے۔ کیونکہ اس سے قبل اسے اب موقعہ کبھی نہیں ملتا۔

ان ابتدائی رسموں کے علاوہ جو ہر صوبہ اور ضلعے میں مختلف ہوسکتی ہیں شادی کے لئے تین اہم بنیادی رسمیں لازمی ہیں جن کے بغیر شادی مکمل ہوتی نہیں پاتی۔ ان کی ادائیگی مذہبی اعتبار سے بھی ضروری ہے۔ وہ شرطیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) شادی کا تحریری اقرار نامہ جس پر دولہا دلہن کے والدین یا سرپرستوں کے دستخط ہوتے ہیں۔

(۲) شادی کی رقم کی وصولی۔

(۳) دلہن کی رسید یعنی لڑکے والوں کی طرف سے اقرارنامہ کہ دلہن ان کے خاندان میں پہنچ گئی۔

شادی کی رقم دلہن کے والدین یا سرپرستوں کو پیشگی دے دی جاتی ہے۔ اس کا تعین حسب حیثیت ہوا کرتا ہے۔ مشاطاؤں کے وسیلے سے جب پہلی دو شرطیں پوری ہوجاتی ہیں تو آخری شرط کی تکمیل بڑی تفصیل کے ساتھ عمل میں آتی ہے۔

دلہن کو بہترین قسم کا لباس پہناکر سرخ رنگ کی ایک شاندار پالکی نما کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے جو وضع قطع کے لحاظ سے صرف شادیوں کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ دلہن کے علاوہ کوئی اور اس میں سوار نہیں ہوتا۔ ہر چینی عورت زندگی بھر میں صرف ایک ہی بار اس پر بیٹھ سکتی ہے۔ کیونکہ پھر یہ موقع نصیب ہی نہیں ہوسکتا۔ کرسی لکڑی کی بنی ہوئی نہایت وزنی ہوتی ہے۔ باہر کے رخ چاروں طرف بہت ہی دیدہ زیب نقش و نگار ہوتے ہیں جن میں مراسم شادی کے مختلف مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ اس کے کناروں وغیرہ پر پھندنے پر لگاکر زینت میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ پُرہُد کو بہت مبارک شگون سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر اس پردے کا سایہ کسی پر پڑ جائے تو ازدواجی زندگی لازمی طور پر عیش و آرام میں بسر ہوتی ہے۔

اس پالکی میں داخل ہونے کا راستہ کسی قدر تنگ ہوتا ہے اور اسے بھی بند کرکے اس کے سامنے دبیز پردے لٹکا دئے جاتے ہیں تاکہ جلوس کے آدمیوں یا راہگیروں میں سے کسی کی نظر دلہن پر نہ پڑ سکے۔ روشنی اور ہوا کا گذر نہ ہونے کے باعث یہ خلوت عموماً وبال جان ہونے لگتی ہے خصوصاً گرمی کے موسم میں دم گھٹنے سے بعض عورتیں بے ہوش اور کبھی کبھی فوت بھی ہوجاتی ہیں۔ اسے چار کہاروں سے اور زیادہ شان دکھانی ہو تو آٹھ کہاروں سے اٹھوایا جاتا ہے۔ بعض گھرانوں میں پالکی کی بجائے موٹر کار کا رواج ترقی پاگیا ہے لیکن دبیز پردے اس پر بھی ڈالے جاتے ہیں۔ تاہم اس میں دم نہیں گھٹتا۔

دریا کے پار جانے کی صورت میں پالکی کشتی کے اوپر رکھ دی جاتی ہے لیکن ملّاحوں کو یہ خطرہ دامنگیر رہتا ہے کہ اس کے زیادہ وزن سے کشتی بیٹھ نہ جائے۔ تاہم کشتی کے ہچکولے دلہن کو ادھ موا ضرور کردیتے ہیں۔ اگر ابتدائی دو شرطیں پوری ہوچکنے کے بعد دلہن اتفاقاً مرجائے تو دولہا اس کے جنازے کو ساتھ لے کر آخری شرط پوری کرتا ہے تاکہ شادی کی رسم ہر لحاظ سے مکمل ہوجائے۔ مرد ایسی صورت میں دوسری شادی کرلیتا ہے لیکن صورت اگر متضاد ہو تو دلہن باقی عمر کے لئے بیوہ سمجھی جاتی ہے۔

سرخ لباس پہنے ہوئے مزدور اور مزدورنیاں جہیز کی مختلف چیزیں اپنے سروں پر اٹھائے پالکی کے آگے چلتی ہیں۔ امیر لڑکیوں کی شادی کے موقعوں پر یہ جلوس غیر معمولی طور پر کافی طویل ہوجاتے ہیں۔ پالکی سب سے آخر میں روانہ ہوتی ہے۔ مٹھائیوں کے خوان، رنگ برنگ کی کاغذی قندیلیں اور دوسری نمائشی چیزیں پالکی کے ساتھ رہتی ہیں۔ باجہ بھی بجتا جاتا ہے۔ جلوس کے منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے دولہا کے دوست دولہا کا خط لاکر دلہن کے حوالہ کرتے ہیں جو سرخ کاغذ پر سنہرے حروف میں لکھا ہوتا ہے۔ اس میں دولہا کی طرف سے تاکید ہوتی ہے کہ بہت جلد میرے گھر پہنچنے کی کوشش کرو۔ خط کا مضمون ہمیشہ نپا تلا اور ہر صورت میں یکساں ہوتا تھا اس لئے دلہن اگر پڑھنا جانتی بھی ہو تو پڑھنے کی تکلف گوارا نہیں کرتی۔ وہ جانتی ہے کہ اس میں کیا لکھا ہوگا۔ تاہم وہ اسے مرنے دم تک اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے۔

دولہا کے گھر میں پالکی کاندھوں سے اتار کر صحن میں رکھ دی جاتی ہے اور اگر مکان وسیع اور نئی وضع کا ہو تو اسے ملاقات کے کمرے میں لے جاکر رکھتے ہیں۔ دولہا ہاتھ میں پنکھا لے کر پالکی کے قریب آتا اور اس کی ڈنڈی سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ دلہن چہرے پر بدستور سرخ ریشمی نقاب ڈالے باہر نکل آتی ہے۔ فوراً گھر کی ایک ملازمہ آگے بڑھ کر

اسے اپنی پیٹھ پر بٹھا لیتی اور کوئلوں کی آگ پر سے لے کر گذرتی ہے۔ عین اس وقت ایک دوسری ملازمہ دلہن کے سر پر ایک سینی اٹھائے رکھتی ہے جس میں چاول، چاول کھانے کی تیلیاں اور سپاری کی چند ڈلیاں رکھی ہوتی ہیں۔ اس رسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی بلا دلہن کے سر پر سوار ہو تو فوراً دور ہو جائے۔

اس اثنا میں دولہا ایک اونچی تپائی پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور وہیں سے اپنی دلہن کا استقبال کرتا ہے جو قریب پہنچ کر سربسجود ہو جاتی ہے اور اس وقت تک پڑی رہتی ہے جب تک کہ دولہا تپائی سے اتر کر اسے اٹھا نہ لے۔ ساتھ ہی وہ اس کے چہرے سے نقاب ہٹا دیتا ہے اور پہلی بار اس کی جھلک دیکھتا ہے۔ حالانکہ منہ اب بھی موتیوں کی جھالر سے جو نقاب کے نیچے ہوتی ہے، قریب قریب ڈھکا رہتا ہے۔

اس کے بعد وہ دونوں اس بڑے کمرے میں جاتے ہیں جہاں دولہا کے آبا و اجداد کے ناموں کی تختیاں، زمین و آسمان اور مکان کے صدر دروازے کی نگرانی کرنے والے دیوتاؤں کی مورتوں کے ساتھ قربان گاہ والے بڑے طاق پر رکھی ہوتی ہیں۔ دونوں مل کر ان کی پوجا کرتے ہیں۔ اس پوجا کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس کے بعد ہی دلہن صحیح معنوں میں اپنے دولہا کی بیوی کہلائے جانے کی مستحق ہو سکتی ہے۔ پوجا کے بعد دلہن چند مشروبات بھی بھینٹ چڑھاتی ہے۔

اس سے فارغ ہو کر وہ دونوں حجلۂ عروسی میں قدم رکھتے ہیں۔ وہاں نارنگی کا ایک چھوٹا سا پودا گملے میں رکھا ہوتا ہے۔ یہ خاص قسم کی نارنگی کا پودا محض نمائشی ہوتا ہے۔ اس کا پھل انتہائی ترشی کے باعث کھایا نہیں جاتا لیکن سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بہت چھوٹا پودا ہی بری طرح پھلوں سے لدا رہتا ہے۔ اس کی ڈالیوں میں چند سکے بھی بندھے ہوتے ہیں۔ یہ گویا افراطِ اولاد اور فراوانیٔ دولت کی علامات ہیں۔

دلہن کی سیج پر چھتری سے بندھی ہوئی سرخ کاغذ کی تین لمبی پٹیاں لٹکتی ہوتی ہیں جن پر کچھ دعائیں لکھی ہوتی ہیں۔ مثلاً "بھگوان کرے تمہیں سو بیٹے اور ہزار پوتے نصیب ہوں"۔

دولہا اپنی دلہن کو سلام کر کے اس کے قریب چائے پینے بیٹھ جاتا ہے۔

چائے کے ساتھ مٹھائیاں اور پھل بھی ہوتے ہیں۔ بیٹھتے وقت دلہن چاہتی ہے کہ دولہا کے لباس کا ایک دامن اپنے زانو کے نیچے دبا لے۔ دولہا بھی یہی کوشش کرتا ہے اور عموماً کامیاب رہتا ہے کیونکہ دلہن جان بوجھ کر اسے موقع دیدیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آئندہ کون کس پر حاوی رہے گا۔ چونکہ ہمیشہ سے مرد کا سکہ عورت پر چلتا آیا ہے، اس لئے دلہن پہلے دستور کو نہ توڑنے کے خیال سے خود ہی اعتراف کمتری کر لیتی ہے۔ لیکن اس زمانہ کی بعض روشن خیال لڑکیاں برابری اور ہمسری کی دعویدار ہوتے ہوئے بالاجیت لینے کی کوشش کرتی ہیں۔

چائے نوشی کے وقت دولہا کی بہنیں دلہن کے چہرے پر سے موتیوں کی جھالر ہٹا دیتی ہیں تاکہ اس کا منہ صاف طور پر نظر آسکے۔ دلہن کے لئے لازمی ہوتا ہے کہ وہ عروسی لباس پہننے اور بناؤ سنگھار کرنے کے وقت تزئین جمال کے لئے چہرے پر غازہ یا پوڈر بالکل نہ لگائے تاکہ رونمائی کے وقت خد و خال کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔ اگر کوئی لڑکی اس اصول کا خیال نہ رکھتے ہوئے مصنوعات استعمال کرے تو اس پر نام دھرے جاتے ہیں۔

دولہا دلہن چائے پینے میں مشغول ہو جاتے ہیں لیکن پاس کھڑی ہوئی عورتیں دلہن کے نقش و نگار اور حسن و جمال کی بابت اپنے خیالات طنزیہ انداز میں ظاہر کرتی ہیں۔ بعض دفعہ ان کی رائے زنی اتنی سخت اور دلسوز ہو جاتی ہے کہ غریب دلہن دل ہی دل میں کڑھتی اور کبھی رو پڑتی ہے۔

شام کو تقریباً سات بجے دولہا کے والدین کے اعزاز میں ایک پر تکلف ضیافت کا انتظام کیا جاتا ہے جس میں اصولاً دلہن پیش پیش رہ کر ہر کام میں حصہ لیتی ہے حتیٰ کہ کھانا کھانے کے وقت وہ دسترخوان پر اپنے ہاتھ سے سب چیزیں چنتی اور بالکل "بیرے" کی طرح ہر فرمائش پوری کرتی ہے۔ خسر کا پیالہ شراب سے لبریز کر کے وہ خود گھٹنوں کے بل جھک کر اپنے ہاتھوں سے پیش کرتی اور اسی طرح جھکی رہتی ہے جب تک کہ وہ تمام شراب ختم نہ کر لے۔ پیالہ واپس لینے سے پہلے وہ سجدہ کرتی ہے۔ کچھ دیر بعد عام دعوت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں دولہا دلہن بھی حصہ لیتے ہیں۔

حجلۂ عروسی میں دوبارہ پہنچانے سے پہلے دولہا کی رشتہ دار عورتیں دلہن سے

غزل

زبیر افضل

تمہیں خوف مآل آتا تو ہوگا ۔۔۔ جوانی کا خیال آتا تو ہوگا
کبھی منزل کے دو بچھڑے ہوؤں میں ۔۔۔ مقام اتصال آتا تو ہوگا
تمہیں معلوم ہے دل کی حقیقت ۔۔۔ کہ اس شیشے میں بال آتا تو ہوگا
نقاب رخ کبھی اٹھتی تو ہوگی ۔۔۔ حیا میں اعتدال آتا تو ہوگا
یہ میرا اور تمہارا ربط باہم ۔۔۔ کہیں اس کا سوال آتا تو ہوگا
فسانے میں تمہارے ذکر میرا ۔۔۔ بہیں انکشر جلال آتا تو ہوگا
کبھی معراج دل ہوتی تو ہوگی ۔۔۔ کبھی وہ ماہ وصال آتا تو ہوگا

تصور میں کسی کے اب بھی افضل
کوئی افسردہ حال آتا تو ہوگا

بہت سی پہیلیاں پوچھتی اور کوشش کرتی ہیں کہ ساری رات اسی طرح گنوا دیں لیکن دولہا جو عموماً اس وقت تک نشۂ شراب سے چور ہو چکتا ہے آکر مزاحم ہوتا اور دلہن کو زبردستی اپنی سیج پر لے جاتا ہے۔

تیسرے دن دوبارہ دولہا کے آبا و اجداد کی پوجا کی جاتی ہے اس سے فارغ ہو کر دلہن اپنے میکے جاتی ہے۔ دولہا بھی ساتھ جاتا ہے ان کے پہنچنے کے دوسرے دن دلہن والے بڑے پیمانے پر دعوت دیتے ہیں جس میں تمام عزیز و اقارب اور دوست احباب شامل ہوتے ہیں۔

دو سال تک دلہن کو دلہن سمجھا جاتا ہے اور گھر کے کام کاج میں اس سے کوئی مدد نہیں لی جاتی۔

یہ ہے مختصر سا خاکہ ان رسموں کا جو صوبہ کینٹن میں عام طور پر قدیم کنفیوشی مت کے پیروؤں میں رائج ہیں۔ بعض صوبوں میں ان کی ادائیگی میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ نیز بودھیوں اور مسلمانوں کے طریقے بھی جدا جدا ہیں۔

صوبہ سواتو میں پالکی کرسی کے لئے لازمی نہیں ہے کہ وہ سرخ رنگ کی ہو اور لکڑی ہی کی بنائی جائے۔ اس کے دروازے کو دبیز پردوں سے بند بھی نہیں کیا جاتا۔ اس میں کافی گنجائش ہوتی ہے تاکہ اگر دلہن چاہے تو ٹانگیں پھیلا کر آرام سے بیٹھ جائے۔ دولہا کے مکان میں صدر دروازے کی چوکھٹ پر سؤر کے کچے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا لٹکایا جاتا ہے۔ دلہن کو اس کے نیچے سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ کوئلوں کی آگ کی بجائے جلتی ہوئی سوکھی گھاس پر اسے خود پاؤں رکھ کر چلنا ہوتا ہے۔ وہ ملازمہ کی پیٹھ پر سوار نہیں ہوتی۔ تیسرے دن میکے واپس جانے کی بجائے وہ مسلسل چار ماہ تک سسرال میں رہتی ہے۔ البتہ اس دوران میں اس کے چھوٹے بھائی بہن اس کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ تین سال تک ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو اسے دولہا کے آبا و اجداد کی پوجا کرنی پڑتی ہے۔ اسے تین سال تک دلہن سمجھا جاتا ہے۔

صوبہ ین نان میں "گھر داماد" رکھنے کا رواج بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی رسمیں شادی کی عام رسموں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس صورت میں ابتدائی بات چیت طے ہونے کے بعد دولہا بذات خود دلہن کے گھر جاتا ہے جہاں تمام رشتہ دار اور دوست احباب پہلے سے جمع ہوتے ہیں۔ اسے مکان کا صدر دروازہ بند ملتا ہے۔ کواڑوں پر دو بار دستک سن کر دلہن اس کا نام، پتہ، حسب نسب اور وہاں آنے کا مقصد پوچھتی ہے۔ وہ سب حالات بتا کر اپنا مقصد بیان کرتے ہوئے اقرار کرتا ہے کہ میں اس گھر میں تمہارا شریک حیات بن کر ہمیشہ رہنا چاہتا ہوں۔ تب وہ دروازہ کھول کر اسے اندر بلا لیتی ہے اور باقی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ اس صورت میں لڑکی کے آبا و اجداد کی پوجا دولہا کو کرنی پڑتی ہے۔ زندگی بھر یا جب تک وہ اس بیوی کے ساتھ رہے دولہا کو کوئی کام کاج کرنا نہیں پڑتا۔

اس کے تمام اخراجات دلہن والے برداشت کرتے ہیں۔ یہ طریقہ زیادہ تر ان گھرانوں میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں لڑکی اکلوتی ہو اور والدین بہت امیر ہوں۔ ایسی صورت میں پیدا ہونے والے بچوں کے ناموں کے ساتھ لڑکی ہی کے نام کا جزو ملایا جاتا ہے اور وہ اسی کی ملکیت تصور کئے جاتے ہیں۔

اگر کوئی شخص بہ سلسلۂ ملازمت یا کسی اور ضروری کام کے باعث اپنے گھر سے دور دراز مقام پر ہو اور اس کی واپسی جلدی ممکن نہ ہو سکتی ہو لیکن شادی کرنی ضروری ہو تو اس کی بجائے ایک سرخ مرغ کو دولہا بنا کر تمام رسمیں ادا کر دی جاتی ہیں اور جب وہ شخص واپس آتا ہے تو دوبارہ کسی رسم کی ادائیگی کے بغیر دلہن کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اگر کوئی لڑکا جوان ہو کے اور شادی کرنے سے پہلے ہی مر جائے تو اس کے والدین فوراً مشاطہ کو بلا کر اس کا رشتہ ڈھونڈنے کے لئے ہدایت کرتے ہیں۔ وہ کسی قدر تلاش و تجسس کے بعد ایسا گھر معلوم کر لیتی ہے جہاں کوئی کنواری لڑکی تقریباً انہی دنوں میں فوت ہوئی ہو۔ پتہ چلتے ہی رشتہ فوراً قائم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ لڑکی والے بھی منتظر ہوتے ہیں کہ کوئی مشاطہ کہیں سے ایسا پیغام لے آئے اور ان کی لڑکی دوسری دنیا میں شوہر کے بغیر نہ رہے۔ ایسی صورت میں دولہا دلہن کی بجائے ان کے ناموں کی تختیاں تیار کر کے شادی کی تمام رسمیں ادا کر دی جاتی ہیں اور اس طرح دو مختلف خاندان ایک دوسرے کے سمدھیانے بن جاتے ہیں۔

نقد و نظر

افادی ادب

مصنفہ اختر انصاری، ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی — ضخامت ۲۰۰، قیمت عہ

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا اور اب پانچ برس بعد دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ اب سے پانچ برس پہلے بھی اس کی افادی اہمیت اتنی ہی تھی جتنی آج ہے۔ بلکہ تاریخ ذرا سے آگے بڑھ جانے کے بعد بھی ہماری زندگی کے ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جب اس کتاب کا موضوع اور اس کا انداز بھٹکے ہوئے تخیل اور بھٹکے ہوئے قلم کو سیدھی راہ پر چلنے کی طرف مائل کر سکتا ہے۔

کتاب میں مصنف نے چند ایسے مسائل پر بحث کی ہے جو یوں تو ہر زمانہ کے ادب کیلئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ایک ایسے زمانہ میں جب زندگی کی قدریں ایک نئی شکل اختیار کر رہی ہوں اور اس لئے ادب بھی اپنے لئے نئے سانچوں کی جستجو کر رہا ہو یہ بنیادی مسائل اور بھی اہم بن جاتے ہیں۔ انہیں زیادہ وضاحت اور صفائی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب اردو میں یہ خدمت بوجوہ احسن انجام دیتی ہے اس میں ادب کے اہم بنیادی مسئلوں کو اختصار کے ساتھ اعتماد کے لہجہ میں اور ادبی جوش اور توانائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور اسلئے بہت کم موقعے ایسے آتے ہیں جہاں کتاب پڑھنے والا اپنے آپ کو لکھنے والے کا ہم خیال نہ محسوس کرتا ہو۔ یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی عذر نہیں ہوتا کہ ادب حیات انسانی کی تفسیر ہی نہیں بلکہ تنقید بھی ہے۔ وہ زندگی سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے اور اس پر اثر انداز بھی۔ اور ادب میں دو خصوصیتیں لازمی ہیں پہلی یہ کہ اسے اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق ہو اور دوسری یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت ہو۔ اور اس لئے کسی ادبی کارنامے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے یہی دو چیزیں سامنے رکھنی چاہئیں۔ اس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے مصنف نے شروع سے استدلال کا ایک منطقی طریقہ اختیار کیا ہے اور اس منطق کے مختلف مقدموں میں کہیں الجھن نہیں۔ اور اس لئے اگر کہیں کسی کو مصنف کی رائے سے اختلاف بھی ہو تو وہ کم از کم اس کے منطقی قیاس سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔

"افادی ادب" کی کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ سر ورق بھی رنگین اور دیدہ زیب ہے۔ لیکن کتابت میں شروع سے آخر تک جو حد سے زیادہ خوش مذاقی برتنے کی کوشش کی گئی ہے اس سے کتاب کا حجم بلا ضرورت بڑھ گیا۔ کتاب اصل میں اتنی صفحہ کی ہونی چاہئے تھی۔ اس طرح اس کی قیمت بھی ذرا اور کم ہو جاتی۔

(۱) آنسو اور پسینہ — قیمت عہ، ۲۲۵ صفحے
(۲) جھگڑے — قیمت عہ، ۲۰۰ صفحے

مصنف اور ناشر ڈاکٹر رام پرتاب بہادر
ملنے کا پتہ:- ہریش چندر ۳۳، کچہری روڈ، الہ آباد۔

آنسو اور پسینہ ڈاکٹر بہادر کی دس بیس ... کا مجموعہ ہے چیزوں اس لئے کہ اس میں پانچ افسانے ہیں، تین ریڈیو کی تقریریں، ایک اور چیز جو نشر ہو جاتی تو تقریر ہوتی، ایک مضمون جس کے متعلق خود مضمون نگار صاحب بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ وہ مزاحیہ ہے یا سنجیدہ اور پڑھنے والے کیلئے بھی کسی نتیجہ پر پہنچنا دشوار ہے۔ افسانوں اور مضمونوں کے شروع میں مصنف نے کتاب کے بارے میں، اور خود اپنے بارے میں، بہت سی باتیں کہی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی کی جگہ وہ ادب برائے پیسہ، کے قائل ہیں۔ آجکل کے اکثر لکھنے والوں کی ذہنی ... یہی ہے لیکن ادب اور ... کی بلندیوں سے اتر کر سچائی کی اس سطح پر آنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں۔ یہ ہمت میں نے ڈاکٹر رام پرتاب بہادر میں دیکھی۔ ایک طرف یہ ہمت کہ مصلحت اور مروت کے پردے ڈالے بغیر اور بلا کسی اور شاعرانہ اشاروں کا سہارا لئے بغیر، بات کو جس طرح محسوس کیا جائے اسی طرح بیان بھی کر دیا جائے۔ اور دوسری طرف اس صفائی، سچائی اور اس سے تلخی کو مزاح اور ظرافت کی ملی جلی چاشنی میں ڈبو کر سامنے لانے کی عادت۔ یہ ہمت اور یہ عادت ڈاکٹر بہادر کے طرز کی دو اہم خصوصیات ہیں۔ وہی ان کے افسانوں میں بھی ہیں، وہی ان کی ریڈیو کی تقریروں میں بھی اور وہی ان سنجیدہ مضامین میں بھی جن کا مجموعہ "جھگڑے" ہے۔

"جھگڑے" کوئی جھگڑے کی چیز نہیں بلکہ بدنصیب ہندوستان کے موجودہ جھگڑوں کا کوئی حل تلاش کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔ ہندو مسلمانوں کے جھگڑے جنہوں نے دو دلوں اور دو ذہنیتوں سے بازی لگائی ہے، ہندی، اردو، ہندوستانی کے جھگڑے جنہوں نے اس معصوم اور بے ضرر چیز کو اکھاڑہ بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر رام پرتاب نے ان جھگڑوں کے ہر پہلو کو ایک عامی کے نقطۂ نظر سے سوچا ہے اور جس جگہ جس کا قصور دکھائی دیا ہے اسے بے کھٹکے کھری کھری سنائی ہیں۔ ان کھری کھری لیکن حد سے زیادہ تند تیز اور تلخ باتوں کا نشانہ ایک طرف جوش اور سمترا نندن پنت ہیں اور دوسری طرف جناح اور گاندھی۔ اور ان کے علاوہ اور ہزاروں اس طرح کے آدمی جو مصنف کے نزدیک ان جھگڑوں کی آگ کو ہوا دیتے ہیں۔ ان ساری باتوں میں ہر جگہ دیانتداری ہے، ہر جگہ انہیں دور کرنے کی ایک بے چین خواہش ہے، ہر جگہ ایک بہتر زندگی کا ایک سہانا سپنا ہے لیکن اس ساری دیانتداری، اور بے چین خواہش کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ان مضمونوں کو پڑھ کر نہ ہندو خوش ہو سکتے ہیں نہ مسلمان، نہ کانگریسی نہ لیگی، نہ اردو والے نہ ہندی والے۔ پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں سب کی خوشنودی کا سامان ہے۔ مصنف کے ترکش سے تیر جب کبھی برستے ہیں تو ایک کا کلیجہ چھلنی ہوتا ہے اور دوسرے کو یہی منظر جاں فزا معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ یہ مشورہ طلب کیا ہے کہ وہ افسانے لکھیں یا مضامین۔ اس لئے شاید مشورہ بے محل نہیں میرا مشورہ ہے کہ وہ افسانے بھی لکھیں اور مضامین بھی۔ لیکن ایک بات کو ذہن میں رکھ کر اور وہ یہ کہ ادب برائے پیسہ بھی اگر ادب کی روایتوں کی پاسبانی سے محروم ہو جائے تو وہ ادب نہیں رہتا۔ زبان و بیان میں نئی ادبی روایتوں کی مستحکم عمارت بھی صرف پرانی روایتوں کی بنیاد پر بنائی جا سکتی ہے۔ یہ مجموعہ اظہار خیال کی ہمت اور فکر کے خلوص کی ایک ایسی مثال پیش کرتا ہے جس کی ہمارے ادب میں انتہائی کمی ہے۔

و — ع

اردو کے چند ابتدائی اخبار

حامد اللہ افسر

اس میں شبہ نہیں کہ اخبار نویسی موجودہ صورت میں ہمارے یہاں انگریزوں کے وسیلے سے نمودار ہوا لیکن انگریزوں سے پہلے بھی ہمارے ملک میں قلمی اخبار کا رواج تھا، شاہان مغلیہ کے زمانے میں "وقائع"[1] کے نام سے اخبار شائع ہوتے تھے یہ قلمی اخبار تھے اور حکومت ان کو شائع کرتی تھی "وقائع نویس" اس مقصد کے لئے ایک مستقل عہدہ ہوتا تھا جس کی نگرانی میں بہت سے "وقائع نگار" ملک کے مختلف حصوں میں متعین رہتے تھے جن کا فرض تھا کہ بادشاہ کی حضوری میں پیش کرنے کے لئے اہم واقعات کی اطلاع دارالسلطنت کو بھیجتے رہیں، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ "یہ وقائع" کسی خاص مقام پر کھڑے ہو کر کوئی رکن حکومت پبلک کو بھی سنا دیتا تھا، چنانچہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر "وقائع" کے سنانے کا ذکر بعض تاریخوں میں موجود ہے۔

ان قلمی اخباروں کا سلسلہ انگریزوں کے تسلط کے بعد تک قائم رہا، سرکاری "وقائع" کے علاوہ بعض اور لوگ بھی قلمی اخبار نکالتے تھے یہ لوگ اخبار نویس کہلاتے تھے، خفی خاں نے اپنی کتاب منتخب اللغات میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب کی فوجوں میں اخبار تقسیم کئے جاتے تھے، کرنل جیمس ٹاڈ نے ۱۸۲۰ء میں کئی سو قلمی اخبار رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی نذر کئے تھے یہ سب اخبار سلاطین مغلیہ کے زمانے کے تھے، ملکاف نے ۱۸۳۰ء میں لکھا تھا کہ دیسی لوگوں میں قلمی اخباروں کا بہت رواج ہے، صرف دہلی سے ایک سو بیس قلمی اخبار مختلف مقامات کو بھیجے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں مطبوعہ اخباروں کا سلسلہ ۱۷۸۰ء سے شروع ہوا، سب سے پہلا ہندوستانی اخبار انگریزی زبان میں "بنگال گزٹ" کلکتہ سے ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو جیمس آگسٹس ہکی نے شائع کیا لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل و عقد ابتدا ہی سے اخباروں سے گھبرا اٹھے، لارڈ ولسلی نے ۱۷۹۹ء میں ایک حکم جاری کیا کہ ہر اخبار اشاعت سے پہلے گورنمنٹ کے سکریٹری کو دکھا لینا ضروری ہے، سکریٹری کو اختیار حاصل تھا کہ جس عبارت کو وہ قابل اعتراض سمجھے قلم زد کردے۔ سنسر کا یہ سلسلہ لارڈ میٹکاف کے زمانے تک جاری رہا جنھوں نے ۱۸۳۵ء میں اخباروں کے اوپر سے پابندیاں ہٹا لیں اور ایک حد تک ان کو اظہار رائے کے لئے آزاد کر دیا۔

بنگال گزٹ کے بعد نومبر ۱۷۸۰ء میں "انڈین گزٹ" شائع ہوا، پھر ۱۷۸۴ء میں "کلکتہ گزٹ" نکلا اور ۱۷۸۵ء میں "بنگال جرنل" شائع ہوا۔ ملکی زبانوں میں سب سے پہلا اخبار بنگالی زبان میں جاری ہوا، یہ اخبار سیرام پور کے عیسائی مشنریوں نے نکالا تھا، اس کا نام "دگ درشن" تھا یہ ایک ماہوار رسالہ تھا جو اپریل ۱۸۱۸ء میں شائع ہوا، دو نمبر نکلنے کے بعد جب اس کے منتظمین کو اطمینان ہو گیا کہ باوجود سیاسی خبروں کے حکومت نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ تو انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار "سماچار درپن" بنگالی زبان میں شائع کیا یہ اخبار جب لارڈ ہیسٹنگس کی نظر سے گزرا تو انھوں نے سیرام پور کے مشنریوں کی بہت ہمت افزائی کی اور ان سے درخواست کی کہ اس اخبار کا ایک فارسی اڈیشن بھی شائع کیا جائے۔

۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو "جام جہاں نما" کا پہلا نمبر شائع ہوا یہی گویا سماچار درپن کا فارسی اڈیشن تھا، اس کے اڈیٹر منشی سدا سکھ تھے اور پرنٹر مسٹر ولیم ہاپکنس پیرس، اس اخبار کا آدھا حصہ فارسی میں تھا اور آدھا اردو میں، یہی اردو کا سب سے پہلا اخبار تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ "اردو اخبار" جو مولوی محمد باقر صاحب نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے شائع کیا اردو کا پہلا اخبار نہ تھا جیسا کہ ان کے لائق فرزند مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں بیان کیا ہے۔ بلکہ "جام جہاں نما" اردو کا پہلا اخبار تھا جو اردو اخبار سے چودہ برس پہلے نکلنا شروع ہوا تھا، جام جہاں نما کے بہت سے پرچے امپیریل رکارڈ ڈپارٹمنٹ میں اب تک موجود ہیں۔

اس کے بعد ۱۶ مئی ۱۸۲۳ء کو ماتھر موہن متر نے "شمس الاخبار" جاری کیا، یہ اخبار بھی فارسی اور ہندوستانی (اردو) میں تھا، یہ اردو کا دوسرا اخبار تھا۔

اس تحقیق سے ایک دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ اردو کا سب سے پہلا اخبار ایک ہندو بزرگ کی ادارت میں شائع ہوا اور اس کے بعد دوسرا اخبار بھی ایک ہندو بزرگ ہی نے نکالا، گویا اردو اخبار کی بنا اصل میں ہندو اصحاب نے ڈالی۔

۱۸۲۲ء میں راجہ رام موہن رائے نے فارسی زبان کا ایک اخبار "مرآۃ الاخبار" کے نام سے جاری کیا، راجہ صاحب نے بھی اعلان کیا تھا کہ ہم "مرآۃ الاخبار" کا ایک حصہ ہندوستانی کے لئے مخصوص کرنے کا انتظام کر رہے ہیں لیکن یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ انھوں نے یہ انتظام کیا یا نہیں۔

۹ فروری ۱۸۲۶ء کو "ہندی" کا سب سے پہلا اخبار "اودنت مارتنڈ" جاری ہوا یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور اس کے پبلشر جگل کشور صاحب تھے اور خود ہی پرنٹر تھے۔ یہ اخبار دیوناگری رسم خط میں تھا لیکن چل نہ سکا ایک سال جاری رہ کر بند ہو گیا۔

۱۸۳۶ء میں مولوی محمد باقر صاحب نے "اردو اخبار" جاری کیا، اس اخبار میں زیادہ تر قلعہ معلی کی خبریں شائع ہوتی تھیں، مولوی محمد باقر اپنے علم و فضل کے لئے دہلی میں بہت ممتاز تھے اور دہلی اور مضافات دہلی میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کا اخبار بہت مقبول تھا، اس اخبار میں واقعات حاضرہ پر بے لاگ رائے کا اظہار کیا جاتا تھا، مثلاً قلعہ کی مرمت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:۔

"دل شکستوں کی عمارت دل کی تعمیر نہیں ہوتی اور شکستہ ہاتھوں کی تعمیر ہوتی ہے"

(اردو اخبار ۲۶ جون ۱۸۴۰ء)

تعزیرات ہند کی ترتیب کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کیا گیا:۔

[1] لفظ اخبار خبر کی جمع ہے لیکن اردو میں بطور اصطلاح کے وہ مطبوعات کے لئے مستعمل ہے جو روزانہ یا ہفتہ وار یا ہفتہ میں دو بار شائع ہوں اور جن میں واقعات و سانحات حاضرہ شائع کئے جائیں اور ان پر اظہار رائے ہو۔

جامعہ نگر (دہلی)

[illegible] صاحب نے ۱۱ پچیس [illegible] سے ۲ نومبر [illegible] تک یعنی تین برس پانچ مہینے چودہ دن کے واسطے بطور تنخواہ کے تین لاکھ چیالیس ہزار پانسو پچیس روپیہ پا [illegible] اور کل ۲۰۰ قانون بنائے۔ وہ قانون چھاپے جاویں تو قریب ۲۰۰۰ کالم اس اخبار (اردو اخبار) کے ہوں۔ علاوہ ان صاحب کے کوئی ممبر مجلس قوانین کے تھے اور کئی صاحب اور بالفعل تنخواہ پاتے تھے۔

(منقول از اردو اخبار ۲۵ جنوری [illegible])

اس کے بعد تو گویا اردو اخباروں کا باقاعدہ دور شروع ہو گیا۔ [illegible] میں "خیر خواہ ہند" مرزا پور سے نکلا [illegible] میں "دار السلام" دہلی سے [illegible] میں "اخبار" بنارس سے اور "اودھ اخبار" لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ سب اخبار ہفتہ وار تھے اور ان کا چندہ پندرہ روپیہ سے پچیس روپیہ سالانہ تک تھا۔

[illegible] میں منشی ہر سکھ رائے صاحب نے "کوہ نور" کے نام سے ایک اخبار لاہور سے جاری کیا۔ یہ اخبار ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ [illegible] کے غدر کے دوران میں یہ اخبار روزانہ کر دیا گیا۔ میری تحقیق کے مطابق یہ اردو کا سب سے پہلا روزنامہ تھا۔ "کوہ نور" [illegible] تک جاری رہا۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ نول کشور پریس لکھنؤ کے بانی اور مالک منشی نول کشور صاحب "کوہ نور" پریس لاہور میں اس وقت کلرک تھے۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارۂ مطبوعات [illegible] شائع کیا



ترکی کے شہر کوتاهیه میں ایک مسجد کا اندرونی حصہ اور اسکی دیدہ زیب آرائشیں۔

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			چندہ سالانہ	فی کاپی
الثقیر	(عربی)	(ماھوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیوور	(فارسی)	(ماھوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آھنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماھی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
العرب	(عربی)	(ماھوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ھندی)	(ماھوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماھوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ھے ڈے	(انگریزی)	(ماھوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماھوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اون ورلڈ	(انگریزی)	(ماھوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی ـ چینی)	(سہ ماھی)	تین روپیہ	چار آنہ
پوسپیکٹو	(انگریزی)	(سہ ماھی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی ـ فارسی)	(ماھوار)	تین روپیہ	چار آنہ
	(اردو ـ ھندی)			
	(پشتو ـ روسی)			
	(برمی ـ رومن اردو)			
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)	—	ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا ٹریڈ بلیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

الڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں ـ ایک سو اسی صفحات ـ دو نقشے ـ کپڑے کی جلد ـ قیمت دو روپیہ (بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں) ـ

«میزان بیور لیٹر» (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (محصول ڈاک [illegible]) ـ

خاص رعایت «عربی ـ انگریزی جلے» نوے صفحات ـ گتے کی جلد ـ قیمت دو روپیہ [illegible] آنہ ـ کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ ـ

«فارسی انگریزی جلے» کپڑے کی جلد ـ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) ـ

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ ـ پوسٹ بکس نمبر [illegible] ـ دہلی